شخصیت

حمایت علی شاعر نمبر

شخصیت

حمایت علی شاعر نمبر

(نگراں)

شفیق الزماں

(مرتب)

انور جبیں قریشی

(زیر اہتمام)

ٹیلنٹس گلڈ

A-1 منیر گارڈن، بلاک 18 گلستان جوہر کراچی (پاکستان) فون - 8117652

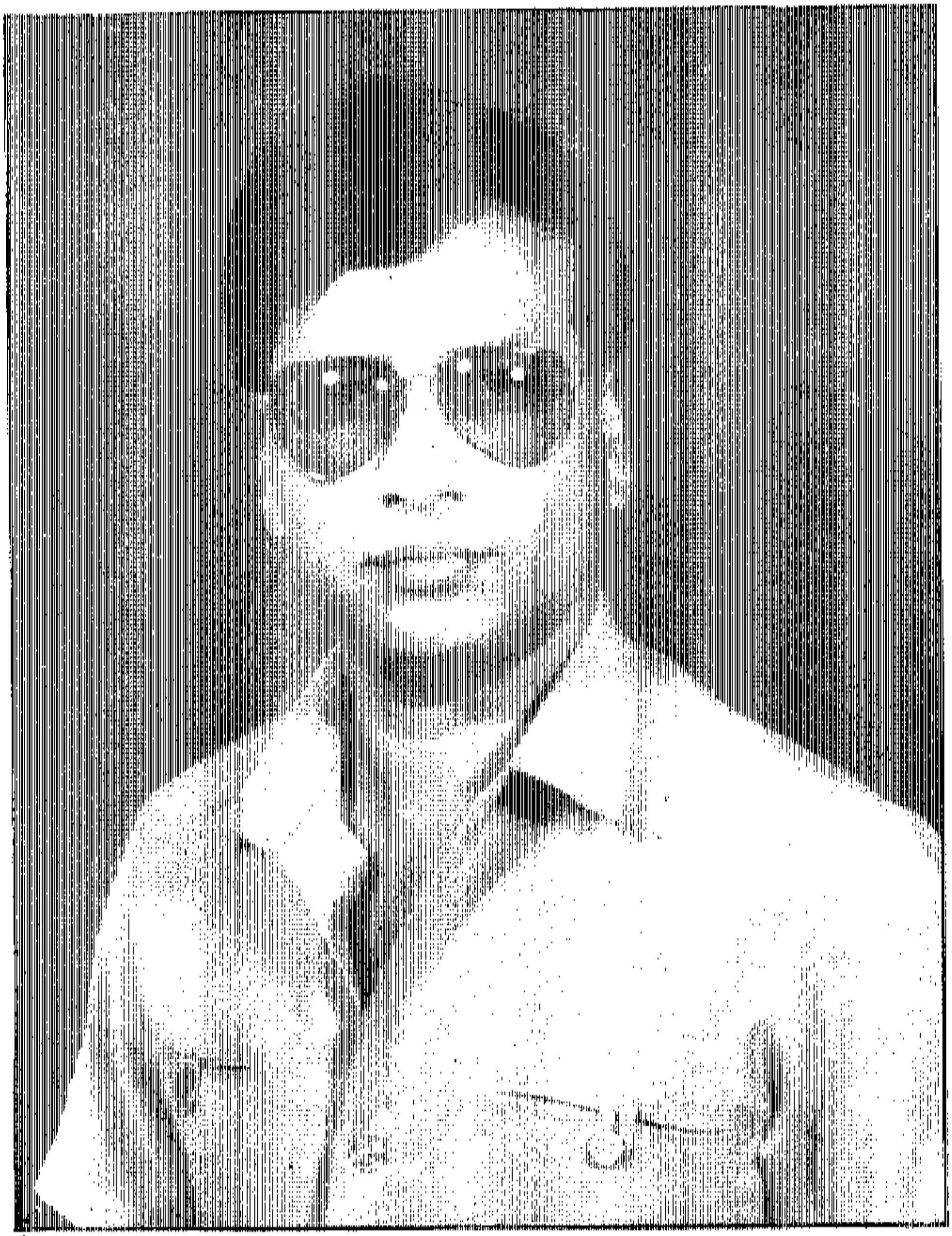

شفیق الزماں

ٹیلنٹس گلڈ۔ ایک تعارف

شفیق الزماں

ٹیلنٹس گلڈ۔ کراچی کی ایک فعال، متحرک اور منظم تنظیم ہے جو گزشتہ ۲۴ برس سے ادبی، ثقافتی اور سماجی نوعیت کے مثبت پروگراموں کا انعقاد بڑی باقاعدگی سے کرتی آرہی ہے۔

ٹیلنٹس گلڈ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے شہر کے اہم اور بڑے شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں اور فنکاروں کا نہ صرف بھرپور تعاون حاصل رہا بلکہ کئی شخصیات اس تنظیم سے وابستہ بھی ہیں اور ان کی رہنمائی اسے حاصل ہے

ٹیلنٹس گلڈ نے ہمیشہ اپنے پروگرام کسی نہ کسی مقصد اور افادیت کی بنیاد پر مرتب کئے۔ صرف "پروگرام کرنا" کبھی اس کا مقصد نہیں رہا۔ ٹیلنٹس گلڈ کی کارکردگی کا ایک سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو آپ کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

یہ تنظیم ۱۹۷۴ء میں قائم ہوئی۔

ٹیلنٹس گلڈ سے وابستہ اہم شخصیات میں پروفیسر انجم اعظمی (مرحوم) پروفیسر آذر حفیظ۔ جناب یاور مہدی، جناب نثار بزمی اور دیگر حضرات شامل ہیں جن کے مشورے اور رہنمائی گلڈ کو حاصل رہی۔

۱۹۷۴ء میں مشہور ڈرامہ نگار آغا بابر کا لکھا ہوا ڈرامہ "بڑا صاحب" کراچی کے مشہور سیٹ ڈیزائنر محمد اشرف مرحوم کے لئے پیش کیا گیا جس کی ساری آمدنی محمد اشرف کی بیوہ کو باقاعدہ ایک تقریب میں پیش کی گئی۔ اس ڈرامے میں پاکستان ٹیلی وژن کے پروڈیوسر اقبال لطیف نے مرکزی کردار (بڑا صاحب) ادا کیا تھا۔ اس کے علاوہ شہزاد رضا (آج کے ایک مقبول اور مشہور فنکار) نے بھی ایک بہت اہم رول کیا تھا۔ یہ ان کا ابتدائی دور تھا۔ ۱۹۷۵ء میں گلڈ نے کئی پروگرام پیش کئے۔

شوکت صدیقی کے مشہور ناول "خدا کی بستی" کو کراچی ٹی وی پر نہایت خوبصورت انداز میں پیش کرنے والے فنکاروں کو ایوارڈز دیئے گئے انعام حاصل کرنے والوں میں قاسم جلالی (بحیثیت پروڈیوسر) ذہین طاہرہ، قاضی واجد، محمد یوسف (مرحوم) بختیار احمد، بہروز سبزواری اور منور سلطانہ شامل تھے۔ اس مقصد کے لئے ججوں کا ایک پینل تشکیل دیا گیا تھا جس میں عبدالکریم بلوچ، محسن علی، اے آر ممتاز، نیلوفر عباسی اور غزالہ رفیق (مرحوم) شامل تھے۔

۱۹۷۵ء ہی میں ایک ڈرامہ "بیچ رستے میں" پیش کیا گیا اس ڈرامہ کو منظر امام نے لکھا تھا جو آج کے جانے پہچانے ڈرامہ نگار ہیں اور اکثر ٹیلی وژن پر ڈرامے لکھتے ہیں۔ ان کا پہلا ڈرامہ ٹیلنٹس گلڈ ہی نے پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ آج کے مشہور اداکار شہزاد رضا کو بھی بحیثیت ڈرامہ ڈائریکٹر پہلی مرتبہ ٹیلنٹس گلڈ ہی نے پیش کیا (اس ڈرامے کے ڈائریکٹر شہزاد رضا تھے)۔

۱۹۷۵ء ہی میں آج کے مشہور و معروف فنکار معین اختر کے ساتھ ایک شام منائی گئی یہ ان کا ابتدائی دور تھا اور ان کو وہ شہرت اور اہمیت حاصل نہیں تھی جو آج ہے۔ اس کے علاوہ کسی مزاحیہ فنکار کے ساتھ شام منانے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو بڑا کامیاب رہا۔

اس کے علاوہ مشہور گلوکار بشیر احمد کے ساتھ ایک شام منائی گئی یہ ایک بہت بڑی محفل موسیقی تھی۔ بنگلہ دیش جانے سے پہلے بشیر احمد کراچی میں کافی عرصہ رہے۔ وہ اپنے زمانے کے مقبول ترین گلوکار تھے ان کے گانے آج بھی بہت مشہور ہیں (خاص طور پر فلم درشن کے) ٹیلنٹس گلڈ نے اس وقت ان کے ساتھ شام منائی جب وہ اپنے انتہائی عروج پر تھے۔

۱۹۹۲ء میں آج کے مشہور گلوکار (میاں بیوی) شیلو خان اور مسعود خان کو سب سے پہلے با قاعدہ ایک بڑے پبلک فنکشن میں ٹیلنٹس گلڈ ہی نے متعارف کروایا۔

یہ چیدہ چیدہ پروگرام ہیں۔ ان کے علاوہ افسانوی نشستیں اور موسیقی کی چھوٹی چھوٹی محفلیں بھی اکثر گلڈ منعقد کرتی رہتی ہے۔

آج کے بڑے اور مقبول فنکار ثمینہ پیرزادہ' منظر امام' شیلو خان اور مسعود خان وغیرہ ٹیلنٹس گلڈ ہی کے پلیٹ فارم سے دنیائے فن و ادب میں نمایاں ہوگئے ہیں۔

اب اس تنظیم نے یہ پروگرام بنایا ہے کہ ہر سال ملک کی کسی اہم شخصیت پر ایک دستاویز مرتب کیا کرے۔ جو ان کی پوری زندگی پر محیط ہو۔ یہ دستاویز ایک ضخیم مجلّہ کی صورت میں شائع ہوگی تاکہ عہد حاضر اور مستقبل کے اہل فکر و نظر جان جائیں کہ اس اہم شخصیت نے ادب و فن میں یہ مقام کس طرح حاصل کیا۔ بقول غالب "کیا گزری ہے قطرے پہ گہر ہونے تک" کسی شخصیت کی تعمیر میں جہاں اس کا خون دل اور خون جگر صرف ہوتا ہے وہاں اس کی لگن' خلوص اور مسلسل محنت کو بھی دخل ہے۔

حفیظ جالندھری نے کیا خوب کہا تھا۔

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے　　نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں

موجودہ معاشرے میں "تعلقات عامہ" کے فن نے بڑی مصنوعی شخصیات ہمارے گرد جمع کردی ہیں اب افراد کی باضابطہ "مارکیٹنگ" ہوتی ہے۔ اعزازات' مرتبے اور شہرت خریدی اور بیچی جارہی ہے۔

کسی بھی قوم و ملک کے ادیب' شاعر' صحافی' کھلاڑی مصور اور فن کار اس قوم اور ملک کی شناخت ہوتے ہیں۔ وہ قوم کے مزاج' ثقافت' تہذیب اور شعور کی علامت سمجھے جاتے ہیں اگر اس میں بھی مصنوعی پن آجائے تو پوری قوم سے "اپنے عہد کا اعتماد" اٹھ جاتا ہے۔ اور بالخصوص نئی نسل پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ٹیلنٹ گلڈ نے اسی لئے یہ قدم اٹھایا ہے کہ تاریخ کھوٹے اور کھرے کی پہچان کرسکے۔ خدا کرے ہم اس کوشش میں کامیاب ہوں اور ہم نے جس روایت کا آغاز کیا ہے دوسری انجمنیں بھی اسے آگے بڑھانے میں سرگرم عمل ہوجائیں۔

ٹیلنٹس گلڈ نے اس نئے پروگرام کی ابتداء کے لئے اپنے ملک کی ایک معروف ادبی شخصیت جناب حمایت علی شاعر کو منتخب کیا ہے جو ہمارے عہد کا ایک بڑا نام ہے۔

"شخصیت" کا اولین شمارہ "حمایت علی شاعر نمبر" جناب انور جبیں قریشی نے مرتب کیا ہے۔

انور جبیں قریشی بڑی صلاحیتوں کے آدمی ہیں۔ ریڈیو اور اخبارات (انگریزی) سے بھی جزوی تعلق رکھتے ہیں مگر بحیثیت تدوین کار اس مجلّہ کی ترتیب میں ان کے جوہر کھلے ہیں۔ انہوں نے حمایت علی شاعر کے انٹرویو میں جو سوالات اٹھائے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ کتنے ادبیات اور شخصیت آشنا ہیں۔ انہوں نے حمایت صاحب کی زندگی اور ان کے تخلیقی سفر کا مختلف سمتوں سے جائزہ لیا اور ان کی کثیر الجہت شخصیت کو ایک آئینے میں منعکس کرتے ہوئے "پورا چہرہ" دکھانے کی کوشش کی ہے۔

یہ اعزاز بھی ٹیلنٹس گلڈ کو حاصل ہے کہ انور جبیں قریشی بھی' اسی تنظیم کی معرفت دنیائے فن و ادب میں پہلی بار نمایاں ہورہے ہیں انور صاحب کو اس سلسلے میں کس کس کی معاونت حاصل رہی' وہ "عرض مرتب" میں تفصیل سے بتا چکے ہیں۔ مجھے تو صرف ان مخلص دوستوں' اور ادب دوست تجارتی اداروں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے گلڈ کی اس کوشش کو کامیاب بنایا۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات کے تعاون اور مدد کے بغیر "شخصیت" کا اتنا ضخیم نمبر نکالنا ممکن نہیں تھا۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر　　لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

انور جبیں قریشی

انور جبیں قریشی 7 مارچ 1955ء کو پیدا ہوئے۔ Mass Communication میں ڈبل ایم اے اور LLB کیا۔ حبیب بینک میں وائس پریذیڈنٹ (V.P) ہیں اور گزشتہ ۱۲ سال سے اس کے پبلک ریلیشننگ ڈیپارٹمنٹ میں P.R.O کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ملک کے اردو اور انگریزی اخبارات اور رسائل کے لئے کالم اور مضامین تحریر کرتے ہیں۔ ریڈیو سے خبریں بھی پڑھیں۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس میں پروٹوکول آفیسر کی حیثیت سے کام کیا جو اسلام آباد میں منعقد ہوئی تھی۔ پبلک ریلیشن کے سلسلے میں کئی کورسوں میں شرکت کی۔ پبلک ریلیشن کلب کے جنرل سیکریٹری ہیں۔ آرٹس کونسل آف پاکستان کی ADVISORY کمیٹی کے ممبر ہیں LOBBY N.G.O نامی ایک تنظیم کے صدر ہیں۔

انور جبیں کے اس BIO-DATA کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ ایک محنتی، پڑھے لکھے، ذہین اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ ٹیلنٹس گلڈ کے اس نمبر کو مرتب کرنے کے سلسلے میں انہوں نے اپنی انہی صلاحیتوں سے کام لیا اور ایک خوبصورت نمبر پیش کیا۔

(شفیق الرماں)

عرضِ مرتب

انور جبیں قریشی

ایک بڑے صاحبِ علم، مشہور و معروف شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کوئی دستاویز مرتب کرنا ایک مشکل اور احتیاط طلب کام ہے، اور یہی کام ٹیلنٹس گلڈ کے صدر جناب شفیق الزماں نے جناب حمایت علی شاعر جیسی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں میرے سپرد کیا اور ان پر ایک مکمل اور بھرپور نمبر مرتب کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی۔

حمایت علی شاعر اس عہد کے بہت ہی اہم شاعر، ادیب، محقق، دانشور، براڈکاسٹر، فلمساز اور نغمہ نگار ہیں۔

جناب حمایت علی شاعر کی کثیر الجہات فنی شخصیت تک پہنچنے کے لئے اتنی راہوں سے گزر کر جانا مجھ جیسے کم علم کے لئے ایک مشکل مرحلہ تھا۔ کیونکہ حمایت علی شاعر نے کئی اہم کام کئے ہیں۔ زندگی سے چومکھی لڑائی لڑی، بڑے چیلنجوں کا مقابلہ بڑی جرات مندی سے کیا اور ایک عملی انسان، بڑے شاعر، ادیب اور محقق کی حیثیت سے اپنے عہد کی تمام قد آور شخصیات کے سامنے اپنی ایک مستند حیثیت منوائی اور آج بھی بڑی بُردباری اور توانائی کے ساتھ اپنی اس حیثیت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ بہت کم ادیب اور شاعر ہوتے ہیں جو ادبی اور عوامی دونوں حیثیتوں میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہوں۔ ریڈیو، ٹیلی وژن اور فلم کے حوالے سے آپ کو جو عوامی شہرت حاصل ہے وہ بہت کم دوسروں کے حصہ میں آئی ہے حمایت صاحب نے ادب کے حوالے سے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر جو کام کیا وہ ادب میں بھی ایک مقام رکھتا ہے اور ادب کی دنیا میں ان کی جو کاوشیں، جو تخلیقات ہیں اس کی تو دنیا معترف ہے۔ ذاتی زندگی میں بھی وہ ایک باعمل اور متحرک انسان ہیں۔

مجھے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر یہ نمبر مرتب کرنا تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں ادبی شخصیات پر بڑے اہم، مکمل اور تاریخی نمبر مرتب ہوئے ہیں جو ہماری ادبی تاریخ کا ایک سرمایہ ہے، ایک مستند دستاویز ہے۔ ادبی دنیا کی اس فضا میں حمایت علی شاعر پر اس نوعیت کا ایک ایسا نمبر مرتب کرنا کہ وہ بھی تاریخی اہمیت کی دستاویز بن جائے اور مستقبل کے محققین کے لئے ایک اہم وسیلہ ثابت ہو، میرے لئے ایک چیلنج اور امتحان تھا۔ بہرحال میں نے اپنی مقدور بھر کوشش کی ہے، بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ معلوماتی مواد حاصل کرکے اس نمبر میں شامل کیا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ملک کے بڑے اور بزرگ اہل قلم بالخصوص ہم عصر ادیبوں کی نگارشات جو جناب حمایت علی شاعر پر ہیں جن میں مضامین، تنقیدی، تبصرے اور خطوط شامل ہیں اس نمبر کی زینت بنیں (میں ان تمام اہل قلم کا شکرگزار ہوں جن کی تحریریں اس نمبر میں شامل ہیں) اس کے علاوہ میں نے کوشش کی ہے کہ جناب حمایت علی شاعر کی چیدہ چیدہ تخلیقات، منظوم سوانح عمری (جو ادب میں بذات خود ایک نیا تجربہ ہے) منظوم تمثیل، غنائیے، مختصر نظمیں، ثلاثیاں، غزلیں، قومی نغمے، فلمی گیت اور نادر تصاویر کو اس نمبر میں سمیٹ سکوں۔ اس کے علاوہ اس خیال سے کہ کوئی بات رہ نہ جائے میں نے ایک طویل انٹرویو بھی جناب حمایت علی شاعر صاحب سے لیا جو شاملِ اشاعت ہے۔

اپنی اس سعی و کاوش کے دوران جن محترم حضرات نے اس خاص نمبر کی تکمیل میں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا ان میں محترم نکہت بریلوی، ٹیلنٹس گلڈ کے صدر شفیق الزماں اور حمایت صاحب کے فرزند اوج کمال (جو خود بھی ایک بڑے اہم اور مقبول ادبی ماہنامہ ''دنیائے ادب'' کے مدیر اعزازی ہیں)، شامل ہیں۔ میں ان سب کا ممنون ہوں۔ ان حضرات کے تعاون، مشوروں اور رہنمائی کے بغیر میرے لئے یہ نمبر مرتب کرنا ممکن نہ تھا۔

زبیرالدین

ٹیلنٹس گلڈ کے جنرل سیکریٹری ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے مقبول اور سینئر نیوز کاسٹر ہیں گزشتہ ۲۵ سال سے خبریں پڑھ رہے ہیں۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ٹیلنٹس گلڈ میں ان کی موجودگی بڑی معاون اور مددگار ہے۔

اختر عادل

ٹیلنٹس گلڈ کے پروگرام آرگنائزر ہیں۔ PTA میں پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ اس سے قبل پاکستان ٹیلی ویژن میں بھی پروڈیوسر تھے۔ بڑے فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ پروگراموں کو ترتیب دینے سے لے کر پایہ تکمیل تک کامیابی سے پہنچانے میں انہیں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ ٹیلنٹس گلڈ میں ان کی موجودگی بڑی اہم اور مفید ہے۔

محمد ایوب

نیشنل بینک میں آفیسر ہیں۔ فیلینشن گلڈ کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسٹیج کے بہت معروف آرٹسٹ ہیں اور گزشتہ ۲۵ سال سے اس شعبے سے وابستہ ہیں۔ فیلینشن گلڈ کے زیر اہتمام ہونے والے تمام ڈراموں کی ڈائرکشن بھی کرتے ہیں۔ فیلینشن گلڈ میں ان کی موجودگی بڑی فعال ہے۔

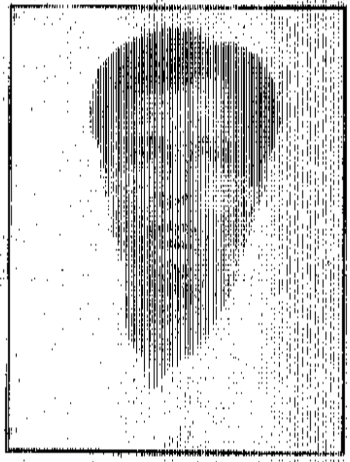

شاہد معین فاروقی

فیلینشن گلڈ کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں ۔ PSO میں PRO ہیں۔ میوزک سے ان کو بڑی دلچسپی ہے۔ خود بھی بہت اچھا گاتے ہیں۔ فیلینشن گلڈ کے تمام میوزک کے پروگرام ان کی زیر نگرانی منعقد ہوتے ہیں۔ جو بہت کامیاب اور فیلینشن گلڈ کی شناخت بن جاتے ہیں۔

اختر علیم سید

جامعہ معاون مدیر ہیں۔ N.D.E.C کے وائس پریذیڈنٹ (V.P) ہیں۔ اچھے شاعر ہیں۔ اس مجلہ کو ترتیب دینے میں انہوں نے فیلینشن گلڈ اور انور شیخ کی بڑی معاونت کی ہے اور بڑی خوش اسلوبی سے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

ترتیب

۱ لہو کا رشتہ ازل اور ابد کا رشتہ ہے ۱۲

۲ روئیں ہے رخشِ عمر (Bio-Data) ۱۳

۳ حمایت علی شاعر سے ایک طویل ملاقات........ انور جبیں قریشی ۱۷

۴ آئینہ در آئینہ (منظوم خود نوشت سوانح حیات ۲ حصے) ۲۵

۵ خود نوشت دیباچے (اپنی کتابوں پر) ۳۹–۷۴

آگ میں پھول (۳۹) تشنگی کا سفر (۵۸) مٹی کا قرض (۶۴)

ہارون کی آواز (۶۵) حرف حرف روشنی (۷۱) شیخ ایاز (۷۲) شخص و عکس (۷۳)

۶ مکتوبات (۱) ۷۵–۹۴

بابائے اردو۔ نیاز فتح پوری (۷۷) اثر لکھنوی۔ خواجہ غلام السیدین۔ حفیظ جالندھری (۷۸) ڈاکٹر محمود حسین (۷۹)

احسان دانش (۸۰) مخدوم محی الدین۔ پروفیسر احتشام حسین۔ احمد ندیم قاسمی (۸۱) ڈاکٹر وزیر آغا (۸۴) محشر بدایونی۔

سری نواس لاہوٹی (۸۶) اختر الزماں ناصر (۸۷) شانتی رنجن بھٹاچاریہ (۸۸) پروفیسر ڈاکٹر حبیب الحق ندوی (۹۰)

(ایک غلط فہمی کا ازالہ) شان الحق حقی اور حمایت علی شاعر (۹۴)

۷ تبصرے۔ مطالعے ۹۵–۱۵۸

آگ میں پھول۔ سجاد ظہیر (۹۵) سید سبط حسن (۹۶) ماہر القادری (۹۷) ڈاکٹر مغنی تبسم (۱۰۰)

مٹی کا قرض۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ (۱۰۳) احمد ندیم قاسمی (۱۰۵) امجد اسلام امجد (۱۰۸) شہزاد احمد (۱۱۲) سید نجم الحسن رضوی (۱۱۴)

ہارون کی آواز۔ مسعود قریشی (۱۱۹) شبنم رومانی (۱۲۱) میر مجاہد علی (۱۲۴)

حرف حرف روشنی۔ ڈاکٹر سیفی پریمی (۱۲۹) مخمور سعیدی (۱۳۲) بدر اورنگ آبادی (۱۳۳) ؟ (۱۳۵)

شخص و عکس۔ مرزا ادیب (۱۳۸) اختر حسن (۱۳۹) پروفیسر نظیر صدیقی (۱۴۱) ادیب سہیل (۱۴۴) ڈاکٹر امانت شیخ (۱۴۵)

شیخ ایاز۔ یوسف ناظم (۱۴۸) شیخ عزیز (۱۵۰)

Flower in Flames۔ یوسف ناظم (۱۵۱) ـــــ بنگال سے کوریا تک۔ محمد تقی (۱۵۴) اشاعتی حوالے (۱۵۷)

۸ انتخاب کلام۔ نکہت بریلوی ۱۶۱–۱۷۶

۹ تاثرات ۱۷۷–۱۸۴

فیض احمد فیض (۱۷۷) رئیس امروہوی (۱۷۸) مرزا ادیب (۱۷۹) ادا جعفری (۱۸۰) اختر الزماں ناصر (۱۸۴)

۱۰ شعری ادب میں تجربے ۱۸۵_۱۸۷

ایک مصرعہ ایک نظم۔ ایک تصویری نظم۔ ایک اضافی بحر۔ ایک رنگی غزل۔ بنتی گئی کہانی (ایک ڈرامہ۔ چار ادیب)

شکست کی آواز۔ ایک کرداری تمثیل (منظوم) ایک تمثیلی نظم

۱۱ شکست کی آواز۔۔ ایک کرداری تمثیل۔۔ (منظوم) ۱۸۸

۱۲ مقالات ۲۰۱_۲۸۹

احمد ہمدانی (۲۰۱) ڈاکٹر مجیب الاسلام (۲۰۹) ڈاکٹر ارتکاز افضل (۲۲۳) پروفیسر سجاد حارث (۲۲۹) پروفیسر آفاق صدیقی (۲۳۷)
پروفیسر سحر انصاری (۲۴۳) نکہت بریلوی (۲۴۹) مظفر ملاٹھوی (۲۵۵) پروفیسر عطاء الرحیم (۲۵۸) عثمان عرفانی (۲۶۸)
شاہدہ حسن (۲۷۵) نجمہ خان (۲۷۹) اثر فاروقی (۲۸۷)

۱۳ حرفِ تحسین ۲۹۰_۲۹۴

راغب مراد آبادی۔ احمد رئیس۔ علی آذر۔ رشیدہ عیاں۔ کشور غنی۔ دستگیر غازی۔ حکیم اورنگ آبادی

۱۴ تجزیاتی مطالعہ (نظم۔ تضاد) ۲۹۵_۳۰۵

مجید امجد (۲۹۶) انجم رومانی (۲۹۷) خلیل الرحمان اعظمی (۲۹۷) جمیل ملک (۳۰۱) محمد منور (۳۰۳) حمایت علی شاعر (۳۰۴)

۱۵ مکتوبات (۴) ۳۰۶_۳۲۶

واجدہ تبسم (۳۰۶) احمد فراز۔ مصطفیٰ زیدی (۳۰۸) قمر اجنالوی۔ ساقی فاروقی (۳۰۹) عاشور کاظمی (۳۱۰)
ڈاکٹر ملک زادہ منظور (۳۱۱) حامدی کاشمیری۔ پروفیسر نظیر صدیقی (۳۱۲) عاصی کرنالی (۳۱۳) عزیز قیسی (۳۱۴)
پروفیسر راجندر سنگھ ورما (۳۱۵) پروفیسر لطیف الزماں خاں (۳۱۷) پروفیسر اکبر رحمانی (۳۱۸) عمران الارشد (۳۲۱)
جمشید مسرور (۳۲۲) نایاب حسین (۳۲۴) ممتاز احمد خان (۳۲۵)

۱۶ بدلتے زاویے (ایک غنائی تمثیل) ۳۲۷

۱۷ شخص و شاعر ۳۳۳_۳۸۴

مسلم ضیائی (۳۳۳) مرزا ظفر الحسن (۳۳۸) انور عنایت اللہ (۳۴۰) ڈاکٹر انور معظم (۳۴۴) نکہت بریلوی (۳۴۸)
نور الحسنین (۳۵۲) قمر اقبال (۳۵۶) پروفیسر عبد القوی ضیاء (۳۶۰) ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی (۳۷۲) مرزا سلیم بیگ (۳۷۷)

۱۸ بیگم حمایت علی شاعر (ایک گفتگو۔ شائستہ فرحت) ۳۸۵

۱۹ حمایت علی شاعر کے خطوط۔ ۳۸۹_۴۵۱

مرزا ادیب کے نام (خلیل الرحمان اعظمی ۳۸۹) اختر انصاری اکبر آبادی کے نام (سلیم احمد کی جنسی شاعری اور سندھ میں
ادبی خدمات ۳۹۳) ایڈیٹر "اخبار جہاں" کے نام (فیض کا متنازعہ شعر۔ ۴۰۰) اعجاز راہی کے نام (زبان اور اہل زبان ۴۰۳)
ایڈیٹر "اورنگ آباد ٹائمز" کے نام) حمایت علی شاعر نمبر ۴۰۶ مجتبیٰ حسین کے نام (عالمی اقبال سیمینار۔ ۴۰۸)

اظہار جستجو کے نام (جشن احمد ندیم قاسمی۔ عرب امارات ۲۰۰۵ء)

ایڈیٹر "جواز" کے نام (ہومیوڈی کانفرنس ۴۱۰) علی احسن اور فضل شہاب الدین کے نام (ایشین پوئٹری فیسٹیول۔ ڈھاکہ ۴۱۴) صہبا لکھنوی (مختلف ممالک میں ادبی سرگرمیاں۔ ۴۲۱) پروفیسر ریاض صدیقی کے نام (علامہ اقبال۔ مولانا مودودی اسلامی سیاسی تحریکات۔ ۴۲۱) ایڈیٹر "ادب لطیف" کے نام (مختلف ممالک میں ادبی سرگرمیاں ۴۲۹) ایڈیٹر "کتاب نما" کے نام (جوش۔ فیض اور رشید حسن خاں ۴۳۴) پروفیسر حمید الدین شاہد کے نام (مشاہیر دکن کی وفات ۴۳۸) ایڈیٹر "منشور" کے نام (کلام اقبال کی پیروڈیاں۔ امریکہ میں جشن کیفی اعظمی ۴۴۱) اظہر جاوید کے نام (علامہ اقبال۔ شیخ ایاز۔ ڈاکٹر صبیحہ صبا۔ ۴۳۵) ایڈیٹر "تجدید نو" کے نام (تقلیدی ذہن ۴۳۸)

۴۰ ریڈیو، ٹیلی وژن اور فلم ۴۵۴-۵۰۶

○ نغموں اور گیتوں کی علاوہ غنائیے، منظوم و منثور، (طبع زاد) ڈرامے، لوک کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل اور اسٹیج ڈرامے

○ عقیدت کا سفر (نعتیہ شاعری کے سات سو سال۔ ۴۵۴) خوشبو کا سفر (علاقائی زبانوں کے شعراء کا اردو کلام۔ پانچ سو سال۔ ۴۵۷) غزل اس نے چھیڑی (اردو غزل کے سات سو سال۔ ۴۶۴)

○ حمایت علی شاعر کی فلمی شاعری۔ زخمی کانپوری (۴۱۸) مقبول فلمی نغمے (۴۷۳) اور بھی غم ہیں (۴۷۳) حمایت علی شاعر سے ایک گفتگو۔ بشیر نیاز (۴۷۴) (۱۹۶۴ء کا بہترین گیت۔ فلمی شاعری اور میں۔ ایک ادبی نظم کی غنائی شکل) واویلا (ایک طنزیہ نظم۔ حمایت علی شاعر) ۴۸۵۔ سیر کے واسطے تھوڑی سے فضا اور سہی۔ حمایت علی شاعر (ہم خیال اشعار کا تاریخی مطالعہ (۴۸۷) الیاس رشیدی کے نام (حمایت علی شاعر کا بمبئی سے خط (۴۹۴) منتخب فلمی نغمے (۴۹۷) قومی نغمے (۵۰۴)

۴۱ ابتدائی تحریریں ــــ (۱۹۴۵ء تا ۱۹۵۰ء) ۵۰۷-۵۲۰

فلسفہ اور حقیقت (افسانہ) تاج کے زیر سایہ (افسانہ) تقدیر (نظم) بدلتے زاویئے (افسانہ) اختر حسین لے ایک دانشور)

اختر حسین

۴۲ حمایت علی شاعر تصویری البم ۵۲۹-۵۶۰

۴۳ انگریزی مضامین ۵۶۱-۶۲۶

یونس احمر۔ پروفیسر عبدالقوی ضیاء۔ پروفیسر اظہر قادری۔ پرکاش چندر۔ نسیم سیماب (دیباچے) یونس احمر۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی پروفیسر نسیم نیشو فوز (تبصرے) اکرام بریلوی۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی ۔ حمایت علی شاعر (انٹرویو) حمیرا اشفاق

○

میں تو یوں چپ ہوں کہ آئے نہ ترے ذوق پہ حرف
جو سخن فہم ہے، غالب کا طرفدار بھی ہے

لہو کا رشتہ ازل اور ابد کا رشتہ ہے
یہ آدمی کی دوئی میں احد کا رشتہ ہے

نام	**حمایت علی شاعر**
والد کا نام	**سید تراب علی**
والدہ کا نام	۱۔ لطف النساء بیگم (مرحومہ)
دوسری والدہ کا نام	۲۔ حور النساء بیگم
بہن بھائی	(چار بھائی دو بہنیں)
	۱۔ میر عنایت علی' بی ای (سول)
	۲۔ میر مجاہد علی' ایم اے (معاشیات) ایم اے (ادبیات) (پی ایچ ڈی) مقالہ زیر تحریر
	۳۔ فرزانہ لیاقت علی' ایم ایس سی' بی ایڈ
	۴۔ ڈاکٹر شوکت شعور' ایم اے (سیاسیات) پی ایچ ڈی (جماعت اسلامی کا سیاسی کردار)
	۵۔ میر آصف علی' بی اے' ایل ایل بی' (ایڈووکیٹ)
	۶۔ شاہین اقبال' ایم اے (انگریزی ادبیات)
اولاد	**(چار بیٹے۔ چار بیٹیاں)**

۱۔ جاوداں میر۔ ایم۔ اے (اسلامیات) اس کے علاوہ عربی اور سندھی زبان کا ایک سالہ سرٹیفیکٹ کورس
۲۔ روشن خیال۔ ایم۔ اے (ادبیات) ایم۔ اے صحافت)
۳۔ فروزاں علی۔ ایم اے (سیاسیات) بی۔ ایڈ۔۔۔ ایل ایل بی
۴۔ غزالاں حمایت۔ ایم اے (تعلیم) ایم۔ ایڈ
۵۔ اوج کمال۔ ڈپلومہ (میکنیکل) ایم۔ اے (صحافت) ایم۔ اے (بین الاقوامی تعلقات) فرسٹ کلاس فرسٹ
کتابیں ۱۔ پاکستان میں ٹیلی ویژن صحافت (انگریزی سے ترجمہ) ۲۔ فن تحقیق (برائے طلباء)
ادارت' مدیر اعزازی (ماہنامہ دنیائے ادب)
۶۔ ذوالجمال۔ ایم۔ ایس۔ سی (ریاضیات) F.O.O (فلائٹ آپریشن آفیسر) لائسنس یافتہ (سول ایوی ایشن) F.A.A (امریکہ)
۷۔ ڈاکٹر بلند اقبال۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (ڈاؤ میڈیکل کالج) F.C.F.M.G (امریکہ)
۸۔ زر افشاں سید۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (سال آخر) سندھ میڈیکل کالج

رو میں ہے رخشِ عمر

خاندانی نام	میر حمایت علی
ادبی نام	حمایت علی شاعر
پیدائش	(میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق) ۱۴ جولائی ۱۹۲۶ء خاندانی یادداشت۔ ۳۰-۱۹۲۹ء
مقام	اورنگ آباد (دکن)
تعلیم	ایم اے (سندھ یونیورسٹی)
شادی	۱۴ فروری ۱۹۴۹ء
شریکِ حیات	معراج نسیم
تعلیم	ادیب فاضل
اولاد	(چار بیٹے ۔ چار بیٹیاں)

اعزازات

۱۔ صدارتی ایوارڈ ۔ آگ میں پھول ۔ ۱۹۵۹ء
۲۔ نگار ایوارڈ (بہترین نغمہ نگار) فلم ۔ آنچل ۱۹۶۲ء
۳۔ نگار ایوارڈ (بہترین نغمہ نگار) فلم ۔ دامن ۱۹۶۳ء
۴۔ آدم جی ادبی ایوارڈ (رائٹرز گلڈ) مٹی کا قرض ۱۹۷۴ء
۵۔ عثمانیہ گولڈ میڈل (بہادر یار جنگ ادبی کلب) ۱۹۸۷ء
۶۔ نقوش ایوارڈ (لاہور) ۱۹۸۷ء
۷۔ نگار ایوارڈ (عقیدت کا سفر ٹی وی پروگرام) ۱۹۸۸ء
۸۔ مخدوم محی الدین عالمی اردو ایوارڈ (عالمی اردو کانفرنس دہلی) ۱۹۸۹ء
۹۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ (اکادمی ادبیات) ہارون کی آواز (ایوارڈ کا اعلان ۱۹۹۱ء میں کیا گیا)
۱۰۔ ہندی اردو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ (لکھنؤ) "ادبی خدمات کا اعتراف" ۱۹۹۱ء
۱۱۔ ایوارڈ برائے اعلیٰ کارکردگی (ریڈیو پاکستان حیدر آباد) ۱۹۹۳ء

نوٹ : حیدر آباد میں ایرانی تقویم رائج تھی جو ریاست کے Fall ، یعنی ۱۹۴۸ء تک چلتی رہی حمایت صاحب نے میٹرک ۱۹۵۱ء میں پاس کیا تھا پاکستان آنے کے بعد (۱۹۵۱ء) اردو کالج کراچی میں داخلے کے لئے جب انڈیا سے سند منگوائی گئی تو اس پر صرف ۱۴ جولائی ۱۹۲۶ء لکھا ہوا تھا جبکہ "مطابق فصلی سنہ" بھی تحریر ہونا چاہیئے تھا۔ حمایت صاحب نے اس پر غور نہیں کیا اور اسی کو درست سمجھ لیا چنانچہ ۱۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو سندھ یونیورسٹی سے ریٹائر کردیئے گئے جبکہ انکے بیشتر "کلاس فیلو" ۹۱-۱۹۹۰ء میں ریٹائر ہوئے (مرتب)

۱۲۔ موحد ثلاثی ایوارڈ۔ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ (شکاگو) ۱۹۹۳ء
۱۳۔ وثیقۂ اعتراف۔ ہمدرد فاؤنڈیشن۔ ۱۹۹۴ء
۱۴۔ لائف لانگ لیٹریری اچیومنٹس۔ (ایسٹرن آرٹ فورم۔ نیو جرسی) ۱۹۹۴ء

Award of life long literary

achivement. Eastern arts forum 1994.

By. Mayor Peter Canto. New Jersey (U.S.A)

۱۵۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں امریکہ کی اعزازی شہریت

Honorary Citizen of Boling Brook

by Mayor Roger C. Clear (Chicago) U.S.A)

تدریس ۱۔ سچل کالج (حیدر آباد سندھ) ۶۳ء
۲۔ سندھ یونیورسٹی اکتوبر ۱۹۷۷ء تا جولائی ۱۹۸۶ء
۳۔ بیجنگ یونیورسٹی (عوامی جمہوریہ چین) میں مرکزی
وزارت تعلیم پاکستان کی طرف سے تقرر۔ مگر طبیعت کی ناسازی کے سبب معذرت چاہ لی

صحافت روزنامہ جناح' منزل اور ہمدرد (حیدر آباد دکن) ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۰ء

ادارت ساز نو (حیدر آباد دکن) ۱۹۴۹ء
شعور (حیدر آباد سندھ) ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۷ء
صریر خامہ (سندھ یونیورسٹی) اقبال نمبر ۱۹۷۷ء نعت نمبر ۱۹۷۸ء

ثقافت (ارژنگ کے زیر اہتمام)
۱۔ (نظم) بنگال سے کوریا تک (ٹیبلو کے انداز میں سندھ یونیورسٹی کے اسٹیج پر پیش کی گئی) ۱۹۵۹ء
۲۔ تمثیل۔ اندھیرے اجالے (مکالمے۔ اور ہدایات حمایت علی شاعر) ۱۹۵۹ء میں اسٹیج کیا گیا

ریڈیو دکن ریڈیو' آل انڈیا ریڈیو (حیدر آباد) ۴۷ء تا ۵۰ء
ریڈیو پاکستان' (کراچی' حیدر آباد سندھ) ۵۱ء تا ۶۲ء

ٹیلی وژن لاہور' کراچی۔ اسلام آباد (مختلف سلسلہ وار پروگرام) ۶۷ء تا ۸۹ء
۱۔ غزل اس نے چھیڑی (اردو غزل کے سات سو سال) ۱۹۷۴ء
۲۔ کسوٹی (ذہنی آزمائش کا پروگرام) ۱۹۷۷ء
۳۔ خوشبو کا سفر (علاقائی زبانوں کے شعراء کا اردو کلام۔ پانچ سو سال) ۱۹۸۸ء
۴۔ عقیدت کا سفر (اردو نعتیہ شاعری کے سات سو سال) ۱۹۸۸ء
۵۔ لب آزاد (احتجاجی شاعری کے چالیس سال) ۹۰-۱۹۸۹ء

(۱۹۹۶ء)

۶۔ عقیدت کا سفر (پاکستان میں نعتیہ شاعری) جاری ہے
۷۔ محبتوں کے سفیر (سندھی شعراء کا اردو کلام۔ ۵۰۰ سال) جاری ہے
۸۔ نشید آزادی (تحریک آزادی میں اردو شاعری کا حصہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک)
پاکستان کے پچاس سالہ جشن آزادی پر یکم اگست تا ۱۴ اگست ۱۹۹۷ء سے یہ غنائی پروگرام پیش کیا جائے گا۔

فلم
(بے شمار فلموں کے نغمات، مکالمے اور منظر نامے)
۱۔ بحیثیت نغمہ نگار پہلی فلم۔ "آنچل" ۱۹۶۲ء
۲۔ بحیثیت منظرنامہ و مکالمہ نگار پہلی فلم "تصویر" ۱۹۶۵ء
۳۔ بحیثیت فلم ساز پہلی فلم۔ "لوری" ۱۹۶۶ء
۴۔ بحیثیت فلم ساز و ہدایت کار پہلی فلم "گڑیا" ۔ ۱۹۷۳ء

اعترافات
۱۔ روزنامہ "اورنگ آباد ٹائمز" (حمایت علی شاعر نمبر) ۲ جون ۱۹۸۵ء، اورنگ آباد مہاراشٹر
۲۔ روزنامہ "کلیم" (سکھر) ۱۰ اگست ۱۹۸۷ء (گوشہ حمایت علی شاعر)
۳۔ ماہنامہ "طلوع افکار" (کراچی) جولائی ۱۹۹۵ء (گوشہ حمایت علی شاعر)
۴۔ سہ ماہی "مجلہ عثمانیہ" (کراچی) اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء (گوشہ حمایت علی شاعر)

اختلافات
۱۔ احوال واقعی (مرتب) مرزا سلیم بیگ (حیدر آباد سندھ میں "ادبی سیاست" تاریخی احوال ۱۹۹۴ء)
۲۔ چراغ بکف (زیر طبع) (کراچی میں "ادبی سیاست" کا تاریخی احوال۔ ایک دستاویز)

(تصنیفات)
شاعری
۱۔ آگ میں پھول (نظمیں، غزلیں، رباعیات) ۱۹۵۶ء
۲۔ مٹی کا قرض (ثلاثیاں۔ نظمیں۔ غزلیں) ۱۹۷۴ء
۳۔ تشنگی کا سفر (طویل افسانوی و تمثیلی نظمیں) ۱۹۸۱ء
۴۔ ہارون کی آواز (نظمیں۔ غزلیں۔ ہائیکو) ۱۹۸۵ء
۵۔ حرف حرف روشنی (انتخاب) ۱۹۸۶ء

نثر
۱۔ شیخ ایاز (جدید سندھی ادب کا عہد آفریں شاعر) ۱۹۷۸ء
۲۔ عکس و عکس (تنقیدی مقالات و مباحث) ۱۹۸۴ء
(ان کتابوں کے ہندوستانی ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں)

(تراجم)
"بنگال سے کوریا تک"
(عالمی امن کے موضوع پر لکھی ہوئی طویل افسانوی نظم کے مختلف لسانی روپ)

۱۔ Flower in Flames (ترجمہ) پروفیسر راجندر سنگھ ورما' پنجاب یونیورسٹی' پٹیالہ
۲۔ Flute and Bugle (ترجمہ) پرکاش چند' ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا' لکھنؤ۔ انڈیا
۳۔ گل باہمہ (سندھی ترجمہ) ام۔ عالمانی' حیدر آباد سندھ
۴۔ بنگال سے کوریا تک (ہندی) پروفیسر جی این نداف' ابوالکلام آزاد کالج۔ اورنگ آباد
۵۔ (تلگو) ڈاکٹر وسرتی۔ حیدر آباد دکن (آندھرا پردیش)

Every word Aglow

(حرف حرف روشنی' کا انگریزی ترجمہ پروفیسر راجندر سنگھ ورما)

شبد شبد پرکاش (ہندی) قاضی رئیس

حمایت علی شاعر جا ڈرامہ (سندھی تراجم)

۱۔ مفاصلہ۔ رشید احمد لاشاری ۲۔ دشمن آساں پہنجو۔ ایم۔ بی۔ انصاری
۳۔ واچوڑو (بگولا) ممتاز مرزا ۴۔ برزخ۔ محمد اسحاق پیر سرہندی

(زیر طبع)

۱۔ ثلاثی (ایک نئی صنف سخن)
۲۔ اپنے پرچم تلے (قومی نغمے اور غنایئے)
۳۔ سرگم (گیت اور نغمے)
۴۔ فاصلے (ریڈیائی ڈرامے۔ منظوم و منثور)
۵۔ مہران موج (سندھ کی لوک کہانیوں کا تمثیلی روپ۔ منظوم و منثور)
۶۔ کچھ پیش رو' کچھ ہم سفر (تنقیدی مطالعے)
۷۔ میرے بزرگ' میرے دوست (تنقیدی مطالعے)
۸۔ چاند کی دھوپ (تازہ کلام)
۹۔ عقیدت کا سفر (اردو نعتیہ شاعری کے سات سو سال)
۱۰۔ خوشبو کا سفر (علاقائی زبانوں کے شعراء کا اردو کلام۔ پانچ سو سال)
۱۱۔ لب آزاد (پاکستان میں احتجاجی شاعری کے ۵۰ سال)
۱۲۔ حرف بہ حرف (کلیات۔ حمایت علی شاعر)

سیاحت

امریکہ' کینیڈا (تقریباً تمام ریاستیں) یورپ (انگلینڈ' ناروے' سویڈن وغیرہ) افریقہ (جنوبی افریقہ اور بوٹسوانا وغیرہ) چین' عرب ممالک (سعودی عرب' کویت' مسقط' دوحہ' قطر' بحرین اور عرب امارات) ہندوستان' بنگلہ دیش اور موریشس وغیرہ

حمایت علی شاعر سے ایک طویل ملاقات

انور جبیں قریشی

بڑے دنوں سے میری خواہش تھی کہ حمایت علی شاعر صاحب سے ایسی گفتگو ہو' جو ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کرلے۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ادب و فن سے لے کر زندگی تک انہوں نے مختلف شعبوں میں کام کیا ہے۔ وہ نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی محنت سے بھی گزرے ہیں۔ وہ بلاشبہ ایک سیلف میڈ (Self Made) آدمی ہیں۔

انور جبیں :۔ حمایت صاحب! پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے وقت دیا اور مجھ سے ایسی گفتگو پر آمادہ ہوئے جس کا ذکر میں نے آپ سے ٹیلیفون پر کیا تھا۔

حمایت علی شاعر :۔ انور جبیں صاحب! مجھے بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ آپ نے میری ذات اور میری ادبی خدمات میں دلچسپی لی حالانکہ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

انور جبیں :۔ وہ بھی نظر میں ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ نے کہا تھا

مری متاعِ سخن ہے تمہارا سرمایہ
اسے سنبھال کے رکھنا متاعِ جاں کی طرح

تو نہ صرف آپ کی متاعِ سخن بلکہ آپ کی "متاعِ حیات" کو بھی ہم اپنی "متاعِ جاں" سمجھتے ہوئے' اسے سنبھال کر رکھنا چاہتے ہیں۔

حمایت علی شاعر :۔ خوب' آپ کا مزید شکریہ۔ مگر...... سنا ہے' آپ بڑے "خطرناک" سوالات کرتے ہیں۔

انور جبیں :۔ (ہنستے ہوئے) خطرناک تو نہیں البتہ...... میر صاحب کا یہ شعر تو آپ نے بھی سنا ہوگا..... ہر شاعر پر صادق آتا

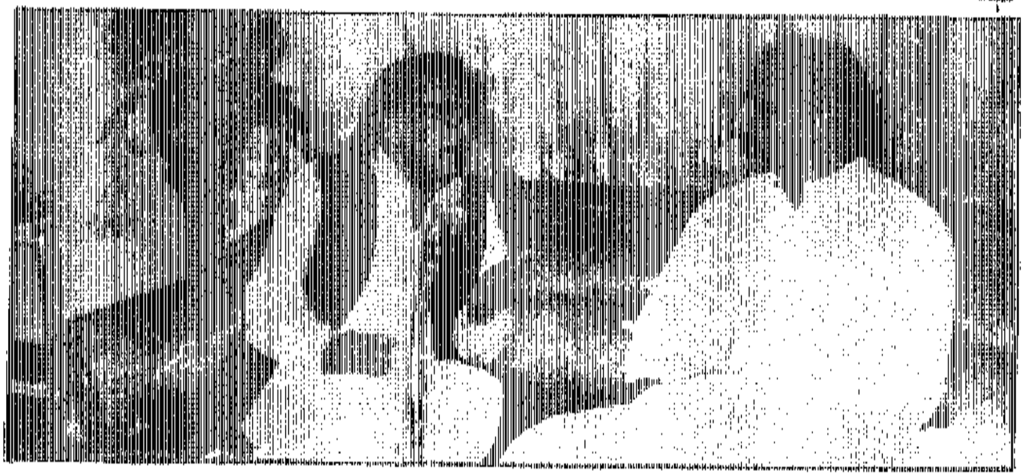

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

حمایت علی شاعر :۔ ہاں صاحب' سنا کیا..... پڑھا ہے۔ یقیناً "شاعر شعر کے پردے میں اپنی روداد محفوظ کرتا ہے۔
انور جبیں :۔ میں اسی "شعر کے پردے" کو اٹھانا چاہتا ہوں۔ شاعر استعاروں اور کنایوں میں...... بڑی بڑی حقیقتیں چھپا جاتا ہے۔
حمایت علی شاعر :۔ چھپاتا نہیں' بیان کرتا ہے۔ شاعر اپنے عہد کی ناگفتہ صداقتوں کو گفتنی بنادیتا ہے۔
انور جبیں :۔ آج کی گفتگو کا مقصد بھی یہی ہے۔ "وہ سخن ہائے گفتنی" جو..... خوف فساد خلق سے.........
حمایت علی شاعر :۔ (ہنستے ہوئے) اب ناگفتہ نہیں رہے۔ آپ جیسے لوگ موجود ہیں تو کوئی سچائی پردہ پوش نہیں رہے گی....... بسم اللہ
انور جبیں :۔ میں آپ سے ایسا کوئی سوال نہیں کروں گا کہ آپ کب پیدا ہوئے اور کہاں؟ اور کب تک جینے کا ارادہ رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ (دونوں ہنستے ہیں)
ہاں صاحب' بقول حافظ

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

شاعر یا فن کار کی زندگی' انفاس کی پابند نہیں ہوتی۔ میر اور غالب تو بہت بڑے لوگ ہیں۔ ہمارے درمیان وہ شاعر بھی زندہ ہے جس نے یہ شعر کہا ہے۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے' مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ویسے یہ شعر ہے کس کا؟
حمایت علی شاعر :۔ میاں داد سیاح کا...... غالب کے شاگرد تھے۔
انور جبیں :۔ ماشاء اللہ' تو شاعر و فن کاریوں زندہ رہتے ہیں۔ ویسے آپ کا Bio-Data سامنے ہے۔ ولادت سے لے کر لمحہ موجود تک ساری باتیں تاریخ وار نمایاں ہیں۔ اسے پڑھ کر میرے دل میں جو سوالات پیدا ہوئے۔ ان میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ آپ جو ایک آدمی ہیں' بہ یک وقت کتنے آدمی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں؟
حمایت علی شاعر :۔ میں پھر عرض کروں گا..... چھپائے ہوئے نہیں' بلکہ ظاہر کئے ہوئے۔
انور جبیں :۔ نہیں صاحب' خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ابھی خدا جانے کیا کچھ ظاہر ہونا باقی ہے۔ میرا خیال ہے' آدمی آخری لمحے تک ظاہر ہوتا رہتا ہے۔
حمایت علی شاعر :۔ یہ تو آپ نے فلسفیانہ تاویل کی ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی ذات میں کئی گوشے رکھتا ہے اور اپنی بساط بھر انہیں دریافت کرنے اور نمایاں کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

انور جبیں :۔ مگر یہ ہر آدمی کی فطرت ایسی نہیں ہوتی۔ وہ عموماً ایک یا دو پہلو رکھتا ہے۔

حمایت علی شاعر :۔ شاعر اور فن کار کی شخصیت ایک ایسے بلور سی ہوتی ہے جو ہر زاویے سے دعوتِ دید دیتا ہے۔ وہ اپنے تخلیقی جوہر کو نت نئے انداز میں آزماتا ہے۔ اس کا وسیلہ اظہار الفاظ ہیں۔ چنانچہ الفاظ کے جتنے معتبر پیرایے ہیں شاعر ان پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

انور جبیں :۔ یہ تو آپ نے ٹھیک کہا' لیکن ہم کو ان کے محرکات پر بھی نظر رکھنا چاہیئے جہاں تک مجھے علم ہے' آپ نے پہلے افسانے لکھے' پھر شاعری کی..... کبھی کبھی ہلکے پھلکے مضامین بھی لکھے۔ آپ ہی کی لائبریری میں حیدر آباد دکن کے ہفتہ وار "پرواز" کی فائل دیکھ رہا تھا۔ اس میں "میں امن چاہتا ہوں" اور "باپو کے نام" جیسے "اظہاریے" بھی نظر سے گزرے۔ یہ سنہ ۱۹۵۰ء کے شمارے ہیں۔ آپ کی کہانیاں بھی آپ کی ابتدائی شاعری کی طرح "سوچتی" ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ مثلاً" ۱۹۴۳ء کے رسالے "سویرا" (حیدر آباد دکن) میں آپ کی نظم "تقدیر"..... میرا مطلب ہے' دل کی واردات کا کوئی عکس نہیں ملا۔

حمایت علی شاعر :۔ (ہنستے ہوئے) جس واردات کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں اس وقت تک ایسا کوئی سانحہ ہوا ہی نہیں تھا جس کی ترجمانی میر صاحب نے کی ہے۔

انور جبیں :۔ اچھا وہ........

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

ہاں صاحب سنا ہے۔ شاعری کی "جنم بھومی" ہے دل........ عشق کی آماجگاہ۔

حمایت علی شاعر :۔ یہ بہت بڑا لفظ ہے بلکہ بہت بڑا تجربہ۔ اس میں مجازی سے حقیقی تک سفر کرنا پڑتا ہے اور بقول اختر الایمان

"کون ستارے چھو سکتا ہے' راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

ہم نے بہت سادہ زندگی گزاری ہے بھائی' چھوٹی چھوٹی مسرتیں' چھوٹے چھوٹے دکھ..... بات یہ ہے کہ ہمارے اور بھی مسائل تھے' میرا اسی زمانے کا ایک شعر ہے۔

فکر معاش کھا گئی' دل کی ہر اک امنگ کو
جائیں تو لے کے جائیں کیا' حسن کی بارگاہ میں

انور جبیں :۔ ہاں' یہ شعر میں نے آپ کے پہلے مجموعہ کلام "آگ میں پھول" میں پڑھا تھا مگر اس کتاب میں بعض اشعار اور غزلیں' کسی "واردات" کا بھی آئینہ دکھاتی ہیں۔

حمایت علی شاعر :۔ اس کے بغیر شاعری میں سوز ہوتا ہے نہ ساز.......

انور جبیں :۔ "آگ میں پھول" میں آپ کی ایک نظم ہے "ادھوری کہانی" میں اس کے آغاز کے بارے میں جاننا چاہوں گا' وہ لمحہ جب بقول آپ کے

دل کے تاروں پہ کوئی گیت سا لہرانے لگا

حمایت علی شاعر :۔ (ہنستے ہوئے) وہ لمحہ گیت بننے سے پہلے..... کچھ اور تھا۔ اس کا اظہار میں نے یوں کیا تھا۔

یوں کتنی نگاہوں کا سندیسہ نہ ملا
دل ایسا ہے پتھر کہ کسی کا نہ ہوا
اب حال مگر یہ ہے کہ دھڑکن نہ سکوت
کیا جانئے اس ایک نظر میں کیا تھا

اگر آپ کی نظر سے ماہنامہ "افکار" میں میری منظوم سوانح حیات گزری ہو تو آپ نے اس لمحے کی وسعت کا بھی اندازہ کرلیا ہوگا۔

انور جبیں :۔ یہی تو مجھے آپ سے پوچھنا ہے کہ جب آپ اپنی محبت میں کامیاب ہوگئے تو پھر کہانی..... "ادھوری" کہاں رہی؟

حمایت علی شاعر :۔ اس کا جواب میری دوسری نظم میں ملے گا "غم حاصل" اس کا آخری بند ہے۔

آج جب عشق غم زیست سے ٹکرایا ہے
ٹوٹ کر رہ گیا خوابوں کا ہر اک تاج محل
کسی تخیل کو اب دعویٰ فردوس نہیں
دل ہے اب اپنی تمناؤں کا خود اک مقتل
کوئی ساعت ہو' کوئی راہگذر ہو' ہرگام
زیست کی تاک میں بیٹھی نظر آتی ہے' اجل

انور جبیں :۔ آپ کی شاعری میں غم جاناں اور غم دوراں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ ہمارے دور کے اکثر شعراء کے پاس یہ درد مشترک ہے۔

حمایت علی شاعر :۔ ارے بھائی' ہر دور میں یہ درد مشترک رہا ہے۔ ولی کا شعر

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

دراصل اس دور کا آدمی غربت و افلاس کو خدا کی دین سمجھ کر خاموشی سے جھیلتا رہتا تھا۔ عہد حاضر میں یہ حقیقت کھل گئی ہے کہ سب کچھ انسان ہی کا کیا دھرا ہے۔ اب وہ یہ کہہ کر دل کو تسلی نہیں دیتا کہ

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اُس رند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا

بلکہ میر صاحب ہی کے لہجے میں یہ فیصلہ کرتا ہے۔

نہ ملِ میر اب اِن امیروں سے تو
ہوئے ہیں غریب اِن کی دولت سے ہم

زندگی کا یہ شعور، ہمارے عہد کے شاعر کو مزید سوچنے پر اکساتا ہے۔ بقول مصطفیٰ زیدی

انھیں پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

انور جبیں :۔ آپ کی شاعری میں ایک دبا دبا غصہ، جو پھٹ پڑنے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے کہیں آپ کے خاندانی مزاج کی غمازی تو نہیں کر رہا ہے۔ آپ کے دادا فوج میں تھے، والد پولیس میں تھے جو مذہبی لوگ تھے وہ مفتی و قاضی..... ان سب کے مزاج میں ایک طمطراق ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مشکل سے سمجھوتہ کرتے ہیں۔
حمایت علی شاعر :۔ جی ہاں، یہ خصوصیت تو مجھ میں ہے۔ میں اسے طمطراق تو نہیں، اپنی اَنا سے تعبیر کروں گا، لیکن یہ انا اتنی خودپسند نہیں کہ دوسروں کو "دکھلی آنکھوں" نظرانداز کردے۔ مجھے یہ احساس بھی رہتا ہے کہ

جہاں میں کوئی ہمارے سوا بھی ہو شاید
ہم اپنے آپ سے باہر نکل کے دیکھیں گے

انور جبیں :۔ غالباً" یہ حفیظ ہوشیار پوری کا شعر ہے۔
حمایت علی شاعر :۔ جی ہاں، آپ کسی بڑے شاعر کو دیکھیں، ان میں دوسروں کو قبول کرنے کا بھی حوصلہ ہے، ولی نے انوری کا ذکر کیا ہے۔ تو میر نے ولی کا۔

معشوق جو اپنا تھا، باشندہ دکن کا تھا

غالب سے بڑا انا پرست کون ہوگا..... جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ

لوح جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

وہاں یوں بھی گویا ہے۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

یہ ایک شاعر کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ جو لوگ اس سے محروم ہوتے ہیں وہ اپنی ہی ذات کی چکا چوند میں کھوئے رہتے ہیں۔

جنہیں خود اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا
مری نگاہ میں ایسے بھی دیدہ ور ہیں بہت — شاعر

انور جبیں :۔ میرا خیال ہے یہ وسعت نظر، مطالعے سی پیدا ہوتی ہے۔ آدمی باخبر رہتا ہے۔ آپ کے گھرانے میں بھی کیا ایسے صاحبان علم گزرے ہیں؟

حمایت علی شاعر :۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، مفتی اور قاضی، بغیر علم کے یہ مقام کس طرح پاسکتے تھے، یہ اور بات کہ ان کا علم اپنے موضوع تک محدود تھا ان میں شاعر و ادیب کوئی نہ تھا، اور شاعر تو ہمارے بزرگوں کی نظر میں بے عمل آدمی کی علامت تھا پیشہ آباء سپہ گری بھی تو تھا...... وہ جو غالب نے کہا ہے کہ

عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

یا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

ان اشعار میں جو "مرد" ہے وہ "سپاہی" ہی ہو سکتا ہے میرے مزاج میں استقلال، قوت برداشت، اور وہ بے نیازی کہ

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اسی سپہ گرانہ روش یا بزرگوں کے خون کی عطا ہے۔ میں اکثر اپنے بچوں کو علی سردار جعفری کا یہ شعر سناتا رہتا ہوں۔

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

زندگی کی جدوجہد میں انسان، اسی طرح کامیاب ہو سکتا ہے۔

انور جبیں :۔ آپ نے زندگی سے چونکہ لڑائی لڑی، کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، بقول آپ کے ..... تن کے کپڑوں سے یہاں زندگی شروع کی اپنی طویل نظموں کے مجموعے "تشنگی کا سفر" میں آپ نے ہر بات صاف صاف لکھ دی ہے۔ حتیٰ کہ اس دور کا واقعہ بھی جب آپ نے روزگار کی خاطر "اخبار" بیچے۔ میں نے آپ کی لائبریری میں ہفتہ وار "پرواز" کا وہ خصوصی شمارہ بھی دیکھا۔ غالباً "۵۰ء کا جس میں حیدر آباد، بمبئی اور دوسرے شہروں کے ادیبوں کے احتجاجی بیانات یکجا کر دیئے گئے تھے۔ یقین نہیں آتا کہ اس دور میں اتنی یکجہتی تھی۔ جب کہ آپ آج کی طرح اتنے مشہور اور اہم شاعر بھی نہ تھے۔

حمایت علی شاعر :۔ انور صاحب۔ یہ نظریاتی ہم آہنگی کی دین ہے۔ ترقی پسند تحریک، امن تحریک اور عالمی مزدور تحریک اتنی ہمہ گیر ہو چکی تھی کہ جزوی اختلافات کے باوجود، دنیا کے تمام باضمیر ادیب و شاعر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ غالباً "۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ تلنگانہ کے ایک گیارہ سالہ کسان لڑکے کو جب چالیس سال قید کی سزا سنائی گئی تھی تو چلی کے پابلو نرودا سے

سے لے کر فرانس کے لوئی ارگان تک سبھی نے آواز اٹھائی تھی۔ اس پر مختلف زبانوں میں نظمیں لکھیں گئیں۔ میں مانتا ہوں کہ یہ ایک جذباتیت تھی، وہ ادب نہیں تھا جسے ہم عرف عام میں "ابدی" کہہ کر خوش ہولیتے ہیں۔ اسی لئے ایلیا اہرن برگ کو وہ مشہور فقرہ کہنا پڑا جس کا مطلب ہے ہمیں اس لیے کو بھی اپنی گرفت میں لینا پڑے گا جس میں ہماری قوم کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ "لمحاتی ادب" بھی تاریخ میں ادیب کا ایک مخصوص کردار متعین کرتا ہے ہمیں اس ادب کے ضائع ہوجانے کا کوئی افسوس نہیں اور وقت کا طرفہ تماشہ دیکھیے کہ جن لوگوں نے اس ادب کا مذاق اڑایا تھا ۱۹۶۵ء کی جنگ میں وہی کچھ لکھتے نظر آئے۔

میں ان دنوں نوجوان تھا، ریاست کے Fall کے دو سال بعد مجھے آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے نکال دیا گیا تھا ۔دو سو سال تک انگریز کی پھیلائی ہوئی نفرت نے جن تعصبات کو ہوا دی تھی، میں بھی اس کا شکار ہوا۔ نہ صرف میں، بلکہ میری بیوی کو بھی سروس سے ہٹادیا گیا۔ میں کیا کرتا..... باعزت زندگی گزارنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں نے ریاست کے زوال پذیر معاشرے کے مصنوعی معیاراتِ زندگی کی پروا کیئے بغیر اخبارات اٹھالئے۔ یہ اور بات کہ میرے بزرگوں اور دوستوں نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔

کاش پاکستان میں بھی یہ فضا ہوتی۔ یہاں تو ہم دیکھتے ہیں کہ حسن حمیدی کی موت پر نیشنل عوامی پارٹی کے کسی رہنما نے تعزیت کے چند الفاظ بھی نہیں کہے۔ جب کہ حسن حمیدی اپنے نظریات کی خاطر برسوں جیل میں رہا۔ ارباب اقتدار کا معتوب رہا۔ البتہ اس کے چند قریبی دوستوں نکہت بریلوی، مظہر جمیل اور مسلم شمیم نے "طلوع افکار" کا ایک نمبر مرتب کر دیا۔ حبیب جالب نے بھی بڑی سخت جانی کا ثبوت دیا ہے۔ آخر کار اسے مان لیا گیا۔

معاف کیجئے۔ میں قدرے جذباتی ہوگیا..... انور صاحب، میرا عقیدہ ہے کہ جب کسی قوم کا کوئی مطمح نظر نہیں رہتا یا جب اس کا نظریہ کمزور پڑجاتا ہے تو وہ نفسی نفسی کا شکار ہوجاتی ہے۔ وہ پھر

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

کو مقدم جان کر خود غرض اور کم ظرف ہوجاتی ہے۔ اللہ ہمیں اس عالم سے بچائے۔

انور جبیں :- میں اپنے عہد کے المیہ کو سمجھ رہا ہوں، اور بڑی حد تک آپ سے متفق ہوں، آپ نے "آگ میں پھول" لکھا تھا۔ "یہ انگارہ جو میرے سینے میں مسلسل دہکتا رہتا ہے، میری تاریخ کی امانت ہے یہی انگارہ کبھی بھڑک اٹھتا ہے تو میرے اور میرے فن کے لئے مشعل راہ بن جاتا ہے اور کبھی چراغ مزار۔"

پھر اس آگ کو مختلف مجموعوں میں مختلف حوالوں سے دیکھتے ہوئے "ہارون کی آواز" میں آپ نے اُسے جس عالم میں دیکھا ہے..... وہ شاید ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔

بدن پہ پیرہن خاک کے سوا کیا ہے
مرے الاؤ میں اب راکھ کے سوا کیا ہے

یہ "واحد متکلم"......... "جمع متکلم" کا آئینہ ہے اور میں اسے اپنی مشترکہ بدنصیبی سے تعبیر کرتا ہوں۔ لیکن یہ بھی تو آپ نے ہی کہا ہے "حرف حرف روشنی" میں......... کہ

سمیٹتا ہے ہر اک غم کو اپنے دامن میں
کشادہ ظرفیِ قلبِ پیمبراں کی طرح

حمایت علی شاعر :۔ جی ہاں' میں نے اپنے بچوں کی معرفت، نئی نسل کے لئے یہ نصیحت یا وصیت کی ہے۔

انور جبیں :۔ آپ کی شاعری غم جاناں سے غم دوراں تک' متعدد مسائل سے نبرد آزما نظر آتی ہے۔ ان میں بعض مسائل جذبات اور محسوسات کی سطح پر ہیں بعض فکری سطح پر.... بالخصوص "مٹی کا قرض اور "تشنگی کا سفر" میں' البتہ ان کتابوں میں وہ اشعار جو بقول ڈاکٹر سید عبداللہ آپ کی فکر اور آپ کے شعورِ حیات کی ترجمان ہیں کہیں "حد سے متجاوز" دکھائی دیتے ہیں۔

حمایت علی شاعر :۔ انور صاحب' شاعری میں حد کوئی نہیں ہوتی۔ اور پھر ہم لوگ تو غالب اور اقبال کے وارث ہیں۔ ہمیں جوش ایسا عقلیت پسند' انسان دوست اور نیچر پرست شاعر بھی ملا ہے۔ جس نے کہا تھا۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اس مخصوص موضوع پر اس سے بڑا شعر نہیں کہا جا سکتا۔ تو شاعر کسی حد کا پابند نہیں رہ سکتا۔ میں جس دائرے کو توڑتا ہوں تو خود بخود دوسرے دائرے میں چلا جاتا ہوں' یہی آئینِ فطرت ہے۔

میں جتنا توڑتا ہوں حلقہ زنجیرِ وحشت کو
اسی سرعت سے اک زنجیر نو ڈھلتی ہے سینے میں شاعر

سو یہ سلسلہ ازل سے چل رہا ہے' ابد تک چلتا رہے گا۔ میرا ہی شعر ہے۔

ازل سے اک عذابِ قبول و رد میں ہوں
کبھی خدا تو کبھی ناخدا کی زد میں ہوں

انور جبیں :۔ آپ نے شاعری کے لئے کئی پیرائے اختیار کئے۔ عموی غزلوں' نظموں کے علاوہ طویل تمثیلی اور افسانوی نظمیں اور مختصر ترین پیمانہ شعر "ثلاثی وغیرہ۔ طوالت سے اختصار کی طرف آپ کی رغبت کو کچھ لوگ آپ کی تھکن سے تعبیر کرتے ہیں یا پھر ہائیکو کی پیروی بلکہ نقالی......

حمایت علی شاعر :۔ فکرِ ہر کس بقدرِ...... چھوڑیئے اس بات کو۔ جو لوگ مجھے جانتے ہیں' وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ "ثلاثی" میں ۱۹۶۰ء سے کہہ رہا ہوں' جب نہ کہیں ہائیکو لکھا جا رہا تھا نہ ماہیا...... ہائیکو تو بہت دور کی صنف ہے' ماہیا اپنے پنجاب کا عوامی گیت ہونے کے باوجود' اردو میں شاذ و نادر ہی لکھا گیا۔ دونوں اصناف کی فنی خصوصیات یا تکنیک سے ہمارے بیشتر لکھنے والے ناآشنا ہیں۔ انہیں سلیبلز اور ہماری بحروں کے عربی ارکان کا فرق ہی نہیں معلوم۔ بعض شعراء تو ۵ ۔ ۷ ۔ ۵ عربی ارکان میں بھی ہائیکو کہتے نظر آتے ہیں۔

میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اردو میں "تین مصرعوں کی وحدت" نہیں تھی تو مثلث کی رعایت سے میں نے یہ کام

(باقی صفحہ ۵۲۱ پر)

آئینہ در آئینہ

اس بار وہ ملا تو عجب اس کا رنگ تھا — الفاظ میں ترنگ نہ لہجہ دبنگ تھا
اک سوچ تھی کہ بکھری ہوئی خال و خط میں تھی — اک درد تھا کہ جس کا شہید انگ انگ تھا
اک آگ تھی کہ راکھ میں پوشیدہ تھی کہیں — اک جسم تھا کہ روح سے مصروف جنگ تھا

میں نے کہا کہ یار تجھے کیا ہوا ہے یہ — اس نے کہا کہ عمر رواں کی عطا ہے یہ
میں نے کہا کہ عمرِ رواں تو سبھی کی ہے — اس نے کہا کہ فکر و نظر کی سزا ہے یہ
میں نے کہا کہ سوچتا رہتا تو میں بھی ہوں — اس نے کہا کہ آئینہ رکھا ہوا ہے یہ

دیکھا تو میرا اپنا ہی عکس جلی تھا وہ
وہ شخص میں تھا اور حمایت علی تھا وہ

یہ نظم ایک طرح سے میری سوانح حیات کا "حرف آخر" ہے جو میں نے بہت پہلے لکھ دیا تھا' ایک دن صہبا لکھنوی نے کہا "تمھیں یاد ہے ۱۹۵۶ء میں "آگ میں پھول" کے حوالے سے پروفیسر ممتاز حسین نے تمہاری شاعری کے بارے میں کیا لکھا تھا؟"
(حمایت کی شاعری اگر ایک طرف اپنی خود نوشت سوانح عمری ہے' تو دوسری طرف قومی تاریخ کا آئینہ بھی......)
"تم جو اپنی زندگی کی جھلکیاں دکھاتے رہتے ہو۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ باضابطہ اپنی سوانح لکھ ڈالو......؟" صہبا نے مشورہ دیا۔
"اور منظوم لکھ دو تو کیا کہنے...... شعری ادب میں پہلا تجربہ ہوگا۔" نکہت بریلوی نے لقمہ دیا اور میں سوچنے لگا......

میں نے کتنے ہی منظوم ڈرامے اور طویل افسانوی نظمیں لکھیں' اپنی تاریخ پر محیط منظوم تمثیلیں اور نئی نسل کے لئے منظوم "نصیحتیں اور وصیتیں" بھی لکھ ڈالیں۔ غنائیے اور عام نظموں اور غزلوں کے علاوہ مختصر ترین پیمانہ شعر "ثلاثی" میں بھی خود کو آزمالیا۔ کیا میں اس تجربے سے بھی' بہ سلامت گزر جاؤں گا......؟

اپنی سوانح حیات لکھنا' دوبارہ جنم لینے اور دوسری زندگی' از سرِ نو گزارنے کے مترادف ہے...... اور پھر منظوم......!!
"نکہت۔ تم تو خوشبو کی طرح ایک بات کہہ جاتے ہو اور وہ بات مرے دل میں اتر کر رہ جاتی ہے مگر اب......
اک آگ کا دریا ہے' اور تیر کے جانا ہے"

خدا کرے' میرے سینے میں دھڑکتا ہوا "گل گامش" راز حیات کی جستجو میں اپنے "ات انا پشتم" تک پہنچ جائے... خدا کرے......

(حمایت علی شاعر)

آئینہ در آئینہ

(خودنوشت منظوم سوانح حیات)

یہ شہر، جس کو سب اورنگ آباد کہتے ہیں
یہاں پہ صدیوں سے میرے بزرگ رہتے ہیں
بہت زمانہ ہوا، اس کا نام "کھڑکی" تھا
جو فتح خان کے ہاتھوں "فتح نگر" بھی ہوا
پھر اس کے بعد مغل دست برد میں آیا
اور اس پہ پڑگیا اورنگ زیب کا سایا
یہ آج بھی ہے، اسی بادشاہ سے منسوب
"وہ بات کل تھی جو ناخوب، آج ہوگئی خوب"
اسی کی گود میں ایلورہ اور اجنتا ہے
وہ خلد آباد ہے جو اولیاء کا گوشہ ہے
یہیں پہ دولت آباد کا وہ قلعہ ہے
جو شہر دیو گری کا عظیم ورثہ ہے
وہ نہر جو ملک عنبر کی تھی بنائی ہوئی
جو گاؤمکھ سے تھی ہر ایک گھر میں لائی ہوئی
وہ آب سرد کا اور آب گرم کا مخزن
وہ اپنے دور کے فن کار کا کرشمہ فن
وہ جوئے شیر سی چھوٹی سی دودھنا ندی
ہے اب بھی جس کے قریں آبشار پن چکی
حسین مسجد و مندر، حسین درگاہیں
خدا کی سمت وہ جاتی ہوئی حسیں راہیں
وہ مقبرہ وہ دکن کا حسین تاج محل
وہ "بادشاہی محبت" کا ایک راج محل
وہ اونچی اونچی فصیلیں، بلند دروازے
درون خانہ کے ہم راز، بند دروازے

○

یہ اک طویل کہانی ہے، چھوڑیئے اس کو
مآل اس کا غلامی ہے، چھوڑیئے اس کو
منافقت ہے سیاست ہے، بادشاہت ہے
ہزار سال سے اپنی یہی روایت ہے
ہر ایک راز، مشیت کے راز کے مانند
"رموز مملکت خویش، خسرواں دانند"

○

فرنگیوں کی سیاست سے کون ہے آگاہ
زوال عہد مغل ہے "عروج آصف جاہ"
دکن میں ایک ریاست کی جب پڑی بنیاد
یہاں بھی آ کے بہت لوگ ہوگئے آباد
انہیں میں تھے مرے اجداد، لوگ کہتے ہیں
یہ سب تھی رزق کی بیداد، لوگ کہتے ہیں

○

جو لوگ مہر بلب تھے وہ آج بولتے ہیں
زبان حال سے ماضی کے راز کھولتے ہیں
ولی، سراج، شفیق اور صفی کے لہجے میں
حقیقتیں ہیں نمایاں ادب کے پردے میں
کبھی ملے تو ذرا "دلگداز" پڑھ لیجیے
نگارش شرر حق نواز پڑھ لیجیے
یہ شہر جس میں اساطیر کا اجالا ہے
یہ شہر جس میں طریقت کا بول بالا ہے
کیا ہے جس نے بغاوت کا اولیں دربار
جہاں سے ہوتا ہے گوریلا جنگ کا آغاز
وہ "کلیات ولی" ہو کہ "گلشن گفتار"
مری زبان کے ہیں اولین نقش و نگار

وہی زباں، جو ہے دکنی بھی، اور اردو بھی
وہ شاعری کہ ہے جس میں، زمیں کی خوشبو بھی

○

یہیں رکھی ہے "بنائے ترقی اردو"
یہیں سے پھیلی ہے اردو زبان کی خوشبو
اس انجمن کے ہیں بانی، جناب عبد الحق
محقق اور مجسم کتاب، عبد الحق
یہیں سے نکلا تھا پہلا رسالہ "اردو"
جگا رہا ہے جو اردو زباں کا جادو
ہمارے شہر میں کالج کی ڈال کر بنیاد
کیا تھا کتنے ہی اہل علوم کو آباد
ہر ایک اہل نظر پر اسی کا احساں ہے
ہمارے شہر سبا کا، وہی سلیماں ہے
اسی کے سائے میں ہم سب نے آنکھ کھولی ہے
اس کی گود میں میری زبان بولی ہے

۳

میں جس گھرانے کا ہوں فرد، مذہبی تھا بہت
دار وقتی بھی تھا لیکن شریعتی تھا بہت
فقیہ و صوفی و قاضی مرے اب و جد تھے
بڑے نمازی، تہجد گزار سید تھے
وفا شعار تھے، دیں دار تھے، سپاہی تھے
وطن پرست، اطاعت گزار شاہی تھے
مرے بزرگ تھے جو دیں کے رہنماؤں میں
خدا کے نام پہ شامل تھے ناخداؤں میں
انھوں نے دین کی خدمت سے رفعتیں پائیں
زمیں کی شکل میں "شاہی عنایتیں" پائیں
مگر جو تھے مرے دادا، بہت قوی و جری
وہ جن کا اسم گرامی تھا، میر ببر علی
وہ فوج میں تھے، بڑے جانثار افسر تھے
بزرگ کہتے ہیں وہ "بخت کے سکندر" تھے
وہ کچھ سہی، کسی فوجی کی زندگی کتنی
سیاہ رات میں جگنو کی روشنی کتنی
نثار جاں گئی تو انعام خسروانہ ملا
زمیں کا قطعہ برائے چراغ خانہ ملا

زمیں تو دوست بھی ہوتی ہے اور دشمن بھی
یہ ایک بھاگ بھری کو کرے ابھاگن بھی
وہ کھیت جو مرے اجداد کی امانت تھے
وہ ان کے پاس تھے جو ماہر خیانت تھے
جو فصل آئے وہ ڈھوروں کی نذر ہوجائے
اگے اناج تو چوروں کی نذر ہوجائے
یہ ایک بیوہ کے سسرال کی کہانی ہے
فقیہ و قاضی و ملا کی مہربانی ہے
وہ جس کے ساس سسر تھے نہ جیٹھ دیور تھے
جو تھے تو دادا کے کچھ "یوسفی برادر" تھے
وہ گاؤں جو میرے اجداد کا گلستاں تھا
وہ گلستاں تھا کہاں اب، اب تو "دشت کنعاں" تھا
جہاں کہیں مرے دادا کی قبر ہے اس کو
میں "چاہ یوسف کنعاں" کہوں تو بہتر ہے
سمجھ گئیں مری دادی ہر ایک کے تیور
وہ اپنے بچوں کو لے آئیں اپنے بھائی کے گھر
یہ گاؤں "پیپری جاگیر" جس کو کہتے ہیں
یہاں بھی میرے بہت سے عزیز رہتے ہیں
مگر عزیز بھلا کب عزیز ہوتے ہیں
جو زر ہو پاس تو پھر سب عزیز ہوتے ہیں
ہر ایک رشتہ یہاں رشتہ تجارت ہے
یہ ایک جنس تجارت ہے جو محبت ہے

یتیم کب یہ محبت خرید سکتے تھے
یہ وقت وہ تھا کہ اپنے بھی سب پرائے تھے
زبان میٹھی سہی، پھر بھی زہر اگلتی ہے
جو چیز ڈستی ہے وہ آستیں میں پلتی ہے
خدا کو یوں بھی غریبوں کو آزمانا تھا
کہ اپنا میکہ بھی اک "اجنبی گھرانہ" تھا
عجیب عالم بیچارگی تھا دادی پر
یہ وقت آنا تھا، ایسی شریف زادی پر
تراب علی (مرے والد) بڑے تھے اور خوددار
نکل پڑے وہ یہاں سے بھی چھوڑ کے گھر بار
وہ شہر میں چلے آئے کہ کوئی کام کریں
اور اپنی ماں کی بھی خدمت بہ احترام کریں
انہیں یہ غم تھا کہ تعلیم پاسکے نہ بہت
زمیں سے اٹھے، بلندی پہ جاسکے نہ بہت
بزرگ فوج میں تھے اور وفا شعار بھی تھے
اور اپنے "ظل الٰہی" کے جاں نثار بھی تھے
تو یہ ہوا....مرے دادا کی کام آئی "سند"
"اگر پدر نہ تواند، پسر تمام کند"
وہ نوجوان تھے، پولیس میں نوکری کرلی
پڑھے لکھے تھے تو چھوٹی سی افسری کرلی
یہ داستاں ہے پرانی، مگر ضروری تھی
برائے نکتہ اہل نظر ضروری تھی

۳

پٹنہ کے قاضی کی بیٹی تھی (والدہ میری)
بہت ہی بخت کی ہیٹی تھی (والدہ میری)
نہ ماں تھی سر پہ نہ بھائی بہن، اکیلی تھی
نہ وہ کسی کی، نہ اس کی کوئی سہیلی تھی
جو آس پاس تھے بچے، وہ سب تھے سوتیلے
(تو گھر میں کیوں کوئی اس بد نصیب سے کھیلے)
تمام دن ہی وہ گم سم رہے، اداس رہے
بس ایک سایہ تھا اپنا جو اسکے پاس رہے
مگر اندھیرے میں دیتا ہے کون کس کا ساتھ
بھرا جہاں، یہ تنہائی اور خدا کی ذات
وہ کم سنی ہی سے بارگراں تھی سب کے لئے
بڑی ہوئی تو متاع زیاں تھی سب کے لئے
جو اس غریب پہ تھی مہرباں تو دادی ماں
ہوئیں جو پیار سے سایہ کناں تو دادی ماں
بہو بناکے اسے لائیں اپنے گھر کے لئے
چراغ گھر میں جلائے گئے سحر کے لئے
شب برات تھی اس رات اور دوالی بھی
بہت ہی نیک قدم تھی، گھر آنے والی بھی

○

سنا ہے جب مرے ابا ہوئے پولیس افسر
سبھی عزیز بہت مہرباں ہوئے ہم پر
وہ دادی ماں کا بہت ہی خیال رکھتے تھے
ہمیشہ جیب میں کچھ حسب حال رکھتے تھے
جو لوگ کھیتوں پہ قبضہ جمائے بیٹھے تھے
سنا ہے وہ بھی سروں کو جھکائے بیٹھے تھے
وہ گنگاپور ہو یا پیپری کہ رنجن گاؤں
ہر اک مقام پہ پھیلی ہوئی تھی ٹھنڈی چھاؤں
عزیز دھوپ میں چھتری اٹھائے پھرتے تھے
سب ابا جان کے اب سائے سائے پھرتے تھے
وہ گرچہ خوب سمجھتے تھے رشتہ داروں کو
مگر انہوں نے سہارا دیا ہزاروں کو
پولیس میں ہو کے بھی دل میں گداز رکھتے تھے
غلط روی سے وہ ہر اک کو باز رکھتے تھے

یہی سبب تھا کہ لوگوں میں ہوگئے محبوب
مگر وہ اپنے ہی دفتر میں تھے بہت معتوب
اگرچہ فرض و ضوابط کی حد میں رہتے تھے
وہ افسروں کے تلون کی زد میں رہتے تھے
یہ دفترانہ سیاست ہے چھوڑیئے اس کو
بہت پرانی روایت ہے چھوڑیئے اس کو

○

ہر آدمی کی تمنا ہے، اس جہاں میں رہے
اور اس کا نام و نشاں اپنے خانداں میں رہے
سو میرے گھر کی بھی ایسی مراد بر آئی
"کہ انتظار تھا جس کا، وہی سحر آئی"
بہن کے بعد میں، جب اس جہاں میں آیا
تو گویا اک نیا سورج مکان میں آیا
جو خاندان کی قسمت جگانے والا تھا
اور اپنا شجرہ آباء بڑھانے والا تھا
سنا ہے میری ولادت پہ شادیانے بجے
چراغ گھی کے جلے اور آستانے سجے
خوشی یہ تھی کہ ولی عہد خاندان آیا
تراب علی کے گھرانے کا پاسباں آیا
چچا کا چین تو پھوپھی کے دل کا ارماں تھا
پہ دادی ماں کی نظر میں بہو کا احساں تھا
وہ بار بار بہو کی بلائیں لیتی تھیں
اتارتی تھیں نظر اور دعائیں دیتی تھیں
دعائیں تھیں کہ چمن میں بہار آتی رہے
بہار آتی رہے اور گل کھلاتی رہے
بہار آئی ۔ مگر تھی خزاں بھی پہلو میں
نہ جانے زہر تھا کیسا گلوں کی خوشبو میں
میں تین سال کا تھا، بس ہے مجھ کو اتنا یاد
کہ اک جنازہ اٹھا اور نالہ و فریاد
پھر آنسوؤں میں ہر اک خاص و عام ڈوب گیا
بکاہ و آہ میں منظر تمام ڈوب گیا

۴

میں سوچتا ہوں تو وہ دور یاد آتا ہے
بھلانا چاہوں تو کچھ اور یاد آتا ہے
وہ ایک چھوٹا سا لڑکا، وہ ایک قبرستان
وہ ایک پیڑ کی چھاؤں، اداس اور سنسان
وہ کھوئی کھوئی سی آنکھوں میں جستجو کوئی
لرزتے ہونٹوں میں اپنے سے گفتگو کوئی
بس اک خیال کہ اماں مری یہیں ہے کہیں
اسی جگہ پہ اتاری گئی ہے زیر زمیں
یہاں سے اس کو خدا نے بلالیا شاید
زمیں سے اس کو فلک پر اٹھالیا شاید
کبھی مجھے بھی بلالے تو پھر مزہ آجائے
یہاں پہ کون ہے جو ماں کی طرح اپنائے

○

بہت عجیب خیالوں کی رہ گزر تھا دماغ
سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا، منتشر تھا دماغ
کبھی چچا تو کبھی پھوپھی مجھ کو سمجھائیں
کبھی خود ابا کوئی "جھوٹ" کہہ کے بہلائیں
مگر وہ "سچ" جو کسی کی بھی دسترس میں نہ تھا
کسی کے ہاتھ نہ آیا، کسی کے بس میں نہ تھا

○

گزر رہے تھے مہ و سال اور گزرتے رہے
ہزار نقش سنورتے رہے، بکھرتے رہے

پھر ایک دن میری قسمت نے یہ ستم بھی کیا
کہ ماں کے بعد بہن کو بھی مجھ سے چھین لیا
وہی کہانی، جو ماں کی تھی، وقت نے دہرائی
بھرا جہاں تھا اور میں تھا اور میری تنہائی

○

عجیب چیز ہے، تقدیر جس کو کہتے ہیں
ازل سے پہلے کی تحریر جس کو کہتے ہیں
سنا ہے وقت کی گردش ہے صورت پرکار
کہ نسل نسل انہیں واقعات کی تکرار
جو والدین کا غم تھا، وہی مجھے بھی ملا
اگر ہے مجھ کو خدا سے تو بس یہی ہے گلہ

○

میں سوچتا تو خیالات اور الجھتے تھے
جو میں سمجھتا وہ سب لوگ کب سمجھتے تھے
یہ کس کا دل تھا جو مجھ میں دھڑکتا رہتا تھا
دماغ میں کوئی شعلہ بھڑکتا رہتا تھا
تصورات کی دنیا اجڑتی جاتی تھی
خیال و خواب کی صورت بگڑتی جاتی تھی
جو لوگ تھے مرے اطراف، سب ہی اپنے تھے
مگر میں رہتا تھا جن میں، عجیب سپنے تھے
میں اس جہان میں رہتا نہ اس سے باہر ہی
میں گھر میں رہ کے بھی رہنے لگا تھا، بے گھر ہی
کبھی یہ چاہوں کہ ماں کی طرح کہیں سو جاؤں
کبھی یہ سوچوں کہ سیل ہجوم میں کھو جاؤں
جو لوگ اپنے تھے، مجھ کو پرائے لگتے تھے
وہ آدمی تھے مگر مجھ کو سائے لگتے تھے
اک ابا جان تھے، جو گھر میں کم ہی ہوتے تھے
وہ صرف رات گئے، گھر میں آ کے سوتے تھے

پولیس کی نوکری کب کس کو گھر کا رکھتی ہے
وہ آدمی کو سدا در بدر کا رکھتی ہے

○

مگر یہ زیست کا انداز، روز و شب کی روش
بنی ہوئی تھی مری دادی ماں کے دل کی خلش
وہ چاہتی تھی، یہ ویرانہ پھر سے گھر بن جائے
وہ روشنی ہو کہ تاریک شب، سحر بن جائے
پھر ان کے بیٹے کو مل جائے اک شریک حیات
پھر انکے گھر میں ہو دن عید، رات ہو شبرات
بہو جو آئے، محبت کا خواب بن کے رہے
اور انکی پہلی بہو کا جواب بن کے رہے
مگر سنا ہے کہ ابا نہیں ہوئے راضی
(اگرچہ تھے گھر میں کتنے ہی مفتی و قاضی)
انہیں کچھ اپنی وفا کا بھی پاس تھا شاید
مرے لئے بھی ذرا سا ہراس تھا شاید
وہ دادی ماں کا بھی اصرار ٹال دیتے تھے
وہ فال کوئی، نئی ہی نکال دیتے تھے

○

اسی بہانے گزارے گئے کچھ اور برس
مگر پھر آگیا ان کو ضعف ماں پہ ترس
میں بارہ سال کا تھا اور بڑا سا لگتا تھا
اور اپنے گھر کے مسائل سمجھ بھی سکتا تھا
بہو چنی گئی اور سب ہی ہوگئے دل شاد
اور اپنے ابا کو میں نے بھی دی مبارکباد
گلے لگایا تو دل پہ نہ رکھ سکے قابو
نکل پڑے مرے ابا کی آنکھ سے آنسو
وہ دن ہے یاد مجھے، کیا عجیب عالم تھا
خوشی کی تہہ میں بہت ہی لطیف سا غم تھا

۵

خدا کا شکر کہ اس گھر میں بھی چراغ جلے
جہاں اندھیرا تھا دن میں بھی آسمان تلے
یہ دادی ماں کی فراست تھی یا مرا مقسوم
ملی وہ "ماں" مجھے جو خود بھی "ماں" سے تھی محروم
جو غم گزیدہ ہو' وہ مہرباں بھی ہوتا ہے
وہی شریک غم دیگراں بھی ہوتا ہے
وہی تو جانے ہے' کرب شکستگی کیا ہے
جسے ملے نہ محبت' وہ زندگی کیا ہے
سو مجھ کو میرے مقدر سے کچھ زیادہ ملا
جو مہربان ملا مجھ کو' دل کشادہ ملا
میں خود بھی اب تو سمجھ دار ہوگیا تھا بہت
"حریص لذت آزار" ہوگیا تھا بہت
مگر کچھ ایسے بھی تھے اقربائے درد نواز
جو بن گئے تھے بہت پیار سے مرے ہم راز
کبھی تو دیتے' یسیری کا واسطہ مجھ کو
کبھی نیا ہی دکھاتے تھے راستہ مجھ کو
کہیں سراب سا آئینہ متاع خلوص
کہیں وہ لفظ کہ مفہوم ہی بہت مخصوص
کہیں یقیں میں گماں کی لطیف آمیزش
کہیں گماں میں' چمکتے یقین کی تابش
کہیں وفاؤں میں تھوڑی سی بے وفائی بھی
کہیں ادائے محبت میں کج ادائی بھی
امانتوں میں خیانت' دیانتیں جھوٹی
خدا کے نام پہ ساری عبادتیں جھوٹی
گھرے ہوئے تھے تضادوں میں ظاہر و باطن
بس ایک جال تھا جس سے رہائی ناممکن

○

میں سوچتا تھا کہ کیسے عجیب لوگ ہیں یہ
جو دیکھئے تو خدا کے قریب لوگ ہیں یہ
میں چاہتا تھا کہ اس جال سے نکل بھاگوں
منافقت کے مہ و سال سے نکل بھاگوں
مگر کہاں؟ یہی دل میں سوال اٹھتا تھا
تو بیٹھ جاتا جو دل میں ابال اٹھتا تھا
تمام شہر ہی' پورا معاشرہ تھا یہی
زباں پہ کچھ سہی' دل کا معاملہ تھا یہی
گزر گئے اسی ماحول میں مرے کچھ سال
نہ میرا ماضی ہی بہتر تھا اور نہ میرا حال

○

یہ شہر جس کو سب اورنگ آباد کہتے ہیں
نہ جانے کب سے یہاں لوگ ظلم سہتے ہیں
یہ اک "عظیم ریاست" کا شہر تھا لیکن
بڑی عظیم روایت کا شہر تھا لیکن
یہاں پہ کچھ نہ تھا بوڑھی عمارتوں کے سوا
غریب لوگوں کی بھولی عبادتوں کے سوا
نہ علم و فن کی کوئی درس گاہ تھا اعلیٰ تھی
نہ کوئی لائبریری ' علم کا حوالہ تھی
کوئی رسالہ نہ اخبار ہی نکلتا تھا
سنی سنائی پہ لوگوں کا کام چلتا تھا
تمام شہر میں اک انٹر آرٹس کالج تھا
نہ اسپتال' نہ کوئی بڑا معالج تھا
سوائے بلدہ' کوئی مرکز علوم نہ تھا
ہمارا شہر بجز "شہر زاغ و بوم" نہ تھا
یہ اور بات' ریاست کا نشہ تھا کچھ اور
امارت اور حکومت کا نشہ تھا کچھ اور
یہاں جو ایک مسلماں کی بادشاہت تھی

تو ہم سمجھتے، ہماری ہی وہ حکومت تھی
اگرچہ ہم بھی یہاں صرف تیرہ فیصد تھے
مگر یہ زعم حکومت "عظیم بے حد" تھے
جو بادشاہ تھا، اس پر خدا کا سایہ تھا
خدا نہ تھا، پہ خدا ہی کا ایک کنایہ تھا
جسے گماں تھا کہ وہ ہے تو ہیں مسلماں بھی
خدا، رسول بھی، قرآں بھی اور ایماں بھی
یہ سلطنت ہے تو سارا نظام باقی ہے
"نظام" ہی سے مسلماں کا نام باقی ہے
نظام..... آصف سابع، وہ شہریار دکن
تھاجس کے پاس (سنا ہے) خدا کا سارا دھن
خدا نے اپنے خزانے کی چابیاں دے کر
بنادیا تھا اسے بادشاہ سیم و زر
یہ بات ہم کو بتائی گئی تھی بچپن میں
بندھی ہوئی تھی جو اب تک ہمارے دامن میں
مرے رفیق تو سارے یہی سمجھتے تھے
سبھی بزرگ ہمارے یہی سمجھتے تھے
بس ایک میں تھا گھرانے میں ناخلف ایسا
بنا ہوا تھا ہر اک فرد کا حدف ایسا
کہ میرا نام بھی سنتا انھیں گوارا نہ تھا
(وہ کیا برائی تھی جس کا میں استعارہ نہ تھا)
سبب یہ تھا کہ مجھے اختلاف تھا سب سے
میں اپنے گھر میں خود اپنا رقیب تھا کب سے
میں اپنی عمر کے لڑکوں سے مختلف تھا بہت
ہر اک روایت کہنہ سے منحرف تھا بہت
کتابیں پڑھتا تھا ایسی جو باغیانہ تھیں
سبھی بزرگوں کی نظروں میں کافرانہ تھیں

○

مجھے یہ دکھ تھا ولی عہد پر ہے میرا نام
"نواب میر حمایت علی" تھا اس کا نام
میں سوچتا کہ مرا خانداں بھی کم تو نہیں
یہ بادشاہ، مرے جد سے محترم تو نہیں
حسب نسب میں علی کا ولی ہوں، سید ہوں
وہ "باب علم" تھے، میں خاک پائے سرمد ہوں
ہے فرق مجھ میں، ولی عہد میں تو اتنا ہے
غریب زادہ ہوں میں، وہ امیر زادہ ہے
مگر غریب تو سارے عظیم لوگ رہے
امیر تو سبھی انسانیت کا روگ رہے
عجیب ذہن تھا ان بدنصیب لوگوں کا
یہ تاج و تخت کے مارے غریب لوگوں کا
غریب ہو کے بھی، پاشا ۔ نواب کہلاتے....
یہ عرفیت کے غباروں سے خود کو بہلاتے
میں دور رہتا، نمائش کے ان سہاروں سے
نکال دیتا تھا ساری ہوا غباروں سے
کسی نے طنز سے جب مجھ کو کہہ دیا "شاعر"
تو میں نے ضد میں تخلص ہی رکھ لیا شاعر
بجائے "میر" تخلص ہے آج ، نام کے ساتھ
کہ رشتہ جوڑلیا ہے میں نے عوام کے ساتھ

○

میں سوچتا ہوں تو ہر ایک چیز بے تکی لگتی
فلک کی پیٹھ بھی مجھ کو جھکی جھکی لگتی
وہ بادشہ ہو کہ نواب، مولوی ہو کہ پیر
مری نگاہ میں سب ہی تھے مجرمان ضمیر
سبھی منافق و موقع پرست و جاہ پرست
خدا و دیں کے مبلغ تھے اور شاہ پرست
میں بات بات پہ ان سب پہ معترض ہوتا
غلط عقائد مذہب پہ معترض ہوتا

کبھی میں "ظلِ الٰہی" کا تجزیہ کرتا
کبھی خلافت و شاہی کا تجزیہ کرتا
کبھی سناتا میں اقبال و جوش کے اشعار
کبھی "نگار" سے لاتا نیاز کے افکار
کبھی میں کرتا تھا مخدوم کی، مجاز کی بات
وہ شعر پڑھتا تھا کہ ہوجاتے مشتعل جذبات
غرض عجیب تلاطم تھا موجزن مجھ میں
کوئی تھا تیشہ بکف، مردِ کوہکن مجھ میں
نہ بے ستون تھا کوئی نہ جوئے شیر کہیں
بس اک جنون تھا کہ ہوتا نہ تھا اسیر کہیں

٦

میں اپنی عمر کے اس دور میں تھا جب ہر خواب
نظر میں ہوتا ہے تعبیر کے لئے بے تاب
یہ میرا شہر کہ جس پر تھا اک کھنڈر کا گماں
مری نگاہ میں اب بھی تھا رشکِ باغِ جناں
یہاں پہ کتنے ہی اہلِ کمال تھے آباد
مرے بزرگ، مرے دوست اور مرے استاد
یہ شیخ چاند کا گلزار، وجد کا مسکن
یہ نیش، دورد کا، یعقوب کا حسین دامن
سروش و صدق و وحیدہ نسیم کی دنیا
متین و ناصر و قاضی سلیم کی دنیا
یہیں سے یوسف ناظم بہ افتخار اٹھے
یہیں سے اطہر د ع، احمد و خمار اٹھے
یہی مروج کا، فرہاد کا، وحید کا گھر
یہی سکندر و انور کا اور سعید کا گھر
یہی رفیعہ و عجم د قمر کا گہوارہ
بشر نواز کا، میرا، سحر کا گہوارہ

○

میں سوچتا ہوں تو کیا کیا نہ یاد آتا ہے
ہر ایک چہرہ نگاہوں میں مسکراتا ہے
تھا جن کے دم سے مرا شہر آسماں جیسا
اندھیری رات میں مہتاب و کہکشاں جیسا
وہ کامریڈ حبیب، افتخار اور شراف
وہ جن کے وصف سے یہ شہر تھا ہمہ اوصاف
وہ میرے دوست، مرے ہم خیال و ہم مشرب
کہ جن سے اور بھی نکھرا مرا شعور ادب
کبھی ہو جوش کی، مخدوم کی، مجاز کی بات
کبھی نگار کی بحثیں، کبھی نیاز کی بات
کبھی ہو فیض کے راشد کے اختراع کی بات
کبھی ہو عصمت چغتائی کے وقاع کی بات
کبھی ہو منٹو، کبھی میراجی پہ ہو تکرار
کبھی ہو بحث میں مجروح و ساحر و سردار
کبھی ہو کرشن، کبھی بیدی و ندیم کی بات
کبھی فراق کی بحثوں کی اور کلیم کی بات
کبھی ہو اختر و سجاد و احتشام کی بات
کبھی ترقی پسندوں کے "پیش امام" کی بات
کبھی فرائڈ، کبھی کارل مارکس کی باتیں
کبھی قدیم ادب پہ ہزار صلواتیں
کوئی ہو فکر کا موضوع، بحث کرتے تھے
ہر اک مقام سے بے خوف ہم گزرتے تھے
ادب ہو، دینی مسائل ہوں یا کہ لادینی
کبھی پہ فرض تھی خود بینی و جہاں بینی
نشست ہوتی تھی اکثر اجنتا ہوٹل میں
وہ بحث ہوتی مکمل میں، نامکمل میں
کہ ڈر یہ ہوتا کہ آپس میں لڑ نہ جائیں کہیں
سب اپنے اپنے عقیدے پہ اڑ نہ جائیں کہیں

مگر یہ خوف، پھر اک قہقہے میں ڈھل جاتا
ہنسی مذاق میں منظر ہی سب بدل جاتا

○

ہمارے قلمی رسائل تھے "جگنو" و "شاہیں"
ہم اپنے شوق کے کرتے کسی طرح تسکیں
ہمیں نے شہر میں "اقبال ڈے" منایا تھا
اسی میں پہلے پہل میں نے کچھ سنایا تھا
وہ ایک نظم کہ اقبال ہی کا پرتو تھی
ہر ایک شعر میں "ضربِ کلیم" کی ضو تھی
شریکِ بزم تھے سردار اور کیفی بھی
نظرؔ، اریبؔ، کنولؔ، مسلم ضیائی بھی
مرے کلام کو ہر شخص نے سراہا تھا
"نظام" کے لئے صہبائی نے بھی چاہا تھا

○

ہوا تھا جب سے "عوامی کتاب گھر" آغاز
وہ بن گیا تھا ہمارا بھی محرم و دمساز
وہاں پہ ایسی کتابیں بھی لوگ پڑھ لیتے
جنہیں خرید نہ سکتے تو پڑھ کے رکھ دیتے
کبھی کبھی کوئی ایسی کتاب مل جاتی
کہ ہم کو کوئی "رہِ انقلاب" مل جاتی
ہم اس پہ چلنے کی تدبیر کرلیا کرتے
خیال و خواب کو تصویر کرلیا کرتے
قلم تو بن ہی چکے تھے، ہمارے تیغ دو دم
بس انتظار میں تھے "سرخ انقلاب" کے ہم
سمجھ رہے تھے کہ جوں ہی وطن ہوا آزاد
عوام راج کریں گے "عوام زندہ باد"
عجیب دور تھا، دن رات یوں گزرتے تھے
کہ روز جیتے تھے ہم لوگ، روز مرتے تھے

○

انہیں دنوں میں گرفتار افتخار ہوا
نئے عتاب حکومت سے ہم دوچار ہوئے
پولیس ادیبوں کے گھر کی تلاشیاں لیتی
کتابیں چھین کے ہم سب کو گالیاں دیتی
جو شہر یارِ دکن کی مخالفت کرتا
تو گویا اپنے وطن کی مخالفت کرتا
ادیب.... باغیِ سرکار جو ٹھہر جاتے
خدا و دین کے غدار وہ ٹھہر جاتے
اریب و راج ہوں، مخدوم ہوں کہ لاہوتی
جو سہہ رہے تھے مسلسل عذاب روپوشی
کبھی نگاہ میں آتے تو دھر لئے جاتے
خدائے وقت کی جیلوں میں بھر لئے جاتے

○

کہانیاں بھی میں لکھتا تھا، شعر بھی کہتا
کوئی ہو مسئلہ، میرا قلم رواں رہتا
"نظام" میں مرا جب وہ فسانہ طبع ہوا
جو "افتخار" کے بارے میں، میں نے لکھا تھا
تو کیا بتاؤں کہ کیا کیا عتاب آئے ہیں
خود اپنے شہر میں کتنے عذاب آئے ہیں
رکھے گئے کئی الزام بے ثبوت و دلیل
میں ہوسٹل سے نکالا گیا بصد تذلیل
کتب، رسائل و اخبار چھن گئے سارے
مری کہانیاں، اشعار چھن گئے سارے
سی آئی ڈی کی نگاہوں میں رچ گیا تھا میں
پولیس میں تھے مرے والد تو بچ گیا تھا میں

ے

میں اپنے شہر سے عنبڑ چلا گیا اک رات
مگر ارادے نئے لے گیا تھا اپنے ساتھ

تھا ان دنوں مرے ابا کا مستقر وہ شہر — فدا تھے "سرخ سویرا" پہ حیدرآبادی
خیال تھا، مرے حق میں ہے بے ضرر وہ شہر — سرہانے رہتے تھے "آہنگ" و "نقشِ فریادی"

ملے گی "صحبتِ بد" سے مجھے نجات وہاں
ادب کی اور نہ سیاست کی ہوگی بات وہاں
مگر یہ بات کہ شیطاں کہاں نہیں ہوتا
جہاں کوئی نہ ہو، شاید وہاں نہیں ہوتا
خدا تو ہے بھی یہاں (لاکھ بے نیاز ہے)
وگرنہ "ظلِ الٰہی" کا کیا جواز ہے
وہاں وہاب کے گھر میں چھپا تھا لاہوتی
وہیں ہوا مجھے معلوم، کیا تھا لاہوتی
وہ چھوٹی ذات کا ہندو تھا، شخص اعلیٰ تھا
فراخ دل تھا، مسلماں کا ہم پیالہ تھا
وہ اپنی مادری بولی میں بات کرتا تھا
مگر قلم کی زباں میں حیات کرتا تھا
جو اس کا طرزِ نگارش تھا، ناقدانہ تھا
یہی پولیس کی نگاہوں میں کافرانہ تھا
پولیس کے خوف سے روپوش ہوگیا تھا وہ
اور اپنے چاہنے والوں میں کھوگیا تھا وہ
وہاب اس کو مسلماں بتائے رکھتا تھا
اور اس طرح اسے سب سے چھپائے رکھتا تھا
اسے خبر تھی کہ میں کون ہوں..... مگر کیا ہوں
میں "افتخار" کا ساتھی ہوں، شعر کہتا ہوں

○

وہاب ادیب تھا اور نوجوان افسر تھا
وہ ہم خیال بھی تھا اور بہت دلاور تھا
پولیس سے اس کے روابط تو افسرانہ تھے
مگر ہمارے گھرانے سے دوستانہ تھے
وہ بیٹے بھائی کا، "مخدوم کا دوانہ تھا
مجاز و فیض سے رشتہ ہی عاشقانہ تھا

○

چھڑی ہوئی تھی تلنگانے میں گوریلا جنگ
وہاں پہ راج کا، مخدوم کا تھا اور ہی ڈھنگ
زمین داروں سے حق چھیننے کھڑے تھے کسان
ہر ایک جابر و ظالم سے لڑرہے تھے کسان
"درانتی اور ہتھوڑا" تھے اپنے نشانِ علم
"نظامِ جبر" کے آگے جمے ہوئے تھے قدم

○

ادھر تھا ہند میں انگریز کے خلاف محاذ
"اگرچہ ایک ہی صف میں تھے غزنوی و ایاز"
مگر تھے مسلم و ہندو الگ الگ ایسے
جدا ہوں ایک بدن ہی میں خون و رگ جیسے
یہ تفرقہ بھی فرنگی ہی کی عنایت تھی
کہ بھائی بھائی کو اک دوسرے سے نفرت تھی

○

خدا تو ایک ہے، لیکن تھے اس کے نام ہزار
اور اس کے گرد تھے شیخ و برہمن و سردار
ہر اختلاف کو انگریز نے ہوا دی تھی
ہر اتحاد کی بنیاد ہی ہلادی تھی
وہ اتحاد، وہ بھگتوں کا صوفیوں کا کرم
ہزار سال کی پیہم رفاقتوں کا کرم
وہ مندروں کے قریں، مسجدوں کی دیواریں
دھنک کی طرح بہم رنگ و نور کی دھاریں
انھیں بکھیر دیا سامراج نے کیسا
بدل کے رکھ دیا انگریز راج نے کیسا

کہ آب و خاک بھی ہندو تھے اور مسلماں تھے
زباں، لباس بھی، کافر تھے اہل ایماں تھے

○

عجیب ذہن دیا تھا فقیہہ و پنڈت نے
یہ کیسا ظلم کیا تھا فقیہہ و پنڈت نے
تھیں حکمران زبانیں تو ہم کو دل سے عزیز
مگر مقامی زبانوں میں کررہے تھے تمیز
کہیں تو ہندی و اردو میں ایک جھگڑا تھا
کہیں پہ مسجد و مندر کا "نیک جھگڑا" تھا
غرض یہ ایک سیاست تھی چند طبقوں کی
خدا کے نام پہ تقسیم تھی زمینوں کی
تو اس زمین کا بٹوارہ کردیا سب نے
کہ ایک ملک کو دو کردیا تھا مذہب نے

○

جو کانگریس ہے وہ رکھتی تھی لیگ پر الزام
کہے یہ لیگ کہ درپردہ کانگریس کا ہے کام
کوئی کہے کہ یہ برطانیہ کی سازش ہے
کسی کو وہم کہ اسلام کی نوازش ہے
کوئی کہے کہ یہ اقبال کا ہے خواب عظیم
جو آج ہوگیا پورا بفضل رب کریم
جناب قائد اعظم کی رہنمائی میں
جناب پنڈت نہرو کی ناخدائی میں
جہاں زیادہ تھے مسلم، بنا وہ پاکستان
جو باقی رہ گیا، کہتے ہیں اس کو ہندوستان
میں سوچتا تھا، ہمارا مآل کیا ہوگا!
اب اس "عظیم ریاست" کا حال کیا ہوگا

(۸)

لگا نہ دل تو میں اک روز جالنہ پہنچا
(وہاں پہ اک مری ننھیال کا گھرانہ تھا)
وہیں تھے حضرت عبدالغفور، میرے بزرگ
بہت ہی نیک، بہت باشعور میرے بزرگ
انہیں کتب کا، رسائل کا شوق بے حد تھا
جدید شعر و ادب کا بھی ذوق بے حد تھا
وہ میر و غالب و اقبال کے تھے شیدائی
مگر ہماری بھی کرتے تھے قدر افزائی
وہ میرے ذوق ادب سے تھے خوش گمان بہت
سبھی بزرگوں میں تھے مجھ پہ مہربان بہت
انہیں تھا، مادر مرحومہ سے بھی بے حد پیار
بڑے ہی شوق سے پڑھتے تھے وہ مرے اشعار
وہ جالنہ کے اک اسکول میں پڑھاتے تھے
بڑے قرینے سے شعر و ادب سکھاتے تھے
میں ان کے گھر میں بہت کم ہی آتا جاتا تھا
(دراصل ان سے مرا دور ہی کا ناتا تھا)
مگر جو، اب کے گیا تو عجیب ہوا احساس
کہ جیسے ایک اجالا ہوا ہے دل کے پاس
کھڑی تھی سامنے اک خوش جمال دوشیزہ
سلیقہ مند، بڑی خوش خصال دوشیزہ
یہ ان کی بیٹی تھی، معراج نام تھا اس کا
مصورانہ شفق، صبح و شام تھا اس کا
نظر نظر سے ملی اور جھک گئی چپ چاپ
جہاں رکی تھی وہاں پہ ہی رک گئی چپ چاپ
بس اتنا یاد ہے، اک زیر لب تبسم تھا
درون دل کوئی خاموش سا ترنم تھا
ادب کے ساتھ جب اس نے مجھے سلام کیا

اور اس کے بعد جو ہم نے بہم کلام کیا
نہ جانے کتنے ہی اشعار جاگ اٹھے مجھ میں
جو صف بہ صف پسِ اظہار جاگ اٹھے مجھ میں
مگر میں چپ ہی رہا، اک شعر بھی سنا نہ سکا
اشارتاً بھی اسے رازِ دل بتا نہ سکا

○

میں جب وہاں سے چلا تو عجیب عالم تھا
کہ دل میں پھول کھلے تھے اور آنکھ میں نم تھا
قدم قدم پہ یہ لگتا، قریب تر ہے کوئی
ہوا کی طرح بہ ہر گام ہم سفر ہے کوئی

○

عجیب دور تھا، میں بھی تھا کس قدر ناداں
پہنچ گیا تھا میں اک بات میں کہاں سے کہاں
یہ ٹھیک ہے کہ سلیقے سے کی تھی اس نے بات
تو میرے دل میں ستاروں کی ہوگئی برسات
میں چاند بن گیا اور سب ستارے باراتی
عجیب خواب تھے یک طرفہ اور لمحاتی
جب آنکھ کھلتی تو خود پہ ہنسی بھی آتی تھی
مرے جنون کا ہر اک شے مذاق اڑاتی تھی

○

دراصل یہ مری تنہائی کا تقاضا تھا
جو مرے خوابِ حسیں کا فریب تازہ تھا
یہ دل، ازل سے جو پیاسا رہا محبت کا
لرزتے ہاتھ میں کاسہ رہا محبت کا
ذرا سی چھاؤں جو دیکھی تو گھر بنا بیٹھا
تصورات میں دل کا نگر بسا بیٹھا

○

میں اپنے گھر میں بھی رہتا تھا، اپنی ذات میں گم
اداس اداس پریشاں، تصورات میں گم
کبھی کو فکر تھی، آخر مجھے ہوا کیا ہے
یہ روگ کیسا لگا ہے، مری دوا کیا ہے
میں کس سے کہتا کہ میں نے بھی میر کے مانند
جو چہرہ چاند میں دیکھا، وہ تیر کے مانند
مجھے بھی کر گیا گھائل، کہ جیسے میر ہوئے
مجھے بھی کرگیا پاگل، کہ جیسے میر ہوئے
سبب بتاتا تو سب کہتے مجھ کو ”آوارہ“
کہ میں بھی میر کے مانند بھی تھا ناکارہ
میں میٹرک میں بھی اک بار ہوگیا تھا فیل
پولیس میں ہوتے نہ ابا، تو جاچکا تھا جیل
اک ایسے لڑکے کو کوئی پناہ کیا دیتا
کہ سنگ رہ کو کوئی دل میں راہ کیا دیتا
سو میں بھی اپنے ادھورے خیال و خواب کے ساتھ
یہ شہر چھوڑ کر بلدہ چلا گیا اک رات

(۹)

وہ شہر، شاہ دکن کا تھا پائے تخت جہاں
وہ شہر، جمع تھے دنیا کے اہل بخت جہاں
وہی کہ جس کا تھا شہرہ کے تمام عالم میں
جو بے مثال تھا، پورب میں اور پچھم میں
جہاں پہ رہتے تھے نواب و یار جنگ تمام
کہ سونے چاندی کے ہوتے تھے خشت و سنگ تمام
جہاں کے کوچہ و بازار، کہکشاں کی طرح
جہاں کی ساری ہی دھرتی تھی آسماں کی طرح
تمام لوگ مہذب، تمام لوگ شریف
بزرگ کرتے تھے جن کی بہ صد صفت توصیف
غرض ہزار تھے قصے ہزار افسانے
کہ ایک ساقی تھے اور صد ہزار پیمانے

○

قلی قطب کی محبت کا آئینہ تھا جو شہر
دکن کے حسن ثقافت کا آئینہ تھا جو شہر
وہ جس کو بھاگ متی کا کہیں سہاگ مگر
قطب نے پیار سے جس کو کہا تھا "بھاگ نگر"
اسی کو حیدر آباد آج کہتے ہیں
جہاں پہ اب بھی ہے دولت کا راج کہتے ہیں

○

میں پہلی بار اسی شہر کی طرف تھا رواں
ہزار دھڑکے تھے دل میں، ہزار ہا ارماں

○

میں کاچی گوڑہ پہ جس وقت ٹرین سے اترا
نظر کے سامنے منظر، کچھ اور ہی ابھرا
وہاں تھے تانگے بھی، موٹر بھی اور رکشا بھی
تھے آدمی بہت اعلیٰ بھی اور ادنیٰ بھی
نظارہ یہ بھی وہاں میں نے دیکھا پہلی بار
کہ آدمی ہی سواری تھا، آدمی ہی سوار
بنا رکھے تھے خدا نے عجیب سے سانچے
کہیں تو گوشت کے تودے تھے اور کہیں ڈھانچے
وہ آدمی کہ جو رکشا چلا رہا تھا یہاں
وہ جانور کی طرح بوجھ اٹھا رہا تھا یہاں
کبھی میں دیکھتا خود کو، کبھی یہ غور اس کو
مگر تھا کون، سمجھتا جو اس تجسس کو
میں سوچتا مگر اس سوچ نے دیا کیا تھا
یہ میری دربدری تو صلہ اسی کا تھا
یہاں میں آیا تھا خود سنوارنے کے لئے
اور اپنا جوہر پنہاں، ابھارنے کے لئے
کہ اپنی ذات پہ تھا، مجھ کو اعتبار بہت
اور اپنے ذہن پہ بھی ناز و افتخار بہت
میں کس طرح کوئی احساں اٹھاتا لوگوں کا
اور اپنا صبر تو ظرف آزماتا لوگوں کا
سو میں مگن رہا خود میں، کسی سے کچھ نہ کہا
پڑا جو وقت بھی مجھ پر، وہ مسکراکے سہا
کبھی میں رات کو مسجد میں جا کے سوجاتا
یہ فیض در بدری ہی، خدا کا ہوجاتا
مگر امام نے "ہونے" نہیں دیا مجھ کو
عشاء کے بعد بھی سونے نہیں دیا مجھ کو
وہ بند کرگیا مجھ پہ خدا کا دروازہ
اور آج تک میں ادا کررہا ہوں خمیازہ

○

خدا کے گھر میں بھی جب کوئی آسرا نہ ملا
تو اولیاء کا فقیروں کا آستانہ ملا
میں شب کو سوتا وہیں، صبح کو نکل پڑتا
جدھر بھی ملتا کوئی کام ادھر ہی چل پڑتا
پھر ایک دن کسی اخبار میں خبر یہ پڑھی
"جناح" کو بھی ضرورت ہے ایک شاعر کی
تو اس خبر کو خدا کا کرم سمجھتے ہوئے
اور اپنے تئیں یہ "وقار قلم" سمجھتے ہوئے
میں فرضی نام سے "قطعہ نگار" بن بیٹھا
اور اپنے دور کا آئینہ دار بن بیٹھا

○

دکن کے لوگ بھی تھے کیا عجب سیاست داں
سمجھ رہے تھے یہاں بھی بنے گا پاکستان
یہاں جو ایک مسلماں کی بادشاہت تھی

تو وہ سمجھتے تھے "اسلام" کی حکومت تھی
وہ خوش گماں تھے کہ ہے اس کے پاس دولت بھی
اور اس کے سر پہ ہے "سرِ رشتہ" کا دستِ شفقت بھی
ہیں دائیں سمت بھی ہم اور بائیں سمت بھی ہم
جنوب میں بھی اڑے گا ہمارا ہی پرچم
جناب قاسم رضوی..... "مجاہدِ اعظم"
(وہی جو اہلِ دکن کے تھے "قائدِ اعظم")
سو اب تو دلی میں ہوگا ہمارا اگلا قدم
اڑے گا لال قلعہ پہ "اسلام" کا پرچم

○

یہ خواب دیکھ رہے تھے، سبھی امیر و غریب
تمام شاعر و فن کار و مولوی و خطیب
کسے مجال کہ کچھ اختلاف کر جائے
اگر ہے شوق تو پھر جان سے گزر جائے
تو خیر اسی میں تھی، چپ چاپ زندگی کیجیے
خدائے وقت کی خاموش بندگی کیجیے

۱۰

ادھر تو مسئلہ روزگار تھا اور میں
ادھر وہ میرا گلِ نوبہار تھا اور میں
وہ ایک خواب کہ تعبیر کا تمنائی
وہ ایک خیال کہ تحریر کا تمنائی
وہ ایک لفظ جو شاعر بنا گیا مجھ کو
وہ ایک لمحہ جو جینا سکھا گیا مجھ کو
وہ ایک پھول، جو دل کی طرح تھا پہلو میں
اک آرزو کہ میں بس جاؤں اس کی خوشبو میں
مگر یہ بات کہ دل کو زبان نصیب نہ تھی
زبان تو خیر زباں ہے، فغاں نصیب نہ تھی

عجیب شخص تھا میں، بزدل و بہادر بھی
کہ جس سے عشق کیا، کھل سکا نہ اس پہ کبھی
سو یوں ہوا، مرے اشعار کہہ گئے ہر راز
(یہ میرے عشق، مری شاعری کا تھا اعجاز)
سبھی سمجھ گئے کوئی مرض لگا ہے مجھے
جنوں یہ قیس سا، فرہاد سا ہوا ہے مجھے
یہ حال زار، یہ دیوانہ پن، یہ مایوسی
بھرے جہاں میں یہ تنہائی اور محرومی
وہی جو میرا مقدر تھا، حاصلِ غم تھا
میں کیا بتاؤں جو اس وقت میرا عالم تھا
میں اس کا نام زباں پر کبھی لا نہ سکتا تھا
اور اپنا غم بھی کسی سے چھپا نہ سکتا تھا

○

انہی دنوں اسے آنے لگے پیام کئی
امیدواروں میں لکھے ہوئے تھے نام کئی
سنا یہ پھر کہ کہیں اس کی بات ٹھہری ہے
مرے نصیب میں پھر ایک رات ٹھہری ہے
میں سوچتا رہا پہروں کہ کیا کیا جائے
کوئی ہو ایسا جسے رہنما کیا جائے
تو اک عزیز کو ہم راز کرلیا میں نے
شفیق و ہمدم و دم ساز کرلیا میں نے
وہ جن کا اسم گرامی تھا منتجب الدین
بہت خلیق، بہت مہرباں، بہت ہی متین
وہ اس گھرانے کے داماد تھے، بڑے داماد
(خدا کرے، وہ گھرانہ رہے سدا آباد)
یہ سب انہیں کا کرم ہے، انہیں کا ہے احساں
جو آج میں نظر آتا ہوں، اس قدر شاداں
انہوں نے میری سفارش، میری وکالت کی

اور اس طرح مجھے دولت ملی، محبت کی
مگر یہ رشتہ مرے گھر کو ناپسند ہوا
اور اس قدر کہ ہر اک رستہ مجھ پہ بند ہوا
مرا خمیر بغاوت سے تو اٹھا ہی تھا
مرا وجود مزاجاً بھی ایک سپاہی تھا
تو اپنے گھر سے بغاوت کی ٹھان لی میں نے
جو ہو سو ہو، یہی تقدیر جان لی میں نے

○

یہ لوگ جن سے نیا رشتہ استوار ہوا
وہ میری مادرِ مرحومہ کا گھرانہ تھا
جو ہونے والے تھے میرے سسر، جناب غفور
تبادلے کے نتیجے میں جا بسے "لاتور"
وہیں پڑھانے لگی ایک مدرسے میں "وہ"
وہی، مرے لئے "معراج" بن گئی تھی جو
پھر ایک دن یہ سنا، بلدہ آرہے ہیں وہ سب
(میں خوش کہ ہوگیا مجھ پر بھی مہرباں، مرا رب)
مرے "سسر" مرے بارے میں جانتے ہی تھے
مجھے وہ ایک قلم کار مانتے ہی تھے
مگر کھلا نہ تھا ان پر ابھی مرا کردار
میں کرتا کیا ہوں یہاں، کیسے ہیں مرے اطوار
یہاں تھے حضرت مسلم ضیائی ان کے رفیق
جو میرے بھی تھے "یکے از برادران شفیق"
جو میرا حال تھا، مسلم ضیائی جانتے تھے
میں کیسا شخص ہوں، یہ میرے بھائی جانتے تھے
انھوں نے کی میری تعریف اور ایسی کی
کہ بات ہوگئی پکی ہماری "منگنی" کی
عجیب لمحہ تھا آنکھوں میں اشک بھر آئے
جو مجھ پہ گزری، کسی کو کون یہ سمجھائے

یہ لمحہ وہ تھا کہ اپنے خدا پہ پہلی بار
امڈ کے آیا مرے دل میں پیار ایسا پیار
کہ گر پڑا تھا میں سجدے میں اور روتا رہا
اور اپنے اشکوں سے دل کا غبار دھوتا رہا
وہ دن ہے آج بھی روشن مری نگاہوں میں
بچھے ہوئے تھے ستارے سے میری راہوں میں
یہ زندگی مجھے کتنی حسین لگتی تھی
ہر ایک چیز مجھے بہترین لگتی تھی

॥

یہاں کچھ ایسے بھی اہل قلم تھے جن کی نظر
وہ پڑھ رہی تھی، لکھا تھا جو "لوح فردا" پر
انہیں خبر تھی، یہاں جو بھی ہونے والا ہے
نظام کا جو اثاثہ ہے، کھونے والا ہے
بدلتے وقت کے تیور سمجھ رہے تھے لوگ
زمیں پہ رہ کے فلک سے الجھ رہے تھے لوگ
یہ وہ زمانہ تھا "زیرِ زمیں" تھے جب مخدوم
مگر زمیں پہ انہیں کے کلام کی تھی دھوم
وہ جنگلوں میں تھے ہتھیار بند، محو ستیز
مگر تھا شہر میں ان کا کلام شور انگیز
"دیارِ ہند کا وہ راہبر ..... تلنگانہ"
"بلا رہا ہے بہ سمت دگر ..... تلنگانہ"
"پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربت کاری"
"حضور آصف سابع پہ ہے غشی طاری"
لبوں پہ پھول سہی، دل میں آگ جلتی تھی
اک آرزو تھی کہ خوابوں میں آنکھ ملتی تھی

○

دکن میں کانگریسی بھی تھے، اشتراکی بھی
سپاہ قاسم رضوی بھی، فوج شاہی بھی

کہیں تھی شاہ پرستی، کہیں تھی جاگیرداری
بصد فریب سیاست کی تھی عمل داری
کوئی یہ کہتا کہ بھارت ہمارا دشمن ہے
اگر ہے دوست ہمارا تو "سٹرلی کاٹن" ہے
دکن کے سارے مسلماں تھے خوش گمان بہت
تھا ان پہ عالم اسلام مہربان بہت
ہمارے روز و شب و ماہ و سال ... "ایرانی"
"دیار ترک"..... ولی عہد کا تھا سسرالی
عرب سے خاص تعلق، عجم سے یارانہ
الگ الگ سہی ہر ملک، ایک افسانہ
سیاست ایک ہی ہوتی ہے، بادشاہوں کی
(جہاں میں کم نہیں تعداد، کم نگاہوں کی)

○

ادیب ہوگئے دارالسلام میں یکجا
وہ مختلف تھے، ہوئے "عرف عام" میں یکجا
معین ہوں کہ وہ تحسین، جلیس ہوں کہ نظر
جناب قاسم رضوی کے سب تھے زیر اثر
وہ ریڈیو ہو کہ اخبار، راستے ہوں کہ بزم
برستے رہتے تھے مضمون، گرجتی رہتی تھی نظم
ترانے گونجتے رہتے، فضاؤں میں ہر سو
ہر ایک شہر میں شعلہ بنا ہوا تھا لہو
خطیب، غازی گفتار ہوتے جاتے تھے
ادیب، برہنہ تلوار ہوتے جاتے تھے
وہ مسجدیں ہوں کہ گھر ہوں کہ کوچہ و بازار
تمام ملک تھا، لڑنے کے واسطے تیار

○

میں اس زمانے میں اخبار چھوڑ بیٹھا تھا
اور اپنا رشتہ کہیں اور جوڑ بیٹھا تھا

انہیں دنوں مری آواز سن کے مائک پہ
لے آئے مجھ کو دکن ریڈیو پہ بھائی ظفر
یہاں وراثت و ماجد تھے، بدر، رضواں تھا
امیر احمد خسرو سا، اک غزل خواں تھا
میں قدر دان تو "فن کا" تھا، ہم خیال نہ تھا
وہ میرے ساتھ تھے، میں ان کے حسب حال نہ تھا
میں لکھتا رہتا "سویرا" میں بھی "پیام" میں بھی
مری رسائی تھی اس طرح خاص و عام میں بھی
کہ ایک دن یہ خبر گونجنے لگی گھر گھر
دکن میں رات در آیا ہے بھارتی لشکر
یہ حملہ "کفر" نے "اسلام" پہ کیا گویا
"بتوں" کا پھر ہے "خدا" سے مقابلہ گویا
یہ جنگ..... جنگ مسلسل ہے "کفر و ایماں" کی
اور اس میں فتح تو ہونی ہی ہے مسلماں کی
ہمارے ساتھ صف آراء تھے سارے جن و ملک
ہماری تیغ ہلال اور ہماری ڈھال، فلک
مگر محاذ پہ پہنچی نہیں "نظام" کی فوج
لڑی ہے بھارتی لشکر سے بس عوام کی فوج
عوام ..... یعنی دکن کے وہ نوجواں بیٹے
جو آکے جوش میں ٹینکوں کے آگے جا لیٹے
نہ ان کے پاس تھا فوجوں سا اسلحہ کوئی
نہ ان کو جنگ میں لڑنے کا تجربہ کوئی
وہ نوجواں تھے رضا کار..... موت سے راضی
شہید ہونے کو تیار..... قوم کے غازی
سو ایک دن ہی میں یہ جنگ اختتام کو پہنچی
سحر طلوع ہوئی تھی کہ شام کو پہنچی
اسیر ہوگئے حضرت "مجاہد اعظم"
اور ان کے سب وزراء بھی "بصد وقار و حشم"
کھلا کہ جو بھی ہوا "شاہ" کی رضا سے ہوا
"نصیب" کا تھا لکھا "مرضیٔ خدا" سے ہوا

(۴)

وہ رات، قبر کے مانند، دن قیامت خیز
زمیں پہ عالمِ ہو، آسمان وحشت خیز
نگاہ خوف زدہ، دل کی دھڑکنیں خاموش
تمام شہر نظر آئے مرگ در آغوش
نہ تیغ زن ہی کہیں تھے نہ وہ قلم کے دھنی
لبوں میں دفن تھا جوش و خروشِ نعرہ زنی
ہر ایک لحہ یہ دھڑکا کہ مار دے نہ کوئی
ہزار سال کا قرضہ اتار دے نہ کوئی
وہ نفرتیں جو بہت پیار سے ابھاری گئیں
دلوں میں "دین" کے عنوان سے اتاری گئیں
بڑے ہنر سے سیاست کے کام آئی تھیں
دل و دماغ پہ "دانشورانہ" چھائی تھیں
یہ سب انھیں کا کرم تھا کہ اپنا سایہ بھی
ہمارا اپنا ہی ہو کر لگے پرایا بھی
عجیب دور تھا، کوئی کسی کا یار نہ تھا
پڑوسیوں کا پڑوسی کو اعتبار نہ تھا
خبر نہ تھی کہ بھرے شہر میں ہے کون کہاں
بس اک اشارہ کہ سب جاچکے ہیں پاکستان

○

میں ریڈیو پہ اکیلا ہی رہ گیا تھا اب
جو لوگ تھے بھی کہیں تو سبھی تھے مہر بہ لب
میں فکر مند تھا لاتور کے لئے بے حد
کہ اس سے ملتی تھی ہندوستان کی سرحد
جناب قاسم رضوی کا بھی تھا شہر وہی
(کہ تھا بنائے عداوت، بنائے قہر وہی)
یہ خوف تھا کہ بہت لوٹ مار ہوگی وہاں
تباہ ہونے سے شاید بچے کسی کا مکاں
مگر کسی کو کسی نے بھی لوٹنے نہ دیا
پڑوسیوں کے بھی رشتہ کو ٹوٹنے نہ دیا
یہ ہندوؤں کی مسلماں سے تھی وفا گویا
برس برس کی رفاقت کا تھا، صلہ گویا
کیا تھا فوج نے بھی اہتمام امن بہت
عوام نے بھی کیا انتظام امن بہت
جو لوگ بھاگ چکے تھے، وہ لوٹ کر آئے
کہ منتظر تھے بہت اب بھی ان کے ہمسائے

○

وہ لوگ جو اسے اک ہار جان بیٹھے تھے
وہ دل کو تھامے، پئے امتحان بیٹھے تھے
سمجھ رہے تھے کہ اب کافروں کا ہوگا راج
نہ اپنا ملک رہا ہے نہ اپنا تخت و تاج
کسی بھی قوم کی پہچان، بادشاہ سے ہے
کسی بھی ملک کی طاقت فقط سپاہ سے ہے
جو بادشاہ نہ ہوگا تو فوج کیا ہوگی
جو بحر ہی نہیں ہوگا تو موج کیا ہوگی
ہر ایک ملک میں لاکھوں عوام ہوتے ہیں
جو بھیڑ بکری کی صورت مدام ہوتے ہیں

○

کسی بزرگ کی یہ سوچ بھی تھی غور طلب
(اور ان کی سوچ پہ تنقید بھی ہے حد ادب)
وہ کہہ رہے تھے، قیامت کے ہیں یہ سب آثار
ہزاروں سال کے "پس ماندہ" سر پہ ہوں گے سوار
یہ بھیل، گونڈ، دراوڑ، یہ ڈھیڑ، مانگ، چمار
وہ جن سے اپنے بزرگوں نے لی سدا بیگار
سنا ہے ان کو بھی کرنا پڑے گا جھک کے سلام*
جنہیں خدا نے بنایا غلام ابن غلام
غلام بن کے رہیں گے اب اہل ایماں سب
اچھوت ہی کی طرح ہوں گے اب مسلماں سب

○

عجیب سوچ کے انداز تھے، عجب معیار
نہ زندگی کی حقیقت نہ آدمی کا وقار

○

ہر ایک چیز کی قیمت زر و زمین سے تھی
ہر ایک "قدر" عبارت زر و زمین سے تھی
مگر تضاد کا عالم بھی دیدنی تھا بہت
جو مسئلہ رہا ناگفتہ، گفتنی تھا بہت
امیر کہتے تھے خود کو بہ انکسار، فقیر
غریب خود کو جتاتے ـــ امیر ابن امیر
الگ الگ سبھی لوگوں کے طور ہوتے تھے
وہ گھر میں اور تو باہر کچھ اور ہوتے تھے

○

کوئی بھی قوم ہو، ہوتی ہے جب زوال پذیر
تو اس کے ایک سے رہتے نہیں ہیں ذہن و ضمیر
وہ اپنے آئینے میں سب کا عکس دیکھتی ہے
"خلا" میں اپنے ستاروں کا رقص دیکھتی ہے

زمیں پہ پاؤں نہیں اور آسماں پہ دماغ
جلائے جاتی ہے برسات کی ہوا میں چراغ
ہر ایسی قوم کا انجام سب نے دیکھا ہے
خدا سے جو ملا انعام، سب نے دیکھا ہے
جو سازشوں سے بنی تھی ریاستیں، ٹوٹیں
جو بے زمین رہی تھیں ثقافتیں، ٹوٹیں
بکھر کے رہ گئی ساری نمائشی تہذیب
سفید پوشوں کی جھوٹی ستائشی تہذیب

○

زمیں سے رشتہ جو قوم اُستوار رکھتی ہے
شکست میں بھی بقا، پائیدار رکھتی ہے

○

(نوٹ... یہ منظوم خود نوشت سوانح حیات "آئینہ در آئینہ" کے عنوان سے ماہنامہ "افکار" کراچی میں قسط وار ماہ بہ ماہ شائع ہو رہی ہے۔ اہل ادب جانتے ہیں کہ یہ اردو شاعری میں پہلا تجربہ ہے (مرتب)

اشاریہ

(۱)

۱۔ فتح خان = ملک عنبر کا بیٹا ۲۔ تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا = (اقبال) ۳۔ خلد آباد = (عموی تلفظ) یہاں صوفیاء اور اولیا کے متعدد مزار ہیں ۴۔ آصف جاہ = سلطنت آصفیہ کا بانی، میر قمرالدین خان نظام الملک آصف جاہ اول ۵۔ ریاست = حیدر آباد دکن ۶۔ ولی = جنہیں ولی اورنگ آبادی، ولی دکنی اور ولی گجراتی بھی کہتے ہیں ۷۔ سراج = سراج اورنگ آبادی ۸۔ شفیق = لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی (تذکرہ چمنستان شعراء کے مصنف ۱۷۶۲ء) ۹۔ صفی = صفی اورنگ آبادی ۱۰۔ دلگداز = عبد الحلیم شرر کا رسالہ ۱۱۔ اساطیر = ایلورہ اور اجنتا کی دیو مالا ۱۲۔ طریقت = تصوف ۱۳۔ گوریلا جنگ = مغل شہنشاہیت کے خلاف شیواجی کی لڑائی جس کی فوج میں بہت سے مسلمان بھی تھے ۱۴۔ گلشن گفتار

= حمید اورنگ آبادی کا لکھا ہوا تذکرہ جس کا سال تحریر بھی وہی ہے جو میر تقی میر کے تذکرہ "نکات الشعراء" کا ہے (۱۷۵۲ء) مگر میر صاحب چونکہ مشہور اور بڑے شاعر ہیں اسلئے محققین نے ان کے تذکرے کو اردو کا اولین تذکرہ قرار دیا تاہم یہ فیصلہ ابھی تک معرض بحث میں ہے ۱۵۔ دیوگری کا قلعہ = دولت آباد کا قلعہ جسے علا الدین نے فتح کیا تھا ۱۶۔ گاؤ مکھ = نہر عنبری کا منبع ۱۷۔ مخزن = گنج کے وہ ستون جن سے گرم و خنک پانی بیک وقت الگ الگ نلوں سے آتا تھا' انگریزوں نے تحقیق کے دوران انہیں توڑ دیا۔ ۱۸۔ پن چکی = نہر عنبری سے یہ چکی چلتی تھی ۱۹۔ مقبرہ = گنج کی وہ عمارت جو "تاج محل" جیسی ہے اورنگ زیب کی بیوی رابعہ درانی (دلرس بانو) کے نام سے منسوب ہے ۲۰۔ بلند دروازے = اورنگ آباد کی فصیل میں مجموعی طور پر ۲۱ دروازے تھے' اب صرف چھ رہ گئے ہیں۔ دہلی دروازہ' روشن دروازہ' پٹن دروازہ' بھڑکل دروازہ اور محمود دروازہ ۲۱۔ انجمن = انجمن ترقی اردو ۲۲۔ کالج = عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج جہاں میں نے تعلیم پائی جس کے پہلے پرنسپل بابائے اردو مولوی عبد الحق تھے ۲۳۔ اہل علوم = انجمن ترقی اردو اور عثمانیہ کالج کے سبب جو اہل علم و دانش یہاں آباد رہے ان میں اختر حسین رائے پوری' صدق جائسی' درد کاکوروی' شیخ چاند' آغا صادق سروش' میجر آفتاب حسن' یعقوب عثمانی' سکندر علی وجد اور علمائے دین میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا نام سرفہرست ہے۔

(۲)

۱۔ طریقتی = (صوفی) سید نور اللہ حسینی' میرے جد اعلیٰ جو ایک بڑے صوفی تھے۔ محمد تغلق یا اورنگ زیب کے دور میں اورنگ آباد کے ایک گاؤں "رنجن گاؤں" میں آباد ہوگئے تھے۔ ۲۔ شریعتی = (علمائے شریعت) مفتی ضیا یار جنگ اور میرے خاندان کے دوسرے بزرگ جو ریاست میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ ۳۔ شاہی عنایتیں = ہمارا خاندان "انعام داروں" کا خاندان کہلاتا ہے' یعنی اعزاز یافتہ زمین دار جو عام زمین داروں میں زیادہ معزز سمجھے جاتے تھے۔ ۴۔ دشت کنعاں = مشرق وسطیٰ میں حضرت یعقوب علیہ السلام (اسرائیل) کا آبائی مقام جہاں سے (قحط کے سبب) انہوں نے اپنے قبیلے کے ساتھ مصر ہجرت کی (جہاں حضرت یوسف علیہ السلام' حکومت کے ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ "راشنگ سسٹم" (اناج کی مساویانہ تقسیم) انہیں کی ایجاد ہے) ۵۔ چاہ یوسف کنعاں = وہ کنواں جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے سوتیلے بھائیوں نے زخمی کرکے ڈال دیا تھا۔ حضرت یوسف' حضرت یعقوبؑ کے چہیتے بیٹے تھے جن کے غم میں وہ روتے روتے اندھے ہوگئے تھے۔ ۶۔ دادی اماں کے بھائی = قاضی رکن الدین (قاضی شہر) ۷۔ بھیری جاگیر = یہ چمنا راجہ کے نام سے منسوب ہے۔ یہاں میری دادی کے والد اور بھائیوں کی زمینیں تھیں۔ ۸۔ "اسم خاص" میں کہیں کہیں ضرورت شعری کے طور پر میں نے "عموی تلفظ" اختیار کیا ہے۔ ۹۔ سند = فوجی خدمات کے صلے میں انعام خسروانہ کی اسناد

(۳)

۱۔ پٹن = دریائے گوداوری کے کنارے ایک چھوٹا سا تاریخی شہر جہاں کی "یاترا" بہت مشہور ہے۔ یہاں کے بڑے مندر میں عبادت کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ ۲۔ قاضی کی بیٹی = میرے نانا قاضی اسماعیل الدین کی دختر لطف النساء بیگم (میری والدہ) ۳۔ گنگاپور ۴۔ بھیری ۵۔ رنجن گاؤں = یہ تینوں مقامات میرے ددھیالی گاؤں ہیں جہاں ہماری آبائی زمینیں اور مکان ہیں۔ یہاں اب بھی میرے بہت سے رشتہ دار رہتے ہیں۔ ۶۔ بہن = حبیب النساء (میری بڑی بہن)

۷۔ آستانے= حضرت نظام الدین اولیاء مقبول الٰہی کی درگاہ جو اورنگ آباد میں ہے۔ ۸۔ ولی عہد = ریاست میں سب سے بڑے بیٹے (یعنی وارث تخت و تاج) کو عموماً "ولی عہد" کے خطاب سے نوازا جاتا تھا چنانچہ بادشاہ کی پیروی میں ہم "رعایا" کے بڑے بیٹے بھی اپنے گھر کے "ولی عہد" کہلاتے تھے۔ ۹۔ تراب علی = (عموی تلفظ اختیار کیا گیا) ۱۰۔ سنا ہے چھوٹے بھائی کی ولادت ہی والدہ کی وفات کا سبب بنی اور دونوں رخصت ہوگئے۔

(۴)

۱۔ قلعہ ارک کا قبرستان جہاں سراج اورنگ آبادی کا مزار ہے۔ میری والدہ کی قبر بھی وہیں ہے۔ ۲۔ چچا = میر ممتاز علی
۳۔ پھوپھی = قاضی شفیع (شفیع الدین فرقت کی والدہ ۴۔ بہن = حبیب النساء بیگم

(۵)

۱۔ ماں = حور النسا بیگم بنت سید نور المقتدیٰ (عم زاد مفتی ضیاء یار جنگ) خدا کے فضل سے میری دوسری والدہ ابھی موجود ہیں۔ میرے منتخب کلام کا مجموعہ "حرف حرف روشنی" (مطبوعہ ۱۹۸۶ء مکتبہ جامعہ دہلی) انہیں کے نام سے معنون ہے اور اس کا پاکستانی ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۸۸ء مکتبہ المنصفین کراچی) میری مرحوم والدہ لطف النساء بیگم بنت قاضی اسماعیل الدین کے نام معنون ہے۔ ۲۔ عظیم ریاست= حیدر آباد دکن ۳۔ درس گاہ اعلیٰ = جب میں نے ہوش سنبھالا تو اس وقت ایک چھوٹا سا "مدرسہ صنعت و حرفت" تھا جہاں سرٹیفکیٹ کورس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اب ماشاء اللہ اورنگ آباد میں ہر "علم" کا کالج (سنا ہے جملہ ۸۰ کالج ہیں) اور دو یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ مرہٹواڑہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر امبیڈکر یونیورسٹی ۴۔ لائبریری = حضرت نظام الدین مقبول الٰہی کی درگاہ سے متصل ایک چھوٹا سا مذہبی کتب خانہ، وہاں کے سجادہ نشین قیصر میاں نے قائم کر رکھا تھا اور بس...... پن چکی کا کتب خانہ اور بلدیہ لائبریری (چوک) برسوں سے بند پڑی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں ہم نوجوانان اورنگ آباد نے اسے کھولا اور اپنی "انجمن نوجوانان اورنگ آباد" کا دفتر قائم کرکے اس کا نام "ادبستان" رکھا۔ جس کے تحت اورنگ آباد میں پہلا "یوم اقبال" منایا گیا۔ اس انجمن کے اراکین میں اختر الزماں ناصر، ممتاز اختر (ممتاز احمد خان) عباس اخگر (عباس انجم) یوسف شاہین، بلند اقبال، عنایت کمال، شفیع الدین فرقت، اولاد حیدر زیدی، (فرہاد زیدی) اطہر رضوی (باغی) ۔ فرید احمد، کامریڈ افتخار، نسیم الحسن موہانی۔ اور راقم الحروف (حمایت علی شاعر) شامل تھے۔ ہم لوگ مختلف قلمی رسائل بھی نکالتے تھے۔ جگنو۔ شاہین اور شرارہ وغیرہ۔ ۵۔ نورس = عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج کا رسالہ جو کبھی کبھی شائع ہوتا تھا۔ شہر سے کوئی رسالہ یا اخبار نہیں نکلتا تھا۔ سب بلدہ کے اخبارات کے منتظر رہتے تھے مثلاً" رہبر دکن۔ میزان۔ پیام۔ جناح اور بعد ازاں رہنمائے دکن۔ عوام، خورشید، منزل اور سیاست وغیرہ (اب اورنگ آباد سے چھ اردو کے اخبارات نکلتے ہیں جس میں سب سے بڑا اخبار "اورنگ آباد ٹائمز" ہے اس کے علاوہ ڈان اور عالمگیر وغیرہ ہیں۔ ۶۔ بلدہ = حیدر آباد دکن ۷۔ خدا کا سایہ = ظل اللہ
۸۔ نواب میر عثمان علی خان شاعر بھی تھے اور نواب فصاحت جنگ جلیل مانک پوری کو ان کی استادی کا شرف حاصل تھا (جو امیر مینائی کے شاگرد تھے) استاد جلیل کا ایک مشہور شعر ہے

میں جب چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے
تم جب چلو، زمین چلے، آسمان چلے

اور میر عثمان علی خان کی ایک غزل کا مقطع ہے۔

سلاطین سلف سب ہوگئے نذر اجل عثماں
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

یہ مقطع بہت مشہور تھا لیکن ریاست کے آخری دنوں میں جب سید قاسم رضوی کی سیاست عروج پر تھی اس مصرعے کو یوں پڑھا جانے لگا

مسلمانوں سے تیری سلطنت کا ہے نشاں باقی

۹۔ ثواب = مشدد اور بالفتح' دونوں طرح جائز ہے۔ ۱۰۔ باب علم = حضرت علی کے بارے میں ایک حدیث ۔۱۱۔ سرمد = فارسی زبان کے ایک بڑے صوفی شاعر جو ٹھٹھہ (سندھ میں رہتے تھے۔ شاہجہاں کے بڑے بیٹے دارالشکوہ کے ہم عصر اور ہم خیال تھے۔ سرمد کو اورنگ زیب کے ملا قوی سے فتویٰ لیکر قتل کروادیا گیا تھا مگر تاریخ نے انہیں "شہید" قرار دیدیا۔ وہ آج بھی سرمد شہید کے نام سے مشہور ہیں۔ سرمد کی رباعیات کے مجموعے پر مولانا ابو الکلام آزاد کا فکر انگیز مقدمہ قابل مطالعہ ہے۔ (دارالشکوہ کو بھی اورنگ زیب نے قتل کروادیا تھا' دارا نے صوفیائے کرام کے بارے میں کتابیں بھی لکھی ہیں مثلاً" سکینۃ الاولیاء وغیرہ جن میں تصوف کی مسلک و مسائل کے بارے میں تفصیلی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ۱۲۔ ظل الٰہی = مسلمان بادشاہ خود کو عموماً" ظل الٰہی یا ظل اللہ کہلواتے یا کہتے رہے۔ اس طرز فکر کے خلاف میں نے ایک افسانہ بھی لکھا تھا جو "بدلتے زاویئے" کے عنوان سے ہفتہ وار "شاہد" (عید نمبر ۱۹۴۸ء) بمبئی میں شائع ہوا تھا (ایڈیٹر عادل رشید) ۱۳۔ خلافت = بادشاہت کے خلاف اسلام کا ایک انقلابی اقدام تھا مگر سبھی مسلمان بادشاہوں' نے اپنے نام کے ساتھ "خلیفہ" لکھ کر ایک منافقت کی بنیاد ڈال دی۔ خلاف بنو امیہ' خلافت بنو عباس اور پھر ترکی میں خلافت عثمانیہ جسے مصطفی کمال پاشا نے ۱۹۲۴ء میں ختم کردیا (اتا ترک یعنی ترکوں کا باپ) اب سارا عالم اسلام انہیں "اتاترک" ہی کہتا ہے۔ ۱۴۔ نگار = علامہ نیاز فتح پوری کا رسالہ "نگار" (لکھنؤ) جس نے روایتی انداز کے خلاف سائنسی انداز میں غور و فکر کی ترغیب دی۔ اب "نگار" کراچی سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نکالتے ہیں ۱۵۔ مخدوم = دکن کا انقلابی شاعر (سرخ سویرا' گل تر اور بساط رقص) پاکستان میں سید سبط حسن نے ان کا کلیات "مخدوم اور کلام مخدوم" کے نام سے شائع کیا ہے مخدوم کا مشہور شعر ہے

حیات لے کے چلو' کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

۱۶۔ مجاز = اسرار الحق مجاز (آہنگ اور شب تاب) پاکستان میں ماہنامہ "افکار" نے "مجاز نمبر" شائع کیا اور صہبا لکھنوی نے مجاز کی شخصیت اور شاعری پر ایک کتاب "مجاز۔ ایک آہنگ) کے نام سے مرتب کی۔ ۱۷۔ مرد کوہکن = فرہاد ۱۸۔ بے ستون ۱۹۔ جوئے شیر = شیریں فرہاد کے افسانے کی مشہور علامتیں

(۶)

۱۔ شیخ چاند = بابائے اردو کے رفیق کار۔ "سودا" کے مصنف ۲۔ وجد = سکندر علی وجد (لہو ترنگ۔ آفتاب تازہ' بیاض مریم اور جمال اجنتا' جلال ہمالہ کے شاعر) ۳۔ عیش = عیش فردوسی ۴۔ درد کاکوروی (کئی نعتیہ مجموعوں کے شاعر) ۵۔

یعقوب عثمانی = (سنگ میل) ۶۔ مامن = یعقوب عثمانی کے مکان کا نام ۷۔ سروش = آغا صادق سروش ۸۔ صدق = صدق جائسی (دربار دربار کے مصنف) ۹۔ وحیدہ نسیم = شاعرہ، ناول نگار اور شاہان بے تاج اور "اورنگ آباد" کی مصنف ۱۰۔ متین = متین سروش (شاعر براڈکاسٹر) ۱۱۔ ناصر = اختر الزماں ناصر (شاعر و ماہر اقبالیات مجموعہ کلام۔ برگ و بار) ۱۲۔ قاضی سلیم = شاعر سیاست دان (مجموعہ کلام۔ نجات سے پہلے) ۱۳۔ اطہر = اطہر رضوی، (بیاد غالب کے مرتب) ۱۴۔ ع۔ احمد = افسانہ نگار اور مترجم ۱۵۔ خمار = علی حامد خمار (شاعر و گیت نگار) ۱۶۔ عروج = عبد الرؤف عروج (شاعر اور محقق۔ چراغ آفریدم، بزم غالب، اردو مرثیے کے پانچ سو سال وغیرہ کے مصنف) ۱۷۔ فرہاد = اولا حیدر زیدی (فرہاد زیدی) ۱۸۔ وحید = وحید اختر۔ (شاعر اور نقاد) ۱۹۔ سکندر = سکندر توفیق (ڈرامہ نگار) ۲۰۔ انور = ڈاکٹر انور معظم ۲۱۔ سعید = جے پی سعید (گلگشت) ۲۲۔ رفیعہ = پروفیسر رفیعہ سلطانہ (ادیب و نقاد) ۲۳۔ نجم = عبد المقتدر نجم (گرد کارواں) ۲۴۔ قمر = قمر اقبال (شاعر و صحافی تتلیاں کے مصنف) ۲۵۔ بشر نواز = شاعر و نقاد (رائیگاں) ۲۶۔ سحر = سحر انصاری (شاعر و نقاد۔ نمود) ۲۷۔ حبیب = کمیونسٹ ۲۸۔ افتخار = کامریڈ افتخار ۲۹۔ شراف = گوانداس شراف (سیاسی رہنما) ۳۰۔ جوش = جوش ملیح آبادی ۳۱۔ اختر = اختر حسین رائے پوری ۳۲۔ سجاد = سجاد ظہیر ۳۳۔ احتشام = پروفیسر احتشام حسین ۳۴۔ اجنتا ہوٹل۔ چوک میں اہل قلم کا مخصوص ہوٹل ۳۵۔ مکمل = ادب عالیہ ۳۶۔ نامکمل = جدید اور ترقی پسند ادب ۳۷۔ جگنو = ایڈیٹر عباس اخگر ۳۸۔ شاہین = ایڈیٹر ممتاز اختر ۳۹۔ سردار = علی سردار جعفری ۴۰۔ کیفی = کیفی اعظمی ۴۱۔ مسلم ضیائی = (شاعر، محقق اور ترجمہ نگار) ۴۲۔ نظام = ترقی پسند ادب کا ترجمان ہفتہ وار) ۴۳۔ صہبائی = قدوس صہبائی (ایڈیٹر نظام) ۴۴۔ عوامی کتاب گھر = کمیونسٹ لٹریچر کی دکان ۴۵۔ ایسی کتاب = کمیونسٹ منی فیسٹو اور وہ کتابیں جو ریاست میں بینڈ تھیں۔ ۴۶۔ شہریار دکن = نظام حیدر آباد ۴۷۔ اریب سلیمان اریب ۴۸۔ راج = ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (کمیونسٹ، ادیب اور نقاد) ۴۹۔ لاہوتی = سری نواس لاہوتی (نقاد، صحافی اور اشتراکیت پسند) ۵۰۔ فسانہ = تاج کے زیر سایہ (مطبوعہ نومبر ۱۹۴۶ء، نظام، ویکلی بمبئی) ۵۱۔ ہوسٹل = پن چکی بورڈنگ برائے طلبا

(۷)

۱۔ عنبز = شاید ملک عنبر کے نام بسا ہو جو بعد میں مرہٹی کے زیر اثر "عنبز" ہوگیا۔ ۲۔ وہاب = وہاب حیدر (افسانہ نگار و صحافی) ۳۔ چھوٹی ذات کا ہندو = مارواڑی ۵۔ مادری بولی۔ گجراتی اور تلگو ۶۔ قلم کی زبان = اردو ۷۔ بنے بھائی = سجاد ظہیر ۸۔ تلنگانہ = ریاست کا وہ صوبہ جہاں کی زبان تلگو ہے۔ تلنگانہ تحریک میں مخدوم، راج بہادر گوڑ اور روی نارائن ریڈی پیش پیش تھے اور باغی کسانوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ۹۔ غزنوی و ایاز = سرمایہ دار (زمین دار) اور مزدور (کسان)۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز (اقبال) ۱۰۔ سردار = سکھ ۱۱۔ بھگت = بھگتی تحریک کے رہنما جو صوفیائے کرام کی طرح سیکولر تھے۔ ۱۲۔ آب و خاک = ہندوپانی، مسلم پانی کی تخصیص ۱۳۔ حکمران زبانیں = فارسی ار انگریزی (حتیٰ کہ ہم نئے حکمرانوں کی نظر میں "معتبر" بننے کی خواہش میں "خط نستعلیق" کی کوتاہیوں اور خامیوں کو دور کرنے کے بجائے "رومن" میں "اردو" لکھنے کی بابت سوچنے لگے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر یہی درست تھا تو "دیوناگری" اور "گورمکھی" میں

کیا برائی تھی۔ وہ تو بہرحال اسی سرزمین کی زبانوں کے رسم الخط ہیں) ۱۴۔ مقامی زبانیں= ہندی۔ گجراتی' پنجابی' بنگالی اور دوسری ہندوستانی زبانیں جو دیوناگری اور گورمکھی میں لکھی جاتی ہیں۔

(۸)

۱۔ جالنہ = اورنگ آباد سے چالیس میل کے فاصلے پر ایک تجارتی شہر ۲۔ حضرت عبد الغفور = میرے خسر ۳۔ معراج = معراج نسیم (میری شریک حیات) ۴۔ پاگل= گھائل کا قافیہ نہیں ہے مگر باندھ دیا کہ اسی کو "ضرورت شعری" کہتے ہیں ۵۔ جیل= سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر امکان تھا جس کا تذکرہ میں نے پچھلی اقساط میں کیا ہے ۶۔ بلدہ= حیدر آباد جو اورنگ آباد کے جنوب میں ساڑھے تین سو میل کے فاصلے پر ہے۔ ہندوستان میں موجودہ STATES (سابقہ صوبے) کی نئی لسانی تقسیم کی بنیاد پر اب حیدر آباد (تلنگانہ) آندھرا پردیش میں ہے اور اورنگ آباد (مرہواڑہ) مہاراشٹر میں ہے۔ اب ہر اسٹیٹس کی "سرکاری زبان" یہاں کی "مادری زبان" ہے اور بھارت کی قومی زبان "ہندی" ہے۔

(۹)

۱۔ بھاگ متی= قطب شاہ کی محبوبہ کا نام ۲۔ بھاگ نگر= حیدر آباد کا پہلا نام ۳۔ قلی قطب شاہ= قطب شاہی دور کا تاجدار۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر جسکی غزل کا مشہور مطلع ہے۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا

پیا باج اک تل جیا جائے نا

۴۔ کاچی گوڑہ= ریلوے اسٹیشن (چھوٹی لائن جو حیدر آباد کو منماڑ جنکشن سے ملاتی ہے) ۵۔ سواری= اورنگ آباد میں "سائیکل رکشہ" نہیں ہیں۔ ۶۔ جناح= روزنامہ (اخبار) جو پولیس ایکشن (ستمبر ۱۹۴۸ء) تک جاری رہا اور ریاست ٹوٹنے کے بعد "منزل" کے نام سے نکلنے لگا (ایڈیٹر سید اظہر حسین رضوی) ۷۔ قاسم رضوی = مجلس اتحاد المسلمین کے صدر ۸۔ لال قلعہ = (عمومی تلفظ) دہلی کا مشہور قلعہ ۹۔ جان سے گزر جائے= شعیب اللہ خان ایڈیٹر "امروز" کو اختلاف کی بنیاد پر قتل کردیا گیا تھا۔

(۱۰)

۱۔ منتجب الدین = میرے ہم زلف (قاضی رئیس کے والد) ۲۔ لاتور = عثمان آباد کا تعلقہ جو مہاراشٹر میں ہے۔ قاسم رضوی کا تعلق اسی شہر سے تھا۔

(۱۱)

۱۔ اہل قلم= اختر حسین (ایڈیٹر روزنامہ "پیام")عالم خوند میری (ماہر اقبالیات)مسلم ضیائی' وہاب حیدر' قمر ساحری' عزیز قیسی' سلیمانی اریب' مغنی تبسم غوث محی الدین (ایڈیٹر سویرا) سردار الہام۔ سری نواس لاہوٹی۔ کنول پرشاد کنول۔ سرور ڈنڈا۔ نصیر افسر۔ عاتق شاہ۔ اقبال متین اور راقم الحروف (حمایت علی شاعر) وغیرہ ۲۔ مخدوم کی نظم "تلنگانہ" کے اشعار جو ان دونوں بہت مقبول تھی ۳۔ سیاہ قاسم رضوی= رضاکار ۴۔ سڈنی کاٹن= ایک اسمگلر (سنا تھا کہ وہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے حیدر آباد میں اسلحہ پہنچاتا تھا) ۵۔ ایرانی=حیدر آباد مین ایرانی تقویم رائج تھی۔ یعنی فصلی سنہ اور اس کے مہینوں کے نام تھے

(باقی صفحہ نمبر ۱۲۸ پر)

(اپنی کتابوں پر)

حمایت علی شاعر کے دیباچے

آگ میں پھول

(مطبوعہ۔ ۱۹۵۶ء)

میں اور میرا فن

کتابیں تو آئے دن چھپتی رہتی ہیں لیکن اپنی کتاب کو اشاعت کے لئے دیتے وقت جو کچھ مصنف پر گزرتی ہے وہ کچھ اسی کا دل جانتا ہے۔ اس وقت میں کچھ عجیب سی کشمکش سے دوچار ہوں۔ ایک طرف یہ ندامت کہ جس بک ڈپو اور جس لائبریری میں یہ کتاب رکھی جائے گی وہیں کہیں میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ اور دنیا کی دوسری زبانوں کی کم و بیش اسی مرتبے کی شخصیتوں کا سرمایہ فکر یک جا ہوگا........ دوسری طرف یہ احساس کہ جانے اس مجموعہ اشعار کا کیا حشر ہو ایک طرف تنقید نگار ہیں اور دوسری طرف بازار' ناقدین میں سوائے چند کے بیشتر ایسے ہیں جن کی نگاہ نکتہ شناس جب کسی تخلیق کو پرکھنے پر آجاتی ہے تو انہیں کسی الف کی شاعری میں "ملٹن" اور "میر" کی روح نظر آنے لگتی ہے اور کسی ب کی افسانہ نگاری کے مقابلے میں "چیخوف" اور "پریم چند" اپنی کم مائیگی پر سر بہ گریباں دکھائی دیتے ہیں اور جب ان کی فکر گردوں مقام اپنی بلندیوں سے کسی خاک نشین کا جائزہ لینے لگتی ہے تو اپنے عہد کی ابھرتی ہوئی شخصیتیں تو درکنار........ منفرد شخصیتوں کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتی۔

بازار کا یہ عالم ہے کہ تیسرے درجے کا ادب تو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا ہے لیکن ادب عالیہ کا بہترین انتخاب اور عہد رواں کی عظیم تخلیقات اپنے قارئین کرام کا منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔

انہیں حقائق کے پیش نظر دل ہمیشہ ڈرتا رہا اور میں خاص طور پر اپنے مجموعہ کلام کی اشاعت سے گریز کرتا رہا کہ جو نہ عظیم تخلیق ہے اور نہ بازار کی مانگ کے مطابق کوئی چیز........ لیکن میرے دوست اور میرے کرم فرما...... جن کی تعداد یقیناً" زیادہ نہیں ہے..... مصر رہے کہ میں بھی رسوا سربازار ہو جاؤں روایت بھی کچھ یہی رہی ہے۔ میں نے بھی اس روایت کا پاس کیا اور آج اپنا دامن سمیٹے بیچ چوراہے کے کھڑا ہوں۔ لیکن بقول ساحر

مرے دامن چاک میں ۔ گرد راہ سفر کے سوا کچھ نہیں

میری پوری شاعری اسی گرد راہ سفر کی آئینہ دار ہے۔ یہ گرد زندگی کے ہر موڑ پر میرے دامن' میرے تن من سے لپٹی رہی ہے اور سچ پوچھئے تو اسی گرد سے میری شاعری ابھری ہے اور شاید ایک روز اسی گرد میں دب کر بھی رہ جائے۔

آج جب اپنی "گرد سفر" کی نمائش کا وقت آ ہی گیا ہے تو میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ کچھ دیر کے لئے اس گرد کو صاف کر کے اپنے خدو خال بھی نمایاں کردوں۔

۱۹۵۶ء میں ڈرتے ڈرتے میری عمر پچھسویں برس میں قدم رکھ رہی ہے آج سے چوبیس سال پہلے میں نے اپنے وطن اورنگ آباد کی جس چہار دیواری میں زندگی کی پہلی سانس لی تھی' اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ کچی مٹی کی چہار دیواری تھی اور بس...... لیکن اگر مجھے اس کچی مٹی کے گھر پر ناز ہے تو اس لئے کہ اس کی وساطت سے مجھے اپنے ملک کے ننانوے فیصد انسانوں کی زندگی کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملا ان کے تہذیبی پس منظر اور ان کی ذہنی تربیت کے مختلف خم و پیچ کو سمجھنے اور پرکھنے والی نگاہ عطا ہوئی۔ مجھے وہ درد نصیب ہوا جو میرے شعور کی روشنی میں چمک کر شعلہ نہ بن سکا' تو ایک انگارہ ضرور بن گیا۔ یہ انگارہ جو میرے سینے میں مسلسل دہکتا رہتا ہے میری تاریخ کی امانت ہے۔ میری تہذیب کا عطیہ ہے۔یہی انگارہ کبھی ہوائے زمانہ سے بھڑک اٹھتا ہے تو میرے اور میرے فن کے لئے مشعل راہ بن جاتا ہے اور کبھی چراغ سرمزار۔

ممکن ہے کہ میرے احباب اور میرے ناقدین اسے فرار سے تعبیر کریں لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہی "چراغ سرمزار" میری زندگی کا محور بھی ہے۔ اس کا واقعاتی پس منظر بڑا طویل اور پیچ در پیچ مسائل میں الجھا ہوا ہے اس لئے میں اسکا ذکر نہیں کروں گا لیکن میرے ذہنی عمل اور میری شاعری میں اس کے رد عمل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ میں استعارتاً" ایک بات ضرور کہہ دوں..... یوں سمجھ لیجئے کہ محبتوں کے جتنے سہارے مجھے ملے اسی عمر میں "چراغ سرمزار" میں ڈھل گئے جب زندگی ایک کھیل ایک شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اس المیئے نے تنہائی کا شدید احساس میرے دل میں پیدا کردیا اور عرصہ دراز تک مجھے اس دنیا سے نفرت رہی۔ ہمارے طبقاتی نظام نے اس نفرت کو اور ہوا دی اور کیا عجب تھا کہ میں خودکشی کرلیتا...... ایک شخص نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے "چاقو" چھین لیا اور ایک "کتاب" تھمادی (دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کتاب کالج میں مجھے کبھی نہیں پڑھائی گئی۔)

اس گمنام شخص کا نام ہے...... افتخار[1]...... جو میرا دوست بھی ہے اور محسن بھی۔ افتخار نے میرے ذہنی میلان کا رخ اس طرف موڑ دیا جس طرف وہ خود جارہا تھا یعنی زندگی کے راستے پر...... اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ راستہ کٹھن ضرور ہے لیکن حسین اتنا ہے کہ نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں کوئی مخصوص ہستی نزدیک رگ جاں یقیناً نہیں ہے لیکن ہر انسان کا دل دوسرے انسان کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہے۔ دھڑکنوں کی ہم آہنگی کے اس احساس نے میری فکر کو ایک نیا زاویہ عطا کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ انسان فرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اجتماع بھی ہے اور انسان کے ارتقا کی انتہائی منزل اپنی ذات میں ضم ہونا نہیں ایک "اجتماعی انسان" ہوجاتا ہے۔

کلی کی ننھی سی گود میں محو خواب ہیں گلستاں ہزاروں
زمیں کے ایک ایک ذرہ میں سانس لے رہے ہیں جہاں
ہزاروں
نہایت قطرہ ابر باراں' مآل خورشید کہکشاں ہے
قدم قدم پر ہے موت لیکن حیات کا کارواں رواں ہے

۱۔ کامریڈ افتخار

یا

سکوت موج میں مضطر ہیں سیکڑوں طوفاں
تہہ سکوت کی طغیانیوں کو موت نہیں

میں جس گھرانے میں پلا بڑھا' وہ نہ صرف یہ کہ کٹر' مذہبی گھرانہ ہے' بلکہ تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے ہے صرف ایک میرے والد ہیں جو کچھ تعلیم حاصل کر سکے اور ان کے زیر سایہ مجھے کچھ پڑھ لکھ لینے کا موقع مل گیا۔ شاعری' ادب یا سیاست میرے گھرانے کو کبھی چھو کر بھی نہیں گئی۔ بقول غالب

سو پشت سے ہے پیشہ آباء سپہ گری

میری گھرانے میں سپہ گری کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی بھی شامل ہے۔ اس کا مفہوم یہ نہیں کہ میں کسی زمیندار خاندان کا فرد ہوں۔ حیدر آباد میں ایک طبقہ ہوتا تھا...... انعام دار...... اس طبقے کی تاریخ یہ ہے کہ بادشاہ وقت کسی بات یا کسی کارنامے سے خوش ہو کر مرحمت خسروانہ کے طور پر زمین کے کچھ قطعات عطا کر دیتا تھا اور پھر اسی متاع کے سہارے نسل در نسل زندگی گزرتی۔ نسل کے ساتھ تقسیم در تقسیم سے اگر وہ زمین اتنی باقی نہیں رہتی کہ ایک فرد کے متعلقین کی کفیل ہو سکے تو ان گھروں کے افراد ملازمت کی تلاش میں نکل پڑتے۔ میرا خاندان اسی قسم کے ملازمت پیشہ انعام داروں کا خاندان ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے خاندان میں علم و ادب سے شغف کا کیا تصور کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال' ایک ایسے ہی گھرانے اور ایک ایسے ہی ماحول میں پل بڑھ کر میری عمر نے شعور کی حدود میں قدم رکھا اور مختلف قسم کے علمی' ادبی اور سیاسی ہنگامہ بازیوں سے گزر کر زندگی اس موڑ پر آگئی جہاں پہنچ کر عمل سوچ کے تابع ہو جاتا ہے۔

میری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ پہلے مضامین اور افسانے لکھے اور بعد میں شاعری شروع کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غیر منقسم ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ مدت سے باہم دست و گریباں رہ کر آخر اس منزل تک آگئی تھیں کہ ملک کا تقسیم ہو جانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ادھر حیدر آباد جو اپنی جگہ الگ ایک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کیے ہوئے تھا' سیاسی اعتبار سے ایک ایسے گروہ کے ہاتھ آگیا تھا کہ جس کی سیاسی بصیرت اپنی مثال آپ تھی...... خیر' اورنگ آباد جس کی خاک کو ولی جیسے شاعر کے نقش کف پا کا شرف حاصل ہے' جہاں کی فضاؤں میں داؤد جیسے شیریں مقال شاعر کے نغمے گونجے اور جس کی مٹی نے سراج کو آج بھی اپنے سینے سے لگا رکھا ہے عرصہ دراز سے ادبی اور علمی اعتبار سے اس قدر محدود ہو کر رہ گیا تھا کہ اپنی آواز بازگشت بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ بلدہ میں تو ادب اور صحافت کا بڑا شہرہ تھا لیکن اورنگ آباد میں کوئی پریس ہی تھا اور نہ ہی وہاں سے کوئی رسالہ یا اخبار شائع ہوتا تھا۔ عبد الحلیم شرر کے "دلگداز" کے بعد اس روایت کو انجمن ترقی اردو کے سہارے مولوی عبد الحق نے آگے بڑھایا۔ اور جب انجمن کا دفتر بھی اورنگ آباد سے اٹھ گیا تو یہ تاریخی شہر ایک بے مصرف یادگار سی ہو کر رہ گیا تھا۔ چلتی پھرتی لاشوں کا ایک کھنڈر

میری شاعری نے اسی کھنڈر میں جنم لیا اور آنکھیں کھول کر جب اپنے اطراف دیکھا تو دور دور تک اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں چراغ ٹمٹمارہے تھے جن کی لرزتی ہوئی روشنی کبھی کبھی دل کی ڈھارس بندھا دیتی تھی۔ اس عالم میں اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا تصور خود فریبی سے زیادہ نہ تھا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ کالج سے نکلے ہوئے بہت سارے احباب جونہی عملی زندگی میں داخل ہوئے ایک بیوی کے شوہر' چند بچوں کے باپ کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔ ان کے وہ سارے خواب منتشر ہو گئے کبھی

نظروں کے آئینہ خانوں میں خود کو سنوارا کرتے تھے۔ اس گروپ میں صرف میرے قدم ادب و شعر کے میدان میں جمے رہے اور بالآخر عمر کا ایک خاصہ حصہ اپنی اسی"خود فریبی" کی نذر ہو گیا۔

آج میں جب اپنی پچھلی زندگی کا جائزہ لینے بیٹھا ہوں تو محسوسات کا کچھ عجیب عالم ہے بیشتر واقعات ذہن کے پردے پر ابھر آئے ہیں اور زندگی آنسو کے ایک قطرے میں لرزتی ہوئی چمک کی طرح مجھ پر خندہ زن ہے اور میں نگاہیں نیچی کئے سوچ رہا ہوں۔

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

عمر کے اس مختصر سے دوران میں' میں نے اتنے نشیب و فراز دیکھے' اتنے تلخ' ترش اور شیریں لمحات سے گزرا' اتنی ٹھوکریں کھائیں اور اتنی بار گر کر سنبھلا کہ اپنی زندگی پر خود ایک طنز ہو کر رہ گیا۔ اور مسائل کو جانے دیجئے۔ روزگار کا مسئلہ یوں اپنے وطن کا ایک خاص مسئلہ ہے ہی میں بھی اس سے دوچار رہا ہوں کالج کی زندگی سے لیکر آج تک ہر دور میری زندگی کا ایک دور کشاکش رہا ہے۔ ایک بات سلجھتی ہے تو دوسری الجھ جاتی ہے۔ اور سلجھنے اور الجھنے کا یہ لامتناہی سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ کل میں ریڈیو سے متعلق تھا' آج انجمن ترقی اردو سے متعلق ہوں اور کیا عجب ہے کہ کل طلوع ہونے والی صبح ۱۹۵۰ء کی طرح مجھے پھر اخبار فروش کے روپ میں دیکھے' مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں نے اپنا سربلند رکھنے کی خاطر معمولی سے معمولی کام بھی کیا ہے اور اس آگ کو جو ہمیشہ میرے سینے میں دہکتی رہتی ہے کبھی کسی عنوان کو بجھنے نہیں دیا اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ مجھے اپنے طبقہ' اپنی کچی مٹی کے مکان' اور اپنی اس معمولی سی زندگی پر ناز ہے جس کی وساطت سے مجھے سماج میں زندگی کے جدلیاتی عمل کو سمجھنے کا موقع ملا۔ مجھے وہ درد نصیب ہوا کہ جو میرے شعور کی روشنی میں چمک کر شعلہ نہ بن سکا تو ایک انگارہ ضرور بن گیا۔ یہی انگارہ کبھی ہوائے زمانہ سے بھڑک اٹھتا ہے تو میرے اور میرے فن کے لئے مشعل راہ بن جاتا ہے اور کبھی.........چراغ سرمزار

آپ ٹھنڈے دل سے میری شاعری کا مطالعہ کریں گے تو میرے خیال میں آپ اس آتشیں رو کو محسوس کرلیں گے جو میری رگ رگ میں رواں دواں ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس آگ کی حدت کو محسوس طور پر پیش کرنے میں' میں کہاں تک کامیاب رہا' لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود میری شاعری صرف دماغ کا ناپ تول نہیں ہے' اس میں دل کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں۔

شاعری میں میرا نقطہ نگاہ کسی غیر معمولی انفرادیت کا حامل نہیں ہے۔ میں شعوری طور پر کسی ایسی جدت کا طرفدار نہیں ہوں' جو فنکار کا رشتہ اپنے عہد یا اپنے عہد کی زندگی سے توڑ لے' میرے خیال میں جتنی اہمیت ایک زندہ روایت کی ہوتی ہے اتنی ہی ان اقدار کی بھی ہوتی ہے جنھیں عصر رواں جنم دیتا ہے۔ میرے نزدیک فنکار اپنے عہد کا نمائندہ انھی معنوں میں ہوتا ہے اور ادب اپنے عہد کی تاریخ انھی معنوں میں مرتب کرتا ہے کہ وہ اپنے عصر کا ترجمان ہوتا ہے لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعور کیا چیز ہے؟

شعور حقیقت کے ادراک سے عبارت ہے اور حقیقت وہ نہیں ہوتی جو ہم دیکھتے ہیں بلکہ وہ ہوتی ہے جو پیش نظر شئے میں درپردہ کہیں کارفرما ہوتی ہے لیکن یہاں بھی یہ مسئلہ بحث طلب رہتا ہے کہ دنیا میں مختلف نقاط نظر کے لوگ آباد ہیں اور اپنے اپنے خیال کے مطابق حقیقت کی تلاش میں ہر ایک اپنی راہ کو مستقیم سمجھتا ہے۔ ہر ایک اپنے زاویہ نظر کو صحیح قرار دیتا ہے۔ پھر یہ کیسے طے ہو کہ کون اپنی دانست میں صحیح ہے اور کون غلط؟ ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ یوں نہیں ہو سکتا۔ ہر رجحان کے پیچھے

ایک فلسفہ ہوتا ہے اور ہر فلسفہ اپنے تحفظ کے لئے منطق کا ایک قلعہ بھی تعمیر کرلیتا ہے اور اس قلعے میں گھر کر دماغ اکثر اٹل حقیقتوں سے بھی انکار کرجاتا ہے' اور طول و فرسنگ اطراف و جوانب میں الجھ کر خواہ مخواہ ایک مسئلہ لا ینحل بن جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ حقیقت کی جستجو میں فکر کا رخ تاریخ کی روشنی میں متعین کیا جائے۔ تاریخ ادوار کے واقعاتی تسلسل کا نام نہیں بلکہ معاشرتی ارتقاء کے جدلیاتی تسلسل کا نام ہے۔ جب تک ہم تاریخ کے مادی حقائق کی کسوٹی پر بحث طلب مسائل کو نہیں پرکھیں گے' کھرے اور کھوٹے کا فرق ظاہر نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام جگر کو خون کرلینے کے مترادف ہے اور وہی فنکار اسے انجام دے سکتا ہے جو ادب کو دل کا ایک مشغلہ نہیں بلکہ دماغ کی زندگی سے تعبیر کرتا ہو اور ایسے فنکار کے نزدیک نہ صرف اپنے عہد کی اقدار مقدم ہوتی ہیں بلکہ وہ ان کی تعمیر کے راز کو بھی سمجھتا ہے۔

ہر نوزائد قدر اپنا ایک روایتی تسلسل رکھتی ہے اور اپنی جگہ آئندہ امکانات کے ایک لامتناہی سلسلے کا نقطہ آغاز بنی رہتی ہے بصیرت کا تقاضہ یہی ہے کہ فنکار اس لامتناہی سلسلے کی کھوج میں اپنے سفر کی ابتدا نقطہ آغاز سے کرے اگر وہ اسے نظر انداز کردے گا تو سمت کا تعین ٹھیک طور سے نہیں کرسکے گا اور نتیجتاً" اپنی راہ سے بھٹک بھٹک جائے گا ایسی تنگ و تاز ہوا" ایک ہی دائرے میں اسیر ہو کر رہ جاتی ہے اور اپنے جال کا آپ شکار ہو جاتی ہے۔

آج کل ادب میں جب بھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے تو ادب عالیہ کی بحث چھڑ جاتی ہے اور ایک حلقے سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ ادب عالیہ شعوری طور پر ہر قسم کی حد بندی سے آزاد رہا ہے اور اسی میں اس کی ابدیت کا راز پنہاں ہے۔

میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے' ادب ہو یا کوئی فن اس حد سے باہر اپنا کوئی مقام نہیں رکھتا۔ ہر داخلی تحریک کی جڑیں خارج میں پیوست ہوتی ہیں اور خارج کے ساتھ ساتھ عمل کی داخلی حرکت میں تبدیلی آتی رہتی ہے' میر کا ایک شعر ہے۔

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل\
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

یا

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش\
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

یا غالب............ جو ہماری تاریخ اور ہماری تہذیب کے ایک موڑ کا نمائندہ ہے داخلی کشمکش سے گزر کر لب گفتار تک آجاتا ہے اور وہ بات کہہ جاتا ہے جس کی حقیقت عصر حاضر میں آکر کھلتی ہے۔

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا\
واماندگی شوق تراشے ہیں پناہیں

یہی شعور ہے اور یہی اپنے عہد کی نوزائدہ قدر کا نقطہ آغاز۔ یہی قدر اپنے جدلیاتی تسلسل کی روشنی میں ایک "اجتماعی انسان" کا تصور ہمارے ذہن میں اجاگر کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی شاعری زیر لب گنگنا کر الفاظ کو ایک خاص وزن میں ترتیب دے لینے سے پیدا نہیں ہوسکتی بلکہ دل و دماغ

کے ایک معنوی ربط سے پیدا ہوتی ہے اور دل و دماغ میں معنوی ربط اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک ہماری نظر میں اپنا عہد اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ روشن نہ ہو۔ میری شاعری میں یہ معاشرتی پیچیدگیاں کسی نہ کسی حد تک اپنی جگہ بناتی ہیں اور میں نے کوشش کی ہے کہ خیال مجرد طور پر کہیں میرے شعر کا موضوع نہ بنے بلکہ اس کی محسوس تشکیل میں میری صلاحیتیں صرف ہوں۔

آپ محسوس کریں گے کہ بعض ایسے مسائل بھی ہیں جنہیں یقیناً" وقتی کہا جاسکتا ہے اور جن کا میری ذاتی زندگی سے راست کوئی تعلق بھی نہیں، میرے اشعار میں دل کے راستے سے آئے ہیں اور میں چونکہ اپنے آپ کو سماج کے ایک فرد سے علیحدہ کوئی مخلوق نہیں سمجھتا اس لئے ان مسائل سے چشم پوشی نہیں کرسکا اور یہ مسائل میرے شعر میں ڈھل کر میری زندگی کا جزو بن گئے۔

میری شاعری کو آسانی سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ غم جاناں، غم وطن اور غم کائنات...... غم جاناں کے زمرے میں جو تخلیقات شامل ہیں ان میں یقیناً" میرا ذاتی غم موضوع شعر ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ میرا ذاتی غم میرا نجی غم بن کر نہ رہ جائے بلکہ سماجی زندگی کے رشتے سے یہ موضوع غم مشترک کی حیثیت سے اختیار کرجائے۔ غم وطن یقیناً" میرے یہاں غم جاناں سے مختلف ہے۔ اس کا لب و لہجہ مختلف ہے۔ اس میں تلخی کا وہ احساس مختلف ہے جو غم جاناں میں بھی اکثر منہ کا مزا خراب کردیتا ہے۔ غم وطن میں یہ تلخی نسبتاً" شدید ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے اس کے بعد غم کائنات کا سلسلہ ہے جس میں غم جاناں، غم وطن دونوں شامل ہیں میری جو تخلیقات اس دائرے میں آتی ہیں ان میں کہیں آپ کو بے پناہ ضبط کا احساس ہوگا اور کہیں ایسا محسوس ہوگا کہ چیخ للکار بن گئی ہے۔ اسے بادی النظر میں کچھ بھی کہا جائے لیکن میرے خیال میں شکست ضبط کا بھی ایک تاثر ہوتا ہے جو گیرائی کے ساتھ ساتھ اپنے حدود میں گہرائی بھی رکھتا ہے اور زندگی میں ایسے مقام آتے رہتے ہیں۔

دو باتیں اور......

پہلی بات تو یہ ہے کہ جدید ادب میں زبان سے جو بے اعتنائی برتی جارہی ہے میں اس کا سخت مخالف ہوں۔ میرے نزدیک زبان بنیادی چیز ہے۔ شاعری کیسے ہی خیالات کی آئینہ دار کیوں نہ ہو، زبان کی آرٹ سے بے نیازانہ گزرنے کی کوشش کرے گی تو ممکن ہے کہ کچھ عرصے کے لئے عام توجہ کا مرکز بن جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا دائرہ اثر ہمہ گیر اور دیرپا نہیں رہے گا۔ تخلیق کی ابدیت کا راز زبان کی قید و بند میں پنہاں ہے نہ کہ بے راہ روی میں۔ قید و بند سے میرا مطلب گھٹ کے رہ جانے سے نہیں بلکہ پاس آداب سے ہے ہمیں مروجہ زبان میں نت نئے الفاظ ضرور شامل کرنے ہیں، نت نئے انداز بیان کی طرف توجہ ضرور دینی ہے، لیکن بے مقصد جدتیت جس کا آج کل عام راج ہے یقیناً سود مند نہیں ہوگی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ الفاظ کے دروبست میں، اسلوب کی ندرت اور خیال کی شیرازہ بندی میں اس رکھ رکھاؤ کا ضرور پابند رہوں جس سے اردو زبان کا مزاج عبارت ہے۔

دوسری بات موضوعات کے انتخابات سے متعلق ہے، اور خصوصاً" حسن و عشق کے معاملات میں...... میری شاعری میں کہیں بھی آپ کو اس روایت کی جھلک نظر نہیں آئے گی جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، مثلاً روایتی عشق، روایتی محبوب اور اس کے روایتی صفات وغیرہ...... میں نے زندگی کو ہمیشہ مادی حدود میں دیکھا ہے اور انہیں مادی حدود میں اس کی تصویر کشی کی ہے میرا محبوب وہی ہے جو زندگی میں میرا محبوب ہے۔ میری طرح گوشت پوست کا انسان ظاہر ہے کہ اس کے

محسوسات انسانی محسوسات سے مختلف نہیں ہوسکتے۔ اگر مجھے اس سے عشق ہے تو اس نے بھی مجھے چاہا ہے' اگر میں اسے اپنا نہیں سکا تو میں نے گریبان چاک کرکے وشت نوردی کرنے کے بجائے سماجی حالات میں اپنے عشق کی ناکامی کا جواز تلاش کیا ہے اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اگر میں نے اسے پالیا ہے تو سماجی زندگی میں اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ زندگی میں یہی کچھ ہوتا ہے اور اس کے علاوہ سب مفروضات ہیں۔ اس وقت مجھے میر ہی کا ایک شعر یاد آگیا ہے۔

کوہ کن و مجنوں کی خاطر وشت و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میر نہایت پاس عزت داراں ہے

اس شعر میں نہ صرف ایک روایتی نظریئے پر تیکھا سا طنز ہے بلکہ انسان کے تہذیبی ارتقا کی ایک منزل کا سراغ بھی ملتا ہے نتیجتاً" یہ شعر ایک دور کی پوری تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ ظاہر ہے کہ میر صاحب کو یہ شعور حقیقت کی طرف نگاہ کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

اس کتاب میں آپ کو بعض ایسی نظمیں بھی ملیں گی جو بالکل گھریلو ماحول سے متعلق ہیں ان میں آپ کو وہ غم بھی ملے گا جو گرہستی سے علاقہ رکھتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ مسرت مجھ سے خود بخود شعر کہلوالیتی ہے جو آفس سے گھر آنے کے بعد بیوی کے ہلکے تبسم اور بچوں کی پر لطف شرارتوں سے مجھے حاصل ہوتی ہے اور اسی طرح میں اس غم کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتا جو ان چہروں پر ہلکی سی افسردگی دیکھ کر اندر ہی اندر دل کو کھائے جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے اس رجحان کو ادبی دنیا میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میرے نزدیک تو ان محسوسات کو شعر کا موضوع نہ بنانا حقیقت سے روگردانی کے مترادف ہے۔ بہرحال زندگی اور شعر سے متعلق جو نظریات ہیں وہ میں نے بیان کردیئے ہیں۔ اب ایک بات اپنی طویل نظم "بنگال سے کوریا تک" کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔

"بنگال سے کوریا تک" کو میری بہت اچھی اور نمائندہ نظم کہا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے میں نے اپنی کوششوں میں کسی حد تک کامیابی حاصل کی ہو۔ یہاں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ تکنیک کے اعتبار سے میں نے اس میں ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے یہ طویل نظم جسے منظوم کہانی بھی کہا جاسکتا ہے کہانی کے ساتھ ساتھ ایک نظم بھی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے افسانوی نظم کہہ سکتے ہیں۔ اکثر جگہ کیفیات کے اظہار میں' میں نے اس میں مسلسل غزل کی تکنیک استعمال کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم کے انداز بیان میں ایک خاص ملائمت پیدا ہوگئی ہے یہ ملائمت ایک ایسی نظم کے لئے بہت ضروری تھی جس میں کہانی یادداشت کے طور پر ابھرتی ہو یہ نظم ایک اور طریقے سے بھی کہی جاسکتی تھی یعنی مثنوی انداز میں...... لیکن چونکہ میرا موضوع ایک تاریخی المیے سے اکتساب فکر کرتا ہے اس لئے کہانی کے تسلسل سے زیادہ ان مخصوص واقعات کو میں نے اہمیت دی جو نظم کے بنیادی خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

ایک اور بات جو آپ اس نظم میں محسوس کریں گے ایک "تاریخی غلطی کا ارتکاب" ہے۔ جب اس کہانی کا بنیادی کردار میدان جنگ سے اپنے وطن بنگال واپس آتا ہے تو وہاں قحط کی تباہیاں دیکھتا ہے حالانکہ بنگال میں قحط ۱۹۴۲ء میں پڑا اور گزشتہ عالمگیر جنگ ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی تین سال کے عرصے میں ظاہر ہے کہ قحط کے آثار اس طرح باقی نہیں رہے ہوں گے جس طرح نظم میں پیش کئے گئے ہیں مثلاً

میرے ٹیگور کی زمیں پہ آج
لاشوں ڈھانچوں کا بس گیا جہاں
اس قدر تھا کریہہ ہر منظر
جسے قبضے کرچکا ہو قبرستاں

یہ ایک "تاریخی غلطی" ہے جس کا میں جان بوجھ کر مرتکب ہوا ہوں' دراصل بنگال کے قحط کا جنگ سے تعلق میرا بنیادی موضوع ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ بنگال کا قحط قدرتی نہیں' بلکہ مصنوعی تھا اور اس کا عالمگیر جنگ کی تباہ کاریوں سے ایک تعلق ضرور تھا...... خیر...... میری نظم میں بنگال اور کوریا جغرافیائی حدود کے پابند رہ کر بھی ایک سمبل کے طور پر آتے ہیں بنگال ...... ایک ایسا مقام جو جنگ سے دور رہ کر بھی اتنا ہی تباہ ہوگیا جتنا کوریا...... یعنی تازہ ہیروشیما...... اس بنیادی خیال کے پیش نظر میں نے چند برسوں کے فرق کو نظرانداز کردیا ہے جو بہت ضروری تھا۔

(دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۸۰ء)

"آگ میں پھول" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سوچتا تھا کہ اپنے کلام کا دوسرا مجموعہ بھی مرتب کرلوں چنانچہ "چاند کی دھوپ" کے نام سے کچھ رسائل میں اس کا اعلان بھی کردیا گیا تھا مگر اسے دھوپ کی تمازت کہئے کہ حالات کی سردمہری...... وہ کتاب مرتب نہ ہوسکی۔ پھر زندگی نے معاشی مسائل کا ایسا جال بچھایا کہ میں الجھ کر رہ گیا اور عمر کے بارہ سال (فلم انڈسٹری میں) انہیں الجھنوں کو سلجھاتے گزر گئے۔ ۱۹۷۱ء میں جب ہمارا ملک اندرنی اور بیرونی سازشوں کا شکار ہو کر شکستگی کے عالم میں کراہ رہا تھا۔ وطن کی محبت نے مجھے بھی مجبور کردیا کہ اپنی "مٹی کا قرض" ادا کردوں چنانچہ بکھرے ہوئے کلام کو یکجا کرنے' ترتیب دینے اور طباعت کے مراحل سے گزرنے تک ۷۴ء آگیا اور بالآخر کتاب شائع ہوگئی۔ اس کتاب کو اہل نظر نے "ادبی اعزاز" سے بھی نوازا مگر مجھے یہ احساس مسلسل کچوکے دیتا رہا کہ میں نے عمر کے بارہ سال بے کار ضائع کردیئے۔

یوں تو فلمی دنیا میں بھی مجھے بہترین نغمہ نگاری اور فلم سازی کے اعزازات ملتے رہے اور ایسی شہرت اور عزت بھی حاصل ہوگئی جو معاشرے میں ایک خاص سطح کے ذہن کو مطمئن بھی کردیتی ہے مگر مجھے یوں محسوس ہوتا رہا گویا میرے اندر ایک خلاء پھیلتا جارہا ہے۔ میری روح ایک ایسے افلاس کا شکار ہورہی ہے جو ذہنی طور پر ایک دن مجھے قلاش کرکے رکھ دے گی۔ اس ہولناک اندیشے سے میں اکثر لرز اٹھتا اور سوچتا کہ کسی طرح اس جال سے نکل بھاگوں مگر جس زمین پر یہ جال بچھا ہوا تھا وہ ایک ولدل سے کم نہ تھی۔ میری ہر کوشش مجھے کچھ اور زمین میں اتاردیتی۔ ایسے عالم میں علم و ادب کے خواب "طوفان سے ساحل کا نظارہ" کرنے کے مترادف ہوتے اور میں ایک کربناک حسرت کے ساتھ آنکھیں بند کرلیتا۔

سچ پوچھئے تو عمر کے یہ سنہری سال میں نے ایک برزخ میں کاٹے جس کے بعد حقیقی ادبی زندگی کی آس ایک موہوم خوش فہمی اور خود فریبی سے زیادہ نہ تھی۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا' مجھے اس زیاں کا احساس بھی تھا مگر میں یہی سوچ کے خاموش ہورہتا کہ وقت نے یہ سنگین مذاق صرف میرے ساتھ ہی نہیں کیا ہے۔ تاریخ میں میرے جیسے کتنے شاعر اور ادیب اپنے حالات سے مجبور ہو کر بازار میں جا بیٹھے۔ چاہے وہ بازار کسی بادشاہ کے دربار میں لگا ہو' یا فلمی دنیا کے مصنوعی محل دو

محلوں میں.... بادشاہ کی قصیدہ خوانی سے لیکر فلمی کرداروں کی سراپا نگاری تک...... ہر بکنے والا حرف، علم و ادب کی توہین نہیں تو اور کیا ہے، خاص طور پر ایسی صورت میں، جب ہر پیش نظر حقیقت، جھوٹ ہی نہیں بلکہ عامیانہ بھی ہو۔

میں نے تنہائی میں کتنی بار ان ''الفاظ'' سے معافی مانگی ہے جنہیں اپنی ضرورت کے لئے اشعار کا روپ دے کر میں نے سخن کے تاجروں کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس عمل پر شرمندگی کا اظہار، طہارت ضمیر کا تقاضہ تھا مگر.... کاش اس نظام حیات کے ماتھے پر عرق انفعال کے کچھ قطرے لرز جاتے جس کی گرفت میں رہ کر ہر دور کا ذہن اس جبر کو بخوشی قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

آج پچیس برس کے بعد جب ''آگ میں پھول'' کا دوسرا ایڈیشن مرتب کرنے بیٹھا ہوں تو اس دور کا ہر لمحہ آنکھوں میں رقص کرنے لگا ہے۔ احساسات و جذبات کے کتنے ہی نقوش ہیں جو نظموں اور غزلوں کی صورت میرے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ ہر نقش گویا کتاب عمر کا ایک باب ہے جو نہ صرف میری ذات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈال رہا ہے بلکہ میرے پیارے وطن کی تاریخ کا بھی آئنہ دکھا رہا ہے اس آئینے میں عکس پس عکس کتنے چہرے جھلک رہے ہیں جو اس دور کے انفرادی اور اجتماعی دکھ سکھ میں کہیں نمایاں تھے تو کہیں پوشیدہ۔

میں جانتا ہوں کہ یہ لمحے اور یہ چہرے اب وقت کی گرد میں دب چکے ہیں اور ان کا شعری اظہار بھی اب ایسا نہیں رہا کہ لمحہ موجود کے شعری اسلوب سے مطابقت رکھ سکے مگر ماضی سے گریز بھی اپنی شخصیت کو بے بنیاد کرلینے کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ ادب کا تاریخ سے بھی ایک رشتہ ہوتا ہے جو ادب کو نہ صرف اپنے عہد کا ترجمان بناتا ہے بلکہ مستقبل کے مورخ کو ماضی کی زندہ حقیقتوں کا سراغ بھی دیتا ہے۔ ہمارے ادب کے مختلف ادوار میں ''شہر آشوب'' اور ''مثنویاں'' نہ لکھی جاتیں یا کوئی نظیر اکبر آبادی پیدا نہ ہوتا تو اکبر الہ آبادی، اقبال، ظفر علی خان اور جوش ایسے شاعر بھی تاریخ کو حقیقت کا آئینہ دکھانے کے قابل نہ ہوتے۔ ہر نگاہ استعاروں کے پیچھے، تاریخ کی سچائیوں کی تلاش میں گم ہو کر محض پرچھائیوں کا طواف کرتی رہ جاتی یا ''عشق مجازی'' سے ''عشق حقیقی'' تک سفر کر کے اپنے کلبہ احزاں میں لوٹ آتی اور ادب کی معرفت تاریخ کو وصال و ہجر کی مفروضہ داستانوں کے سوا کچھ نہ ملتا۔ ہم مختلف ادوار کے مسائل انسانی سے واقف ہوسکتے ہیں۔ نہ ان تہذیبی اقدار سے جو معاشرے میں روبہ زوال یا نمو پذیر تھیں۔ ہمیں ان محرکات کی بھی خبر نہ ہوتی جو بتدریج کسی عہد کو بدلنے کا سبب ہوتی ہیں۔ انہیں ادب پاروں کی معرفت، مختلف عہد کے زندہ انسانوں سے ہماری ملاقات ہوسکی ہے اور ہم ان کے دکھ سکھ کو سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں۔

تاریخ کی مثال ایک ایسے دھارے کی ہے جو سطحی طور پر وقت کے بدلتے ہوئے زاویوں کی نمائندگی تو کر دیتا ہے مگر سطح کے نیچے، ڈھلان اور چڑھائی پر رفتار کی تیزی اور سست گامی کے آنکھ اوجھل محرکات کی نشاندہی نہیں کرپاتا۔ یہ کام ادب اور فن انجام دیتے ہیں۔ وہ زندہ انسانوں کے عمل اور رد عمل کے آئینے میں اپنے عہد کی ایسی تصویر دکھاتے ہیں جو تاریخ کے بین السطور کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ادب اسی معنی میں تاریخ کا باطنی رہنما ہے کہ اس کے دامن میں زندگی کی صداقتیں محفوظ رہتی ہیں، فرد ہو یا کوئی قوم، ان صداقتوں سے روشنی لئے بغیر اپنے حال کو سمجھ سکتی ہے نہ مستقبل کے بارے میں کوئی رویہ اختیار کرسکتی ہے۔

''آگ میں پھول'' کی تدوین اور ترتیب میں میرے پیش نظر یہی بات رہی ہے کہ اپنی شاعری اور اپنی زندگی کے اس دور کو محفوظ کر دیا جائے جو آج سے بیس سال پہلے میں گزار چکا ہوں۔ اس ایڈیشن میں وہ کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے جو ''چاند کی

دھوپ" کے نام سے مرتب کیا جانے والا تھا البتہ ضخامت سے بچنے کے لئے میں نے دو طویل نظمیں "شعلہ بے دود" اور "بنگال سے کوریا تک" کو اس ایڈیشن سے علیحدہ کرکے طویل نظموں پر مشتمل اپنی تیسری کتاب "تشنگی کا سفر" میں شامل کردیا ہے۔

"آگ میں پھول" میرے اس کلام کا مجموعہ ہے جو بیس سے تیس سال کی عمر تک میں نے لکھا اور جو اس دور کے مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ تازہ اشاعت میں کچھ تبدیلیاں بھی آپ دیکھیں گے جو نظر ثانی کے سبب وقتاً فوقتاً عمل میں آتی رہیں جسے آپ "خوب سے خوب تر کی جستجو" بھی کہہ سکتے ہیں۔

آیئے اب میں آپ کو اپنی عمر کے اس دور میں لے چلوں

"جن دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا"

حمایت علی شاعر

(شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی)

تشنگی کا سفر

(مطبوعہ۔ ۱۹۸۱ء)

"تشنگی کا سفر" میری طویل افسانوی اور تمثیلی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظمیں میں نے ۵۲ء سے ۶۳ء کے دوران لکھی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں ریڈیو پاکستان سے متعلق تھا اور بہ یک وقت کئی شعبوں میں کام کرتا تھا۔ صداکاری (اناؤنسر، کنٹریٹر، نیوز ریڈر اور ڈرامہ آرٹسٹ) مسودہ نگاری (نغمات، گیت، غنایئے، ڈرامے، فیچر اور تقاریر لکھنا) پروڈکشن (مختلف پروگراموں کی پیشکش وغیرہ) یہ ملازمت سالانہ کانٹریکٹ کی بنیاد پر ہوتی اور جن ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو اس زمرے میں شامل کیا جاتا انھیں ریڈیو کی اصطلاح میں "اسٹاف آرٹسٹ" کہا جاتا۔ جن دنوں میں نے یہ ملازمت اختیار کی ان دنوں کراچی ریڈیو پر احمد فراز، سلیم احمد اور عبدالماجد سے لے کر چراغ حسن حسرت، بہزاد لکھنوی اور رفیع پیرزادہ تک سبھی اسٹاف آرٹسٹ ہوتے تھے میں چونکہ ہندوستان میں بھی نشریات کا تجربہ رکھتا تھا اس لئے مجھے فوری یہ ملازمت مل گئی مگر اسے میری طبیعت کی سیمابیت کہئے کہ نوجوانی کے باغیانہ جذبات...... میں افسران بالا کی مستقل خوشنودی حاصل نہ کرپاتا اور کسی نہ کسی بہانے میری ملازمت ختم ہوجاتی۔ پھر عارضی طور پر میں کبھی انجمن ترقی اردو میں کام کرتا یا کسی اخبار میں..... اور پھر کسی کرم فرما کی توجہ سے مجھے دوبارہ ریڈیو کا کانٹریکٹ مل جاتا۔ میری زندگی میں یہ واقعات چونکہ نئے نہیں تھے اس لئے مجھے چنداں فکر بھی نہ ہوتی۔ شاید کچھ بزرگوں اور دوستوں کو یاد ہو کہ ۱۹۵۰ء میں آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے "بلاسبب" یکایک ملازمت ختم ہوجانے اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اخبار فروشی بھی کی تھی۔ مگر یہ وہ دور تھا کہ "ایک خاص ذہنی ہم آہنگی" کی وجہ سے دور دراز کے رہنے والے ادیب بھی ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے تھے۔ چنانچہ میری زندگی کے اس معمولی واقعہ پر جب قمر ساحری اور وہاب حیدر نے احتجاج کیا تو نہ صرف دکن کے ادیبوں اور صحافیوں نے آواز اٹھائی بلکہ مرزا ادیب نے "ادب لطیف" (لاہور) میں، فکر تونسوی اور نریش کمار شاد نے "نقوش" (جالندھر) میں، ساحر لدھیانوی اور پرکاش پنڈت نے "شاہراہ" (دہلی) میں اور عادل رشید، کیفی اعظمی اور خواجہ احمد عباس نے "شاہد" "نئی زندگی" "بلٹز" اور "کراس روڈز" (بمبئی) میں متواتر احتجاجی کالم لکھے۔ یہی نہیں بلکہ حیدر آباد دکن کے ایک صحافی اور

میرے بچپن کے دوست ممتاز اختر نے تمام احتجاجی تحریروں کو جمع کر کے اپنے ہفتہ وار "پرواز" کا ایک نمبر بھی شائع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں نہ صرف اپنے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بڑھتا بلکہ دوسروں کے مسائل میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی آرزو بیدار رہتی۔

کراچی میں ہرچند ایسی فضا نہیں تھی مگر چند ہم خیال دوستوں کی رفاقت دل میں ایک امنگ ضرور پیدا کئے رہتی۔ چنانچہ کراچی میں جب کبھی مجھ پر ایسی افتاد پڑی، میں حوصلہ مندی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتا رہتا۔

یہاں میں نے زندگی اس عالم میں شروع کی تھی کہ جس پر تن کے کپڑوں اور رہنے کے لئے ایک جھونپڑی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کراچی کی لمبی لمبی سڑکوں پر اکثر پیدل گھومتا اور بھٹیار خانوں میں ایک یا دو وقت کھانا کھاتا۔ کبھی کبھی فاقے بھی کرنا پڑتے۔ اپنے کپڑے خود دھوتا اور اکثر بغیر استری کے پہن لیتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے عالم میں شہر کے سفید پوشوں کے درمیان میرا گزر ممکن نہ تھا۔ ریڈیو کے افسران بالا بھی ایک نظر دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ اس کا ردعمل میری اس دور کی شاعری میں موجود ہے۔ دل میں باغیانہ جذبات سلگتے رہتے اور میں انہیں اپنے اشعار میں منتقل کر کے اپنی دانست میں یہ سمجھ لیتا کہ میں نے انقلاب کے لئے زمین ہموار کر لی۔ دراصل یہ نوجوانی کی رومانوی سوچ تھی جو مجھے خوش فہمی میں مبتلا کر کے مطمئن ہو جایا کرتی تھی۔

اس دور کی زندگی کا ایک واقعہ سناؤں جس نے میرے اندر ایک نئے احساس کو جنم دیا۔ میری بیوی شہر کے ایک اسکول میں ادیب فاضل کا امتحان دے رہی تھی اور میں اپنی بیٹی جاوداں اور بیٹے روشن خیال کو لئے صدر کی سڑکوں پر ان کا دل بہلا رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر کسی دوکان میں کوئی چیز دیکھ کر روشن خیال مچل گیا۔ میں دوکان دار سے بات کرنے لگا اور جاوداں میری انگلی چھوڑ کر کچھ آگے نکل گئی۔ جیسے ہی مجھے خیال آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ تھوڑے سے فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑی ایک کار کو دیکھنے میں مصروف ہے۔ کار میں کچھ پیارے پیارے بچے بیٹھے ہوئے تھے اور جاوداں ہچکچائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی میں قریب گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگی۔

"ابو.... یہ بڑے لوگ ہیں نا؟"

جاوداں کا یہ فقرہ مجھے تیر کی طرح لگا۔ میں نے اسے احساس کمتری سے نکالنے کے لئے کہا۔

"نہیں بیٹی.... یہ بچے بھی تمہاری طرح ہیں۔ چلو، ان سے باتیں کرو۔"

جیسے ہی میں جاوداں کو لے کر ان بچوں کی طرف بڑھا۔ بچے ڈر گئے اور جلدی سے شیشہ چڑھا لیا۔ شاید میری ہیئت ایسی ہو مگر مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ میں نے ان بچوں سے اپنی بیٹی کا تعارف کرانا چاہا۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھتے رہے اور ابھی میں ان سے مخاطب ہی تھا کہ بچوں کے والدین آ گئے اور صاحب نے تشویش اور حقارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون ہے تو.... یہاں کیا کر رہا ہے....؟"

مجھے غصہ آ گیا، مگر میں نے ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جناب.... میری بچی آپ کے بچوں کو دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو رہی تھی۔ میں نے چاہا کہ ان کا آپس میں تعارف کرا دوں.... تاکہ...."

ابھی میں جملہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ کار میں بیٹھ گئے اور غصے اور نفرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ

کردی۔

جاوداں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور میں دل ہی دل میں تلملا کر رہ گیا۔ وہ سوالیہ نظر یں اور کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز عرصے تک میری آنکھوں میں چمکتی اور میرے کانوں میں گونجتی رہی اور میں نے طے کرلیا کہ اپنے بچوں کو اس احساس میں مبتلا نہیں ہونے دوں گا جس نے میری رگوں میں زہر بھر دیا ہے۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے اپنے اس ارادے میں خودغرضی کا جذبہ بھی شامل نظر آتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں صبح و شام ایسے کتنے دل شکن واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارے سوچنے کا انداز ہمدردانہ سہی مگر قدرے رسمی ہوتا ہے اور ہم عملاً اس کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ شاید ہمارے انفرادی عمل سے معاشرے کے یہ مسائل حل نہ ہوں۔ اس کے لئے تو اجتماعی عمل کی ایک مستقل تحریک چاہیئے جس کا شعور ابھی ہمارے عوام میں نہیں۔

کراچی ویسے بھی تجارتی شہر ہے اور زیادہ تر ان لوگوں سے آباد ہے جن کا رشتہ زمین سے ٹوٹ چکا ہے۔ زمین سے رشتہ ٹوٹ جانے سے بہت سی اقدار بھی ٹوٹ جاتی ہیں اور معاشی بنیادوں کی ناہمواری انسان کو خودغرض بنانے لگتی ہے۔ ایسے عالم میں اگر سیاسی حالات بھی متوازن نہ ہوں تو معاشرہ ایک ہمہ گیر بے چینی کا شکار ہوجاتا ہے اور اٹل حقیقتوں پر اس کا یقین کمزور پڑنے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں صرف تہذیب اور تاریخ ہی انسان کا سہارا بنتی ہے۔ اور جب یہ سہارا بھی باقی نہ رہے تو انسان اپنی ذات میں محدود سے محدود تر ہونے لگتا ہے اور زندگی علاقائی اور خاندانی حدود میں سمٹنے لگتی ہے۔ کراچی کے مختلف محلوں کے نام خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ شہر کتنے خانوں میں تقسیم ہے۔ اس کا تشخص اپنی اکائی کھوتا جارہا ہے۔ اور تہذیبی وحدت نہ ہونے کی وجہ سے مختلف اکائیاں صرف تجارتی رشتوں میں منسلک ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رشتے سودوزیاں کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور ضروریات کے کچے دھاگوں میں بندھے رہتے ہیں۔

دنیا کے ہر تجارتی شہر کی نوعیت یہی ہوتی ہے مگر ایسا شہر جو تو آبادکاروں سے آباد ہو "وادی سینا" کی مثال ہوجاتا ہے کہ قوم تو امت موسیٰ کہلاتی ہے اور پوجا کرتی ہے سامری کے "گوسالہ" کی۔ جسے دیکھئے دولت کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کراچی کا المیہ بھی یہی ہے۔

ایسے شہر میں متوسط طبقہ بڑی الجھن میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ "دوپاٹن کے بیچ" دھیرے دھیرے پستا چلا جاتا ہے اور غیر محسوس طور پر ایک دن اپنا تشخص کھو بیٹھتا ہے حتیٰ کہ وہ اس تہذیب میں بھی ضم ہونے سے رہ جاتا ہے جو اس کا رشتہ نئی سرزمین سے جوڑ سکے۔

مجھ ایسے آدمی کے لئے کراچی میں اک اور بھی مسئلہ تھا۔ اور وہ یہ کہ تجارتی ماحول کی گہما گہمی اور نفسی نفسی سے دل گھبرانے لگے تو کہاں جاؤں؟ بمبئی میں جب کبھی یہ وحشت دل کا بوجھ بنتی تو بھاگ کر اورنگ آباد چلا جاتا تھا اور وہاں کی محدود اور خاموش فضا میں کچھ دن سکون کے سانس لے لیتا مگر یہاں مضافات سے کوئی ایسا تعلق نہ تھا۔ چنانچہ جب حیدرآباد سندھ میں ریڈیو اسٹیشن کھلنے کی نوید ملی تو میں پہلا شخص تھا جس نے ٹرانسفر کی درخواست دے دی اور ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد آگیا۔

حیدرآباد میں مجھے اپنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا اچھا موقع ملا۔ ریڈیو اور شہر کے ادیبوں میں ایسی یگانگت تھی کہ ہمارا ماحول ادبی محفلوں سے جگمگاتا رہتا۔ مجھے بھی گویا ایک نئی زندگی مل گئی تھی۔ میں بھی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔

وہ دور، لکھنے پڑھنے کے اعتبار سے میری زندگی کا اہم ترین دور تھا۔ میں نے اس دور میں نہ صرف شعر کہے بلکہ متعدد منظوم

اور منظوم ڈرامے بھی لکھے۔ "ارژنگ" کے تحت مختلف ثقافتی خدمات بھی انجام دیں۔ ماہی رسالہ "شعور" بھی شائع کیا۔ "آگ میں پھول" کی اشاعت پر بھی اسی دوران توجہ دی اور سب سے اہم کام یہ کیا کہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرلی۔ کچھ عرصے سچل کالج میں پڑھایا اور استاد مکرم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اپنا تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کردیا۔ مگر اسے زندگی کی ستم ظریفی کہئے کہ اپنے عہد کا جبر کہ معاشی مسائل نے پھر مجھے اپنے دام میں الجھالیا اور میں نے فلموں میں نغمہ نگاری شروع کردی۔

فلم انڈسٹری میں جانے والا ہر سنجیدہ آدمی کچھ تعمیری عزائم بھی ساتھ لے کر جاتا ہے اور اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی تبدیلی کا عنوان بن جائے گا چنانچہ میں نے بھی نغمہ نگاری اور مکالمہ نویسی سے لے کر فلمسازی اور ہدایت کاری تک ہر شعبہ فلم کو نہایت سنجیدگی سے اپنایا اور اپنے حدود میں روایت سے کسی حد تک مختلف کام بھی انجام دیئے۔ ان خدمات کا صلہ مجھے کچھ ایوارڈز کی صورت میں ملا مگر رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں جو کچھ کررہا ہوں اس سے زیادہ کھو بھی رہا ہوں۔

ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینکنے سے کچھ لہریں ضرور پیدا ہوجاتی ہیں مگر کوئی ایسا تموج پیدا نہیں ہوتا کہ پانی کا رخ بدل جائے۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری میں ہم چند خوش فہم لوگوں کی شمولیت بھی اسی مثال کے مصداق تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "لاحاصل" سے زیادہ "حاصل کا غم" میری روح کا المیہ بن گیا۔

روٹی کے لئے طاق پہ رکھ دوں گا کتابیں
جینا مجھے اس طرح گوارا تو نہیں تھا

لٹا دیا ہے غم آب و تاب میں کیا کیا
وگرنہ خواب تھے چشم پر آب میں کیا کیا

روشنی کے زاویوں پر منحصر ہے زندگی
آپ کے بس میں نہیں ہے آپ کا سایہ یہاں

یہ اور اس قسم کے بہت سے شعر اسی دور کی یادگار ہیں۔

جیسا کہ میں نے "آگ میں پھول" کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا ہے۔ "سچ پوچھئے تو عمر کے یہ سنہری سال میں نے ایک ایسے برزخ میں کاٹے جس کے بعد حقیقی ادبی زندگی کی آس ایک موہوم خوش فہمی اور خود فریبی سے زیادہ نہ تھی۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، مجھے اس زیاں کا احساس بھی تھا مگر یہی سوچ کے خاموش ہو رہتا کہ وقت نے یہ سنگین مذاق صرف میرے ساتھ تو نہیں کیا ہے۔ تاریخ میں میرے جیسے کتنے شاعر وادیب اپنے حالات سے مجبور ہوکر بازار میں جا بیٹھے۔ چاہے وہ بازار کسی "بادشاہ کے دربار" میں لگایا ہوا "فلمی دنیا کے مصنوعی محل دو محلوں میں......"

"میں سوچتا کہ اس جال سے نکل بھاگوں مگر جس زمین پر یہ جال بچھا ہوا تھا وہ ایک دلدل سے کم نہ تھی۔ میری کوشش مجھے کچھ اور زمین میں اتار دیتی۔ ایسے عالم میں علم وادب کے خواب طوفان سے ساحل کا نظارہ کرنے کے مترادف ہوتے اور میں ایک کربناک حسرت کے ساتھ آنکھیں بند کرلیتا۔"

"مٹی کا قرض" کی ترتیب کے دوران میں اسی کرب میں مبتلا تھا۔ میری آخری فلم "گڑیا" ادھوری تھی اور میرے دل میں

فلم انڈسٹری چھوڑ دینے کا ارادہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ ان دنوں کی ایک "غزل"

پندار یوسفی سہی' پندار ہی تو ہے
بازار کی یہ شے سر بازار ہی تو ہے

میرے اندرونی خلجان اور میرے غم و غصہ کا آخری اظہار ہے۔

میں بھی انا پرست ہوں' اقرار کیا کروں
میرے لبوں پہ آج بھی انکار ہی تو ہے
(مٹی کا قرض)

اور میں اپنی فلم ادھوری چھوڑ کے فلم انڈسٹری سے باہر آگیا اور پھر تلاش معاش میں سرگرداں ہوگیا۔ کبھی ریڈیو' کبھی ٹیلیوژن اور کبھی تحریر و طباعت مختلف کانٹریکٹ....... جن میں نیشنل سیونگس کے نغموں (ا۔ ہم جو پیسہ بچاتے ہیں' وطن کے کام آتا ہے۔ ۲۔ خوشحال وطن' آج سے عہد ہمارا ہے) سے لے کر طباعت کے ٹھیکے تک شامل تھے۔

زندگی کی اس طویل' متنوع اور مسلسل جدوجہد میں' میں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اس کا مختصر تجزیہ یہ ہے کہ میں تو اپنی ذات میں ادھورا رہ گیا مگر اپنے بچوں کو.... "تکمیل ذات کی خاطر....." اعلیٰ تعلیم دلا دی۔ اب دیکھئے ان کی زندگی انہیں کس منزل تک پہنچاتی ہے۔

میرے چار بیٹے ہیں اور چار بیٹیاں۔ جن میں دو بیٹیاں (جن کی شادیاں ہوچکی ہیں) جاوداں میر اور فروزاں علی..... اور ایک بیٹا روشن خیال' پی ایچ ڈی کررہے ہیں۔ ایک بیٹی غزالاں حمایت' بی ایڈ اور تین بیٹے اوج کمال' ذوالجمال اور بلند اقبال انجینئرنگ اور میڈیکل کے طالب علم ہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی ضو افشاں سید' پرائمری میں پڑھ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کامیابیاں میری تنہا کوششوں کا حاصل نہیں' میری ہر کامیابی میں حقیقی اعزاز کی مستحق میری شریک حیات ہے جس نے زندگی کے کٹھن سے کٹھن مرحلے میں مسکراتے ہوئے میرا ساتھ دیا اور مثالی انداز میں اپنے بچوں کی تربیت کی۔ اس پہلو سے میں جب بھی اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو کچھ دیر کے لئے اپنی ذات کے تشنۂ تکمیل رہ جانے کا غم بھی بھول جاتا ہوں اور اپنے بچوں میں اپنی ذات کو بٹا ہوا دیکھ کر یوں خوش ہولیتا ہوں کہ۔

میں اک اکائی کے مانند ہر عدد میں ہوں

(ہارون کی آواز)

یا جیسا کہ میں نے اپنی بیٹی جاوداں میر پر لکھی ہوئی نظم میں کہا ہے۔

نئے خدوخال سے ہمارے جسد کی تشکیل ہورہی ہے
ادھورا پن ختم ہورہا ہے' ہماری تکمیل ہورہی ہے
(آگ میں پھول)

بادی النظر میں اسے بھی خود فریبی کا اک بہانہ کہئے ورنہ یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ ایک المیہ ہے کہ معاشی وسائل کے بہ آسانی بہم نہ ہونے کی وجہ سے کتنی ہی شخصیتیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔ کتنے لوگ اپنے اصلی چہرے کھو بیٹھتے ہیں اور ساری زندگی مصنوعی چہرے لگائے پھرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں زندگی کے ہاتھوں ایسا کھلونا نہیں بنا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جہاں بینی کے ساتھ میں نے ہمیشہ خود بینی کو بھی مقدم سمجھا ہے اسی عمل نے مجھے "نامکمل" رہ جانے کا احساس دیا اور اسی عمل نے میرے اندر "تکمیل کی لگن" کو ابھی تک تازہ رکھا ہے۔

"تشنگی کا سفر" میری زندگی کا بھی استعارہ ہے اور میری شاعری کا بھی۔ شاعری میں نظم، غزل اور ثلاثی کے علاوہ طویل نظمیں اور منظوم اور نثری ڈرامے بھی میرے تخلیقی اضطراب کے ضامن ہیں۔ یہ اور بات کہ اپنی بیشتر تخلیقات پر میں عرصہ دراز تک نظرثانی کر سکا نہ انہیں طباعت کے لئے دے سکا۔ اب اس طرف توجہ کی تو اپنی "مجرمانہ غفلت" کا احساس ہوا۔

فی الحال جو کتابیں مرتب کیں ہیں ان میں "آگ میں پھول" اور "تشنگی کا سفر" ایک ساتھ طبع ہو رہی ہیں۔ دوسری کتابیں بھی انشاءاللہ جلد ہی منظرِ عام پر آجائیں گی۔ "تشنگی کا سفر" دو تمثیلی اور دو افسانوی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان تمثیلی نظموں میں "نئے زاویے" (غنائی تمثیلی نظم) ۵۷ء یا ۵۸ء میں لکھی گئی تھی اور انہیں دنوں ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے (قدرے ترمیم کے ساتھ) نشر بھی ہوئی لیکن ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

"شکست کی آواز" (تمثیلی نظم) ۱۹۶۴ء میں لکھی گئی تھی اور "فریب آگہی" کے نام سے دو تین بار نشر ہو چکی ہے۔ اشاعت کے لئے دیتے وقت جب میں نے اس پر نظرثانی کی تو اس کا عنوان بدل دیا۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں یہ نظم "شکست کی آواز" کے عنوان سے "فنون" میں شائع ہوئی۔ اس تمثیلی نظم کا بنیادی خیال ایک فرانسیسی ادیب "مارسل بائبل" کی کہانی سے ماخوذ ہے۔

افسانوی نظمیں "شعلۂ بے دود" اور "بنگال سے کوریا تک"۔ "آگ میں پھول" کے پہلے ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں شامل تھیں۔ دوسرے ایڈیشن سے یہ نظمیں نکال کر میں نے طویل نظموں کے اس مجموعے میں شامل کردی ہیں۔

"شعلۂ بے دود" ۵۲ء میں لکھی گئی تھی اور اسی سال "ادب لطیف" کے کسی شمارے میں شائع ہوئی۔ (جولائی ۵۲ء)

"بنگال سے کوریا تک" ۵۲ء سے ۵۴ء کے دوران لکھی گئی اور اس کے مختلف حصے برگ گل (۵۲ء) مشرب (۵۳ء) روح ادب (۵۳ء) سیارہ (۵۳ء) اور نیا دور وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ بعد ازاں پوری نظم وامق جونپوری کے زیر ادارت "شاہراہ" (دہلی) کے شمارہ نمبر ۳ (بسلسلہ سالنامہ) مارچ ۵۴ء میں شائع ہوئی۔ پھر یہی نظم ۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکیڈمی حیدرآباد (آندھرا پردیش) کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتاب "حیدرآباد کے شاعر" کی جلد دوم میں سلیمان اریب نے منتخب کی۔ اس نظم کا موضوع "جنگ" ہے اور یہ دوسری جنگ عظیم کے پس منظر (۳۹ء تا ۴۵ء) سے شروع ہو کر کوریا کی لڑائی (تیسری جنگ عظیم کے امکانات) پر ختم ہوتی ہے۔ (1951ء)

"تشنگی کا سفر" میں ان نظموں کو شامل کرتے وقت میں نے "خوب سے خوب تر کی جستجو میں" کہیں کہیں کچھ تبدیلیاں بھی کردی ہیں جسے "خود تنقیدی" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

حمایت علی شاعر

شعبہ اردو

۱۹۸۰ء

سندھ یونیورسٹی۔ جام شورو

مٹی کا قرض

(مطبوعہ - ۱۹۷۴ء)

میزان

وقت کی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہے میرا ہر عمل اس کی نگاہ کی زد میں ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں جو کچھ سوچتا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں۔ لمحوں میں تقسیم ہو کر اکائی میں سمٹ جاتا ہے۔ مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اس اکائی سے اپنے کسی عمل کو الگ کر سکوں۔ میں گزرتے لمحوں کو روک سکتا ہوں اور نہ آنے والے لمحوں کے احتساب سے بچ سکتا ہوں' میں چاہوں یا نہ چاہوں' میری فرد عمل مرتب ہو رہی ہے اور میرے دل میں یہ دھڑکا بیدار ہے کہ تاریخ کا فیصلہ میرے حق میں کیا ہو گا۔

میں جو بیک وقت شاعر بھی ہوں اور ایک ایسا آدمی بھی جو اپنی پرچھائیوں میں بٹ چکا ہے۔ ان پرچھائیوں میں اپنی وحدت کی تلاش مجھے اپنے آپ سے نبرد آزما رکھتی ہے اور شکست و ریخت کے اس عمل میں اکثر وہ شاعر بھی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے جو میری روح کا استعارہ ہے اور میں عرصے تک اپنے بکھرے ہوئے ریزوں کو جمع کرنے اور انہیں پھر سے جوڑنے میں سرگرداں رہتا ہوں۔ یہ عرصہ مجھ پر ایک عذاب کی طرح گزرتا ہے۔

"آگ میں پھول" سے لیکر "مٹی کا قرض" تک میں کتنی ہی بار اس روح فرسا اذیت سے گزرا ہوں اور خدا جانے ابھی کتنے کرب انگیز مراحل سے گزرنا باقی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ روح اور بدن کی اس جنگ میں میرا کیا حشر ہو گا۔ میں پرچھائیوں میں بٹے ہوئے آدمی کے ملبے تلے دب کر رہ جاؤں گا' یا اس شاعر کو بچا لاؤں گا جو مر کر بھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ جو فنا میں بھی ثبات کے خواب دیکھتا ہے اور ظہور کے نت نئے پیرائے تلاش کرتا رہتا ہے۔

ظہور کی یہی آرزو شاعر کو تجربوں پر اکساتی ہے اور اس کے فن کو وقت کی رفتار سے ہم آہنگ رکھتی ہے۔ لیکن فن کا وقت کی رفتار سے ہم آہنگ ہونا ہی شاعر کی خوبی نہیں ہے شاعری جب تک تاریخ کے شعور سے روشن نہ ہو' اندھیرے میں چمکتے ہوئے جگنو کی طرح ہے۔ تاریخ کا شعور شاعر کو عہد شناس بناتا ہے اور معاشرے میں اقدار کے جدلیاتی عمل سے آگاہ رکھتا ہے۔

شاعری اسی معنی میں اپنے عہد کی تنقید بھی ہے کہ وہ تاریخ کے تسلسل میں عصر رواں کا نہ صرف محاسبہ کرتی ہے بلکہ محاکمہ بھی کرتی ہے۔ اور یہ محاکمہ ثابت کرتا ہے کہ شاعر کا اپنے زمانے سے رشتہ مجازی تھا یا حقیقی' جزوی تھا یا کلی...... وہ گرد و پیش کی دنیا میں صرف اپنی ذات کا سفیر تھا یا اپنے عہد کا وہ ہرکارہ بھی' جو گھر گھر کا پیامبر ہوتا ہے۔ اس نے محض آب حیات پی کر خضر کی ابدیت کے خواب دیکھے یا وہ زہر بھی پیا جو اپنی دھرتی کی محبت میں نیل کنٹھ کو پینا پڑا تھا۔

حیات ابدی کی لالچ میں تو سکندر نے بھی خضر کو رہنما کیا تھا اور اسر (راکھشس) بھی وہ امرت لے بھاگے تھے جو دیوتاؤں نے سمندر کو متھ کر نکالا تھا لیکن .... زہر وہی پیتا ہے جسے اپنی مٹی عزیز ہوتی ہے۔

یہ مٹی ہی کی محبت تھی جس نے آدم کو زمین پر اتارا' اور اپنی توہین کے انتقام پر اکسایا...... فطرت کی آتشیں قوت کے

خلاف انسان کی جنگ جو ازل سے آج تک زندگی کے مختلف مورچوں پر لڑی جا رہی ہے اسی محبت کا اقرار ہے۔
شاعر اس اقرار کو الفاظ عطا کرتا ہے اور ان الفاظ کو اپنے عہد کی آواز دے کر تاریخ کے حوالے کر دیتا ہے۔ پھر تاریخ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اس آواز میں صداقت کتنی تھی اور حسن بیان کتنا۔
میں نہیں جانتا کہ تاریخ کا فیصلہ میرے حق میں کیا ہوگا.........میں جو صداقت کی تلاش میں اپنے کفن کا احرام باندھے کبھی اپنی ذات کا طواف کرتا ہوں اور کبھی اپنی دھرتی کا....... اور ادب کی بارگاہ میں آواز دیئے جاتا ہوں کہ میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں۔

حمایت علی شاعر

ہارون کی آواز

(مطبوعہ ۱۹۸۵ء)

واحد متکلم = جمع متکلم

(دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم)

تلمود سے منسوب ایک حکایت ہے کہ
بچپن میں حضرت موسیٰ نے فرعون کے تاج کو ٹھوکر مار دی تھی
ستارہ شناسوں نے اسے بدشگونی قرار دیا اور بچے کی معصومیت مشکوک قرار پائی۔ امتحان لیا گیا۔
ایک تشت میں یاقوت کے ٹکڑے رکھے گئے اور دوسرے میں انگارے، بچے نے انگارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔
فرعون تو مطمئن ہو گیا مگر یہ آگ بچے کی پہچان بن گئی۔
یدبیضا اور زبان کی لکنت اسی آگ کی امانتیں ہیں۔

حقیقت، کا یہ افسانوی پس منظر درست ہو یا نہ ہو مگر یہ سچ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان رواں نہ تھی۔ بائبل سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور قرآن حکیم سے بھی۔

"اے خدا، میں فصیح نہیں ہوں، نہ پہلے ہی تھا اور نہ جب سے تو نے اپنے بندے سے کلام کیا، بلکہ رک رک کر بولتا ہوں اور میری زبان کند ہے"

(خروج، ۴-۱۰)

"اے پروردگار، میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کردے اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں" (طٰہٰ)

قرآن حکیم سے اس دعا کا بھی سراغ ملتا ہے جو انہوں نے اپنے بھائی ہارون کے لئے مانگی تھی۔

"میرا بھائی ہارون، مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اس کو میرے ساتھ (نبی بنا کر۔ (الشعراء) مددگار کی حیثیت سے بھیج"
(القصص)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول بھی کر لی۔
"میں نے تجھے فرعون کے لئے گویا خدا ٹھہرایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا۔" (خروج)
"ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے۔" (القصص)
ان الہامی حوالوں کی روشنی میں اگر ہارون کو "اظہار" کی علامت قرار دیا جائے تو شاعری۔ جزویست از پیغمبری کے مصداق ٹھہرتی ہے۔ اور میرا یہ مصرعہ

ہارون کی زبان بھی لوح کلیم ہے

اپنے وسیع تر معنی آپ متعین کر لیتا ہے
مولانا گرامی نے علامہ اقبال کے لئے فرمایا تھا

پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

یقیناً "شاعر پیغمبر نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ "کلیم اللہ" تھے اور شاعر "تلمیذ الرحمٰن" شاید اسی اعزاز کے سبب یہ دنیا شاعر کا بھی امتحان لیتی ہے۔ اس کے سامنے بھی دو تشت رکھے جاتے ہیں اور ایک زندہ ضمیر شاعر' دولت کو ٹھکرا کر انگاروں کو اپنے سینے سے لگالیتا ہے۔
اپنا تعارف کراتے ہوئے میر نے کہا تھا۔

میں کون ہوں اے ہم نفساں' سوختہ جاں ہوں
اک آگ ہے سینے میں جو میں شعلہ فشاں ہوں

یہ آگ نہ صرف شاعر کے تخلیقی جوہر کی امین ہوتی ہے بلکہ ان محرکات کا بھی سراغ دیتی ہے جو ہمیشہ اسے اظہار کی حسرت میں مضطرب رکھتے ہیں۔ غالب کے الفاظ میں

آتش کدہ ہے سینہ مرا' راز نہاں سے
اے وائے اگر معرض اظہار میں آوے

اور جب اظہار کے لئے اقبال ایسا صاحب شعور نصیب ہوتا ہے تو وہ شاعر کا منصب بھی متعین کر دیتا ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون ے خانہ

محرم راز ہونا ہی شعور کی دلیل ہے اور شعور' زندگی کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنے کا نام ہے' علامہ اقبال نے اسی شعور کی روشنی میں زندگی کی بنیادی حقیقت کا انکشاف کیا تھا۔

جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہوگا' یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی' اسی کا مشتاق ہے زمانہ

لیکن شاعر صرف قریب تر کا مشتاق نہیں ہوتا' وہ اس نامعلوم کو بھی امکانات کے حدود میں دیکھتا ہے جو ابھی پردہ افلاک میں ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے
عکس اس کا' مرے آئینہ ادراک میں ہے
(اقبال)

اور جب معلوم و نامعلوم کی سرحدیں مل جائیں تو عہد عتیق کو عہد حاضر سے اور موجود کو لاموجود سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے درمیان اقدار کا ایک معنوی رشتہ برقرار رہتا ہے جو عہد بہ عہد' عمل اور ردعمل کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا نئے امکانات کی صورت متعین کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:۔

حضرت یوسفؑ کے زمانے میں حضرت یعقوبؑ کی امت نے قحط سالی کے سبب ارض کنعان سے ہجرت کرکے مصر میں بود و باش اختیار کرلی تھی لیکن دریائے نیل کے زرخیز کناروں پر صدیوں آباد رہنے کے باوجود وہ بے زمینی کے احساس میں مبتلا رہی۔ اس کا سبب جہاں نسلی اور تہذیبی فرق تھا' وہیں معاشرے کی وہ مخصوص درجہ بندی' معاشی حق تلفی اور سیاسی ناانصافی بھی تھی جن کے باعث رفتہ رفتہ عبرانیوں کو قبطیوں کا غلام بن جانا پڑا اور بالآخر اس کا انجام پوری قوم کی مراجعت پر منتج ہوا۔ ظاہر ہے کہ فرعون کی مطلق العنان حکومت میں مظلوم طبقے کے حقوق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا' لیکن یہ صدی جسے "جمہوری حقوق" کی صدی کہا جاتا ہے' اس جبر سے آزاد ہے۔ اس لئے ضروری نہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگے۔

جہاں تک تہذیبی آواگون سے گزر کر ایک نیا تشخص پانے کا مسئلہ ہے وہ قانون فطرت کا پابند ہے اور اس میں صدیاں صرف ہوجاتی ہیں' لیکن جہاں تک مظلوم طبقات کی حق طلبی کا مسئلہ ہے فلسطین سے لے کر لاطینی امریکہ تک ہر ملک میں ایک جدوجہد جاری ہے۔

میری شاعری میں عہد پارینہ کی مخصوص حکایات اور ان کے مختلف کردار جو اپنی پرچھائیاں تلاش کرتے نظر آتے ہیں ماضی و حال کے اسی جدلیاتی ربط کے آئینہ دار ہیں۔ میں اس آئینے میں ان حکایات کا نیا روپ اور ان کرداروں کے نئے چہرے دیکھتا ہوں اور اس آگ کی روشنی میں جو میرے تخلیقی جوہر کی امین ہے' اپنے عہد کے ان پس پردہ محرکات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں جن کے سبب تاریخ کبھی اپنے آپ کو دہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کبھی آگے بڑھتی ہوئی اور کبھی اس عالم میں جیسے اپنی جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہو۔

افسانہ یاد آگیا اصحاب کہف کا
تاریخ لکھنے بیٹھا تھا میں اپنے دور کی

اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا عہد کسی طلسم کا اسیر ہے اور ایک عالم خود فراموشی ہے کہ ہم سب پر طاری ہے۔

اعجاز دیدنی ہے طلسم سراب کا
دریا رکا ہوا ہے بہے جارہے ہیں ہم

اور میرے ذہن میں مختلف سوالات جاگ اٹھتے ہیں۔ میں کبھی نسل پرستی کے خلاف حضرت عیسیٰ کے اجتہاد کو استعارے کے طور پر اپنا کر حضرت مریمؑ سے سوال کرتا ہوں

مریمؑ کہو کہ جائے یہ لختِ جگر کہاں
اللہ کی زمین پہ ہے اس کا گھر کہاں

اور کبھی عالمی انسانی برادری کے خوبصورت تصور میں "برادران یوسف" کا کردار دیکھ کر چیخ پڑتا ہوں:۔

میں چاہ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے

پھر مجھے انجیل کی ایک حکایت یوں تسلی دینے لگتی ہے۔

حیراں نہ ہو' یہ زہر ہے اپنی ہی کشت کا
اک رشتہ سانپ سے بھی ہے باغ بہشت کا

اور میں سوچنے لگتا ہوں۔

سانپ تو شیطان کا بہروپ تھا جس کے سبب باغ بہشت' حضرت آدمؑ سے چھن گیا اور میرے ذہن میں وہ تمام سانپ پھنکارنے لگتے ہیں جنہوں نے انسانوں کو اپنی اپنی جنتوں سے محروم کردیا' اور میں ایک اندرونی کرب سے بے تاب ہو کر پھر چیخ پڑتا ہوں۔

جب سانپ ہی ڈسوانے کی عادت ہے تو یارو
جو زہر زباں پر ہے' وہ دل میں بھی اتر جائے

لیکن پھر وہ انجام بھی نظر میں گھوم جاتا ہے جو ہر بے زمین قوم کا مقدر ہے

دشت غربت میں ہوں آوارہ مثال گردباد
کوئی منزل ہے نہ کوئی نقش پا رکھتا ہوں میں

زندگی کے یہ تمام مسائل جو ان اشعار میں بکھرے ہوئے ہیں' میرے عہد کی ان منتشر حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں ایک مشترکہ صداقت پوشیدہ ہے۔ اور میرے اندر چھپی ہوئی آگ اسی صداقت کے اظہار کے لئے مضطرب رہتی ہے' کبھی شعلہ جوالا کی صورت تو کبھی راکھ کے اندر دہکتی ہوئی' کبھی چراغ کی لو کے مانند تو کبھی میرا بائی کے اس دوہے کی مثال۔

کوئلہ
لکڑی جل بھئی کونلہ / جل بھئی آگ
میں پاپن ایسی جلی' کوئلہ بھئی نہ راکھ

میرے پہلے مجموعہ کلام کا نام تھا "آگ میں پھول" (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) اور اس میں ایک طویل افسانوی نظم تھی "شعلۂ بے دود" (یہ نظم اب "تشنگی کا سفر" میں ہے) یہ نظم میں نے ۵۲ء میں کہی تھی۔ اس دور میں میرے اندر جو آگ بھڑک رہی تھی' اس کی تپش ہی کچھ اور تھی۔

آگ' لاشو کے قلب کی دھڑکن
آگ' پیہم سکوت کا طوفاں
آگ' محرومیوں کی تشنہ لبی
آگ' غربت کا آخری ارماں

اور یہ آگ کرگئی روشن
مجھ پہ تاریخ کے مقدس راز
ہر گناہ عظیم کے پیچھے
کس خدا کا ہے دستکار دراز

۶۴ء میں ایک طویل تمثیلی نظم "شکست کی آواز" میں یہ آگ ایک کردار کی معرفت مجھے اپنی حقیقت کا سراغ دیتی ہے۔
(تشنگی کا سفر)

یہ بجھی آگ ہے؟ خوب! آگ بجھی بھی ہے کہیں
آگ بجھ جائے تو زندہ بھی رہے گی یہ زمیں؟
یہ مہ و مہر ہیں کیا چیز' اگر آگ نہیں'
زندگی کے ہر اک ایوان میں پوشیدہ ہے آگ
زندگی کے ہر امکان میں پوشیدہ ہے آگ

پھر ۷۲ء میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ آگ میری روح کا عذاب بن گئی۔

میرے سینے کے دہکتے ہوئے انگارے کو
اب تو جس طرح بھی ممکن ہو' بجھادے کوئی

اور ۸۲ء میں جب ہر گفتنی ناگفتنی ہو کر رہ گئی تو مجھے اپنی ذات میں ایک "اجتماعی نزاع" کی کیفیت محسوس ہونے لگی۔

بدن پہ پیرہن خاک کے سوا کیا ہے
مرے الاؤ میں اب راکھ کے سوا کیا ہے

تیس برس کے اس سفر میں آگ کی حدت کا جو گراف بنتا ہے وہ میری تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ اس المیے کا پس منظر' اس عظیم المیے سے مختلف نہیں جو حضرت موسیٰ کی امت کا مقدر بن گیا تھا' فرعون کے تاج کو ٹھوکر مارنے اور انگارہ منہ میں رکھ لینے کے باوجود ان کی قوم سامری کے سحر کا شکار ہو گئی اور "گوسالہ" کی پرستش کرنے لگی۔

"گوسالہ" زر پرستی کا جو استعارہ ہے

صدیاں گزر گئیں' حتیٰ کہ بنی اسرائیل پر ایک نیا صحیفہ بھی اتار دیا گیا۔ مگر یہ المیہ تاریخ پر محیط رہا اور آج بھی استہزائیہ لہجے میں اپنی قوم کا مرثیہ سنا رہا ہے۔

یہ "معجزہ" بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
اب دست سامری میں عصائے کلیم ہے

لیکن اسے تاریخ کی جدلیات کہئے کہ وقت کا انتقام' جس امت نے اپنے پیغمبر سے انحراف کیا' اسی امت کے ایک باغی مفکر کے قلم نے عصائے موسیٰ کی روایت تازہ کر دی اور اس گوسالہ کا طلسم توڑ دیا جس نے ساری دنیا کو دولت کا پجاری بنا کر رکھ دیا تھا۔

آں کلیم بے تجلی' آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن دربغل دارد کتاب
(اقبال)

قلم نے انسان کو کتاب دی اور کتاب نے حقیقت کا شعور اور آج شعور انسانی ایک فیصلہ کن منزل پر پہنچ چکا ہے۔

کھینچی تھی جن کے خوف سے سد سکندری
سوئے نہیں ہیں آج وہ دیوار چاٹ کے

روایت ہے کہ یاجوج ماجوج جس دن یہ دیوار چاٹ لیں گے اس دن قیامت آجائے گی اور قیامت کا مطلب ہے۔ روز حساب یعنی سزا و جزا کا دن۔

شہنشاہیت کا دفاع کرنے والی یہ دیوار شاید اسی قیامت کو روکنے کے لئے کھڑی کی گئی تھی۔

سکندر سے لے کر ابرہہ تک ہر استحصالی طاقت نے اپنے تحفظ کے لئے کہیں دیوار اٹھائی ہے تو کہیں گرانے کی کوشش کی ہے اور آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے' ہر عہد ایک امتحان سے گزر رہا ہے۔

اک طرف اڑتے ابابیل' اک طرف اصحاب فیل
اب کے اپنے کعبہ جاں کا مقدر دیکھنا

ظاہر ہے کہ سکندر کی فوج قیامت کو روک سکتی ہے' نہ ابراہہ کے ہاتھی کعبے کی دیوار گرا سکتے ہیں۔ یہ وقت کا فیصلہ ہے اور وقت۔ خدا ہے۔

Dont vilify time

Because time is God

"زمانہ کو برا نہ کہو...... زمانہ خدا ہے" (حدیث نبویؐ)

اور شاعر تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے' وہ جس زبان سے بولتا ہے وہ ہارون کی زبان ہے اور جس ہاتھ سے لکھتا ہے' وہ بیضا کی طرح روشن ہے۔

مری ہتھیلی کہ جس میں روشن
وہ آگ بھی ہے' وہ نور بھی ہے
جو دست موسیٰ ہے' طور بھی ہے

لیکن اس روشنی میں لفظ و معنی کے قافلے کو لے کر شاعر فن کے جس پل صراط سے گزرتا ہے وہ بحر احمر پار کرنے کے مترادف ہے اگر اس کا قلم' عصائے کلیم کی طرح معجزنمانہ ہو تو وہ بیچ منجدھار میں ڈوب بھی سکتا ہے۔
تاریخ ادب میں کتنے ہی شاعر اس منجدھار کی نذر ہوگئے اور کون جانے کہ میری نصیب میں کیا ہے۔

حمایت علی شاعر

۱۸ جون ۸۵ء

شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی

حرف حرف روشنی

حرف مختصر

"حرف حرف روشنی" میرے تین شعری مجموعوں، "آگ میں پھول" "مٹی کا قرض" اور "ہارون کی آواز" کا مختصر انتخاب ہے۔ چوتھا مجموعہ "تشنگی کا سفر" تمثیلی اور افسانوی نظموں پر مشتمل ہے اس کتاب کی ایک طویل ترین نظم "بنگال سے کوریا تک" کا انگریزی ترجمہ Flower in Flames کے نام سے ہندوستان میں شائع ہوچکا ہے۔ (ترجمہ نگار۔ پروفیسر راجندر سنگھ ورما) اور یہ نظم ۱۹۵۴ء میں سالنامہ "شاہراہ" (دہلی) کے علاوہ ۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکیڈمی آندھرا پردیش کے زیر اہتمام شائع کردہ کتاب "حیدر آباد کے شاعر" (جلد دوم۔ مرتبہ: سلیمان اریب) میں بھی شامل ہے۔ اس لئے میں نے "تشنگی کا سفر" کی بجائے تازہ مجموعہ کلام "ہارون کی آواز" سے ایک طویل نظم "حرف حرف روشنی" منتخب کرلی...... اور اب یہی عنوان اس کتاب کا نام ہے۔

اپنے کلام کو منتخب کرتے وقت یہ بات میرے پیش نظر رہی کہ قارئین کی نظر میں میری فکر اور میرے فن کے ارتقائی مدارج کا ایک گراف بھی بنتا جائے لیکن محدود ضخامت کے سبب موضوعات کا وہ تنوع جو زندگی کی طرح شاعری کو بھی ہمہ رنگ بناتا ہے' شاید زیادہ نمایاں نہ ہوسکے اور اسلوب کی وہ اکائی بھی متعین نہ ہوسکے جو ایک زاویے سے شاعر کی پہچان بن جاتی ہے۔

اسلوب کی انفرادیت اہم ضرور ہوتی ہے مگر اس حد تک نہیں کہ اس کی تلاش میں شاعری کا سفر، گرد سفر میں گم ہو کر رہ جائے اور شعر کا معنوی رشتہ اپنے عہد سے کٹ جائے۔ میرے نزدیک شاعری، زندگی کے تنقیدی ادراک سے بھی عبارت ہے اور اس ادراک کے سوتے تاریخ و تہذیب کے جدلیاتی عمل اور اس کے نتائج میں اپنے عہد کے سائنٹیفک تجزیے سے پھوٹتے ہیں اور شاعر اس آگہی کا ابلاغ شعر کی زبان میں فراہم کرتا ہے۔ علامت و استعارہ اسی ابلاغ کے وسیلے ہیں، اگر یہ وسیلہ اس قدر ذاتی اور داخلی ہو جائے کہ اپنے آئینے میں، اپنی ہی شکل پہچانی نہ جا سکے تو شاعری بے چہرہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے دور میں جدیدیت ایک ایسے ہی المیے سے دوچار ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ میرا آئینہ پتھر نہ بن سکے۔ اس آئینے میں چہرہ بہ چہرہ وہ تسلسل برقرار ہے جو روایت میں جدت کا ضامن ہوتا ہے۔

میری شاعری میں یہ التزام کس حد تک رچ سکا۔ اس کا اندازہ اہل نظر ہی لگا سکتے ہیں اور بالخصوص اس نئی صنف میں جسے میں نے مثلث کی رعایت سے "ثلاثی" کا نام دیا ہے۔ "ثلاثیاں" میں ۱۹۶۰ء سے کہہ رہا ہوں۔ پہلے اس کا نام تثلیث رکھا تھا مگر ایک مذہبی نظریئے کی اصطلاح سے مناسبت پیدا ہو جانے کے سبب بہت جلد اسے ترک کر دیا اور اب "ثلاثی" ہی کے نام سے یہ صنف موسوم ہے۔ ہیئت اور فن کے اعتبار سے میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں۔ اس کا فیصلہ بھی اہل ادب کریں گے۔

آخر میں مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کی فرمائش پر یہ انتخاب عمل میں آیا اور میرے قیام کے دوران ہی طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچ گیا۔ ان کی یہ مساعی اور حسن انتظام بلاشبہ قابل رشک ہے۔

حمایت علی شاعر

ایوان غالب
ماتا سندری لین۔ نئی دہلی

شیخ ایاز

نقش تازہ
(۱۹۹۶ء)

شیخ ایاز (شخص و شاعر) کا نیا ایڈیشن..... کچھ اضافی خوبیوں کے ساتھ، زیادہ بہتر اور دیدہ زیب انداز میں شائع ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اشاعت پر میں زیادہ خوش اور مطمئن ہوں۔ لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ وادی مہران کے جمہوریت پسند اور انسان دوست ادیب و شاعر برسوں سے اپنی دھرتی پر جس اتحاد و یگانگت کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اپنی بساط بھر آج بھی کوشاں ہیں..... ساری تگ و دو کے باوجود ابھی تک اس منزل سے دور ہیں جہاں پہنچ کر افراد کی دوئی..... اکائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

معاشرے میں، جہاں تک تہذیبی آواگون سے گزر کر ایک نیا تشخص پانے کا عمل ہے، وہ قانون فطرت کا پابند ہے اور اس

میں نمایاں صرف ہو جاتی ہیں، لیکن اس کے لئے شعوری طور پر راہ ہموار کرنا بھی عصر حاضر کا فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف ادیبوں اور شاعروں کا کام نہیں، زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے دانشور، اپنے حدود میں مشترک طور پر سرگرم عمل ہوں تو یہ منزل تیزی سے قریب بھی آسکتی ہے۔

ہر مسئلے کے پیچھے معاشی اور سیاسی محرکات ہوتے ہیں جو پس منظر میں رہ کر پیش منظر کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرتی خلفشار میں ان اسباب کا بڑا ہاتھ ہے۔ خدا جانے وہ انقلاب کب آئے جو ہمارے نظام زندگی کی بنیادیں درست کردے۔

شیخ ایاز بھی اسی انقلاب کا آرزومند ہے۔ فہمیدہ ریاض نے جب اس کے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ کیا تو میں نے سوچا کہ مجھے بھی اپنا دیرینہ قرض ادا کرنا چاہیے۔ ایاز کے بارے میں میرا نقطہ نظر ہمیشہ سے مختلف رہا ہے۔ اس مقالے میں، میں نے کوشش کی ہے کہ اس کی شخصیت اور شاعری کے وہ پہلو بھی نمایاں ہو جائیں جو "ہماری گرد آلود سیاست" کے سبب پاکستان کی دوسری زبانوں کے اہل قلم اور بالخصوص اردو والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔

یہ مقالہ شیخ ایاز سے دیرینہ مراسم، مطالعے اور ذاتی تاثرات کا محبت بھرا اظہار ہے۔ خدا کرے یہ محبت سندھ میں بسنے والے تمام داوں کی دھڑکن بن جائے۔

حمایت علی شاعر

نمبر۱ ۔ "حلقہ مری زنجیر کا" جس میں یہ مقالہ بطور مقدمہ شامل ہے اور جس کا "اشاریہ و فرہنگ" حمایت علی شاعر کی صاحبزادی جاوداں میر (ریسرچ اسکالر پی۔ ایچ۔ ڈی شعبہ ثقافت اسلامی و تقابل ادیان۔ سندھ یونیورسٹی) نے مرتب کیا ہے۔

(ادارہ)

نوٹ..... "شیخ ایاز" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا (مرتب)

شخص و عکس

(مطبوعہ ۔ ۱۹۸۴ء)

آئینہ

"شخص و عکس" میرے ان مضامین اور مباحث کا مجموعہ ہے جو گزشتہ تیس برس میں لکھے گئے ہیں۔ میں نثر بہت کم لکھتا ہوں اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ نثر، شاعری کے مقابلے میں ذہنی یکسوئی کا زیادہ مطالبہ کرتی ہے دوسرے، اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی جم کر بیٹھے اور وقت کی پروا کئے بغیر لکھتا رہے۔ میں نے زندگی اتنی مصروف گزاری ہے کہ نثرنگاری کے یہ تقاضے مجھ سے پورے نہ ہو سکے، جس کا مجھے افسوس ہے میں اس تخصیص کا قائل نہیں ہوں کہ شاعر صرف شاعر ہوتا ہے اور نثر یا کہانی اور پیرائیہ اظہار اس کا منصب نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ شاعر اگر صاحب علم ہے اور اس کا ذہن تخلیقی اعتبار سے زرخیز ہے تو ہر شعبہ فن میں اپنے خیال کا جادو جگا سکتا ہے۔

دراصل "اظہار" بنیادی حقیقت ہے اور پیرائیہ، ایک صنفی پہچان۔ یہ اور بات ہے کہ ہر پیرائیہ فن اپنے کچھ مخصوص نکات رکھتا ہے جن سے آگہی ہر فن کار کے لئے شرط اول ہے۔

میں نے شاعری بھی کی ہے، ڈرامے بھی لکھے ہیں اور کبھی کبھی تنقیدی مضامین بھی۔ ان مضامین سے میرے انداز فکر اور

میرے طرزِ بیان کا اندازہ ہوسکتا ہے میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میرا کوئی خاص اسلوب ہے مگر یہ کہنے میں کوئی **جھجھک** محسوس نہیں کرتا کہ میں نے جو کچھ سوچا اور محسوس کیا ایمانداری سے لکھ دیا ہے۔
جہاں تک میرے مزاج کا تعلق ہے اس پر حضرت جگر کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

آدمی، آدمی سے ملتا ہے　　　دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

اور میرا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ جس سے دل ملتا ہے، اس وقت ملنے نہیں دیتا اور جب کبھی وقت مل جاتا ہے تو وہ فاصلے حائل ہوجاتے ہیں جو زندگی کے مسائل نے بچھا رکھے ہیں۔

میرے ساتھ قدرت نے ایک مذاق اور بھی کیا ہے کہ جہاں میں نے رہنا چاہا، وہاں رزق فراہم نہیں کیا، چنانچہ گزشتہ تیس سال سے ایک مسلسل عالم سفر میں ہوں، اپنی صلاحیتوں کے مطابق ہر اس شعبے میں کام کیا ہے جہاں باعزت روزی کے امکانات نظر آئے۔ صحافت، ریڈیو، فلم، ٹی وی اور تدریس وغیرہ گزشتہ سات سال سے سندھ یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوں اور حیدر آباد او کراچی کو ایک کئے رہتا ہوں۔

ادبی اور علمی خدمات کے وسیلے سے میں نے نہ صرف اپنے ملک کو دور دور تک دیکھا، بلکہ ہندوستان، بنگلہ دیش، کویت، عرب امارات، امریکہ، کینیڈا اور یورپ کے مختلف مقامات کی بھی سیر کرلی۔ دنیا کی مختلف تہذیبوں اور ان میں بسنے والے لوگوں کی زندگی کے نشیب و فراز کا کھلی آنکھوں نظارہ کیا اور تقابلی جائزے کے نتائج میں یہ بھی جان لیا کہ انسان نے دنیا کو کیا سے کیا بنادیا ہے اور ہم خود فریبی کے کن اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔

گردشِ روزگار کے ساتھ اس جہاں گردی نے، جہاں حقیقت شناسی کی جستجو مجھے عنایت کی، وہاں وہ خود اعتمادی بھی عطا کردی جو عزتِ نفس کے تحفظ کی ضامن ہوتی ہے اسی خود اعتمادی کا فیضان ہے کہ میں نے زندگی کے ہر محاذ پر، ہر مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔

ادب میں نظریاتی اختلافات سے فکر و نظر کے جو افق کھلتے ہیں، ان سے نہ صرف امکانات کی نئی منزلوں کا سراغ ملتا ہے بلکہ نئی حقیقتیں بھی روشن ہوتی ہیں لیکن وہ تعصبات جو کلبہ ذات کے تاریک گوشوں میں جنم لیتے ہیں اور خود نمائی کی ہوس میں صرف پگڑی اچھالنے کو طرہ امتیاز سمجھتے ہیں، میرے خیال میں سستی شہرت طلبی کے بدترین مظاہرے ہیں۔

ان "مظاہروں" کی زد میں میری تخلیقات بھی آئی ہیں، اس کتاب کے "بابِ تزکیہ" میں میرے جوابی مضامین و خطوط کی اشاعتی تاریخیں شاہد ہیں کہ مجھے کتنی مدت اس عذاب سے گزرنا پڑا اور پچھلا ایک سال تو اسی مدافعتی جنگ میں کٹ گیا۔

ادب جب زندگی کے مسائل سے کٹ کر محض ذات کی نمائش گاہ بن جاتا ہے تو اسی قسم کے مناقشات فروغ پاتے ہیں آج کل ہمارے ادب میں یہی مثالیں عام ہیں۔

"شخص و عکس" میری تنقیدی فکر اور میری تخلیقات کے ردِ عمل میں ہونے والے مباحث کی روشنی میں، میرا بھی آئینہ ہے اور ان مخصوص چہروں کا بھی جنہوں نے شاید آج تک اپنا عکس نہیں دیکھا۔

حمایت علی شاعر
شعبہ، اردو سندھ یونیورسٹی

حمایت علی شاعر

بــابــائے اردو

(ایک دعا ــ جو قبول نہ ہوسکی)

وہ اک چراغ کہ روشن ہے انجمن کے لئے
وہ اک دماغ کہ مشعل ہے اہل فن کے لئے
یہ جل رہا ہے کہ اوروں کو روشنی مل جائے
دلوں کی آگ، نگاہوں کا نور زندہ رہے
خیال و خواب کی راہوں کا نور زندہ رہے
لبوں پہ حرف تمنا کے پھول ہنستے رہیں
جہان دل کے یہ ننھے رسول ہنستے رہیں

مگر یہ بات کہ دل کو زباں نصیب نہیں
نگاہ فکر کو حسن بیاں نصیب نہیں
لبوں پہ کاغذی پھولوں کی مسکراہٹ ہے
نظر میں جھوٹے نگینوں کی جگمگاہٹ ہے
سکوت درد کو اذن فغاں نصیب نہیں
یہ وہ زمیں ہے جسے آسماں نصیب نہیں

میں سوچتا ہوں کہ وہ ہے چراغ آخر شب
اور اس کی بزم کا ہر نغمہ گر ہے مہر بہ لب (۱)
نہ جانے وقت کی تقدیر میں لکھا کیا ہے
چراغ آخر شب کی حیات کا کیا ہے
خدا کرے کہ اسے میری زندگی مل جائے

---

(۱) بابا نے اپنے خط میں اس مصرع کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا ہے۔ خدا کرے ہماری "مہر بہ لبی" کو زباں مل جائے۔

فون نمبر: ۳۲۷۸۳

کل پاکستان انجمن ترقی اردو
اردو روڈ ـ کراچی

حوالہ نمبر.........
مورخہ [illegible]

عزیزم حمایت علی شاعر سلمہ اللہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

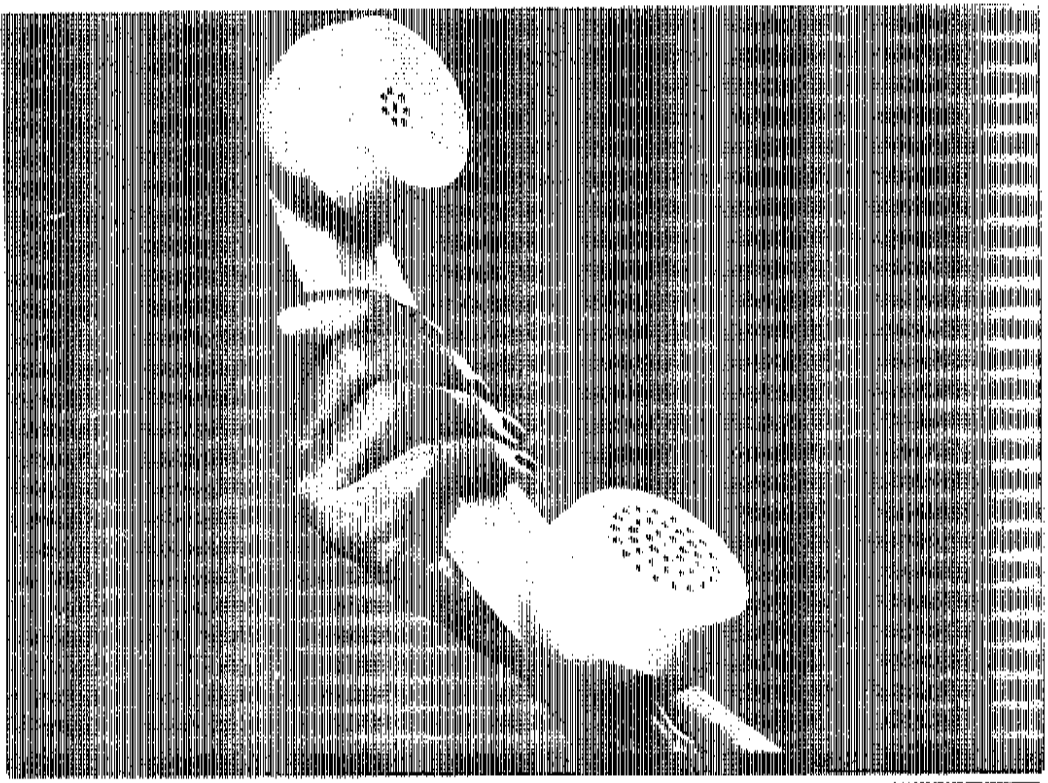

صرف
ایک فون کی زحمت
اور ہم حاضر خدمت

آپ جہاں بھی ہوں ہمیں صرف ایک فون کیجئے۔ اُسی دن ہمارا نمائندہ آپ کے اہم کاغذات، ضروری دستاویزات اور پارسل لے جانے کے لیئے آپ کے دروازہ پر خود موجود ہوگا اور پاکستان کے تقریباً ۱۵۰ مقامات پر، جہاں بھی آپ چاہیں، ان کی تیز ترین اور محفوظ ترین ترسیل کو یقینی بنائے گا دیکھتے ہی دیکھتے . . . صرف چوبیس گھنٹوں میں۔

TCS
COUNTRY-WIDE EXPRESS

جب وقت ہی سب کچھ ہو

مکتوبات

(۱)

مولوی عبدالحق (بابائے اردو)

عزیزِ من حمایت علی شاعر سلمہ اللہ تعالیٰ

حال میں تم نے جو نظم میرے لئے لکھی ہے وہ میں نے یہاں ایک اردو اخبار میں پڑھی اگر یہ نہ سمجھا جائے کہ اس نظم کی تعریف کے پردے میں، میں اپنی تعریف کر رہا ہوں، تو تم کو دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ تم نے ایسی پاکیزہ اور خوبصورت نظم لکھ کر اپنے لئے ایک مقام پیدا کرلیا ہے۔ اپنے خیال کے ادا کرنے کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے اور جن لفظوں میں اسے ادا کیا ہے وہ بلاشبہ قابل تعریف ہے۔ جس کسی نے یہ نظم پڑھی بے ساختہ تعریف کی۔ خلوص و محبت اس کی جان ہے اور خلوص و محبت ہی ایسی نظم لکھوا سکتی ہے۔

تم نے آخری مصرعہ میں جس دل سے مجھے دعا دی ہے اس کا شکریہ کیوں کر ادا کروں، میں بہت جیا، اب زیادہ جینے کی ہوس نہیں، جی چاہتا ہے کہ وہی مصرعہ "اسے" بجائے "تجھے" لکھ کر تمہیں بھیجوں۔ پر اس سے تمہارا کیا بھلا ہوگا۔ مشکل سے دو چار برس ملیں گے مگر کیا تعجب یہی دو چار برس تمہارے کمال کے دن ہوں اللہ تعالیٰ تمہیں سالہا سال زندہ و سلامت اور خوش رکھے کہ تم اس سے بہتر نظمیں لکھو اور کمال حاصل کرو۔

خیر طلب، عبدالحق ۱۲ اگست ۱۹۵۹ء

مزید ـــــــ

میں یہ لکھ ہی رہا تھا کہ ایک صاحب کا خط آیا جس میں انھوں نے تمہاری اس نظم کی بہت تعریف لکھی ہے وہ لکھتے ہیں "ادبی و فنی اعتبار کے علاوہ صحیح و تعمیری جذبات سے لبریز ہے آخری مصرعہ میں ان کی تمنا، ان کے خلوص کی دلیل ہے مگر اس نظم کا یہ مصرعہ

اور اس بزم کا ہر نغمہ کہ ہے صرف لب، بڑی حد تک قابل غور ہے

علامہ نیاز فتح پوری

عالیہ (ڈاکٹر عالیہ امام) کے گھر میں آپ نے جو "ثلاثیاں" مجھے سنائی تھیں ان میں دو تین بہت اچھی تھیں خاص طور پر وہ جس میں ذہن کو غار حرا سے تشبیہ دی گئی ہے...... آپ کا یہ صنفی تجربہ مجھے پسند آیا میرے خیال میں اس کا نام "ثلاثی" ہی بہتر ہے تثلیث سے ذہن دوسری طرف چلا جاتا ہے یہ صنف، اس ہیئت کے ساتھ اردو میں پہلی بار آئی ہے، اس لئے آپ ہی سے منسوب ہوگی۔ ویسے قدرے ہیئتی فرق کے ساتھ یہ نام فارسی میں بھی کہیں استعمال ہوا ہے فی الحال یاد نہیں آرہا، آپ شعر العجم دیکھ لیں۔

اثر لکھنوی

پاکستان کے نئے شعراء میں جن کا کلام میں توجہ سے پڑھتا ہوں ان میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔
"ثلاثی" کے بارے میں بھی نیاز صاحب کا ہم خیال ہوں، کبھی تفصیل سے آپ کو لکھوں گا' جو ثلاثیاں آپ نے مجھے بھیجی ہیں ان میں "پتھر" بہت خوبصورت ہے' ایک ثلاثی میں یہ مصرعہ کھٹکا "پاؤں زمیں گاڑ کے سوئے فلک چلو" آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے' بدل دیں تو بہتر ہے۔ چلو بھی غور طلب ہے

۲۷ دسمبر ۶۶ء

خواجہ غلام السیّدین

پنڈت جی (پنڈت جواہر لال نہرو) کے ہاں پہلی بار اور جامعہ نگر میں دوسری بار سننے کا موقع ملا۔ حفیظ صاحب (حفیظ جالندھری) نے جن الفاظ میں آپکی تعریف کی تھی کتاب (آگ میں پھول) پڑھ کر یہ بھی یقین آیا کہ واقعی آپ کا مستقبل روشن ہے اکثر مقامات پر آپ اپنی عمر سے بڑے شاعر محسوس ہوئے۔
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے
پاکستانی شعراء جب بھی آجاتے ہیں بہت سی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ آئندہ آئیں تو غریب خانے پر بھی تشریف لائیں
۲۴ ستمبر ۶۲ء

(۶۲ء میں جب پاکستانی شعراء D.C.M کے مشاعرے میں شریک ہونے دہلی گئے تو وزیراعظم ہندوستان نے پاکستان کے سفیر جناب سجاد حیدر کی معرفت پاکستانی شعراء کو سننے کی خواہش کی اور اپنے گھر مدعو کیا۔ ان شعراء میں حفیظ جالندھری' سید محمد جعفری' شوکت تھانوی' تابش دہلوی' قتیل شفائی اور حمایت علی شاعر بھی شامل تھے۔ مرتب)

ابوالاثر حفیظ جالندھری
ماڈل ٹاؤن - لاہور

عزیز القدر حمایت علی جی۔ تسلیم
اول تو یہ کہ قادری صاحب کے مکتوب پر آپ کے تحریر کے نیچے آپ کا نام مجھ سے پڑھا نہیں جاسکا۔ دوسرے یہ کہ "نشیمن" کراچی ہی میں میرے ایک ایسے قدیم کی اقامت گاہ کا نام ہے جو کراچی میں سندھ مدرسہ کے متصل سٹریچن روڈ کی بڑی عمارت کے بالائی حصوں میں ایک فلیٹ ہے۔ ان کا نام مبارک ساغر ہے۔ وہ اسلامیہ کالج میں ۲۴-۱۹۲۵ء میں داخل تھے۔ وہ مجھ سے شعر کی اصلاح لیتے رہے۔ پھر سوشلسٹ ہوگئے۔ "کرتی کسان" پہلا صحیفہ اغلبا" میرٹھ سے نکالا۔ پاکستان میں وہ پاکستان سے بہت پہلے کراچی میں مقیم اور سوشلسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا' اور ساری دنیا میں اس کی نمائندگی کرتے تھے۔ بہرحال میری ان کی دلی دوستی ہے۔ وہ ایسے آدمی ہیں کہ ایسا بے نفس اور ایک وقت کی روٹی اور پھٹا پرانا پہن لینے اور صبر کے ساتھ انسان کے لئے وہ بہتر سمجھتے تھے' کرتے تھے' بیمار ہوگئے۔ دورہ دل اور فالج وغیرہ نے ان کو آلیا۔ چار پانچ سال سے اسی

حالت میں پڑے ہیں۔ پارٹی میں کوئی پرسان حال نہ ہوا۔ بس یہ عاجز' پرانا دوست' جو کچھ بس میں ہے' یہاں سے کرتا رہا۔ یہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ قادری صاحب کے خط سے پہلے ان کا خط آیا تھا۔ کہ ان کی واحد پرسان بیوی وفات پا گئی تھی۔ میں نے دوسرے ہی دن نشیمن کے پتے سے قادری صاحب کا خط اور ایک سفارشی سی تحریر دیکھی۔ شکستہ' کھنچا ہوا نام پڑھا نہ گیا۔ لیکن طرز تحریر ایک پرانے مخلص دوست کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ مبارک ساغر خود ان دنوں نشیمن والے کو نشیمن سپرد نہ کر سکتے تھے۔ بہرحال مزا آ گیا۔ اگر میں آپ کا نام پڑھ لیتا تو بھلا جو آپ نے میرے اپنے تعلقات کی نزاکت دکھائی ہے۔ کیسے معلوم ہوتی۔ یار شاعر' خدا کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ باقی رہی بے تکلفی۔ جان تم' آپ کو مجھ سے بے تکلفی کا سب سے زیادہ حق ہے۔ اس لئے کہ میں وہ ہوں جو آپ کو اردو کالج میں اپنی پہلی نظم یا غزل پڑھتے دیکھ کر تمہارے کلام میں' تمہاری اصل شخصیت کے آغاز کو پا گیا۔ ملیر چھاؤنی میں ملاقات کی تکلیف دی۔ کچھ مشورے شاعری زندگی کے بارے میں عرض کئے۔ خداوند کریم نے جو دل مجھے دیا تھا' اس کی گواہی صداقت رکھتی تھی۔ آپ نے فقط اپنے بل بوتے پر وہ کچھ کر دکھایا جو اس دور تو ہیں کسی دوسرے نے کر دکھانے کی جرات بھی نہیں کی۔ لیکن تمہارے کلام کے سبب تمہارا ہمیشہ سے یعنی آغاز شناسائی سے قدرداں ہوں۔ البتہ میں سمجھتا تھا کہ آپ اسی طرح مجھے بھول گئے جس طرح وہ دوسرے' جو اپنے کار و بیکار ہیں منہمک ہونے کے سبب کس کس کو یاد رکھیں تاہم قادری صاحب واسطہ بنے اور آپ رفتہ باز آمد۔

ہاں' میں اس دور کی شاعری کا موجد نہ سہی' مخترع ضرور ہوں' اے کاش دور جدید' حسن صوت و حسن کلام کے معاملے میں بھی' میری تقلید نہ سہی' تائید بھی نہ سہی تمہید ہی اختیار کرتا۔

شاہنامہ اسلام' شعر و شاعری سے کچھ الگ چیز ہے میرا کلام غزل' نظم اور گیت ہیں' نغمہ زار ہی کی نہیں' سوز و ساز و تلخا بہ شیریں ہی کی نہیں' سینکڑوں موضوعات پر انسانی زندگی کی وہ تصویریں سب نے کھینچی ہیں جن پر قبول درد' دونوں گوشے انہیں بحروں میں ہیں جو موضوع کے لئے درکار ہوتی ہیں۔

میرے پیارے' میرے عزیز' بلکہ میرے فرزند معنوی' جب لاہور آؤ تو پیشتر کی طرح دور دور نہ رہنا۔ اور دیکھو' میں آپ آپ لکھتا ہوا' کس بے تکلفی سے "تم" تک آ گیا۔

شاید اب "تو" تک نوبت پہنچ جائے۔

حفیظ

ڈاکٹر محمود حسین
کراچی یونیورسٹی

برادرم اسلام وعلیکم

میں نہیں بیان کر سکتا کہ آپ سے کس قدر شرمندگی ہوئی۔ میں نے بڑے شوق اور خلوص سے آپ کو دعوت دی تھی۔ لیکن ایک صاحب کی غفلت سے جن کے ذمہ یہ فرض تھا کہ جو شعراء بیٹھک کے کمرہ میں تشریف فرما تھے انہیں مشاعرہ میں لاتے۔ یہ صورت پیدا ہوئی جس کی طرف آپ نے خط میں اشارہ کیا ہے۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ مجھے اس وقت پتہ چلا کہ آپ جا چکے ہیں جب آپ کا نام مشاعرہ میں پکارا گیا۔ آپ معاف کر سکیں تو مجھے معاف کر دیں۔ لیکن معاف کرنے کا مجھے یقین اسی وقت ہو گا جب آپ کبھی دوبارہ جامعہ میں تشریف لائیں گے اور اپنے اشعار سے جامعہ والوں کو محظوظ کریں گے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۵۷ء

محمود حسین

احسان دانش

عزیزم حمایت علی السلام علیکم

تمہاری شاعری پر میں نے پروفیسر سجاد حارث ایم اے سے ایک طویل مضمون لکھوایا ہے۔ یہ مضمون سجاد حارث صاحب سے اس لئے لکھوایا گیا ہے کہ یہ فکری طور پر اسی حلقہ سے متعلق اور ایسی ہی ذہنیت اور نظریہ کے جاننے اور ماننے والے ہیں جن میں آپ اور آپ جیسے نوجوان ہیں۔ میرے پاس تو صرف پندرہ روزہ "چودھویں صدی" ہے اسی میں چھاپ سکتا ہوں اگر تمہارے زیر اثر کوئی موقر جریدہ ہو تو اس کی کاپی تمہیں بھجوا دوں؟ میں چاہتا ہوں کہ وہ مضمون کسی اچھے پرچے میں چھپے۔ مجھے بواپسی جواب دو۔ خدا کرے تم بخیریت ہو۔

احسان دانش

مکتبہ دانش

ایک روڈ انار کلی لاہور

۲۸-۶-۵۵ء

(۲)

عزیزم شاعر السلام علیکم

عرصہ ہوا میں نے آپ کی شاعری پر پروفیسر سجاد حارث ایم اے سے ایک مضمون لکھوایا تھا لیکن یہاں کے پرچوں میں کسی وجہ سے نہیں چھپ سکا اور وجہ بھی کیا ہوتی ہر ایک پرچہ پر ایک حلقہ بیٹھا ہے۔ اس لئے یہ مضمون آپ کو بھیج رہا ہوں آپ اسے کسی اچھے پرچے میں چھپوادیں۔

احسان دانش

جہاں یہ مضمون چھپے اس کا ایک نسخہ اس پتہ پر بھجوادیں۔

پروفیسر ادریس احمد خان، پرنسپل کالج (شعبہ انگریزی)

بورے والا (ملتان)

(۳)

عزیزم حمایت السلام علیکم

میرے بھائی اس مضمون کا کیا ہوا، کہیں چھپا ہے یا نہیں۔ سجاد حارث صاحب کئی بار دریافت کر چکے ہیں اگر کہیں وہ چھپ گیا ہے تو وہ پرچہ بھجوادیں تاکہ وہ مضمون ان کی کتاب کا جزو بن جائے نہ چھپا ہو اور چھپنے کی امید نہ ہو تو فوراً مجھے روانہ کر دو۔ اسے کہیں نہ کہیں چھپوادوں گا۔

خدا کرے آپ ٹھیک ہوں۔

احسان دانش

۸ جون ۱۹۷۰ء

مخدوم محی الدین

تم کیا اچھی نظمیں لکھ رہے ہو آج کل۔ پچھلے دنوں تمہاری کچھ نظمیں بہترین شاعری کے انتخاب میں پڑھیں' جدید شعرا کے بارے میں یہ کتابیں اردو میں بھی شائع ہوئی ہیں اور دیوناگری رسم الخط میں بھی۔ خدا جانے تم تک پہنچیں یا نہیں۔ یہاں تمہاری "تلاشیاں" بھی موضوع بحث رہی ہیں۔ یہ اچھی صنف ہے' مختصر اور جامع۔ معلوم ہوتا ہے تم آج کل "عشق" نہیں کر رہے ہو' بڑی گمبھیرتا آگئی ہے سوچ میں۔ اس سے تمہاری شاعری پروقار تو ہو رہی ہے لیکن ڈر ہے کہ کہیں وقت سے پہلے "بوڑھے" نہ ہو جاؤ۔ شاعر کو ہمیشہ جوان رہنا چاہئے اور تم تو "نوجوان" ہو۔ سدا بہار۔ تمہیں جب دیکھتا ہوں' ویسا ہی پاتا ہوں۔ عمر کا کوئی اثر ہی نہیں' آخر ہے نا دکن کی مٹی۔ دکن کی مٹی کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا وہ "سورج" بھی نہیں جو تمہاری شاعری میں "آمریت" کی علامت کے طور پر ابھرا ہے۔ (یہ تشبیہ پاکستانی شاعر ہی دے سکتا ہے)

ادیب نے جوش صاحب کے بارے میں میرے جو اشعار تمہیں بھیجے تھے' وہ عرصہ ہوا تفریحاً" کہے گئے تھے۔ لیکن اگر تم یا کوئی اور صاحب اپنے کسی مضمون میں ان کا حوالہ دینا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

احتشام حسین

۹ ستمبر ۷۵ء

آپ کی کتاب زیر مطالعہ ہے میں اس پر تفصیل سے لکھوں گا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تقسیم کے بعد جن شعراء کے نام زیادہ نمایاں ہوئے ان میں آپ کا نام بھی نہایت اہم ہے۔ پاکستان میں آپ' احمد فراز' ظہور نظر' حبیب جالب اور ناصر کاظمی وغیرہ ایسے شاعر ہیں جنہیں یہاں بھی بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے' بھارت میں بھی ایک نئی پود سامنے آئی ہے جن میں دو تین تو آپ کے حیدر آباد دکن سے تعلق رکھتے ہیں شاذ تمکنت' عزیز قیسی اور وحید اختر وغیرہ۔ ادھر راہی معصوم رضا اور دوسرے شعراء ہیں جو بہت اچھا کہہ رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک "انجمن" کی شکل میں باقی رہے نہ رہے۔ فکر کا جو انداز اس تحریک نے دیا ہے وہ ادب کی تاریخ میں ایک انقلابی تبدیلی کا ضامن ہے۔

آپ کا رسالہ "دستور" بھی پسند آیا' خوبصورت اور قابل مطالعہ۔ میں اس کے لئے ضرور لکھوں گا۔

احمد ندیم قاسمی

مجلس ترقی ادب' (لاہور)

۱۵ر جولائی ۹۳ء

برادرِ عزیز و مکرم' کرم فرمائی کا دلی شکریہ۔ آپ نے مرحوم قمر اجنالوی کی طرزِ نظم پر عمدہ مضمون عنایت کیا ہے۔ قمر اچھا شاعر تھا مگر ناقدری کا شکار رہا۔ آپ نے اتنی فراخدلی سے اسے داد دی ہے کہ جی خوش ہو گیا۔

آپ ساتھ ہی اپنا تازہ کلام بھی بھجوا دیتے تو فنون امیر ہو جاتا۔ ویسے اس مضمون سے بھی کچھ کم امیر نہیں ہوا۔

دعاؤں اور محبتوں کے ساتھ

آپ کا دعاگو ندیم

۱۶ر۵ر۹۴ء

برادرم۔ سلام مسنون

نیویارک سے کرم فرما لیتین صاحب کا فون آیا تھا کہ ان کی بیگم زرین اپنا مجموعہ کلام آپ کی نگرانی میں شائع کرا رہی ہیں۔ مجھے ان کی طرف سے مختصر رائے کی فرمائش ہوئی تھی جو پوری کررہا ہوں۔ اسے کام میں لایئے اور انہیں ضرور مطلع کردیجئے۔ کہ ندیم نے تعمیل کردی۔

آپ کا مقالہ جو قمراجنالوی مرحوم کے بارے میں تھا' جون کے وسط میں شائع ہونے والے فنون ۶۱ میں آرہا ہے۔ تاخیر کی دلی معذرت

دعاؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

احمد ندیم قاسمی

(نوٹ) قمراجنالوی پر حمایت علی شاعر کا مضمون فنون (۶۱) مورخہ جنوری' اپریل ۹۴ء میں شامل ہے۔ یہ شمارہ جولائی ۹۴ء میں منظرعام پر آیا تھا۔

رئیس امروہوی

۲۱دسمبر۱۹۸۳ء

برادر عزیز حمایت علی شاعر۔ اسلام وعلیکم۔ دعائیں' آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۸دسمبراس دلکش مضمون کے ساتھ ملا جو آپ نے "ملبوس بہار" اور "حضرت یزداں" کے مطالعے کے بعد قلم برداشتہ لکھا تھا۔ بخدا مجھے اس مضمون کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ نقد و نظر کی کتنی سطحیں ہوتی ہیں اور کس ذہنی مقام نظر سے کیا بات کس طرح کہی جاتی ہے۔ ان دونوں کتابوں کے بارے میں اپنے چند احباب کے مضامین پڑھے تھے۔ ان کا اخلاص اور ان کی سخن فہمی میں کسی شے کی گنجائش نہیں۔ لیکن اس مختصر مگر جامع مضمون سے یہ ادراک ہوا کہ بعض لوگوں کو وہ مخصوص تنقیدی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ جو عام طور پر دستیاب نہیں۔ میں خود بھی دوسروں کی تصانیف کے بارے میں لکھتا رہتا ہوں اور دوسرے حضرات بھی میری شاعری کے بارے میں کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن اکثر کوئی بات نہیں بنتی۔ بس اس میں تواضع (تنقید نمیں) سی ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ مضمون ان سب سے الگ ہے اور اس لئے قابل قدر ہے۔ ہاں جی چاہتا ہے کہ آپ ان تصانیف کے بارے میں کبھی جم کر لکھیں تاکہ مجھے بھی اپنی فکر کے بارے میں کچھ اندازہ ہوسکے۔ فی الحال تو میں خود اپنے بارے میں کسی حد تک لاعلم ہوں۔

یہ خط یونیورسٹی کے پتے پر بھیج رہا ہوں' خدا کرے مل جائے' کوئی تصنیف "شخص و شاعر" اگر آپ کے قلم سے نکلی تو یادگار چیز رہے گی۔ اس کی ضرورت بھی ہے اور گنجائش بھی۔ ہمارے بہت سے معاصرین ایسے ہیں جن کے بارے میں لکھنا چاہئے۔ سندھ کے اردو سندھی شعراء کا آپ کے قلم پر اور آپ کی فکر پر یوں بھی حق ہے۔ کب ملاقات ہوسکے گی؟

رئیس

مرزا ادیب

لالہ صحرا۔ چوہان روڈ
کرشن نگر۔ لاہور
۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵ء

میرے عزیز اور پیارے بھائی
سلام مسنون
گرامی نامہ ملا' دلی شکریہ

میں سمجھتا ہوں' "ثلاثی" کی صنف جس کی ایجاد کا سہرا آپ کے سر بندھتا ہے۔ ہمارے یہاں ضرور قبول ہوگی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمارے اجتماعی شعری مزاج کے قریب ہے۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ یہ بھارت میں بھی مقبول ہو رہی ہے خدا کرے ہمارے شعراء ادھر توجہ کریں۔

ہمارے ہاں "نثری" نظم کا تجربہ ہو رہا ہے۔ جان ہوگی تو اپنا وجود منوالے گی البتہ میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ نثری نظم کا تجربہ اس بناء پر آگے نہیں بڑھ سکا کہ اسے کوئی ن۔م۔ راشد جیسا بڑا شاعر نہیں ملا۔

اصل میں کسی تجربے کی اپنی داخلی توانائیاں اسے استحکام بخشتی ہیں۔ بڑے شاعر زیادہ سے زیادہ اپنے کچھ مقلد پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر تقلید سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ دیکھئے سانیٹ کو کتنا بڑا شاعر (اختر شیرانی) ملا تھا۔ ن۔م۔ راشد بھی۔ راشد نے بھی سانیٹ لکھے تھے مگر نتیجہ کیا ہوا۔ میں ذاتی طور پر نثری نظم کے تجربے کو چند نوجوانوں کے ذاتی تجربے کا نتیجہ گردانتا ہوں' انہیں کام کرنے کا' تجربے کو آگے بڑھانے کا موقع ملنا چاہئے۔ آگے چل کر خود بخود پیچھے ہٹ جائیں گے۔

اس خبر سے خوشی ہوئی کہ آپ کا "ثلاثیوں" کا مجموعہ کچھ مدت بعد منظر عام پر آرہا ہے۔ میں نے نہ جانے کہاں پڑھا ہے کہ آپ ڈرامے پر تھیسس لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے لئے۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔ ویسے عرض کردوں کہ مجھے اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ حمایت علی شاعر ہر اعتبار سے اس موضوع پر کام کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہے۔

ہاں جان برادر' یہ جو آپ نے لکھا ہے۔ "باغوں میں پڑے جھولے" یہ استاد عبدالکریم خاں کا گایا ہوا نہیں ہے۔ استاد برکت علی خاں نے اسے گایا تھا استاد برکت علی خاں' استاد بڑے غلام علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ "ماہیا" مولانا چراغ حسن حسرت نے لکھا تھا۔ مناسب سمجھیں تو تصحیح فرمادیں۔

آپ کا اپنا
مرزا ادیب

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

کیمبل پور
۶-۶-۷۷ء

صاحب العلم والفضل
اسلام علیکم ورحمتہ اللہ

آج کل ٹی وی پر اور پہلے ریڈیو سے آپ کے تمام پروگرام سنتا رہا۔ میں اس پروگرام کو شاید کبھی نہ بھولوں جس میں آپ "آب حیات" اور "گل رعنا" میں ذکر کردہ شعرا کا کلام' تاریخی ترتیب سے سنواتے رہے۔ ان شعراء پر آپ کا تبصرہ اتنا فاضلانہ ہوتا تھا کہ بارہا میرے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ اے کاش کہ آپ کسی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے چیئرمین ہوتے۔

چونکہ آپ اردو ادب میں ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ آپ کو بطور سند استعمال کرنے کا احتمال پیدا ہوگیا ہے۔ اس لئے میں آپ کی توجہ آپ ہی کے ایک سہو کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ میں چالیس سال معلم رہا ہوں ور اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ ۴ فروری کی شام کوئی وی سے ڈرگ روڈ والا مشاعرہ نشر ہوا۔ سب سے پہلے آپ نے اپنا کلام پیش کیا۔ بڑا حکیمانہ اور فلسفیانہ کلام تھا۔ مجھے صرف تین غزلیں پسند آئیں۔ فیض، ندیم اور آپ کی۔ آپ نے کئی بار اِملاک پڑھا۔ گرامر کے لحاظ سے یہ املاک ہونا چاہیئے۔ یہ ملک کی جمع ہے (غیاث اللغات) اور اس وزن کی جمع بفتحہ الف ہوتی ہے۔ مثلاً

خلق کی جمع اَخلاق

نسب کی جمع اَنساب	طرف کی جمع اَطراف
شریف کی جمع اَشرف (شرفاء)	نفس کی جمع اَنفاس
خبر کی جمع اَخبار	مِلک کی جمع اَملاک

اس شکل کی مصادر افعال (بکسر الف) کے وزن پر ہوتی ہے مثلاً اِنصاف، اِبلاغ، اِمکان، اِقرار، اِنکار، اِدراک، اِرسال، اِسلام، اِصرار، اِنعام وغیرہ کسوٹی ۔ یہ پروگرام بے حد دلچسپ معلومات افزا اور بے حد مفید ہے۔ کتنا اچھا ہو اگر فضلائے کسوٹی کے (غلط اضافت کے لئے معذرت) ۷۵ فیصد سوالات کا تعلق اسلامی تاریخ اور اسلامی رجال سے ہو۔ ہمارے رجال کا یہ عالم کہ ابن الفوطی (۶۴۲ھ۔۷۲۳ھ = ۱۲۴۵ء۔۱۳۲۳ء) نے آج سے سات سو سال پہلے اپنے دور تک کے علماء و حکما کا ایک تذکرہ "معجم الالقاب" کے نام سے ۵۰ جلدوں میں لکھا تھا۔ ہمارے مورخین کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب ہے اور مفسرین کی چار ہزار کے لگ بھگ۔ اگر "کسوٹی" کے سوالات کا تعلق اسلامک تاریخ و تہذیب سے ہو تو نئی نسل مسلمان ہو جائے۔

کیا مجھے بھی کراچی میں کوئی جانتا ہے۔ ۳۶ کتابیں لکھ چکا ہوں۔ مشہور ترین "دو قرآن" اور "من کی دنیا"۔ عمر ۷۵۔ کالجوں سے ۱۹۵۷ء میں ریٹائر ہوا۔ گھر کیمبلپور، کسی دن آپ اپنے رفقاء سے میرے متعلق پوچھئے۔ شکریہ

والسلام غلام جیلانی برق

○ عربی میں بے شک "اَملاک" ہے مگر اردو میں "اِملاک" عام ہے، جیسے شِکوہ سیمت وغیرہ (مرتب)

ڈاکٹر وزیر آغا

برادرم

آپ کا خط ملا۔ مجھے یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے سالنامہ "کامران" پسند فرمایا۔ آپ درست فرماتے ہیں کہ مرکز سے دور رہ کر معیاری رسالہ پیش کرنا مشکل بات ہے۔ تاہم ایسی کوشش ضرور ہونی چاہیئے۔ کامران ایک ماہنامے کے طور پر پچھلے چار سال سے شائع ہو رہا ہے لیکن سالنامے کی نوبت اس بار ہی آئی ہے۔ میں نے مدیر کامران سے وعدہ کر رکھا ہے کہ سالنامے کے سلسلے میں ہمیشہ اپنی خدمات پیش کر دیا کروں گا۔ باقی پرچے وہ خود ترتیب دے لیا کریں۔ امید ہے یہ سلسلہ

جاری رہے گا

""مسرت کی تلاش" پر ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں) کی رائے کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ازراہ کرم اس تبصرے کی ایک کاپی مجھے ضرور بھیج دیں جو ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو میرا سلام بھی پہنچا دیں اور یہ پیغام بھی کہ میں اس تبصرے کے لئے بے حد ممنون ہوں۔

"طنز و مزاح" کا ایک نسخہ ارسال خدمت ہے۔ اس کے بارے میں جو "تبصرہ" آپ لکھیں گے اس کی ایک کاپی بھی ضرور بھیج دیجیے گا۔

تحقیق کے لئے آپ نے ایک نہایت شاندار موضوع انتخاب کیا ہے۔ اس پر ضرور لکھنا چاہئے۔ اس لئے بھی کہ اس میں اردو کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ بھی شامل ہو جائے گا اور ہماری تنقید کو تاریخی اور سماجی پس منظر کی اشد ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے میں خود بھی ایک گاؤں میں رہتا ہوں جہاں کتب دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ تاہم میں اب اس بارے میں سنجیدگی سے سوچوں گا اور اگر شہر میں جا کر رہنے کا موقع مل سکا تو ضرور اس سلسلے میں تحقیق بھی کروں گا۔

"آگ میں پھول" کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اس پر مفصل تبصرہ تو بعد میں کروں گا۔ چند باتیں ابھی لکھنا چاہتا ہوں۔ اس مجموعہ کی مختصر نظموں میں "غم فردا" اور "مژدہ نو" بہت اچھی نظمیں ہیں۔ مجھے یاد ہے غالباً ۱۹۵۵ء کے بہترین ادب کا انتخاب کرتے وقت اس نظم یعنی "غم فردا" نے مجھے اپنی تازگی اور نکھار کے باعث بہت متاثر کیا تھا اور میں نے اس نظم کو انتخاب میں شامل کر لیا تھا "مژدہ نو" جتنی مختصر نظم ہے اتنی ہی پر تاثیر بھی ہے۔ اس میں طنز کی آمد بے محابا ہے۔ اردو ادب میں "نوحوں" کا مطالعہ کریں تو اس نظم کو ایک مقام امتیاز حاصل ہے۔ جیسا کہ آپ نے خود بھی لکھا ہے کہ آپ کے اس مجموعے کی بیشتر نظمیں مسائل سے متعلق ہیں اور اگرچہ یہ درد، کسک اور احساس سے لبریز ہیں اور ان کے ہر ہر مصرعے سے شاعر کے خلوص کا اظہار ہوتا ہے (اور شعر کے لئے خلوص کس قدر ضروری ہے) تاہم شاید عمر کے ایک خاص دور سے متعلق ہونے کے باعث ان نظموں میں تفکر کا وہ عنصر نہیں جو مثلاً آپ کی نظم "سمندر اور انسان" میں ہے۔ اگر مجھے اس بار پھر پچھلے برس کی شاعری پر تبصرہ کرنے کا موقع ملا تو میں اس نظم پر تفصیل سے لکھوں گا کیونکہ میری دانست میں یہ نظم اردو کی بہترین نظموں میں شامل کئے جانے کے قابل ہے۔

طویل نظموں میں "بنگال سے کوریا تک" نہایت خوبصورت نظم ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ بالکل اسی موضوع پر پچھلے دنوں ساحر لدھیانوی نے بھی ایک طویل نظم لکھی ہے "پرچھائیاں"۔ لیکن میری رائے میں آپ کی نظم "پرچھائیاں" سے کہیں بہتر ہے۔ "پرچھائیاں" میں ایک تو ساحر نے میٹر کو بار بار بدلا ہے جس سے نظم کی روانی کو صدمہ پہنچا ہے۔ آپ کی نظم میں یہ نقص موجود نہیں۔ دوسرے ساحر نے جو کہانی پیش کی ہے نہ صرف بے حد معمولی ہے بلکہ بے ربط ہے اور آخر میں اس نے وعظ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ آپ کی کہانی میں لوچ ہے، ایک نقطہ عروج ہے اور پھر زندگی کے ایک مخصوص "انداز" کو طشت از بام کیا گیا ہے۔ اس نظم میں "بچی" کا کردار "امید" کے معنوں میں آیا ہے جو موجودہ خلفشار، تخریب اور بربریت کے زمانے میں انسان کا واحد سہارا ہے۔ نظم کا یہ مثبت پہلو بڑے فطری انداز سے ابھرا ہے اور یہی اس نظم کا سب سے بڑا وصف ہے۔ پھر آپ نے ساحر کی طرح اپنے افکار قاری پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف اپنی کہانی سنائی ہے اور اسی طرح قاری کی ہمدردی حاصل کر لی ہے۔ میں آپ کی اس نظم سے متاثر ہوا ہوں۔ مبارکباد قبول فرمائیے

آپ کا وزیر آغا

(یہ خط وزیر آغا صاحب نے غالباً ۵۸ء میں لکھا تھا، اس لئے کہ "اردو ادب میں طنز و مزاح" اسی سال شائع ہوئی تھی)

(مطبوعہ "احوال واقعی" مرتبہ مرزا سلیم بیگ۔ ۱۹۹۴ء)

محشر بدایونی

کراچی
۲۰ جولائی ۱۹۸۸ء

حمایت بھائی، اسلام علیکم

حسب وعدہ (مرحوم) شعراء کی فہرست بھیج رہا ہوں فہرست میں ۶۶ نام ہیں میں صرف پچاس شعراء کو کتاب میں شامل رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ پچاس نام منتخب کردیں میرے خیال میں مندرجہ ذیل نکالے جاسکتے ہیں۔ (۱) ظریف دہلوی (۲) تحسین سروری (۳) بہار کوٹی (۴) عابد حشری (۵) عبد العزیز فطرت (۶) یاور دہلوی (۷) ضیاء القادری (۸) صفدر حسین (۹) ماہر افغانی (۱۰) شعیب حزیں (۱۱) حیرت شملوی (۱۲) تمنا عمادی (۱۳) شیوا بریلوی (۱۴) جام بدایونی (۱۵) نازش حیدری (۱۶) زیبا ردولوی

اگر کچھ ممتاز اور اہم شعراء کے نام سہواً فہرست میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں تو ان ناموں کا اضافہ فرمادیں۔

فہرست میں نام۔ پیدائش ۔ وفات اور تصانیف کے جو کالم ہیں، انہیں بھی جن ناموں کے حوالے سے بھر سکتے ہیں، بھردیں۔ میں اس سلسلے میں مشورہ طلب ہوں۔ آپ اپنے سرمایہ کتب اور گہری معلومات کی مدد سے جو رائے بھی دیں گے یا اطلاعات بہم پہنچادیں گے وہ محققانہ بھی ہوں گی اور منصفانہ بھی۔ آپ نے جن کتابوں اور رسالوں کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے غالب لائبریری جا کر ان کا مطالعہ کیا۔ بہت کچھ میٹر دستیاب ہوگیا۔ لیکن ابھی بہت کام باقی ہے۔ میں نے ابھی یہ کام روک رکھا ہے۔ آپ کے مشوروں کا منتظر ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری خاطر آپ یہ زحمت گوارا فرمائیں گے اور پوری مدد کریں گے۔

اب آپ کے ہاتھ کی تکلیف تو ختم ہوگئی ہوگی۔ اللہ آپ کو سکون و آسودگی کی نعمت سے نوازے۔

گھر میں سب کو سلام کہئے

آپ کا دیرینہ رفیق
محشر بدایونی

سری نواس لاہوٹی

۱۸۔۴۔۸۴ء

پیارے حمایت سلامت رہو

آج تمہیں عرصہ دراز کے بعد مخاطب کرتے ہوئے مسرت محسوس کررہا ہوں۔ امید کے تم مع اہل عیال کے خیریت سے ہوں گے۔

یہ خط تو صرف اس لئے لکھ رہا ہوں کہ رسم و راہ کی تجدید ہوجائے اور ہم ایک دوسرے کو ماضی کے جھروکوں سے جھانکنے کے بجائے راست ربط پیدا کرلیں تاکہ زندگی کے اس نصف آخر میں نوجوانی کی تجدید ہوسکے۔ پچھلے دنوں عنبڑ پر سے گزر رہا تھا تو بے ساختہ تم یاد آگئے جب کہ میں بیڑ سے چھوٹ کر سیدھا تمہارے گھر عنبڑ گیا تھا۔ لیکن تم سے ملاقات نہیں ہوسکی بعد میں حیدر آباد میں مل گئے۔

کہو! تمہارا کیا حال ہے۔ کتنے بچے اور کتنی ...... ہیں؟ آخر کو مسلمان ٹھہرے؟ ہمارا حال تو غالب کے اس شعر کے مصداق ہے۔

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت　　می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

تمہارے بچوں کی والدہ محترمہ اور بچوں کو دعا و سلام! امید کہ تم خیریت سے ہوں گے۔ پر خلوص نیک تمناؤں کے ساتھ!

بہت سا پیار
تمہارا خیر اندیش
سری نواس لاہوٹی

(انجمن ترقی اردو۔ آندھرا پردیش)
حیدر آباد دکن

اختر الزماں ناصر

اقبال اکیڈمی۔ اورنگ آباد

۱۱-۴-۱۹۸۸ء

برادر عزیز

اسلام علیکم

مجھ پر لکھا ہوا آپ کا مضمون جو بلاشبہ ایک مقالے کا وقار و تجمل رکھتا ہے۔ بہت پہلے جنوبی افریقہ ہی سے بھیجا ہوا مجھے مل گیا تھا۔ میں نے اسے پوری دلچسپی اور محبت سے پڑھا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی قمر اقبال کے نام وہی مضمون یہاں پہنچا۔ ''اورنگ آباد ٹائمز'' میں وہ شائع کرنا چاہتے تھے مگر چند احباب نے مشورہ دیا کہ میرے مجموعہ کلام[1]۔ جو شاید کبھی بھی منت پذیر طباعت اور اشاعت نہ ہو آغاز اسی سے ہو۔ دو ایک روز قبل ہی میں نے اسی مضمون کا آدھا حصہ حیدر آباد دکن سے نکلنے والے ایک ماہ نامے ''شاداب'' میں دیکھا ہے بلند اقبال[2] کے نام آئے ہوئے خط میں آپ نے پوچھا کہ میری اپنی رائے میں یہ مختصر مقالہ کیسا ہے۔ آپ نے یہ تک لکھا کہ اگر کوئی بات مجھے گراں گزری ہو تو آپ معافی چاہ لیں گے۔

خدا گواہ ہے کہ میں آپ کی فراخ دلی اور حقیقت شناسی سے اتنا زیادہ متاثر پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کوئی بات یا کسی بات کا کوئی جزو مجھے نہ تو غلط معلوم ہوا اور نہ بار خاطر اور نہ خفگی کا باعث۔ میرا پورا کلام آپ کے سامنے نہیں تھا۔ مگر آپ کا تبصرہ اور تجزیہ پورے ہی کلام کا احاطہ کرلیتا ہے۔ مجھے آپ نے قریب رہ کر جتنا دیکھا اس سے زیادہ دور رہ کر سمجھا' میں آپ کے ہر نقد سے متفق ہوں اور ممنوں ہوں کہ آپ نے اضلاع مراٹھواڑہ اور شہر حیدر آباد کے بہت سے ایسے لوگوں کو میری طرف متوجہ کیا جو میری خاموشی اور ایک نوع کی گوشہ نشینی کو میری بے بضاعتی اور کم سوادی پر محمول کرتے رہے تھے۔

آپ اس وقت جس مقام و مرتبہ پر فائز ہیں۔ وہ آپ اور صرف آپ کی لگن' خلوص اور تگ و دو کا پھل ہے یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ نے ان لوگوں کو آج بھی عزت اور احترام اور محبت کا حق دار سمجھا جو کبھی آپ سے قریب رہے اور جن سے آپ کو آپ کی اپنی دانست میں کچھ حاصل ہوا۔

میرے کلام کی طباعت و اشاعت میں اتنی الجھنیں پیدا ہو گئیں کہ میں انہیں تفصیل سے اور سلسلہ وار بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ قدر دانوں نے جس طرح مجھے اشاعت کلام کے لئے آمادہ کیا اور پھر اغماض بلکہ تساہل و تغافل برتا دوستوں نے اس نوع کی اطلاعوں کو جس محبت سے سنا اور پھر تجاہل سے کام لیا' ادب شناسوں نے پورے ہی مجموعہ کلام کو جس نخوت سے لائق اعتنا نہیں سمجھا ان سب کی ساری تفصیلات بڑی خونچکاں ہیں۔ مجھے اپنا کلام نہ پہلے بہت زیادہ عزیز تھا اور نہ اب ہے۔ میں اس کی اشاعت سے مایوس اور اپنی اس بے نیازی پر مسرور ہوں۔ گھر میں سب کو سلام کہئے۔ بچوں کو دعائیں۔ حفیظ کے خط کا میں نے جواب دیدیا ہے میں نے جو نیا گھر خریدا ہے وہ ایک ایسے علاقے میں ہے جہاں ابھی گھر کو سرکاری نمبر نہیں ملا ہے اس لئے میں نے انہیں پتہ نہیں دیا جہاں کام کرتا ہوں اس کا پتہ دینا مناسب نہیں۔ البتہ یہ بات قطعی ہے کہ حفیظ صاحب میرے ہی گھر ٹھہریں گے۔ ان کو سلام۔ ان کی بیگم اور بچوں کو دعائیں۔

فقط

اختر الزماں ناصر

سمیٹتا ہے ہر اک غم کو اپنے دامن میں
کشادہ ظرفی قلب پیمبراں کی طرح

نمبر ۱۔ مجموعہ کلام ''برگ و بار'' کے نام سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ نمبر ۲۔ اورنگ آباد کے دوست کا نام۔ (مرتب)

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

کلکتہ
۴ مارچ ۸۳ء

شاعر بھائی
محبت

کیا لکھوں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ لیکن اگر کچھ نہ لکھوں تو آپ سمجھیں گے کہ یہ شانتی کیسا آدمی ہے کہ اتنی کتابیں اور خط ملنے کے بعد بھی اس نے جواب نہیں دیا....!

دراصل میں اس وقت آپ کو کچھ لکھنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بہت کچھ کہنا چاہتا ہے' لکھنا چاہتا ہے' بہت سی باتیں' دل سب کچھ کہہ دینے پر تل جاتا ہے۔ لیکن دماغ بالکل ساتھ نہیں دیتا۔ چونکہ دماغ کا کام سوچنا ہے وہ سوچتا ہے' کون سی بات پہلے کہی جائے' کیونکر کہی جائے' انداز گفتگو کیا ہو! اور دل و دماغ کے اس چکر میں باتیں ان کہی رہ جاتی ہیں۔ اس وقت میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔

آپ شاعر ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک "استاد فن" اور ایک "حقیقی شاعر" میں فرق ہوتا ہے۔ "استاد فن" کی نظر ہمیشہ اصول شاعری پر ہوتی ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے ہمیشہ اصول کو سامنے رکھ کر قواعد کا پابند رہ کر کہتا ہے۔ لہٰذا استاد کے کلام میں کہیں کوئی فنی جھول نہیں ہوتا اور کوئی فنی لحاظ سے اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن حقیقی شاعر دل سے مجبور ہوتا ہے' وہ دل کا مالک ہوتا ہے۔ دل جس میں جذبات ہوتے ہیں' بے پناہ جذبات اور جب وہ جذبات کی شدت میں بہہ کر کہتا ہے تو کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کا کوئی شعر فنی پابندیوں کو توڑ دیتا ہے۔ استاد چیخ اٹھتے ہیں۔ لیکن سماج میں "حقیقی شاعر" کی قدر ہوتی ہے اور عوام میں وہی مقبول ہوتا ہے چونکہ اس کی باتیں دل سے نکل کر دلوں میں گھر کرلیتی ہیں۔ میں بھی اس وقت جذبات سے مجبور ہوں لہٰذا میری غلطیوں پر نہ جایئے۔ شاید میں ایسی باتیں کہہ رہا ہوں جو مجھے نہیں کہنی چاہئے۔

مجھے یاد نہیں' میں نے آپ کو حیدرآباد میں دیکھا تھا یا نہیں۔ کبھی ملا تھا یا نہیں۔ لیکن میں اورنگ آباد میں بھی رہا اور حیدرآباد اور سکندرآباد میں بھی۔ پورا سابق ریاست حیدرآباد میرے لئے جانا پہچانا سا ہے۔ گھر آنگن سا۔ چونکہ میرے پتاجی ریاست حیدرآباد کے ریلوے ملازم تھے اور ان دنوں وہ نظام اسٹیٹ ریلوے تھا۔ میں نے شہر حیدرآباد اور سکندرآباد میں تعلیم پائی۔ تعلیم کیا خاک پائی بس میٹرک پاس کرلیا اور اس کے بعد تلنگانہ تحریک سے وابستہ ہوگیا۔ ۵۲ء تک میں ریاست حیدرآباد میں رہا۔ پھر کلکتہ آیا اور پھر گیا۔ لیکن آخر کار پتاجی کے انتقال (انتقال بمقام چکل تھانہ یعنی اورنگ آباد کا ایرپورٹ اسٹیشن پر ہوا) کے بعد ۵۷ء میں کلکتہ میں آگیا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

برسوں بعد گزشتہ سال اردو کانفرنس کے موقع پر حیدرآباد گیا تھا۔ حیدرآباد جس کی گلی گلی سے میں واقف تھا۔ مجھے بالکل ہی بدلا ہوا ملا۔ اجنبی شہر معلوم ہوا۔ یہاں فلاں گھر تھا۔ لیکن وہ گھر کہاں ہے۔ یہاں اریب رہتا تھا' لیکن کہاں ہے وہ سلیمان اریب۔ اس اخبار میں وہاب حیدر کام کرتے تھے۔ لیکن کہاں ہے وہاب حیدر۔ پھر بھی چند پرانے ساتھی مثلاً" راج بہادر گوڑ' سری نیواس لاہوٹی' حسینی شاہد' عاتق شاہ' زینت آپا اور باجی وغیرہ ملے۔ یہی نہیں بلکہ جب حیدرآباد کے اخبارات میں میری آمد کی اطلاع شائع ہوئی تو سابق ریاست حیدرآباد کے اضلاع سے بھی کئی ساتھی آکر ملے۔ مثلاً" پداپلی سے امر بھارتی (راجہ رام سنگھ) کریم نگر سے تاج کریم نگری (ریاست علی تاج) اور پربھنی سے ابراہیم اختر وغیرہ۔ کتنی باتیں ہوئیں' کیا کیا باتیں ہوئیں' رات کے ۱۲ بجے۔ ایک بجے تک باتیں ہی باتیں' نہ ختم ہونے والی باتیں۔ کتنوں نے گھروں میں کھانے کی

دعوت دی۔ پھر نام پلی کے ہوٹل' عابد روڈ کے ہوٹل۔ دل حیدر آباد چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا اور نہ حیدر آباد کے ساتھی چھوڑنے کو تیار تھے۔ لیکن لوٹ آنا تھا اور لوٹ آیا۔ ریل جب پلیٹ فارم سے رینگنے لگی کتنے ساتھیوں کے دل رو اٹھے اور میری بھی اس وقت کیا حالت ہوئی تھی۔ یہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لکھا نہیں جا سکتا۔ سمجھایا نہیں جا سکتا!

شاعر بھائی آپ کی شاعری نے ایک بار پھر میرے دل میں حیدر آباد کی یادوں کو تازہ کر دیا۔ میں تو ہندوستان میں ہوں۔ میرے لئے پاسپورٹ وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ صرف روپیہ ہو تو کئی بار جا سکتا ہوں لیکن آپ کے دل کی کیا حالت ہوگی؟ یاد وطن آپ کو کس کس طرح ستاتی ہے۔ آپ کے کئی اشعار میں یہ درد دل صاف ہے۔ چاہے وہ نظم "شہکار" ہو یا "زندگی اور پتھر" یا ادھر ادھر کے اشعار مثلاً"

وہ دھوپ چاندنی تھی' وہ پتھر بھی پھول تھے
کیا جانے سحر کیا' مری خاک وطن میں تھا

شفاف سطح آب پہ کھلتے کنول سے لوگ
یہ زندگی کا روپ بھی ارض دکن میں تھا

اور آپ نے جو کہا

سینے میں دم گھٹ جاتا ہے
جب بھی گھر کا خیال آتا ہے
دل پہ پتھر برساتا ہے

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسی لئے نا کہ انسان گھر کا قیدی ہے' اسے گھر سے بے انتہا محبت ہے۔ یاد نہیں آرہا ہے کس نے کہا تھا۔

Home home sweet home
There is no place like home

غالباً" یہی وجہ ہے کہ دم گھٹنے لگے تب بھی گھر کی یاد ستاتی ہے۔ دل پر پتھر برسے تب بھی گھر کا خیال آتا ہے۔ اگر گھر سے' وطن سے محبت نہ ہو تو یہ سب کچھ کیوں ہو؟

آج میں کچھ اور نہیں لکھوں گا۔ آپ کی شاعری کے سلسلے میں بھی نہیں۔ نور صاحب کو میں نے صرف چند ہی کتابیں دی ہیں۔ وجہ' ان کی زبانی آپ کو حالات کا درست علم ہو جائے گا۔ آپ نے جو کتابیں بھیجی ہیں ان کو بار بار پڑھوں گا اور دو تین ماہ بعد ایک مکمل مضمون لکھوں گا۔ کم از کم دو ماہ بعد۔ اس لئے کہ آج کل ایک خشک موضوع پر کام کر رہا ہوں جس کام کو پورا کرنے کے لئے مجھے کلکتہ سے باہر پٹنہ' دلی اور لکھنؤ وغیرہ کے چند کتب خانوں میں بھی جانا ہوگا۔ ۱۵ مارچ کو باہر نکلوں گا اور کوئی ایک ماہ باہر رہنا پڑے گا۔ آپ چاہیں گے یہ خشک موضوع کیا ہے...... وہ ہے "تاریخ صحافت اردو۔ بنگال"

نور صاحب کو سلام کہنے کے بعد کہئے گا کہ ان کے حکم کے مطابق میں نے رفیق ساجد کے کلام پر رائے دے دی ہے۔

اچھا رخصت

شانتی رنجن بھٹاچاریہ
۴ مارچ ۸۴ء کلکتہ

(۲)

بھائی شاعر محبت

دو ادبی رسالے آپ کو روانہ کررہا ہوں "زبان و ادب" جو بہار اردو اکادمی کا رسالہ ہے اس میں آپ کے سلسلے میں میرا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ رسالہ آپ کو بہار اردو اکادمی والوں نے روانہ کیا ہو۔ پھر بھی میرا یہ کام ہے کہ آپ کو ایک پرچہ روانہ کردوں۔ دوسرا رسالہ مغربی بنگال اردو اکادمی کا "روح ادب" ہے۔ جس کا حال ہی میں ایک خاص شمارہ "بنگال میں اردو شاعری نمبر" آیا ہے۔ اس میں بھی میرا ایک طویل مضمون ہے۔

زمانہ ہوا آپ نے کتابیں روانہ کی تھیں اور اس کے بعد سے آج تک آپ خاموش ہیں۔ معلوم نہیں اس دوران آپ کی اور کون کون سی کتابیں سامنے آئی ہیں۔ بہرحال تازہ حالات کا مجھے کوئی علم نہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ مجھے بنگال کے سلسلے میں شائع شدہ تصانیف سے خاص دلچسپی ہے۔ پاکستان میں اس سلسلے میں کون سی تصانیف آئی ہیں؟ اگر آپ کی نظروں سے کوئی کتاب گزری ہو تو مجھے وہ بھیجنے کی کوشش کریں۔ سنا ہے کہ وفا راشدی کی ایک کتاب "وحشت کلکتوی" کے سلسلے میں چھپی ہے۔

کبھی کبھی حالات سے آگاہ کیجئے اور کیا عرض کروں شہزاد منظر یہاں آئے تھے اس سے ملاقات ہوئی اگر آپ سے ان کے تعلقات ہو تو میرا سلام کہئے۔ چند اچھے ادبی رسالے ہوسکے تو روانہ کیجئے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو لکھئے۔

بھابی اور بچوں کو سلام و پیار

شانتی رنجن بھٹا چاریہ

۸۵-۸-۹

پروفیسر ڈاکٹر حبیب الحق ندوی

(صدر شعبہ عربی، اردو، فارسی)

ڈربن یونیورسٹی، (جنوبی افریقہ)

۳۰ جولائی ۹۱ء

برادر عزیز گرامی قدر جناب حمایت علی شاعر صاحب سلامت باکرامت باد

بحمد للہ زندہ ہوں امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔ آپ کا مودت نامہ ملا۔ لیکن تاریخ ندارد تھی معلوم نہیں کراچی سے یہ خط کب روانہ ہوا۔ برادرم راغب صاحب نے عید مبارک کا خط لکھا جو بقرعید مبارک کے موقع پر ملا۔ معلوم نہیں یہ خط تین ماہ تک کہاں سوتا رہا۔ آپ کا خط بھی راستہ میں غیر ضروری استراحت کے بعد روانہ ہوا۔ یہی حال ہندوستانی خطوط کا بھی ہے۔ اب تو خط غائب ہوجاتے ہیں اسی لئے اس کو رجسٹری کے ذریعہ ارسال کررہا ہوں۔ خط پر تاریخ ڈالا کریں۔ شاعر اور پروفیسر بھولا کرتے ہیں۔ بہرحال جنوبی افریقہ سے جانے کے بعد آپ کا یہ پہلا خط مجھے موصول ہوا۔ شاید اس لئے کہ آپ نے Post Box کے پتہ پر ارسال کیا تھا۔ یونیورسٹی میں ہمارے خطوط اکثر Mislplace ہوکر غائب ہوجاتے ہیں۔ جامعہ Oxford سے لکچرز کا دعوت نامہ آیا وہ غائب ہوگیا بلکہ غائب کردیا گیا۔ آپ اشارہ سمجھ رہے ہوں گے۔ بعد میں فون اور Reminder کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ہم نے دعوت نامہ لکچرز کا جواب نہیں دیا۔ مسلمانوں کی یہ عادت دور زوال میں بھی

ختم نہیں ہوئی ہے۔ جارج ٹاؤن یونیورسٹی واشنگٹن سے خط آیا کہ میں ان کے اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے لئے دو مضامین لکھوں۔ یہ خط بھی دبادیا گیا۔ دس ماہ بعد Reminder ملا کہ تم نے ہنوز جواب نہیں دیا۔ حیرت کی بات ہے۔

خیر معاف کریں یہ سب باتیں معترضہ طور پر سامنے آگئیں۔ عند الملاقات، تفصیلات بیان کروں گا۔

اردو شاعری کے سلسلہ میں انعامات کے سلسلہ میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ قبول کریں۔ الھم زد فزد۔

مملکت خداداد کی ادبی و لسانی شاہراہوں کی پر پیچ تاریکوں میں آپ اور راغب صاحب جیسے فنکار روشنی کا مینار ہیں۔ کاش ہماری قوم اسے سمجھ سکتی۔ وہ قوم وہ ملک جہاں قومی زبان نشوونما سے محروم اور عصبیت کا شکار ہے۔ خدا رحم فرمائے۔

آپ نے سوٹ کی مدح میں نظم منثور یا Prose Poetry تو ضرور لکھی لیکن آپ کو منظوم کلام بلکہ ایک قصیدہ بھی لکھنا چاہئے تھا۔ اخلاص کے تحفہ میں کشش ہے حسن ہے اور برکت بھی۔ یہ سوٹ آپ پر اسی وقت جچا تھا جب آپ نے یہاں زیب تن کیا تھا۔ جیسے بنایا گیا ہوں میں تیرے لئے! مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کے احباب نے سوٹ کو پسند کیا۔ یہ Executive سوٹ کے نام سے معروف ہے۔ اور جنوبی افریقہ میں بے حد مقبول ہوا۔ کمپنی کے بڑے بڑے ڈائریکٹر' افسران حکومت کے لئے یہ طرز نو طرح خاص کی ایجاد ہوئی' جو ہر موزوں اور منظوم جسم پر "زیب تن" ہو گئی۔ ہر سوٹ میں یہ جادو نہیں ہے۔ اسے خاص خاص موقوں پر استعمال کریں اور یہ خیال رہے کہ جمالستان میں جہاں نبات حسنات حوران خلد کا فردوس ہو' وہاں پہن کر جائیں۔ آپ اب بھی جوان ہیں۔ لیکن طرف جمالستان دیکھ کر بجلیاں گرائیں۔ اور جہاں تک انھیں تاب ہو وہیں تک قدم اٹھائیں۔

میری کتاب Urdu Aesthetice and Poetics زیر ترتیب ہے۔ اس میں انشاء اللہ اقبال کے بعد کے تمام معیاری شعراء کا تذکرہ جدید انداز میں لکھوں گا۔ اردو میں تو بہت تنقیدی مواد ہوگا لیکن انگریزی کا میدان خالی ہے۔ شائد اس خلا کو میں پورا کرسکوں۔ صدیقی صاحب کی کتاب اقبال تک آکر رک گئی۔ اس کے بعد اس کو کسی نے آگے نہیں بڑھایا۔ یہ کام درحقیقت جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس دور آزمائش میں کہاں کسی کو فرصت ہے کہ رگ گل سے بلبل کے پر باندھے۔ ہر شخص قوت لایموت کی جنگ میں مبتلا ہے۔ اس خاکسار نے اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ خدا کامیاب کرے۔ اسی کتاب میں آپ کا ذکر خیر بھی ذکر فیض کے ساتھ ہوگا۔ راغب صاحب اور دیگر حضرات بھی اس گلدستہ کی زینت ہوں گے' انشاء اللہ۔ آپ حضرات سے میں نے بار بار درخواست کی کہ اپنی زندگی کے حالات اہم واقعات وغیرہ سے واقف کریں لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ انشاء اللہ میں دسمبر میں کراچی اور ہندوستان آؤں گا اور اس موقع پر کچھ مواد جمع کروں گا۔ آپ حضرات سے بھی درخواست ہے کہ کچھ مواد فراہم کریں اور مزید مواد کی طرف رہبری کریں۔ میر' مومن' غالب پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ نئی نسل پر کچھ بھی نہیں ہے۔ خاص کر انگریزی میں۔ ضرورت ہے کہ اس کی طرف فوری توجہ دی جائے۔ انشاء اللہ میں ہر نوجوان شاعر کا حق ادا کروں گا اور ان کے ساتھ Historical Justice بھی کروں گا۔

میری کتاب آپ کو ضرور مل گئی ہوگی! ممکن ہے ڈاک کی نذر ہوئی ہو یا کہیں استراحت کی منزل میں ہو دوسری کاپی ضرور جائیگی۔ اسی تازہ کتاب کا عظیم حادثہ یہ ہے کہ کسی نے کراچی یا پاکستان میں میری اس کتاب کو بغیر اجازت و اطلاع کے شائع کردیا ہے۔ ماریشس کے ایک دوست نے میری کتاب پاکستان میں خریدی اور مجھے خط لکھا کہ میں مزید کاپیاں ڈربن کے ارسال کروں۔ میں یہ سن کر وم بخود رہ گیا۔ کس قدر ظلم ہے حمایت صاحب کہ مولف کی Sleepless Nights اور

سالوں کی محنت سے چور استفادہ کریں اور خود مولف محروم رہے۔ کتنا بڑا ظلم ہے۔ ماریشس کے خالق صاحب کے خط کی کاپی ارسال کررہا ہوں۔ تاکہ آپ کو اس ظلم کا علم ہو۔ میں نے دو ایک دوستوں کو مزید لکھا ہے۔ آپ چونکہ پبلک لائف میں ہیں۔ مراسم و تعلقات بھی وسیع ہیں۔ ذرا نظر رکھیں۔ کتاب گھروں میں بھی نظر رکھیں شائد پتہ چل سکے۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ بہت خفیہ طور پر اشاعت ہورہی ہے۔ لیکن دیکھئے چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ کس جرات کے ساتھ اس نے شائع کردیا۔ احسان مند ہوں گا اگر پتہ لگ سکے۔ ان کے خلاف قانونی کاروائی تو ہوسکتی ہے۔

میری تالیفات کی ایک فہرست بھی خط کے ساتھ منسلک ہے۔ خدا اپنی پسند کے کام کرنے اور کروانے کی توفیق عطا کرے۔ آپ احباب کی دعاؤں کی بھی ضرورت ہے۔

حبیب الحق ندوی

(ایک غلط فہمی کا ازالہ)

ڈاکٹر شان الحق حقی

عزیز و مکرم حمایت علی شاعر صاحب

آپ نے "دائرے" میں میرا مضمون دیکھ لیا ہوگا جو آپ ہی کے خط کو پڑھ کر لکھا گیا تھا اور امید ہے کہ آپ کے شکوک رفع ہوگئے ہوں گے۔

میں آپ کی نسبت کسی عداوت کا گمان کرنا نہیں چاہتا کیونکہ کوئی بنائے عداوت دور دور تک میرے علم میں نہیں ہے۔ خود مجھے کسی موقع پر کوئی شکایت آپ سے پیدا ہوئی تھی گو بجا تھی یا بے جا اس قابل نہیں تھی کہ عرصے تک دل میں رہتی۔ ایک بار آپ ہی نے اس کا ذکر نکالا تھا اور بجائے کسی تاسف کے خاصی برہمی کا اظہار کیا تھا۔ مجھے آپ نے اس لہجے میں بات کرتے کبھی نہ سنا ہوگا۔

آپ کو یہ گمان بھی نہیں ہونا چاہئے کہ میں مشاعروں میں جانے یا چمکنے کا بہت شوقین ہوں گا اتنے مشاعرے ہوتے رہتے ہیں میں کہیں جانے کی خواہش یا کوشش نہیں کرتا میں اپنا کلام بھی چھپنے کے لئے نہیں بھیجتا۔ مجموعوں میں ہمیشہ کلام غیر مطبوعہ ہوتا تھا۔ جو پہلی بار چھپ کر سامنے آیا چند سرسری ملاقاتوں کی بنا پر آپ مجھ سے شاید بالکل واقف نہیں۔ مجھے کئی موقعوں پر اس طرح کا احساس ہوا ہے۔

تشنہ صاحب (عالمتاب تشنہ) نے بھی مجھ پر "ذکر خنداری" اردو لکھنے اور شیکسپئیر کو مسخ کرنے کا الزام برسرعام ایک اخباری بیان میں لگایا تھا اس کے بعد سے وہ خود ہی دل میں کچھ لئے بیٹھے ہیں حالانکہ میں اسے بھی رفت گزشت کرچکا تھا۔ وہ دعوت نامہ جس کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا کہ ایکسپریس ڈاک سے بھیجا ہے مجھے آج تک نہیں ملا۔ خیر یونہی سہی یہ زندگی کے تجربات ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو آدمی نے کیا دیکھا کیا پایا

خیابان تنظیم
ڈیفنس سوسائٹی کراچی
۱۷ستمبر۱۹۸۹ء

خیر طلب
شان الحق حقی

برادر محترم شان الحق حقی صاحب (کراچی)

۲۳-۹-۱۹۸۹ء

تسلیمات عرض

ابھی ابھی آپ کا خط ملا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یاد فرمایا۔ مگر انداز تحریر سے گمان ہوا کہ آپ مجھ سے "قدرے بدگمان" ہیں کیوں؟ اس کا سبب مجھ پر نہ کھلا...... مولوی عبد الحق صاحب کے استعفیٰ سے متعلق آپ کا مضمون میری نگاہ سے بھی گزرا۔ آپ نے اچھا کیا وضاحت کردی ورنہ لوگ مزید بدگمانیوں میں مبتلا ہوتے۔ میں نے اپنے خط میں آپ کا اور جمیل الدین عالی صاحب کا حوالہ اسی لئے دیا تھا کہ دونوں حضرات کا تعلق مولوی صاحب سے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ نئی نسل ان واقعات سے بے خبر ہے جن کا ذکر آپ نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مولوی صاحب پر جب بھی کوئی تحقیقی کام ہوگا تو ان کا مطبوعہ استعفیٰ بھی معرض بحث میں آئے گا اور پھر خدا جانے کس "نکتہ آفرینی" سے کام لیا جائے۔ آپ کی نظر سے اگر میری کتاب "شخص و عکس" گزری ہو تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ میں خود کتنا "احباب گزیدہ" ہوں۔

آپ کے مضمون سے بھی یہی اندازہ ہوا۔ ہوسکتا ہے مولوی صاحب کا استعفیٰ جعلی ہو' اب یہ پروفیسر حسنین کاظمی صاحب کی ذمہ داری ہے کہ اصل حقیقت واضح کریں۔

آیئے اب اس بدگمانی کی طرف جو آپ کو مجھ سے ہے۔ حقی صاحب کسی مشاعرے میں تقدیم و تاخیر کی حد تک اگر مجھ سے کوئی کوتاہی' سرزد ہوئی تو میں نے آپ سے معذرت بھی طلب کرلی تھی اور میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے ارادی طور پر کسی کے ساتھ' کبھی کوئی ایسی زیادتی نہیں کی..... خیر میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے معاف بھی کردیا۔

مجھے تو افسوس یوں ہے کہ اس کے باوجود آپ کا دل میری طرف سے صاف نہیں' کبھی کبھی آپ کا کوئی فقرہ مجھے احساس دلاتا رہتا ہے مگر میں اس لئے چپ رہتا ہوں کہ آپ میرے بزرگ ہیں اور میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں (آپ کو یقین آئے یا نہ آئے)

آپ نے اس خط میں بھی غیر ضروری طور پر "مشاعرے میں چمکنے" کا طعنہ دیا ہے آپ شاعری میں جو مرتبہ و مقام رکھتے ہیں اس کی روشنی میں "مشاعرے کی چمک" کیا حقیقت رکھتی ہے۔ اتنا شعور تو مجھے بھی ہے کہ ادب محض "سماعی" نہیں ہوتا۔ ادب پڑھا جاتا ہے اور صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ آپ اہل نظر ہیں' اہل فن ہیں' آپ جیسے بزرگوں کو پڑھ کر ہی ہم لوگوں نے لکھنا سیکھا ہے۔ خدا کے لئے اپنے دل سے (کم از کم میری حد تک) ایسا تاثر نکال دیجئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرا کوئی حلقہ بھی نہیں ہے کہ تحسین باہمی کی تعریف میں آسکے۔ میں تو خود اتنا محتاط ہوں کہ اپنی کتابوں پر بھی کسی سے کوئی فلیپ نہیں لکھواتا۔ نہ خود ستائی کا آزار مجھے ہے اور نہ فرمائشی مضمون نویسی کا..... اس کے باوجود میرے "مخصوص دوست" مجھے جس طرح نوازتے رہے... گزشتہ برسوں میں آپ کی نظر سے وہ تحریریں گزرتی رہی ہوں گی مجبوراً حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے ان تحریروں کا جواب دیدیا۔ میرا تعلق (اپنی بساط بھر) چونکہ "تحقیق" سے بھی رہا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اپنے مستقبل کے بارے میں زیادہ خوش گمان بھی نہیں رہنا چاہئے۔

خیر' یہ باتیں... مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں۔ میں تو ضمناً "عرض کررہا ہوں' تشنہ صاحب' نے شیکسپیئر کے تراجم کے سلسلے میں جو کچھ لکھا' اتفاق سے میری نظر سے نہیں گزرا اگر انہوں نے ایسا لکھا ہے کہ تو افسوسناک ہے اور ان کی لاعلمی کی دلیل ہے۔ میرا چونکہ ان سے کوئی خاص ربط نہیں ہے اس لئے آپ کے بارے میں انکے خیالات کا مجھے علم نہیں۔

میں ایک بار پھر آپ سے عرض کرتا ہوں کہ "دائرے" میں میرا خط' محض ایک تحقیقی ضرورت کے حوالے سے تھا اگر ایسی تحریریں شائع ہوتی رہیں جن میں بدگمانیوں کے راہ پانے کے امکانات ہوں تو بہتر ہے کہ نہ چھپیں۔ اور اگر ان کی اشاعت ضروری ہی سمجھی جائے تو وضاحتی حاشیئے ضرور دیدیے جائیں۔

آپ کے مضمون سے بڑی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ میری ہی نہیں' ان سب کی جو مولوی عبد الحق سے ایک تعلق خاطر رکھتے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں

آپ کا مخلص

حمایت علی شاعر

۱۸۔ ۷۔ ۱۹۸۹ء

پروفیسر حسنین کاظمی (مدیر دائرے) کے نام

محترم حسنین کاظمی صاحب۔ تسلیمات

"دائرے" کا تازہ شمارہ (مئی جون ۸۹ء) آج کل زیر مطالعہ ہے۔ اس شمارے میں مولوی عبد الحق کا ایک خط نما مضمون شائع ہوا ہے جو غالباً "ترقی اردو بورڈ" (موجودہ نام۔ ڈکشنری بورڈ) کے صدر کے نام ہے۔ اور یہ خط "ترقی اردو بورڈ" مولوی صاحب کے استعفیٰ سے متعلق ہے۔ ایسی تحریریں جو برسوں بعد دستیاب ہوتی ہیں حاشیئے میں ضروری وضاحتوں کی طلب گار ہوتی ہیں اس خط میں سوائے عشرت حسین زبیری (مرحوم) کے کسی کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ "اس دور" کے پڑھنے والے کو قطعی پتہ نہیں چلتا کہ یہ خط کس کے نام ہے۔ ان دنوں بورڈ کا سیکریٹری کون تھا اور وہ "حسنین صاحب" کون تھے جنہوں نے اپنی سرکاری حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھایا (کاش ان کا پورا نام دے دیا جاتا) ادبی اور علمی اداروں میں سرکاری اور نیم سرکاری افسران کی مداخلت عموماً" ایسے مسائل پیدا کردیتی ہے۔ اس لئے ان کی ہنرمندانہ کارکردگی کو سمجھنے کے لئے ان کے نام اور منصب کی وضاحت ضروری ہوتی ہے تاکہ اہل علم وادب کو معلوم ہوتا رہے کہ

"ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے"

ترقی اردو بورڈ کے جن سیکریٹری صاحب کی طرف مولوی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ لوگوں کا گمان ہے کہ وہ شاید محترم شان الحق حقی صاحب ہیں' کچھ لوگ برادر عزیز جمیل الدین عالی کا نام بھی لے رہے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ مولوی صاحب کا یہ خط جناب ممتاز حسن احسن کے نام ہے جو اس زمانے میں ترقی اردو بورڈ کے "صدر" تھے شاید' وقت بہت گزر چکا ہے۔ مجھے بھی یاد نہیں کہ حقیقت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ نئی نسل کے اہل قلم..... یا قاری.... بالکل ہی ناواقف ہوں گے۔ اگر آپ ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب کی اس نایاب تحریر کے ساتھ محترم جلیل احمد قدوائی سے ضروری معلومات حاصل کر کے "حاشیئے" میں نوٹ فرمادیتے تو تحریر کی افادیت اور بڑھ جاتی۔ ایسی تحریریں آئندہ اہل تحقیق کے بہت کام آتی ہیں۔ مبہم تحریروں سے غلط فہمیوں کے در کھل جاتے ہیں۔ میں متعلقہ حضرات سے گزارش کروں گا کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اس مضمون کے سیاق و سباق پر حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالیں تاکہ سبھی کو معلوم ہو جائے کہ کون "معشوق" تھے اس پردہ زنگاری میں

آپ کا۔ حمایت علی شاعر

(مطبوعہ "دائرے" اگست ۱۹۸۹ء)

(نوٹ) اس خط کے جواب میں جو وضاحتی مضامین اور خطوط "دائرے" میں شائع ہوتے رہے وہ اہل تحقیق کے لئے توجہ طلب ہیں ان کی روشنی میں بیشتر "پس پردہ حقیقتیں" نمایاں ہوتی ہیں۔ (ستمبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء (مرتب)

تبصرے ــ مطالعے

آگ میں پھول

سجاد ظہیر

"آگ میں پھول" پاکستان کے نوجوان شاعر حمایت علی شاعر کا پہلا مجموعہ کلام ہے اس میں آگ کی سی گرمی بھی ہے' پھول کی سی نرمی بھی۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شعور کی وہ رو بھی رواں دواں ہے جو سماجی حقیقت نگاری سے اشتراکی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اس میں اپنے عہد کا کرب بھی ہے اور مستقبل کی طرب انگیز امنگ بھی۔

حمایت کی شاعری صرف اپنی ذات کے گرد ہالہ بنا کر نہیں رہ جاتی بلکہ وہ اس دنیا کا بھی طواف کرتی ہے جس میں اس جیسے ہزاروں لاکھوں انسان رہتے ہیں حمایت نے یہ طواف احرام باندھ کر محض عبادت کے طور پر نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس کا محاسبہ بھی کیا ہے۔ اس نے اپنی دنیا کو انسان کی نظر سے دیکھا ہے اور جتنے دکھ اسے اور اس جیسے انسانوں کو ملے' انہیں گن گن کر اپنے عہد کی تاریخ کے حوالے کیا ہے۔

سرسری طور پر دیکھا جائے تو یہ ایک جذباتی نوجوان کی شاعری نظر آئے گی لیکن ذرا غور کریں تو اس میں احساس کی وہ کیفیت بھی پوشیدہ ملے گی جو بھرپور زندگی کی علامت ہے! اس کی نظمیں "آخر شب" "غم فردا" "ادھوری کہانی" اور "مہاجر بستیاں" اسی کیفیت کی غماز ہیں! ان نظموں میں اس کی روح کا زہر' اس کی زبان پر آکر ایک تلخ مسکراہٹ چھوڑ گیا ہے۔ یہ مسکراہٹ اس کے پورے عہد پر ایک طنز بھی ہے اور وہ نشتر بھی جو اس زہر کو نکالنے کے لئے نبض دوراں پر لگایا گیا ہے اس کے علاوہ سیاسی مسائل پر جو نظمیں ہیں' ان میں بھی اس کی دھار بہت تیز ہے ممکن ہے ادب کے بعض نقاد ان نظموں کو غصے اور جھلاہٹ سے تعبیر کریں اور اس میں انہیں وہ ادب کم نظر آئے جس کا تاثر دیرپا ہوتا ہے لیکن میں شاعری میں جذبے کی صداقت کا قائل ہوں اور حمایت علی شاعر کی پوری شاعری میں مجھے یہ عمل شدید نظر آتا ہے وہ کہیں مصنوعی شعر نہیں کہتا اس کی افسانوی نظمیں "شعلہ بے دود" ہو یا "بنگال سے کوریا تک" وہ افسانے کو بھی زندگی کے آئینے میں دیکھتا ہے' اور وہ چہرے تراشتا ہے جو ہم جیسے انسانوں کے چہرے ہیں۔ "شعلہ بے دود" متوسط طبقے کے طبقاتی کردار کا نمائندہ ہے اور "بنگال سے کوریا تک" ایک وسیع کینوس میں انسانیت کی اس ابدی آرزو کی تصویر' جسے امن کہتے ہیں۔ وہ آگ اور خون کے میدانوں سے رومانوی انداز میں نہیں گزرا' بلکہ خود بھی جلتا اور خون اگلتا' اس منزل تک آیا ہے' جہاں پہنچ کر جنگ سے نفرت ایک مقدس فرض بن جاتی ہے۔

اس کتاب کی روشنی میں حمایت علی شاعر سے بڑی شاعری کی توقع وابستہ رکھی جا سکتی ہے۔

۱۸ دسمبر ۶۳ء

سید سبط حسن

عام طور سے ہر تصنیف کے دیباچے میں اس کی اشاعت کا جواز ضرور ملتا ہے۔ یہ ایک رسم سی ہے۔ مصنف حضرات لکھتے ہیں 'ناشر کا اصرار تھا اس لئے کتاب چھپوا دی یا دوستوں کی ضد تھی۔ ٹال نہ سکا۔ بہرحال کچھ اسباب کچھ ایک سے ہوتے ہیں 'یہ کوئی نہیں لکھتا کہ اپنے فکری سرمایہ کو کتابی صورت میں دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ بارے آج یہ مراد بر آئی ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کتاب لکھی ہے تاکہ لوگ پڑھیں' آخر ہم لکھتے کیوں ہیں؟ اسی لئے تاکہ ہماری تحریر لوگوں تک پہنچے۔ اگر یہ باتیں ٹھیک ہیں تو لوگوں کے کام آئیں گی۔ نہیں تو شاید انہیں کے سہارے بحث چل نکلے۔ کچھ مسائل سامنے آئیں گے۔ الجھیں گے۔ پھر سلجھیں گے بہرحال کام کی باتیں ہوں گی۔

حمایت علی شاعر نے بھی یہی کیا "آگ میں پھول" ان کے کلام کا شاید پہلا مجموعہ ہے۔ ان کی اشاعت کی ذمہ داری سے کترانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ اس کی روشنی میں شاعر سے کامیاب تر مجموعے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس میں ۳۵ کے قریب نظمیں ہیں۔ چھ سات غزلیں ہیں' کچھ متفرق اشعار ہیں اور آخر میں طویل نظم "بنگال سے کوریا تک" شامل ہے۔ یہ نظمیں متاثر کرتی ہیں اور فکر انگیز ہیں' صاف ستھری' رواں دواں لہجے میں بے باکی لیکن تلخی کی حد تک نہیں۔ مزاج میں ایک خاص طرح کا تجسس اور معصومیت' موضوع یہی عام زندگی کے سیدھے سادے واقعات ہیں۔ کچھ غم دنیا ہے۔ جس میں ذاتی غم کا احساس صاف نظر آتا ہے۔ کچھ اپنا غم ہے جو ان نظموں کے خاتمہ پر صرف "اپنا" نہیں رہ جاتا۔ ان نظموں کی کامیابی کی وجہ یہی ہے۔ شاعر کا یقین ہے کہ "انسان فرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اجتماع بھی ہے اور انسان کے ارتقاء کی انتہائی منزل اپنی ذات میں ضم ہونا نہیں ایک "اجتماعی انسان" ہو جانا ہے" "بنگال سے کوریا تک" اس مجموعے کی کامیاب ترین نظم ہے۔ جو قحط اور گزشتہ جنگ کی روداد ہوتے ہوئے بھی صرف روداد نہیں۔ نظم کا اسلوب کچھ ایسا ہے جیسے پردے پر دستاویزی فلم دکھائی جا رہی ہے۔ ایک ایک مصرعہ' ذہن کے پردے پر دھندلے دھندلے منظر کی طرح ابھرتا ہے۔ روشن ہوتا ہے۔ دھندلکے میں کھو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرا منظر اجاگر ہوتا ہے۔ نظم کا ایک کردار "میں" ہے۔ جس کے حافظ میں قحط بنگال اور جنگ کی ہولناک داستان کے باب ابھرتے ہیں اور اس دور کی مکمل تصویر نگاہوں میں گھوم جاتی ہے۔ نظم اس طرح ختم ہوتی ہے

جنگ نے کتنے کھلتے غنچوں کو
پھول بننے سے پہلے توڑ دیا
کتنی راتوں کی مانگ سنولا دی
کتنی صبحوں کا خوں نچوڑ دیا
کتنے کومل جوان جسموں کو
سوکھی شاخوں کی طرح توڑ دیا
صبح فردا کے کتنے خوابوں کو
ظلمتوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا

ارتقاء کے لپکتے قدموں کا
رخ کسی اور سمت موڑ دیا
کوئی سوچے عروس فطرت کیوں
شام سے تا بہ صبح روتی ہے
ایک سورج کی موت میں مضمر
کتنی کرنوں کی موت ہوتی ہے

یہ نظم شاعر کے اجتماعی شعور، حادثات کے ادراک، واقعات اور ان کے جزئیات کی مصوری، ایک داستان میں ان کی ترتیب، جذبات کی شدت، گہرائی اور گیرائی، الفاظ کے انتخاب اور ان کے دروبست کی کامیاب مثال ہے۔ ویسے مختصر نظموں سے زیادہ مکمل اور موثر اس مجموعے کی نسبتاً طویل تر نظمیں ہیں۔ "غم فردا" "۸ جنوری" "زندگی اور پتھر" اور "منظر و پس منظر" اس مجموعے کی نمائندہ نظمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔

گزشتہ دنوں شعر میں قنوطیت اور رجائیت کی بحث عام تھی۔ نظم کا ناگزیر انجام اگر رجائیت ہو تو اسے یقینی طور پر نظم کی کامیابی نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن "آگ میں پھول" کی بیشتر نظمیں محرومیوں کی ہلکی ہلکی آنچ اور امید کی طراوت سے لکھی سکتی نظر آتی ہیں۔

ابتدا "میں اور میرا فن" کے عنوان سے حمایت علی نے اپنی زندگی اور شاعری پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے جو ان نظموں، ان کی طبیعت کی افتاد اور مزاج کو سمجھنے میں بہت مفید ہوگا۔

(مطبوعہ۔ ہفت روزہ لیل و نہار (لاہور) ۲۷ جنوری ۵۷ء)

ماہر القادری

جناب حمایت علی شاعر پاکستان کے ادبی حلقوں میں کافی معروف ہوچکے ہیں اور مشاعروں میں ان کی کامیابی نے ایک حد تک پبلک سے بھی ان کا تعارف کرادیا ہے۔ "آگ میں پھول" ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے جو خاصے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔

"میں اور میرا فن" کتاب کا دیباچہ خود شاعر نے لکھا ہے جو مختصر سی آپ بیتی بھی ہے اور اپنے فن کا تعارف بھی۔ فرماتے ہیں "....اور میں نے کوشش کی ہے کہ خیال مجرد طور پر کہیں میرے شعر کا موضوع نہ بنے بلکہ اس کی محسوس تشکیل میں میری صلاحیتیں صرف ہوں"

یہ کیا بات ہوئی؟ وہ کون سا شاعر ہے جس کے خیال کی تشکیل میں اس کی صلاحیتیں صرف نہیں ہوتیں۔ پھر خیال کا مجرد طور پر شعر کا موضوع بننا یا بنانا۔ یہ بھی ایک "چیستاں" سے کم نہیں، غرض کہ بات کہنا بلاوجہ دور کی کوڑی لانے کی کوشش کرنا ایک کاواک قسم کے خیالات ظاہر کرنا آج کل آرٹ بنتا جارہا ہے۔ شعر ہو یا نثر لطف الجھاؤ میں نہیں سلجھاؤ میں ہے۔

حمایت علی شاعر کی شاعری قدامت اور جدت کا برزخ ہے، انہوں نے "قدامت" کی خوبیوں کو بھی اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے اور جدت و ترقی کا بھی اثر قبول کیا ہے۔ وہ یک رخے شاعر نہیں ہیں غزل اور نظم دونوں اصناف سخن پر

قدرت رکھتے ہیں مگر ان کی طبیعت کو زیادہ مناسبت "نظم" سے ہے ان کی شاعری میں "غم روزگار" کے ساتھ غم جاناں بھی پایا جاتا ہے لیکن "غم روزگار" کا پلہ بھاری ہے۔ حمایت علی شاعر جاگیرداری نظام اور مغربی سامراج کا دشمن ہے۔ اس نے اپنے کلام میں جگہ جگہ ان سنگین بتوں پر چوٹیں اور ضربیں لگائی ہیں۔

چند منتخب اشعار

لرزش لب میں گفتگو کی امنگ
کروٹیں لے رہی ہے میرے لئے

ایک درماندہ راہرو کے لئے
سنگ راہ سفر ہی کیا کم ہے

کوئی تسکین جاوداں نہ سہی
راحت مختصر ہی کیا کم ہے

آج اے دل لب و رخسار کی باتیں ہی سہی
وقت کٹ جائے گا کچھ پیار کی باتیں ہی سہی

چشم خنداں کی چمک دیکھ کے آتا ہے خیال
یہ تبسم نہیں، اشکوں کی نمی ہے شاید

عشق تو خیر ہے ایک جذبہ سوزاں کہ جسے
کسی سائے، کسی ٹھنڈک کی ضرورت ہی نہیں

یہ گرد آلود کچے راستے پر
شکستہ جھونپڑے گرتے ہوئے سہم
کسی بوڑھے کی آنکھوں کی طرح چپ
کسی بیوہ کے دامن کی طرح نم

تہ بہ تہ آئینوں میں قوس قزح
کتنی نزدیک اور کتنی دور!!

ساریاں جیسے سطح آب رواں
ساریاں جیسے کہکشاں لہرائے
ساریاں جیسے چاندنی لب جو
ساریاں جیسے گلستاں لہرائے

یہ بزم طرب اور یہ آداب عزاداری
نغموں کی کشاکش سے ہر ساز کا دل عاری
ساقی ہے تو ساقی کی نظروں میں وہ پرکاری
ہر رند تہی ساغر اور فیض کرم جاری

اس کو کیا کہئے کہ احساس زیاں کے باوجود
راستے میں رہروان و راہبر سب سوگئے
کارواں خطرے میں ہے کچھ دیر میں ہی جاگ لوں
کون اس کا پاسباں ہوگا اگر سب سو گئے

جہل زندہ ہے تو رسوا ہی رہے گی تہذیب
بھوک زندہ ہے تو بکتے ہی رہیں گے اجسام

جن کے ابرو کے اک اشارے پر
انقلابات رخ بدلتے ہیں
جن کے بت خانہ سیاست میں
تا خدا کیا خدا بھی ڈھلتے ہیں

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میر کارواں یارو، میر کارواں یارو
صرف زندہ رہنے کو زندگی نہیں کہتے
کچھ غم محبت ہو، کچھ غم جہاں یارو

چمن میں رہ کے مرا حال پوچھنے والو
قفس میں صرف اندھیرا ہے اور تنہائی

اسی جنت، اسی جہنم میں
غنچے چٹکے، کھلے گلاب ہوئے
اسی چھاؤں کی نرم خدت میں
ذرے تپ تپ کے آفتاب ہوئے

تیرگی دم بہ دم سمٹتی ہوئی
دم بدم پھیلتے شفق کے حدود

دوسرا رخ

میری ویران خلوتوں کا سکوں
اپنی غربت سے برسرِ پیکار
اس کی تنہائیوں کے سہمے خواب
کھلتی مرجھائی غنچگی کے دیار

یہ کس قسم کا سکون ہے جو "برسرِ پیکار" بھی ہے دوسرا شعر بھی اس طرح کا ایک "معمہ" ہے غنچے کھلتے اور مرجھا جاتے ہیں "غنچگی" کے ساتھ یہ نسبتیں مہمل نظر آتی ہیں۔

جس طرف بھی نگاہ کر لیتی
برق شرما کے منہ چھپا لیتی

"کرلیتی" کے ساتھ "چھپالیتی" قافیہ ردیف۔ نومشقوں ہی سے ایسی غلطی سرزد ہو سکتی تھی۔ ؎

میں خلاؤں میں جھولتا ہی رہا
روپیہ روپیہ کو کھینچ گیا

تصویر کے ساتھ تو "کھینچ گیا" بول سکتے ہیں (وہ جاتے جاتے تصویر میری کھینچ گیا) مگر یہاں "کھینچ کے لے گیا" کا محل تھا۔

مجھ کو ڈر ہے کہ میرا سوزِ دروں
میرے دل کو جلائے نہ کہیں

کس قدر کمزور اور بے مزہ شعر ہے

میں نے تیرے لئے دنیا سے بغاوت کر دی
اور بہرحال تیرے پیار کو اپنا ہی گیا

"پیار کو اپنانا" آخر یہ کیا بات ہوئی؟ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ تیری محبت کی خاطر میں نے سارے زمانے سے لڑائی مول لی ہے اس خیال کو موزوں الفاظ میں ادا کرنا چاہئے۔

کشتیو' طوفان سے گھبرا کر نہ لو ساحل کا رخ
لوٹتی موجوں سے پوچھو رحمت ساحل کی بات

"حسرت ساحل" کہنا تھا۔

اک لغزش قدم نے سجھائی تو کوئی راہ
اب غم نہیں جو راہ میں کانٹے ہوا کئے

"لغزش قدم" کسی نہ کسی راہ میں تو ہوئی تھی تو پھر "یہ سجھائی تو کوئی راہ" زائد ہے "ہوا کئے" زبان کے اعتبار سے غلط ہے "ہوا کریں" کہنا چاہئے تھا۔

کانپ جاتا ہوں جب کوئی انگشت
سوئی میں کوئی گل پروتی ہے

پھول "سوئی" میں نہیں دھاگے میں پرویا جاتا ہے پھر مصرعہ ثانی میں "سوئی" وجدان پر کس قدر گراں گزرتا ہے۔ بھول چوک کس سے نہیں ہوتی۔ کوئی شک نہیں کہ حمایت علی شاعر کے اس مجموعہ کلام کو لوگ شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے شاعر کے مستقبل سے زبان وادب اور سماج اچھی توقعات رکھتے ہیں۔

(مطبوعہ ماہنامہ "فاران" کراچی جولائی ۵۸ء)

سلہ نظم کا بند یوں ہے....

جب کبھی وہ قدم اٹھاتی تھی
کہکشاں راستہ بنا دیتی
جس طرف بھی نگاہ کر لیتی
برق شرما کے منہ چھپا لیتی

(ظاہر ہے کہ ماہر صاحب کا اعتراض غلط فہمی کی بنا پر ہے... مرتب)

ڈاکٹر مغنی تبسم

آگ میں پھول حمایت علی شاعر کا پہلا مجموعہ کلام اور ان کی نو دس سال کی فکر سخن کا نچوڑ ہے۔ حمایت علی شاعر کا نام ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے' ان کی نظمیں اور غزلیں آئے دن مختلف معیاری ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حمایت علی شاعر ان شاعروں میں سے ہیں جنکے لئے شاعری نہ تو ذریعہ معاش ہے اور نہ محض دل بہلائی اور وقت گزاری کا ذریعہ۔ انکی شاعری میں کسک اور خلش ہے جو زندگی کے درد سے پیدا ہوتی ہے۔

اس مجموعے میں مختلف رومانی اور مسائلی نظموں اور غزلوں' رباعیوں اور قطعات کے علاوہ ایک طویل نظم "بنگال سے کوریا تک" بھی شامل ہے جو غالباً" اس مجموعے کی سب سے اچھی نظم ہے۔ امن کے موضوع پر اردو میں بے شمار نظمیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے صرف چند ہی پڑھی جانے کے قابل ہیں اور ان میں سے ایک "بنگال سے کوریا تک" بھی ہے۔ یہ نظم ایک کہانی ہے جو آپ بیتی کے انداز میں بیان کی گئی ہے۔ بنگال اور کوریا اس میں تمثیلی علامتیں ہیں۔ اس نظم کے کئی حصے ہیں۔ ہر حصہ اپنی جگہ ایک مکمل نظم ہے۔ ہر نظم دوسری نظم سے ایسی پیوست ہے کہ تسلسل اور روانی میں کہیں فرق نہیں آیا ہے یہ نظم بہت زیادہ طویل بھی ہو سکتی تھی لیکن شاعر نے اختصار اور ایجاز سے کام لیکر اسے طوالانی ہونے سے بچالیا' اس کی

وجہ سے نظم کا مجموعی تاثر بہت بڑھ گیا ہے۔ اس نظم کا ہیرو جنگ میں شریک رہ کر اس کی تباہ کاریاں دیکھنے کے بعد گھر لوٹتا ہے۔ جنگ کے اثرات اس کے وطن تک پہنچ چکے ہیں "دوسری زندگی" کے دو بند ملاحظہ کیجئے۔

زندگی کے ہر ایک گوشے میں
ایک اک چیز کاروباری تھی
کھیت کے کھیت تھے گھروں میں دفن
اور بھوکی خدائی ساری تھی
جنگ تو ختم ہو چکی تھی مگر
جنگ ایک ایک گھر میں جاری تھی

ہر تجوری میں قبر کی مانند
موت کی جوئے فیض جاری تھی
دیر تا کعبہ کوئی دوکاں ہو
ہر طرف زر کی شہریاری تھی
تنگ آکر نہ جانے کتنی بار
دل نے سانسوں کا ساتھ چھوڑ دیا
لیکن اکثر مرے عزائم کو
ایک بچی نے ہنس کے توڑ دیا

جنگ کے معاشی اثرات کی تصویر مختصر نظموں میں کس خوبی سے کھینچ دی گئی ہے۔ آخری دو شعروں میں ایک طویل کہانی سموئی ہوئی ہے۔

شعلہ بے دود، آخر شب، ادھوری کہانی، شکست خواب، اجنبی مہمان اور غم فردا بھی اس مجموعے کی اچھی نظمیں ہیں ان نظموں کی موسیقیت، خیالات کی ترتیب اور توازن، لب و لہجے کی گھلاوٹ اور تاثر کی شدت ایسی خصوصیات ہیں جو ہماری توجہ کو مرکوز کر لیتی ہیں۔

حمایت علی شاعر ترقی پسند شاعر ہیں۔ ایک مخصوص فلسفہ حیات پر ایمان رکھتے ہیں جو "اشتراکیت" ہے۔ غم ذات ہو، غم حیات ہو، یا غم کائنات وہ ہر مسئلہ کو ایک خاص زاویہ سے دیکھتے ہیں جابجا جمالیاتی اور معاشی قدروں کے ربط کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "میں نے اپنی زندگی کو ہمیشہ مادی حدود میں دیکھا ہے اور انہیں مادی حدود میں اس کی تصویر کشی ہے میرا محبوب وہی ہے جو زندگی میں میرا محبوب ہے میری طرح گوشت و پوست کا انسان، ظاہر ہے کہ اس کے محسوسات انسانی محسوسات سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ اگر مجھے اس سے عشق ہے تو اس نے بھی مجھے چاہا ہے۔ اگر میں اسے اپنا نہ سکا تو میں نے گریباں چاک کرنے کے بجائے سماجی حالات میں اپنے عشق کی ناکامی کا جواز تلاش کیا ہے اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اگر میں نے اسے پالیا ہے تو سماجی زندگی میں اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔" اس اقتباس کو پیش کرنے سے میرا مقصد آپ کو اس مجموعے کی شاعری کے حدود اربعہ سے واقف کرانا تھا۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ کو اس مجموعے میں کوئی خالص عشقیہ یا رومانی یا منظری نظم نہ ملے تو تعجب نہیں ہونا چاہئے عشق اور حسن کے تعلق سے شاعر کا رویہ وہی ہے جو ساحر لدھیانوی کا ہے۔ شاعر نے بھی "حسن زر پرست" کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔

زندگی کے بارے میں کسی فلسفے کو اپنانا بری بات نہیں ہے لیکن جب کوئی فلسفہ حیات اپنی روشنی سے حیات و کائنات کے مختلف مظاہر کو ان کی اصلی صورت میں بے نقاب کرنے کے بجائے فن کار کی آنکھ پر رنگین عینک چڑھاتا ہے تو فن کا انجام ظاہر ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری کے نام پر ہمارے ادب میں کیسے کیسے "انمول جواہر" بھرے پڑے ہیں وہ سمجھ دار اور

متوازن دل و دماغ رکھنے والے قارئین کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ چنانچہ ساحر لدھیانوی کی طرح حمایت علی شاعر بھی کہیں کہیں کلبیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی چاند کو دیکھ کر اس وجہ سے کڑھنے لگے کہ وہ روٹی کے مشابہ ہے مگر اس کی بھوک نہیں مٹا سکتا تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟ آپ صرف اس سے ہمدردی کرسکتے ہیں۔ اس کا علاج تو کسی مطب ہی میں ممکن ہے شاعر کی نظم "مژدہ نو" میں اسی قسم کی جذباتیت جھلکتی ہے کسی سیاسی یا معاشی نظام کو ہدف ملامت بنانے کے لئے اپنی بچی کی موت کا سہارا لینے میں اور جاگیرداری نظام کو مطعون کرنے کی خاطر "تاج محل" کی تحقیر روا رکھنے میں ایک سی اذیتیں کار فرما نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی جذباتیت نے شاعر کے لہجے میں کہیں کہیں حقارت آمیز تلخی پیدا کردی ہے' بڑا شاعر بننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اس تلخی کو رنگینی سے بدلیں اور فن کی نشاطی اور جمالیاتی قدروں کا احترام کرنا سیکھیں۔

حمایت علی شاعر فطرتاً" نظم گو شاعر ہیں۔ غزل یا رباعی کی صنف سے ان کا مزاج نہیں ملتا۔ وہ اس طرف توجہ کریں تو اپنے لئے بہت جلد جگہ پیدا کرسکتے ہیں۔ اس موقع پر میں نظم نگاری کے تعلق سے چند باتیں عرض کروں گا آٹھ دس سال پہلے اردو شاعری میں موضوع اور ہیئت کے کچھ تجربے کئے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاعری میں اظہار خیال کے لئے نئی راہیں نکالی جارہی ہیں۔ لیکن عرصہ سے یہ جستجو قریب قریب مفقود ہوگئی ہے۔ آج کے نظم نگار شاعر مقررہ اصناف سے انحراف کرتے جھجکتے ہیں۔ کبھی چاہا تو بندوں میں اشعار کی ترتیب اور تعداد میں کچھ ردوبدل کرلیا اور بس۔ اردو شاعری میں نظم آزاد اور نظم معریٰ کے پروان چڑھنے کے امکانات بہت وسیع ہیں۔ اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اس سے قطع نظر نظم نگاری کے لوازم اور فنی اصولوں سے بالعموم شعراء بے نیازی برتتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ حمایت علی شاعر کی نظموں میں ایسی بے راہ روی زیادہ بار نہیں پاسکی ہے مگر بند بازی اور قافیہ پیمائی ان کی بعض نظموں میں بھی نظر آتی ہے' کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ذرا سی عدم توجہی سے اچھی خاصی نظم مکمل فن پارہ بننے سے رہ گئی ہے۔ "بنگال سے کوریا تک" کا خاتمہ موثر اور فطری نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ نظم کا اختتام قاری کے توقع کے مطابق ہی ہو' لیکن نظم اس طرح ختم ہونی چاہئے کہ پڑھنے والا محسوس کرے کہ اس نظم کا خاتمہ اس سے ہٹ کر ہو ہی نہیں سکتا۔

ان امور کے علاوہ زبان و بیان کی بعض ایسی خامیاں اس مجموعے میں نظر آتی ہیں جو ذرا سی توجہ سے دور ہو سکتی تھیں۔

حمایت علی شاعر کا اپنا اسلوب یا اسٹائل ابھی پوری طرح متعین نہیں ہوا ہے۔ ان کے لب و لہجے میں کیفی اور ساحر کے لہجہ کی آمیزش ہے۔ کہیں کہیں فیض کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ شاعر نے اس مجموعے کو چھپوانے میں جلدی کی۔ عام طور پر شاعر پہلا مجموعہ چھپوانے کے بعد مطمئن یا مایوس ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے حمایت علی شاعر اس روایت کو نہیں اپنائیں گے۔ ابھی اردو شاعری کو ان سے اچھی توقعات وابستہ ہیں۔

"آگ میں پھول" صوری اور معنوی ہر لحاظ سے اردو شاعری کے قارئین کے لئے ایک حسین تحفہ ہے۔

(مطبوعہ "صبا" ۱۹۵۷ء شمارہ نمبر ۶-۷ حیدر آباد دکن)

مٹی کا قرض

ڈاکٹر سید عبداللہ

بعض شاعر ایسے ہوتے ہیں جو سوال اٹھاتے ہیں۔ ان کا جواب نہیں دیتے۔ بعض ان کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں اور بعض سوال وجواب کے اس قصے سے آزاد دل کی بات بیان کرتے رہتے ہیں۔

حمایت علی شاعر ان سخن وروں میں ہیں جو سوالوں کا جواب دیتے ہیں اور فکری استدلال کا سہارا لے کر شعر کو فکر کا وسیلہ بناتے ہیں وہ سوال بھی اٹھاتے ہیں جواب بھی دیتے ہیں

مجھے ان کے مجموعہ کلام ”مٹی کا قرض“ کو پڑھ کر یہی محسوس ہوا ہے

شاعر کا مرکزی سوال روح اور بدن کی جنگ سے متعلق ہے۔ یہی جنگ آگے چل کر فطرت اور انسان کی کشمکش بن جاتی ہے۔ اس آویزش میں شاعر، انسان، بدن اور مٹی کا طرفدار ہے۔

بدن اور مٹی کا یہ اعلان جنگ، اپنے عہد کے شعور اور تاریخی حرکت ارتقائی کے حوالے سے ہے اور شاعر ہمیں باور کراتا ہے کہ بدن روح پر دھرتی آسمان پر اور انسان فطرت پر غلبہ پاکے رہے گا۔

شاعر نے ان افکار کے لئے سورج (خورشید) چاند (مہتاب) چاندنی دھوپ نور اجالا اور شمع کو علامت بنایا ہے اور ان کے مقابلے میں تاریکی، اندھیرا......اور شب کو اور اس تاریکی اور سکوت وخاموشی (سناٹا) کو بطور ضد استعمال کیا ہے۔

اس آویزش میں قدرتی طور پر اندیشے اور خوف اور وسوسے بھی ابھرتے ہیں اور وحشت کی فضا بھی ہے جو شاعر کے داخلی المیے میں ایک معنی پیدا کرتی ہے۔

شاعر نے مٹی کے قرض میں وطن اور خاک وطن کی پرستش کے واجبات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور اسے اپنی سرزمین کے بعض واقعات سے وابستہ کیا ہے۔

یہ ہے مجملاً ” content جو حمایت علی شاعر کے اس مجموعے میں مختلف عنوان کے تحت بیان ہوا ہے اور میں اسے شاعر کا فکری مینی فیسٹو کہنا چاہوں گا۔ اپنے موضوع کی نثری تشریح دیباچے میں خود شاعر نے پیش کردی ہے۔

اپنی وحدت کی تلاش مجھے اپنے آپ سے نبرد آزما رکھتی ہے

”تاریخ کا شعور شاعر کو عہد شناس بناتا ہے اور معاشرے میں اقدار کے جدلیاتی عمل سے آگاہ رکھتا ہے۔

”شاعری......اپنے عہد کی تنقید بھی ہے“

”میں جو صداقت کی تلاش میں اپنے کفن کا احرام باندھے کبھی اپنی ذات کا طواف کرتا ہوں اور کبھی اپنی دھرتی کا..........اور ادب کی بارگاہ میں آواز دیئے جاتا ہوں........کہ میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں......“

میں کہتا ہوں کہ اے شاعر تیری حاضری لکھ لی گئی.....!

لیکن ذات اور دھرتی کے حقائق کی ابھی مزید جستجو کر۔ ابھی ان کے معانی تک پہنچ...... تیری وحدت تجھے مل جائے گی ضرور مل جائے گی لیکن ذات کا قصہ کیا ہے؟ تیرا شعور ہے مگر حقیقی شعور کبھی دوئی اور ثنویت کا باعث نہیں ہوا، خودی کی وحدت حقیقی شعور ہی سے پیدا ہوتی ہے اور انا کی یہ آواز کوئی نئی نہیں، یہ آواز پہلے بھی اٹھی تھی، منصور حلاج کا شعور جب اس پل کے قریب پہنچا تو غیر منتہی کی سرزمین میں مسافر کو اتارتا ہے تو وہ یہ سمجھا کہ منتہی اب غیر منتہی ہو گئی۔ ہے حالانکہ یہ صرف ایک پل تھا۔ وحدت کی سرزمین ابھی دور تھی۔ لیکن جب بھی اس وحدت کو نقصان پہنچا وہ اس تصور سے پہنچا کہ میں

نے خود کو پیدا کیا۔ میں عقل رکھتا ہوں اس لئے میں خود ہی سیاہ و سپید کا مالک ہوں' ہر شے میری طاقت میں ہے۔ میں علیم ہوں' میں بصیر ہوں...... میں ہی ہوں میں ہی ہوں!

مادہ پرست مفکر نے عقل کی پرواز میں کچھ اوپر اڑ کر یہ گمان کرلیا کہ اوپر کچھ نہیں جو کچھ ہے مٹی میں ہے' انسان کے بدن میں ہے' اس نے بھی نعرہ لگادیا۔

سو یہ آواز نئی نہیں پرانی ہے مگر حقیقتِ کائنات پر (کہ انسان اس کا ایک حصہ ہے) غور کیا جائے (صرف عقل سے نہیں شعور برتر سے بھی) تو یہ معلوم ہوگا کہ کائنات میں دوئی کہیں موجود ہی نہیں' دوئی نظر آتی ہے مگر اصل میں دوئی کوئی شے نہیں کائنات کی حقیقت صرف یہ ہے کہ حقیقت مطلقہ کا خارجی روپ ہے...... اگر یہ ٹھیک ہے تو دوئی کی بات بے وزن' اور بدن و روح و نفس کی ثنویت ہوا ہوجاتی ہے۔

اب جبکہ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مادہ کوئی جامد شے نہیں اسکے باطن میں بھی کوئی شے حرکت کررہی ہے جسے ہم اپنی تسلی کے لئے قوت یا انرجی کہہ دیتے ہیں تو بدن اور روح (جوہر) کی غیریت کی بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔

وائٹ ہیڈ جیسا ریاضی دان اعداد کی ثنویت اور کثرت کے بارے میں متشکک ہوچلا ہے..... عدد صرف ایک ہے باقی اضافات ہیں۔ جب صورت حال یہ ہے تو دوئی اور جنگ کی باتیں عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے باطن میں اگر اس قسم کی کوئی لڑائی ہے تو پرانے طبیعاتی تصور کے تحت ہے ورنہ شب کیا' اور دن کیا' خورشید کیا اور قمر کیا۔ جوہری ذرات ہیں جن سے کائنات کی وحدت مرتب ہوتی ہے۔

اس لحاظ سے عہد من سے اور من فطرت سے الگ کوئی شے نہیں...... من کے آئینے میں عہد بھی ہے اور تاریخ بھی غیریت وہاں نظر آتی ہے جہاں کوئی شخص من اور عہد اور کائنات کو حقیقت مطلقہ سے جدا کرکے دیکھتا ہے۔

اور جب یوں دیکھنے کی عادت پختہ ہوجاتی ہے تو اسے ہر طرف بیگانگی ہی بیگانگی نظر آتی ہے ہر شئے دوسری ہر شئے کی دشمن..... ایک انسان دوسرے انسان کا بیری.... ذات کے اندر ہی نہیں ذات کے باہر بھی ایک شدید آویزش اسے محسوس ہوتی ہے۔

اور یہی دانش افرنگ کی سب سے بڑی محرومی ہے کہ اس کے سارے معجزات علم و ہنر' اندر کو مجتمع نہیں کرسکے!

شاعری کے ایک مجموعے پر اتنی سنگلاخ فکری گفتگو بعض کے لئے تعجب انگیز ہوگی مگر تعجب اس لئے نہ ہونا چاہئے کہ حمایت علی شاعر کا یہ شعری مجموعہ ہماری فکری شاعری کا نمائندہ ہے اس کے کلام میں فکری حقائق عمدہ شاعری بن کر نکلے ہیں......! افکار نے تخلیقی پیکروں کی صورت اختیار کی ہے اس لئے یہ شاعری بھی ہے اور فکر بھی....! اور شاعر دونوں کے تقاضے پورے کررہا ہے۔

مٹی کا قرض میں نظمیں بھی ہیں غزلیں بھی اور ثلاثیاں بھی

حمایت علی شاعر کی ثلاثیاں عام مثلثات سے یوں مختلف ہیں کہ ان میں رباعی کی طرح ایک مصرعہ برجستہ ایسا موجود ہے جس پر Stress دینے سے' ثلاثی کا مرکزی نکتہ سامنے آجاتا ہے لیکن فنی ذوقیات کے اعتبار سے ثلاثی سے ایسا نکتہ برآمد کرنا جو چونکا دینے والا ثابت ہو بمقابلہ رباعی مشکل ہوتا ہے۔

حمایت علی شاعر کی نظموں اور غزلوں کے درمیانی فاصلے کچھ زیادہ نہیں...... اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر مفکر اور نکتہ آفریں فنکار ہے...... آزاد نظم میں شاعر نکتے سے تصویر تک پہنچتا ہے جو شاعر آزاد نظم میں بھی تخیلی نقاشی اور فضا سازی کے بجائے نکتہ آفرینی کو مرکزی اہمیت دے گا' وہ نظم میں غزل کی سی فن کاری کرتا ہے۔ حمایت علی شاعر کی نظم "ہوا" اچھی خاصی غزل ہے' اور خود نظم "مٹی کا قرض" بھی اچھی خاصی غزل ہے۔ مگر اس مجموعے میں عمدہ نظموں کی بھی کمی نہیں' مثلاً "چاند' خورشید کا رازداں اور بگولا اچھی نظمیں ہیں۔

مٹی کا قرض میں عہد کے بعض واقعات کے جذباتی رد عمل بڑے توجہ خیز ہیں بابائے اردو اور حسن ناصر کی یاد میں جو

کچھ لکھا ہے اسے لہو میں پھول اگانے کے مترادف کہا جا سکتا ہے۔
حمایت علی شاعر کو میں جب پسند کرنے لگا تھا تو ان کی غزل کے طفیل غائبانہ ذہنی ملاقات کا واقعہ پیش آیا۔ میں میر تقی میر کے عقیدت مندوں میں سے ہوں اور مجھے حمایت علی شاعر کی یہ بات اچھی لگی تھی کہ وہ بھی میر پسند ہیں بلکہ بانداز میر لکھتا ہے موجودہ مجموعے میں بھی میر کے مزار پر جلائے ہوئے چراغ روشن نظر آتے ہیں۔
شاعر کی غزل میں وہ بات جسے نکتہ کہا جاتا ہے اکثر ملتا ہے۔ نکتہ کسی حقیقت کے بیان کو کہتے ہیں جس سے زندگی کے بارے میں کچھ عرفان ملتا ہو مگر کہنے کا انداز ایسا ہو جس میں ثقل نہ ہو' اور طرز بیان ایمائی ہو۔
اس معاملے میں میرا ایک شخصی معیار ہے... اور وہ یہ کہ نکتے والا شعر اگر پڑھتے ہی یاد ہو جائے تو میں اسے بلا خوف اچھا شعر کہہ دیتا ہوں میں نے چند ایسے اشعار کا انتخاب کیا ہے جو میری بیاض میں درج ہو گئے ہیں۔
میں ان اشعار کا احسان مانتا ہوں کہ ان سے میرے جذبے کو فیض ملا ہے۔
اب ایک ذاتی بات... حمایت علی شاعر میرے لئے ایک مانوس شخص تھا وہ مجھ سے ملا اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ جس کا نام "مٹی کا قرض" تھا عنوان سے مجھے غلط فہمی ہوئی میں اسے محض کومٹمنٹ کی کتاب سمجھا پھر میں نے اسے بادل نخواستہ پڑھا اور پڑھتا چلا گیا... مگر ہر ورق گردانی نے خیال گردانی کی۔ا... اس بے رنگ عنوان کے نیچے سے ایک اور کتاب نکل آئی جسے اگر کتاب فکر رنگین کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا اگر میں شاعر کی جگہ ہوتا تو کتاب کا نام شاعر کے چراغ رکھتا' مٹی کا قرض بڑا خشک عنوان ہے۔
ایک اسی طرح کی بات دیباچے کے بارے میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس رسم سے اب تک مانوس نہیں ہو سکا کہ شاعر اپنی شاعری کے فکری حصے پہ دیباچہ خود لکھے کیونکہ اس کے بعد نقاد کے پاس کچھ نہیں رہتا۔
تو مطلب یہ کہ میرا نصف دل دیباچے سے ناخوش رہا.... لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی دیباچے سے مجھے شاعر کی شخصی جذباتی کیفیت کا پتہ چلا..... اور اتنا تو میں روا رکھتا ہوں بلکہ اسے پسندیدہ سمجھتا ہوں کہ شاعر' اپنی جذباتی شخصیت کے کوائف سے قاری کو ضرور آگاہ کرے تاکہ اس کی شاعری کے سمجھنے میں مدد ملے۔

(مطبوعہ "اوراق" لاہور۔ اپریل۔ مئی' ۷۵ء)

احمد ندیم قاسمی

حمایت علی شاعر گزشتہ دس پندرہ برس کے دوران ادبی محفلوں اور ادبی رسالوں سے بہت حد تک غائب رہا' دوست اس شبہ کا اظہار کرتے تھے کہ حمایت کو جو کچھ کہنا تھا وہ "آگ میں پھول" لکھ کر کہہ چکا اور اب اس لئے کچھ نہیں کہہ رہا ہے کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ مگر میں نے ان دوستوں کی ہمیشہ بڑے اعتماد کے ساتھ تردید کی۔ میرا یقین ہے کہ جو لوگ محض موزوں طبع نہیں ہیں بلکہ سچ مچ کے شاعر ہیں۔ وہ ایک برس دو برس دس برس تک تو خاموش رہ سکتے ہیں مگر ہمیشہ خاموش نہیں رہ سکتے۔
شاعری کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے بطور پیشہ جو چاہے اختیار کر لے۔ شاعری تو شاعر کے وجود کا ایک حصہ ہوتی ہے اور جس طرح انسان سانس لینے کی شعوری کوشش نہیں کرتا بلکہ اس کی سانس خود بخود چلتی رہتی ہے۔ اسی طرح شاعر شعر نہ بھی کہہ رہا ہو تو اس کے اندر شاعری ہوتی رہتی ہے۔ پھر خبر اڑتی ہے کہ آخر کار شاعر نے مہر خاموشی توڑ ڈالی۔ حالانکہ اس کے شعور و وجدان پر کبھی کوئی مہر لگتی ہی نہیں۔ حمایت علی شاعر سچ مچ شاعر ہیں۔ شاعری اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کا ایک ناگزیر عنصر ہے۔ چنانچہ مجھے یقین تھا کہ بظاہر خاموش دکھائی دینے کے باوجود اس کے اندر شاعری کا عمل جاری ہوگا اور "مٹی کا قرض" اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ حمایت علی شاعر خاموش نہیں تھا۔ یوں سمجھئے کہ استغراق کے عالم میں تھا اور فکر و تامل

کی گہرائیوں سے وہ جو موتی سمیٹ کر لایا ہے وہ "مٹی کا قرض" کی صورت میں قارئین ادب کے سامنے ہے۔

اس مجموعے کے ابتدایئے میں جس کا عنوان اس نے "میزان" رکھ ہے۔ حمایت علی شاعر نے اعلان کیا ہے کہ میں "ادب کی بارگاہ میں آواز دینے جاتا ہوں کہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں" شاید یہ اعلان ضروری تھا۔ مگر جن لوگوں نے حمایت علی شاعر کو پڑھا اور سمجھا ہے ان کے لئے اس انکشاف کی ضرورت نہیں تھی کہ ان کی رائے کے مطابق حمایت علی شاعر ادب کی بارگاہ سے کبھی غیر حاضر نہیں رہا۔ جس طرح فیض کبھی غیر حاضر نہیں رہے، یا وہ سب اچھے شاعر کبھی غیر حاضر نہ رہے جو طویل وقفوں کے لئے غوطہ مار جاتے ہیں اور اہل ادب ان کی غیر حاضری لگا دیتے ہیں۔

"مٹی کا قرض" میں حمایت علی شاعر کی سہ مصرعی نظمیں بھی شامل ہیں، جنہیں اس نے رباعی کے انداز میں "ثلاثی" قرار دیا ہے۔ دوسری نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ حمایت نے یقیناً بہت عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ مگر کم سے کم "مٹی کا قرض" کے مطالعے سے میرا یہ تاثر بنا ہے کہ غزل میں وہ پورے نکھار اور گہرائی اور وسعت کے ساتھ اظہار فن کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر کوئی بھی صنف سخن منتخب کرے، زندگی اور انسان اور کائنات کے بارے میں اس کے جو بھی نظریات ہیں وہی ہر صنف میں اظہار پائیں گے۔ البتہ اظہار کے تیور مختلف ہو جائیں گے۔ مثلاً میں نے محسوس کیا ہے کہ حمایت نظم میں براہ راست اور دو ٹوک بات کرنے کا عادی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز اظہار یعنی بعض صورتوں میں ضروری بھی ہو جاتا ہے اور اس لئے موثر بھی رہتا ہے مثلاً اس کی مشہور نظم "لہو" مگر جب وہ یہی باتیں غزل میں کہنے بیٹھتا ہے تو اردو غزل کی پوری روایت، اس کے جمالیاتی معیار، اس کی روایت پسندی، اس کا ایجاز، سب اس کی بھرپور مدد کرتے ہیں اور وہ ایسی غزل تخلیق کرتا ہے جو غزل بھی ہے اور جدید بھی۔ ایک عجیب اتفاق ہے کہ حمایت مجھے اردو غزل کی سی قدیم صنف سخن میں بہت جدید نظر آیا تو اردو نظم کی سی جدید صنف سخن میں ذرا سا قدیم۔ یوں میں اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ حمایت جبلی اور فطری لحاظ سے غزل کا شاعر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی نظم کے لئے غزل کی ہیئت کا انتخاب کرتا ہے تو وہ نظام اس کی غزل کی طرح خاصے کی چیز بن جاتی ہے۔ "مٹی کا قرض" کی پہلی نظم "گفتنی و ناگفتنی" ہی کو دیکھئے، یہ ایک مکمل اور کامیاب نظم ہے، کیونکہ غزل کے پیرائے میں کہی گئی ہے۔ اس طرح اس کی ایک نظم "بادل" ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے مگر دراصل اپنی ہیئت کے علاوہ اپنے قافیہ کے لحاظ سے بھی ایک مسلسل غزل ہے۔ خوبصورت بھی، نرم و نازک بھی اور گمبھیر بھی۔ رہیں حمایت علی شاعر کی ثلاثیاں، تو مختصر ترین نظم کہنے کی یہ اچھی کوشش ہے۔ اور اس صنف سخن میں صرف کامیاب غزل گو ہی کامیاب رہ سکتے ہیں۔ غزل کا شاعر ایک مکمل بات دو مصرعوں میں کہتا ہے۔ حمایت نے ان دو میں ایک اور مصرعے کا اضافہ کرکے اسے ثلاثی بنا دیا ہے۔ میں جب بھی حمایت کی ثلاثیاں سنتا اور پڑھتا ہوں تو مجھے غزل گو شعراء کے دواوین کے آخر میں درج "فردیات" یاد آتے ہیں۔ یہ وہ شعر ہوتے ہیں جو غزل نہ بن سکے۔ مگر اس آزادانہ صورت میں بھی وہ قائم بالذات ہوتے ہیں۔ ثلاثیاں بھی ایک طرح سے یہی فردیات ہیں۔ حمایت علی شاعر نے اپج سے کام لے کر انہیں صنف سخن بنا لیا تو وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اظہار فن کے لئے ہمارے پاس جتنی زیادہ اصناف ہوں گی، اتنی ہی اظہار ہی وسعت پیدا ہو گی۔

حمایت علی شاعر "مٹی کا قرض" میں ایک تردد میں گرفتار ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ کسی مخمصے میں گرفتار نہیں ہوئے۔ اسے تردد یہ ہے کہ "میں پرچھائیوں میں سٹے ہوئے آدمی کے ملبے تلے دب کر رہ جاؤں گا یا اس شاعر کو بچا لاؤں گا، جو مر کر بھی زندہ رہنا چاہتا ہے" حمایت کو اس حقیقت کا بھرپور شعور حاصل ہے کہ شاعر کے لئے تاریخ شناسی، عہد شناسی، عصر شناسی اور اقدار کے جدلیاتی عمل سے آگاہی نہایت ضروری ہے۔ اس کے باوجود سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ اس تردد میں کیوں

مبتلا ہے کہ وہ دب جائے گا یا سرفراز رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے اپنے اس تردد سے خلاصی پانے کی سعی کرنی چاہئے۔ کیونکہ جب اس کا دعویٰ ہے کہ وہ وقت کی اکائی سے اپنے کسی عمل کو الگ نہیں کر سکتا تو یہ تردد بے جواز ہے کہ

ازل سے ایک عذاب قبول ورد میں میں ہوں

جب وہ خود کہتا ہے کہ شاعری اپنے عہد کی تنقید ہے کہ وہ محاسبہ بھی کرتی ہے اور محاکمہ بھی تو قبول ورد اس محاسبے اور محاکمے ہی کی تو پیداوار ہوتے ہیں۔ اگر صداقت کی تلاش میں وہ کبھی اپنی ذات کا طواف کرتا ہے اور کبھی اپنی دھرتی کا تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس کی ذات اس دھرتی کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے جب وہ ذات کا طواف کر رہا ہوتا ہے تو دھرتی اس کی ذات سے خارج نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح جب وہ دھرتی کا طواف کرتا ہے تو اس کی ذات طواف کے اس عمل میں کہیں الگ رکھی نہیں رہ جاتی۔ البتہ ذات کے طواف کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پہلو کی تصویر خود حمایت علی شاعر کے ایک شعر میں موجود ہے

کس درجہ ہولناک ہے شاعر شعور ذات
کتنی حسین پہلے ہی کائنات تھی

اور اس کے ایک اور شعر میں یہ شعور ذات یوں نئے پہلو سے سامنے آتا ہے

عجب ہے نشہ خود آگہی کہ دنیا میں
ہر اجنبی نظر آتا ہے' آشنا کی طرح

میرا دوست اس دوسرے شعر ذات کے حق میں ہے کہ دراصل اسی سے شعور کائنات کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہ دونوں مثالیں میں نے حمایت ہی کے کلام سے قصداً چنی ہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جب شعور ذات کے دونوں پہلو شاعر کے سامنے ہیں تو ان کے سلسلے میں اسے عذاب ردو قبول سے ایک بار ضرور گزرنا ہوگا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کا فیصلہ اس خود آگہی کے حق میں ہوگا۔ جس کے دم سے ایک اجنبی بھی آشنا دکھائی دیتا ہے۔

مجھے اس امر کا یقین اس لئے ہے کہ حمایت علی شاعر کو میری طرح اور کئی دوسرے پرانے نئے شعراء کی طرح مٹی سے بہت محبت ہے' وہ مٹی جو وطن ہے' زمین ہے' دھرتی ہے' ایک ثلاثی میں وہ کہتا ہے

گر زمیں ہو تو ہر ایک بیج سے امکان شجر

پھر ایک نظم میں اس نے کہا ہے

زمیں پہ پاؤں نہیں اور آسماں پہ دماغ
یہ ہجرتی بھی ہیں بس سایۂ خدا کی طرح

ایک اور جگہ کہا ہے

آسماں لاکھ سر پے ہوں سایہ فگن
زندگی' ماسوائے زمیں' کچھ نہیں

زمیں سے اتنی غیر مشروط، اتنی بھرپور محبت تو کسی تردد کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتی اور اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ حمایت علی شاعر کا فیصلہ اس شعور ذات کے حق میں ہوگا۔ جو ذات کو کائنات کا شعور بخشتا ہے۔ اور یہ "ہوگا" بھی کیا معنی۔ یہ تیقن تو حمایت کے کلام میں اب بھی موجود ہے۔ "آگ میں پھول" میں بھی تھا اور "مٹی کا قرض" میں بھی ہے۔

حمایت مسائل پر غور کرنے والا اور ان کی جڑوں اور پس منظروں اور پیش منظروں کا تاریخی اور سائنسی شعور رکھنے شاعر ہے۔ ثلاثی ہو، نظم ہو یا غزل ہو، اس کے اسی شعور کے جگمگاتے چراغ لفظ لفظ میں روشن ہیں۔ خاص طور سے اس کی غزل میں تو امکانات کی ایک دنیا آباد ہے اور پھر اس نے خود بھی تو کہا ہے۔ اور "مٹی کا قرض" پڑھنے والے مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس نے غلط نہیں کہا ہے کہ

شاعر، ادب کے محتسبوں کو خبر نہیں
کیا کام لے رہے ہیں تغزل کے فن سے ہم

(مطبوعہ۔ ماہنامہ "کتاب" لاہور۔ فروری ۱۹۷۵ء)

مٹی کا قرض اور خدا

امجد اسلام امجد

یہ ہزار رنگ کائنات جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہے، کیا ہے؟ وہ جو اس کے ہر رنگ میں موجود ہے کون ہے؟ یہ دو سوال ایسے ہیں جن کی کوکھ سے لاکھوں سوال پیدا ہوتے ہیں، سوچنے اور تخلیق کرنے والے ذہنوں کے لئے یہ سوال ان کے ہونے کی طرح ناگزیر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ادب و فن کی تاریخ میں یہ دو خاندان ازل سے حکمران چلے آرہے ہیں۔ ہر عہد نے اپنی بساط کے مطابق ان کے جوابات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیسوی صدی بھی اپنی تمام تر سائنسی علمی اور فنی ترقی کے باوجود ان دو سوالوں کے سامنے اس طرح عاجز نظر آتی ہے جس طرح اس سے پہلے کی صدیاں۔

مسلمانوں کے شعر و ادب میں بھی یہ سوال بڑی قوت اور کثرت سے اٹھے ہیں لیکن یہاں یہ دوسری امتوں کی طرح مکمل طور پر آزاد اور بے جہت نہیں ہیں۔ ہمارا مذہبی نظام ایک ایسے سماج کا تصور پیش کرتا ہے جس میں تمام سوالوں کے جواب ایک ہی حوالے سے دیئے جاتے ہیں اور وہ حوالہ ہے خدا کی ذات۔ خدا جو اس کائنات کا مبدا و منتہا ہے جس کے حکم کے بغیر پتے نہیں ہلتے جو ہر شے پر قادر ہے اور جس نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ایک چھپا ہوا خزانہ تھا اور اپنا اظہار چاہتا تھا۔ بقول غالب

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

یا ولی دکنی کے لفظوں میں

حسن تھا پردہ تجرید میں سب سوں آزاد
طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

ان بزرگوں سے پہلے فارسی میں بھی شعراء نے کم و بیش اسی طرز فکر کو بنیاد بنا کر ان سوالات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اسلامی صوفیانہ شاعری بھی اپنی تمام تر وسعت کے باوجود عبودیت کے گمبھیر اثر سے آزاد نہیں ہوپاتی۔ خدا کی ذات اور کائنات سے متعلق ایسے سوالات جو تشکیک اور بے یقینی سے پیدا ہوتے ہیں' ہماری کلاسیکی شاعری میں بہت کم ہیں۔ سائنس کی ترقی' مادے کی قوت کا احساس' مذہب سے آزاد' فلسفوں اور ترقی یافتہ معاشروں کی ذہنی غلامی نے مل ملا کر ہمارے ادب میں بھی اس رویے کو جنم دیا جسے بے علم مذہبی گروہ نے امریت اور نئے علم کے حامل ذہن نے آزادہ روی اور انسان پرستی کا نام دیا ہے اردگرد کی مشینی زندگی پر جب مذہب والوں کا تصور خدا لاگو نہیں ہوتا تو اکثر فن کار گھبرا کر اس کی موجودگی سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ کیونکہ خدا کے ہونے سے انکار اور کچھ نہیں تو انسان کو بہت سی وضاحتوں سے نجات ضرور دے دیتا ہے۔

اس پس منظر میں جب میں حمایت علی شاعر کی شاعری پڑھتا ہوں تو مجھے اس کے ہاں خدا سے متعلق انکار کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری میں خدا سے متعلق تحیر استعجاب' تشکیک' بیزاری' نفی اور حیرت کے تاثرات اتنے تواتر سے آئے ہیں کہ ایک طرح سے یہ اس کی فکر کا اہم ترین مسئلہ بن گیا ہے۔ میرے خیال میں صوفی شعراء کے علاوہ اردو شاعری میں یاس یگانہ چنگیزی کے علاوہ کسی شاعر نے اتنی شدت اور تواتر سے خدا کے بارے میں باتیں نہیں کہیں۔ البتہ ایک فرق ہے۔ یگانہ نے خدا کے ہونے اور پھر اس میں قادر مطلق ہونے پر شک و شبے کا جو اظہار کیا ہے اس کے پیچھے مذہب اور تصوف کا بنایا ہوا خدا اور خود اس کی حریفانہ حد تک بڑھی ہوئی انا پسندی ہے جب کہ حمایت زندگی کے اجتماعی عمل میں معاشرتی بے انصافیوں اور فرد پر عائد جبریت کی بنیاد پر اپنے افکار کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس فرق کی وضاحت کے لئے میں ہر دو حضرات کے تین تین اشعار بطور مثال پیش کرتا ہوں۔

یگانہ کہتا ہے۔

آواز باز گشت پہ دیتے ہو کیا صدا
کس سے الجھ رہے ہو سوال و جواب میں
پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے
کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے

حمایت کہتا ہے۔

ہمیں حرم میں نہاں تھے ہمیں صنم سے عیاں
ہماری ذات سے باہر ہمیں خدا نہ ملا
میں اپنی بازیافت کہوں یا خدا کہوں
جی چاہتا ہے جو بھی کہو برملا کہوں
ازل سے ایک عذاب قبول و رد میں ہوں
کبھی خدا تو کبھی نا خدا کی زد میں ہوں

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حمایت کے ہاں خدا کا تصور مجرد نہیں ہے وہ اسے انسان کے حوالے کے بغیر لکھنے اور سمجھنے سے قاصر ہے اور انسان کا یہی حوالہ ہے جو خدا کے تصور میں ایک ایسی تخلیقی قوت کی نشاندہی کرتا ہے جو اسے سماجی عمل کا ایک حصہ بنا دیتا ہے مذہب کا جامد تصور رکھنے والوں کے نزدیک اس کا یہ رویہ جسارت اور بے ادبی ہوگا کہ وہ خالق کو مخلوق کے برابر اور ان میں موجود دیکھتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس نے کلاسیکی اور صوفیانہ شاعری کے خدا کی نفی نہیں کی بلکہ انسانی جسم اور روح کے بعد کو روحانی فلسفوں اور کشف و کرامات کی دنیا سے نکال کر سہمی ہوئی اور مجبور مخلوق کے مادی مسائل میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی سوچ زمین کے نشیب سے جنم لیتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اسی نشیب میں پیدا ہوا ہے۔ اس کے وجود کی تمام تر تاریخ اسی زمین پر رقم ہے زمین کے ساتھ یہ محبت اور وابستگی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ آسمانی رشتوں کو بھی اس کی معرفت دیکھے۔ یہ احساس اس کتاب کے عنوان میں بھی جھلکتا ہے اور اس کی نظم "مٹی کا قرض" میں بھی۔ اس نظم کی چند لائنیں دیکھئے۔

ہم کہ مشت خاک ہیں خاک بطن خیر و شر
خاک کی افلاک ہیں! خاک ہی ام بشر
خاک کا آہنگ، صوت جلوہ شمس و قمر
خاک چپ ہوجائے، موت خاک کا حسن نظر
خاک کا امکاں، وجود ہم پہ جو کچھ فرض ہے
خاک ہی بود و ہنود خاک ہی کا قرض ہے

خاک اس کے نزدیک عالم رنگ و بو کا استعارہ ہے اور اس عالم سے درا دوسرے عالموں کا وجود اسے بے معنی محسوس ہوتا ہے، کیونکہ وہ ابھی زمین کی معنویت دریافت کرنے میں مصروف ہے ہر وہ چیز جو اس سطح پر نہیں اترتی اسے وہ اپنی دنیا میں جگہ دینے پر تیار نہیں ہے۔ وہ خدا کا انکار نہیں کرتا۔ خدا کے اس تصور کا انکار کرتا ہے جو صرف اپنی منواتا ہے بے کسوں کی بے بسی میں اضافہ کرتا ہے اور ظالموں کو ظلم کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہ ہمارے عہد کے انسان کا المیہ بھی ہے اور مجبوری بھی کہ اسے ماورائے انسان پر انسان کو ترجیح دینے کا فیصلہ کرنا پڑا ہے۔ لا انتہا کے خواب جن کے ذریعے وہ ان گنت صدیوں سے اپنے دکھوں کو تسکین دیتا تھا۔ اب اسے شانت نہیں کرتے۔ وہ اپنی ذات کی چھوٹی سی اکائی میں پناہ لیتا ہے۔ اس اکائی کا پھیلاؤ اسی کی جیسی دوسری اکائیوں تک ہے اور بس۔

نظر میں کوئی بھی جچتا نہیں ہے اپنے سوا
کہ آگہی کے نشے میں سرور اتنا ہے

حمایت، زندگی کے بارے میں مارکسی نقطہ نگاہ کا قائل نظر آتا ہے لیکن شعر ترنم سے پڑھتا ہے کہ غزل کا کلاسیکی انگ اسے بہت عزیز ہے۔ اس بظاہر بے ربط سی بات میں ایک بہت اہم نقطہ پوشیدہ ہے۔ اس وقت میں حمایت کے حوالے سے اس کی تھوڑی بہت وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ پچھلے پچاس برسوں میں جدید مادی فلسفوں سے متاثر ہوکر تعلیم یافتہ شاعروں کے بارے میں عام طور پر یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ ان کا دہریہ ہونا ناگزیر ہے کہ مارکسی نظام فکر میں مابعدالطبیعات کے لئے گنجائش نہیں رکھی گئی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف علاقوں کے کلچر، تاریخ، نسل، فطری میلانات، جغرافیہ اور رسوم و

رواج سوشلسٹ یا مارکسسٹ سوچ رکھنے سے ناپید نہیں ہوجاتے کہ انہوں نے صدیوں سے ہم کو علائق کی زنجیروں سے باندھ رکھا ہے۔ جس اجتماع کی فلاح کے لئے یہ نظام اختیار کیا جاتا ہے اسے سمجھے اور سمجھائے بغیر اس کی اپنی بقا ممکن نہیں ہے۔ مذہب اور خدا کے تصورات ایشیا اور افریقہ میں اتنے راسخ اور ہمہ گیر ہیں کہ ان کا رو فی الوقت کیا آئندہ کم از کم دو صدیوں تک ممکن ہی نہیں ہے۔ اور کون جانتا ہے اس وقت سے پہلے ہی یہ قوتیں پسپا ہونے کے بجائے کسی نئی شکل میں ظہور پاکر پھر سے رائج ہوجائیں۔

حمایت برصغیر کے مسلمان خاندان سے تعلق رکھتا ہے خدا کا تصور ہماری آپ کی طرح اس کی بھی ہڈیوں میں رچا بسا ہے چنانچہ وہ لاکھ کوشش کرے بڑبڑائے' بیزاری کا اظہار کرے۔ لا کے نعرے لگائے۔ وہ اس سے فرار حاصل کرنے میں ناکام ہے اور رہے گا۔ کیونکہ خدا صرف ماضی کا حصہ نہیں جسے آدمی فراموش کردے۔ یہ حال اور مستقبل میں بھی جاری و ساری ہے۔ مذہب والوں کے خدا سے علیحدہ ایک ناقابل فہم اور عظیم سچائی کی طرح۔ حمایت کا روئے سخن جب اس خدا کی طرف ہوتا ہے تو اس کے آہنگ میں اقرار کی نغمگی رہ رہ کر چھنک اٹھتی ہے۔

اے کاش ہم بھی سیکھتے آداب بندگی
دو چار دن نباہتے ہم بھی خدا کے ساتھ

دنیا مری دشمن سہی تو کیوں ہے گریزاں
مشکل میں تجھے میں نے پکارا تو نہیں تھا

آدمی ہوں کہ دیوتا ہوں میں !
جو بھی ہوں تیرا آئینہ ہوں میں

میں آئینے میں بھی ہوں آئینے کے باہر بھی
مرے وجود کی وحدت میں یہ دوئی کیا ہے

میں بھی انا پرست ہوں اقرار کیا کروں
میرے لبوں پہ آج بھی انکار ہی تو ہے

بیدار دل میں ہے کوئی بے نام خوف سا
سہمی ہوئی ہے روح سوال و جواب سے

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"
زیر فلک کہیں نہیں مامن' ترے سوا

کانوں میں آرہی ہے کسی صور کی صدا
دھڑکے ہوئے ہیں دل کسی روز حساب سے

تنہا ہے تو بھی میری طرح اے خدائے کل
اک رشتہ نہاں بھی ہے ہم میں عیاں کے ساتھ

اقرار اور انکار کی یہ کٹھن منزل آج کے حساس اور ذہین مشرقی انسان کا مقدر ہے کہ وہ اس کا سامنا کرنے پر مجبور ہے جہالت کے اندھیرے کے پار اس کی گزری ہوئی تہذیب کی روشن جھلک۔ اور جابر فاتح اور ظالم اقوام کی نام نہاد انسان دوستی کے دوراہے پر رکنا اس لئے ناگزیر ہے کہ اسے اپنے لئے ایک تیسرے راستے کا انتخاب کرنا ہے۔ فرد کی سطح پر بھی اور اجتماع کی سطح پر بھی۔ تیسری دنیا کے محکوم کی سیاسی جدوجہد کے پس منظر میں دیکھئے۔ تو آپ کو ان کی اور فاتح قوموں کی اجتماعی نفسیات میں ایک واضح فرق نظر آئے گا۔ اس فرق کو عرف عام میں مابعد الطبیعات پر ایمان کہا جاتا ہے۔ حمایت کی شاعری میں ہمیں یہی ایمان احساس اور شعور میں مبدل ہوتا نظر آتا ہے کہ وہ ارتقا پر یقین رکھتا ہے اور ارتقا وہ عمل ہے جس کی زد سے کچھ بھی باہر نہیں۔ خود خدا بھی نہیں۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون (اقبال)

میں نے حمایت علی شاعر کی شاعری کے صرف ایک پہلو کے حوالے سے بات کی ہے یقیناً "اس کے فن اور افکار پر اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور کہا جائے گا لیکن چونکہ حمایت نے اپنی شاعری میں اس مسئلے پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس کو بنیاد بنا کر گفتگو کی جائے۔ اس مختصر سے مضمون کو میں اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ حمایت علی شاعر نے خدا سے اس متعلق اپنے افکار میں بیسویں صدی کے نصف آخر میں محکوم اور خصوصاً مذہبی مشرقی اقوام کی ذہنی اور نفسیاتی کشاکش کو پیش کیا ہے۔ وہ ایک پڑھا لکھا ذہین اور حساس شخص ہونے کے ساتھ ساتھ باکمال شاعر بھی ہے چنانچہ اس کے یہاں یہ باتیں بلیغ، جامع اور خوبصورت انداز میں آئی ہیں اور اس کی یہ شاعری اس اجتماعی نفسیات کی تعبیر کا ایک اہم حصہ ہے جو محکوم اقوام کی سیاسی بیداری کی شکل میں ظہور پا رہی ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ "تحقیق" لاہور۔ ۱۹۷۵ء)

شہزاد احمد

حمایت علی شاعر کے بارے میں کچھ کہنا بیک وقت بے حد مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ آسان اس لئے کہ وہ بظاہر آج کل کے عمومی شعری تجربے سے کوئی الگ تھلگ شخصیت نہیں ہے۔ اور مشکل اس لئے کہ اس کے سوال آج کے عہد کے نہ صرف لاینحل سوال ہیں بلکہ ان کے جواب میں ہمارا سارا مستقبل بھی مضمر ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ حمایت علی شاعر بظاہر ایسے سوالات اٹھاتا ہے جو اردو شاعری ہی میں نہیں بلکہ دوسری زبانوں کی شاعری میں بھی کئی بار اٹھائے جا چکے ہیں۔ لیکن وہ ان سوالوں کو ہمارے Immediate کے ساتھ متعلق کر کے اٹھاتا ہے تو اس کی گرفت ہمارے شکوک و شبہات پر بے حد گہری ہو جاتی ہے۔

ایک سطح پر اس کا فکری ڈھانچہ ان عام مابعد الطبیعاتی سوالوں پر مشتمل ہے جو تھیلز سے لیکر اب تک شاید ہزاروں بار دہرائے جا چکے ہیں ان میں انسان اور انسان کا رشتہ، خدا اور انسان کا رشتہ، انسان اور اردگرد کا رشتہ، انسان اور اس کے ماضی حال اور مستقبل کا رشتہ، انسان اور اسکے لفظ و معانی کا رشتہ، غرض کتنے ہی رشتے ہیں جنہیں انسانی حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک لحاظ سے اس کے سارے سوال و جواب ذائقے کے حامل ہیں۔ مگر تشکیک کے سوا اس کے پاس ان کا کوئی حل موجود نہیں۔ جب وہ نظم شروع کرتا ہے تو اس کا پہلا حصہ اس طرح لکھتا ہے کہ گویا اس کے ذہن میں اشیاء کے اقداری ڈھانچے مستقل اور متعین انداز میں موجود ہیں۔ مگر اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس کی نظم ایک ایسے سوال پر جا کر ختم ہو جاتی ہے جس کا جواب تشکیک ہوتا ہے یا موجود کا مکمل رد، یہ رویہ روایتی ترقی پسندی کے نزدیک منفی رویہ ہے کیونکہ اس رویئے سے کسی سمت یا رخ کا تعین نہیں ہوتا اور نہ ہی قاری کو کسی رجائی احساس سے ہمکنار کیا جاتا ہے۔

اپنے اس بیان کی وضاحت کے لئے مجھے کسی خاص نظم کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے حمایت کی تقریباً تمام نظمیں اور غزلیں اسی تاثر کی حامل ہیں۔ سوائے ان نظموں کے جو حمایت نے حب الوطنی کے جذبے کے تحت لکھی ہیں جن میں اس کی نظم "لہو" بھی شامل ہے۔ حمایت کی پوری شاعری میں صرف حب الوطنی ہی ایسا جذبہ ہے جسے میں ترقی پسندی کی اصطلاح میں مثبت قدر کہہ سکتا ہوں۔ اگرچہ حمایت نے اسلام اور اسلامی روایت کو مثبت اقدار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ حوالہ بھی وطن ہی کی وساطت سے پیدا ہوتا ہے۔

"مٹی کا قرض" ایک ایسے کردار کی داستان ہے جو شخصیت اور اقدار دونوں سطحوں پر تشکیک اور واہمہ شکنی کا شکار ہے۔

اور واضح لفظوں میں ہر شئے کی نفی کرتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی شخصیت کی بھی نفی کر دیتا ہے۔ مگر جب ہم اس کی حب الوطنی کے جذبے والی نظمیں دیکھتے ہیں تو ایسی شخصیت ابھرتی ہے جو نہ صرف زندگی کی جدوجہد میں عمل اور توانائی کی قائل ہے بلکہ ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے بالکل تیار ہے۔ حمایت کے اس جذبہ حب الوطنی کو میں محض وقتی تاثر قرار نہیں دے سکتا۔ اس کی نظمیں یقیناً ان نظموں میں شامل نہیں ہے جو ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں میں ایک جذباتی ہیجان کی صورت میں لکھی گئی تھیں بلکہ مٹی سے محبت کا یہ جذبہ اس کے اندر بہت گہرا ہے چنانچہ چیزوں کے دیکھنے کے لئے اس نے دو مختلف رویئے اپنا رکھے ہیں۔ ایک تو حمایت علی شاعر کا انفرادی رویہ ہے جو جاگیرداری معاشرے کی توڑ پھوڑ سے اس قدر متاثر ہوا ہے کہ اس نے اکائی کا تصور کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب اس کے لئے ساری کائنات محض ایک آرزومندانہ فکر سے زیادہ کسی اہمیت کی حامل نہیں مگر دوسری طرف جب وہ اجتماعی فکر سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اسکے اندر کا چور جسے میں فرد کا نام دیتا ہوں تھوڑی دیر کے لئے بے بس ہو کر کہیں چھپ جاتا ہے اور اس کی شخصیت ایک اجتماع کے جذبے کی زبان بن جاتی ہے۔

یہ بظاہر ایک تضاد ہے مگر میں اسے تضاد کا نام نہیں دوں گا۔ ہمارے ایک دوست نے ایک امریکن خاتون سے شادی کی' ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔

یوں تو وہ لڑکا بظاہر یورپین لگتا ہے مگر اسکی ایک آنکھ امریکن ماں پر گئی ہے اور دوسری پاکستانی باپ پر۔ اس کی ایک آنکھ نیلی ہے اور دوسری سیاہ ہے۔ اگر یہی آنکھیں اس کے باطن میں بھی پیدا ہوئیں تو پھر کیا ہوگا؟ میرے پاس ہی نہیں ہم سب کے پاس اس کا جواب نہیں ہے کیونکہ ہمارے باطن میں یہی واقعہ پیش آگیا ہے وہاں کم از کم دو آنکھیں ضرور پیدا ہوگئی ہیں جس میں سے کم از کم ایک ضرور نیلی ہے سیاہ آنکھ کہیں ہے اور کہیں بالکل موجود نہیں' اگر موجود ہے تو ہم نے اسے کھولنے کی قسم کھا رکھی ہے مگر حمایت علی شاعر اس آنکھ کو بھی کبھی کبھی کھولتا ہے اور پھر بند کر لیتا ہے دنیا کو دیکھنے کے لئے اس کے ہاں زیادہ تر نیلی آنکھ سے کام لیا گیا ہے۔ یہ وہ آنکھ ہے جس نے اپنے لئے بہت سے کرب اور بہت سے مسائل خود بھی پیدا کئے ہیں۔

حمایت نے اپنی کتاب کا نام "مٹی کا قرض" رکھا ہے۔ اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش شدت سے موجود ہے کہ اس کی مٹی کا اس پر حق ہے مگر اسکے ساتھ ہی ساتھ اپنے مجرم اور گناہ گار ہونے کا بھی احساس ہے کہ وہ مٹی کا قرض ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ حمایت کی موجودہ کتاب اپنی ذات کا نوحہ بھی ہے اور شہر آشوب بھی۔ کیونکہ ذات آخر کار ایک اجتماع کا حصہ ہے اور اجتماع آخر کار کسی ذات ہی کے حوالے سے اپنا اظہار کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو محسوس کرواتا ہے۔

حمایت علی شاعر نے اپنے بارے میں سچ بولا ہے اس نے اپنے تمام مسائل پختہ اور ناپختہ' حل شدہ اور لاینحل قاری کے سامنے ڈال دیئے ہیں۔ اس نے یہ بھی کوشش نہیں کی کہ انہیں زیادہ بنا کر سنوار کر دیدنی اور شنیدنی بنایا جائے۔ مگر کہیں کہیں اس کا کلاسیکی لہجہ اس کے معانی کو سمجھنے میں الجھاؤ پیدا کرتا ہے۔ یہ الجھاؤ ہماری نسل کے لکھنے والوں کا مقدر ہے کیونکہ ان کے اور کلاسیکی شاعروں کے درمیان بے پناہ تفاوت کے باوجود لفظوں اور ترکیبوں کا ایک جہاں مشترک ہے جسے فوری طور پر تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہی لنڈے کا مال تو ہم جیسوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ نئے کپڑے بہت مہنگے ہیں اور اپنا ... بھی انہیں خریدنا مشکل ہے۔ اور اگر خرید بھی لیا جائے تو ان کے patric کچھ ایسے ہیں کہ انسان انہیں پہن کر ممکن ہے سوسائٹی میں زیادہ قابل قبول بن جائے مگر اپنے اندر ایسا جذبہ ضرور محسوس ہوتا ہے جو دیہاتی کو پہلی بار پتلون

پہننے پر محسوس ہوتا ہے۔
جناب صدر! میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے حمایت علی شاعر کے کسی شعر کا حوالہ نہیں دیا' روایتی طور پر مجھے ایسا کرنا چاہیئے تھا مگر ایک روایت یہ بھی ہے کہ قاری اپنے طور پر بھی کتاب پڑھتے ہیں میرا کام تو صرف ان چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا تھا میں نے پہلی بار کتاب کے مطالعے کے فوراً بعد جو باتیں محسوس کیں' بیان کردیں یہاں شاید یہ بتانا بھی ضرور ہو کہ میں ایک زمانے میں حمایت علی شاعر کا قاری ہوں' مگر جو چیزیں فرداً فرداً میں نے پڑھیں تھیں ان کا تاثر یہ نہیں بنتا تھا کہ جو اجتماعی طور پر کتاب کا تاثر ہے۔ ہمارے نیم جاگیرداری اور نیم سرمایہ داری معاشرے میں فرد ٹکڑوں سے بنتا ہے اس کی ذات کا اظہار بھی ٹکڑوں میں ہی ہوتا ہے۔ مگر جب ان ٹکڑوں کو مجتمع کردیا جائے تو جو شکل بنتی ہے وہ عام طور پر ریزہ خیالی سے بالکل الگ تھلگ ہوتی ہے اگر آپ وقتاً" فوقتاً" حمایت علی شاعر کا مطالعہ کرتے جارہے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ "مٹی کا قرض" آپ کے ذہن میں اس کا Image خاص حد تک تبدیل کردے بہرصورت کوشش شرط ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ کتاب' لاہور فروری ۷۵ء)

سید نجم الحسن رضوی

"مٹی کا قرض" ادا کرنے سے بہت پہلے جب پہلی بار حمایت علی شاعر نے "آگ میں پھول" کھلایا تو اس وقت وہ صرف ایک شاعر تھے۔ بعد میں خوب سے خوب تر کی تلاش انہیں ریڈیو سے فلم میں لے گئی اور ان کی روح میں پوشیدہ شاعر اپنی ذات کی پرچھائیوں میں بٹ گیا اس کیفیت کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

میں اپنی ذات کے صحرا میں کھو گیا تھا کہیں
صدائیں دیتا تھا دل' نالہ درا کی طرح

اگرچہ اس عرصہ میں انہیں ستم ہائے روزگار نے' شاعری کی جانب پوری طرح متوجہ نہ ہونے دیا لیکن حمایت نے اپنے احساس کے دیدہ بیدار کو عہد حاضر کی حقیقتوں سے بے نیاز ہونے کی اجازت نہ دی۔ "مٹی کا قرض" دراصل حمایت کی اسی تگ و دو کا اظہار ہے جو انہوں نے عرصہ گاہ وجود میں خود کو سمیٹنے کے لئے کی ہے۔
یہ مجموعہ کلام تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ثلاثی' نظم اور غزل۔ پہلے باب میں ۳۳ ثلاثیاں دوسرے باب میں ۳۴ نظمیں اور تیسرے باب میں ۴۸ غزلیں شامل ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر چیزیں حمایت یا تو مشاعروں میں سنا چکے ہیں یا وہ مختلف رسائل میں شائع ہوچکی ہیں اب مجموعے کی صورت میں ان کی اشاعت سے حمایت کے اس ذہنی اور روحانی سفر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو انہوں نے "آگ میں پھول" اور "مٹی کا قرض" کے درمیانی عرصے میں طے کیا ہے۔
حمایت علی شاعر ان چند خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جو اپنی خوش آہنگی اور خوش نوائی کے سبب سامعین میں ہمیشہ مقبول رہے ہیں لیکن حمایت کی شاعری محض اس لئے قابل توجہ نہیں کہ اسے عوامی مقبولیت کی سند حاصل ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اس دور کے ان شاعروں میں ہیں جن کی آواز میں عصر حاضر کی آواز بھی شامل ہے مگر یہ آواز کرخت نہیں اور نہ اس میں جذباتی نعروں کی گھن گرج ہے۔ حمایت کا لہجہ اپنی فکر انگیز متانت اور نرمی کی وجہ سے منفرد ہے۔ ان کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ نظم اور غزل دونوں میں اپنا دھیما آہنگ برقرار رکھتے ہیں۔ رومانویت حمایت کے یہاں بھی موجود ہے۔ خاص طور پر

ان کی نظمیں ان کہی' پرتو' بہروپ' خلا' بازگشت وغیرہ۔ جن میں آسمانی باتیں زیادہ ہیں لیکن زیادہ تر حمایت کا رشتہ احساس زمین ہی کے ساتھ رہتا ہے۔ اور جب وہ زمین کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا لہجہ بھراتا نہیں بلکہ اس وقت بھی ان کی وہ نغمگی برقرار رہتی ہے جو ان کی رومانی نظموں میں ہے اس طرح انہوں نے آسمان اور زمین کو ملانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

حمایت علی شاعر حیات و کائنات کے خوش کلام ترجمان ہیں۔ ان کی نظمیں سمندر اور انسان' آدمی' ہوا اور جواب' کائنات کی دائمی سچائیوں کا خوبصورت استعارہ ہیں۔ ایک حساس فن کار کی حیثیت سے جسے یہ احساس ہو کہ ۔

میرا شعور مجھ کو یہ آزار دے گیا
سورج کی طرح دیدہ بیدار دے گیا

حمایت جب بھی سماجی ناانصافیوں' استحصال اور تہذیبی انتشار پر نظر کرتے ہیں تو ان کے ہونٹوں سے نعرے نہیں بلکہ سوچ میں ڈوبی ہوئی ایک بات ادا ہوتی ہے ان کی نظمیں بگولا' اندیشہ' اور لحہ فکر اسی ضمن میں آتی ہیں۔ سماجی ناانصافیوں اور معاشرتی خرابیوں کے خلاف جنگ میں حمایت جو تلوار چلاتے ہیں وہ زہر میں بجھی ہونے کے بجائے مصری کی بنی ہوئی ہے ان کی شاعری میں معاشی ناہمواری کی جانب اس قسم کے سطحی آوازے' کہ ۔

روٹی کے لئے طاق پہ رکھ دوں گا کتابیں
جینا مجھے اس طرح گوارا تو نہیں تھا

بہت کم ملتے ہیں' حمایت بات کہنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں کہیں پر ہلکے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ترقی پسندوں کی قدیم دولت کے مطابق حمایت کے یہاں بھی سقراط' عیسیٰ' منصور' مریم وغیرہ بار ہا استعمال ہوا ہے گرچہ یہ وہ تلمیحات ہیں جو کثرت استعمال سے معنی کھو چکے ہیں مگر حمایت نے انہیں کہیں بے معنی نہیں ہونے دیا۔ منظومات میں حسن ناصر' شاہ بھٹائی' بابائے اردو' ماجد میر دوست' منظوم عقیدت نامے ہیں۔

ایک بات جو حمایت کو موجودہ دور کے شاعروں میں منفرد بناتی ہے یہ ہے کہ وہ ''مٹی کا قرض'' میں ایک مخلص وطن دوست شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ ان کی نظمیں لہو' وفاداری بہ شرط استواری' مٹی کا قرض' ارض وطن سے ان کی شدید محبت کا ثبوت پیش کرتی ہیں لیکن خاص بات یہ ہے کہ وطن کی محبت ان کی زخم ٹٹولنے والی آنکھ پر غفلت کی پٹی نہیں باندھتی' کیونکہ قومی المیوں پر ان کی نظمیں مارچ پاسٹ' پس دیوار حرف' اور لحہ فکر ذاتی کرب کے اظہار کی نہایت فنکارانہ صورتیں ہیں۔ دھرتی کا عکس اور خاک وطن کا ذکر حمایت کی تازہ شاعری میں بڑی شد و مد کے ساتھ آیا ہے۔

مٹی سے گہرے تعلق کا اظہار دراصل ان کے اس نظریئے کا اعلان ہے کہ سماجی شعور کے بغیر شاعری کا منصب ادھورا رہتا ہے۔ زمین سے ربط کو انہوں نے زندگی کے لئے ضروری قرار دیتے ہوئے اسے اپنی شاعری میں مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

اگر اڑوں بھی تو سایہ زمین پر ہی رہے
تو کیوں اڑوں میں ہوائے گریز پا کی طرح

آسماں لاکھ ہو سر پہ سایہ فگن
زندگی ماسوائے زمین کچھ نہیں

زندگی کا ہر شعار خاک سے ہے مستعار
ہم پہ جو کچھ فرض ہے خاک ہی قرض ہے

میں ہوں اپنی روح پر لادے ہوئے مٹی کا قرض
کوئی شاعر کہہ رہا ہے کوئی پیغمبر مجھے

کب ہوا کی کوئی تحریر نظر میں آئی
گر زمیں ہو تو ہر اک بیج میں امکان شجر
بے زمیں ہو تو ہر اک نقش نمو ہے کائی

یہ اوج اک بے فراز ہے آوارہ بادلو
کونپل نے سر اٹھا کے بڑے فخر سے کہا
پاؤں زمیں میں گاڑ کے سوئے فلک چلو

اپنی شاعری میں حمایت نے ہر مقام پر اپنے زمین سے تعلق کو خوبصورتی کے ساتھ نبھایا ہے اور ان کے اشعار میں باقاعدہ زمین کی دھمک سنائی دیتی ہے خاص طور پر ان کی ایک نظم "لمحہ فکر" کے اس بند میں کہ۔

اس معرض فنا میں ذرا کل کی سوچئے
جینے کی آرزو میں نہ مقتل کی سوچئے
موہل کا پیرہن تو نظر کا فریب تھا
رانو کی فکر کیجئے' موہل کی سوچئے
مالیر ماروی کا رہے گا سدا' مگر
صدیوں کے ارتباط میں' اس پل کی سوچئے

موہل' رانو' موہل' مالیر اور ماروی کے روپ میں یہ سوندھی زمین جس سے شاعر کا تعلق ہے دور سے مہکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

حمایت کی ثلاثیاں ان کے اس مصرعے کی تفسیر ہیں کہ

شرط سخن ہے' کہنے کے پیرائے بہت

تین مصرعوں کی ثلاثی حمایت کی اپنی اختراع ہے۔ یہ رباعی سے مختصر ہوتی ہے مگر خیال انگیزی میں اسی طرح پر اثر! شاید یہ کہنا ٹھیک نہ ہو کہ شعر سے ثلاثی تک حمایت کے تخیل کی پرواز اس خواہش کے تحت ہوئی کہ بقول غالب

کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے

کیونکہ ان ثلاثیوں کے انتخاب میں کم از کم ایک ثلاثی ایسی ہے جس کے مفہوم کو وہ اپنی غزل کے ایک شعر میں نظم کر چکے ہیں۔

خوش ہے سورج کہ کٹ گئی ہے رات
کاش یہ بھی اسے خبر ہوتی
سائے سائے میں بٹ گئی ہے رات
کٹتی ہے تو سایوں میں بکھر جاتی ہے ہر رات
شب کا کوئی گہرا ہی تعلق ہے سحر سے!

ثلاثی کی ایجاد شاید حمایت کے لئے یوں قابل توجہ ٹھہری کہ وہ کہہ سکیں

اپنا انداز جنوں سب سے جدا رکھتا ہوں میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ ثلاثی ایک نکتہ ادراک کو خوبی کے ساتھ ادا کرنے کے لئے نہایت خوبصورت صنف ثابت ہوئی ہے۔ اس مجموعے میں جو ثلاثیاں شامل ہیں انھیں الہام' اسلوب' اساس' زاویہ نگاہ' ارتقاء' انتباہ' ارتفاع' شرط' خوش فہمی' خوبصورت ثلاثیاں ہیں ان میں نکتہ بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ اس کے علاوہ ان میں سے بعض ثلاثیوں مثلاً" تضاد' مساوات' ذوق تعمیر وغیرہ میں بڑے خوبصورت طنز کی مثالیں موجود ہیں اسی طرح ہوس اقتدار پر ایک ثلاثی (کرسی) میں نہایت تیکھا طنز کیا گیا ہے۔

جنگل کا خونخوار درندہ کل تھا مرا ہمسایہ
اپنی جان بچانے' میں جنگل سے شہر میں آیا
شہر میں بھی ہے میرے خون کا پیاسا اک چوپایہ

حمایت کی غزلیں بوجھل نہیں ان میں وہی لوچ اور دھیما پن ہے جو کلاسیکل غزل کا مزاج ہے مگر حمایت نے غزل کے کلاسیکی لہجے کو عصر نو کے تفکر میں گوندھا ہے جس سے ان کے یہاں تازگی کا احساس ہوگا ہے۔

خاک اڑاتی گلیوں میں بچوں کا شور
میرے وطن کا مستقبل کا نوحہ ہے

وہ مشت خاک ہوا نے جسے بکھیر دیا
سمیٹنے کی تگ و دو ہے آدمی کیا ہے

گھر کی دیواروں نے ڈالی ہے بنائے قید و بند
اب تو زنداں بھی نظر آتا ہے اپنا گھر مجھے

محنت کی ناجائز بیٹی ہے دولت
قسمت کیا ہے اس تجربہ کا برقعہ ہے

ہے خود اپنی آگ سے ہر پیکر گل تاب ناک!
لے ہوا کی زد پہ مٹی کا دیا رکھتا ہوں میں

منزلیں ہیں زیر کف پا مگر
ایک ذرا عزم سفر چاہیے

کس لئے کیجئے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

جب تک زمیں پہ رینگتے سائے رہیں گے ہم
سورج کا بوجھ سر پہ اٹھائے رہیں گے ہم

ملتے ہیں روز دست صبا سے پیام گل
زنداں میں بھی قریب ہیں اہل چمن سے ہم

یہ الگ بات کہ خاموش ہیں اہل زنداں
ورنہ یہ حبس ہے دیوار میں در ہونے تک

آج اس کی گود میں ہے تو کل اس کی گود میں
دولت ہے چیز کیا، زن بازار ہی تو ہے

حمایت نے تغزل کے فن سے بھی "مٹی کا قرض" چکانے کا پورا کام لیا ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ کہیں بھی مقصد پر فن کو بھینٹ نہیں چڑھایا۔ حمایت کے ہاں جا بجا خوبصورت استعارے، تمثیلیں اور نادر شبیہیں (Imageries) ملتی ہیں۔ بعض نظموں مثلاً "آگ میں پھول" خوبصورت خیالی تصویروں سے پر ہے۔ اسی طرح ثلاثیاں اور غزلیں بھی تصویر بکف اشعار سے مزین نظر آتی ہیں۔

پیش نظر تا دور سلگتا ملبہ ہے
ہاتھ اٹھا کر دھواں دہائی دیتا ہے

دیکھے جو آبلے کسی رہرو کے پاؤں میں
نادم کھڑے ہوئے ہیں درخت اپنی چھاؤں میں

"مٹی کا قرض" حمایت علی شاعر کی، خاک پرستی کا خوبصورت اظہار ہے جسے شاعری کے اچھے مجموعوں میں اضافہ کہنا چاہیے۔ مجموعے کے شروع میں شاعر نے ان الفاظ میں اپنے چند خدشات کا اظہار کیا تھا کہ: میں نہیں جانتا کہ روح اور بدن کی اس جنگ میں میرا کیا حشر ہوگا۔ میں پرچھاؤں میں بٹے ہوئے آدمی کے ملبے تلے دب کر رہ جاؤں گا یا اس شاعر کو بچالاؤں گا جو مر کر بھی زندہ رہنا چاہتا ہے جو فنا میں بھی ثبات کے خواب دیکھتا ہے اور ظہور کے نت نئے پیرائے تلاش کرتا رہتا ہے۔" لیکن مجموعے کے اختتام پر یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اگر شاعر دیدہ بیدار کا تجسس اور زمین میں پاؤں گاڑ کے سوئے فلک، چلنے کا عزم رکھتا ہو اور بات کہنے کی پیرائے پر قادر ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس جنگ میں سرخرو نہ ہو سکے جو وہ اپنے آپ سے لڑتا رہا ہے۔

(مطبوعہ "پاکستانی ادب" کراچی، جنوری ۱۹۷۵ء)

ہارون کی آواز

مسعود قریشی

حمایت علی شاعر اردو ادب میں ایک جانی پہچانی آواز ہے۔ شعر میں بھی اور نثر میں بھی۔ شعر میں زیادہ' نثر میں مقابلتاً کم۔ اس تازہ مجموعہ میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی' نظمیں پابند بھی ہیں اور آزاد بھی۔ تیر کا" نئی مقبول صنف سخن ہائیکو بھی موجود ہے۔ کچھ ترجمے' کچھ طبع زاد نظمیں اور غزلیں آپس میں شیر و شکر ہیں۔ ان کی ترتیب کی طرف کوئی اشارہ نہیں کہ آیا یہ تاریخ وار درج کتاب ہیں یا کوئی اور ترتیب ہے۔

آغاز میں واحد متکلم کے عنوان سے مصنف نے اپنے فن' اپنی ذات کے بارے میں پیش لفظ لکھا ہے جس کو دیباچہ کہہ سکتے ہیں اور اس میں مبہم اشارے زیادہ ہیں اور واضح تفصیل کم۔

حمایت علی شاعر تاریخ کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ تاریخ انسانی کا بھی' تاریخ ملی کا بھی اور تاریخ وطن کا بھی۔ یہ شعور ان کی نظموں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ کتاب کا آغاز دو نعت نما نظموں سے ہوتا ہے۔ پہلی نعت میں حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات بیان کی گئی ہیں اور دوسری میں حضورؐ سے مخاطب ہو کر امت مسلمہ کی صفات یا حقیقت حال' یہ حقیقت تلخ ہے۔ اس میں سفاک سچائی سے کام لیا گیا ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ حمایت علی شاعر تاریخ کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ اس شعور کا بہت حصہ علم قرآن کا مرہون منت ہے۔ اس کتاب کا نام بھی اسی پس منظر میں رکھا گیا ہے۔ حمایت علی شاعر ہارون کو اظہار کا ایک استعارہ سمجھتا ہے۔ جس میں پیغام کی مقصدیت بھی ہے۔ اور اظہار کا حسن و جمال اور رنگینی بھی۔ نظم گوسالہ اسی پس منظر میں کہی گئی ہے۔ اس نظم میں موجود حقیقتوں کو موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے اشاروں میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

لوحِ کلیم ٹوٹ گئی ہے' پارہ پارہ ہے
ہارون شرمسار کہ موسیٰ سے کیا کہے
گوسالہ کو جب امت موسیٰ خدا کہے

گوسالہ اب بھی زندہ ہے دولت کے روپ میں
بدلے نہیں ہیں آج بھی آداب بندگی
اک سامری کا خواب ہے ہر خواب بندگی
یہ رات سایہ سایہ ہے سورج کی دھوپ میں

ایک اور نظم "ید بیضا" میں اسی استعارے کو سرمایہ کاری کے نظام کی نسبت سے یوں بیان کرتے ہیں

مری حقیقت کا اک کنایہ
مری ہتھیلی کہ جس میں روشن
وہ آگ بھی ہے وہ نور بھی ہے
جو دست موسیٰ ہے طور بھی ہے

حمایت علی شاعر کی شاعری میں یہ تاریخ کا شعور بادشاہوں اور جنگوں کی تاریخ نہیں بلکہ تہذیبوں اور ثقافتوں کی داستان ہے جس میں حرارت ہے، تسلسل ہے، ارتقا ہے۔ اس تسلسل کا اظہار ان کی نظم "پرانے سلسلے نئے رابطے" میں نمایاں ہوتا ہے۔ جس میں اپنے وطن کی تمام تہذیبوں کا خمیر ہے۔

یہ چہرہ جس کا ابھی کوئی نام ہے نہ نسب
یہ چہرہ میرا ہے، لیکن ہے یہ تمہارا بھی
وہ رابطہ کہ جو تاریخ میں ہے دفن کہیں
ہماری ہم نسبی کا ہے استعارہ بھی

یہی انداز ان کی دوسری نظموں میں نمایاں ہے۔ ایک نظم موہنجو ڈرو پر ہے جس میں پاکستان کی جدید و قدیم تہذیبوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔

میں آج اپنے کھنڈر میں ہوں اپنے گھر کی طرح
یہ میرے ساتھ رہا میرے بام و در کی طرح
یہ شہر مجھ سے ہے زندہ مرے ہنر کی طرح

حمایت علی کی نظموں کے سلسلے میں قابل ذکر ایک طویل نظم ہے جس کا عنوان ہے "حرف حرف روشنی" اکیس بند کی اس نظم میں نئی نسل سے کلام ہے۔ یہ نظم تلخ نوائی سے پر ہے۔ اس میں سفاک مسیحائی کی کوشش ہے۔ حق گوئی کا اظہار ہے۔ اس میں اس سرزمین کی تاریخ کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ تجزیہ درست ہی ہو یا کلیتا" درست ہو۔ اس میں ایک صوفی کی برداشت کی بجائے ایک انقلابی کا سا جوش و خروش ہے۔ جھنجلاہٹ ہے۔ مادی جدلیات کے تضاد کا انداز ہے۔ لیکن اس سے عوام سے پیار، دھرتی سے پیار اور آدرش کی خوشبو بھی آتی ہے۔ ماضی اور حال پہ کڑی تنقید ہے لیکن مستقبل سے حسین امیدوں کی وابستگی ہے۔ اگر ماضی کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ

کسی نگاہ میں تھی اس زمیں کی زرخیزی
حصول زر تھا کہیں حملہ آوری کا سبب

تو مستقبل کے حوالے سے نئی نسل کو یہ پیغام دیا گیا ہے

مرے لہو کے چراغو مرے جگر پارو
تمہیں زمین پہ رہنا ہے آسماں کی طرح
سمیٹنا ہے ہر اک غم کو اپنے دامن میں
کشادہ ظرفی قلب پیمبراں کی طرح
ملا ہے جو تمہیں میری زندگی کے عوض
عزیز رکھنا ہے اپنی متاع جاں کی طرح
اسی وطن کی عطاء ہے اسی وطن کا کرم
جنم دیا ہے تمہیں جس نے ایک ماں کی طرح

اس مجموعے کی غزلیں جدید غزل کا حسن اور سوچ لیے ہوئے ہیں ان میں بھی زندگی کی حقیقتوں کا اسی طرح اظہار ہوا ہے جس طرح نظموں میں۔ لیکن اشاروں اور استعاروں میں اور لطیف پرائیہ خیال میں جو غزل کی زبان ہے ان کی تراکیب میں غزل کا رچاؤ ہے۔ آفاقیت ہے۔ یہ لمحہ حاضر کی داستان ضرور ہیں لیکن ان کے انداز نے انہیں ازلی حقیقتوں کی کہانی بھی بنا دیا ہے

یہ معجزہ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
اب دست سامری میں عصائے کلیم ہے

یہ الگ بات کہ میں ہی نہیں یوسف ورنہ
بکنا چاہوں تو یہاں مصر کا بازار بھی ہے

(بی بی سی' اسلام آباد)
(مطبوعہ ''آہنگ'' ریڈیو پاکستان' مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۸۶ء)

شبنم رومانی

آدمی سے آدمی تک کے سفر میں بڑی قباحتیں ہیں۔ سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ آدمی خود اپنی راہ کا پتھر ہے اور پتھروں کے پیر نہیں ہوتے۔ آدمی بجائے خود ایک محشر خیال ہے اور محشر میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر شخص اپنی ہی آواز کی گونج کا شکار ہے اور یہ سب آوازیں ایک دوسرے کو توڑنے اور کاٹنے کے شوق فضول میں اپنی قوت بھی کھوتی جا رہی ہیں۔
مگر میرے دوست' میرے ہم عصر حمایت علی شاعر' شاعرانہ اسلوب کے ساتھ ساتھ ناقدانہ بصیرت بھی رکھتے ہیں' اسی لئے ان کو کسی مسئلے کی تہ تک پہنچنے اور آزادانہ رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور جب وہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر اسی پر ڈٹے رہتے ہیں پھر وہ مباحثوں مناظروں اور مقابلوں سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ان کا عمل قصیدہ شاہان کج کلاہ
اپنا عمل عمامہ و دستار کھینچنا

حمایت علی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں ان کی غزل کا مزاج بھی نظم سے ہی لگا کھاتا ہے یوں بھی جدید غزل اپنے مزاج اور موضوعات میں نظم سے قریب تر ہے۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ حمایت جذبہ و احساس سے زیادہ غور و فکر کے قائل ہیں' ان کی شاعری جذبات اور جمالیات سے عاری تو نہیں ہے مگر اس میں عقلی اور تجزیاتی عنصر زیادہ ہے۔ وہ اشیاء کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کی ماہیت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے اس تجزیاتی عمل میں مختلف کڑیوں کو ملا کر ایک مربوط اور مضبوط نتیجے تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں اور ان کے ہاں اپنے سیاق و سباق سے کٹی ہوئی کوئی بات نہیں ہے' ان کا حال ماضی سے مربوط اور مستقبل سے مشروط ہے جو رفتگاں اور آئندگاں کے درمیان ایک زندہ لمحے کی صورت میں موجود ہے۔ حمایت نے ماضی کو حال کا استعارہ اور حال کو مستقبل کا استعارہ بنایا ہے۔ وہ حکایت کو حقیقت سے جوڑنے کا ہنر جانتے ہیں۔

افسانہ یاد آگیا اصحاب کہف کا
تاریخ لکھنے بیٹھا تھا میں اپنے دور کی

ہم نے بہت کچھ اساطیر عجم سے حاصل کیا ہے' بہت کچھ ہندی دیومالاؤں سے لیا ہے ہمارے ہاں اپنی تاریخ اپنی روایات اپنی تہذیب اپنی ثقافت اور اپنی زبان کے حوالے نہ ہونے کے برابر ہیں' حمایت نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ بائبل سے استفادہ تو عالمگیر ہے لیکن قرآن اور قصص الانبیاء سے استفادہ کی جو شعوری کوشش انہوں نے کی ہے۔ اردو شاعری میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

مانا کہ سامری کی خدائی عظیم ہے
اب اپنے ہاتھ میں بھی عصائے کلیم ہے

اک طرف اڑتے ابابیل' اک طرف اصحاب فیل
اب کے اپنے کعبہ جاں کا مقدر دیکھنا

ہر موج نیل' سانپ سی بل کھا کے رہ گئی
اہرام کی نگاہ بھی پتھرا کے رہ گئی

کھینچی تھی جن کے خوف سے سد سکندری
سوئے نہیں ہیں آج وہ دیوار چاٹ کے

ہارون شرمسار کے موسیٰ سے کیا کہے
گوسالے کو جب امت موسیٰ خدا کہے

میں چاہ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے

حمایت علی شاعر درد مند دل رکھتے ہیں ان کے دکھ سکھ بہت واضح ہیں۔ زمین سے محبت اور بے زمینی کا دکھ' زندگی سے محبت اور زندگی کی ماہیت کا دکھ' انسان سے محبت اور اس کی بے بسی کا دکھ ارتقا سے محبت مگر ترقی معکوس کا دکھ' استحصال اور ناانصافی' جبر و استبداد کے خلاف' چاہے وہ دنیا میں کہیں بھی ہو' حمایت علی کا رد عمل تلخ ہے اور کہیں کہیں طنز تک پہنچ جاتا ہے مگر یہ رد عمل فطری ہے۔ ایک ترقی پسند ذہن کا رد عمل کم از کم اتنا تو ہونا ہی چاہئے دراصل حمایت علی انسان کو ایک اکائی تصور کرتے ہیں اور اس کے دو نیم ہو جانے سے ان کا دل بھی دو نیم ہے۔

آرائشیں جدا سہی بنیاد ایک ہے
کعبے سے مختلف نہیں پتھر کنشت کا

اضداد کی یہ جنگ اصول قدیم ہے
اور اب کہ آدمی کی اکائی دو نیم ہے

بس حمایت، ملوکیت اور ملکیت کے خلاف ہیں اسی لئے ان کی مخالفت سرمایہ داری اور جاگیرداری سے ہے۔ ملکیت کے تصور نے زمین کو اس کے بیٹوں پر تنگ کردیا ہے تو ملوکیت نے مستقبل کے سب نقوش دھندلا رکھے ہیں اور نئی نسل کو محرومی کے عذاب سے دوچار کردیا ہے اور یہ جو زیر زمین زلزلے دوڑتے پھرتے ہیں تو یہ بھی اس عذاب محرومی کے سبب ہیں۔

زمیں پر دھوپ کی چادر بچھائے لیٹے ہیں
مرے وطن، یہ تیرے خوش نصیب بیٹے ہیں
زیر زمین دوڑتے پھرتے ہیں زلزلے
ہم اس زمیں پہ پاؤں تو رکھیں مگر کہاں؟

حمایت علی شاعر کو انسان کی عظمت کا احساس بہت زیادہ ہے سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس کو خالق حقیقی نے اپنا شاہکار ٹھہرایا ہو وہ کیسا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے اندر تمام عالم سمائے ہوئے ہیں اب یہ اس کا کام ہے کہ علم کے ذریعہ غور و فکر کے ذریعہ اپنے آپ تک رسائی حاصل کرے کہ اپنی ذات کی حیرت انگیز صفات کو دریافت کرے اور ان صفات سے کام لیتے ہوئے تمام کائناتوں کو مسخر کرے۔ مگر اس کے لئے ایک ایسے معاشرے کی ضرورت ہے جس میں انسان کو پھلنے پھولنے کے اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے تمام مواقع حاصل ہوں گے جو ہر قسم کی چھوت چھات تنگ نظری اور تعصبات سے پاک ہو جس میں دو شہریوں اور دو پڑوسیوں کے لئے مختلف معیارات نہ ہوں۔ جس میں وسائل قدرت اور وسائل حیات سے استفادے کو محدود اور ممنوع نہ کیا گیا ہو۔

شام وصال میں نہ ہو دھڑکا فراق کا
صبح فراق بھی یہ امید وصال ہو

مگر ان تصورات کے اظہار کے لئے "موسیٰ کا عصا" اور "ہارون کی آواز" چاہئے۔ سو حمایت نے اپنے قلم کو موسیٰ کا عصا اور اپنی زبان کو ہارون کی آواز بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ شعر لکھتے ہیں مگر الفاظ سے زیادہ بین السطور پر زور دیتے ہیں۔ ان کا اصرار اخبار سے زیادہ نوشتہ دیوار پر ہے۔ ان کی فکر کا مثلث انسان، زمین اور خدا ہے اور اپنی شاعری میں وہ ان تینوں سے مختلف سطحوں اور مختلف پیرایوں میں مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔

سورج کے گرد گھوم رہا ہوں زمیں کے ساتھ
اس گردش مدام سے مجھ کو امان دے
میں سچ تو بولتا ہوں مگر اے خدائے حرف
تو جس میں سوچتا ہے مجھے وہ زبان دے

(مطبوعہ روزنامہ "جنگ" کراچی)

ایک مطالعہ........

میر مجاہد علی (ایم اے)

۱۹۵۶ء تا ۱۹۸۵ء حمایت علی شاعر کی ادبی زندگی کے لئے نہایت ہی اہم سال قرار دیئے جاسکتے ہیں ۱۹۵۶ء میں شاعر کا پہلا مجموعہ کلام "آگ میں پھول" شائع ہوا تھا۔ ۱۹۸۵ء تک ہارون کی آواز کے علاوہ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ حمایت علی شاعر کی مشہور زمانہ نظم "بنگال سے کوریا تک" کا انگریزی اور سندھی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور وہ شائع بھی ہو چکی ہیں۔

"ہارون کی آواز" حمایت علی شاعر کا نیا مجموعہ کلام ہے' جسے حال ہی میں المصنفین کراچی نے شائع کیا ہے شاعر کا یہ نیا مجموعہ کلام عرب کے جانباز سپوت یاسر عرفات کے نام سے منسوب ہے۔ یاسر عرفات نام ہے ہجرت کردہ اہل فلسطین کا جاری صدی میں عالم اسلام اور خاص کر برصغیر اور عرب ممالک میں جو حالات پیدا ہوئے اور جس طرح عالم اسلام اور اہل عرب نے اپنے فلسطینی بھائیوں کے قتل عام اور ان کی فلسطین سے ہجرت کو جس خاموشی اور بے اعتنائی سے دیکھا وہ تمام عالم اسلام کا اور اس صدی کا سب سے بڑا المیہ قرار دیا جاسکتا ہے' اہل فلسطین آج جس طرح سے تنہا اپنی زمین اپنے وجود کی جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ جنگ اسلامی تاریخ کی ایک اہم ترین جنگ ہے اس کے اثرات یقیناً عالم اسلام کو متاثر کریں گے' ہجرت نام ہے ناکامی' محرومی' احساس تنہائی اور وسائل کی تنگ دامانی کا' غلامی سے انکار اور آزاد فضا میں سانس لینے کا۔ ایک فرد جب اپنے وطن سے اپنے اقتصادی معاشی مسائل کی وجہ سے ہجرت کرتا ہے تو اسے اپنی زندگی کے میدان میں بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے تب کہیں جا کر وہ اپنے مقاصد زندگی کو حاصل کرپاتا ہے۔ لیکن اس کا رشتہ اپنی سرزمین اپنے وطن سے ضرور ہوتا ہے جو بظاہر ایک مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔ وہ فرد اپنی تہذیب اور اپنے کلچر سے الگ نہیں ہوپاتا' فرد واحد کی ہجرت میں یہ امیدیں بھی ہوتی ہیں کہ وہ دوبارہ جب چاہے اپنی مٹی کی طرف لوٹ آسکتا ہے لیکن جب ایک قوم خواہ وہ کسی مسائل سے دوچار ہو ہجرت کرتی ہے تو ایسی ہجرت سے ایک تہذیب اور ایک کلچر کی موت ہو جاتی ہے اپنی زمین سے رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد اس قوم کی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے اور اس پر آہستہ آہستہ مقامی رنگ کی چھاپ پڑنا شروع ہو جاتی ہے' حضرت یوسف کے زمانے میں حضرت یعقوب کی امت نے قحط سالی کے سبب ارض کنعان سے ہجرت کر کے مصر میں بود و باش اختیار کرلی تھی لیکن دریائے نیل کے زرخیز کناروں پر صدیوں سے آباد رہنے کے باوجود بے زمینی کے احساس میں مبتلا رہی۔ اس کا سبب جہاں نسلی اور تہذیبی فرق تھا وہیں معاشرے کی وہ مخصوص درجہ بندی' معاشی حق تلفی اور سیاسی ناانصافی بھی تھی جن کے باعث رفتہ رفتہ عبرانیوں کو قبطیوں کا غلام بن جانا پڑا۔

ہمارے گرد تو خیر ایک مدت سے تاریکی۔ جاریہ صدی میں ہندوستان پاکستان بنگلہ دیش میں جو سیاسی حالات پیدا ہوئے تھے جس کے نتیجے میں ملک کی تقسیم در تقسیم عمل میں آئی اور جس طرح تقسیم کے نام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی زمین اپنے وطن اپنی جائیداد' اپنا مال و متاع چھوڑ کر ہندو پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہجرت کرنا پڑی اور اس کی خاطر جن لوگوں نے آگ اور خون کے دریا کو عبور کیا وہ ہی ہجرت کے کرب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

حمایت علی شاعر بھی اسی سیاسی تجربے کا شکار ہوئے تھے' جب نفرت' قتل و خون کی آگ جو بجھی تو نہ تھی لیکن کچھ حد تک سرد ضرور ہوئی تھی تو حمایت علی شاعر نے اپنے عہد کے ان پس پردہ محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی جن کے سبب تاریخ کبھی

اپنے آپ کو دہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کبھی تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی اور کبھی اس عالم میں نظر آئی جیسے اپنی جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہو' تو انہیں محسوس ہوا۔

تم ہی نہیں قسمت کے ہیں پیٹے ہم بھی
برسوں سے ہیں دکھ درد سمیٹے ہم بھی
کیا تم سے کہیں اپنی تباہی کا سبب
نادان اب و جد کے ہیں بیٹے ہم بھی

اور جب نئی سرزمین پر انہوں نے اپنے انجام کو کھوجنے کی کوشش کی تو انہوں نے دیکھا۔

وشت غربت میں ہوں آوارہ مثال گردباد
کوئی منزل ہے نہ کوئی نقش پا رکھتا ہوں

شاعر اس سوچ سے گھبراتے ہیں وہ گھبراہٹ میں ان دیکھی گلی کوچوں میں چکر لگاتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہر شخص شرم سے نظریں جھکائے ہوئے ہے انکی زبانیں کند ہو گئی ہیں۔ جو افراد بولنا بھی چاہتے ہیں تو وہ اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے قابل نہیں ہیں اور ہر شخص خاموش ہے جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔

گنبد کی طرح دوش پہ رکھے ہوئے ہیں سر
جسموں کے مقبروں میں دریچے نہ جالیاں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی مشکل درپیش تھی وہ اپنی قوم کو ذلت غلامی اور احساس کمتری سے بچانا چاہتے تھے وہ انہیں ایک نئی راہ دکھانا چاہتے تھے لیکن ان کی زبان میں لکنت تھی اور ان کی زبان رواں نہ تھی۔ بائبل سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور قرآن حکیم سے بھی۔

"اے خدا میں فصیح نہیں ہوں' نہ پہلے ہی تھا اور نہ جب سے۔ تو نے اپنے بندے سے کلام کیا' جب رک رک کر بولتا ہوں اور میری زبان کند ہے۔" (خروج ۱۰۴)

اور انہوں نے دعا کی

"اے پروردگار میرا سینہ کھول دے' اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔" (طہٰ)

قرآن حکیم سے اس دعا کا بھی سراغ ملتا ہے جو انہوں نے اپنے بھائی ہارون کے لئے مانگی تھی۔

"میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے اس کو میرے ساتھ نبی (بنا کر۔ الشعراء) مددگار کی حیثیت سے بھیج" (القصص)

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی دعا قبول کی اور اس طرح سے ہارون عوام تک موسیٰ کا پیغام پہنچانے لگے اور یوں "ہارون" اظہار کی علامت قرار پائے۔

شاعر پیغمبر نہیں ہوتا ہے حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھے۔ اور شاعر تلمیذ الرحمان دنیا ہر شاعر کا امتحان لیتی ہے اس کے سامنے

بھی دو تسمت رکھے جاتے ہیں اور ایک زندہ ضمیر شاعر دولت کو ٹھکرا کر انگاروں کو اپنے سینے سے لگالیتا ہے۔

"ہاروں کی آواز" حمایت علی شاعر کے ایک زندہ ضمیر شاعر ہونے کا پورا پورا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

حمایت علی شاعر تاریخ سے ہو کر موجودہ نسل پرستی، حق تلفی اور مظلوم طبقوں کے حقوق کی پامالی کی جانب توجہ کرتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا عہد کسی طلسم کا اسیر ہے اور ایک عالم خود فراموشی طاری ہے تو وہ نسل پرستی کے خلاف حضرت عیسیٰ کے اجتہاد کو استعارے کے طور پر اپنا کر حضرت مریم سے سوال کرتے ہیں۔

مریم کہو کہ جائے یہ لخت جگر کہاں
اللہ کی زمین پہ ہے اس کا گھر کہاں

اور کبھی عالمی انسانی برادری کے خوبصورت تصور میں برادران یوسف کا کردار دیکھ کر چیخ پڑتے ہیں۔

میں چاہ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں میں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے

ہم اگر پچھلی صدی کی اسلامی تحریکوں کا تجزیہ کریں تو ہمیں صاف دکھائی دے گا کہ مکمل طور پر یہ تحریکیں برصغیر کے مسلمانوں کو متاثر نہ کرسکیں۔ کسی نہ کسی زاویئے سے یہ تمام تحریکیں ناکامیاب دکھائی دیتی ہیں۔

برصغیر کے مسلمان آج جس طرح سے خانوں خانوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان جو مذہبی اور سیاسی اختلافات نظر آتے ہیں وہ تمام مذہبی تحریکوں کی ناکامی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان سے جو ہندو ہندوستان آئے ان کے لئے ہندوستان نئی جگہ ہونے کے بعد بھی انہیں اجنبیت اور تنہائی کا احساس نہ ہوا، مذہب کی بنا پر وہ ایک ہی قوم تھے۔ اکھنڈ بھارت کا تصور ان کے پاس پہلے سے موجود تھا وہ ہندو قوم کا ایک جز بن گئے، طبقاتی کشمکش ضرور رہی لیکن وہ علاقہ واریت اور صوبہ واریت کا شکار نہ ہو پائے۔ مقامی لوگوں نے ان سے غلامانہ سلوک نہ کیا بلکہ ان کے لئے فراخ دل سے روزگار اور بود و باش کے وسائل فراہم کرکے انہیں قومی دھارے میں سمودیا، لیکن جو ہندوستانی مسلمان پاکستان گئے وہاں جاکر علاقہ واریت صوبہ واریت کے علاوہ طبقاتی کشمکش کا شکار ہوئے اور آج تک ہو رہے ہیں سندھی، پنجابی، بلوچی، مکرانی، مہاجر مسلمان آج تک ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ یہ حالت اس قوم کی ہے جس کا ایک رسول، ایک قران اور ایک خدا پر ایمان ہے اور جس کے رسول پاک نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا۔ پاکستان میں جاری مہاجر پٹھان فساد، اردو اور سندھی زبان پر جھگڑے، شیعہ سنی فساد، تبلیغی اور جماعت اسلامی میں بڑھتی ہوئی دوریاں اور ان میں جاری اقتدار اور مذہبی کشمکش، علاقہ واریت صوبہ واریت، ملکی اور غیر ملکی کا سوال وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مسائل کو حمایت علی شاعر بڑے دکھ سے دیکھتے ہیں اور اس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

حضور آپ کی امت کا ایک فرد ہوں میں
مگر خود اپنی نگاہوں میں آج گرد ہوں میں

میں کس زباں سے کروں ذکر اسوۂ حسنہ
فقط تلاوتِ الفاظ میرا سرمایہ

کہ اہل درک و بصیرت نہ اہل درد ہوں میں
پس حروف ہے کیا، کب مجھے نظر آیا

میں کس قلم سے لکھوں سرخیِ حکایتِ عشق
کمی تھی آج نے جو بات استعاروں میں

کہ رنگ دیکھ کے اپنے لہو کا زرد ہوں میں
میرا شعور کب اس کا سفیر بن پایا

حضور آپ نے چاہا تھا کیا، ہوا کیا ہے
کہا گیا جسے قرآں میں بندۂ مومن

مگر میں سوچ رہا ہوں، مری خطا کیا ہے
وہ میں تو کیا، مرا کوئی ہم وطن بھی نہیں

ہر امتی کو یہ فرد عمل ہے کیا کیجئے
حضور آپ ہی ہم سب کا فیصلہ کیجئے

۶ "حرف حرف روشنی" ہارون کی آواز، کی ایک طویل نظم ہے جو حمایت علی شاعر نے اپنے بچوں کی معرفت نئی نسل کے نام لکھی ہے۔ وہ نئی نسل کو ہماری تاریخ کے بھیانک رول سے آگاہ کرتے ہیں۔

مرے لہو کے چراغو، میرے جگر پارو
برائے نام خدا ہے برائے نام ہے دیں

دروغ و مکر کا انبار ہے، مری تاریخ
خدا و دیں کی گنہ گار ہے مری تاریخ

فقیہ و شاعر و فنکار، سب وظیفہ خوار
غلام فکر کا بیوپار ہے مری تاریخ

وہ ہمارے اسلاف کی تصویر انہیں دکھلاتے ہیں۔

زمیں کی چاہ میں، جاگیر کے تصور میں
بس اپنے شاہ کے غم خوار تھے بہت اسلاف

اسلام کے پاک و صاف معاشی نظام کے باوجود بھی دولت ہمیشہ سے امیر لوگوں کے پاس رہی وسائل پر بھی مکمل کنٹرول ایک خاص طبقے کا ہی رہا اور عوام غربت و افلاس کے بوجھ تلے دبے رہے، شاعر نئی نسل کو اس معاشی استحصال کی طرف توجہ دلاتے ہیں

عوام کے لئے ہر اک شجر ہے ممنوعہ
غریب ہو تو وہ قسمت کا بھی غریب، مگر

خواص کے لئے اللہ بڑا غنی بھی ہے
امیر ہو تو وہ تقدیر کا دھنی بھی ہے

وہ نئی نسل کو انسان کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں

زمیں کو اہل سیاست نے کردیا تقسیم
یہ شرق و غرب، سفید و سیاہ، پست و بلند

وگرنہ اہل زمیں میں ہے کوئی خاص نہ عام
ہر ایک فرق سے بالا ہے آدمی کا مقام

شاعر نئی نسل کو وطن کی عظمت اور اس کی مٹی سے اٹوٹ محبت کرنا سکھاتے ہیں

مرے لہو کے چراغو، میرے جگر پارو
جو اس زمیں کا ہے ماضی وہی تمہارا ہے

تم اب جہاں بھی ہو آباد اسی زمیں پہ رہو
وہی تمہاری ہے تاریخ تم کہیں پہ رہو

شجر کا رشتہ زمیں سے تو کٹ نہیں سکتا
تم اپنی خاک میں مل جاؤ گے، یہیں پہ رہو

(مطبوعہ روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز، حمایت علی شاعر نمبر ۲ جون ۸۵ء)

(بقیہ۔اشاریہ۔ آئینہ در آئینہ)

(آزر' دے' بہمن' اسفندار' فروری' اردی بہشت' خورداد' تیر' امرداد' شہریور' مہر' آبان) ۶۔ سسرالی= ولی عہد' نواب میر حمایت علی خان' اعظم جاہ بہادر کی بیگم شہزادی درشہوار۔ ترکی کے خلیفہ (غالباً) عبد الحمید کی صاحبزادی تھیں جن کی خلافت (خلافت عثمانیہ) کو اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا نے ختم کرکے جمہوریت کی بنیاد ڈالی تھی (نظام کے دوسرے صاحبزادے نواب معظم جاہ شجیع کی شریک حیات۔ شہزادی نیلوفر بھی ترکی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ معظم شاہ کے دربار کی کہانی صدق جائسی نے "دربار دربار" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں بہت سی پوشیدہ حقیقتوں پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ۷۔ عرب= سعودی عرب کے بدو قبیلے کے لوگ ریاست میں "چاؤش" کہلاتے تھے۔ انہیں ہتھیار رکھنے کی بھی اجازت تھی' وہ نظام کی "بے قاعدہ فوج" سے موسوم تھے۔ ۸۔ دارالسلام= مجاہد اعظم قاسم رضوی اور ان کے رضاکاروں کا ہیڈ کوارٹر ۹۔ معین= خواجہ معین الدین (ڈرامہ نگار) ۱۰۔ تحسین=تحسین سروری (شاعر و محقق) ۱۱۔ جلیس=ابراہیم جلیس ۱۲۔ نظر=نظر حیدر آبادی (شاعر) ۱۳۔ ظفر= مرزا ظفر الحسن (کراچی میں غالب لائبریری کے بانی۔ سہ ماہی "غالب" کے مدیر۔ فیض صاحب کے خاص دوست۔ ذکر یار چلے' دکن اداس ہے اور کئی کتابوں کے مصنف) ۱۴۔ وراثت = وراثت مرزا (دکن ریڈیو کے اناؤنسر اور نیوز ریڈر جو پاکستان میں بھی ریڈیو سے متعلق تھے ۱۵۔ ماجد=عبد الماجد۔ (ڈرامہ نگار' صداکار جس کی ناگہانی موت (۱۹۶۵ء) پر میں نے ایک نظم "ماجد۔میرا دوست" لکھی تھی' جو میرے مجموعہ کلام "مٹی کا قرض" میں شامل ہے۔ ۱۶۔ بدر رضواں= اناؤنسر' کومپیئر' کومنٹیٹر..... دکن ریڈیو میں بھی رہے اور ابھی تک ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ ہیں۔ ۱۷۔ امیر احمد خسرو=غزل کے خوبصورت حیدر آباد ہی میں قیام پذیر ہیں) ۱۸۔ پیام=روزنامہ جس کے پہلے ایڈیٹر قاضی عبد الغفار تھے' پھر اختر حسن ہوئے (ترقی پسند فکر کا ترجمان) اختر حسن پر میں نے ایک مختصر مضمون بھی لکھا تھا جو ہفتہ وار "پرواز" مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۔ وزراء= ہندوستانی کے حملے کے وقت ریاست میں مجلس اتحاد المسلمین کے وزراء بر سر اقتدار تھے ۲۰۔ شاہ کی رضا= کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کو حملے کی دعوت خود "بادشاہ سلامت" نے دی تھی۔ اسی لئے سرکاری فوج نے جنگ میں حصہ نہیں لیا ان دنوں ریاست کے کمانڈر انچیف جنرل العدروس تھے۔

(۱۲)

۱۔ ہزار سال= ہندوستان پر مسلمانوں کے حملوں کا آغاز چاہے کسی سبب سے ہوا ہو' مفتوح قوم کا بھی اپنا ایک نظریہ ہوتا ہے۔ فاتح جب کمزور پڑتا ہے تو مفتوح کے نظریئے سے ڈرنے لگتا ہے۔ ۲۔ پس ماندہ= نیچ ذات کے ہندو ۳۔ بھیل گونڈ وغیرہ۔ ہندوستان کی قدیم قومیں جو دراوڑ نسل سے ہیں ۴۔ بیگار= غریبوں سے کام لیا اور انہیں معاوضہ نہ دینا۔ یہ بھی حکمران طبقے کی ایک "ادائے خاص" تھی (کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری) کہتے ہیں کہ "عید بقرعید" پر "بخشش" بھی تو دی جاتی تھی۔ "وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا"

تاجر کا دیں ہے ایک' برہمن ہو یا کہ شیخ
لیکن یہ راز سب پہ کہاں منکشف ہوا

حرف حرف روشنی

ڈاکٹر سیفی پریمی (انڈیا)

"شاعر کو زندہ جاوید بنانے کے لئے "کلیات" اور "انتخاب کلام" دونوں چیزیں اہم ہیں۔ مگر دشواری یہ ہے کہ اب منشی نول کشور ہیں نہ ان کا عہد۔ وہ بڑے اہتمام اور آسانی سے کلیات چھاپ دیتے تھے۔ اگرچہ حکومت کی پوری گاڑی کاغذ پر ہی چل رہی ہے۔ مگر شعر و ادب کو کاغذ دستیاب نہیں، پھر کلیات کون چھاپے اور کیسے چھاپے؟ مجبوراً انتخاب کلام کی اشاعت پر اکتفا کی جاتی ہے۔

"مکتبہ جامعہ نئی دہلی" نے حمایت علی شاعر کے تین شعری مجموعوں "آگ میں پھول" "مٹی کا قرض" "ہارون کی آواز" کا مختصراً انتخاب بہ عجلت تمام اور نہایت شان دار طریقے سے شائع کیا ہے۔ اس کا نام "حرف حرف روشنی" ہے۔ اس میں ثلاثی، غزلیں اور نظمیں شامل ہیں

اردو شاعری میں "مثلث" پہلے سے موجود ہے۔ یہ اقسام مسمط میں داخل ہے مولوی محمد نجم الغنی رام پوری صاحب "بحر الفصاحت" نے مثلث کی یہ تعریف بیان کی ہے۔

"مثلث اسے کہتے ہیں کہ جس کے ہر بند میں تین تین مصرعے ہوں پہلے تین مصرعوں کا ایک قافیہ ہو۔ باقی بندوں میں دو مصرع قافیہ جداگانہ میں لکھ کر تیسرے مصرع میں قافیہ بند اول کی رعایت سے ہو"

قدیم عہد میں بھی نئے شعری تجربے ہیئت کے باب میں کئے گئے ہیں۔ چنانچہ مثلث میں عبدالمجید ازل لاہوری نے تیسرے مصرعے کا قافیہ بند اول کے قافیہ کے تابع نہیں رکھا۔ نظام رام پوری نے یہ جدت کی کہ مثلث کے پہلے بند کو چھوڑ کر باقی تمام بندوں میں دوسرے اور تیسرے مصرعوں کے قوافی کو بند اول کے قافیہ کا تابع رکھا مگر پہلے مصرع کا قافیہ علیحدہ نظم کردیا۔ نظام الدین میرٹھی اور مولانا اسماعیل میرٹھی نے مثلث میں ایک اور آزادی کا رویہ برتا۔ انہوں نے بند اول کے تیسرے مصرع کو مستقل حیثیت عطاء کردی۔ یعنی مثلث کے باقی تمام بندوں میں مسلسل اسی مصرع کی تکرار کو جاری رکھا "آگئی بات اب ثلاثی تک" ثلاثی عربی لفظ ہے۔ معنی (سہ حرفی کلمہ)

حمایت علی شاعر نے اس سلسلے میں ہیئت کا بالکل اچھوتا اور کامیاب تجربہ کیا ہے۔ انہوں نے مثلث کو بندوں کی قید سے آزاد کردیا۔ یعنی اصناف شعری میں "مطلق مثلث" کا اضافہ کیا۔ اس کا نام بھی بدل دیا۔ پہلے اس نئی صنف کا نام "تثلیث" رکھا تھا۔ مذہبی اصطلاح سے اشتباہ کے باعث اسے ترک کردیا۔ اور "ثلاثی" نام تجویز ہوا۔ ۱۹۶۰ء سے یہ شاعر ایک نئی صنف کی بقاء اور فروغ کا ضامن ہے۔

ثلاثی میں صورت التزام یہ ہے۔ پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہیں دوسرا مصرع علیحدہ ہے۔ یعنی قافیہ کی پابندی نہیں میرے نزدیک حسب ذیل ثلاثی نہایت وقیع ہیں

الہام، احساس، ارتفاع، جدلیات، نتائج خوش فہمی

مجھے دوران مطالعہ یہ بھی احساس ہوا کہ ثلاثی میں رباعی کی تمام تر معنویت جلوہ ریز ہے۔ صرف دو ثلاثی پیش کرتا ہوں

الہام

کوئی تازہ شعر، اے ربِ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر، محوِ انتظارِ جبرائیل

اساس

کب ہوا کی کوئی تحریر نظر میں آئی
گر زمیں ہو، تو ہر ایک بیج میں امکان شجر
بے زمیں ہو، تو ہر اک نقش نمو ہے، کائی

یہ ثلاثی ذو معنی ہے۔ ایک سامنے کا مضمون یعنی تمام پیداواری رشتہ زمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ دوسرے "نفی کی نفی" کا فلسفہ۔ شاعر نے دوسرے مصرعے میں امکان شجر، استعمال کیا ہے۔ اس کی Implication ثمر ہے۔ اشجار بے ثمر پر فکر کرنا مہمل بات ہے۔ یا سرکاری پروجیکٹ کا پروپیگنڈہ۔ اصل میں پوری بات کو حمایت علی شاعر نے "بیج، شجر اور ثمر" کی وساطت سے سمجھایا ہے

یا یوں سمجھئے

دانہ، پودا، دانے کی بالیاں۔ یعنی
دانہ کی نفی پودا، پودے کی نفی دانے کی بالیاں
یہی عمل تسلسل کائنات کے وجود کا ضامن ہے۔

"حرف حرف روشنی" کی غزلوں میں رومان بھی ہے۔ سیاست بھی، تخیل، جذبہ، فکر تصور کی جلوہ سامانی ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے

یہ شہر سجدہ گزاراں، دیار کم نظراں
یتیم خانہ ادراک کے سوا کیا ہے
تمام عمر کا حاصل، بہ فضل ربِ کریم
متاع دیدہ نم ناک کے سوا کیا ہے
تجھ سے وفا نہ کی تو کسی سے وفا نہ کی
کس طرح انتقام لیا اپنے آپ سے
آہٹ پہ جانے کیوں دل دھڑکے ہے
کوئی نہیں اطراف میں لیکن جاگتے رہنا
شاعر اپنے گھر کا خدا ہی حافظ ہے
اس گھر کو ہیں گھیرے ہوئے ہمسائے بہت

غزلوں میں گل پیرہنی کے باوجود، میں زیادہ متاثر نہیں۔ شاید اس لئے بھی کہ میں ارغوانی راہ آورد کا زیادہ متوقع تھا۔

اپنے شاعر دوست سے میری گزارش ہے کہ وہ اس صنف سخن میں گل رنگ، گل نشاط اور گل شگفتہ پر زیادہ توجہ دیں۔

نظموں میں آئینہ در آئینہ، جواب، ایک منظر، پس دیوار حرف، مادر وطن کا نوحہ کاش، ان کہی، چل خسرو اپنے گھر، قاری اور ناقد سے خراج تحسین وصول کر سکتی ہیں "کاش" اس باب میں عدیم النظیر ہے۔ "پس دیوار حرف" میں آخری تین شعر

پیش ہیں

اب کہ دامانِ یوسف کے ہر چاک سے
آئینہ ہوگیا ہر فریبِ کہن
غربت تیشہ کی زد پہ ہے بے ستوں
روبرو آگئے خسرو و کوہ کن
بوذری اپنی منزل ہے یا زرگری
فیصلہ چاہتی ہے زمینِ وطن

"چل خسرو اپنے گھر" کا آخری بند

کب تک اس قبر کی وادی میں پھرے گا پاگل
یوں کبھی بھی مل سکی ہے، غمِ دوراں سے نجات
چل کہ جن چہروں سے بڑھ جاتی ہے تیری وحشت
وہی چہرے ہیں مرے دل، ترا عنوانِ حیات
اور تجھے جینا ہے کہ اے کشتۂ دوراں کل بھی!

اس شعری مجموعے کی ایک طویل معرکہ آرا نظم "حرف حرف روشنی" ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر کتاب کا نام یہی تجویز ہوا ہے۔ شاعر نے اپنے بچوں کی معرفت نئی نسل کو پیغام پہنچایا ہے۔ اس میں ۱۲ باب ہیں۔ ہر باب اس مصرع سے شروع ہوتا ہے (مرے لہو کے چراغو۔ مرے جگر پارو)

دراصل یہ نظم ایک تاریخی دستاویز ہے۔ جس میں رمز وحدت اقوام، نظام جاگیرداری، دین اور خدا، اوہام و عقائد، تہذیبوں کی آمیزش، حسب و نسب، قومی یکجہتی، وطن دوستی، اسرار حیات و کائنات، عذاب ہجرت اور انسان کی سربلندی پر معروضی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ یہ نظم اس قابل ہے کہ اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے کرائے جائیں۔

آرٹ کو سماج کی لفظی نقش گری کہا جاتا ہے اور حمایت علی شاعر نے یہ کام بوجوہ احسن انجام دیا ہے۔

فن پر کافی گفتگو ہو چکی۔ اب فنکار کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ یہ نکتہ ذہن میں محفوظ رہنا چاہئے کہ تخلیقی سرگرمیوں میں "خود آگہی" کا غالب حصہ ہے۔ حمایت علی شاعر میں خود آگہی کا جوہر ہے۔ خود آگہی سے مراد اپنی صلاحیتوں کی پہچان، خود اعتمادی کتابی علم و معلومات نہیں۔ یہ وہ جوہر ہے جو سماجی شعور میں نکھر کر دست یاب ہوتا ہے اور "سماجی شعور" سماجی بالیدگی یا ارتقاء کی پیداوار ہے۔ سماج سے خارج میں اس کا وجود کہیں نہیں۔ مارکسی نقطہ نظر میں آرٹ کو سماج کی ایک مخصوص فارم میں بتلایا گیا ہے۔ یہ فنکار سماجی شعور کا نقیب ہے اور "حرف حرف روشنی" معروضی حقیقت پسندی کے جلوؤں کا دوسرا نام۔

(مطبوعہ "کتاب نما" دہلی اپریل ۸۷)

مخمور سعیدی

حمایت علی شاعر اردو کے جانے مانے شاعر ہیں۔ ان کا آبائی وطن حیدر آباد دکن ہے لیکن تقسیم ملک کے بعد وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور حیدر آباد سندھ کو اپنا مستقر بنایا۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر نکھار وطن ثانی ہی میں آیا لیکن یہ صلاحیتیں جس زمین کی ودیعت تھیں اس کی یادیں ان کے ذہن و فکر کا حصہ بنی رہیں۔ ہجرت کا تجربہ ایسے کئی شاعروں کا موضوع سخن رہا ہے جو تقسیم کے نتیجے میں ادھر سے ادھر ہوئے لیکن حمایت علی شاعر کے ہاں اس کی حیثیت مرکزی ہے۔ ان کی طویل نظم حرف حرف روشنی' جس کے عنوان پر اس کتاب کا نام ہے' اسی تجربے کی مختلف جہات کو پیش کرتی ہے۔ اس نظم کے وسیلے سے انہوں نے اپنے تجربے کی سماجی اور تاریخی معنویت نئی نسل تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ نظم کا انداز بیانیہ ہے اور اس میں شاعر ایک ناصح نظر آتا ہے جس کی خواہش ہے کہ اس کے بعد آنے والے بالخصوص اس کی اولاد اس کے خیالات کو اپنی عملی زندگی میں رہنما بنائے لیکن نظم میں چونکہ شاعر کا فکری خلوص شامل ہے اس لئے یہ کوری نصیحت نہ رہ کر ایک تخلیقی فن پارہ بن گئی ہے اور اثر انگیز ہے۔

حمایت علی شاعر غزلیں بھی کہتے ہیں اور ان میں بھی احساس کی وہ تازگی اور اظہار کی پختگی موجود ہے جو ان کی شاعری کی شناخت ہے لیکن نظموں میں ان کے فکر و احساس کی ترسیل زیادہ موثر انداز میں ہوئی ہے۔ وہ زخم خوردہ فکر و احساس کے مالک ہیں اور زوال عمر کے مظاہر نے ان زخموں کی ٹیس اور گہری کردی ہے۔ یہ ٹیس جب لفظوں میں ڈھلتی ہے تو "آئینہ در آئینہ" جیسی نظم وجود میں آتی ہے یا غزلوں کے ایسے اشعار ان کے قلم سے نکلتے ہیں۔

تمام عمر کا حاصل' بہ فضل رب کریم
متاع دیدہ نمناک کے سوا کیا ہے

اچھا کیا کہ تو نے مرا گھر ہی ڈھا دیا
یوں بھی یہ اک فریب ہی تھا سنگ وخشت کا

محسوس کر رہا ہوں میں کرب شکستگی
تم بھی شگفت گل کی صدا غور سے سنو

دستک ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو
طوفاں کی آرہی ہے صدا غور سے سنو

اس ابر کو بھی اڑا لے گئی یہ تیز ہوا
جو میرے سر پہ رہا دست مہرباں کی طرح

حمایت علی شاعر نے ایک نئی صنف سخن بھی اردو شاعری کو دی ہے اور اس کا نام انہوں نے "ثلاثی" رکھا ہے۔ یہ تین ہم وزن مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور پہلا اور دوسرا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ نمونہ ایک ثلاثی دیکھئے

کوئی تازہ شعر اے رب جلیل
ذہن کے غار حرا میں کب سے ہے
فکر ۔ محو انتظار جبرئیل

ثلاثی سے حمایت علی شاعر نے وہی کام لیا ہے جو رباعی سے لیا جاتا ہے۔ یعنی کسی بلیغ نکتے یا شدید احساس کا مختصر مگر جامع انداز میں اظہار کہ وہ نکتہ یا احساس قاری بھی اسی بلاغت یا شدت کے ساتھ قبول کرسکے۔ جس سے شاعر گزرا ہے۔

حرف حرف روشنی

ثلاثی

حمایت علی شاعر کا ایمان، اسلامی عقائد پر قدرے متزلزل نظر آتا ہے لیکن ان کی شاعری میں اسلامی تعلمیحات بکثرت ملتی ہیں اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہم عصر فکری تناظر میں وہ ان کی معنویت کو ایک نئی جہت دے سکیں۔ اس کوشش میں اکثر مقامات پر انہیں کامیابی ہوئی ہے۔

غزل کے ایک مطلع میں انہوں نے "خاک" اور "راکھ" کا قافیہ باندھا ہے۔ ان جیسے محتاط شاعر کو ان غیر ضروری بدعتوں سے بچنا چاہیے

"حرف حرف روشنی" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) نے اس خوش سلیقگی کے ساتھ شائع کی ہے جو اس کی مطبوعات کی پہچان ہے۔

(مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی، یکم اگست ۸۶ء)

بدر اورنگ آبادی (گیا۔ بہار)

عام روش، بلکہ رسم سے ہٹ کر حمایت علی شاعر نے اپنے تین شعری مجموعوں کا مختصر انتخاب کسی عظیم المرتبت شخصیت یا ناقد کے "پیش لفظ" کے بغیر پیش کیا ہے جس سے اس بات کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ شاعر کو اپنے فن اور اپنے کلام پر بھروسہ ہے اس لیے بیساکھیوں کی ضرورت نہیں۔ اور مشمولات کے مطالعہ کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ شاعر کا اپنے اوپر بھروسہ غلط نہیں ہے۔ اردو نثری اور شعری ادب تجربات کی کئی منزلوں سے گزر چکا ہے لیکن زندگی سے بھرپور ادب کے لیے تجربے کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ غزل کے میدان میں مظہر امام نے ایک تجربہ کیا اور آج آزاد غزل ایک تحریک بن چکی ہے۔ حمایت علی شاعر نے بھی ایک تجربہ کیا۔ قطعات کے چار مصرعوں میں سے ایک مصرعہ حذف کر کے تین مصارع کے قطعات کا نام انہوں نے ثلاثی رکھا اور بہ قول شاعر "ثلاثیاں" وہ ۱۹۶۰ء سے کہہ رہے ہیں۔ تجربہ اگر صرف برائے تجربہ ہو تو بے کار لیکن حمایت علی شاعر نے "ثلاثی" کو ایک نیا پیرہن دیا ہے اور غزلوں اور نظموں کی طرح ان کے اسلوب کی انفرادیت "ثلاثیوں" میں بھی اجاگر ہے اسلوب کی کتنی صحیح تعریف اس ثلاثی میں ہے۔

کس طرح تراش کر سجائیں
نادیدہ خیال کے بدن پر
لفظوں کی سلی ہوئی قبائیں

فکر کی جدت، خیالات کا تنوع، الفاظ کی ہم آہنگی، ہمہ آن تبدیل ہوتی ہوئی زندگی کی پیچیدگیاں اور شاعر کے حساس دل کی دھڑکنیں تمام حاوی ہیں۔ کبھی چونکا دینے والا انداز ہے اور کبھی نغمگی کی کیفیت پیدا کرنے کی شعوری کوشش۔ کچھ ثلاثیوں سے آپ بھی محظوظ ہوں

مغرور ہوا سے کہو یہ بات نہ بھولے
جم جائیں تو بن جاتے ہیں اک کوہ گراں بھی
ویرانوں میں اڑتے ہوئے آوارہ بگولے

(انتخاب)

خوش ہے سورج کہ کٹ گئی ہے رات
کاش یہ بھی اسے خبر ہوتی
سائے سائے میں بٹ گئی ہے رات
(خوش فہمی)

شب کو سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے
(شرط)

ناقدوں کے عتاب کا شکار غزل' تمام کوششوں کے باوجود اب بھی تابناک ہے اور حمایت علی شاعر کی ہنرمندی نے اسے ایک نیا رنگ عطاء کیا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ قاری کے ذہن کو براہ راست متاثر کرتے ہیں۔ علامتوں کا استعمال اس چابک دستی سے کیا گیا ہے کہ اشعار زندگی کی زبان بن گئے ہیں اور جیسا کہ خود شاعر نے کہا ہے۔ "علامت و استعارہ اسی ابلاغ کے وسیلے ہیں۔ اگر یہ وسیلہ اس قدر ذاتی اور داخلی ہو جائے کہ اپنے آئینے میں اپنے ہی شکل پہچانی نہ جاسکے تو شاعری بے چہرہ ہو کر رہ جاتی ہے" اس لئے بے چہرگی سے ہر حال میں بچایا ہے۔

اچھا کیا کہ تو نے مرا گھر ہی ڈھا دیا
یوں بھی یہ اک فریب ہی تھا سنگ و خشت کا

دستک ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو
طوفاں کی آرہی ہے صدا غور سے سنو
مجھے غروب نہ جانو جو میں افق پہ نہیں
بکھر گیا ہوں اندھیرے میں کہکشاں کی طرح
دیکھے جو آبلے کسی رہرو کے پاؤں میں
نادم کھڑے ہوئے ہیں درخت اپنی چھاؤں میں

نظمیں اس بات کی آئینہ دار ہیں کہ حمایت علی شاعر زندگی کی پر پیچ راہوں سے کما حقہ واقف ہیں۔ زندگی کی جمالیاتی پہلو پہ بھی ان کی نظر ہے اور اس کے دامن میں سمٹے ہوئے کرب سے بھی وہ نا آشنا نہیں۔ ایک ظلمت زدہ نگاہوں والی غریب عورت کے لئے زندگی کا منظر ایک تجارت کے سوا اور کیا ہے

یہ تجارت' یہ ارتقاء کا کمال
کائنات اک دکاں یہ سر بہ سجود

ایک شو کیس میں بنارس قید
ایک شو کیس مجبس کشمیر
ایک شو کیس ' اک حسین زنداں
بر اعظم سے تا بہ برصغیر

"جواب" ایک نظم ہے جس میں سورج کی تمکنت اور اس کی راہبری کا زعم عیاں ہے لیکن اس کے Anti Climax پر ذہن جھنجھنا اٹھتا ہے۔

اب میں نہیں رہوں گا تو یہ ساری کائنات
ظلمات میں بھٹکتی پھرے گی تمام رات
سورج یہ کہہ کے جا رہا تھا کہ اک دیا
چپکے سے جل اٹھا اور اسے دیکھنے لگا

سبھی نظمیں شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں لیکن "حرف حرف روشنی" شاہکار ہے۔ ماضی کی روایات' حسب' نسب' حرف حق' وظیفہ خوار' فقیہ و شاعر و فن کار' نشے میں سرشار اسلاف' زمین پر درود کا عمل' قربانیاں اور ضمیر فروشی' عوام و خواص کے درمیان گہری خلیج' غرض کہ پوری کائنات وحیات کا پرتو ہے۔ یہ شاہکار نظم جو ۲۱ حصوں پر مشتمل ہے۔
یہ مجموعہ اس لائق ہے کہ تمام اردو کتب خانوں میں محفوظ رہے تاکہ شعری ادب سے ذوق رکھنے والے استفادہ کرسکیں۔

(مطبوعہ۔ ہفتہ وار بودھ دھرتی گیا۔ ۱۶ اکتوبر ۸۶ء)

○

(تبصرہ نگار نے اپنا نام پس پردہ رکھا ہے)

دکن اور بالخصوص اورنگ آباد کی مردم خیز سرزمین سے سراج و ولی کے بعد جھومتے ہوئے اٹھنے والوں میں ایک نام حمایت علی شاعر کا بھی آتا ہے جو اس صدی کی تیسری، چوتھی دہائی میں ماقبل آزادی حیدر آباد میں پہلے پہل سنا گیا لیکن بعد میں جا کے کہیں زیادہ چمکا۔ تقسیم ہند کے بعد شاعر صاحب نے کراچی کو اپنا وطن ثانی بنالیا چنانچہ ان کا کلام میں جہاں جہاں وطن کے باب میں جو بھی تلخ و شیریں احساس ملتا ہے اس سے ان کا یہی وطن ثانی مراد ہے (ملاحظہ ہو۔ مادر وطن کا نوحہ صفحہ نمبر ۹۵)

دوسرے مہاجر شاعروں کی طرح ان کی شاعری میں بے وطنی کا وہ کرب نظر نہیں آتا جس سے ناصر کاظمی اور ایسے ہی دوسرے شاعروں کی پرسوز شاعری عبارت ہے۔

اس مجموعہ کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس پر حاشیہ نویسان ادب کی کوئی تحریر نہیں ملتی۔ جس میں عام طور پر شاعر اور اس کی شاعری کے بارے میں کم اور اپنی قابلیت اور علمیت کا اظہار زیادہ ہوتا ہے۔ اس بات سے شاعر کی خود اعتمادی اور عزت نفس کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس نے کسی طرح بیساکھیوں کا سہارا لینا گوارا نہیں کیا۔ البتہ مصنف نے خود

"حرف مختصر" کے عنوان کے تحت اپنی شاعری اور اپنے نظریہ شاعری کے بارے میں اظہار کیا ہے۔ شاعر صاحب جدلیاتی مادیت کے مارکسی فلسفے کے بڑے صمیم قلب سے قائل نظر آتے ہیں جس کا اظہار ان کے پیش لفظ کے علاوہ شاعری میں بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔

میرے تضاد سے ہے عبارت مراد وجود
گر زہر ہوں تو زہر کا تریاق بھی ہوں میں
(جدلیات / ثلاثی)
اضداد کی یہ جنگ اصول قدیم ہے
(ہارون کی آواز)

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جدلیاتی' مادیت کی افہام و تفہیم کے لئے مصنف نے زیادہ تر اسلامی تلمیحوں' علامتوں اور استعاروں سے کام لیا ہے

ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

چنانچہ اکثر تخلیقات میں سانپ' آدم و حوا' ابابیل' اصحاب فیل' اصحاف کہف' منبر و محراب' کعبہ و کنشت' گو سالہ' موسیٰ' ہارون' و بوذری جیسی تلمیحیں اور علامتیں ملتی ہیں۔ غالبا اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ترقی پسند شاعری ایک شعلہ مستعجل تھی جس کو کھل کھیلنے کا اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ اپنا کوئی استعاراتی نظام تشکیل دے سکے۔ مجبورا اردو کی تین سو سالہ اور فارسی کی ایک ہزار سالہ شاعری کی علامات روایات اور استعارات ہی سے اپنا کام چلانا پڑا۔ فیض کی شاعری اس کی بہترین مثال ہے۔

اکثر و بیشتر نظمیں ۱۹۳۶ء کے ادب کی یاد دلاتی ہیں۔ اپنے مواد کے اعتبار سے بھی اور اسلوب و ہیئت کے لحاظ سے بھی' بیشتر نظمیں بیانیہ اور قطعات کی شکل کے بندوں پر مشتمل ہیں جن پر فیض اور ساحر کی چھاپ نمایاں ہے۔ ایک نظم "جواب" (صفحہ ۶۹) پڑھ کر عدم کا ایک قطعہ بے ساختہ یاد آگیا۔

چھپنے لگا جو چاند تو بولا غرور سے
تھا مختتم جہاں کے اندھیروں میں اپنا دم
اب کون ہے جو رات کو بخشے گا روشنی؟
جگنو نے مسکرا کے کہا "بے وقوف ہم"

جگنو نے مسکرا کے "بے وقوف ہم" کہنے میں جو تیکھا پن ہے اس سے نظم کا یہ اختتامیہ مصرع خالی ہے

سورج یہ کہہ کے جارہا تھا کہ اک "دیا"
چپکے سے جل اٹھا اور اسے دیکھنے لگا

فرق صرف یہ ہے کہ شاعر نے چاند کی جگہ سورج اور جگنو کی جگہ دیئے کی علامت استعمال کی ہے لیکن دیئے سے دیا جلانے میں شاعر زیادہ کامیاب نظر نہیں آتا۔

شاعر نے شعوری طور پر بیانیہ طرز بیان اختیار کیا ہے۔ غالبا وہ اقبال کے اس خیال کہ

حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

سکے زیادہ قائل نظر نہیں آتے چنانچہ اپنے پیش لفظ میں علامتوں اور استعاروں کے ذاتی اور داخلی بن جانے کا نتیجہ شاعری کی بے چہرگی قرار دیتے ہیں۔ "میں نے کوشش کی ہے کہ میرا آئینہ پتھر نہ بن سکے"

یہی سبب ہے کہ کلام میں جگہ جگہ وہی کثیرالاستعمال علامات و استعارے نہیں ملتے ہیں جن سے ہماری ترقی پسند شاعری عبارت رہی ہے جیسے 'کارواں' رہبر' رہزن' سحر' نشیمن' قفس' دار' تیشہ' بے ستون' کوہکن' خسرو وغیرہ جو اب بڑی حد تک ......بن چکے ہیں۔ پوری کتاب میں نئی لفظیات صرف الفظوں تک محدود ہے۔ جس 'کمرہ' ریل' گھڑی اور حصار ذات' ویسے یہ بھی یہ اب جدید شاعری کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔

شاعر صاحب نے فن و زبان کا خیال رکھا ہے تاہم ایک جگہ "خاک" کا قافیہ "راکھ" بھی باندھ گئے ہیں اپنے ایک شعر کی تشریح کے لئے ایک مصرع غالب کے نام سے فٹ نوٹ میں دیا گیا ہے۔ جو غالب کے متداول دیوان میں کہیں نہیں ملتا ممکن ہے یہ شاعر کی اپنی تحقیق ہو۔

زیر نظر کتاب دراصل مصنف ہی کی تین کتابوں "آگ میں پھول" "مٹی کا قرض" اور "ہارون کی آواز" کا ایک مختصر انتخاب ہے جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

کتاب میں جملہ (۳۲) غزلیں (۳۶) نظمیں ایک طویل نظم بعنوان "حرف حرف روشنی" جو کتاب کا نام بھی ہے اور (۴۷) ثلاثیاں شامل ہیں۔ "ثلاثی" شاعر کی "ایجاد بندہ" ہے جو تین مصرعوں پر مشتمل ہے جس میں پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ آخری طویل نظم اقبال کی نظم خطاب بہ نژاد نو (جاوید نامہ) کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ جس میں حکمرانوں کے جبر' فلسفہ' تاریخ' مذہب پرستوں کی اجارہ داری' جنگ زرگری اور سادہ دل عوام کے استحصال کی داستان بیان کی گئی ہے' لیکن موضوع اس قدر گمبھیر اور وسیع ہے کہ اس کو طویل' مختلف نظم میں' سمیٹا نہیں جا سکتا تھا تاہم میں شاعر کی کوشش قابل داد ہے۔

نمونہ کلام کے طور پر چند ثلاثیاں اور غزلوں کے اشعار درج ذیل ہیں۔

شرط

شب کو سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

رویت ہلال

خود آگہی نہ جدت فکر و نظر ملی
وہ قوم آج بھی ہے پرستار چاند کی
جس قوم کو روایت شق القمر ملی

(رویت ہلال کو چاند کی پرستش قرار دینا مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے)

محسوس کر رہا ہوں میں کرب شکستگی
تم بھی شگفت گل کی صدا غور سے سنو

میں آئینے میں بھی ہوں' آئینے کے باہر بھی
میرے وجود کی وحدت میں یہ دوئی کیا ہے

اچھا کیا تو نے مرا گھر ہی ڈھا دیا
یوں بھی اک فریب ہی تھا سنگ وخشت کا

یوں دل کی سیاہی میں قلم ڈوب گئے ہیں
تحریر کو نسبت نہ رہی خون جگر سے

(مطبوعہ روزنامہ سیاست' حیدر آباد دکن مورخہ ۱۷ نومبر ۸۶ء)

شخص و عکس

حمایت علی شاعر کی نثری نگارشات

مرزا ادیب

حمایت علی شاعر ہمارے دور کے ممتاز اور منفرد شاعر ہیں جن کی شعری تصانیف کی تعداد وقت کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی جارہی ہے۔ ان کے جن شعری مجموعوں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے وہ ہیں "آگ میں پھول" "مٹی کا قرض" "تشنگی کا سفر" اور "ہارون کی آواز" یہ تو ہیں شاعر کی نظموں، غزلوں، طویل تمثیلی اور افسانوی نظموں کے مجموعے۔ ان کے علاوہ بھی انہوں نے جو قابل ذکر اور قابل قدر کام کیا ہے وہ ہے عالمی امن کے موضوع پر ایک طویل افسانوی نظم "بنگال سے کوریا تک" اس نظم کا انگریزی زبان میں منظوم ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ مترجم پنجاب یونیورسٹی (بھارت) کے انگریزی ادبیات کے استاد پروفیسر راجندر سنگھ ورما ہیں۔ مگر اس وقت ان کی جو تصنیف میرے پیش نظر ہے وہ ان کا کوئی شعری مجموعہ نہیں بلکہ ان کی نثری تحریروں کا مجموعہ ہے۔ جس کا نام ہے "شخص و عکس"

اس کتاب میں آئینہ کے زیر عنوان انہوں نے جو دو صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے اس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

"شخص و عکس" میری تنقیدی فکر اور میری تخلیقات کے رد عمل میں ہونے والے مباحث کی روشنی میں۔ میرا بھی آئینہ ہے اور ان مخصوص چہروں کا بھی جنہوں نے شاید آج تک اپنا عکس نہیں دیکھا"

میں جو بات سب سے پہلے کہنا ضروری سمجھتا تھا وہ شاعر نے خود دیباچے میں کہہ دی ہے یعنی یہ کہ شاعر صرف شاعر ہوتا ہے اور نثر یا کوئی اور پیرایہ اظہار اس کا منصب نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعر اگر صاحب علم ہے اور اس کا ذہن تخلیقی اعتبار سے زرخیز ہے تو ہر شعبہ فن میں اپنے خیال کا جادو جگا سکتا ہے۔

شاعر نے درست کہا ہے۔ ایک شاعر بھی اگر ضرورت محسوس کرتا ہے تو اپنے خیالات کا اظہار نثری پیرائے میں بھی کرسکتا ہے اور اس باب میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آسکتی۔ جیسا کہ خود انہوں نے کہا ہے۔

اپنی اس تصنیف میں شاعر نے رنگا رنگ تحریریں دی ہیں کچھ تحریریں ادب کے اہم موضوعات سے متعلق ہیں۔ کچھ معاصر شخصیتوں کے بارے میں اور اس میں کچھ ایسے مضامین بھی ہیں جن کے ذریعہ شاعر نے اپنے متعلق یا دوسروں کے متعلق جن زاویوں کا اظہار کیا ہے ان کے حوالے سے اپنا رد عمل ظاہر کیا ہے۔ ان تحریروں کے مطالعے سے ایک باشعور قاری اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ شاعر کی ناقدانہ حس خاصی تیز ہے۔ وہ مخالفوں کے حملوں کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرنے کے عادی نہیں بلکہ خم ٹھونک کر میدان میں اتر آتے ہیں مگر اس حقیقت کو لازما تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاعر کا رد عمل جذباتی نہیں ہوتا وہ دلائل دیتے ہیں۔ براہین سے کام لیتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے مطالعہ پر غور کرتے ہیں اس لئے ان کا رد عمل جذباتی ہونے کی بجائے منطقی ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں، اشتعال کے عالم میں ہرگز نہیں کہتے، دلائل و براہین کے سہارے کہتے ہیں۔

گزشتہ تیس برس میں رسائل و جرائد میں بڑے ہنگامہ خیز مباحث ہوئے ہیں۔ ان مباحث میں نامور اہل قلم نے حصہ لیا

ہے۔ بعض مباحث میں شاعر بھی شامل ہوئے ہیں اور شاعر نے ایسے متعدد مباحث کی روداد بڑے دلچسپ انداز میں قلم بند کردی ہے۔ ''شخص و عکس'' پڑھ کر قاری پچھلے تیس برسوں کی کئی تحریکوں' بحثوں اور نظریاتی تضادات سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب محض چند مضامین و مباحث کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ تاریخ ادب کا ایک اہم حصہ بھی ہیں۔

شاعر نے آئینہ میں جو باتیں لکھی ہیں وہ سب کی سب اس لحاظ سے بڑی اہم ہیں کہ ان کے مطالعے سے قاری کتاب کی روح تک پہنچ جاتا ہے یا یوں کہئے کہ اس روح کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے' خصوصاً'' یہ سطریں حاصل مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

''میں نے شاعری بھی کی ہے' ڈرامے بھی لکھے ہیں اور کبھی کبھی تنقیدی مضامین بھی' ان مضامین سے میرے انداز فکر اور میرے طرز بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میرا کوئی خاص اسلوب ہے مگر یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ میں نے جو کچھ سوچا اور محسوس کیا' ایمانداری سے لکھ دیا ہے''

شاعر کو خود اپنے اسلوب کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی ان کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے جو کچھ سوچا اور محسوس کیا' ایمانداری سے لکھ دیا ہے۔ اسلوب کے بارے میں گفتگو کرنے کا حق ان کے قاری کو ہے اور میں بطور ان کے ایک قاری کے بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ شاعر کا اسلوب' نثر میں اس قدر خوبصورت ہے جس قدر شاعری میں ہے۔ شاعری کی طرح ان کا نثری پیرایہ بھی قاری کا جمالیاتی تقاضا پورا کرتا ہے اور یہ کوئی معمولی نہیں بڑی بات ہے

(مطبوعہ ماہنامہ ''کتاب'' لاہور۔ فروری ۸۶ء)

اختر حسن

''شخص و عکس'' حمایت علی شاعر کی نثری نگارشات پر مشتمل ایک بھاری بھرکم کتاب ہے جسے مصنف نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ تجزیہ' تبصرہ اور تزکیہ۔ تجزیہ کے باب میں سولہ ادبی اور تنقیدی مضامین شریک ہیں۔ تبصرہ کے زیر عنوان بارہ کتابوں اور رسالوں پر تبصرے کئے گئے ہیں اور تزکیہ کے تحت ایسی تحریریں ملتی ہیں جن میں حمایت علی نے اپنے بعض معاصرین کے اعتراضات کے مدلل جواب دیئے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھ کر پہلا تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ صاحب کتاب نے اس کے اوراق میں اپنی ان تمام چھوٹی' بڑی تحریروں کو محفوظ کر دیا ہے جو پچھلے (۳۵) برس کے دوران میں مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر انہوں نے سپرد قلم کیں۔ ان میں سے بعض نثر پارے تو بے شک بہت اہم اور مستقل قدر و قیمت کے حامل ہیں لیکن کچھ ایسی نگارشات بھی ہیں جو نجی' وقتی اور رفتنی و گزشتنی ہیں جن کو اگر اس کتاب میں شریک نہ کیا جاتا تو ایک باشعور قاری کے لئے کوئی فرق نہ پڑتا۔

حمایت علی شاعر بنیادی طور پر شاعر ہیں' طرفہ تماشا یہ کہ انہوں نے اپنا تخلص ہی کچھ ایسا رکھا ہے کہ آپ مانیں نہ مانیں حمایت علی شاعر کہے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اب تک ان کے پانچ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں اور مزید تین مجموعے زیر طبع ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے ''آگ میں پھول'' پر انہیں صدارتی انعام ملا اور شاعری کی دوسری کتاب ''مٹی کا قرض'' کو رائٹرز گلڈ آدم جی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ حمایت علی شاعر نے شاعری میں تکنیک اور ہیئت کے بعض اچھے تجربے بھی کئے ہیں۔ خصوصاً تین مصرعوں کی نظم کا ہئیتی تجربہ' جسے انہوں نے ثلاثی کا نام دیا ہے۔ بہت اہم ہے۔ حمایت علی نے اپنے ادبی سفر میں صرف شاعری کے دائرے تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ ڈراما' ریڈیو' ٹیلی ویژن' فلم اور صحافت کے شعبوں

میں بھی اپنے اشہبِ قلم کی جولانیاں دکھائیں اور بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ ڈرامے لکھے، فلمیں لکھیں، فلمی نغمے لکھے اور فلمیں بھی بنائیں۔ فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے بھی کئی انعام پائے۔ یہ تو نہیں معلوم کہ فن کے اس کاروبار میں پیسہ بھی کمایا کہ نہیں لیکن نام ضرور کمایا۔ ان سب مصروفیتوں کے باوجود اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ سندھ یونیورسٹی نے ۱۹۶۴ء میں ایم اے کیا۔ اور پاکستان میں اردو ڈراما پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ مشرق و مغرب کے کئی ملکوں کی سیاحت کے مواقع بھی انہیں میسر آئے جس کی بدولت ضرور ہے کہ ان کے ذہن میں اور زیادہ فراخی اور نظر میں وسعت پیدا ہوئی ہوگی۔ زندگی اور علم و ہنر کے میدان میں پیہم تگ و تاز نے ان کی ترقی پسندانہ فکر اور انسان دوستی کو محکم و محترم بنایا جس کی شاہد اول ان کی شعری تخلیقات اور نثری نگارشات ہیں۔

حیدر آباد دکن کی سرزمین سے ابھرنے والا یہ فنکار ان دنوں حیدر آباد سندھ کی جامعہ میں شعبہ اردو سے وابستہ ہے اور تخلیق کے ساتھ ساتھ تدریس کے ہفت خواں بھی طے کر رہا ہے۔

حمایت علی شاعر کی جنم بھومی اورنگ آباد ہے۔ ان کے والد اورنگ آباد میں پولیس کے ایک افسر تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی ان کے نقش قدم پر چلے۔ لیکن بیسویں صدی کے پانچویں دہے کا یہ زمانہ ہندوستان کی تحریک، آزادی کے عروج کا زمانہ تھا۔ اورنگ آباد پر جو برطانوی ہند کی سرحد سے ملا ہوا تھا' انقلابی تحریکوں کے سائے پڑ رہے تھے۔ حمایت علی شاعر کے الفاظ میں شہر میں کچھ باغی نوجوانوں نے پیپلز بک ہاؤس قائم کر رکھا تھا۔ جہاں سوشلسٹ لٹریچر کی افراط تھی۔ میں اسکول جانے کے بہانے وہاں جاتا اور زندگی کے ان اسرار سے واقف ہوتا جو تقریر کے پردے میں چھپے ہوئے تھے۔ ان دنوں بمبئی کے رسائل قومی جنگ' نیا ادب اور نظام کے علاوہ روزنامہ "پیام" (حیدر آباد) بھی میرے زیر مطالعہ رہتے اور میں ترقی پسند ادیبوں سے ایک ذہنی قرب محسوس کرتا۔

پھر یوں ہوا کہ حمایت علی نے اورنگ آباد کے ایک باغی کامریڈ افتخار کی گرفتاری پر ایک کہانی لکھی جو نظام (بمبئی) میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کو پڑھ کر ان کے والد آگ بگولہ ہوگئے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کا نوجوان انقلابی بیٹا کڑی نگرانی کے باوجود ایک روز رات کے اندھیروں میں سب کی نظروں سے اوجھل ہو کر سیدھا حیدر آباد پہنچا یہ غالباً ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ حمایت علی شاعر کا سن پیدائش ۱۹۳۰ء ہے اس لحاظ سے پہلی ہجرت کے وقت ان کی عمر کیا ہوگی۔ لیکن حمایت علی شاعر کی جوانی کی راتیں امنگوں کے دن ایک اجنبی شہر میں کس طرح بسر ہوئے۔ اس کا مختصر سا احوال بھی زیر نظر کتاب کے اس مضمون میں ملتا ہے جس کا عنوان ہے پودے اور مسلم ضیائی اور مسلم ضیائی کی مسکراہٹوں نے اس نوخیز شاعر کو اپنے دامن میں پناہ دی۔ پھر وہ ابراہیم جلیس سے ملے۔ دوسرے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں سے ان کی شناسائی ہوئی۔ دکن ریڈیو میں نوکری بھی کی اور وہاں سے نکالے بھی گئے۔ سڑکوں اور گلیوں میں گھوم پھر کر اخبار بیچے۔ انقلابی نظمیں لکھیں' ان کے ہم عصروں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مختلف اخباروں میں بھی کام کیا اور بالآخر ۱۹۵۱ء میں پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک کا دور حیدر آباد کی تاریخ میں مختلف حیثیتوں سے ہمیشہ ناقابل فراموش رہے گا۔ حمایت علی شاعر نے بھی یقیناً اس دور کے نبض کی دھڑکنوں کو سنا ہوگا اور آنے والے انقلاب کے قدموں کی آہٹوں سے بھی ضرور ان کے کان آشنا ہوئے ہوں گے۔ ہماری آنکھیں ان کی زیر نظر کتاب "شخص و عکس" میں ان پانچ چھ برسوں کے شب و روز کو تلاش کرتی رہیں جو انہوں نے جاگیر شاہی کی گرتی ہوئی دیوار کے سائے تلے گزارے تھے۔ بڑے باغیانہ اور انقلابی انداز میں لیکن ان چند اشاروں کے علاوہ جو پودے اور مسلم ضیائی والے مضمون میں ملتے ہیں کہیں اور اس کا کوئی مدھم نقش بھی نہیں ملتا۔ اس

مضمون میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ اردو محل (گجروگاہ منظم جاہی مارکیٹ مسلم ضیائی کی سکونت اور تارے کا دفتر) سے ادیبوں کا ایک گروہ روزنامہ "پیام" کے دفتر تک پھیلا ہوا تھا۔ جہاں سے ایک راہ تلنگانہ کے جنگلوں تک چلی گئی تھی اور دوسرا گروہ اردو محل سے دارالسلام چلا گیا تھا جو مجلس اتحادالمسلمین کے پرچم تلے قاسم رضوی کے رضاکاروں کا مورچہ تھا۔ ان دو الگ الگ راستوں پر چلنے والے ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور دانشوروں کے بارے میں کچھ ضروری معلومات فراہم کرنے سے انہوں نے کن ذہنی تحفظات کی بناء پر گریز کیا۔ کیا حمایت علی اس سوال کا جواب دیں گے؟ ابراہیم جلیس نے "پاکستان منتقل ہونے کے بعد ایک دستاویزی کتاب لکھی "دو ملک ایک کہانی" حمایت علی شاعر نے تاریخ کے اس اہم ترین دور کے تعلق سے کم از کم اس دور کی تیزی سے بدلتی ہوئی قدروں اور اردو کے اہل قلم کی مختلف آوازوں پر روشنی کیوں نہیں ڈالی؟ ایک ترقی پسند اور ذمہ دار ادیب کی حیثیت سے اگر آج کا قاری ان سے ایسے سوالات کرے تو بے شک حمایت علی کو کم از کم اپنی تحریروں میں ان کے جواب دینا ہوں گے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ حمایت علی شاعر نے سولہ سترہ سال کی عمر میں ترقی پسندی، روشن خیالی اور انسانی دوستی کا جو مسلک اختیار کیا تھا پاکستان میں ۳۵ سال کا طویل ادبی سفر طے کرنے کے دوران میں بھی وہ بدستور اپنے اسی مسلک پر قائم رہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ پچھلے ۳۰، ۳۵ برس میں ان کی شعری اور نثری تخلیقات، نعرہ بازی اور انقلابی رومانیت کی تنگنائے سے نکل کر فکر و نظر کے وسیع تر افقوں کی آئینہ دار بن گئیں۔

زیر نظر کتاب میں شامل تقریباً ساری ہی نگارشات اپنے لکھنے والے کی دیدہ وری روشن نظری اور اعلیٰ مشربی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ بعض جزوی باتوں میں حمایت علی شاعر کے خیالات اور ارتسامات سے اختلافات کے باوجود ہم ان کی ادبی دیانتداری، صداقت پسندی، شگفتہ بیانی اور خوش اسلوبی کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے ایسا لگتا ہے کہ حمایت علی شاعر اپنے پورے ادبی سفر میں غالب کے اس مشورے پر بہت خلوص کے ساتھ کاربند رہے۔

جوں عکس پل بہ سیل بہ ذوق بلا برقص (غالب)

ہماری تمنا ہے کہ حمایت علی شاعر اپنے مرکز سے ہٹے بغیر اسی ذوق بلا کے ساتھ بساط ادب پر رقص بے اختیار میں آئندہ بھی اسی طرح منہمک رہیں گا

(مطبوعہ روزنامہ "سیاست" حیدر آباد دکن، مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

پروفیسر نظیر صدیقی

پچھلے دنوں ایک دلچسپ کتاب ہاتھ آئی۔ اس کے مصنف ہیں حمایت علی شاعر جو مشاعروں کے مقبول ترین شاعروں میں سے ہیں اور جن کی مقبولیت میں ان کے کلام کی خوبیوں کے علاوہ ان کے دلکش ترنم اور ڈرامائی تحت اللفظ دونوں کو دخل ہے۔ اس وقت تک ان کے کلام کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں اور چوتھا مجموعہ بھی آیا چاہتا ہے۔ نثر نگاری ان کا ثانوی مشغلہ رہی ہے "شخص و عکس" ان کے اسی ثانوی مشغلے کا نتیجہ ہے۔ "آئینہ" کے عنوان سے انہوں نے اس کتاب کا جو دیباچہ تحریر کیا ہے اس کی آخری عبارت یہ ہے:

"شخص و عکس" میری تنقیدی فکر اور میری تخلیقات کے ردعمل ہونے والے مباحث کی روشنی میں میرا بھی آئینہ ہے اور ان مخصوص چہروں کا بھی جنہوں نے شاید آج تک اپنا عکس نہیں دیکھا"

اس کتاب کے آئینے میں حمایت علی شاعر کا جو عکس نظر آتا ہے اس بنا پر یہ سوچنا شاید غلط نہ ہوگا کہ زندگی میں حمایت علی

شاعر ایک مہم جو یعنی adventurous آدمی ہوں یا نہ ہوں ادب میں ایک مباحثہ جو یعنی "Controversialist" نقاد ضرور ہیں چنانچہ یہ کتاب جو تین حصوں میں منقسم ہے اس کا تیسرا حصہ ادبی مناظروں اور مناقشوں سے عبارت ہے اور یہی حصہ کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ ہے۔ باقی دو حصوں میں ادبی موضوعات پر مضامین اور کتابوں پر تبصرے ہیں۔

زندگی میں جھگڑالو ہونا یقیناً" کوئی اچھی بات نہیں۔ لیکن ادب میں جھگڑالو ہونا شعر و ادب کے حق میں مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حمایت علی شاعر نے بہت اچھا کیا کہ وہ اپنے مخالفین اور معترضین سے لڑ بیٹھے۔ ان دونوں کی لڑائی سے بعض مسائل واضح ہو گئے۔ بعض غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ بعض حقائق سامنے آگئے اور یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو گئی کہ بعض تنقید نگاروں کی تنقید میں بصیرت اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ خباثت ہوا کرتی ہے۔

حمایت علی شاعر اپنے جن معاصرین سے برسرپیکار رہے ہیں ان میں سلیم احمد، شمیم احمد، خلیل الرحمٰن اعظمی قمر جمیل اور محسن بھوپالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حمایت علی شاعر نے کہیں اپنے مضامین میں ان کے عائد کردہ الزامات کی تردید کی ہے اور کہیں کسی ایڈیٹر کے نام اپنے خطوط میں ان کو للکارا ہے۔ ادبی نوک جھونک کی یہ فضا "آب حیات" میں انشا اور مصحفی کے جھگڑوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔

"آئینہ کیوں نہ دوں" کے عنوان کے تحت حمایت علی شاعر ایک اخبار کے ایڈیٹر کو خط لکھتے ہوئے قمر جمیل کا حساب یوں چکاتے ہیں:

"مگر وقت کی ستم ظریفی کہ وہ نوجوان جو قمر جمیل کی دانست میں ان کے حلقہ تربیت میں تھے زیادہ انقلابی نکلے...... یہ قافلہ تو آگے بڑھ گیا اور بے چارے قمر جمیل اس دعویٰ باطل میں گم رہ گئے کہ انہیں نہ صرف ان کا رہنما بلکہ نثری نظم کا بانی سمجھ لیا گیا ہے مگر جب نثری نظم کے دیرینہ شاعر اور قمر جمیل کے دوست احمد ہمیش نے بھی انہیں اس مکان کا ناجائز قابض ثابت کر کے نکال باہر کیا تو انہوں نے گھبرا کر پھر غزلیں کہنا شروع کر دیں اور جب اس زمین پر بھی پاؤں نہ جمتے دیکھے تو سلیم احمد کے تتبع میں کالم نگاری اختیار کر لی۔ سلیم احمد تو اپنے کالموں میں بھی اکثر سنجیدہ مسائل پر گفتگو کرتے ہیں مگر قمر جمیل اپنی دانست میں قابلیت کا مظاہرہ یا فقرے بازی یا اپنے حلقہ احباب میں اسناد کی تقسیم یا جنہیں رقیب سمجھ لیا ان کی کردار کشی میں مبتلا رہتے ہیں۔"

اس عبارت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ادھر چند برسوں کے اندر اردو ادب کی فضا کس قدر غبار آلود رہی ہے۔ کون لوگ کتنی دھول اڑاتے رہے ہیں بہر حال مندرجہ بالا عبارت کی بنیاد پر یہ قیاس کرنا صحیح نہ ہو گا کہ "شخص و عکس" میں صرف ادبی جھگڑوں کی باتیں ہیں اور کوئی کام کی بات نہیں ہے۔

حمایت علی شاعر پر ان کے ایک کرم فرما محسن بھوپالی نے یہ الزام رکھا کہ حمایت علی شاعر اپنی جن ثلاثیوں کے لئے مشہور ہیں، اس کا خیال ان کے ذہن میں جاپانی شاعری "ہائیکو" سے آیا۔ اس الزام کی تردید کرتے ہوئے حمایت علی شاعر لکھتے ہیں:

"اچھا اب ثلاثی کی اصل حقیقت ظاہر کر دوں۔ اس کی محرک نہ ہائیکو ہے نہ ظہیر کاشمیری کی شکست زندان، اور نہ اپنے بعد آنے والے کسی نو مشق شاعر کی کوئی نظم، ثلاثی کہنے کا خیال میرے ذہن میں رباعی سے پیدا ہوا۔"

حمایت علی شاعر کا یہ اعتراف اس مسئلے کو ہمیشہ کے لئے رد کر دیتا ہے کہ وہ ثلاثی کے موجد ہیں یا نہیں۔

"فیض کا متنازہ شعر" کے عنوان سے حمایت علی شاعر کا ایک مختصر سا مضمون ہے جس میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ مشہور شعر فیض کا ہے یا کسی اور کا۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

حمایت علی شاعر نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ شعر فیض کا نہیں بلکہ میر محبوب علی خان آصف کا ہے جو نظام دکن میر عثمان علی خان کے والد تھے۔

"شخص و عکس" میں تیرہ کتابوں پر وہ تبصرے بھی ہیں جو کسی زمانے میں انھوں نے کسی رسالے یا بعض رسالوں میں لکھے تھے۔ اگرچہ اس طرح کے تبصرے وقتی چیز ہوتے ہیں تاہم ان سے یہ یاد تازہ ہوجاتی ہے کہ کس زمانے میں کون سی کتابیں چھپی تھیں۔

"شخص و عکس" کے پہلے حصے میں تنقیدی اور شخصی مضامین ہیں جن کے لئے تجزیے کا عنوان رکھا گیا ہے اس حصے میں مسلم ضیائی، ابراہیم جلیس، سرور بارہ بنکوی اور جیلانی بانو جیسے بزرگوں اور دوستوں کے شخصی خاکے بھی ہیں جس میں کسی قدر تنقید بھی آگئی ہے۔

ابراہیم جلیس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جلیس بہت کشادہ ظرف انسان تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ ہر دلعزیز رہے ہیں۔ وہ جس محفل میں جاتے اپنی بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی اور خوبصورت فقروں سے ساری محفل کو گلزار بنادیتے۔ انہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا کہ شاید اس انسان کو دنیا کا کوئی غم نہیں۔ خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی جی بھر کے ہنساتے۔ ان کا انداز گفتگو اتنا دلکش اور بیاختہ ہوتا کہ جھوٹ میں بھی سچ محسوس ہونے لگتا۔

یہی بے ساختگی، ذہانت، شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ خاص طور پر ان کا طنز جو تلخ و ترش بھی ہوتا تھا اور شیریں بھی، مسلم ضیائی کہتے تھے کہ کاش جلیس صحافی نہ ہوتا۔ صحافت نے ابراہیم جلیس کے تخلیقی جوہر کو بکھیر دیا ہے۔"

سرور بارہ بنکوی کی بارے میں حمایت علی شاعر لکھتے ہیں:

"مخصوص ترنم میں اس کے اشعار اس وقت بھی کانوں میں گونج رہے ہیں۔ بالخصوص اس کا یہ شعر تو گویا اس کی اپنی شخصیت کا آئنہ ہے۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہوجائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

سرور کے ملنے والے سبھی اس کیفیت کی گواہی دیں گے کہ وہ جب بھی ملتا دلوں میں انبساط کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ شوکت تھانوی نے اصغر گونڈوی کے متعلق "شیش محل" میں ایک جملہ لکھا ہے ان سے مل کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گرمیوں میں برف کا پانی پی رہے ہیں۔ سرور سے مل کر بھی یہی لطف آتا تھا۔"

"شخص و عکس" گزشتہ پچیس تیس سال کے پاکستانی شعر و ادب کا ایک منظر نامہ ہے اسے پڑھ کر بہت سی بھولی بسری باتیں ذہن میں تازہ ہوجاتی ہیں۔ اس طویل مدت میں کن مباحث نے سرد و گرم جنگ کی شکل اختیار کی۔ کونسی کتابیں چھپیں، اردو ادب کی محفلوں میں کون لوگ آئے اور کون ان محفلوں سے اٹھ گئے، خود حمایت علی شاعر کو اپنی شاعرانہ زندگی میں کن

مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ اگر آپ کو اس قسم کی باتوں سے دلچسپی ہو تو "شخص و عکس" آپ کے لئے ایک دلچسپ کتاب ثابت ہوگی۔

(مطبوعہ "نیرنگ خیال" ۔ راولپنڈی جولائی ۱۹۸۶ء)

ادیب سہیل

حمایت علی شاعر کو بہ حیثیت ایک اچھے شاعر میں ایک طویل عرصے سے جانتا اور مانتا ہوں سب سے پہلے میں نے ان کی نظم ۱۹۴۶ء میں کلکتے کے ایک ہفتہ وار "نئی منزل" میں پڑھی تھی اس وقت "نئی منزل" کی ادارت کے فرائض معروف شاعر اختر پیامی انجام دے رہے تھے۔ جو ان دنوں "ڈان" کراچی کے میگزین ایڈیٹر ہیں۔

حمایت علی شاعر کی تازہ کتاب "شخص و عکس" نے ان کی شناخت ایک مبصر اور ناقد کی حیثیت سے کرائی اور معلوم ہوا کہ حمایت علی، شاعر تو پختہ کار ہیں لیکن یہ حضرت نثر بھی بڑی مربوط اور مضبوط لکھتے ہیں۔ موصوف نظری سطح چونکہ صاف اور واضح ہیں اس لئے جو بات بھی کہنا چاہتے ہیں اس کے درمیان عجز فکر و بیان آڑے نہیں آتا اور گومگو کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

شخص و عکس کو تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے یہ عنوانات علی الترتیب، تجزیہ، تبصرہ اور تزکیہ ہیں تجزیہ کے تحت جتنے مضامین شامل ہیں ان میں بیشتر اگرچہ بادی النظر میں شخصی معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ ان معنوں میں شخصی نہیں رہے کہ ان کے حوالے سے جو باتیں لکھی گئی ہیں ان کا دائرہ ذات سے پھیل کر کائنات تک جاتا ہے۔ تجزیہ کا آغاز "اردو میں نعتیہ شاعری" سے ہوتا ہے۔ یہ مضمون روایتی ہوتے ہوئے بھی روایتی اس لئے نہیں رہتا کہ اس میں زیریں رو کی صورت میں صاحب کتاب کا فکری رویہ موجود ہے، شاہ عبد اللطیف بھٹائی اور ان کے فن پر وجودیت کے حوالے سے بات کی گئی ہے وجودیت کی بعض گتھیاں سچ سچ قاری کے ذہن نشین ہو جاتی ہیں یہ مضمون میری معلومات میں اس بات کا اضافہ کرتا ہے کہ شاہ کا صوفیت کے اس اسکول سے تعلق ہے جن کے پیشروؤں میں حسین بن منصور اور ان کے شاگرد معنوی ابن العربی ہیں۔

"پودے اور مسلم ضیائی" کے مطالعہ سے، مسلم ضیائی، مخدوم محی الدین، کرشن چندر، تلنگانہ تحریک اور ترقی پسند مصنفین کی ابتدائی سرگرمیوں کے نقوش ہمارے سامنے آجاتے ہیں اس سے اپنے کاز کے لئے ان حضرات کے Dedicataion کا بھی پتہ چلتا ہے۔

"ابراہیم جلیس" کا مطالعہ میرے سامنے کبھی ایک کھلنڈرے اور زندہ دل آدمی کو لاتا ہے کبھی "چالیس کروڑ بھکاری" کے درمیان ایک درمند، جی دار اور سوچتے ہوئے شخص کو پیش کرتا ہے۔

مقبول نقش اور تیسر دنیا کا شاعر، کا موضوع ایک ایسا شاعر ہے جو شاعر تو بہتوں سے اچھا ہے لیکن پبلک ریلشنگ کے ڈھپ سے نا آشنا اور کنج عافیت کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ یہ مضمون بھی اگرچہ شخصی ہے لیکن بڑے جداگانہ پیرائے میں تحریر ہوا ہے۔

"سرور بارہ بنکوی" کو پڑھ کر میں یادوں کے ہجوم میں گھر گیا ہوں، یکجائی کی وہ بہت شامیں اور بہت سے دن یاد آنے لگے ہیں جب ہم صلاح الدین محمد، نوشاد نوری، عطاء الرحمان جمیل اور سرور یکجا ہوتے تھے۔ سرور اچھے شاعر بھی تھے اور اچھے انسان بھی۔

"میرا پیغام محبت ہے" ایک دل میں اتر جانے والا تاثراتی مضمون ہے اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

"تبصرہ" کے تحت صاحب کتاب نے ان تمام تبصروں کو یکجا کر دیا ہے جو وہ وقتاً فوقتاً مختلف کتابوں پر کرتے رہے تھے ان تبصروں کو پڑھ کر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان میں وہ فکری بصیرت کے ساتھ موجود ہیں یہ تبصرے "سلامت" سے روا ہیں ۔۔۔۔ کی قسم کے نہیں۔

تزکیہ کے ذیلی عنوان کے تحت جو مضامین زیر بحث کتاب "شخص و عکس" میں شامل ہیں وہ بہ ہر نوع ہیں۔ ان میں بیشتر نزاعاتی فضا رکھتے ہیں، چند ایک میں کسی شاعر یا نقاد کی طرف سے ان کے معترضین کا علمی پس منظر میں جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، کہیں صاحب کتاب نے خود پر کیے گئے اعتراضات کا وضاحتی جواب دیا ہے۔ لیکن کہیں بھی اس کا لہجہ علمی سطح سے نیچے نہیں آیا، برہنہ اعتراض کے جواب میں پردہ پوشی کا طرز اپنایا گیا ہے۔ درشت سے درشت صورت حال میں بھی متوازن رہنے کی کوشش ملتی ہے۔ حمایت علی شاعر سے یہ سب اس لئے ممکن ہو سکا کہ وہ ایک وسیع نکتہ نظر کے داعی بھی ہیں۔

(مطبوعہ ماہنامہ قومی زبان، کراچی جون ۸۰ء)

ڈاکٹر امانت شیخ

"شخص و عکس" حمایت علی شاعر کے ان مضامین اور مباحث کا مجموعہ ہے جو انہوں نے گزشتہ تیس سالوں میں لکھے ہیں حمایت علی اس نظریئے کے مطلق قائل نہیں ہیں کہ شاعر صرف شاعری کر سکتا ہے اور نثر نگاری اس کا منصب نہیں ہو سکتا۔ شاعر اگر صاحب علم ہے تو اس کا تخلیقی فن اپنے تخیلات کا جادو جگا سکتا ہے۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے، تجزیہ، تبصرہ اور تزکیہ انتساب ایک (ثلاثی) کی صورت میں مرحوم کے دوست سلیم احمد کے نام ہے خود کتاب کا نام غالب کے شعر سے ماخوذ ہے۔

غالب چو شخص و عکس در آئینۂ خیال
با خویشتن یکے و دوچار خودیم ما

اپنی تصنیف کے بارے میں مصنف کچھ اس طرح لکھتے ہیں........

"شخص و عکس" میری تنقیدی فکر اور میری تخلیقات کے رد عمل میں ہونے والے مباحث کی روشنی میں میرا بھی آئینہ ہے اور ان مخصوص چہروں کا بھی جنہوں نے شاید آج تک اپنا عکس نہیں دیکھا"

"پیش لفظ" کا آغاز (آئینہ) کے عنوان سے ہوتا ہے جس میں شاعر نے اسی کتاب میں شامل مضامین اور مباحث پر مختصراً اظہار خیال کیا ہے، اس طرح ہر باب کا آغاز ایک شعر سے ہوتا ہے جو متعلقہ باب کے مشمولات کا آئینہ دار ہے اور باب کے عنوان پر روشنی ڈالتا ہے اس کے لئے شاعر کی نظر انتخاب میر تقی میر، مرزا غالب اور علامہ اقبال کے کلام پر پڑی ہے۔

باب اول میں اردو میں نعتیہ شاعری اور نثری نظم کے علاوہ شاہ بھٹائی ابراہیم جلیس، سرشار صدیقی، کشور ناہید، جیلانی بانو، نثار صہبائی جیسے ہند و پاک کے شعراء اور ادبا کے فن اور شخصیت پر نقد و تبصرہ کے حامل مضامین ملتے ہیں۔ ان میں مصنف نے اکثر چونکا دینے والی باتیں کی ہیں اور ان حقائق کا ذکر کیا ہے جن سے اردو داں طبقہ بہت کم واقف ہے۔

"انہیں (مخدوم) کے سامنے سامنے ادیبوں اور شاعروں کا ایک ایسا قافلہ چلا جس کا ہر فرد اپنی جگہ منفرد مقام رکھتا ہے۔

ابراہیم جلیس اس قافلے میں بحیثیت طنز نگار سب سے قد آور تھے ان کے قلم میں بقول کرشن چندر تلوار کی کاٹ تھی....."

"شاعری کو تاریخ و تہذیب کے متوازی خطوط کے درمیان رکھ کر پڑھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بدلتا ہوا وقت کس طرح شعری روایت کو بھی بدلتا ہے میر کی ہجر نصیبی غالب کے خواب وصال میں کیسے ڈھل گئی اور فراق سے سرشار تک آتے آتے کس طرح اس خواب کی تعبیر ملی۔"

شاعر اور افسانہ نگار کا بڑے دلچسپ انداز میں تقابل کرتے ہوئے جیلانی بانو کے تعلق سے اپنے مضمون میں یوں لکھا ہے۔
"شاعر کی محبوبہ کو لوگ پس چلمن دیکھ کر مطمئن ہوجاتے ہیں لیکن افسانہ نگار اگر اپنی محبوبہ کا کہیں ذکر کردیتا ہے تو لوگ اس کا نام اور پتہ پوچھنا شروع کردیتے ہیں۔"....(ص ۸۵)

"غالب نے بیدل کے اسلوب اور ناسخ کے لفظی سرمائے سے استفادہ کیا اور اقبال نے داغ سے ضمنی تعلق کے باوجود نہ صرف ان کے رنگ میں غزلیں کہیں بلکہ اپنے مزاج کے خلاف اکبر الہ آبادی کے رنگ میں بھی خود کو آزمایا خود ہمارے دور میں ناصر کاظمی اور ابن انشاء کی مثالیں ہیں دونوں کے کلام میں میر اور نظیر صاف جھلکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان سب کی اپنی پہچان بھی ہے۔.....(صف ۱۰۸)

"لیکن ندیم' کا "انسان" سماجی زندگی میں اپنا ایک طبقاتی کردار بھی رکھتا ہے اور یہ ندیم کے دور کا تقاضہ ہے...... اقبال چونکہ فطرت کی جدلیات کو سماج کے طبقاتی رشتوں پر منطبق نہیں کرسکے اور انسان کے سماجی عمل کو اس کے تاریخی ادوار سے نہیں پرکھ سکے بلکہ صرف خیال کی حرکت کو تاریخ سمجھتے رہے اس لئے انہیں یہ غلط فہمی رہی اور انکا انسان' "انسان" ہونے کے بجائے ایک خیالی پیکر بن گیا....." (ص ۱۵۶)

عربی عروض کے موجد خلیل بن احمد نے جو کئی زبانوں کا عالم تھا اپنی اس ایجاد میں نہ صرف یونانی زبان سے فیض حاصل کیا بلکہ سنسکرت زبان سے بھی....." (صف ۱۷۹)

"اس طویل مقالے سے اختلاف صرف دو ایک جگہ کیا جاسکتا ہے ایک تو یہ کہ انہوں نے دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں غزل کو اس قدر اہمیت دیدی کہ صرف غزل ہی کو شاعری سمجھ لیا' دوسری بات نقطہ نظر کے تعلق سے ہے یعنی انہوں نے مختلف ادوار کی آئیڈیالوجی کو طبقاتی رشتوں کی روشنی میں نہیں پرکھا اور ہر اس خیال کی تائید کردی جو کسی نہ کسی عنوان سے انسانی جذبات اور احساس کی ترجمانی کرتا ہے....." (ص ۱۸۹)

"نئی نسل کا یہ ذہین نقاد (خلیل الرحمان اعظمی) اور منفرد شاعر عروض و قوافی کا فن تو کجا الفاظ برتنے کے آداب سے بھی واقف نہیں...." (ص ۲۲۶)

"میرو مصحفی اور مصحفی و حسرت موہانی کو ایک ساتھ پڑھیئے' حافظ فیض اور سودا کے دیوان قریب قریب رکھ کر مطالعہ کیجئے نظیر اکبر آبادی انیس اور خیام و نظیری کے ساتھ جوش کو پڑھیئے نطشے' برگساں' ہیگل' مولانا روی اور امام غزالی کے بعد علامہ اقبال کا مطالعہ کیجئے۔ اور بیدل اور ناسخ کے بعد غالب کو پڑھیئے۔ اسی طرح افسانوی ادب میں چیخوف' موپساں اور اوہنری کے ساتھ سعادت حسن منٹو کا مطالعہ کیجئے میکسم گورکی کے ساتھ کرشن چندر اور کرشن چندر کے ساتھ ابراہیم جلیس اور اے حمید کو پڑھ ڈالئے۔ تنقید میں کاڈویل کے ساتھ ممتاز حسین کو پڑھیئے اور فراق کے بعد حسن عسکری اور بعد ازاں سلیم احمد' سب میں آپ کو خیال اور انداز بیان کا اکتساب نظر آئے گا فکری بازگشت اور الفاظ کی یکسانیت بھی مل جائے گی...." (ص

(۱۴۸

مندرجہ بالا اقتباسات سے حمایت علی شاعر کی ناقدانہ صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اسکے وسیع مطالعے کا بھی پتا چلتا ہے۔

(بودھم پیشہ باہم پیشہ دشمن) کے بمصداق کلبہ ذات کے تاریک گوشوں میں جنم لینے والے تعصبات جو محض پگڑی اچھالنا چاہتے ہیں، سستی شہرت طلبی کے بدترین مظاہر ہیں اور انہیں مظاہر کی زد میں شاعر کی تخلیقات بھی آئی ہیں۔ تزکیہ کے جوابی مضامین و خطوط کی اشاعتی تاریخیں اس بات کی شاہد ہیں کہ اپنے کمال و صلاحیت کا لوہا منوانے کے لئے شاعر کو ایک گونہ عذاب سے گزرنا پڑا اور عرصہ تک مدافعتی جنگ لڑنی پڑی۔

تینوں ابواب کے مضامین، مباحث اور خطوط کی تعداد بالترتیب ۴۱ - ۱۲ - اور ۳۰ ہے اور ان میں خصوصاً پاکستانی اردو ادب کے رجحانات اور شعری مجموعوں پر نقد تبصرے کے علاوہ ادبی شعری مناقشات کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

جملہ مضامین میں ہمیں (تثلیث) یا ثلاثی بے حد پسند آیا اور ہماری نظر میں اس کی بڑی اہمیت ہے، ثلاثی، حمایت علی شاعر کی ایجاد ہے جس کے لکھنے کا خیال انکے ذہن میں ۱۹۶۳ء سے دو تین سال قبل آیا، اس سلسلے میں ان کی پہلی نظم "پتھر" ہے فرماتے ہیں۔

"اچھا، اب (ثلاثی) کی اصل حقیقت کو ظاہر کردوں، اس کی محرک نہ ہائیکو ہے نہ ظہیر کاشمیری کی شکست، زنداں اور نہ اپنے بعد آنے والی کسی "نومشق شاعر" کی کوئی نظم "ثلاثی" کہنے کا خیال میرے ذہن میں "رباعی" سے پیدا ہوا۔

ناقدری ارباب زمانہ کا گلہ کیا
آئینے کی قسمت میں ہے پتھر کے سوا کیا

ثلاثی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں

شاعری

ہر موج بحر میں کئی طوفاں ہیں مشتعل
پھر بھی رواں ہوں ساحل بے نام کی طرف
لفظوں کی کشتیوں میں سجائے متاع دل

پتھر

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

الہام

کوئی تازہ شعر، اے رب جلیل
ذہن کے غار حرا میں کب سے ہے
فکر... محو انتظار جبرئیل

"عکس و عکس" میں ہمیں ادب، شاعری، غزل اور ہیئت کی نہایت جامع تعریف ملتی ہے۔ مختلف مضامین میں آج کے اردو ادب، رسائل اور صوبائی زبانوں کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مثلاً "آج ہمیں ایسے رسائل کی شدید ضرورت ہے جو اپنے کردار میں بلند اور شعوری طور پر زندہ ادب کے علمبردار ہوں اور آج ہمیں اپنے کلچر کو آگے بڑھانے میں اپنی مقامی زبانوں سے ناواقفیت بھی بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے اور اسے دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ادیب اور فنکار ایک دوسرے کے قریب آئیں، ایک دوسرے کو سمجھیں اور ایک دوسرے کی زبان سے فائدہ اٹھائیں۔ (مطبوعہ "کتابی دنیا" بمبئی)

شیخ ایاز (شخص و شاعر)

یوسف ناظم

۱۱۲ صفحے کی ٹائپ میں چھپی ہوئی یہ چھوٹی سی کتاب شیخ ایاز (شخص و شاعر) اتفاقاً" میرے ہاتھ لگی تو ختم ہونے پر بھی میرے ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔ اکبر الہ آبادی کا مرید ہوں اس لئے ٹائپ کا حرف پڑھنے سے کتراتا تو نہیں گھبراتا ضرور ہوں لیکن یہ کتاب تو جیسے جان کو آگئی۔

شیخ ایاز کا نام معلوم نہیں کب اور کہاں سنا تھا۔ کسی نے بتایا تھا سندھی زبان کا موجودہ دور کا سب سے بڑا شاعر شیخ ایاز ہے۔ ادھر ادھر کلام ڈھونڈا نہیں ملا تو پھر کسی سے پوچھنے کو جی نہیں چاہا اور سندھی شاعری کا شوق یوں جاتا رہا کہ چند سال پہلے سندھی کے ایک شاعر کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ دیا گیا تو بعد میں پتہ چلا کہ یہ ایوارڈ تو مال مسروقہ پر دیا گیا ہے۔ ایک ہی رسم الخط کی دو زبانوں کے اتحاد کا یہ واقعہ ذرا گراں گزرا۔ اس لئے نہیں کہ واردات سرقے کی تھی بلکہ اس لئے کہ میں نے اسے ساہتیہ اکاڈمی کے ایوارڈ کے ہائی جیک کی واردات جانا۔ لیکن اب یہ کتاب پڑھی تو سندھی زبان پر رشک آیا کہ کیا شاعر اسے ملا ہے اور یہ شیخ ایاز تو خود اردو کے بھی اچھے اور خوبرو شاعر نکلے۔ خوب رو میں نے اس لئے کہا کہ کیا کیا خوبصورت شعر انہوں نے کہے ہیں۔ حمایت علی شاعر کو میں شاعر کی حیثیت سے جانتا ہی تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ پچھلے سال میں شاعر نے نثرنگاری، تحقیق اور ترجمے کی اتنی ساری منزلیں طے کرلی ہیں کہ سر اٹھا کر اس کی طرف ~~دیکھنا~~ پڑتا ہے۔ اورنگ آباد دکن کے اس شاعر نے حیدر آباد میں نام کمایا۔ لیکن حیدر آباد دکن میں نہیں بلکہ حیدر آباد سندھ میں۔ اس صدی کے چوتھے دہے میں حمایت علی شاعر اورنگ آباد دکن کے ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ تھے۔ اس وقت بھی شاعر تھے لیکن ہونہار۔ اب وہ ایک مستند شاعر ہیں۔ کلام کے تین مجموعے شائع ہوچکے ہیں دو اور زیر طبع ہیں۔ اس پر مستزاد نثر کی یہ کتاب جس کی دہری اہمیت ہے۔ کیونکہ صرف شیخ ایاز کی شاعری کا تعارف نہیں یہ سندھی اور اردو کے لسانی رشتے کی بولتی تصویر بھی ہے۔ اس کا انتساب یوں ہے "اردو سندھی ادیبوں اور شاعروں کے اتحاد کے نام"

آفاق صدیقی، صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج میرپور خاص نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے "حمایت علی شاعر کا یہ مقالہ اپنی تحقیقی و تنقیدی اہمیت کے علاوہ اسلوب تحریر کے اعتبار سے بھی پرکشش ہے" پیش لفظ عام طور پر صحیح رہنمائی نہیں کرتے لیکن اس پیش لفظ کو قطب نما کہا جاسکتا ہے۔

حمایت علی شاعر نے لکھا ہے شیخ ایاز کو سننے کی آرزو ان کے دل میں اس وقت پیدا ہوئی جب ۱۹۴۹ء میں بھمبڑی کانفرنس میں پروفیسر رام پنجوانی کی زبانی انہوں نے شیخ کا شعر سنا تھا۔ شعر وہ سمجھے نہیں تھے لیکن شاعر کی گھن گرج سے شعر کے شعلہ نوا ہونے کی بات پکی تھی۔ حمایت شاعر کی یہ آرزو ۱۹۵۳ء میں پوری ہوئی۔ حمایت علی شاعر کو شاعر سے مصنف اور مترجم بنانے میں ان کی ذاتی قابلیت اور صلاحیت سے زیادہ میں سمجھتا ہوں، شیخ ایاز کی شخصیت اور شاعری کا دخل ہے۔ کتاب کے سرورق

پر شاعری کی شبیہ دیکھ کر پہلے تو میں سمجھا۔ یہ شیخ محمد اقبال کے بھائی کی تصویر ہے۔ حالات زندگی پڑھے تو پتا چلا کہ یہ شاعر تو سرکاری اسٹیٹس (Status) میں اقبال سے بھی آگے نکل گیا۔ اقبال چیف جسٹس نہیں ہو سکے تھے لیکن شیخ ایاز' سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے۔

شیخ ایاز کی شاعری کی عظمت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے کلام کے مترجمین میں الیاس عشقی' آفاق صدیقی' محسن بھوپالی' حمایت علی شاعر اور فہمیدہ ریاض شامل ہیں۔ اس کتاب میں ۹ مترجمین کے ترجمے موجود ہیں اور خود اردو شاعری کے نہایت ہی لطیف نمونے۔ چوں کہ میں کتاب کے بارے میں لکھ رہا ہوں اس لئے شیخ ایاز کی شاعری کے بارے میں حمایت علی شاعر کی رائے نقل کرنی ہوگی۔

"ایاز کی شاعری کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ زندہ لفظوں میں بول رہی ہے۔ کوئی لمحہ کوئی قدر اور کوئی حقیقت وقت کی گرد میں دفن ہو کر فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک ابدی زندگی کے خواب کی طرح اس کے اشعار میں آنکھیں کھولے ہوئے ہے اور ایاز ان کو نئے لفظ اور نئے جسد کے ساتھ اپنے ادب میں آباد کرتا جارہا ہے اور انہیں اپنے عہد کی آگہی دے رہا ہے۔"

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھی کا یہ مقبول اور مستند شاعر' اردو زبان پر بھی کتنا عبور رکھتا ہے اور صرف شعر نہیں کہتا بلکہ سندھی شاعری کو اردو میں منتقل کرنے کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ شیخ ایاز نے شاہ عبداللطیف کے کلام کو اردو لباس عطا کیا جو خود ایک کارنامہ ہے۔

میرا تو اندازہ تھا ہی کہ پاکستان میں بہت عمدہ شاعری ہو رہی ہے لیکن اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اچھی شاعری صرف اردو میں ہی نہیں' سندھی زبان میں بھی ہو رہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اردو شاعری سے بھی زیادہ وقیع ہو۔

لیکن شیخ ایاز سے آپ متاثر کیسے ہوں گے جب تک کہ اس کی سندھی اور اردو شاعری کے دو چار نمونے آپ نہ دیکھ لیں۔ یہ شاعر باغی بھی ہے رومانی بھی' ٹیڑھا بھی ہے اور ناک کی سیدھ میں چلنے والا عاشق بھی۔ دوہے' نظمیں' گیت' غزلیں سب اس کی چٹکیوں میں بند ہے۔ پہلے اردو کلام دیکھئے۔

پھر کوئی سنگ بدست آتا ہے — پھر کوئی فطرت قندیل لئے
خانہ شیشہ گراں کی جانب — صبح کاذب میں دمکنے آیا
پھر کوئی نعرہ مستانہ بڑھا! — پھر کوئی گردن مینا پہ جھکا
لرزش کوئے اماں کی جانب — پھر لب جام کسی نے چومے
پھر کوئی شبنم تخیل لئے — پھر نہاں خانہ اصنام کھلا
چہرہ گل پہ مہکنے آیا — پھر صنم زندہ ہوئے اور جھومے

ایک سندھی دوہا!

پو پھٹتے ہی اوس پڑی ہے کوٹھی کھول کلال
پی لوں' میں بھی جی لوں' تو بھی جیے ہزاروں سال

سندھی نظموں کے نمونے کتنے ہی دیئے جاسکتے ہیں لیکن اگر سارا مال میں ہی دکھادوں تو پھر حمایت علی شاعر کی کتاب شاید آپ پڑھیں ہی نہ۔ اصل محنت تو ان کی ہے۔ حمایت علی شاعر کو مصنف اور مترجم کی حیثیت سے بھی تو جانئے۔

(مطبوعہ "جائزے" دہلی)

شیخ عزیز

پچھلے دنوں جب میں شیخ ایاز کے کلام کے تازہ مجموعہ کا ذکر ان ہی کالموں میں کر رہا تھا تو مجھے شیخ ایاز اس دور سے بالکل مختلف نظر آئے تھے جس کے لئے بعض ناقدین یہ کہتے ہیں کہ اب شیخ ایاز میں صرف ایک سابق وائس چانسلر اور ایک وکیل زندہ رہ گیا ہے۔ شاعر شیخ ایاز کہیں اور جا بسا ہے' ایک جامعہ کے سربراہ کی حیثیت سے بھی شیخ ایاز شاعری کرتے رہے۔ "حلقہ میری زنجیر کا" اسی یونیورسٹی کے عہد کے دوران شائع ہوئی۔ کچھ اشعار منظر عام پر نہیں آئے اور کچھ آئے مگر ان تمام عوامل نے نہ تو شیخ ایاز کی شخصیت کو مقید کیا اور نہ ہی ان کی سوچ کو قربان ہونے دیا ہاں وہ خود ضرور ان رویوں پر مصلوب ہوگئے جو فن کو تحسین و تنقیص کے خانوں میں بانٹنا جانتے ہیں

شیخ ایاز ہمارے ملک کے بہت بڑے شاعر اور انشاء پرداز ہیں۔ وہ ایک ایسی قد آور شخصیت کے مالک ہیں جن کو اگر جغرافیائی حدود اور زبان کی قیود سے نکال کر دیکھا جائے تو وہ پاکستان سے باہر بھی بہت بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ وہ صرف سندھی زبان کی شاعری کی وجہ سے نہیں پہچانے جاتے' ان کا کلام اردو' پنجابی' گجراتی' مراٹھی' ہندی' بنگالی' جرمن' یونانی' انگریزی اور روسی زبانوں میں بھی ہوچکا ہے۔ برصغیر کے چند ہی اہل قلم ایسے ہیں جو مقبولیت و شہرت کی اس منزل تک پہنچ پائے ہیں۔ عصری شعرا میں یہ مرتبہ صرف شیخ ایاز یا فیض کو حاصل ہوا ہے۔

زمانے کی طرح اس دور کی بھی ٹریجڈی یہ ہے کہ شیخ ایاز اپنے ماحول کے نشتر سہتا رہا ہے۔ حقیقت سے نا آشنائی نے ہماری آنکھوں کو ایسا دھندلا دیا ہے کہ ہم اپنے محسنوں کو اپنے ہاتھوں جلا دیتے ہیں اور پھر ان کی راکھ پر عظمت کے مینار سجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گیارہ برس کی عمر سے اب تک شعر کہنے والا شخص ایاز اس رویہ کے کرب برداشت کرتا رہا ہے مشکل یہ ہے کہ جب ان پر فتوے صادر ہو رہے تھے تب بھی ہم خاموش تھے اور جب وہ خاموش ہوجاتے تب بھی ہم چپ رہے۔

ایسے میں حمایت علی شاعر کی کتاب "شیخ ایاز۔ شخص و فن" نہ صرف قابل قدر اضافہ ہے بلکہ اس امر کی جانب اشارہ ہے کہ کم از کم یہ نسل اپنے محسنین کی قدر و منزلت جانتی ہے۔ یہ ایک ایسی صحت مند علامت ہے کہ اس سے زندگی کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

جہاں تک کتاب کے متن کا تعلق ہے وہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائیہ کے طور پر پروفیسر آفاق صدیقی نے ایک تعارف لکھا ہے کہ سکھر کی سرزمین سے ایک طویل وابستگی اور ادب کے ناطے وہ شیخ ایاز کی شخصیت اور فن سے واقف ہیں۔ ان کا یہ تعارف اسی تعلق کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ محترم آفاق صدیقی کو سکھر کے قیام نے اردو کے علاوہ وہاں کے سندھی ادیبوں شاعروں کو سننے اور سمجھنے کا موقع بھی دیا ان کا یہ تعارف اس پس منظر کی نشاندہی کرتا ہے۔

حمایت علی شاعر کے مقالے کا متن ذاتی مشاہدوں اور یادداشتوں پر مشتمل ہے انہوں نے شیخ ایاز کی شاعرانہ صلاحیت اور اس کی غیر شاعرانہ زندگی پر لکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ اس مقالے سے ان کی شخصیت کے تمام خدوخال واضح ہوجائیں اس کوشش میں وہ بہت دیانتدار نظر آتے ہیں اور جا بجا اپنی ملاقاتوں اور مجلسوں اور شعری انتخاب کے ذریعہ اس مقصد سے قریب تر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر بعض مقامات پر مصنف کی سادہ دلی اور عدم معلومات دونوں آپس میں متصادم نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ کہیں کہیں انہوں نے اپنی کتاب کی مرکزی شخصیت کی کتابوں کے نام بھی درست

نہیں لکھے ہیں مثلاً ان کے شعری مجموعے "کی جو ہیڈل پولیو" پنجابی ترجمہ (مترجم احمد سلیم) کا اصل مسودہ "ریتی کوٹ جو ڈاڑین" بتایا گیا ہے۔ صفحہ (۵۴) جبکہ اسی متن کے پہلے حصے میں صحیح متن بتایا گیا ہے (صفحہ ۳۶) اسی طرح سندھی شاعری کی روایتی "صنف گاہ" کو بھی اس کے حقیقی پس منظر میں لکھا جاتا تو اس کے ضمن میں آنے والا ذکر زیادہ منظر ہوجاتا۔

شیخ ایاز، سندھ اور سندھی زبان ایک ہی مثلث ہیں۔ ان کی شاعری کے ضمن میں ون یونٹ کی تشکیل، سندھی زبان کا مدارس سے اخراج اور جرائد و کتب پر پابندیوں کا ذکر نہ کرنا ممکن نہیں۔ گویا اس ذکر کے بغیر شیخ ایاز کی شخصیت مکمل نہیں ہوسکتی۔ وہ ان شعراء اور ادیبوں میں سرفہرست تھے جنہوں نے ان غیر فطری احکام کے خلاف آواز بلند کی تھی اس کے نتیجے میں کئی ادیبوں اور شعراء کو طرح طرح کی اذیتوں کا شکار ہونا پڑا۔ مصنف نے شیخ ایاز کے اس پہلو کا ذکر کیا تو ہے مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ حقیقت پسند ہو کر ان اقدامات کا ذکر بھی کرتے جو سندھی زبان کے ادیبوں کے علاوہ کسی اور حلقے نے حکومت کی یکطرفہ اور ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف صدائے احتجاج کے طور پر کئے ہوں۔

مصنف یہ تو کہتے ہیں کہ رائٹرز گلڈ بھی جو پاکستان کی تمام زبانوں کے ادب کی نمائندگی کا اعزاز حاصل کئے ہوئے تھی، کوئی جرأت مندانہ قدم نہ اٹھا سکی۔ صفحہ (۳۵) مگر یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے خود ذاتی طور پر اپنے حلقہ کی جانب سے کیا کیا یا اس ظلم کی نفی کرنے کے لئے کیا شعوری کوشش کی۔ اس ضمن میں جس باشعور ادیب کا ذکر وہ کرتے ہیں اگر اس کا ساتھ ہوتا تو نہ کہ سیاسی حکمت عملی کام کرتی اور نہ ہی انہیں نئی نسل میں وہ بدگمانی نظر آتی جس کا ذکر انہوں نے الزام کے ساتھ کیا ہے۔

اگر شیخ ایاز کی شعری خوبیاں خامیاں اس وقت نظر آنے لگیں جب وہ کسی بڑے منصب پر فائز ہو تو وہ بھی سیاسی حکمت عملی متصور ہوگی اور اگر اس کے بعد تو مصلحت کوشی کہلائے گی۔ کاش ہم ایسے رویئے سے کنارہ کریں۔

زیر نظر کتاب کے تیسرے حصے میں شیخ ایاز کے اردو کلام کا انتخاب ہے جبکہ چوتھے حصہ میں ان کے سندھی کلام کا اردو میں ترجمہ ہے۔ یہ ترجمے الیاس عشقی آفاق صدیقی، حسن حمیدی، محسن بھوپالی، تمید ریاض پیکر واسطی شریف کمال عثمانی قاصد عزیز اور حمایت علی شاعر نے کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر ترجمے کی اچھائی برائی اس کے مترجم کی ذاتی حکمت اور اصل کلام کے پس منظر میں واقفیت پر مبنی ہوتی ہے۔ شیخ ایاز کے کلام کے ترجمہ کے لئے تو سندھ کے پورے معاشی اور سماجی پس منظر، تاریخ اور سیاسی عوامل کے مطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود شیخ ایاز کو بحیثیت شاعر جاننا ضروری ہے اس لئے ان تراجم میں یہ فرق موجود ہے بہرحال اس سے ان کی شاعرانہ خوبیوں سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

خاکہ نگاری جس قدر دلچسپ صنف ہے۔ اسی قدر مشکل بھی ہے۔ اس کے لئے قواعد و ضوابط اسی لحاظ سے ٹھوس ہیں بار بار نہیں بدلتے اور نہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کہیں اس کا اطلاق ہو اور کہیں نہیں۔ حمایت علی شاعر نے اس حق کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کم از کم یہ احساس ضرور دلایا ہے کہ کسی اچھے فنکار کے اعتراف کے لئے مرحوم ہونا ضروری نہیں۔ اسے زندگی میں بھی تسلیم کیا جانا بھی نیکی ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ "حریت" کراچی ۱۴ اگست ۸۳ء)

ل (اگر ایاز کی خوبیاں نظر میں نہ ہوتیں تو انہیں "شعور" کی مجلس ادارت میں شامل نہ کیا جاتا کاش تبصرہ نگار واقف ہوتے۔
(مرتب)

Flower in Flames

(بنگال سے کوریا تک)

مترجم۔ راجندر سنگھ ورما (پٹیالہ، انڈیا)

یوسف ناظم

مشکل یہ ہے کہ مجھ سے کوئی پوچھتا نہیں، لیکن اگر کوئی شخص مجھ سے یہ سوال کرے کہ ادب میں سب سے اونچا درجہ کس صنف ادب کو حاصل ہے تو میں شاعری، افسانہ، ناول، تنقید، طنز و مزاح ان سب کو نظرانداز کر کے عرض کروں گا کہ ترجمہ ان سب سے آگے ہے۔ ترجمہ میرے نزدیک دو زبانوں کے درمیان رشتہ مناکحت قائم کرتا ہے اور اگر یہ دو زبانیں مختلف قوموں کی ہوں یا دو مختلف ملکوں میں بولی جاتی ہوں تو ترجمہ ان قوموں اور ملکوں میں جذبہ خیرسگالی پیدا کرتا ہے۔ میری تو رائے ہے کہ ترجموں کے لئے بھی ایک ورلڈ کپ ہونا چاہئے۔

یوں تو اردو زبان بجائے خود اپنے ہی ادبی سرمایہ کی بناء پر کافی دولت مند ہے لیکن دوسری زبانوں کا ادب عالیہ بھی اس میں ترجمے کی مدد سے منتقل ہو چکا ہے۔ خود ہندوستان میں اتنی زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں کہ اگر انہی زبانوں کے تراجم اردو میں منتقل کئے جاتے تو اردو میں اوریجنل تخلیقات کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ ہندوستانی زبانوں میں بنگالی، آسامی، تامل، ملیالم اور سنسکرت کے بیسیوں ترجمے اردو میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی، عربی، انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کے تراجم بھی اردو میں کئے جا چکے ہیں لیکن اردو زبان کا سرمایہ دوسری زبانوں میں کم ہی منتقل ہوا ہے اور خاص طور پر اس صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے کی تخلیقات تو بہت ہی کم دوسری زبانوں میں منتقل ہوئی ہیں۔

حمایت علی شاعر گو اپنی عمر کی نصف صدی مکمل کر چکے ہیں۔ لیکن میں تو انہیں نوجوان ہی شاعر کہوں گا کیونکہ یہ کوئی ایسی بڑی عمر نہیں اور ان سے بہت زیادہ سینئر شاعروں کی موجودگی میں انہیں نوجوان شاعر ہی سمجھا جائے گا خواہ وہ صف اول ہی کے شاعر کیوں ہی نہ ہوں۔ اورنگ آباد دکن کے اس شاعر کی ادبی صلاحیتیں ، پاکستان کی فضا میں پروان چڑھیں لیکن اس شاعر کو انگریزی زبان میں کسی نے متعارف کروایا تو وہ ہندوستانی نژاد راجندر سنگھ ورما ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے انگریزی کے پروفیسر

حمایت علی شاعر کی طویل نظم جو ایک مکمل تصنیف اور کتاب کی حیثیت رکھتی ہے "بنگال سے کوریا تک" اردو کی ان چند نظموں میں سے ایک ہے جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ ان کی نوجوانی کے زمانے کی تخلیق ہے۔ اسی لئے اس نظم میں جذبے کی شدت اپنے نقطہ کمال پر ہے لیکن اس وقت میرا موضوع نظم نہیں نظم کا ترجمہ ہے۔ پروفیسر راجندر سنگھ ورما ہندی اور اردو ادب کے سب سے بڑے اسمگلر ہیں۔ انہوں نے جیسا کہ محمد علی صدیقی نے کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔

ہندی، اور اردو ادب کے انگریزی مترجم کی حیثیت سے بڑا نام کمایا ہے۔۔ ایک زبان کی شاعری کا دوسری زبان میں نثر میں یا آزاد ترجمہ کرنا بھی کوئی معمولی کام نہیں لیکن منظوم ترجمہ تو کام نہیں کارنامہ ہے پچاس صفحوں پر پھیلی ہوئی نظم کا یہ منظوم ترجمہ جو "فلاور ان فلیمس" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے' اردو کا ایک حسین و جمیل تحفہ ہے جو انگریزی داں حضرات کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ اصل نظم کے ساتھ سطر بہ سطر شائع ہوا ہے اس لئے اس کے محاسن فوری طور پر آپ کی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر پروفیسر ورما کو عبور حاصل ہے۔ یہ ترجمہ اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ یہ اس غلط فہمی کو بھی دور کرتا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔

پروفیسر ورما نے اپنے ترجمے میں ایک لفظ ادھر ادھر نہیں کیا ہے۔ کہیں تو آزادی کی سانس لیتے لیکن نہیں' انہوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر باندھے رکھا اور اپنے ترجمے سے یہ ثابت کیا کہ اگر محنت کی جائے اور ذخیرہ الفاظ کے ساتھ ساتھ جودت طبع مترجم کا ساتھ دے تو کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب۔ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی۔ انہوں نے یہ چوٹی سر کرلی۔۔ کتاب کھولئے تو آپ کی نظروں کے سامنے اردو نظم اور انگریزی ترجمہ دونوں موجود ہیں۔ اگر کوئی ایسی عینک ایجاد ہوئی ہوتی تو ہم ایک آنکھ سے ایک صفحہ اور دوسری آنکھ سے دوسرا صفحہ پڑھ سکتے تو میں آپ کو اسی عینک کی مدد سے اس ترجمے کو پڑھنے کا مشورہ دیتا۔ لیکن اب بھی آپ سطر بہ سطر مقابلہ کرکے نظم اور ترجمہ پڑھیں تو آپ کے دل میں شاید یہ احساس بھی پیدا ہو کہ نظم راجندر سنگھ ورما کی ہے اور ترجمہ حمایت علی شاعر کا۔۔ مجھے تو پروفیسر ورما مترجم نہیں' جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔۔ پہلے سوچا تھا کہ شاعر کو اس کامیاب نظم پر مبارکباد دوں گا لیکن اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اصل مبارکباد کے مستحق راجندر سنگھ ورما ہیں۔

(مطبوعہ ہفتہ وار "بلٹز" بمبئی' مورخہ ۳۰ ستمبر ۸۶ء)

بنگال سے کوریا تک

(ایک افسانوی نظم۔ ایک تجزیہ)

محمد نقی

جنگ کی تباہ کاریوں' بربادیوں اور ویرانیوں پر ہر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ شاعر نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔ سبھی دانشور ماضی میں لڑی گئی جنگوں کے مطالعے اور مشاہدے سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جنگ موت کی علامت ہے اور اس سے ہر عقل مند اور ہر بے وقوف شخص کو گریز کرنا چاہئے۔ لیکن افسوس کہ گزشتہ دو عالمی جنگیں' عقل مند سیاستدانوں نے اپنے وقار و ہوس کی خاطر لڑیں۔ اس سے بھی زیادہ آہ و فغاں کا مقام یہ کہ جنگوں میں ایندھن کے طور پر کروڑوں معصوم اور بے قصور انسانوں کا لہو استعمال کیا گیا۔ چنانچہ "بنگال سے کوریا تک" اپنی ایک افسانوی نظم میں حمایت علی شاعر نے بھی جنگ کی ہولناکیوں' تباہ کاریوں اور خصوصاً" انسانی ارتقائی سفر کے منجمد ہونے اور تیسری عالمی جنگ کے اندیشہ کی طرف اشارہ کیا ہے

''اور آج نئی عالمگیر جنگ کا ہولناک اندیشہ دنیا کے ہر انسان کے دل میں ایک سوالیہ علامت بن گیا ہے۔ کیا ہماری نئی نسل بھی جنگ کا ایندھن بن جائے گی؟'' ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۴ء کے درمیان لکھی گئی یہ نظم 'یادوں کے غبار میں' ایک مسرت ایک موت' غم حاصل' وداع' جنگ کے میدان میں' آگ میں پھول' جب شعلے بجھ گئے' اپنا وطن' اپنا گھر' حاصل غم' دوسری زندگی اور دوسری مسرت جیسے ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ پوری نظم میں FLASK BACK کی تیکنیک کو برتا گیا ہے۔ اس لئے ہر ذیلی عنوان کے تحت لکھے گئے اشعار کے ابتدائی اشعار میں واقعات ماضی کے جھروکوں سے حال کے صحن میں اترتے ہیں۔

''یادوں کے غبار میں'' شاعر نے اپنے وطن کا دھندلا سا خاکہ پیش کیا ہے اور اپنی جوانی کے دنوں کی یاد تازہ کی ہے ''ایک مسرت ایک موت'' میں اپنی شادی اور غربت کا خوبصورت بیان درج ذیل شعر میں کیا ہے

اک اندھیری اجاڑ کٹیا میں
کہکشاں کی برات اتر آئی

''غم حاصل'' میں اپنی لاچاری' مجبوری و فکری غلامی اور ضمیر کی محکومیت کا تذکرہ یوں کیا ہے

میں کہ میرا ضمیر بھی محکوم
میرا احساس میری فکر غلام

''وداع'' میں نظم کا ہیرو جنگ پر جانے سے قبل اپنے افراد خاندان سے جدا ہوتے ہوئے مغموم ہوجاتا ہے اور انہیں خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر میدان جنگ میں کود پڑتا ہے۔ ''جنگ کے میدان میں'' خون اور آگ میں لپٹی ہوئی لاشوں کے انبار اور ان سے اٹھتے ہوئے تعفن کا بیان اس طرح کیا گیا ہے کہ میدان جنگ کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔

دراصل یہ نظم ایک کہانی ہے جس کا سفر بنگال سے شروع ہوکر دور میدان جنگ سے ہوتا ہوا پھر بنگال میں ختم ہوجاتا ہے۔ موضوع نیا نہ ہونے کے باوجود بھی قاری کے لئے اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے۔ نظم میں غزل کی سی ملائمت کا شامل ہوجانا ایک لطف دیتا ہے۔ دوسرا اہم پہلو یہ کہ شاعر نے دو مختلف تباہ شدہ خطہ ارض کی انسانی زندگی کا پرسوز انداز میں خاکہ کھینچا ہے۔ ایک وہ خطہ ارض ہے جو دوسری عالمگیر جنگ کے پنجوں سے خون آلود ہے اور دوسرا وہ ہے جو ہوس اور مفاد پرست انسانوں کے پیدا کردہ قحط کی لپیٹ میں ہے۔ جبکہ قحط' طوفان' سیلاب یا زلزلے قدرتی آفات کے زمرے میں آتے ہیں۔ لیکن بڑی عجیب بات تھی کہ ۱۹۴۲ء میں بنگال کا قحط مفاد پرست سرمایہ داروں کی دین تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ (جو ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء جاری رہی) کے باعث ساری دنیا کا معاشی' سیاسی اور تہذیبی نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ اشیاء ماتحیاج کی قلت نے ذخیرہ اندوزوں کو لوٹ' کھسوٹ کا ایک سنہری موقع فراہم کردیا تھا۔ اشیاء بازاروں سے غائب ہوچکی تھیں۔ نرخ آسمانوں کو چھونے لگے تھے۔ سرمایہ دار ذخیرہ اندوز ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی حتی الامکان کوشش کر رہے تھے۔ نتیجتاً'' اناج کی اچھی خاصی فصلوں کے باوجود انسان بھوک کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہے تھے۔ اور ادھر اناج اور ضروری اشیاء سے تاجروں کے گودام بھرے پڑے تھے

کھیت کے کھیت تھے کھروں میں دفن
اور بھوک خدائی ساری تھی
دیوتا کعبہ کوئی دنیا ہو
ہر طرف زر کی شہر یاری تھی

کہانی کا ہیرو جنگ سے اپنے وطن بنگال لوٹتا ہے تو اسے اپنے وطن کے بھیانک مناظر کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ روٹی کے لئے ماؤں کی آبرو، بہنوں کی عزت اور سہاگنوں کی مانگوں کا سیندور لٹ رہا تھا۔ زندہ لاشوں کے چہرے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے مہیب بادلوں نے تمام فضا کو غم آلود کردیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے قبرستان کی لاشیں زمین کے اوپر نکل آئی ہیں

میرے ٹیگور کی زمیں پہ آج
لاشوں، ڈھانچوں کا بس گیا تھا جہاں
اس قدر تا کریہہ ہر منظر
جیسے نئے کرچکا ہو قبرستان

خود حمایت علی شاعر نے لکھا ہے "دراصل بنگال کے قحط کا جنگ سے تعلق میرا بنیادی موضوع ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بنگال کا قحط قدرتی نہیں بلکہ مصنوعی تھا اور اس کا عالمگیر جنگ کی تباہ کاریوں سے ایک تعلق ضرور تھا"

جن کی فصلوں سے قحط پھوٹ پڑا
ایسی شاداب کھیتیوں کا دیار

"فصلوں سے قحط کا پھوٹ پڑنا" سے ۱۹۴۳ء کے قحط زدہ بنگال کے مصنوعی پن کا پتہ چلتا ہے

کس سے پوچھوں کہ کیوں تباہ ہوا؟
جنگ سے دور رہ کے یہ گاؤں

"یادوں کے غبار میں" شاعر نے اپنی جوانی کے خوشگوار دنوں کی کیفیات یوں بیان کی ہے کہ انہیں پڑھ کر جوانی انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔

نوجوانی کہ موج طوفاں جوش
نوجوانی کہ آندھیوں کا خروش
پتھروں کے رگوں میں کھولتی آگ
زندگی کے لہو کا نقطہ جوش
ایک فرزانگی، جنوں کی سی
ایک دیوانگی، بقید ہوش

ایک راحت نواز بے چینی
ایک سکوں، اضطراب در آغوش
ایک خاموشی، اپنے شور میں گم
ایک غوغا مگر بہت خاموش
کس قدر تھے حسین وہ دن رات
کتنا دل کش تھا زندگی کا روپ

لیکن جوانی کا یہ تموج میدان جنگ میں اپنے ہی بھائیوں کے سفینہ حیات کو ڈبونے کے لئے استعمال کیا گیا اور اس کام کے بدلے کیا ملا۔ چند سکے چنانچہ حاصل غم کا ماتم شاعر کا مقدر بن گیا

چند سکوں میں بیچ کر خود کو
زندگی، آج تو کدھر آئی؟
سوچتا تھا کہ میری غربت نے
اپنا سب کچھ لٹا کے کیا پایا
ایک خوشحال زندگی کے لئے
جنگ کے کام آ کے کیا پایا

لڑائی کے دوران لاشوں کے پہاڑ اور انسانی تہذیب و ثقافت کے مٹتے ہوئے نقوش کے ولدوز مناظر دیکھ کر ہیرو کا دل دہل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے لفظ "جنگ" سے نفرت ہو جاتی ہے اور خاتمہ جنگ کے بعد جب وہ اپنے وطن واپس لوٹتا ہے تو بے شمار آرزوئیں اور مسرتیں دل میں موجزن ہوتی ہیں لیکن جیسے ہی وہ اپنے گھر میں قدم رکھتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے جیسے اس کی خواہشوں اور تمناؤں کے حسین محل پر جیٹ بمبار طیاروں سے بموں کی بارش ہونے لگی ہے اور لحہ بھر میں یہ محل دھوئیں کی لکیروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا گھر اور خاندان تباہ ہو چکا ہوتا ہے۔ صرف ایک ننھی بچی اس کے سہارے کے لئے بچی رہتی ہے۔ ننھی بچی سے بے پناہ محبت و الفت اور اس کے مستقبل کا خیال ہیرو کو زندہ رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

کیسے کیسے نہ خوں کے طوفاں میں
زندگی ڈوب کر ابھر آئی
ایک بچی کے واسطے یہ لاش
ہر کڑے دور سے گزر آئی

ان اشعار میں شاعر کا داخلی کرب سمٹ آیا ہے۔ شاعر نے بھی اپنی زندگی کا بڑا حصہ آلام، پریشانیوں، اور تلاش روزگار کی صعوبتوں میں گزارا لیکن زندگی کے کسی بھی مشکل موڑ پر ہمت نہیں ہاری اور حالات سے برابر نبرد آزما رہے۔ کبھی ایسا بھی وقت آن پڑا کہ شاعر کو اپنے پیٹ کے ایندھن کی خاطر اخبار بھی فروخت کرنا پڑا۔ آخر میں ہیرو پر جنگ کی ہیبت اور خوف اس طرح طاری ہو جاتی ہے کہ اس کو شہنائیوں میں بھی بگل سنائی دیتا ہے۔ پھول کے سینے میں سوئی پیوست ہو جاتے سے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے

کانپ جاتا ہوں جب کوئی عورت
سوئی میں کوئی گل پروتی ہے
مجھ کو شہنائیوں میں بھی محسوس
اک صدائے بگل سی ہوتی ہے

چھاؤں کی نرم حدت، ایک دیوانگی بقید حیات، اک سکوں اضطراب در آغوش اور ایک غوغا مگر بہت خاموش جیسی

کیفیات شاعر کی جدت پسندی اور گہرے تفکر کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ نظم میں "زندگی اور موت" اور "صبح و شام" کا کثرت سے استعمال کھٹکتا ہے۔ جس سے اکتاہٹ جنم لیتی ہے۔

انسانی آلام کا شدید احساس شاید اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ خود شاعر نے چند دہائیوں تک بڑی کربناک اور پریشان کن زندگی گزاری ہے۔ اس لئے متعدد اشعار میں جذبات کی شدت اور احساس کی حدت پائی جاتی ہے۔ تیسری عالمگیر جنگ سے گریز کی تلقین۔ نظم کے کسی بھی مصرعے میں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی نظم میں ہر جگہ موجود ہے۔ ترقی پسند شاعروں کی طرح شاعر نے کسی خاص مقصد کے حصول یا پند و نصیحت کی خاطر نظم نہیں کہی ہے۔ بلکہ ایک ناقابل فراموش حقیقت کو اپنے خاص "VISION" کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بنگال سے کوریا تک

(اشاعتی حوالے)

۱۔ برگِ گل

(اردو کالج کا جریدہ) شمارہ نمبر ۱۔ مرتبہ۔ ابن انشاء اور افضل الرحمٰن ممتاز

(یہ شمارہ تعلیمی سال ۵۳–۱۹۵۲ء میں مرتب ہوا اور مارچ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ اس رسالے میں مذکورہ نظم کا دوسرا حصہ "تصور" کے عنوان سے چھپا تھا)

۲۔ مشرب

مدیر۔ اختر انصاری اکبر آبادی۔ شمارہ نمبر ۱ جلد نمبر ۱ مئی ۱۹۵۳ء

(اس شمارے میں مذکورہ نظم کا پانچواں اور چھٹا حصہ "موت اور زندگی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ آخر میں "بنگال سے کوریا تک" کا حوالہ بھی موجود ہے)

۳۔ روحِ ادب

مدیر۔ پروفیسر ممتاز حسین۔ شمارہ نمبر ۱۷، ۱۹۵۳ء

(یہ رسالہ ایک ادبی ڈائجسٹ تھا۔ ممتاز صاحب نے "مشرب" سے میری نظم منتخب کی اور شائع فرمایا)

۴۔ سیارہ

مدیر۔ پروفیسر ممتاز حسین۔ جلد نمبر ۱۔ شمارہ نمبر ۸ ستمبر ۱۹۵۳ء

(اس رسالے میں نظم کا آٹھواں حصہ "دکھیوں کی بستی میں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ شروع میں "بنگال سے کوریا تک" کا حوالہ بھی دیا گیا ہے)

۵۔ شاہراہ (دہلی)

جلد نمبر ۶۔ شمارہ نمبر ۳-۱۔ بسلسلہ سالنامہ)

مارچ ۱۹۵۴ء اس شمارے میں نظم کے دس حصے شائع ہوئے تھے اور ابتدا میں بنگال اور کوریا کی علامتی حیثیت کے بارے میں

ایک نوٹ بھی دیا گیا تھا (ملاحظہ "عکس" صفحہ ۳۶۶) "شخص و عکس"

۶۔ نیا دور (کراچی) شمارہ نمبر ۳۔۴

(اس شمارے میں کچھ حصے "طلوع و غروب" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے)

۷۔ سحر (کراچی)

ایڈیٹر۔ محمد فائق۔ عرفان حامد، جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱ جون ۱۹۵۶ء

(اس شمارے میں نظم کا چوتھا حصہ "وداع" کے عنوان سے شائع ہوا تھا)

۸۔ آگ میں پھول

مجموعہ کلام۔ حمایت علی شاعر۔ طبع اول ۱۹۵۶ء (پوری نظم)

۹۔ حیدر آباد کے شاعر

(جلد دوم) مرتبہ۔ سلیمان اریب۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی حیدر آباد (دکن) مارچ ۱۹۶۲ء (پوری نظم)

○

"بنگال سے کوریا تک"

(عالمی موضوع پر لکھی ہوئی طویل افسانوی نظم کے مختلف لسانی روپ)

۱۔ Flower in Flames (ترجمہ) پروفیسر راجندر سنگھ ورما پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ۔ (انڈیا)

۲۔ Flute and Bugle (ترجمہ) پرکاش چندر ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا، لکھنؤ۔ (انڈیا)

۳۔ گل باہ مہ (سندھی ترجمہ) ام۔ ای۔ عالمانی، حیدر آباد۔ سندھ

۴۔ بنگال سے کوریا تک (ہندی) پروفیسر جی۔ این۔ نداف ابوالکلام آزاد کالج۔ اورنگ آباد۔ (انڈیا)

۵۔ (تلگو) ڈاکٹر دوسرتی۔ حیدر آباد دکن (آندھرا پردیش)

Bengal-se-Korea Tak narrative poem by Himayat Ali Shair cast into a monologue and Presented on the Sind University stage during the Pak-American Cultural Festival on Nov. 13, 1959. Also broadcast from <Voice of America>

(<ارژنگ> کے سوونیر سے اقتباس مطبوعہ مارچ ۷۰ء)

وہ گل کسی بہار کا احسان کیوں اٹھائے
جس کو ملی ہے زخم جگر کی شگفتگی

مسلم کمرشل بینک

CAPITAL
GROWTH

FIXED DEPOSIT SCHEME

آپ کی رقم تقریباً ڈگنی

صرف پانچ سال میں

مسلم کمرشل بینک کی کیپٹل گروتھ سرٹیفکیٹ اسکیم میں صرف پانچ سال کی قلیل مدت میں آپ کی جمع شدہ رقم تقریباً ڈگنی اور نہ کسی قسم کا خدشہ، آپ بھی مطمئن اور آپ کا سرمایہ بھی محفوظ۔

- اس اسکیم میں سرمایہ کاری کی مالیت، کم سے کم ١٠ ہزار روپے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔
- "ایم سی بی کیپٹل گروتھ سرٹیفکیٹ اسکیم" میں سرمایہ کاری کی مدت پانچ سال ہے، جو کہ مدت پوری ہونے کے بعد بھی جاری رکھی جا سکتی ہے۔

MCB

مسلم کمرشل بینک

اچھی بینکاری بہترین بینکاری

مزید تفصیلات کے لیے ایم سی بی کی کسی بھی قریب ترین شاخ سے رجوع فرمائیں

The Circuit

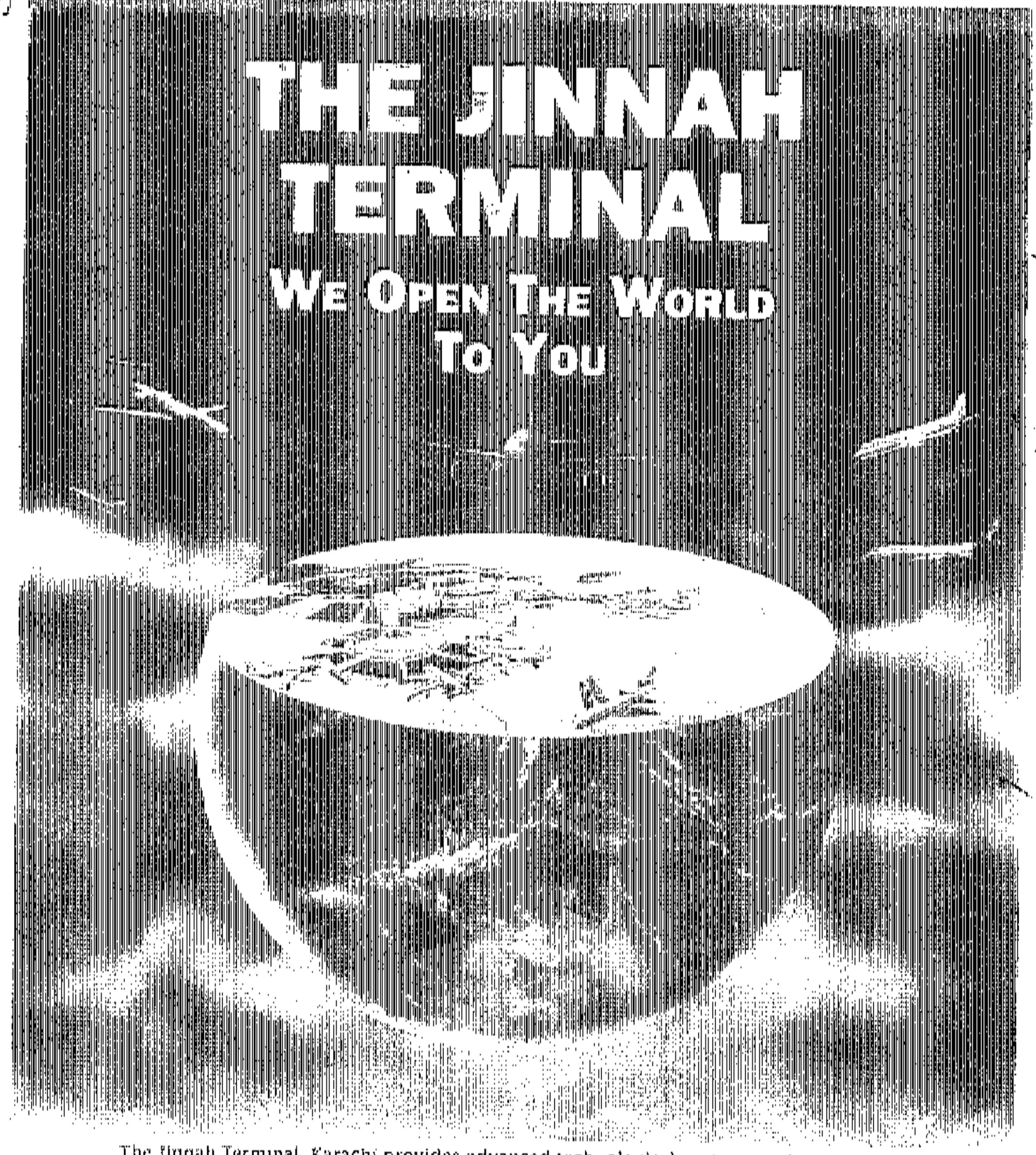

The Jinnah Terminal, Karachi provides advanced technological systems and equipment.

- Two satellites with 12 passenger loading bridges
- Aircraft apron facility of approximately 266,000 sq. metres
- Fuel hydrant system for direct aircraft refuelling.
- Advanced telecommunications systems
- Automated baggage handling system
- Utility building and connecting underground service tunnel
- Passenger carrying facilities such as escalators and elevators
- Handling of domestic and International passengers under one roof
- Convenient inter-aircraft passenger transfer.
- Computerised check-in
- Terminal level pick up and drop
- Split level passenger arrival and departure areas.
- Provision of snack bars and restaurants
- Duty free shopping complex
- Parking space for 2000 cars
- Capacity for parking 12 aircraft simultaneously
- Electrical, H V A C and mechanical systems.
- Aesthetically designed building geared to ensure smooth passenger flow and absorb growing passenger traffic

CAA CIVIL AVIATION AUTHORITY
PAKISTAN

HAWK KHI

انتخاب کلام

ثلاثیاں

نکہت بریلوی

الہام

کوئی تازہ شعر اے ربِ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر..... محوِ انتظارِ جبرئیل

اسلوب

کس طرح تراش کر سجائیں
نادیدہ خیال کے بدن پر
لفظوں کی سلی ہوئی قبائیں

حسنِ تحریر

یہ عظمتِ قلم کی اک ادنیٰ دلیل ہے
لبِ بستگی کو حرفِ سخن یوں عطا ہوا
پتھر ہی راستے کا سہی، سنگِ میل ہے

علم

مرنا ہے تو دنیا میں تماشا کوئی کر جا
جینا ہے تو اس گوشۂ تنہائی میں اے دل
معنی کی طرح لفظ کے سینے میں اتر جا

یقین

دشوار تو ضرور ہے یہ سہل تو نہیں
ہم پر بھی کھل ہی جائیں گے اسرار شہرِ علم
ہم ابنِ جہل ہی سہی، بوجہل تو نہیں

خود فریبی

الفاظ کے طواف میں اربابِ قلم ہیں
لیکن یہ بات اہلِ مدارس سے کیا کہیں
یہ علم تو نہیں، فقط آدابِ علم ہے

انکشاف

عالم تھے، با کمال تھے، اہلِ کتاب تھے
آنکھیں کھلیں تو اپنی حقیقت بھی کھل گئی
الفاظ کے لحاف میں ہم محوِ خواب تھے

مابعد الطبیعیات

حرف و رنگ و صوت سب اظہار کے آداب ہیں
ماورائے ذہن ہر تمثیل، ہر کردار میں
آدمی کی آرزو ہے، آدمی کے خواب ہیں

اساس

کب ہوا کی کوئی تحریر نظر میں آئی
گر زمیں ہو، تو ہر اک بیج میں امکان شجر
بے زمیں ہو، تو ہر اک نقش نمو ہے... کائی

دسترس

کس نے کمند پھینکی ہے روح الامین پر
میں سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا ... قریب ہی
بادل کا سایہ رینگ رہا تھا، زمین پر

زندگی

دھوپ کے پیچھے سایہ بھاگے، دن کے پیچھے رات
آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں ثابت اور سیار
سب کی ایک تمنا لیکن نہ کوئی نہ آئے ہاتھ

شاعری

شاعری ہے شعور کا پر تو
چاند میں جیسے آفتاب کا عکس
برق میں جیسے آبشار کی ضو

جدلیات

مخلوق بھی حیات کا خلاق بھی ہوں میں
میرے تضاد سے ہے عبارت مرا وجود
گر زہر ہوں تو زہر کا تریاق بھی ہوں میں

تناسخ

اگرچہ قبر میں شب کی، اتر گیا خورشید
زمیں اجالے سے پھر بھی نہ ہو سکی محروم
مہ و نجوم کی صورت ابھر گیا خورشید

زاویہ نگاہ

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

ارتقاء

یہ اوج بے فراز ہے آوارہ بادلو
کونپل نے سر اٹھا کے بڑے فخر سے کہا
پاؤں زمیں میں گاڑ کے سوئے فلک چلو

ارتفاع

اپنی زمیں کا حسن تھا اپنی نظر سے دور
دنیا کو ماہتاب سے دیکھا تو یہ کھلا
ہم ہوں اگر بلند تو یہ خاک بھی ہے نور

انتباہ

مغرور ہوا سے کہو یہ بات نہ بھولے
جم جائیں تو بن جاتے ہیں اک کوہ گراں بھی
ویرانوں میں اڑتے ہوئے آوارہ بگولے

شماتت

دن بھر اپنی آگ میں جل کر جب سورج بجھ جاتا ہے
دھرتی اندھیارے میں چھپ کر کیا کیا سوگ مناتی ہے
چاند ستاروں کے جھرمٹ میں کیا کیا موج اڑاتا ہے

المیہ

مجھ کو محسوس ہو رہا ہے یوں
اپنی صورت میں ہوں نہ دنیا میں
زنگ آلود آئینے میں ہوں

ایک سوال

تخلیق ہوں شعور کی، یا لاشعور کی
میری طرح جہاں میں کوئی دوسرا نہیں
یہ عجز کی ہے بات کہ فن پر عبور کی

تعلق

کچھ بھی نہیں ہے فرق سفید و سیاہ میں
پھوٹی ہے جب بھی کوئی کرن رات ہو کہ دن
سائے نکل پڑے ہیں، اجالے کی چاہ میں

خوش فہمی

خوش ہے سورج کہ کٹ گئی رات
کاش یہ بھی اسے خبر ہوتی
سائے سائے میں بٹ گئی ہے رات

دانشور

ہم کہ روشن ظلمتوں میں شمع کی صورت ہوئے
خوش قدوں کے درمیاں پگھلے خود اپنی آگ میں
اور ہم ہی انجمن میں سب سے کم قامت ہوئے

غالب کی "طرح"

اب تو ہر چہرے میں تو ہی نظر آتا ہے مجھے
اس قدر "دوست گزیدہ" ہوں میں (غالب کی طرح)
"سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے"

ابن الوقت

سورج تھا سر بلند تو محو نیاز تھے
سورج ڈھلا تو دل کی سیاہی تھی دیدنی
کوتاہ قامتوں کے بھی سائے دراز تھے

کرسی

جنگل کا خونخوار درندہ کل تھا مرا ہمسایہ
اپنی جان بچانے میں جنگل سے شہر میں آیا
شہر میں بھی ہے میرے خون کا پیاسا اک چوپایہ

مردم گزیدہ

شمع روشن ہو تو پھر سایہ ڈراتا ہے مجھے
آئینہ دیکھتے ڈرتا ہوں میں (غالب کی طرح)
اب تو ہر دوست بھی، دشمن نظر آتا ہے مجھے

دوسرا رخ

سورج کا یہ انداز گواہی تو نہیں ہے
آئینہ دکھاتا ہے اجالا مجھے پیہم
سایہ مرے اندر کی سیاہی تو نہیں ہے

ہم سفر

شاید اک دوسرے سے جلتے ہیں
ایک منزل کے راہرو ہیں مگر
کب مہ و مہر ساتھ چلتے ہیں

شرط

شب کو سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

لنڈا بازار

مردہ انسانوں کے زندہ پیرہن
زیب تن کر تو لئے ہم نے مگر
روح میں حل ہو گئی بوئے کفن

بے کسی

کون دنیا میں رفیقِ غمِ جاں ہوتا ہے
دل میں جاگ اٹھتا ہے جب بھی کوئی سویا ہوا درد
قطرہ اشک بھی پلکوں پہ گراں ہوتا ہے

زہر خند

جانے کس بات پہ ہنسی آئی
رنگ برسے، بکھر گئے اور پھر
اپنی اوقات پہ ہنسی آئی

وابستگی

جب بھی دیکھا اسے تو یاد آئے
چاند کے گرد گھومتے تارے
دھوپ کے پیچھے بھاگتے سائے

عشق

پروانے کی مانند ہر اک حد سے گزر جا
اے دل تجھ گر اس کی محبت کی طلب ہے
بے خوف و خطر، شمع کے شعلے میں اتر جا

من توشدم
دیکھ کر اس کو اور کیا دیکھوں
اب تو یوں بس گیا ہے وہ مجھ میں
جب بھی دیکھوں تو آئینہ دیکھوں

بعد از خدا
زندگی یوں گزارتا ہوں میں
پہلے ہونٹوں پہ تھا، خدا کا نام
آج تجھ کو پکارتا ہوں میں

سپردگی
خواب میں جیسے ناؤ کھیتا تھا
سانس کے زیروبم کے ساتھ کبھی
زیر لب، ایک نام لیتا تھا

سرشاری
میں ہوں اپنے نشے میں کھویا ہوا
آنکھ کیسے کھلے کہ میٹھی نیند
زیر مژگاں ہے کوئی سویا ہوا

شغل
اس کے ہونٹوں کے پھول چن لینا
اور ان کو بسا کے آنکھوں میں
کچھ ادھورے سے خواب بن لینا

دیوانگی
یار تو بھی عجیب انسان ہے
ایسی کشتی میں ڈھونڈھتا ہے پناہ
جس کے اندر خود ایک طوفان ہے

حرفِ آخر
ہر لفظ میں پوشیدہ ہے خود اپنا جواز
ایماں کی نہ کیوں علم ہو شرطِ اول
اقراء ہے نبوت کا بھی حرفِ آغاز

احترامِ آدمیت
بشر نے ڈالی ہے کیا عظمتِ بشر کی طرح
سکھا رہی ہے یہی سنتِ براہیمی
کہ آدمی نہ ہو قرباں، جانوروں کی طرح

گلزارِ خلیل
ریگزار آزر کا افسانہ، حقیقت ہی نہ ہو
اک ذرا تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے
آگ میں گلشن کھلانا، حسنِ محنت ہی نہ ہو

رویتِ ہلال
خود آگہی نہ جدتِ فکر و نظر ملی
وہ قوم آج بھی ہے پرستار چاند کی
جس قوم کو روایت "شق القمر" ملی

ذوقِ تعمیر
ہم میں وہ شوقِ عبادت اب کہاں
ہر محلے میں بناتے ہیں.... مگر
اے خدائے لامکاں، تیرا مکاں

نمائش
قرآں، خدا، رسول ہے، سب کی زبان پہ
ہر لفظ آج یوں ہے معانی سے بے نیاز
لکھی ہو جیسے نام کی تختی مکان پہ

مساوات

زندگی بھر تو نہیں۔ ہاں مگر اک وقت نماز
اپنے ایماں کی سرعام نمائش کیلئے
"ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز"

خود فریبی

دل کی وحشت کسی عنوان تو کم ہوجائے
زندگی اپنے لئے اور بھی ہوجائے عذاب
ہم سے جنت کا تصور بھی اگر کھو جائے

تضاد

اہل اسلام میں نہیں طبقات
اور فرما رہے تھے مولانا
اہل ثروت پہ فرض ہے خیرات

سیکولرازم

اس دکھ بھرے جہان میں کوئی کہاں رہے
گرجا ہو، خانقاہ ہو، مندر ہو یا حرم
جس کو جہاں سکون ملے، وہ وہاں رہے

شاعری

ہر موج بحر میں کئی طوفاں ہیں مشتعل
پھر بھی رواں ہوں ساحل بے نام کی طرف
لفظوں کی کشتیوں میں سجائے، متاع دل

خیرگی

ہرگام پہ جیسے کوئی دیوار کھڑی ہے
میں دیکھنا چاہوں تو بھی کس طرح سے دیکھوں
آنکھوں میں تو اک نور کی زنجیر پڑی ہے

احمد ندیم قاسمی

قاسمی صاحب میں یوں تو خوبیاں ہیں بے شمار
مختصر الفاظ میں سوچا تو یہ دل نے کہا
اچھے انساں، اچھے شاعر، اچھے افسانہ نگار

○

اک امتزاج بھی ہے جدید و قدیم کا
لیکن فقط یہی نہیں حسن کمال فن
اوروں سے مختلف بھی ہے لہجہ ندیم کا

○

افسانہ ہو کہ شعر و سخن، ایک رنگ ہے
ہر ظلم کے خلاف، ادب کے محاذ پر
احمد ندیم قاسمی، مصروف جنگ ہے

سلیم احمد

وہ ایک شخص جو سایہ بھی تھا اجالا بھی
ہر اختلاف مرکز رہا مگر یارو
رقابتوں میں محبت کا تھا حوالہ بھی

کشش ثقل

آزاد کب ہوا کوئی قید مقام سے
جالندھری ہے کوئی تو کوئی ہے لکھنوی
ترک وطن کے بعد بھی نسبت ہے نام سے

تنقید

رنگیں سرورق ہے، نہایت ضخیم ہے
(کیا سوچئے، کتاب میں لکھا ہوا ہے کیا)
بس یہ ہے طے، ادیب بہت ہی "عظیم" ہے

نذرِ حسین

طلوعِ صبح کا منظر نگاہ میں رکھنا
پھر اپنی آنکھ کو شبنم سے باوضو کرکے
جمالِ سبطِ پیغمبرؐ نگاہ میں رکھنا

رسولِ پاک کا ہر لفظ اک اشارہ ہے
"خدا کو مجھ سے تو مجھ کو حسین سے جانو"
حسین۔ دینِ محمدؐ کا استعارہ ہے

حق کا عجب قرینۂ اظہار تھے حسین
مسجد کے واسطے سے جو سوچا تو یہ کھلا
گنبد نبی کی ذات تو مینار تھے حسین

یہی نہیں کہ جگر پارہ بتول تھا وہ
عمل تھا، علم تھا، کردار تھا، اصول تھا وہ
علی کے بعد، نمائندہ رسول تھا وہ

نبی کا دل تو نظر بوتراب کے مانند
وہ شخص جس کا تصور کروں تو روشن ہو
افق سے تابہ افق، آفتاب کے مانند

قرآں کی حفاظت تو خدا نے کی ہے
اسلام کی بنیاد، محمدؐ نے رکھی
تکمیل۔ امام شہداء نے کی ہے

گرمی ہے اور پیاس کی شدت ہے اور حسین
دریا ہے موج موج تو دشمن ہے فوج فوج
حد نگاہ تک یہ قیامت ہے اور حسین

گفتنی و ناگفتنی

بہت دنوں سے میں خاموش تھا خدا کی طرح
زمیں میں گاڑے ہوئے سنگِ رہنما کی طرح

میں اپنی ذات کے صحرا میں کھو گیا تھا کہیں
صدائیں دیتا تھا دل، نالہ درا کی طرح

ہوا کی زد میں تھا گویا چراغ راہ گزر
پڑا ہوا تھا سرِ راہ، نقشِ پا کی طرح

یہ کون عکس کے مانند روبرو آیا
میں خیرہ چشم، وہ خورشید کی ضیا کی طرح

یہ میرے دل کی ہے دھڑکن کہ فکر کی آواز
کوئی صدا سی ہے جبریل کی صدا کی طرح

یہ میری خلوتِ دل ہے کہ جلوتِ کونین
یہ میری ذات میں ہے کون ماسوا کی طرح

کھلی کتاب کے مانند کائنات تمام
نظر ہے خلوتی گوشہ حرا کی طرح

کھلا کہ لا ہی حقیقت ہے، لا ہی افسانہ
عدم وجود میں میں پوشیدہ ہے خدا کی طرح

بس اک تسلسل جذب و گریز جاری ہے
ہر انتہا نظر آتی ہے، ابتدا کی طرح

یہ آسمان ازل سے بہ فیض کم نگہی
زمیں کے دوش پہ ہے پیر تسمہ پا کی طرح

عجب ہے نشہ خود آگہی کہ دنیا میں
ہر اجنبی نظر آتا ہے آشنا کی طرح

کسے خبر کہ ہے کیا ربط ظاہر و باطن
پہن کے بیٹھے ہیں سب جسم کو قبا کی طرح

اگر اڑوں بھی تو سایہ زمین ہی پہ رہے
تو کیوں اڑوں میں ہوائے گریز پا کی طرح

وہ بستیاں تھیں تو کیوں مجھ کو یہ ہوا محسوس
میں جنگلوں میں بھٹکتا پھرا ہوا کی طرح

اسیر ہے دل وحشی بدن کے زنداں میں
میں زیست کاٹ رہا ہوں، مگر سزا کی طرح

زمیں پہ پاؤں نہیں اور آسماں پہ دماغ
یہ جرتی بھی ہیں بس سایہ خدا کی طرح

میں اپنے آپ سے مصروف جنگ ہوں شاعر
لہولہان ہے دل، دشت کربلا کی طرح

آدمی تھا، تم بنا بیٹھے خدا پیکر مجھے
میں تمہارا آئینہ تھا، کردیا پتھر مجھے

میں نے جو کچھ بھی کہا، معنی کی صورت میں کہا
تم سمجھ بیٹھے مگر الفاظ کا دفتر مجھے

میری مٹی نے دیا تھا مجھ کو میرا رنگ روپ
ڈھالتی جاتی ہے دنیا اپنی صورت پر مجھے

میں کہ میری خاک کی لو سے ہوا میرا ظہور
کاش ڈھونڈے کوئی میری خاک کے اندر مجھے

میں نے سوچا، میں نے سمجھا اور میں نے کہہ دیا
تم نے سوچا اور نہ سمجھا کہہ دیا کافر مجھے

میں ہوں اپنی روح پر لادے ہوئے مٹی کا قرض
کوئی شاعر کہہ رہا ہے کوئی پیغمبر مجھے

مٹی کا قرض

ہم کہ مشت خاک ہیں
خاک کی املاک ہیں

خاک، جس کا نم..... لہو
خاک کا آہنگ صوت
خاک، جس کا رم.... نمو
خاک چپ ہوجائے.... موت

خاک کی میزانِ وقت
خاک بطن خیر و شر
خاک کا وجدانِ وقت
خاک ہی امّ البشر
خاک کا امکانِ وجود
نقش دست آزری
خاک ہی بود و نبود
خاک کی صورت گری
ہر عمق ہر ارتفاع
جلوہ شمس و قمر
خاک کا خط شعاع
خاک کا حسن نظر

زندگی کا ہر شعار
خاک سے ہے مستعار

○

ہم کہ مشت خاک ہیں
خاک کی املاک ہیں

ہم کہ اپنی خاک کے
روپ بھی درپن بھی ہم
اپنی خاک پاک کے
دل بھی ہم دھڑکن بھی ہم
آپ صورت گر بھی ہیں
در بھی ہم روزن بھی ہم
بت بھی ہیں آزر بھی ہیں
تیرہ بھی روشن بھی ہم
خواب بھی تعبیر بھی
خاک ..... یہ خاک وطن
رنگ بھی تصویر بھی
یہ متاع جان و تن
لفظ بھی آہنگ بھی
مہرباں گھر کی طرح
مانی و ارژنگ بھی
ماں کی چادر کی طرح

ہم پہ جو کچھ فرض ہے
خاک ہی کا قرض ہے

سمندر اور انسان

قلزم بیکراں! تیرا پھیلاؤ
زندگی کے شعور کا غماز
تیری موجوں کا پرسکون بہاؤ
زندگی کے سرور کا غماز
تیرے طوفان کا اتار، چڑھاؤ
زندگی کے غرور کا غماز

سوچتا ہوں کہ تیری فطرت سے
میری فطرت ہے کتنی ہم آہنگ،
تیری دنیا ہے کتنی بے پایاں
میری دنیا ہے کتنی رنگا رنگ
تو ہے کتنا وسیع اور محدود
میں ہوں کتنا وسیع، کتنا تنگ

میرے ماتھے پہ کتبہ تقدیر
تیری موجیں ترے لئے زنجیر

پابہ گل

صدیوں کا فاصلہ ہے جنگل سے میرے گھر تک
شاخ ثمر بکف سے تخلیق کے ہنر تک
اس پا پیادگی سے اس برق پا سفر تک

یہ فاصلہ ہے میرے ذہن رسا کا ضامن
منزل سے تابہ منزل ہر نقش پا کا ضامن
ہر خواب، ہر حقیقت، ہر ارتقاء کا ضامن

اب میری دسترس میں، سورج بھی ہے ہوا بھی
یہ پرکشش زمین بھی، وہ بے کشش خلا بھی
اب تو ہے میری زد میں دنیائے ماورا بھی

پھر بھی نہ جانے کیوں میں جنگل کو اتنا چاہوں
فردوس گم شدہ کے موہوم خواب دیکھوں
آنگن میں کچھ نہیں تو اک پیڑ ہی لگاؤں

جواب

(ٹیگور اور اقبال کی روشنی میں)

سورج نے جاتے جاتے بڑی تمکنت کے ساتھ
ظلمت میں ڈوبتی ہوئی دنیا پہ کی نظر
کہنے لگا کہ کون ہے اب اس کا پاسباں
میرے سوا ہے کون زمانے کا راہبر
میں تھا تو اپنی راہ پہ تھی گامزن حیات
اب میں نہیں رہوں گا تو یہ ساری کائنات
ظلمات میں بھٹکتی پھرے گی تمام رات

سورج یہ کہہ کے جا ہی رہا تھا کہ اک دیا
چپکے سے جل اٹھا اور اسے دیکھنے لگا

۱۔ تو شب آفریدی چراغ آفریدم (اقبال)

کاش

یہ سب اشجار کتنے خوبصورت ہیں
نظر آتا ہے
سب کڑیل جواں، دھرتی کے بیٹے
موسموں کا ظلم سہتے
سر اٹھائے اپنے پیروں پر کھڑے ہیں
اپنی ماں کو اپنے سائے میں لئے
سینہ سپر ہیں
کاش میں بھی اک شجر ہوتا

مادر وطن کا نوحہ

میرے بدن پر بیٹھے ہوئے گدھ
میرے گوشت کی بوٹی بوٹی نوچ رہے ہیں
میری آنکھیں — میرے حسیں خوابوں کے نشیمن
میری زباں — موتی جیسے الفاظ کا درپن
میرے بازو — خوابوں کی تعمیر کے ضامن
میرا دل — جس میں ہر ناممکن بھی ممکن
میری روح، یہ سارا منظر دیکھ رہی ہے
سوچ رہی ہے
کیا یہ سارا کھیل تماشا
(خوانخواروں کے دسترخوان پہ میرا لاشہ)
لذت کام و دہن کے لئے تھا؟

(۱۹۵۸ء)

یوسف ثانی

میں چاہ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے
کہ چشم یعقوب تو مرے غم میں کل بھی گریاں تھی
آج بھی ہے

ایک منظر

کہکشاں کی جگمگاتی فصل لہرائی ہوئی
دور افق کی اوٹ سے محو نظارہ ماہتاب
شب کسی اندیشہ فردا سے کجلائی ہوئی

سوچتا تھا، یہ چمکتی فصل جب کٹ جائے گی
دامن مہتاب میں کھل جائیں گے چاندی کے پھول
رات کے ماتھے سے گرد تیرگی چھٹ جائے گی

سوچتا تھا میں کہ دیکھا، رات ساری کٹ گئی
ایک سورج ناگہاں ابھرا بصد جاہ و جلال
چاند کی دولت، سحر کے غاصبوں میں بٹ گئی

سورج اپنی کامرانی پر بہت مغرور ہے
سوچتا ہوں، اس سحر سے شام کتنی دور ہے

۱۹۵۹ء (پہلا مارشل لاء)

چل خسرو گھر اپنے

تھک چکے پاؤں بس اب اے دل ناداں، چل بھی

چل کہ اب رات کا نشہ بھی ہے مائل بہ خمار
قمقمے اونگھ رہے ہیں کہ بہت جاگ چکے
کچھ ستارے ہیں تو ان کی بھی ہیں پلکیں بوجھل
وہ بھی تیرے لئے نیند اپنی بہت تیاگ چکے

چاند، پہرے کے سپاہی کی طرف استادہ
سوچ میں ہے کہ جو تو، جائے تو وہ بھی چل دے
رہگزر، ایک طوائف کی طرح واماندہ
ایسے لیٹی ہے کہ کون آئے گا اب رات گئے

ایک اک ذرے کی آنکھوں میں ہے نیند آئی ہوئی
تو بھی گھر چل کے ذرا دیر مرے دل، سو لے
کوئی ایسا نہیں اس وقت جو تیری خاطر
چند لمحوں کے لئے ہی سہی، آنکھیں کھولے

اتنا خاموش ہے ماحول کہ چلتے ہوئے اب
اپنی آواز کف پا بھی گزرتی ہے گراں
تیری دھڑکن مری سانسوں کی ضمانت ہی سہی
تیری چپ چاپ سی دھڑکن بھی ہے وحشت ساماں

کب تک اس قبر کی وادی میں پھرے گا پاگل
یوں کبھی مل بھی سکی ہے غم دوراں سے نجات
چل کہ جن چہروں سے بڑھ جاتی ہے تیری وحشت
وہی چہرے ہیں مرے دل، ترا عنوان حیات

اور تجھے جینا ہے اے کشتۂ دوراں کل بھی

لمحۂ فکر

تم بھی فریب خوردہ ہو ہم بھی تھے بے خبر
دونوں ہی باشعور نہ تھے قصہ مختصر
تاریخ ہر قدم پہ دکھاتی تھی آئینہ
تاریخ کا مذاق اڑاتے تھے دیدہ ور
اب زخم سر کھلا تو ملا سنگ کا سراغ
پتھر سے بے نیاز تھا ہر اک شیشہ گر

پتھر — کہ حرف و صورت بھی نقش و نگار بھی
پتھر — کہ رنگ رخ بھی، لہو کا خمار بھی
پتھر — بلند و پست کا خود ساختہ نظام
پتھر — زمیں کا غم بھی، فلک کا وقار بھی
پتھر — خدا کے نام پہ تکبیر تا خدا
پتھر ہی سنگ میل بھی، سنگ مزار بھی

ہر اک قدم پہ سنگ کو نسبت تھی سر کے ساتھ
اور سائے کی تلاش میں ہم تھے شجر کے ساتھ
سوچا نہ تھا کہ سایہ ہے سورج کا ہم سفر
سورج مگر نہیں ہے کسی ہم سفر کے ساتھ
خوابوں کی دھوپ چھاؤں میں افلاک کے تلے
تھا رقص گردباد، نہایت ہنر کے ساتھ

یہ آگہی کا نور کہ خیرہ ہے چشم دل
احساس تیرگی کہ ہے تا بندگی خجل
دل ہے لہو لہو تو جگر داغ داغ ہے
افکار گرد گرد ہیں، جذبات مشتعل
گردوں دھواں دھواں ہے فضا ہے شرر شرر
سر ہیں ہوا کے دوش پہ اور روح پا بہ گل

اس معرض فنا میں ذرا کل کی سوچیے
جینے کی آرزو میں نہ مقتل کی سوچیے
سوئل[1] کا پیرہن تو نظر[2] کا فریب تھا
رانو[3] کی فکر کیجیے، سوئل[4] کی سوچیے
مالیر، ماروی[5] کا رہے گا سدا مگر
صدیوں کے ارتباط میں اس پل کی سوچیے

۱۔ فریب کی علامت ۲۔ ۳۔ محبت کی علامتیں ۴۔ آبائی زمین کی علامت ۵۔ زمین کی بیٹی (Son of the Soil)

مریم سے ایک سوال

مریم ۔ تمہیں تو خون تھا اپنا بہت عزیز
تم نے ہی تو اس کے واسطے سب سے لڑائی کی
تاریخ ہے گواہ کہ اپنی انا کے ساتھ
(لے کر خدا کا نام) تمہیں نے خدائی کی
تم نے حسب نسب کی روایت کو توڑ کر
رکھی بنا جہاں میں آزاد کائی کی
جس خوں سے سرخرو ہوئی مجروح مامتا
اس خوں نے آدمی کی بہت رہنمائی کی
جو ہاتھ پھول بن گیا شاخ صلیب پر
اس نے رخ حیات کی پردہ کشائی کی

○

مریم - یہ خون بھی تمہارا خون ہے
کیوں تم نے اپنے خون سے بے اعتنائی کی
اس خون میں مہک ہے تمہارے ہی دودھ کی
کیوں مامتا پہ شرط ہے اب کتخدائی کی
تم تو زمیں ہو، مرکز تخلیق زندگی
کیوں آج تم کو فکر ہوئی پارسائی کی
تم نے تو آدمی کو کیا تھا خدا صفات
تکذیب کی ہے کس لئے اپنی بڑائی کی
کیوں آج شرط رزق ہے یہ شجرہ نسب
تم نے تو اپنے آپ سے بھی بے وفائی کی
مریم کہو کہ جائے یہ لخت جگر کہاں
اللہ کی زمین پہ ہے اس کا گھر کہاں

پرانے سلسلے، نئے رابطے

عمر ہو، جام تماچی ہو، یا چنیسر ہو
تمہارا کوئی بھی ہو نام، کوئی مذہب ہو
تمہاری خاک سے میں ہوں، مرے لہو میں ہو تم
مرے خدا کی زمیں کا وقار، تم سب ہو

وہ ماروی ہو کہ نوری، سسی ہو یا لیلاں
ہر ایک پیار بھرا دل، مری زمیں کا جمال
کراچی تا بہ موئن جودڑو، مری تاریخ
ہر اک افسانہ، مری داستان ہجر و وصال

میں اپنی چاہ میں رانو، وفا میں رائے ڈیاچ
مرا سکون ہے سورٹھ، مرا جنوں بیجل
مرے وجود میں شہباز، روح میں سرمد
مرا دماغ لطیفی تو میرا دل سچل

مرا بدن مری دھرتی جس کے دامن میں
بچھے ہوئے ہیں یہ دریا، مری رگوں کی طرح
یہ ریگزار ہے میرا ہی ریزہ ریزہ جسد
مرے درخت ہیں سب، میرے بازوؤں کی طرح

میں ابر بن کے اڑا تو مرے سمندر نے
مری ہواؤں کا جھولا بنادیا مجھ کو
کیا گریز زمیں سے تو بے زمینی نے
وہ گردشیں دیں، بگولا بنادیا مجھ کو

میں گرد گرد کہیں تھا تو آب آب کہیں
سمیٹتا رہا پھر بھی زمیں کا چاک مجھے
دکھا کے مجھ کو مرا ظرف - کوزہ گر کی طرح
مری حدود میں لے آئی میری خاک مجھے

مرا سفر مری تاریخ کا ہے آئینہ
وہ آئینہ جو شکستہ بھی ہے، سلامت بھی
کسی کو اس میں نظر آئے کیا مرا پرتو
کہ میں بھی جس میں ہوں کچھ اور، میری صورت بھی

یہ چہرہ جس کا ابھی کوئی نام ہے نہ نسب
یہ چہرہ میرا ہے، لیکن ہے یہ تمہارا بھی
وہ رابطہ کہ جو تاریخ میں ہے دفن کہیں
ہماری ہم نسبی کا ہے استعارہ بھی

تمہارے ورثۂ اجداد کو خدا رکھے
مجھے بھی پیار مرے شہر ہست و بود سے ہے
مری زمیں ہے مری ماں، میں ابن مریم ہوں
تمہارا خون سے ہے رشتہ تو میرا دودھ سے ہے

گوسالہ

لوح کلیم ٹوٹ گئی، پارہ پارہ ہے
ہارون شرمسار کہ موسیٰ سے کیا کہے
گوسالے کو جب امت موسیٰ خدا کہے
گوسالہ، زر پرستی کا جو استعارہ ہے

لفظوں کے در کھلے تو معانی ہوئے عیاں
جاری ہے ہر خیال میں آزر کا سلسلہ
ٹوٹا نہیں حرم میں بھی پتھر کا سلسلہ
اک کارگاہ سنگ ہے، شیشے کی ہر دکاں

گوسالہ اب بھی زندہ ہے دولت کے روپ میں
بدلے نہیں ہیں آج بھی آداب بندگی
اک سامری کا خواب ہے، ہر خواب بندگی
یہ رات، سایہ سایہ ہے سورج کی دھوپ میں

حریف وصال

عجیب شب تھی
جو ایک پل میں سمٹ گئی تھی
عجیب پل تھا
جو سال ہا سال کی مسافت پر پرفشاں تھا
اور اس کے سائے میں ایک موسم ٹھہر گیا تھا
(کسی کے دل میں تھا کیا، کسی کو خبر نہیں تھی)

بس ایک عالم سپردگی کا
بس ایک دریائے تشنگی کا جس کو موجیں
اڈ اڈ کر بکھر رہی تھیں
کھلے سمندر میں ڈوب جانے کی آرزو میں مچل رہی تھیں
خیال — حسن خیال میں گم
نگاہ — خواب جمال میں گم
نہ جانے کس خواب کی یہ تعبیر تھی کہ آنکھوں میں جاگتی تھی
نہ جانے کس آرزو کی تکمیل ہو رہی تھی
کہ آنکھ سے آنکھ
لب سے لب محو گفتگو تھے
مگر بس اک بات معتبر تھی
کسی کے دل میں تھا کیا، کسی کو خبر نہیں تھی
وہ لمحہ گزرا کہ سحر ٹوٹا
یکایک احساس غم جاگا
ہر ایک چہرہ خود اپنی آنکھوں میں آئینہ ہو گیا ہو جیسے
طلسم سم سم سے جس خزانے کا در کھلا تھا
وہ یک بہ یک کھو گیا ہو جیسے
عجیب تھا ایک چور دل میں
جو اس خزانے کا پاسباں تھا
جو سائے کی طرح درمیاں تھا
تھا خستہ ماہ و سال تھا وہ
کہ دل کی گہرائیوں میں بیدار
کوئی خوف ملال تھا وہ
عجیب سا اک خیال تھا وہ
ہجوم جذبات میں در آیا تھا جو حریف وصال بن کر
جو دل کی دھڑکن میں رک گیا تھا، ضمیر کا اک سوال بن کر

(غزلیں)

○

آئے تھے تیرے شہر میں کتنی لگن سے ہم
منسوب ہوسکے نہ تری انجمن سے ہم
یوں بے رخی سے پیش نہ آ اہل دل کے ساتھ
اٹھ کر چلے نہ جائیں تری انجمن سے ہم
ملتے ہیں روز دست صبا سے پیام گل
زنداں میں بھی قریب ہیں اہل چمن سے ہم
اے ریگزار سندھ ترا چاند بجھ نہ جائے
آئے ہیں اس کی چاہ میں ارض دکن سے ہم
شاعر ادب کے محتسبوں کو خبر نہیں
کیا کام لے رہے ہیں تغزل کے فن سے ہم

○

اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو
پھر ہیں برق کی نظریں سوئے آشیاں یارو
پھول ہیں کہ لاشیں ہیں' باغ ہے کہ مقتل ہے
شاخ شاخ ہوتا ہے' دار کا گماں یارو
تہمتوں کی ضمیں ہیں اور گھر خاموشی
جارہے تھے کس جانب' آگئے کہاں یارو
راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میر کارواں یارو' میر کارواں یارو
صرف زندہ رہنے کو زندگی نہیں کہتے
کچھ غم محبت ہو کچھ غم جہاں یارو
وقت کا تقاضہ تو اور بھی ہے کچھ...... لیکن
کچھ نہیں تو ہوجاؤ' میرے ہم زباں یارو

○

متاع درد ملی' سوز جاودانہ ملا
بہ فیض عشق ہمیں زندگی میں کیا نہ ملا
ہمیں حرم میں نہاں تھے ہمیں صنم سے عیاں
ہماری ذات سے باہر ہمیں خدا نہ ملا
تمہارے غم میں بھی رکھتے ہیں قرینہ زیست
تمہارے غم سے شعور غم زمانہ ملا
انہیں کے خوں سے ہے گلزار' خاک کنج حرم
جنہیں بفضل خدا' سایہ خدا نہ ملا
بنا نہ دیں کسی دیوار ہی کو دریہ اسیر
اگر قفس سے رہائی کا راستہ نہ ملا

○

لٹا دیا ہے غم آب و تاب میں کیا کیا
وگرنہ خواب تھے چشم پر آب میں کیا کیا
بلندیوں کا بھی اٹھا ہے پستیوں سے خمیر
زمیں کے راز ہیں اڑتے سحاب میں کیا کیا
یقیں نہ ہو تو کوئی ڈوب کر ذرا دیکھے
بھنور ہیں سوئے ہوئے نقش آب میں کیا کیا
میں لفظ لفظ جو پڑھتا گیا تو بات کھلی
کھینچی ہوئی تھیں لکیریں کتاب میں کیا کیا
فقط سکوں کی طلب ہے بنام خلد بریں
فریب خود کو دیئے اضطراب میں کیا کیا

○

دستک ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو
طوفاں کی آرہی ہے صدا غور سے سنو
محسوس کررہا ہوں میں' کرب شکستگی
تم بھی شگفت گل کی صدا غور سے سنو
یہ بازگشت' میری صدا کی ہے یا مجھے
آواز دے رہا ہے خدا' غور سے سنو
کب تک زمین اٹھائے رہے آسماں کا بوجھ
اب ٹوٹتی ہے رسم وفا' غور سے سنو
میں ٹوٹتا ہوں' خیر مجھے ٹوٹنا ہی تھا
دھرتی چیخ رہی ہے ذرا' غور سے سنو

صحرا میں چیختے ہیں بگولے، تو شہر شہر
اک شور ہے، سکوت فزا غور سے سنو

○

دنیا سمجھ رہی تھی کہ سورج گہن میں تھا
دیکھا جو روشنی میں تو سایہ بدن میں تھا
سانپوں کی طرح جسم سے لپٹی ہوں جب رگیں
حیرت ہی کیا جو زہر بھی حرف سخن میں تھا
دیکھا وہ خواب رات کہ میں چیخ چیخ اٹھا
میرا خدا بھی حلقۂ دار و رسن میں تھا
وہ دھوپ چاندنی تھی، وہ پتھر بھی پھول تھے
کیا جانے سحر کیا مری خاک وطن میں تھا

○

یہ بات تو نہیں ہے کہ میں کم سواد تھا
ٹوٹا ہوں اس بنا پر کہ میں کج نہاد تھا
الزام اپنی موت کا موسم پہ کیوں دھروں
میرے بدن میں میرے لہو کا فساد تھا
اب میں بھی جل کے راکھ ہوں میرے جہاز بھی
کل میرا نام، طارق ابن زیاد تھا
تو بادباں دریدہ سفینے کا ناخدا
اور قلزم سراب کا میں سندباد تھا
اب ہوں زباں بریدہ تو یہ سوچ کر ہوں چپ
یہ بھی سخن شناس کا انداز داد تھا

○

اس دشت پہ احساں نہ کر اے ابر رواں اور
جب آگ ہو نم خوردہ تو اٹھتا ہے دھواں اور
وہ قحط جنوں ہے کہ کوئی چاک گریباں
آتا ہے نظر بھی تو گزرتا ہے گماں اور
یہ سنگ نئی میرے لئے بارش گل ہے
تھک جاؤ تو سنگ بدست دگراں اور

○

جب تک زمیں پہ رینگتے ہوئے سائے رہیں گے ہم
سورج کا بوجھ سر پہ اٹھائے رہیں گے ہم
کھل کر برس ہی جائیں کہ ٹھنڈی ہو دل کی آگ
کب تک خلا میں پاؤں جمائے رہیں گے ہم
اک نقش پا کی طرح سہی اس زمین پر
اپنی بھی ایک راہ بنائے رہیں گے ہم
جب تک نہ شاخ شاخ کے سر پر ہو تاج گل
کانٹوں کا تاج سر پہ سجائے رہیں گے ہم

○

کیوں ہوگئی اے شمع، تری بزم سخن چپ
دل چپ ہے، نظر چپ ہے قلم چپ ہے، دہن چپ
نعرہ نہ سہی، چیخ سہی کچھ تو ہو یارو
بیٹھے ہیں بڑی دیر سے ارباب وطن چپ
گلچیں ہے کہ گلشن کو کئے جاتا ہے تاراج
اور اہل چمن دیکھ رہے ہیں ہمہ تن چپ
شاعر یہ عجب شور ہے خاموش و پُراسرار
دل میں تو ہے محشر سا، مگر حرف سخن چپ

○

کب تک رہوں میں خوف زدہ اپنے اپ سے
اک دن نکل نہ جاؤں ذرا اپنے آپ سے
جس کی مجھے تلاش تھی وہ تو مجھی میں تھا
کیوں آج تک میں دور رہا اپنے آپ سے
دنیا نے تجھ کو میرا مخاطب سمجھ لیا
محو سخن تھا میں تو سدا اپنے آپ سے
تجھ سے وفا نہ کی تو کسی سے وفا نہ کی
کس طرح انتقام لیا اپنے آپ سے
لوٹ آ۔۔۔ درون دل سے پکارے کوئی مجھے
دنیا کی آرزو میں نہ جا اپنے آپ سے

○

ازل سے ایک عذابِ قبول و رد میں ہوں
کبھی خدا تو کبھی ناخدا کی زد میں ہوں
میں اپنا آپ ہی خالق ہوں آپ کی مخلوق
میں اپنی حد سے گزر کر بھی اپنی حد میں ہوں
مرا تضاد ہی میری بقا کا ضامن ہے
میں مطمئن ہوں اگر اپنی جزر و مد میں ہوں
یہی بڑائی ہے میری کہ آدمی ہوں میں
کہ اپنے جسم میں ہوں' اپنے خال [illegible] میں محصور

○

میں سوچتا ہوں مگر میری سوچ ہی کیا ہے
بس ایک خوابِ حقیقت ہے' آگہی کیا ہے

ہر ایک بات زباں پر ہے' گفتنی کے سوا
اس اختیار پہ یہ جبر خامشی کیا ہے

وہ روشنی ہے کہ ہر شے نظر سے اوجھل ہے
یہ روشنی ہے تو پھر اور تیرگی کیا ہے

وہ مشتِ خاک ہوا نے جسے بکھیر دیا
سمیٹنے کی تگ و دو ہے' آدمی کیا ہے

میں آئینے میں بھی ہوں' آئینے کے باہر بھی
مرے وجود کی وحدت میں یہ دوئی کیا ہے

○

بدن پہ پیرہنِ خاک کے سوا کیا ہے
مرے الاؤ میں اب راکھ کے سوا کیا ہے
یہ شہر سجدہ گزاراں' دیارِ کم نظراں
یتیم خانۂ ادراک کے سوا کیا ہے
تمام گنبد و مینار' و منبر و محراب
فقیہ شہر کی املاک کے سوا کیا ہے
یہ میرا دعوئ خود بینی و جہاں بینی
مری جہالتِ سفاک کے سوا کیا ہے
جہانِ فکر و عمل میں یہ میرا زعمِ وجود
فقط نمائشِ پوشاک کے سوا کیا ہے
تمام عمر کا حاصل بہ فضلِ ربِ کریم
متاعِ دیدۂ نمناک کے سوا کیا ہے

○

اک سنگ دل کا پھر ہے مقدر بنا ہوا
ہر آدمی ہے شہر میں پتھر بنا ہوا

گوتم سے شرمسار' ارسطو ہے یا نہیں
پورس کی سرزمیں پہ سکندر بنا ہوا

اس کو ستم نصیب کہوں یا ستم نواز
جو آدمی ہے صبر کا پیکر بنا ہوا

کیا جانے کب نیام سے باہر نکلنے پڑے
جو ہاتھ آستیں میں ہے خنجر بنا ہوا

تجھ کو نظر نہ آئے تو میری نظر سے دیکھ
آئینے کے اُدھر ہے جو منظر بنا ہوا

بنیاد پر نظر ہو تو شاید سمجھ سکو
کیوں ٹوٹنے لگا ہے مرا گھر بنا ہوا

یہ بات ظرف کی ہے مگر کس سے کیجئے
قطرہ بھی آج کل ہے سمندر بنا ہوا

○

دشت وفا میں دور تک موج سراب دیکھنا
دیدہ خواب آشنا' حاصل خواب دیکھنا

○

اک جسم جو وحشت سے تم جیسے حنا مرے ہیں لہو

تاثرات

(اخبار کے تراشے)

فیض احمد فیض

لاہور......۔ر فیض احمد فیض نے کہا ہے کہ برسوں سے ادب پر طاری جمود کا خاتمہ ہوچکا ہے عوامی اور جمہوری دور میں شاعر اور ادیب اپنی شاعری اور نثر کے ذریعہ معاشرے کو خرابیوں سے پاک اور اجلا بنانے کی جدوجہد کررہے ہیں موجودہ شاعر اور ادیب زمانے کے جدید تر تقاضوں کے مطابق اپنی تخلیقات عوام کے سامنے پیش کررہے ہیں ادب پر جمود طاری ہونے کی شکایت کی تلافی ہوگئی ہے۔ وہ آج شام نیشنل بک سینٹر آف پاکستان کے زیر اہتمام پاکستان نیشنل سینٹر میں حمایت علی شاعر کے تازہ مجموعہ کلام "مٹی کا قرض" کی تقریب رونمائی میں صدارتی تقریر کررہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ شاعروں کا انداز شخصیت اور رنگ جدا جدا ہے۔ فیض احمد فیض نے منیر نیازی اور حمایت علی شاعر کا تقابلی جائزہ پیش کیا اور کہا کہ ان دو شاعروں میں بعض باتوں میں اشتراک کے باوجود خوشگوار قسم کا اختلاف بھی موجود ہے انہوں نے کہا کہ حساس شاعروں کی بنیادی کیفیت اور مضمون ایک جیسا ہوتا ہے۔ شاعر کے نزدیک ناآسودہ معاشرے میں حساس فرد کی معاشرے اور حالات کے ساتھ چپقلش ہمیشہ رہتی ہے۔ تاہم شاعر اس چپقلش سے نجات کا خواہشمند ہوتا ہے۔ وہ جستجو اور تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

جناب فیض نے حمایت علی شاعر کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ انہوں نے جدید شاعری میں بہت سے ایسے پیرائے وضع کیے ہیں جو پہلے نہ تھے منیر نیازی کی شاعری میں اضطرار اور سیمابیت ہے جبکہ حمایت علی شاعر میں تحمل اور تجسس کا احساس موجود ہے حمایت علی شاعر نے بیشتر چیزوں کا مطالعہ خارجی فکر سے کیا ہے۔ دوسری طرف منیر نیازی نے بیشتر چیزوں کا مطالعہ داخلی آئینے میں کیا ہے ان دو شاعروں کے درمیان کہیں اشتراک اور کہیں اختلاف اور تضاد بہت ہی خوشگوار ہے فیض احمد فیض نے کہا کہ حمایت علی شاعر نے اپنی کتاب "مٹی کا قرض" میں لخت لخت کو بڑی خوبی کے ساتھ جمع کیا ہے شاعر بہت ضبط اور نظم کے ساتھ لکھتے ہیں انہوں نے کہا کہ آج کل لوگوں کو پرانی روایات کو توڑنے پھوڑنے کا شوق ہے جو یقیناً صحتمند بات ہے لیکن روایات کو پاؤں تلے روند دینا اچھی بات نہیں شاعر نے ماضی کی روایات کو پامال نہیں کیا جناب فیض نے کہا کہ شاعر جب اختصار سے لکھتا ہے تو اس اختصار میں بھی بہت سی بلاغت ہوتی ہے اس اختصار سے معنی کے بہت سے پہلو پڑھنے والے تک پہنچ جاتے ہیں انہوں نے کہا کہ حمایت علی شاعر کا اچھے اور باکمال ہم عصر شعراء میں شمار ہوتا ہے

(روزنامہ مساوات' لاہور مطبوعہ ۱۲ جنوری ۷۵ء)

رئیس امروہوی

پاکستان جن سخن ور حضرات کی ادبی حیثیت سے دنیا میں روشناس ہے۔ ان میں سرفہرست جناب حمایت علی شاعر کا نام بھی ہے۔ ادب شناسی، شعر فہمی، نکتہ رسی تو ضمنی خصوصیتیں ہیں۔ اصل صفت ان کا پاکیزہ ادبی شعور اور تخلیقی جوہر ہے۔ حمایت علی شاعر کے سینے میں دل زندہ دھڑک رہا ہے اور اس دل زندہ میں انسانیت کے درد اور نوع انسانی کی سوز نہاں کی برق جہندہ چمک رہی ہے۔ ان کی ایک طویل نظم "بنگال سے کوریا تک" کا ترجمہ راجندر سنگھ ورما (پنجاب یونیورسٹی، پٹیالہ) نے FLOWER IN FLAMES کے نام سے کیا ہے۔ کیا خوبصورت اور دلکش نظم ہے ابتدا ہی خیال انگیز ہے

آئینہ خانہ تصور میں
ایک ایک نقش ابھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھر تھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

اس نظم کے پس منظر میں جراحت خوردہ انسانیت کی غمناک موسیقی گونج رہی ہے۔ تیسری دنیا کی زبوں حالی، مظلوم اقوام کی روحانی کشمکش، خوں آشام سامراجوں کے استحصالی ہتھکنڈے! بلاشبہ یہ نظم ہر قسم کی ذہنی اور مادی جارحیت کے خلاف ایک منظم اور منظوم احتجاج ہے۔ راجندر سنگھ ورما اردو شعر و ادب کے مزاج شناس ہیں اور انہوں نے شاعری کی روح کو انگلش لہجے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی ہے۔ آخر میں حمایت علی شاعر کی شعری خصوصیات اور تخلیقی شخصیت کے بارے میں یونس احمر اور پروفیسر اظہر قادری کے مختصر فکر انگیز مضامین ہیں۔ "ہارون کی آواز" حمایت علی شاعر کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے۔ اس مجموعے کو یا سر عرفات کے نام معنون کیا گیا ہے کہ

مری زمیں ہے مری ماں، میں ابن مریم ہوں
تمہارا خوں سے ہے رشتہ تو میرا دودھ سے ہے

"ہارون کی آواز" یہ نام استعارہ ہے 'اظہار و ابلاغ کا! موسیٰ نے دعا مانگی تھی کہ میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے۔ اس کو میرے ساتھ (نبی بنا کر۔ الشعراء) مددگار کی حیثیت سے بھیج (القصص) زیر نظر مجموعے کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ پھر غزلیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ حمایت علی شاعر کے کمال فن اور معیار سخن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بہت کچھ لکھا جائے گا اور بہت کچھ لکھا جانا چاہیے۔ معیاری شاعری، تخیل میں تفکر کی آمیزش، برجستہ رواں مصرع! کہیں کہیں نظمیں بھی ہیں۔ کیا خوب گلدستہ ہے حسن بیان اور لطافت زبان اور شعر مرصع کا!

یہ برادر عزیز (حمایت علی شاعر) اب تک نثر و نظم کے پیرائے میں بہت کچھ لکھے جا چکے ہیں۔ آگ میں پھول، تشنگی کا سفر، مٹی کا قرض، یہ نظم کے مجموعے ہیں۔ نثری تصانیف الگ ہیں۔ ان میں قابل ذکر شیخ ایاز (شخص اور شاعر) اور شخص و عکس ہیں۔ اول الذکر تصنیف سندھ کی عظیم ادبی و شعری شخصیت (شیخ ایاز) کے بارے میں جناب حمایت کے تاثرات و افکار کا مجموعہ ہے۔ شیخ ایاز کی شاعری میں جذبے، احساس اور فکر و خیال کے جو خم و پیچ ہیں۔ حمایت نے ان کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا

ہے اور بعض نظموں کے سلیس و نفیس ترجمے پیش کیے ہیں "عکس و عکس" ضخیم مجموعہ مضامین ہے جس میں مختلف موضوعات تنقیدی مسائل اور ادبی شخصیتوں کے بارے میں اپنے تبصرے اور مقالے غیر جذباتی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

حمایت کی نگاہ نکتہ رس، تنقیدی ذوق پاکیزہ اور تحقیقی میلان غیر جانبدارانہ اور محرمانہ ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ "جنگ" کراچی۔ ۲ جنوری ۸۷ء)

اردو شاعری میں پتھر کا استعارہ

مرزا ادیب

پتھر کتنی معمولی شئے ہے۔ کسی کی بے حسی اور جمود زدہ کیفیت کا احساس کراتا ہو تو ایسے موقع پر اس کی مثال عام طور پر پتھر ہی سے دی جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ پتھر برے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر اس کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جن کا تعلق افادیت سے ہے۔ تاریخ انسان کی روشنی میں اس کی کارگزاریوں کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ پتھر نے کوئی ایسا عہد اور ایسا دور نہیں گزرا، جب تمدن اور تہذیب پر اپنے گہرے اثرات مرتب نہ کیے ہوں۔ ادب کی طرف آیئے تو یہاں بھی پتھر کا اپنا رول کافی اہم نظر آتا ہے۔ اس نے ہمارے ادب، کو کئی خوبصورت تشبیہات، استعارات اور محاورات دے کر مالا مال کر دیا ہے۔

اس وقت میرے پیش نظر دو نظمیں پڑی ہیں۔ ایک نظم کا عنوان ہے "پتھر" اور دوسری کا "زاویہ نگاہ" "پتھر" جناب احمد ندیم قاسمی کی معروف اور انتہائی فکر انگیز ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے اور دوسری نظم کے شاعر بھی اردو کے صف اول کے تخلیق کار ہیں جن کا نام حمایت علی شاعر ہے

آپ نے احمد ندیم قاسمی کی یہ نظم بارہا سنی ہوگی، پڑھی ہوگی،

ریت سے بت نہ بنا اے مرے اچھے فن کار
ایک لمحے کو ٹھہر میں تجھے پتھر لا دوں

میں نے موجودہ کالم کے سب سے پہلے فقرے میں کہا ہے کہ "پتھر کتنی معمولی شے ہے" اور اس نظم کا عنوان ہی "پتھر" ہے۔ مگر اس حقیقت کو کسی صورت بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ایک بڑے فنکار کے لئے اپنی دنیا میں کوئی شے بھی بذات خود معمولی یا غیر معمولی نہیں ہوتی۔ وہ چاہے تو معمولی سے معمولی چیز کو بھی اپنے دست معجزہ طراز کے لمس سے غیر معمولی بنا سکتا ہے۔ ضرورت دیدہ بینا کی ہوتی ہے دیدہ وری کی ہوتی ہے مرزا غالب نے اپنے ایک فارسی شعر میں بالکل درست کہا ہے۔

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمار دلبری
در دل سنگ بنگرد رقص بتان آزری

غالب کے نزدیک دیدہ وری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پتھر کے اعماق میں رقص بتان آزری دیکھ لینے پر قادر ہے اور ندیم احمد قاسمی کی دیدہ وری کی کیفیت یہ ہے کہ اس نے ایک پتھر کی وساطت سے ہمارے پورے معاشرے کی تصویر کے نمایاں ترین

خدوخال واضح کر دیئے ہیں۔

میں نے جب بھی اس نظم کا مطالعہ کیا ہے اور بارہا مطالعہ کیا ہے یہ نظم ایک ڈرامے کی صورت اختیار کر لیتی ہے حرکت اور عملیت' داخلی یا خارجی جو ڈرامے کا بنیادی عنصر ہے اس نظم میں شروع سے آخر تک موجود ہے۔ "ایک لمحے کو شہر" کا ٹکڑا اپنی معنویت کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ پھر شاعر کا استفہامیہ لہجہ' اور اس لہجے میں حقیقت آشنائی کا مثبت اشارہ' اس کے علاوہ نظم کی زیریں لہروں میں ایک واضح طنز کا بہاؤ حقیقتاً یہ ایک بڑی نظم ہے اور ہر بڑی نظم یا کوئی بھی اعلیٰ درجے کا ادب پارہ مصنف یا خالق کے خون جگر سے تابناک ہو کر معجزہ فن بن جاتا اور یہی اس قلم نظم کی خوبی بھی ہے۔

حمایت علی شاعر نے اردو ادب کو زندہ و پائندہ شاعری دی۔ بہت ہی خوبصورت نظموں کا بہت ہی خوبصورت شاعر۔ شاعر کی بڑی مختصر نظم کا عنوان "زاویہ نگاہ" مگر یہ زاویہ نگاہ پتھر ہی کے کردار سے متعین ہوتا ہے۔ اس لئے اس نظم میں پتھر کی بڑی اہمیت ہے۔

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

کتنی بڑی' کتنی واضح اور کتنی گہری حقیقت' ایک ایک لفظ بولتا ہوا' یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر بلاغت کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیتا ہے اس نظم کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں شاعر نے جس انداز سے انکشاف حقیقت کیا ہے اس کی وضاحت کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

شاعر نے تین مصرعوں میں جو بات کہہ دی ہے اس کی متحمل طویل سے طویل نظم بھی نہیں ہو سکتی۔

یہ نظم "ثلاثی" کی تکنیک میں ہے اور یہ طرز خاص ایجاد ہے حمایت علی شاعر کی۔ مثلث ہمارے یہاں رائج ہے مثلث ایک ایسی نظم ہوتی ہے جس کے ہر بند میں تین مصرعے ہوتے ہیں مگر شاعر نے تین مصرعوں کو پوری نظم کو بنا دیا ہے۔

ہمارے ہاں آج کل ہائیکو کا بڑا زور ہے میں اس وقت صرف یہی بات عرض کروں گا کہ کوئی بھی صنف دنیا کے کسی بھی ادب سے آئے مگر وہ ہمارے شعری مذاق سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت سے محروم ہے تو ہمارے ادب میں اجنبی ہی رہے گی۔ اجنبیت سے اس صنف کا وہی حال ہوگا جو سانٹ کا ہوا ہے "ہائیکو" کو ہمارے شعری ادب کا حصہ بننے کے لئے ہمارے شعری مزاج کا حصہ بننا پڑے گا اور اس مزاج آفرینی' کا انحصار ان شاعروں پر ہے جو کہ ہائیکو کی طرف بطور خاص توجہ کرتے ہیں اس کے مقابلے میں "ثلاثی" ہماری اپنی ایک صنف سے پھوٹی ہے اور نتیجتاً" ہماری اپنی ہے' شاعر نے اس کی وساطت سے جو تخلیقی تجربہ کیا ہے جو تخلیقی تجربہ کیا ہے وہ بہت کامیاب اور بہت موثر ہے۔

("اذکار و افکار" مطبوعہ روزنامہ "نوائے وقت" ۔ لاہور۔ ۲۷ ستمبر ۸۵ء)

منفرد اور ممتاز شاعر

ادا جعفری

ہم سب کو علم ہے کہ "شام ہمدرد" کا سلسلہ برسوں سے جناب حکیم محمد سعید صاحب کی زیر ہدایت اور زیر نگرانی جاری

ہے۔ یہ محفلیں مختلف عنوانات کے تحت منعقد ہوتی رہی ہیں اس سال انہوں نے ضعف زیاں کے مریضوں کے لئے صرف صداقت کا جو نسخہ شفا تجویز کیا ہے' وہ ادب کی تاریخ میں ہمیشہ قابل ذکر رہے گا آج کے مہمان شاعر حمایت علی شاعر کا ایک شعر ہے

تمام عمر کا حاصل بہ فیض رب کریم
متاع دیدہ نم ناک کے سوا کیا ہے

مجروح انسانیت کا احساس ہی وہ متاع بے بہا ہے جو آج کے دور میں بہت کم یاب ہو گئی ہے۔ حکیم صاحب جو طویل عرصے سے اس آسیب زدہ معاشرے کے سہمے ہوئے لوگوں کے ذہن اور ضمیر کی صحت اور بقا کے لئے مصروف کار ہیں ان کی کاوشیں بھی اور کامرانیاں بھی اسی دیدہ نم ناک کا عطیہ ہیں۔ اسی دیدہ نم ناک نے حمایت علی شاعر کو منفرد اور ممتاز شاعر کا مقام عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری شدت احساس' بے پایاں درد مندی اور جذبے کے خلوص سے عبارت ہے۔

حمایت علی شاعر کی سخن وری محض فنکاری نہیں ہے' عصری زندگی کی سچائیوں کی چہرہ نمائی بھی ہے۔ بے شک فن اور اس کے تمام تقاضے بھی انکی نگاہ میں رہے ہیں' لیکن ان کی شاعری کے حرف حرف میں سچائی کا جو زہر اور تریاق بہ یک وقت موجود ہے' وہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

گر زہر ہوں تو زہر کا تریاق بھی ہوں میں

شاعر اور ادیب اکہری زندگی بسر نہیں کرتا۔ یہ سفر درون ذات بھی ہوتا ہے اور بیرون ذات بھی۔ اپنی ابتدائی زندگی میں انہوں نے بے گھری کا دکھ بھی سہا اور تلاش رزق کی مسلسل کشمکش بھی ان کا نصیب رہی جس میں بالا آخر وہ کامیاب بھی ہوئے۔ مگر زندگی صرف اپنی ذات کے حصار میں بسر نہیں ہوتی۔ اجتماعی زندگی میں شاعر اور ادیب اپنے عہد اور اپنے معاشرے کا نقاد' سفیر اور ترجمان بھی ہوتا ہے۔ اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں کے زخم' اس کے زخم ہوتے ہیں۔ ان کی جراحتوں کی تصویر کشی بھی حرف دعا کا رتبہ رکھتی ہے۔ ہاں' ان کی شاعری میں سبھی دل کشا اور دل پذیر رنگ موجود ہیں۔

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اڑ کے تیرے دل میں اتر جائے

تجھ سے وفا نہ کی تو کسی سے وفا نہ کی
کس طرح انتقام لیا اپنے آپ سے

یادوں کی سائبان میں شمعیں جلی ہوئی
تنہا بھی تھا جو میں تو بھری انجمن میں تھا

انہوں نے زندگی سے گفتگو کی ہے' لیکن وطن کی محبت کو حمایت علی شاعر مٹی کا قرض کہتے ہیں' اس قرض کی ادائیگی نے ان کی شاعری کو پائیدار بنیادیں فراہم کی ہیں۔

میں ٹوٹتا ہوں، خیر مجھے ٹوٹنا ہی تھا
دھرتی چیخ رہی ہے، ذرا غور سے سنو

کتنے مہ و نجم ہوئے نذرِ شب
اے غمِ دل اب تو سحر چاہئے

ہم نے تاروں سے ہنر سیکھا ہے شب تابی کا
اک چراغاں سرِ مژگاں ہے سحر ہونے تک

اور ان کی ایک خوبصورت ثلاثی ہے

ہر موجِ بحر میں کئی طوفاں ہیں مشتعل
پھر بھی رواں ہوں ساحلِ بے نام کی طرف
لفظوں کی کشتیوں میں سجائے متاعِ دل

عالم گیر سطح پر بھی جس عہدِ نامراد میں ہم لوگ سانس لے رہے ہیں وہاں دن کی روشنی بھی بارود کے دھوئیں سے کجلا گئی ہے چہروں پر خوف و ہراس کی پرچھائیاں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کی کتنی سچی تصویریں ان کے اس شعر میں نظر آتی ہیں۔

اک زنگ خوردہ آئینہ ہاتھوں میں آگیا
اور دیکھنے کو صورتِ حالات رہ گئی

مگر ان کی بات یہاں ختم نہیں ہوجاتی۔ شاعر کی آنکھیں پسِ آئینہ بھی دیکھنا چاہتی ہیں۔

تجھ کو نظر نہ آئے تو میری نظر سے دیکھ
آئینے کے ادھر ہے جو منظر بنا ہوا

انہوں نے آنے والی نسل کے نام جو نظم لکھی ہے، اس کا عنوان ہے "حرف حرف روشنی" اس نظم میں وہ کسی بشارت کی تلاش میں بیتی ہوئی صدیوں میں بھی جا نکلتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے وہ گزرے ہوئے زمانے خود معدوم و مستور ہو کر ہر آنے والے زمانے میں کسی نہ کسی طور پر موجود رہتے ہیں۔ اس لئے شاعر نے لبِ اظہار کو ہارون کی آواز کہا ہے۔

یہ بازگشت میری صدا کی ہے یا مجھے
آواز دے رہا ہے خدا، غور سے سنو

حمایت علی شاعر نے اپنی زندگی اور شاعری، دونوں کا سفر بڑے اعتماد اور تیقن کے ساتھ طے کیا ہے انہوں نے نہ کسی دکھ سے آنکھیں چرائی اور نہ کسی مصلحت کو سنگِ راہ بننے دیا یہی وجہ ہے کہ ان کے شعری مجموعے مسلسل ارتقاء اور ارتفاع کا منظرنامہ پیش کرتے ہیں۔

(خطبہ صدارت۔ شامِ ہمدرد۔ بسلسلہ "وثیقہ اعتراف" ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء)

(ماضی کا امین، مستقبل کا شاعر)

اختر الزماں ناصر

"میری شاعری میں عہد پارینہ کی مخصوص حکایات اور ان کے مختلف کردار جو اپنی پرچھائیاں تلاش کرتے نظر آتے ہیں ماضی و حال کے جدلیاتی ربط کے آئینہ دار ہیں۔ میں اس آئینہ میں ان حکایات کا نیا روپ اور ان کرداروں کے نئے چہرے دیکھتا ہوں اور اس آگ کی روشنی میں جو میرے تخلیقی جوہر کی امین ہے۔ اپنے عہد کے ان پس پردہ محرکات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں جن کے سبب تاریخ کبھی اپنے آپ کو دہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کبھی آگے بڑھتی ہوئی اور کبھی اس عالم میں جیسے اپنی جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہو"

حمایت علی شاعر کا صیغہ واحد متکلم میں یہ انداز تعارف دروں بینی اور خود آگہی کے ساتھ ساتھ جہاں بینی اور ماحول شناسی کی اس صلاحیت کو نمایاں کرتا ہے جو اقصائے عالم میں بکھرے مظاہر و حوادث کو پرکھنے اور چھانٹ چھانٹ کے الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اسی تخلیقی جوہر کی دریافت اور تربیت و پرداخت میں شاعر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا تب کہیں جا کر اس نے ہمیں ان اشعار کی سوغات دی

یہ معجزہ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
اب دست سامری میں عصائے کلیم ہے
وہ دور ہے کہ لفظ سے معنی بچھڑ گئے
روئیں دوئی کو کیا کہ اکائی دو نیم ہے

لیکن اگر مشاہدے کی ان تلخ حقیقتوں نے شاعر کو تھوڑی دیر کے لیے بظاہر قنوطی بننے پر مجبور کر دیا تو فوراً ہی بعد اس کے تجربات نے اس کو روشن اور امید افزا امکانات کا نقیب بننے پر اکسایا

کیا جانئے کب نیام سے باہر نکل پڑے
جو ہاتھ آستیں میں ہے خنجر بنا ہوا
یہ بات ظرف کی ہے مگر کس سے کیجئے
قطرہ بھی آج کل ہے سمندر بنا ہوا

مشاہدے کی تلخی اور تجربات کے روزنوں سے جھانکتے ہوئے امکانات کے روشن چہرے شاعر کے مخصوص اور پسندیدہ موضوعات فکر ہیں اور اسی لیے میں ان کو ماضی کا امین اور مستقبل کا سخن ور تسلیم کرتا ہوں

ان کی طویل نظم "حرف حرف روشنی" اگر ایک طرف کلاسیکی دروبست کے باعث اردو کی شعری لفظیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے تو دوسری طرف نئی نسل کے نام ایک ایسا زندہ اور زندگی بخش پیام ہے جو اردو کے فکری سرمائے کو کبھی گھٹنے یا لٹنے نہیں دے گا۔

مرے لہو کے چراغو' مرے جگر پارو
میں آج اپنی کہانی سنا رہا ہوں تمہیں
وہ راز جو میرے سینے میں دفن تھا اب تک
وہ راز اب سر محفل بتا رہا ہوں تمہیں
تم اپنی آنکھ سے دیکھو خود اپنے چہرے کو
کہ آج اپنا چہرہ بھی دکھا رہا ہوں تمہیں

اور

مرے لہو کے چراغو مرے جگر پارو
تغیرات کی زد میں ہے زندگی کا نظام
ہر اک عمل کا مقدر ہے ایک ردعمل
ہر ایک صبح کی تقدیر میں لکھی ہے شام
ہر ایک مظہر فطرت ہے آدمی کا رفیق
ہر ایک لوح پہ کندہ ہے آدمی کا نام
زمیں کو اہل سیاست نے کردیا تقسیم
وگرنہ اہل زمیں میں ہے کوئی خاص نہ عام
یہ شرق و غرب' سفید و سیاہ' پست و بلند
ہر ایک فرق سے بالا ہے آدمی کا مقام

میں حمایت علی شاعر کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان کے فن نے اورنگ آباد کی شعرخیز و شاعرنواز زمین پر گھٹنوں چلنا سیکھا تھا اور آج جبکہ وہ اپنی بلند قامتی کے باعث ہر سطح سے دیکھے جاسکتے ہیں' ان کی قدردانی اور قدرشناسی کے لئے زندہ ہوں۔ میں اس مختصر تحریر کے ذریعہ ان کے اس طویل اور صبر آزما فکری سفر کا پورا احاطہ نہیں کرسکتا جس کے آغاز پر میں ان کے ساتھ تھا مگر جب وہ اس کی انتہا تک پہنچیں تو شاید میں موجود نہ رہوں

شاعر نے خدا سے اپنے لئے ایک دعا مانگی ہے

میری گواہی دینے لگے میری شاعری
یارب مرے سخن کو وہ حسن بیان دے

اللہ کا شکر ہے کہ میرے "آمین" کہنے سے پہلے بلکہ بہت پہلے ہی یہ دعا قبول ہوگئی۔ ان کی غزلوں پر گفتگو باقی رہے گی انشاء اللہ۔ یار زندہ صحبت باقی

(مطبوعہ "اورنگ آباد ٹائمز" حمایت علی شاعر نمبر' ۲ جون ۸۵ء)

حمایت علی شاعر
کے
شعری ادب میں تجربے

○

ایک مصرعہ......ایک نظم

مستقبل

رات کی گود میں سویا ہوا مہتاب کا خواب

دوشیزگی

نہ مسکرائے تو گلزار، مسکرائے تو پھول

عوام

رات سورج کو نگل سکتی ہے تاروں کو نہیں

(مطبوعہ "ادب لطیف" لاہور۔ ۱۹۵۲ء)

اردو اور بابائے اردو
(ایک تصویری نظم)

جیسے آغوش محبت میں ہمکتی ہوئی معصوم بچی
اپنے بابا کو کسی فکر میں ڈوبا ہوا پاکر خود بھی
کھیلتے کھیلتے چپ چاپ کسی سوچ میں کھو کر رہ جائے
اور پھر اپنے باپ کی پلکوں پہ لرزتا ہوا اک قطرہ اشک
اپنی بچی کے کھلے ہوئے پھول سے رخسار پہ گر کر بہہ جائے

(مطبوعہ "شجاع" عبدالحق نمبر۔ اگست ۱۹۵۹ء)

یک رکنی غزل

(حمایت علی شاعر اور ساقی فاروقی کی مشترکہ غزل)

(فاعلاتن)

جو کرم ہے
اک ستم ہے
تجھ سے مل کر
آنکھ نم ہے
قطرہ اشک
یم بہ یم ہے
تیرا غم تھا
تیرا غم ہے
میرے حق میں
مے بھی سم ہے
کوئے عشرت
شہر غم ہے
درد کی رات
کوئی دم ہے

(مطبوعہ لیل و نہار ۔ لاہور ۔ ۵ جولائی ۱۹۵۹ء)

(ایک اضافی بحر)

تاک دھنا دھن
(تین بار)

آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن، جاگتے رہنا
کوئی نہیں ہے، جان کا ضامن، جاگتے رہنا

قزاقوں کے دشت میں جب تک قافلہ ٹھہرے
قافلے والو، رات ہو یا دن، جاگتے رہنا

تاریکی میں لپٹی ہوئی پُر ہول خموشی
اس عالم میں، کیا نہیں ممکن، جاگتے رہنا

آہٹ آہٹ پر جانے کیوں دل دھڑکے ہے
کوئی نہیں اطراف میں لیکن، جاگتے رہنا

ٹھنڈی ہواؤں کا اے دل، احساں نہ اٹھانا
کوئی یہاں ہمدرد نہ محسن، جاگتے رہنا

راہنما سب دوست ہیں لیکن اے ہم سفرو
دوست کا کیا ظاہر، کیا باطن، جاگتے رہنا

(مطبوعہ ۔ "افکار" ۔ کراچی ۱۹۶۰ء)

شکست کی آواز

(یک کرداری منظوم تمثیل)

کردار

پروفیسر...... ہم زاد
(سرگوشیاں..... قہقہے.... گنگناہٹ..... سسکیاں)

پروفیسر کے علاوہ تمام کردار صرف صوتی اثرات سے نمایاں ہوتے ہیں۔

یہ منظوم تمثیل جو ۶۰۰ مصرعوں پر مشتمل ہے ۶۲ء میں پہلی بار ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے سید رضی ترمذی نے پیش کی تھی۔ پوری تمثیل پہلی بار "فنون" لاہور کے اگست ۶۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی اور ۸۸ء میں سرسید کالج (راولپنڈی) کے مجلہ "پاکستانی ادب" (مرتبہ رشید امجد) کی چھٹی جلد (ڈرامہ) کے حصہ اول میں ۴۷ء سے ۸۷ء تک کے منتخب ڈراموں میں شامل ہے۔ (مرتب)

بنتی گئی کہانی

(ڈرامے کی تاریخ میں انوکھا تجربہ)

ریڈیو پاکستان کے قیام کے بعد حیدر آباد کی ادبی زندگی میں ایک نئی توانائی آگئی تھی۔ ریڈیو پر بھی نئے نئے تخلیقی تجربے کئے گئے۔ اسی سلسلے میں ایک ڈرامہ ایسا بھی لکھا گیا جس کا پلاٹ (کہانی) پہلے سے طے شدہ نہیں تھا۔ ایک گھنٹے کے دورانیے کی تشکیل کے لیے چار ادیبوں نے قرعہ ڈالا۔ پہلے پندرہ منٹ کا حصہ ڈاکٹر الیاس عشقی کے سپرد ہوا' اور کہانی جہاں پہنچی...... وہاں سے محمد عمر مہاجر نے اسے آگے بڑھایا اور اپنے حصے کی تکمیل کے بعد احمد عبدالقیوم نے اسے کسی نئی منزل پر پہنچا کر چھوڑ دیا...... قرعے کے مطابق چوتھا' حصہ حمایت علی شاعر نے لکھا اور بکھری ہوئی کہانی کو سمیٹتے ہوئے ڈرامے کو اختتام تک پہنچایا۔

اس طرح ریڈیو ڈرامے کی دنیا میں ایک انوکھا تجربہ کیا گیا اور یہ ڈرامہ "بنتی گئی کہانی" کے عنوان سے ۱۴ جون ۵۷ کو رات کے سوا آٹھ بجے ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے نشر کیا گیا...... ادب کی دنیا میں بھی غالباً یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا...... کاش اسے شائع کر دیا جاتا۔ یہ ڈرامہ حمایت علی شاعر کے پاس محفوظ ہے (مرتب)

(مطبوعہ "احوال واقعی" مرتبہ مرزا سلیم بیگ ۹۴ء)

خوف

(ایک تمثیلی نظم)

سہمی سہمی کھل رہی تھی اک کلی
میں نے پوچھا کیا خزاں کا خوف ہے؟
جی نہیں! اک دن خزاں تو آئے گی
پھر؟ سنا ہے ... اس نے چپکے سے کہا
اس چمن میں باغباں' گل چیں بھی ہے

(مطبوعہ "ادب لطیف" سالنامہ ۱۹۶۳ء)

تثلیث

(میرے خیال میں مختصر ترین نظم تین ہی مصرعوں کی ہو سکتی ہے اس لیے میں نے اس صنف کا نام مذہبی نظریات سے قطع نظر مثلث کی رعایت سے "تثلیث" مناسب سمجھا ہے۔ شاعر)

شاعری... پیغمبری

پھر کوئی فرمان.... اے رب جلیل
ذہن کے غار حرا میں کب سے ہے
فکر........ محو انتظار جبرئیل

(مطبوعہ۔ نئی قدریں۔ حیدر آباد جنوری۔ فروری ۶۲ء)

شکست کی آواز

("ایک کرداری" منظوم ریڈیائی تمثیل)

حمایت علی شاعر

پروفیسر — آواز (ہم زاد)

(نسائی اور مردانہ سرگوشیاں، قہقہے، گنگناہٹ اور سسکیاں)

(مختلف لوگوں کی آوازیں، طنزیہ فقرے اور قہقہے جو پروفیسر کے ذہنی انتشار کی علامت ہیں۔ آخر پروفیسر چیخ پڑتا ہے۔)

پروفیسر: چپ رہو۔
جاؤ، مجھے اور پریشان نہ کرو
اپنے الفاظ کو میرے لئے ارزاں نہ کرو
میں اسی غم کا سزاوار تھا
جو کچھ بھی ہوا...... ٹھیک ہوا
میں پشیمان ہوں، نادم ہوں
مجھے اور پشیماں نہ کرو

(آوازیں آہستہ آہستہ ابھر کر پس منظر میں چلی جاتی ہیں، پروفیسر زور سے دروازہ بند کردیتا ہے گویا اس نے اپنے ذہن کا دنیا کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کردیا ہو کچھ لمحے مکمل خاموشی)

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دنیا کیا ہے
آگہی بھی ہے بری چیز، تو اچھا کیا ہے

(گہری سانس لیتا ہے)

اے خدا، اے مرے معبود
کوئی راہِ فراغ
جس قدر سوچتا ہوں
الجھتا ہے دماغ
بجھتا جاتا ہے ہر اک منزلِ عرفاں کا چراغ۔
دور تک قبر کے مانند، اندھیرا ہے محیط۔
دفن ہوجائے نہ اس میں مرے افکار کی دنیائے بسیط۔
میں نے چاہا تھا......
مرے دل میں تھے کیا کیا ارماں
کیسے کیسے نہ خیالات کا محور تھا دماغ۔
کتنے سورج تھے مرے ذہن کے نادیدہ افق پر تاباں۔
کتنے مہتاب فروزاں تھے مری روح کی پنہائی میں۔
کتنے انجم کی ضیا تھی مری تنہائی میں۔
کتنی شمعیں تھیں فروزاں۔

کہ مرے کلبۂ ویراں میں چراغاں کا گماں ہوتا تھا
میں نے دیکھا تھا کہ یہ دہر ہے اک شیش محل
اور اس شیش محل میں ہے ہر اک شے بیکل
آدمی اپنے ہی پر تو سے ہراساں ہے یہاں
زندگی آپ بنی جاتی ہے، اپنا مقتل
میں نے سوچا تھا کہ اس وہم کا افسوں ٹوٹے
دستِ اوہام سے ایقان کا دامن چھوٹے
افقِ ذہن سے ابھرے کوئی صبحِ ادراک
اور اس صبح سے اک نور کا چشمہ پھوٹے
میں نے چاہا تھا کہ اس نور سے دنیا کے اندھیروں کا
مداوا کردوں

وسعتِ دہر میں پھیلا کے اجالا ہر سمت
لیجے لیجے کو حریفِ دمِ عیسیٰ کردوں
لیکن اِس چاہ کا، اِس فکر و عمل کا انجام!

(یکایک ایک زہریلا قہقہہ گونج اٹھتا ہے)

آواز :۔ آج معلوم ہوا اپنی حقیقت کیا ہے؟
دل کے بازار میں اک ذہن کی قیمت کیا ہے؟
پروفیسر :۔ (چونک کر)
کون ہو تم؟
آواز :۔ مجھے تم بھول گئے ہو شاید
میں وہی کشتۂ افکارِ گراں مایہ ہوں۔
پروفیسر :۔ میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے تم کو
شاید۔
آواز :۔ میں اسی پیکرِ ادراک کا ہمسایہ ہوں۔
ہم ہیں وہ دوست کہ ہر بُعد کے باوصف ہمیں
ایک ہی نام سے دنیا نے پکارا برسوں
ہم ہیں وہ ثابت و سیار، خلاؤں میں جنہیں
وقت کی گردشِ پیہم نے سہارا برسوں
ہم ہیں اک شاخ کے وہ پھول، وہ گلہائے دو رنگ
اپنے ہی ذوقِ تماشہ نے نکھارا ہے جنہیں
ہم ہیں اک بحر کی موجیں وہ سبک رَو موجیں
عیشِ ساحل نے تلاطم پہ ابھارا ہے جنہیں
پروفیسر :۔ (الجھ کر)
میں نہیں سمجھا کہ تم کون ہو؟
کیا کہتے ہو؟
آواز :۔ تم تو اپنے ہی خیالوں میں نہاں رہتے ہو
اک نظر مجھ کو ذرا غور سے دیکھو تو سہی
کیا میں آئینہ تمہارا نہیں؟
پروفیسر :۔ ہاں..... ہو تو سہی
آواز :۔ میں وہی ہوں، جسے تم ہار چکے ہو اے دوست
آج یہ بازی بھی تم ہار چکے ہو اے دوست
پروفیسر :۔ (حیرت سے) کیا کہے جاتے ہو۔
آواز :۔ جی..... میں ہوں وہی خانہ خراب
مشتِ خوں جان کے۔
پروفیسر :۔ (پہچان کر) تم..... تم ہو!
آواز :۔ جناب!
میں تمہارا دلِ مرحوم ہوں۔
اور زندہ ہوں
آج تک زیست سے محروم ہوں۔
اور زندہ ہوں
میری آنکھوں میں ابھی تک ہے وہ دنیا بے خواب
جس کے آفاق پہ ابھرا نہیں کوئی مہتاب

میرے ہونٹوں پہ تڑپتی ہے ابھی تک وہی پیاس
جس کو ساغر کی کھنک تک کبھی نہیں آئی راس
میری رگ رگ میں وہی خون ہے اب تک رقصاں
جس کے ہر قطرے میں دوزخ کی تپش ہے پنہاں

پروفیسر :۔ تم ابھی زندہ ہو!
آواز :۔ جی..... اور اسی طرح جواں

میری دنیا میں نہیں کوئی غمِ عمرِ رواں
مجھ میں آباد ہے اب تک وہ جہانِ بے نام
جس کا ہر ذرّہ ہے خود اپنی جگہ حسنِ تمام
جس کا ہر رنگ اچھوتا ہے، دھنک کے مانند
جس کا ہر روپ انوکھا ہے، فلک کے مانند
جس کی خوشبو نہیں منت کشِ دامانِ صبا
جس کے پھولوں نے اٹھایا نہیں احسانِ صبا
جس میں تم نے بھی گزارے ہیں مہ و سال کئی

جس میں روشن ہیں ابھی تک وہ خدوخال کئی
جن کی ہم دونوں نے اک عمر پرستش کی ہے
جن کو اپنانے کی ہم دونوں نے خواہش کی ہے

پروفیسر :- میں نے؟
آواز :- ہاں تم نے۔
پروفیسر :- مجھے یاد نہیں۔
آواز :- یاد کرو
وہ حسیں ماہ جبیں
پروفیسر :- ماہ جبیں!
آواز :- یاد کرو۔

وہ ..... جسے تم نے تصوّر میں بسا رکھا تھا
خواب کی طرح نگاہوں میں چھپا رکھا تھا
غنچۂ دل میں تھی سوئی ہوئی خوشبو کی طرح
دشتِ تخیّل میں جولاں، رمِ آہو کی طرح
جب بھی وہ سامنے آتی تو نظر جھک جاتی
موجِ انفاس بھی چلتے ہوئے رک رک جاتی
پرتوِ حسن سے ہر سمت اجالا ہوتا
کاش! اس لمحہ کوئی دیکھنے والا ہوتا

(پروفیسر کو کھویا ہوا پاکر)

یاد ہے تم کو وہ اک دھند میں کھوئی ہوئی رات
وہی گہوارۂ مہتاب میں سوئی ہوئی رات
جاگتی آنکھوں سے ہم دیکھ رہے تھے اک خواب
ذہن اور دل پہ تھا چھایا ہوا کیفِ مئے ناب
صحنِ گل میں تھی وہ شہزادیِ نکہت رقصاں
لمسِ آہنگ سے تارِ رگِ جاں تھے لرزاں
نم فضاؤں میں سلگتے ہوئے جذبات کی تان
نغمگی کے پسِ پردہ وہ دلوں کے پیمان

پروفیسر :- (اضطراب کے عالم میں)
میرا ماضی نہ مجھے یاد دلاؤ...... جاؤ
یہ بجھی آگ خدارا نہ جلاؤ...... جاؤ
آواز :- یہ بجھی آگ ہے..... خوب!
آگ بجھی بھی ہے کہیں؟
آگ بجھ جائے تو زندہ بھی رہے گی یہ زمیں؟
یہ مہ و مہر ہیں کیا چیز اگر آگ نہیں
زندگی کے ہر اک ایوان میں پوشیدہ ہے آگ
زندگی کے ہر اک امکان میں پوشیدہ ہے آگ
پروفیسر :- وہ خطائے دلِ ناداں تھی۔ گناہِ معصوم
آواز :- شکر ہے، تم نے کہا تو اسے معصوم گناہ
میرا ہر ایک عمل
...... کوئی نہ مانے لیکن،
پاک و معصوم ہوا کرتا ہے
کاش تم نے مجھے سمجھا ہوتا
پروفیسر :- میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں۔
تم انساں کا وہ روپ ہو جو قیدِ تعین میں نہیں آسکتا
جو خط و خال کا پابند نہیں
آج اس روپ میں عریاں ہو۔
تو کل روپ نیا دھار کے آجاؤ گے

آواز :۔ (زور کا قہقہہ لگاتا ہے)

کتنے نادان ہو تم

وقت نے کچھ نہ سکھایا تم کو

میں تو سمجھا تھا کہ یہ منزلِ عمرِ گزراں

تھک کے بیٹھے ہو جہاں

کر چکی ہو گی ہر اک رازِ نہاں، تم پہ عیاں

آج معلوم ہوا

زیست بیکار سفر ہے۔ جس میں

کوئی منزل ہے نہ منزل کا نشاں

کاش تم میری رفاقت میں بھی کچھ عمر بسر کر لیتے

میرے ہمراہ بھی دو گام سفر کر لیتے

پروفیسر :۔ وہ حسیں لمحۂ رفتہ

جو تمہاری ہی رفاقت میں ملا تھا مجھ کو

جو میری عمر کی پیشانی پہ اک داغِ سیہ بن کے دمکتا ہے ابھی۔

آواز :۔ داغِ سیہ!

تم اسے داغِ سیہ کہتے ہو!!

وہ حسیں لمحہ جو چھو کر بھی نہ گزرا تم کو

وہ جو آیا تھا کسی سایۂ ابرِ گزراں کے مانند

وہ جو اک خواب کے مانند نگاہوں میں رہا۔ کھو بھی گیا

وہ جسے ایک نظر تم نہ کبھی دیکھ سکے

جس کو پانے کی تمنا بھی کی.... اور پا نہ سکے

تم اسے داغِ سیہ کہتے ہو؟

اپنی ناکامی کا کیا خوب مداوا ہے۔

پروفیسر :۔ (بات کاٹتے ہوئے)

غلط،

میرے کردار کی توہین ہے یہ

وہ میری راہ میں آیا تھا تمہاری شہ پر

تم نے چاہا تھا کہ میں اس کی خنک چھاؤں میں

اس کے آغوش میں چپ چاپ پگھل کر رہ جاؤں

اور کچھ دن غمِ دوراں سے کنارا کر لوں

آواز :۔ اور تم نے غمِ دوراں سے کنارا بھی کیا۔

پروفیسر :۔ صرف تمہاری خاطر

آواز :۔ خیر۔ یوں ہی سہی۔

میں تم سے جدا بھی تو نہیں۔

میں تو نزدیکِ رگِ جاں ہوں۔

لہو بن کے رواں ہوں تم میں

تم ہو "میں"........

اور مری ذات سے منسوب ہو "تم"

ہم ازل سے ہیں بہم

ظاہر و باطن کی طرح

کاش ان ظاہر و باطن میں کوئی خطِ تفاوت ہی نہ کھنچا جاتا

کوئی دیوار نہ حائل ہوتی

پروفیسر :۔ میں نے بالقصد یہ دیوار اٹھائی ہے کہ

کم تم حد سے تجاوز نہ کرو

تم ہو جس رہ پہ رواں، وہ مری منزل ہی نہیں

تم میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے

تم شب ہو میں دن

تم اندھیروں میں اجالوں کے تمنائی ہو

ایسے موہوم اجالوں کے جنہیں رات جنم دیتی ہے
آواز :۔ (کھوئے ہوئے لہجے میں)
رات...... خاموش...... حسیں
کیف و مسرت کی امیں
ایک دلہن کی طرح حجلۂ زرپوش میں بیٹھی۔
کسی آہٹ کا بڑے پیار سے رستہ تکتی۔
جیسے اب کوئی قریب آئے گا
اور آہستہ سے گھونگھٹ کو الٹ کر..... اس کو
زندگانی کے حسیں راز بتا جائے گا
پروفیسر :۔ تم خدا جانے کہاں جا پہنچے
میرے نزدیک یہ سب خواب کی باتیں ہیں کہ جو---
خود فریبی کے سوا کچھ بھی نہیں
تم جسے حسن سمجھتے ہو' وہ اندازِ نظر ہے اپنا
تم جسے عشق سمجھتے ہو' وہ ہے حُسنِ ہوس
محض تسکین کا بہانہ ہے
حقیقت میں فسانہ ہے تمہارا ہر خواب
میرے دن رات کا محور رہے ہمیشہ سے۔ کتاب
کہیں خورشید بھی کرتا ہے طوافِ مہتاب؟
آواز :۔ دل کی دنیا نہیں پابندِ نظامِ شمسی
لیکن اس بات کو تم کیا سمجھو
تم نے دل کو کبھی سمجھا ہی نہیں
حُسن کو آنکھ سے دیکھا ہی نہیں
آنکھ تو صرف بصارت سے عبارت ہے تمہارے نزدیک
اور جس آنکھ کو ہے حسن کا نظّارہ نصیب
اس کو تم بند کیے بیٹھے ہو
تم کو معلوم نہیں لمسِ نظر کی لذت
تم نے پائی ہی نہیں سوزشِ غم کی راحت
تم تو بس ذہن کے آوارہ بگولوں کے تعاقب میں بھٹکتے رہے۔
کیا جانیئے کس دشتِ فراموشی میں
پروفیسر :۔ میں نے جس دشتِ تفکر کی سیاحت کی ہے
تم کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے
میں نے ہر ذرّے کے سینے میں اتارا خود کو
اور دل بن کے دھڑکتا رہا
خوں بن کے ہر اک رگ کی مسافت طے کی
میں نے ہر موج ہوا کے ہمراہ
وسعتِ ارض کے چکر کاٹے
میں ہواؤں سے خلاؤں میں اڑا
اور مہر و مہ و انجم کے پُراسرار فسانوں کو
حقیقت سے ہم آہنگ کیا
میں نے معلوم کیا
وقت' خدا' زیست' یہ دنیا' وہ جہاں
آواز :۔ (ہنستے ہوئے) اور جب آنکھ کھلی
حدّ ِ نظر تک تھا دھواں
ایک تم اور یہ تنہائی...... یہ تاریک مکاں
(زور کا قہقہہ لگاتا ہے)
پروفیسر :۔ (غصے میں)
اوہ...... تم...... چپ رہو' خاموش
آواز :۔ بگڑنے کی ضرورت کیا ہے؟

میں تو سمجھا تھا کہ تم خواب سناتے ہو
ہر اک خواب کی تعبیر غلط ہوتی ہے
اس لئے میں نے یہ تعبیر بتائی تم کو ـــ
پروفیسر :- تم میری بات پہ ہنستے ہو
میرے غم کا اڑاتے ہو مذاق !
آواز :- آج تم کتنے حسین لگتے ہو
برہمی بھی ہے عجب شے
یہ غضب ناک نگاہوں سے لپکتے شعلے
شکن آلود جبیں پر یہ پسینہ..... جیسے
خشک پتوں پہ دمکتے ہوئے شبنم کے گہر
یہ لرزتے ہوئے ہونٹوں کا تشنج۔
بخدا
آئینہ دیکھو تو اپنے پہ فدا ہو جاؤ
پروفیسر :- (جھلا کر)
تم نہیں مانو گے، تم یوں نہیں مانو گے......
آواز :- نہیں..... مان گیا ہوں تم کو
آج پہچان گیا ہوں تم کو
واقعی تم کو یہ راستہ پہ لانا ہے محال
تم ہو اب تک اس منزل میں
جس جگہ کوئی کسی کو نہیں سمجھا سکتا
تم کہو تو میں چلا جاؤں۔
اتر جاؤں پھر اس قبر کی ویرانی میں
جس میں اک میں ہی نہیں
سینکڑوں تشنہ تمناؤں کی زندہ لاشیں

اپنی تقدیر کو روتی ہیں۔
نہ جیتی ہیں نہ مر سکتی ہیں
سالہا سال سے اک مرگِ مسلسل میں گرفتار ہیں۔
شاید یہی برزخ ہے ہماری دنیا
(جانے لگتا ہے)
پروفیسر ٹھہرو۔ اک بات سنو
تم نہیں جانتے... میں آج ہوں کس غم کا شکار
آواز :- مجھ کو معلوم ہے۔
پروفیسر :- پھر بھی تمہیں احساس نہیں
ایسے عالم میں یہ طعنے..... یہ چوکے!
آواز :- میں نے...
خیر جانے دو۔
پروفیسر :- نہیں..... اس کا سبب بتلاؤ
تم تو احساس کی شدت کی علامت ہو۔ تمہیں...
میرا مطلب ہے کہ تم
اتنے ظالم تو نہیں ہو سکتے
آواز :- میں تو خود ظلم کا مارا ہوں۔
ستم جھیلے ہیں کیا کیا میں نے
جب تلک، تم میں تمہارے رگ و پے میں تھی حرارت۔
تم نے
مجھ پر ہر جبر کیا
جب بھی میں نے کوئی خواہش کی۔
کوئی بات بھی کہنا چاہی
میرے ہونٹوں پہ دہن مہرِ خموشی کی لگا دی تم نے

مجھ میں جاگا کوئی ارماں۔
کوئی نازک سی تمنا کبھی بیدار ہوئی
تم نے محسوس کیا، جیسے وہ ناگن ہے کوئی
تم نہ مارو گے تو ڈس لے گی تمہیں
کیسے کیسے نہ ستم کئے تم نے
کیسے کیسے نہ ستم میں نے سہے
میں کوئی ظلم کسی پر کبھی کر سکتا ہوں
میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ مجھے مار کے تم
وہی پتھر ہو ابھی......
پروفیسر :۔ پھر وہی بات..... تمہیں چین نہیں آئے گا
آواز :۔ چین کس طرح سے آسکتا ہے
میرے سینے میں دہکتا ہے جو دوزخ۔
جب تک
اس کا ہر شعلہ کوئی برگِ گُلِ تر نہ بنے
میری آنکھوں میں ہیں آباد جو خوابوں کے خرابے۔
جب تک
اُن کی ویران فضاؤں کا دھواں
کوئی خوشبو نہ بنے
ان کے آفاق پر اڑتی ہوئی گرد
چادرِ نور نہ بن جائے۔
مجھے کیسے سکوں آئے گا
(پروفیسر سوچتے ہوئے کہتا ہے)
پروفیسر :۔ اور شاید یہ مرے بس میں نہیں
آواز :۔ بس میں سب کچھ ہے تمہارے۔

مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو
مجھ کو معلوم ہے۔ تم نے کیا کیا
خود فریبی کے حسین جال بچھا رکھے ہیں
پروفیسر :۔ خود فریبی کے حسین جال.....!
یہ کیا کہتے ہو؟
آواز :۔ ہاں..... یہ انسان کی فطرت ہے کہ اپنے اطراف
اپنے ہاتھوں سے کوئی دام حسیں بنتا ہے
اور پھر عمر تمام
ایک بے نام تگ و دو میں لگا رہتا ہے
خود الجھتا ہے، سلجھتا ہے۔
سلجھتا ہے، الجھتا ہے۔
اسی کوشش بیکار میں دن رات بسر کرتا ہے
پروفیسر :۔ ٹھیک کہتے ہو..... مگر
وہ حسیں دام ضروری نہیں یکساں ہو۔
کوئی گیسوئے پرخم کے حسیں دام میں ہوتا ہے اسیر
اور کوئی دام خیالات میں۔
یہ اپنے مزاج، اپنی نظر۔
اور اجازت ہو تو اک بات کہوں
(ذرا ٹھہر کر)
یہ ہیں سب ظرف کی باتیں لیکن
آواز :۔ یہ بھی ہے ایک حقیقت کہ ہر ایک ظرف کی حد ہوتی ہے
حد سے باہر وہی دنیا ہے، وہی تم، وہی میں
لاکھ ہم حد میں سمٹ آنے کی کوشش کرلیں

زندگی بھر کسی زنداں میں نہیں رہ سکتے
زندگی کا رنگ ہے، خوشبو ہے، کوئی نور کا دھارا ہے جسے
قید کرنا ہے محال
اس کو گر قید تعین میں بھی لایا جائے
تو کسی وقت بھی وہ حد سے گزر سکتا ہے
ذات کے محبس تاریک سے ہو کر آزاد
وسعت قلب دو عالم میں بکھر سکتا ہے
پروفیسر :۔ میرا مطلب بھی یہی تھا...... لیکن
آواز :۔ یہی "لیکن" تو ہے وہ لفظ جو ہر گام پہ دیوار بنا دیتا ہے
کتنی دیواریں اسی طرح نہ کھینچی تم نے
اپنی کھینچی ہوئی دیواروں میں بیٹھے ہو کسی سایۂ مجبور کے مانند نہ جانے کب سے؟
تم فقط ذات کے زنداں ہی میں محبوس نہیں
بلکہ اس ذات کے اطراف بھی زنداں ہیں
...... ہزاروں زنداں
جن سے تم کو کبھی چھٹکارا نہیں مل سکتا
پروفیسر :۔ تم خدا جانے کیے جاتے ہو کیا کچھ...... آخر
صاف الفاظ میں کہتے نہیں کیوں؟
صاف کہو
آواز :۔ میری ہر بات بہت صاف ہے
تم خود نہ سمجھنا چاہو
تو الگ بات ہے
پروفیسر :۔ میں کچھ بھی نہ سمجھا کہ یہ دیواروں کا مطلب کیا ہے
میرے اطراف تو اب کوئی بھی دیوار نہیں

(یکایک ایک نوجوان جوڑے کی ہنسی اور قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ جیسے وہ باہر سے گھر میں آئے ہوں۔ پروفیسر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر۔)
آواز :۔ تم پریشان سے کیوں ہو گئے...... کیا بات ہے؟
یہ ہنستے ہوئے لوگ برے لگتے ہیں؟
پروفیسر :۔ تم نہیں جانتے......
آواز :۔ میں دونوں کو پہچانتا ہوں
دونوں شاگرد اسی "پیکر ادراک" کے ہیں
ایک ان میں وہی لڑکی۔ ہے جسے تم نے بڑے چاؤ سے......
بیٹی کی طرح پالا ہے
اس کے ساتھ اس کا کوئی "دوست" بھی ہے
پروفیسر :۔ (ترش لہجے میں)
تم کو معلوم ہے یہ دونوں......؟
آواز :۔ محبت میں گرفتار ہیں...... میں جانتا ہوں
پروفیسر :۔ تم نہیں جانتے...... یہ حد سے بڑھے جاتے ہیں
(قہقہوں کی آوازیں بدستور جاری ہیں)
آواز :۔ یعنی اس قید سے آزادی کے طالب ہیں جسے
تم نے ان دونوں پہ عائد کی ہے
پروفیسر :۔ یہ کوئی قید نہیں
وہ تو آزاد ہیں اور قید ہوا چاہتے ہیں
آواز :۔ بس یہی فرق ہے ہم دونوں میں
تم جسے قید سمجھتے ہو وہ آزادی ہے میرے نزدیک
پروفیسر :۔ ہاں اگر یہ نہ سمجھتے تو کسی ذات کو محبس۔
کسی قانون کو دیوار نہ کہتے تم بھی
خیر، میں تو اسی دیوار، اسی محبس کا ہوں پابند...... مجھے

ایسی آزادی کی خواہش نہیں جس پر کوئی تحدید نہ ہو
میں سمجھتا ہوں کہ آزادی ہے پابندیِ جذبات کا نام
کوئی قانون ضروری ہے جو دیوار کے مانند کھنچا ہوا اطراف
اور ہم حد سے نہ بڑھنے پائیں
آواز :- دل کی دنیا نہیں پابندِ رسوم و آئین
لاکھ دیواریں اٹھاؤ..... لیکن
دل وہ وحشی ہے جو ہر لحظہ نئے دشت و بیاباں مانگے
پروفیسر :- زندگی دشت و بیاباں کی تمنائی نہیں
اب وہ شہروں میں سمٹ آئی ہے
شہر کے تنگ حصاروں میں جو وسعت ہے
جو پھیلاؤ ہے وہ دشت و بیاباں میں کہاں!
خیر اس بحث سے حاصل کیا ہے
تم نے سمجھی ہے مری بات نہ سمجھو گے کبھی
میں اس آزادہ روی کا کبھی قائل تھا نہ قائل ہوں گا
میں ابھی دونوں کو سمجھاتا ہوں
آواز :- تم نے پہلے تو بھی سمجھائی ہے یہ بات انہیں
کب وہ خاطر میں تمہیں لائے
کوئی حکم بھی مانا اب تک؟
اپنے الفاظ کو ضائع نہ کرو
چپ رہو
دیکھتے جاؤ کہ تم..... عرصہ گہ زیست میں اب ایک "تماشائی" ہو
اور کچھ بھی نہیں
پروفیسر :- تم تو بہکاتے ہو مجھ کو ــــ
یہ غلط بات ہے ــــ
میں صرف تماشائی نہیں رہ سکتا

میں نے اس لڑکی کو پالا.......
اسے تعلیم دلائی ہے کہ وہ
آواز :- زندگی بھر تمہیں اپنا سمجھے
عمر بھر صرف تمہارے ہی اشارے پہ چلے
پروفیسر :- جو ابھی اتنی سمجھدار نہیں ہے۔
آواز :- تو سمجھدار بھی ہو جائے گی
اور پھر اتنی بھی نادان نہیں ہے کہ بھلے اور برے میں
کوئی تمیز نہیں کر سکتی
یہ بھی ممکن ہے کہ تم جس کو برا کہتے ہو
وہی اچھا ہو..... بہت خوب ہو اس کے نزدیک
(لڑکی کی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے۔)
پروفیسر :- اس کی آواز سنی تم نے.....
آواز :- بہت پیاری، سریلی سی آواز
بہت خوب گلا پایا ہے
آؤ آج اس سے کوئی گیت سنیں
پروفیسر :- گیت؟
آواز :- ہاں گیت..... ذرا لطف اٹھائیں کچھ دیر
فکر و احساس کو نغموں کی سبک لے میں بہا دیں..... آؤ
(پروفیسر کو گومگو کے عالم میں دیکھ کر) آؤ بیکار تکلف نہ کرو
پروفیسر :- کیسی باتیں کئے جاتے ہو..... سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ تم!
تم کو معلوم ہے وہ..... وہ مری بیٹی کے برابر ہے۔
آواز :- تو ہو
تم نے جس جذبۂ بے نام کی تسکین کی خاطر اس کو

اپنی شاگرد بنایا، اسے یہ نام دیا..... گھر میں رکھا
اور دن رات اسے اپنے قریں رکھتے ہو
پروفیسر :۔ مجھ کو ان لفظوں سے کچھ.......!
آواز :۔ کوئی غلط بات نہیں
یہ بھی انسان کی فطرت ہے۔
یہ تنہائی، یہ ویران خوشی کب تک،
کچھ تو اس غم کا مداوا ہو جائے
کوئی بے نام سی تسکین سہی
تشنگی کچھ تو مٹے
زندگی بھر کی مسافت میں ذرا دیر تو آرام ملے
پروفیسر :۔ (بگڑ کر)
کیا کہے جاتے ہو تم.......
سوچ کے ہر بات کہو
آواز :۔ سوچ سے مجھ کو تعلق کیا ہے
میں تو جذبات کی، احساس کی تصویر بنا تا ہوں۔
مٹا دیتا ہوں
اور یہ تصویر تمہاری ہے..... مگر
تم نہ پہچان سکو گے اس کو
یہ ہے اُس روح کی تصویر
جو اس جسم میں آویزاں ہے
یہ ضعیف اور تھکا ہارا بدن
جس کی ہر ایک شکن میں ہے جوانی کی وہ کروٹ پنہاں
جس کو آسودگیٔ خواب نہیں مل پائی
وہ جو برسوں سے ہے بیدار
کسی رات کے آغوش میں سو جانے کو

پروفیسر :۔ چپ رہو
یہ مرے کردار، مرے علم کی توہین ہے
آواز :۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔
یہ دھوکہ ہے جو تم خود کو دیئے بیٹھے ہو
زعمِ آگاہی بھی ہے ایک فریب
تم ہر اک گام پہ اک دام کی الجھن میں گرفتار رہو۔
اور اس سے رہائی کو تم ایک موت سے تعبیر کیا کرتے ہو
تم میں پوشیدہ ہے اک خوف
جو اک ناگ کے مانند ہے پھن پھیلائے
تم سمجھتے ہو کہ جیسے ہی تم اس دام سے باہر آئے
روح کا ناگ تمہیں ڈس لے گا
اور برسوں کی ریاضت.....
یہ خیالات کے آوارہ بگولوں کا تعاقب،
یہ سفر
راہ کی اڑتی ہوئی گرد میں کھو جائے گا
(پروفیسر کو سوچتا ہوا پا کر)
تم کو معلوم نہیں
زندگی صرف سفر ہی نہیں..... کچھ اور بھی ہے
فکر کی راہگذر ہی نہیں..... کچھ اور بھی ہے
پروفیسر :۔ آخر اس درس کا مقصد کیا ہے؟
آواز :۔ زندگانی کا حسیں روپ بھی دیکھو پل بھر
افقِ ذہن کے اُس پار...... جہاں
نیلگوں چرخ کی پہنائی میں
چاند کے پاس ستارہ ہے۔

جو چپکے چپکے
چاند کی نقرئی باہوں میں سمٹ آیا ہے
کاخِ گُل کے کسی خاموش جھروکے سے کبھی جھانک کے دیکھا تم نے
کسی بھٹکی ہوئی خوشبو کا کوئی رقصِ لطیف
اور شبنم کے روپہلے گھنگرو
جب بج اٹھتے ہیں تو سورج کی سنہری کرنیں
کس لئے سجدے میں جھک جاتی ہیں۔ کیا پاتی ہیں؟
صبح دم موجِ صبا کرتی ہے کس کے لب و عارض کا طواف؟
اس کی اٹھلاتی ہوئی چال میں کیوں ہوتی ہے دل خیز ترنگ؟
کس کی آنکھوں کا نشہ
کس کے بدن کی خوشبو
کس کی زلفوں کی مہک
اس کے دامن میں چھپی ہوتی ہے
اک ذرا سوچو کہ فطرت کا تقاضا کیا ہے
عشق کیا چیز ہے اور حسن کا منشا کیا ہے
پروفیسر :۔ لیکن اب تو میں بہت دور نکل آیا ہوں
آواز :۔ اسی دوری نے کیا ہے تمہیں منزل سے قریب۔ میرے
ہمراہ چلو
تم تھکے ہارے ہو، بوڑھے ہو...... یہ مانا، لیکن
تم جواں بھی ہو، مری طرح تنومند...... جواں
عمر بڑھ جائے تو بوڑھا نہیں ہوتا انساں
جب تلک تشنگیِ جذبہ و احساس ہے باقی......
اے دوست
آدمی بھی ہے جواں

ضعف، آسودگیِ حسرت و ارماں کا ہے نام
آؤ.... آج اپنی تمناؤں کی تکمیل کریں
زندگانی کے ہر اک حکم کی تعمیل کریں
آؤ.... اس منظرِ خاموش کا نظارہ کریں
جس کے ہر رنگ سے آوازِ جرس آتی ہے
پروفیسر :۔ تم کہاں مجھ کو لئے جاتے ہو۔
اُس کمرے میں.....!
"وہ" سوئی ہے جس میں......!!
آواز :۔ ہاں..... آؤ
پروفیسر :۔ میں نہیں جاؤں گا..... ہرگز نہیں جاؤں گا....
آواز :۔ (بات کاٹتے ہوئے)
مگر اس سے تمہارا کوئی رشتہ تو نہیں
میرا مطلب ہے، کوئی "خون" کا رشتہ بھی نہیں
اور تم نے اسے جو "نام" دیا ہے
وہی دھوکہ ہے جو تم "خود" کو دیئے بیٹھے ہو
پروفیسر :۔ نہیں یہ بات نہیں ہو سکتی
تم مجھے ایک گنہ کے لئے اکساتے ہو
آواز :۔ تم تو مفروضوں کی دنیا میں جیئے جاتے ہو
یہ گنہ اور ثواب...... اور نیکی یہ بدی
محض مفروضے ہیں،
خود ساختہ دیواریں ہیں
جن کی بنیادیں کچھ بھی نہیں،
سچائی کی اک اینٹ نہیں
یہ اصول اور ضوابط

وہ گھروندے ہیں جو تہذیب کے معماروں نے
کچی مٹی سے بنائے ہیں کسی وقت بھی ڈھ سکتے ہیں
پروفیسر :- ٹھیک ہے۔
میں...... مگر اس قسم کا اقدام نہیں کر سکتا
آواز :- (لہجہ تلخ ہو جاتا ہے)
اس کا مطلب ہے کہ تم ایک نمائش کا کھلونا ہو۔
وہ بے جان کھلونا، جس میں
زندگی کا کوئی امکان نہیں
تم بظاہر جو نظر آتے ہو...... ایک جھوٹ......
نہیں جھوٹ ہے...... اور کچھ بھی نہیں
تم وہ پتھر ہو جو انسان نہیں بن سکتا
میں سمجھتا تھا کہ تم میں اب تک
زندگانی کی حرارت ہوگی
تم مگر برف کا پیکر نکلے
پروفیسر :- تم......
سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں
کیسے سمجھاؤں......
ذرا غور کرو
لڑکی تو سوچو کہ وہ کیا سوچے گی
آواز :- سوچ کا وقت نہیں
تم کو چلنا ہے......
اسی مست جد مٹر میں جا ہوں
میں نے ہر جبر گوارا کیا اب تک...... لیکن
اب میں یہ جبر نہ برداشت کروں گا۔

آؤ
تم نے کل تک تو مجھے قوت بازو سے۔
ارادوں کی اٹل طاقت سے
سرکشی سے مجھے روکے رکھا
اب مگر تم میں وہ طاقت نہیں۔
وہ عزم و ارادہ کی صلاحیت نہیں۔
تم موم کا ایک بت ہو جو اب میرے تصرف میں ہے۔
میرے بس میں
آؤ، اب وقت نہ برباد کرو
میرے ویرانے کو آباد کرو
پروفیسر :- تم...... مگر...... اتنا تو سوچو کہ میں بوڑھا ہوں......
بڑھاپے کا جوانی سے علاقہ کیا ہے
مجھ میں اور اس میں سن و سال کا ہے کتنا تفاوت...... سوچو،
آواز :- یہ تفاوت ابھی مٹ جائے گا۔
جب بڑھاپے کو جوانی کا سہارا ہوگا
ہر بڑھاپے کو سہارے کی ضرورت ہے
سہارا کوئی بوڑھا تو نہیں دے سکتا
آؤ...... چپ چاپ چلے آؤ...... ادھر
(پروفیسر لڑکی کے خواب گاہ میں چلا جاتا ہے)
دیکھو...... یہ خواب میں کھویا ہوا حسن
سرخ ہونٹوں پہ یہ ہلکا سا تبسم...... توبہ
اور زلفوں کا یہ بکھرا ہوا انداز......
یہ قامت کی درازی
یہ تراشا ہوا جسم
اور یہ ایک دریچے سے خنک چاند کی کرنوں کا نزول

جیسے اک چادرِ زرتار۔
فرشتوں نے اسے عرش سے بھیجی ہے۔
ذرا دیکھو تو
ایسی تنہائی میں تم نے کبھی دیکھا کوئی سویا ہوا حُسن
ہاں..... ذرا جرأتِ رندانہ سے کام لو......
ذرا ہاتھ بڑھاؤ...... یہ لرزتے ہوئے ہاتھ
ریشمی زلفوں کو چھو کر دیکھو
آج محسوس کرو لمس کی "لذت" اے دوست
لمس کی راحت...... اے دوست
زندگانی ہے اسی "راحتِ محسوس" کا نام
(یکایک پروفیسر پیچھے ہٹ جاتا ہے)
کیا ہوا..... ڈر گئے؟

کیا سوچ رہے ہو؟
مجھے اس طرح سے کیوں دیکھ رہے ہو!
یہ نگاہوں میں ہیں شعلے کیسے؟
تم مجھے کھینچ کے لے جاتے ہو اس طرح کہاں؟
پروفیسر :۔ (اپنے کمرے میں آتے ہوئے)
مجھ کو بہکائے لئے جاتا تھا
مجھ کو سمجھا تھا کہ بوڑھا ہوں میں، کمزور ہوں میں
تیری طاقت سے میں دب جاؤں گا
تو نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے
(میز کی دراز سے پستول نکالتا ہے)
میں تجھے آج فنا کر دوں گا
آج میں تجھ کو فنا کر دوں گا

(یکایک ایک پستول کی آواز فضا میں گونج جاتی ہے ساتھ ہی پروفیسر کی دل دوز چیخ۔ دروازہ پیٹنے اور پھر ٹوٹنے کی آوازیں۔ خود کشی۔۔۔ پروفیسر نے خود کشی کری اور پھر مختلف لوگوں کی آوازوں میں سے ایک نسوانی چیخ کی آواز اور آہ وبکا ابھرتی ہے اور دیر تک جاری رہتی ہے۔)

[illegible]

میں آئینے میں بھی ہوں، آئینے کے باہر بھی
مرے وجود کی وحدت میں یہ دوئی کیا ہے

حمایت علی شاعر

مقالات

تہذیبی سفر کا راہی

احمد ہمدانی

عالم فطرت انسانیت کا خارج اور دنیائے احساس اس کا باطن ہے' سورج' چاند ستارے' دریا' درخت' پہاڑ غرضیکہ فطرت کے تمام مناظر معروضی طور پر موجود ہوتے ہیں لیکن ان کے وجود کی ایک صورت ذہن انسانی میں بھی ہوتی ہے' ذہن انسانی میں مناظر فطرت کی یہ صورت انسانی فکر اور انسانی تہذیب کے سفر ارتقاء کا وہ زادراہ ہے جس کے بغیر یہ سفر کسی طرح ممکن ہی نہیں' حمایت علی شاعر تہذیبی سفر کا ایک ایسا مسافر ہے جو کسی لمحہ بھی اس زادراہ سے بے خبر نہیں ہوتا اس کی شاعری مناظر فطرت سے محرمانہ گفتگو ہے جو قدم قدم پر انسانی سماج کو فطرت کا آئینہ دکھاتی اور فطرت کو انسانی احساس میں جلوہ گر کرتی ہے۔ وہ جب سورج کی روشنی یا سمندر کے تموج کا ذکر کرتا ہے تو سورج یا سمندر صرف معروضی حقیقتیں نہیں ہوتیں بلکہ وہ ان معروضی حقیقتوں میں اپنے معاشرہ کا چہرہ ابھارتا نظر آتا ہے۔ اسے نہ تو علامت نگاری کا ایسا ہاؤکا ہے جو اسے مہملیت اور بے کیفی کے اندھیروں میں دھکیل دے اور نہ استعاروں کو صرف استعاروں کی خاطر استعمال کرنے کا ایسا شوق ہے کہ اس کے وجود کا شعلہ فرسودگی اور تقلید کی یخ بستہ فضا میں ٹھٹھر کر رہ جائے' اس کی علامتیں اور استعارے اس کے باطن سے پھوٹتے اور اس کے سفر تہذیب میں زادراہ بن کر اس کے ساتھ رہتے ہیں اس کی یہی ایک خصوصیت اس کے شاعر ہونے کی بجا طور پر ایک بڑی شہادت ہے۔

حمایت علی شاعر نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز نظم نگاری سے کیا جو اپنی جگہ ایک منفرد بات ہے کیونکہ اردو میں عام روش کے مطابق شعر گوئی کی ابتداء غزل گوئی سے کی جاتی یوں بھی غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس کا ہمارے تہذیبی مزاج سے بہت گہرا تعلق ہے۔ حمایت کی ابتدائی نظمیں دیکھنے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس نے یہ کوشش شعوری طور پر نہیں کی تھی بلکہ یہ اس کے باطنی تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظمیں ہمارے تہذیبی مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ رہتی ہیں۔ اس کی نظم گوئی غزل کے خلاف کوئی ردعمل نہیں تھا نہ اس نے کبھی تقلید مغرب کی فضا میں اپنی روایت سے انحراف کی کوشش کی چنانچہ نظم نگاری میں خاطر خواہ دسترس حاصل کرنے کے بعد جب اس کی باطنی کیفیت غزل گوئی کی متقاضی ہوئی تو اس نے بغیر کسی پس و پیش اور تامل کے غزلیں بھی لکھنا شروع کردیں اور بہت کم عرصہ میں غزل کے مقبول شعراء کی صف میں بھی شامل ہوگیا اور یہ ثابت کردیا بالطبع وہ کوئی یک فضا شاعر نہیں ہے۔ شاعری سے قطع نظر اس کی روزمرہ زندگی بھی اس کی ہمہ جہت شخصیت کی آئینہ دار ہے اس نے معاشرتی انتشار کی فضا میں اپنی شخصیت کی سالمیت کو جس طرح برقرار رکھا ہے وہ نہ صرف مختلف اصناف کے اپنانے سے ظاہر ہے بلکہ اس کے موضوعات' لہجے' رویے اور اسلوب سے بھی نمایاں

ہے۔

وکٹر ہیوگو کا خیال تھا کہ شاعر اور ادیب اپنی صدی کی آواز ہوتے ہیں چنانچہ اس کی رائے میں اس کے معاصر شاعر، ادیب اور مفکر سب انقلاب فرانس کی پیداوار تھے۔ حمایت بھی برصغیر میں برطانوی سامراج کے حالات کی پیداوار ہے۔ اس کا شعری مزاج سامراجی تشدد کے خلاف بغاوت کے جذبہ سے تشکیل پایا ہے۔ اس نے کڑے وقت کا سامنا کیا ہے اور غم و اندوہ کی تاریک و مہیب گھاٹیوں میں اپنے اندر کے انسان کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اچھے دنوں کی امید کے چراغ روشن رکھے ہیں۔ اس نے تاریک عہد کی پیشانی پر روشن زمانہ کے آثار ابھارے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری صرف اس کے لئے نہیں بلکہ پورے معاشرے کے لئے بامعنی سرخوشی کا ایک وسیلہ ہے۔ اس نے اپنے اطراف کے حالات کو دیکھا بھی، ان پر غور بھی کیا اور سب سے بڑھ کر ان حالات کو پوری طرح سر کرکے انہیں اپنا تجربہ بنایا ہے اور تجربہ ہی فن کارانہ تخلیق کی اصل بنیاد ہے۔ تجربہ جب تخیل میں رچ کر اظہار کی صورت اختیار کرتا ہے تو شاعری کہلاتا ہے۔ حمایت تجربہ اور تخیل کو ہر لمحہ ہمکلام رکھنے کی کوشش میں منہمک رہتا ہے۔ اس کا یہ انہماک ہی اس کی شاعری ہے۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتا ہے، ان کی بھولی بھولی معصوم باتیں سنتا ہے لیکن اپنے فنکارانہ انہماک سے غافل نہیں ہوتا۔ بچوں سے پیار اور ان سے باتیں کرنا اس کے تجربے کا حصہ ہیں جبکہ اس کا فنکارانہ انہماک اس کے تخیل کی کارفرمائی ہے جو آخر کار شعری اظہار کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ مثلاً"

جیسے آغوش محبت میں ہمکتی ہوئی ننھی بچی
اپنے بابا کو کسی فکر میں ڈوبا ہوا پاکر خود بھی
کھیلتے کھیلتے چپ چاپ کسی سوچ میں کھو کر رہ جائے
اور پھر باپ کی پلکوں پہ لرزتا ہوا کوئی آنسو
اپنی بچی کے کھلے پھول سے رخسار پر گر کر بہہ جائے

یوں تو یہ ایک پانچ مصرعوں کی مختصر سی نظم ہے لیکن حمایت کے تجربہ اور تخیل نے مل کر اسے پورے عہد پر پھیلا دیا ہے۔ اس نظم کی ایک سطح تو واقعاتی ہے جو باپ کی پریشانی پر بچی کو افسردہ کرتی نظر آتی ہے اور پھر بچی کی افسردگی باپ کو رلا دیتی ہے لیکن نظم صرف واقعاتی سطح پر ختم نہیں ہوجاتی "اپنے بابا کو کسی فکر میں ڈوبا ہوا پاکر" میں فکر کی وضاحت نہیں کی گئی ہے اس طرح "بچی کھیلتے کھیلتے چپ چاپ کسی سوچ میں کھو جاتی ہے" میں سوچ کو مبہم ہی رکھا گیا ہے۔ دونوں مصرعوں میں لفظ "کسی" بھرپور شاعرانہ رمزیت کے ساتھ استعمال ہوا ہے جس سے باپ کی فکر اور بچی کی سوچ نظم کے بنیادی لفظ بن جاتے ہیں اور اپنے فکر رمزی و ایمائی اظہار کی وجہ سے واقعاتی سطح سے بلند ہوجاتے ہیں۔ باپ حالات کا شکار ایک ایسا فرد بن جاتا ہے جو مستقبل کی صورت گری میں مصروف ہے اور بچی مستقبل کا استعارہ بن کر ابھرتی ہے مستقبل ساز، شخصیات ایسے لمحات سے اکثر دوچار رہتی ہیں جب مخالف اور نامساعد حالات ان کے دکھوں میں اضافہ کردیتے ہیں۔ حمایت نے اس نظم میں ایسے لمحات ہی کو اسیر کیا ہے۔ نظم میں باپ اور بچی کی بھرپور معنویت کے ساتھ نمایاں خوبی یہ ہے کہ نظم واقعاتی سطح پر بھی پرکشش ہے اور اپنے وسیع تر پس منظر میں روز مرہ زندگی کا سچا اظہار بھی ہے۔ نظم کی دونوں علامتیں شاعر کے اپنے تجربے سے پھوٹی ہیں جنہیں فکر اور "سوچ" کے غیر متعین اشاروں نے پوری زندگی پر پھیلا دیا ہے۔ اس کی ایک اور نظم "اندیشہ" ملاحظہ ہو۔

سہمی سہمی کھل رہی تھی اک کلی
میں نے پوچھا
کیا خزاں کا خوف ہے؟
جی نہیں۔ اک دن خزاں تو آئے گی
پھر؟
سنا ہے (اس نے چپکے سے کہا)
اس چمن کا باغباں گلچیں بھی ہے۔

اس نظم کی بھی دونوں علامتیں "کلی" اور "گلچیں" پورے معاشرتی حالات کو محیط نظر آتی ہیں۔ نظم میں موت و حیات کے فطری عمل کو کھلے دل سے تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن موت و حیات کا عمل جب استحصالی قوتوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو تردد اور پریشانی بڑھ جاتی ہے' یہاں بھی کلی مستقبل کی علامت اور گلچیں حالات کا استعارہ ہے۔ چھٹے مصرعے میں "اس نے چپکے سے کہا" میں بے جا پابندیوں کے خوف کا اظہار ہے' جو بات پہلی نظم میں انسانی رشتوں کے حوالے سے کہی گئی تھی وہی بات اس نظم میں ایک فطری منظر سے ابھاری گئی ہے۔ آج کل علامت نگاری کا بہت ذکر کیا جاتا ہے لیکن صحیح معنے میں علامت کا استعمال شاذ شاذ ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے علامت کوئی فیشن یا تقلید کی چیز نہیں ہے۔ علامت کا تعلق باطنی احساس سے ہے۔ یہ حقیقت کی حسی تصویر ہے۔ استعارے یا تشبیہ کی طرح شاعر علامت میں اپنے احساس یا خیال کو اشیاء و مناظر کی خارجی مماثلت میں پیش نہیں کرتا بلکہ پوری زندگی کو اپنے احساس کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ علامت کی معنویت کسی منطق یا استدلال کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ یہ شاعر کے احساس کی ہم رشتہ خارجی حقیقت کی منفرد اور مخصوص صورت ہوتی ہے جو بغیر کسی ظاہری تلازمہ کے اظہار پاتی اور براہ راست احساس کو چھوتی ہے اور اگر کہیں کوئی تلازمہ یا خارجی مماثلت آبھی جائے تو وہ بغیر کسی شعوری کوشش کے آتی ہے جیسے حمایت کی مذکورہ نظم بچی کی علامت مستقبل کے نشان کی حیثیت سے پھیلتی نظر آتی ہے۔

علامتوں کے سلسلہ میں حمایت کی نظم "بگولا" کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے اس نظم میں "بگولا" ہوائی جہاز کے حوالے سے تمام خلائی فتح مندیوں اور ستاروں کی تسخیر کے عمل کو ظاہر کرتا ہے' خارجی مماثلت کے اعتبار سے "بگولا" یکسر وحشت کا ترجمان ہے اور ہماری روایتی شاعری میں بگولے کو وحشت ہی کے استعارہ کے طور پر برتا گیا ہے لیکن ہوائی جہاز کی پرواز یا خلائی تسخیر کا عمل وحشت کے بجائے تابناکی اور کامرانی کا عمل ہے۔ یہ ذہن انسانی کی ایک ایسی کامیابی ہے کہ اس پر جس قدر بھی فخر کیا جائے کم ہے لیکن کیا کریں کہ ذہن انسانی کی اس قابل فخر کامیابی کو چند استحصالی قوتوں نے انسان کی تباہی کا وسیلہ بنا دیا ہے۔ یہ ذہن انسانی کے کارناموں کی خرابی نہیں بلکہ ان کارناموں کے ثمرات کو غلط طور پر استعمال کرنے کا نتیجہ ہے۔ حمایت علی شاعر جب ذہن انسانی کے اس عظیم کارنامہ کے معاشرتی کوائف سے ہم رشتہ کرکے دیکھتا ہے تو اسے یہ سارا قابل فخر عمل وحشت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا' وحشت ان معنی میں کہ ایک طرف انسان پیٹ بھر روٹی کو ترس رہا ہے اور دوسری طرف انسان ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے' ایک طرف انسان خلاء کو تسخیر کررہا ہے اور دوسری طرف اس تسخیر سے نوع انسانی کو جنگ اور عدم تحفظ کے غاروں میں دھکیل رہا ہے۔ معاشرہ کا یہ تضاد بگولے کی وحشت نمائی کے سوا کیا ہے! یہاں حمایت نے ایک روایتی استعارے کو اس کی روایتی حدود سے نکال کر ایک علامت بنایا ہے جو حقیقت سے کسی ظاہری و

صوری مماثلت کے بغیر انسانی صورت حال کی اک حسی تصویر ہے۔ اس طرح اس کی نظم "سنگ میل" میں "سنگ میل" انسان کی بے عملی کی علامت بن کر ابھرتا ہے جبکہ روایتی شاعری میں یہ رہنمائی یا مسافت سفر کا نشان ہے۔ الغرض حمایت کو علامت نگاری کا کوئی بے جا شوق تو نہیں لیکن اسے علامتیں تراشنے اور انہیں برتنے کا سلیقہ ضرور آتا ہے۔

شاعری میں ہیئت کا تجربہ اور نئی اصناف کی تلاش کوئی انوکھی بات نہیں ہے البتہ ان تجربات اور اس تلاش کو فنکار کے حسی تقاضوں اور باطنی دباؤ کا نتیجہ ہونا چاہئے۔ صرف ہیئت کے تجربات کو مقصد بنالینا کوئی تخلیقی عمل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ حمایت نے اصناف شاعری کے سلسلے میں ایک صنف ثلاثی کا تجربہ کیا ہے اس کے لئے یہ تجربہ اس کے باطنی دباؤ ہی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے یعنی وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کی لئے ایک مناسب صنف درکار تھی جو اس پر اس کے تخلیقی عمل کے دوران میں منکشف ہوئی جسے اس نے تین مصرعوں کی نظم کی صورت میں پیش کردیا۔ جب حمایت پر منکشف شدہ یہ صنف عوام میں مقبول ہونے لگی تو ہمارے کچھ دوستوں نے دعوے کرنے شروع کردیئے کہ حمایت سے پہلے وہ اس صنف کو ایجاد کرچکے تھے۔ ہمارے ان دوستوں کے یہ دعوے سراسر نادانی پر محمول ہیں کیونکہ حمایت سے ثلاثی ایک صنف کے طور پر مقبول ہی نہیں ہوئی تھی اور اگر کسی نے مغربی زبان کے زیر اثر کوئی ایک، آدھ تین مصرعوں کی نظم کہہ بھی لی تھی تو اسے باطنی دباؤ کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا، خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ آیئے دیکھیں کہ جب کوئی صنف کسی پر منکشف ہوتی ہے تو اس کی صورت کیا ہوتی ہے حمایت کی چند ثلاثیاں ملاحظہ ہوں۔

الہام

کوئی تازہ شعر اے رب جلیل
ذہن کے غار حرا میں کب سے ہے
فکر محو انتظار جبرئیل

اسلوب

کس طرح تراش کر سجائیں
نادیدہ خیال کے بدن پر
لفظوں کی سلی ہوئی قبائیں

یہ دونوں ثلاثیاں حمایت کے اس باطنی دباؤ کی مظہر ہیں جو ایک نئی صنف کے انکشاف کا سبب بنا۔ اس نے یہ ثلاثیاں ایجاد صنف کے طور پر نہیں کہیں۔ بلکہ یہ اس کی باطنی کیفیت کا فطری اظہار ہیں جو لفظوں میں آنے کے بعد خود بخود ایک نئی صنف کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ آج کل جدیدیت اور روایت کی بحثیں بہت عام ہیں اور ان مباحث میں انتہا پسندی کی ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ناطقہ سربگریباں ہے انہیں کیا کہئے لیکن حمایت کی ایک ثلاثی میں یہ مسئلہ تمام مباحث سے الگ اس کے اپنے وجود میں حل ہو کر کس خوبصورتی سے اظہار پاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اساس

کب ہوا کی کوئی تحریر نظر میں آئی
گر زمیں ہو، تو ہر ایک بیج میں امکان شجر
بے زمیں ہو تو ہر اک نقش نمو ہے۔ کائی

آپ نے دیکھا کہ روایت اور جدیدیت کے مسئلہ کو سلجھانے کے لئے ان تین مصرعوں میں زمینیت کی اہمیت کو کس بھرپور انداز سے ابھارا گیا ہے۔ زمینیت بجائے خود مقامی ثقافت اور روایت کی ایک علامت ہے جدیدیت کے وہ پرستار جو زمینیت

یا روایت سے قطع تعلق کر کے نئے تخلیقی امکانات کے دروازے کھولنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل ہر طرف "کائی" بکھیرتے ہیں جس پر چل کر آدمی صرف پھسل ہی سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر زمین سے تعلق برقرار رہتا ہے تو تخلیق کے بیج سے نئے درخت اگائے جاسکتے ہیں۔ یہ نئے درخت بھی جدیدیت ہیں۔ حمایت نے اتنی بڑی بحث کو جس طرح تین مصرعوں میں سمیٹ لیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تین مصرعوں والی صنف اس پر واقعی منکشف ہوئی ہے۔ اس نے اسے اپنے اوپر اوڑھا نہیں ہے۔ حمایت کی ثلاثیوں کی اثر انگیزی اس کے احساس کی صداقت کی داخلی شہادت ہے۔

حمایت کی ثلاثیوں کا موضوع اس کے کسی احساس کی کوئی ہلکی اور نازک سی لہر یا اس کے خیال کی مخفی کرن ہوتی ہے۔ کسی ہلکی اور نازک حسی لہر کے لئے مختصر ترین نظم ہی کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ نزاکت کا طوالت کے ساتھ برقرار رہنا اگر ناممکن نہیں تو سخت دشوار کام ہے البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ نزاکت احساس اپنی اثر انگیزی کے عمل میں بھی محدود ہو۔ چنانچہ حمایت اپنی ثلاثیوں میں اپنے احساس کی نازک سی لہر کو تخیل کی مدد سے پوری زندگی پر منطبق کردیتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں اثر انگیزی کی ہمہ گیری حاصل ہوجاتی ہے۔

حمایت نے اگر ایک طرف اپنے نازک احساسات کے اظہار کے لئے ثلاثی جیسی مختصر صنف کو اپنایا تو اپنے پورے عہد کی صورت گری کے لئے طویل نظم کا انتخاب کیا۔ اس کی نظم "بنگال سے کوریا" تک ہمارے پورے عہد کی تصویر ہے لیکن اس نے یہ تصویر اطراف میں رونما ہونے والے واقعات کے خدوخال سے بنانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اس نے ان واقعات کو اس صورت میں ابھارا ہے جس صورت میں وہ اس کے ذہن میں مرتسم ہوئے تھے۔ فنکار کے ذہن میں خارجی دنیا کی مرتسم شدہ صورت دراصل معروض کے موضوع میں تبدیل ہونے کا نام ہے اور شاید معروضیت کی یہی موضوعیت شاعری ہے۔ حمایت نے اپنی اس طویل نظم میں بچپن سے جوانی تک کے واقعات کو اپنی یادوں کے جھروکوں سے دیکھا اور شعر کی صورت میں ڈھالا ہے۔ اس نے یادوں کے ان جھروکوں میں طبقاتی معاشرہ کی سفاکیوں، جنگ کی ہولناکیوں اور قحط کی آفت سامانیوں کے ہاتھوں نوع انسانی کو بدحال ہوتے دیکھا لیکن اس کی جرات، حوصلے اور امید نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس کی حوصلہ مندی اور پرامید رویہ کا سبب اس کی معصوم بچی ہے جس کا مستقبل سنوارنے کے لئے حمایت کے اندر چٹان کی سی صلابت آجاتی ہے۔ پوری نظم کا تانا بانا انسان سے محبت کے جذبہ سے بنا گیا ہے مگر انسان سے اس کی یہ محبت یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بعد پیدا ہونے والی رومانی فکر اور اس کی انسان پرستی HUMANISM کی تحریک سے بالکل الگ چیز ہے۔ اس کی انسان دوستی طبقاتی معاشرہ میں انسان کی زبوں حالی کے حقیقت پسندانہ تجزیہ سے پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ انسانوں کے ان طبقات کو جو دوسرے انسانوں کی بربادی کا سبب بنے ہوئے ہیں کسی طرح بھی گلے لگانے کو تیار نہیں۔ وہ انسان دوستی کی آڑ میں استحصالی قوتوں کے مظالم پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا۔ نظم کی ابتداء میں وہ اپنی یادوں کے جھروکے سے اپنا گاؤں اور اپنے بچپن کے شب و روز کو دیکھتا ہے۔

وہ مرا گاؤں میرا اپنا وطن — سبز شاداب کھیتوں کے بیچ
میری جنت، مرا جہنم زار — بھوکی ننگی حیات کا بازار
چند اونچی حویلیوں کے گرد — ارتقائے جہاں کی پستی کے
زندہ لاشوں کی تربتوں کا دیار — ہر فریب حسین کا آئینہ دار

حسن فطرت کا سادہ لوح امیں
زر گزیدہ سماج کا شہکار

یہ ہے اس کے گاؤں کی تصویر جو اس کے احساس کے آئینہ خانہ اور ذہن کے پردہ پر محفوظ ہے۔ اگر ہم غور کریں تو نظم میں اس کا گاؤں پوری دنیا کا نشان بن جاتا ہے جہاں طبقاتی معاشرہ اپنے اندرونی تضادات سے زندگی کو عذاب بنائے ہوئے ہے معاشرہ کے ان تضادات کو اس نے جنت اور جہنم راز' اونچی حویلیوں اور زندہ لاشوں کی تربتوں' شاداب کھیتوں اور تنگی بھی حیات' ارتقاء اور پستی' حسن فطرت اور زرگزیدہ سماج کے تضادات سے بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے۔ اسی طرح جنگ کی تباہ کاریوں کو دیکھ کر وہ کچھ اس انداز سے سوچتا ہے۔

اک طرف موت کا بھیانک خوف — ہم میں کیا دشمنی ہے جس کے لئے
اک طرف دل کے نت نئے ارماں — خوں اگلتا ہے جنگ کا میداں
سوچتا تھا کہ کس لئے آخر — زندگی کے سبھی ہیں شیدائی
ہم ہیں آپس میں یوں حریف جاں — میں بھی انساں ہوں وہ بھی ہیں انساں

کتنی مجبور بربریت پر
آج انسانیت اتر آئی
چند سکوں میں بیچ کر خود کو
زندگی آج تو کدھر آئی

یورپ میں دو بڑی جنگوں نے وہاں کے طرز احساس اور طرز فکر میں جو انقلاب پیدا کیا ہے اس سے ہم سب ہی واقف ہیں۔ وہاں طرز احساس و طرز فکر کی تبدیلی نے بہت بڑی حد تک منفی جہت اختیار کرلی ہے۔ جس کے نتیجے میں بہت سے ادیب زندگی کو بے معنی اور سماج کو ایک بوجھ سمجھنے لگے ہیں لیکن حمایت نے اپنے احساس اور اپنی فکر کو اس منفیت سے ہمیشہ بچائے رکھا ہے۔ "بنگال سے کوریا تک" کے علاوہ ان کی تین اور طویل نظمیں "شکست کی آواز" "بدلتے زاویئے" اور "شعلہ بے دود" ہیں۔ ان میں "شکست کی آواز" اور "بدلتے زاویئے" تمثیلی نظمیں ہیں۔ جن میں سے پہلی نظم ایک ایسے پروفیسر کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہے جس نے اپنے جذباتی وجود کا گلا گھونٹ رکھا ہو لیکن اس جذباتی وجود سے اسے مفر بھی حاصل نہیں ہوسکا' پورے آدمی کے لئے فکر اور جذبہ دونوں لازمی ہیں چنانچہ ان میں سے کسی بھی عنصر کو پوری طرح فنا کرنا خودکشی کے مترادف ہے... دوسری نظم "بدلتے زاویئے" میں آدمی' وقت اور زندگی کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ انسان کی تقدیر سفر اور صرف سفر ہے یعنی اس کائنات کا اصل اصول حرکت و تغیر ہے جس کے تحت انسان بھی ہمیشہ متحرک رہتا اور ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔

الغرض اپنی طویل نظم ان میں حمایت نے مسائل حیات کے بارے میں انتہائی متانت سے سوچا اور حد درجہ تحمل سے ان کا اظہار کیا ہے۔ تحمل اس کے مزاج کا حصہ اور اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے اس نے تمام ہی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہمیشہ اپنے وجود میں برپا قیامت کو قبول کرتے ہوئے متانت سے اس کا اظہار کیا ہے وجود کے اندر برپا قیامت میں بہہ جانا لہجہ کو بے تہہ اور بے اعتبار بنادیتا ہے ہماری اس بات کا اندازہ بہت سے جدید شاعروں اور ادیبوں کی

تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے جو اپنی اندرونی کشمکش سے مغلوب ہو کر بے صبری سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے طرز اظہار میں ایک طرح کی بے زاری، جھلاہٹ اور کبھی کبھی چونکا دینے والا انداز تو مل جاتا ہے لیکن ان میں دیرپا تاثر کی ہمیشہ کمی رہتی ہے۔ تخلیقی عمل بے صبری کا عمل کبھی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ فنکار اپنی اندرونی کشمکش کو اپنے اندر اس طرح سمائے رکھے جیسے کہ بیج کو زمین کے اندر بو کر چھوڑ دیا جاتا ہے اور یہ توقع نہیں کی جاتی کہ اس سے انکھوے فوراً ہی پھوٹ آئیں۔

غزل کے بغیر ہمارے ہاں شاعری کا تصور ہمیشہ ادھورا رہتا ہے۔ حمایت نے اپنی شاعری کا آغاز ہرچند نظم سے کیا لیکن غزل سے گریز اس کا مسئلہ کبھی نہیں رہا، چنانچہ اس کی شاعری کا خاصہ بڑا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس صنف میں بھی اس کا مزاج پوری طرح نمایاں ہے۔ غزل ہو یا نظم دراصل شاعری کی اساس شاعر کا تصور حقیقت ہوتا ہے جن لوگوں کا اپنا کوئی تصور حقیقت نہیں ہوتا ان کی شاعری صرف لفظوں کو جوڑنے کے تھکا دینے والے بے کیف اور بے مزہ عمل کے سوا کچھ نہیں ہے ہمارے روایتی معاشرہ میں تصور حقیقت ہمیں وراثت میں ملتا تھا اور ہم اسے بلا تامل تسلیم کر لیتے تھے۔ اس زمانے میں اقدار و تصورات کو مطلق سمجھا جاتا تھا جن میں کسی قسم کے تغیر اور تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ہمارے زمانے میں اقدار و تصورات کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اقدار و تصورات کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنے سے یہ کبھی لازم نہیں آتا کہ تمام مروجہ اقدار و تصورات کو یکسر مسترد کر دیا جائے چنانچہ حمایت کے تصور حقیقت میں بہت سی وہ قدریں شامل ہیں جو ہمیشہ سے نوع انسانی کے نظام اقدار کا حصہ رہی ہیں لیکن اس نے انہیں ورثتاً" قبول کرنے کے بجائے اپنے تجربہ سے سیکھا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے تصور حقیقت کی سب سے نمایاں قدریں نوع انسانی سے محبت اور اپنے وطن کی مٹی سے پیار سمجھی جاتی ہیں۔ یہ قدریں اتنی ہی پرانی ہیں جتنی خود نوع انسانی لیکن ذاتی تجربہ سے حاصل ہونے کی وجہ سے حمایت کے یہاں ان کی صورت قدرے مختلف ہے اس نے نوع انسانی سے محبت کرنا سامراجی اور طبقاتی معاشرہ میں استحصال کی شدت اور غیر انسانی رویوں کی تباہی کو دیکھ کر سیکھا اسی طرح اپنے وطن کی مٹی کی برکتوں اور اپنی زمین کے تقاضوں نے اسے حب الوطنی کے چلن سے آشنا کیا۔ اسی طرح یہ قدریں اس کی اپنی دریافت کردہ قدریں ہیں، چنانچہ اس کی شاعری میں ان قدروں کا اظہار اس کی اپنی ذات کا اظہار بن جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شاخیں اٹھا کے ہاتھ دعا مانگنے لگیں
سرگوشیاں چمن میں ہیں کیا غور سے سنو

میں ٹوٹتا ہوں خیر مجھے ٹوٹنا ہی ہے
دھرتی چیخ رہی ہے ذرا غور سے سنو

کچی دیواروں پہ بھاری چھت رکھدی
دیکھتے دیکھتے کیسا بھرا گھر بیٹھا ہے

اب تو درندگی کی نمائش بھی حسن ہے
دیوار پہ سجاتے ہیں سر کاٹ کاٹ کے

دل بھی ہے رہن غیر، بدن بھی ہے رہن غیر
اپنی کلاہ کج ہے بہ حال زبوں ہنوز

اب آدمی سے دور یہاں بھی ہے آدمی
شہروں کی وسعتیں سمٹ آئی ہیں گاؤں میں

آتشکدہ دل کو ہوا کیوں نہیں دیتے
پتھر تو نہیں لوگ صدا کیوں نہیں دیتے

سرمست اگر ہو تو سر بزم رقیباں
اک نعرہ مستانہ لگا کیوں نہیں دیتے

دھرتی نے مجھے ماں کی طرح پالا ہے ورنہ
افلاک تلے کوئی سہارا تو نہیں تھا

وہ آدمی ہے تو کیوں مجھ سے دور اتنا ہے
وہ خاک ہے تو اسے کیوں غرور اتنا ہے

لرزاں رہا لبوں پہ کوئی حرف آرزو
طاری تھا وہ سکوت کہ بولا نہ جاسکا

شاعر صاحب اس بستی میں کس کو گیت سناتے ہو
سایوں کے سنساں نگر میں کس کا دل گرماتے ہو

جلتا سورج، تپتی دھرتی، اونچی نیچی راہ گزر
اپنے سائے سائے چل کر پگ پگ ٹھوکر کھاتے ہو

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مجھ پر ہے مہرباں
دیوار کی یہ چھاؤں تو سورج کے ساتھ تھی

رات سنساں دشت و در خاموش
چاند تارے شجر حجر خاموش

مختصر ہو نہ ہو شب تاریک
ہم کو جلنا ہے تا سحر خاموش

ڈھل چکی رات بجھ گئیں شمعیں
راہ تکتی ہے چشم تر خاموش

شام ہوجائے تو دن کا غم منانے کے لئے
ایک شعلہ سا منور اپنے اندر دیکھنا

کیا لوگ تھے کہ ہجر میں تھا جن کا مشغلہ
عکس جمال یار طرحدار کھینچنا

زمیں پہ دھوپ کی چادر بچھائے لیٹے ہیں
مرے وطن یہ ترے خوش نصیب بیٹے ہیں

گوتم سے شرمسار ارسطو ہے یا نہیں
پورس کی سرزمیں پہ سکندر بنا ہوا

اب کہاں تک اشعار کے حوالے دوں۔ اس کی غزلیں اس کی ذات کا عکس اور اس کے جذبات کی ترجمان ہیں۔ اسے لفظوں کے برتنے کا ایسا سلیقہ آتا ہے جو صرف اس کے لئے مختص ہے۔ اور اسی کو انفرادیت کہتے ہیں۔ اسے جدت طرازی کے ساتھ مضموں آفرینی سے گہرا شغف ہے مضمون آفرینی ایک ایسا وصف ہے جو جدت کو روایت سے جوڑے رکھتا ہے۔ ایذرا پونڈ نے شاعری کے اس وصف کو اس قدر ضروری سمجھا تھا کہ اس نے پرانے مضامین سے نیا مضمون پیدا کرنے کے لئے ماضی میں یونان اور چین کی اساطیری زمانوں تک سفر کیا۔ حمایت نے بھی مضمون آفرینی کے سلسلے میں بساط بھر کوشش سے کام لیا ہے۔ اس کی شاعری ماضی کا احترام پر استوار جدیدیت کی صورت گری ہے اس لئے فیض نے اسے ہمارے عہد کا اچھا اور باکمال شاعر کہا ہے۔ حمایت کا کلام بلاشبہ فیض صاحب کے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔

جولائی ۷۵ء

(مطبوعہ ـ ماہنامہ "طلوع افکار" ـ کراچی)

○

میں تو یوں چپ ہوں کہ آئے نہ ترے "ذوق" پہ حرف
جو سخن فہم ہے "غالب" کا طرف دار بھی ہے

حمایت علی شاعر

(ایک مطالعہ)

ڈاکٹر مجیب الاسلام

(دہلی یونیورسٹی)

پاکستان میں عہد حاضر کے چند اچھے شعراء میں حمایت علی شاعر کا نام انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری پر ابھی تک نہیں لکھا گیا۔ اکثر مقالہ نگار ان کا شمار فہرست سازی میں کرتے ہیں بعض بھول بھی جاتے ہیں۔

پچھلے دنوں اردو اکادمی دہلی نے "اردو غزل" کے عنوان سے مقالات کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے جس میں "پاکستانی اردو غزل" کے موضوع پر جناب سعادت سعید کا مقالہ بھی شامل ہے اس میں اول تا آخر اہم اور غیر اہم شاعروں کے نام اور بعض کے کلام کی خصوصیات شامل ہیں۔ لیکن حمایت علی شاعر کا کلام تو درکنار نام تک نہیں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے' نہیں معلوم! یہ مانا کہ حمایت علی شاعر نے غزل سے زیادہ نظم میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے شائع شدہ مجموعوں میں غزلوں کی بھی اچھی تعداد ہے۔ پھر بھی انہیں نظر انداز کیا گیا ہے یا مقالہ نگاروں سے سہو ہوا ہے۔ بعض شخصیتیں بڑی پروقار ہوتی ہیں سامعین اور قارئین ان سے جلد ہی مرعوب ہو جاتے ہیں لیکن وہ عوامل جو اچھی شہرت کی کارفرمائی میں معاون ہوتے ہیں' ان تک ہماری رسائی نہیں ہوتی اسی لئے ہم جامع شخصیت کے ساتھ ان کے بھرپور کلام سے حظ نہیں اٹھا پاتے۔

ایسی ہی ایک شخصیت حمایت علی شاعر کی ہے جن کا شاعرانہ کلام فہرست سازی سے زیادہ کا متقاضی ہے۔

۱۹۳۰ء میں شاعر کی پیدائش اورنگ آباد دکن کے ایک کٹر مذہبی انعام دار گھرانے میں ہوئی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں حاصل کی اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے بی اے کیا یہ زمانہ حیدر آباد دکن کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا گیا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں نظام حیدر آباد میر عثمان علی خان نے اردو ذریعہ تعلیم کی پہلی یونیورسٹی قائم کی اور پورے ہندوستان سے اہل علم اہل زبان کو جامعہ اور اس سے متعلق تمام شعبوں میں خدمات پر مامور کیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ واحد یونیورسٹی تھی جس میں آرٹس کے ساتھ ساتھ سائنس' میڈیسن' قانون اور انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا گیا تھا۔ فرد واحد کا اقتدار تھا اور دولت کی فراوانی۔ آصف جاہ سابع کی اس عظیم اور منفرد خدمت کا اعتراف اردو زبان و ادب کی تاریخ کرتی ہے گو کہ شاعر بھی اس یونیورسٹی سے فیضیاب ہوئے لیکن نابرابری کے شدید احساس نے شاعر کے ذہن میں گھر کر لیا اور یہی وہ نقطہ آغاز ہے جس نے ان کی طبیعت میں اضطراب کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ اسی کرب کو شاعر نے شاعری کے سانچے میں نئے انداز سے ڈھالا ہے۔ اس زمانے میں مادری زبان کی یونیورسٹی قائم ہو جانے سے اردو کی جو فضا قائم ہوئی اس میں گھر گھر شاعری کے چرچے تھے' علم و ادب کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں شاعر نے جب اس ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں تو ترقی پسند تحریک، نہ

صرف حیدر آباد بلکہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں اپنے قدم جما چکی تھیں۔ ۴۶-۱۹۴۵ء میں اسی کا اجلاس حیدر آباد میں ہوا سروجنی نائیڈو نے اس کا افتتاح کیا۔ کرشن چندر' علی سردار جعفری' مجروح سلطان پوری' کیفی اعظمی' ساحر لدھیانوی اور پریم دھون نے اس میں شرکت کی۔ جامعہ عثمانیہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ادیب اور شاعر اس تحریک میں شامل ہو رہے تھے۔ اور دیسی ریاست کی حکومت اس تنظیم پر کڑی نظر رکھتی تھی یہاں شاعر کے بچپن کا ایک واقعہ ان کی شخصیت اور کلام کو سمجھنے میں معاون ہو گا۔

میر عثمان علی خان آصف جاہی سلطنت کے ساتویں فرماں رواں جب کنگ کوٹھی سے کہیں جاتے آتے تھے تو تمام راستہ بہتے دریا کی طرح صاف و شفاف ہوتا تھا سڑک کے دونوں طرف عوام نیچی نگاہ کئے کھڑے رہتے تھے کیا بوڑھا کیا جوان اور کیا بچہ کسی کو اس وقت اونچی آواز میں بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ نظام حیدر آباد موٹر میں آتے اور زن سے نکل جاتے ان کے چلے جانے کے بعد رعایا کو جانے آنے کی اجازت ملتی۔ ایسے ہی ایک روز حمایت علی[۱۲] اپنے والد کے ہمراہ کہیں جاتے ہوئے سڑک کے ایک کنارے کھڑے کر دیئے گئے مجبوری تھی تلملا کے چپ چاپ کھڑے ہوگئے لوگ کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جاتے تھے اور "اعلیٰ حضرت" کہتے جاتے تھے۔ انہوں نے والد سے پوچھا یہ سب کیا ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ اعلیٰ حضرت کی سواری آنے والی ہے یہ سن کر پہلے تو حمایت علی متعجب ہوئے' مسکرائے' اور پھر زور سے قہقہہ مار کے چپ ہوگئے۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ بچہ کم سنی میں جو کچھ دیکھتا ہے اس سے محبت یا نفرت کا جو بھی تاثر لاشعوری طور پر وہ اپنے ذہن میں قائم کر لیتا ہے یا قائم ہو جاتا ہے وہ شعوری زندگی میں بھی اس کا اظہار اسی طرح کرتا ہے۔

ایک طرف ترقی پسند تحریک اور دوسری طرف اعلیٰ حضرت کی سواری' اس تضاد نے شاعر کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ایک ہی فکر کی جانب موڑ دیا جس میں حقیقت کا گمان غالب ہو اور تفکرات کا لازمی جز ہو۔

میں سوچتا ہوں اس لئے شاید میں زندہ ہوں
ممکن ہے یہ گمان حقیقت کا گیان دے

شاعر کی شخصیت ایک تفکر پسند انسان کی شخصیت ہے جس میں روحانیت' جدت اور جستجو کا مادہ ہے ان کی روح اور شخصیت میں کوئی تضاد نہیں اسی لئے ان کا کلام ان کے ہم عصر شعرا سے مختلف نظر آتا ہے۔ شاعر کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوتا ہے۔ ابتدا میں حیدر آباد کے مختلف اخبارات "جناح" "منزل" اور "ہمدرد" میں بطور صحافی کے کام کیا پھر حیدر آباد ریڈیو میں عارضی ملازم ہوگئے۔ جہاں ڈرامے اور فیچر لکھتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں شعر گوئی کا چسکا لگ چکا تھا۔ سماجی نابرابری کا احساس بچپن ہی سے شعور میں خون کی مانند سرایت کر گیا تھا جس میں احتجاج کا رویہ بڑھتا گیا جو آگے چل کر ایک انقلابی کیفیت کا غماز بن گیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور اپنے حقیقت پسندانہ طرز ادا کی وجہ سے انہیں ۱۹۵۰ء میں نوکری سے نکال دیا گیا۔ شاعر نے احتجاجاً "کچھ عرصے اخبار فروشی کی۔ روزی روٹی کے در جب اور تنگ ہونے لگے تو ۱۹۵۱ء میں پاکستان چلے گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ ۵۲ء میں ریڈیو پاکستان (کراچی) سے منسلک ہوگئے۔ جہاں اناؤنسر' نیوز ریڈر' مسودہ نگار اور ڈرامہ آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ ۵۵ء میں حیدر آباد سندھ میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو

کراچی سے وہاں منتقل ہو گئے۔ اور حیدر آباد سندھ میں ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء کے بعد سچل کالج حیدر آباد سندھ اردو کے مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ کچھ سال اس پیشہ سے وابستہ رہنے کے بعد فلموں میں نغمہ نگاری شروع کی۔ فلم انڈسٹری میں نغمہ نگاری، مکالمہ نویسی فلم سازی اور ہدایت کاری کے فرائض انجام دیئے جب اس رنگین دنیا کا بھید کھلا اور حقیقت آشکارا ہوئی تو یہاں سے بھی جی اکتا گیا۔ تو پھر سندھ یونیورسٹی (جام شورو) سے باضابطہ وابستہ ہو گئے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی تعلق قائم کرلیا آج بھی پاکستان ٹیلی ویژن کے سیریل میں ان کی خدمات لی جاتی ہیں۔ (حمایت صاحب نے ۸۶ء میں یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ لے لی)

فکر معاش کھا گئی دل کی ہر امنگ کو
جائیں تو لے کے جائیں کیا حسن کی بارگاہ میں

حسن کی بارگاہ سے زیادہ اہم ادب کی بارگاہ ہے۔ ہندوپاک کے علاوہ شاعر دوسرے ممالک کے عظیم الشان مشاعروں میں شرکت کرچکے ہیں۔ خوش گلو ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے کلام کی وجہ سے داد و تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔ باشعور سامع اگر کلام سے زیادہ نوا پر دھیان دے تو یہ اس کی کم فہمی ہے۔ دوسرے شعرائے کرام کی طرح شاعر کے ہاں بھی پست و بلند اور ادنیٰ و اعلیٰ ہیں۔ ان کے خیالات میں بھی زمانے کے گرم و سرد ہنگامی حالات سے واسطہ اور عمیق خیالات کی کارفرمائی ہے۔ لیکن جو خصوصیت ان کو دوسرے شاعروں سے الگ کرتی ہے وہ یہ کہ وہ ماضی سے زیادہ حال کے نقوش کو تاریخ کے تناظر میں پیش کرتے ہیں دوسرے شاعروں کی طرح ان کی شاعرانہ صداقتیں بھی جذبہ کے تابع نظر آتی ہیں لیکن حساس ذہن کو جب عملی زندگی میں وہ سب کرنے کا موقع نہیں ملتا جو وہ چاہتا ہے تو اس میں ایک طرح کی نفرت اور انقلابی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ پاکستان آنے سے قبل شاعر نے اپنے وطن کے بارے میں کہا ہے۔

ہزاروں سال سے اس سرزمین پر
مرے جمہور کی دنیا ہے ویراں

ہزاروں انقلابات آئے لیکن
شہنشاہی کی جنگ ہے گل افشاں

پاکستان دنیا کے جغرافیہ میں ابھرنے والا ایک نیا ملک تھا جہاں آزادی تھی لیکن بے شمار زنجیروں میں قید جمہوریت تھی لیکن ویران سی۔ دوسری تمام خامیوں کے ساتھ اقتصادی ناہمواری تھی جسے شاعر بچپن سے اپنے آبائی ملک میں بھگتتا چلا آرہا تھا۔ یہاں بھی انسانی عظمت کی بحالی ناپید اور سماجی

سٹ اپ ناکارہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کی تباہیاں کچھ کم ہوگئیں تو سیاسی ریشہ دوانیوں اور اور اقتصادی نظام سے پیدا ہونے والی مایوسیوں نے شاعر کو بے چین کرکے آسودگی سے ہمکنار نہیں ہونے دیا۔ مزید علاقائی تضادات انسان کش صورت حال، مذہبی منافرت کی بنیادیں یہاں بھی جاری و ساری تھیں۔ نئے ماحول میں شاعر نئے مسائل سے دوچار ہوا جو کچھ پہلے ہی سے اس کی وجود میں لہو کی مانند سرگرداں تھے۔ ایسے حالات میں زندگی گزارنا اور سچی شاعری کو پروان چڑھانا ازحد مشکل تھا۔ اگر شاعری

کا مقصد منذکرہ حالات کی منظر کشی ہوتا تو اس کی شاعری صرف احساسات کی شاعری ہو کر رہ جاتی ہے لیکن جیسا کہ جرمن شاعر رلکے نے کہا ہے "شاعری صرف احساسات کا نام نہیں ہے بلکہ تجربے کا نام ہے اور اسی لئے ایک شعر کہنے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر بہت سے شہروں' انسانوں اور چیزوں سے واقف ہو۔" اس نے شاعر کے تخلیقی عمل کو تجربے کی بنیاد سے وابستہ کیا ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اچھی شاعری وہ ہے جو فن کے معیار پر نہیں زندگی کے معیار پر پوری اترے اور زندگی کا معیار یہ ہے کہ شاعر زندگی سے فرار اختیار کر کے خوابوں کی دنیا میں پناہ نہ لے۔ وہ اپنے عہد کی تمام خرابیوں' منفی اور مثبت پہلوؤں کو قبول کرلے۔ حالات سے ہر روز "جنگ" کی طرح مقابلہ کرے۔ ماحول' نظام' معاشرت' سیاسی اور اقتصادی قوتوں کے بارے میں اپنے تجربات کا مکمل اظہار کرے جس میں حقیقت پسندانہ رویہ شامل ہو۔ یہ سب کچھ ایک حساس اور ذکی شاعر ہی کرسکتا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے تناظر میں بڑا فرق تھا۔ شاعر عوام سے زیادہ محرومی' بے یقینی اور عدم حفظ کا احساس رکھتا ہے۔ ایسے حالات میں وہ عام آدمی کی طرح خود غرضی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس فرق کو وہی شاعر محسوس کرسکتا ہے جو ذہنی اعتبار سے زرخیز ہو اور زرخیز مٹی بہت سی اجناس کو پیدا کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اسی طرح حمایت علی شاعر کا کلام بھی حسن کے دربار سے ہوتا ہوا ظالم حکمرانوں کی سیہ کاریوں تک کا احاطہ کرتا ہے۔ حسن کے تناظر میں جب وہ عشق کی منزلوں سے گزرتا ہے تو یزی جمالیات کا سہارا نہیں لیتا بلکہ اس کی جمالیاتی حس اور بھی بیدار ہو جاتی ہے اور اس کے تجربے جذبات کی صورت میں یوں اپنا جادو جگاتے ہیں۔

حسن کے جتنے مقامات ترے جسم میں ہیں
اپنے ہاتھوں ترے پیکر میں سجایا ہے انہیں

حسن و عشق کے معاملات ہوں یا سماجی حقیقت نگاری کے موضوعات شاعر ہر جگہ روایت سے اجتناب کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کو جس شکل میں دیکھا' محسوس کیا' تجربے کی بنیاد پر اس کی تصویر کشی کی' ان کا محبوب خیالی دنیا سے الگ اپنا ایک گوشت پوست کا جسم رکھتا ہے جس کے کچھ محسوسات اور تقاضے ہیں۔ شاعر کے ہاں اس طرح کے احساسات بھی سماجی حالات کے تحت کامیابی اور ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔

آنکھ کے گرد سیاہی سی بڑھی جاتی ہے
کھا گیا تیری جوانی کو تیرا سوز نہاں
(ادھوری کہانی)

عشق تو خیر ہے ایک جذبہ سوزاں کہ جسے
کسی سائے کسی ٹھنڈک کی ضرورت ہی نہیں
(غم حاصل)

میں سایہ کئے ابر کے مانند چلوں گا
اے دوست جہاں تک بھی تری راہ گزر جائے

چلمن گری جو در پہ تو ہر پردہ اٹھ گیا
کیا کیا کھلے ہیں راز ترے اس حجاب سے

یاد ہے تجھ کو وہ گھونگٹ کے الٹنے کا سماں
جب مری آنکھوں نے جی بھر کے تجھے دیکھا تھا
تیرے ہونٹوں پہ تھے جب میرے لبوں کے سائے
جسم و جاں میں کوئی طوفان اتر آیا تھا
(تیری باتیں تیرے خواب)

تو دبے پاؤں چلی آئی مرے دل کے قریب
اور میں بھول گیا میری حقیقت کیا ہے
میں کہ افلاس مری جہد مسلسل کا صلہ
میری دنیا میں تیرے پیار کی وقعت کیا ہے
بھوک کیا جانے کہ تعظیم محبت کیا ہے
(ادھوری کہانی)

مری نگاہ میں رہ کر بھی جانے کیوں اب تک
مری نگاہ سے ہیں بے خبر تری آنکھیں
(تیری آنکھیں)

یوں تو کٹتی ہی رہے گی غم دوراں میں حیات
آج کی رات غم یار کی باتیں سہی
(غزل)

حسن و عشق کے معاملات میں شاعر کے ہاں خاص رکھ رکھاؤ ہے۔ ان کے عاشقانہ جذبات محض مضمون شعر کے طور پر نہیں ذاتی تجربہ کے رنگ میں بیان ہوئے ہیں۔ رومانیت مرد اور عورت کی رفاقت کا دم بھرتی ہے جو ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شاعر کے ہاں تخیل کا گزر نہیں ان کے ہاں جسمانی لطف و لذت کا ذکر ہے تو اس کا درد بھی ہے۔ وہ عشق کرتے ہیں تو صرف معشوق کے دلفریب حسن اور اپنی بے قراری کے احساس کے ساتھ اپنی بے بضاعتی کا کرب اور غم روزگار کا بھی احساس رکھتے ہیں۔ ان جذبات سے گزرنے کے بعد شاعر کے ہاں یہ دریا اترتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مخدوم نے اپنے ایک خط میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

"تم آج کل عشق نہیں کر رہے ہو' کلام میں بڑی گمبھیرتا آگئی ہے۔"

عشق کے کوچے کی کوئی واردات کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو عالم موجودات سے سروکار رکھنے والا شاعر رومانیت کو یکسر رد نہیں

کرتا۔ شاعر کے ہاں رومانیت انقلابی نہیں بلکہ سچائی کے شعور کے ادراک سے عبارت ہے۔ ان کی شاعری کا امتیازی پہلو اپنے عہد کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی طبقاتی بنیاد اور اس سے وابستہ بے شمار مسائل ہیں اپنے عہد کے حالات سے شاعر کی بے اطمینانی بڑی شدید ہے۔ سماج متنوع مسائل سے دوچار ہے۔ سماجی زندگی کے ہر شعبہ میں ناہمواری اور ناآہنگی ہے۔ انسان کی دن رات جان توڑ محنت کی کوئی وقعت نہیں۔ محنت کشوں کے حقوق کو روندا جارہا ہو۔ پس ماندہ طبقات پر زندگی کا بوجھ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ان پر عرصہ حیات تنگ سے تنگ تر ہوتا جارہا ہے انسانیت سے لبریز اخمنٹ قدروں کو مٹایا جارہا ہے' سیاسی رہنما نت نئے ایسے قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں جن میں پورا معاشرہ اعلا تصورات سے یکسر خالی ہوجائے۔ آزادی کے باوجود پورے معاشرے میں گھٹن ہو اور سچی آزادی کا تصور خام خیال ہو۔ جہاں سیاسی پس ماندگی کے ساتھ ریاکاری اور مکاری بھی شامل ہو' ایسے معاشرے میں سماجی حقائق سے چشم پوشی نہ کرنے والا شاعر ناانصافی' تنگ دستی' محرومی اور ذلت کے باوجود اپنا ایک مخلصانہ رویہ رکھتا ہے' وہ تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے اس لئے نہیں کہ تبدیلی اس کے ہاں اوپر تحریر کئے گئے احساسات کی نفی کرتی ہے بلکہ اس لئے کہ تبدیلی ہی زندگی کی فطرت ہے۔ لیکن ایسے معاشرے میں جہاں قلم اٹھانا تو درکنار لب وا کرنے پر بھی پابندی ہو یہی تبدیلی شاعر کی ذات میں انقلابی کیفی بن کر نمودار ہوتی ہے اور یہی وہ ذات کا کرب ہے جو حمایت علی شاعر کے ہاں سماج کا کرب بن کر سماجی اور اقتصادی نظام کے خلاف آواز اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاعر کی شخصیت جب ان تمام آلودگیوں کو زہر کی مانند اپنے جسم میں اتار لیتی ہے تو تفکر انسانی جذبوں کی بے حرمتی کے خلاف درج ذیل کلام میں ظاہر ہوتا ہے۔

آج یہ کس سرزمیں کا آسماں آنکھوں میں ہے
جو کبھی دیکھا نہیں تھا وہ سماں آنکھوں میں ہے
(جنت نگاہ)

یہ جہاں ایک دکاں ہے کہ جہاں صبح و مسا
آدمی بکتے ہیں نیلام کی چیزوں کی طرح
شب کی تاریکی ہو یا دن کا اجالا ہر وقت
راحتیں بٹتی ہیں محلوں میں کنیزوں کی طرح
(جبر عہد)

کب تک اس قبر کی وادی میں پھرے گا پاگل
یوں کبھی مل بھی سکی ہے غم دوراں سے نجات
چل کہ جن چہروں سے بڑھ جاتی ہے تری وحشت
وہی چہرے ہیں مرے دل تیرا عنوان حیات
اور تجھے جینا ہے اے کشتہ دوراں کل بھی
(چل خسرو گھر اپنے)

یہ کش مکش کی دنیا سود و زیاں کی دنیا
عقل و جنوں کی دنیا وہم و گماں کی دنیا
یہ مہربان صورت نا مہرباں کی دنیا
اے کاش جانتے تم مجھ خستہ جاں کی دنیا
رہتا ہوں کس لئے میں یوں سوگوار صوفی
(یا رنج اوا)

کس بزم میں لے آئی اے دل تری ویرانی
دیواروں کی رنگت فق دروازوں پہ چپ طاری
مبہوت سی خاموشی گم سم سی فضا ساری
ہر دل پہ گراں دھڑکن ہر روح پہ تن بھاری
کعبہ ہو کہ بت خانہ پتھر کی عمل داری
(پچھتاوا)

میں اپنے خوابوں سے دور اک اور ہی فضا میں
خود اپنے ہاتھوں ہی اپنی تحقیر کررہا ہوں
یہ فیض افلاس چند نان جویں کی خاطر
میں اپنی تربت کی آپ تعمیر کررہا ہوں
(نیا عہد نامہ)

کیوں ہوگئی اے شمع تری بزم سخن چپ
دل چپ ہے نظر چپ ہے قلم چپ ہے دہن چپ

اب تو ہر شور طرب سن کر دہل جاتا ہے دل
جانے کس اندیشہ فردا سے گھبراتا ہے دل

دلوں کا درد نگاہوں سے پھوٹ پڑتا ہے
ہزار ضبط کریں اشک ٹوٹ پڑتا ہے

کیوں خوفزدہ اتنا ہے مجھ سے کہ زمانہ
سینے میں مرے دفن کئے جاتا ہے مجھ کو

آنکھ کھلی تو پلکیں نم تھیں
دیکھ لیں خوابوں کی تعبیریں

اس کو ملے گی بھیک ہی جس طرح بھی ملے
کاسہ نما دراز جو دست سوال ہو

شاید کہ راس آگئیں جنگل کی وحشتیں
چونکا نہیں ہے کوئی صدائے کرخت پر

اہل دل اہل خرد اہل نظر سب سوگئے
سب کے بیداری کا دعویٰ تھا مگر سب سوگئے

کہا گیا جسے قرآں میں بندہ مومن
وہ ہیں، تو کیا کہ مرا کوئی ہم وطن بھی نہیں

گنبد کی طرح دوش پہ رکھے ہوئے ہیں سر
جسموں کے مقبروں میں دریچے نہ جالیاں
شاہی حرم سے "شاہی محلہ" تک آگئیں
"شام اودھ" کے ساتھ کراچی کی جالیاں

سماجی حقیقت نگاری کے شعور کا حامل شاعریاس پسندی سے گریز کرتا ہے اور بیمار ذہنیت کو معیوب سمجھتا ہے۔ شاعر کا تفکر معاشرے کی زبوں حالی کو پیش ہی نہیں کرتا بلکہ جہاں کہیں سیاسی طور پر اتار چڑھاؤ آتے ہیں انکو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ رجائیت کا حامی ہے اور رجائیت میں بندھنوں کو توڑنے کی دعوت مضمر ہوتی ہے جس میں بندھے ٹکے اصولوں کو توڑا جا سکتا ہے ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے ایک دشت تفکر کی سیاحت کی ہے اور اس سفر میں اپنی چشم وا رکھی ہے جس نے شاعر کے مزاج میں اس عبرتناک دور کے واضح فرق کو بھی دخیل کیا ہے وہ اپنے عہد کے کرب کو آئین کی روشنی میں پرکھ کر دیکھتے ہیں اور اپنی کامیابی کا عزم لئے قدم بہ قدم آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ایک قدم کے بڑھنے سے ان کی شخصیت میں ایسے عناصر بھی شامل کردیئے ہیں جو پیغام کا کام کرتے ہیں۔

اس مقام پر شاعر پیامبری کا فرض انجام نہیں دیتے بلکہ جس نظام کی خرابیوں کو وہ اجاگر کرتے ہیں وہیں اس بات کے لئے بھی کوشاں نظر آتے ہیں کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی دعوت فکر دیں۔ ایسے حالات میں ان کا کلام عاقلانہ اور حکیمانہ پہلوؤں کو واضح طور پر پیش کرتا ہے شاعر کا تعلق ایک ارتقا پذیر نامیاتی سماج سے ہے اور ایسے انسانی معاشرے تہذیب کی فلاح اور ترقی کے لئے یا موجودہ سماج کو بدلنے کے لئے کون سے افکار ضروری ہیں انکو بھی پیش کرتے ہیں اور آنے والی نسلوں کو متنبہ کرتے ہیں۔

دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں شاید
دنیا میں ابھی اہل نظر جاگ رہے ہیں

جن کے بازو ہوں چواریں
کشتی کا غم کرتے کب ہیں

دوستوں طوفاں سے گھبرا کر نہ لو ساحل کا نام
لوٹتی موجوں سے پوچھو عشرات ساحل کی بات

پتوں کی تالیاں ہیں کہ گھوڑوں کی ٹاپ ہے
رکھنا نگاہ ہم سفرو اپنے رخت پر

صرف دیوار کو رستے کی رکاوٹ نہ سمجھ
پس دیوار کہیں سایہ دیوار بھی ہے

وہ تو دکھا رہا ہے ہتھیلی میں سبز باغ
یاں آمد بہار کی ہیں خوش خیالیاں

شاعر نے اپنے مجموعہ "ہارون کی آواز" میں حرف حرف روشنی کے عنوان سے اپنی طویل نظم میں تاریخ کے ناگزیر واقعات سے نہ صرف روشناس کرایا ہے بلکہ نئی نسل کو اپنا پیغام بھی دیا ہے۔ تاریخ کے تناظر میں انہوں نے بتایا کہ ایشیا پر کیا کیا گزری۔ اس سرزمین کو حصول زر کی خاطر فاتحین نے لوٹا پھر اپنے ہی حکمرانوں نے نئے داؤ پیچ میں یہاں کے معصوم

عوام کو کس کس طرح جکڑے رکھا' کس طرح ان پر روزی روٹی کے دروازے بند کیے' روایتیں کیسے پائمال ہوگئیں' قدروں کا کس طرح جنازہ نکالا گیا' اسلاف اپنے نشے میں کیسے سرشار تھے۔ مورخین نے تاریخ کو کیسے رنگ دیئے جوگیوں' فقیہوں اور صوفیوں کا کیا عمل رہا اور ان کے تئیں حاکموں کا کیا ردعمل تھا ان گنت تغیرات سے یہ سرزمین وابستہ رہی اہل سیاست کا کیا رول رہا اور اہل ہند نے اپنے مقدر میں کیا پایا۔ زیست اور اجل کے درمیان کتنا کم فاصلہ رہا۔ اس نظم میں شاعر نے ماضی سے حال تک کی تاریخ کو تخلیقی اضطراب کے ساتھ پیش کیا ہے اور نوجوانوں کو پیغام بھی دیا ہے۔

مرے لہو کے چراغو' مرے جگر پارو
سنو یہ میر نصیحت بھی ہے وصیت بھی

تم اپنے غم کا نہ دنیا زمیں کو الزام
کوئی یقیں بھی دلائے گماں سمجھ لینا
یہ جبر وقت، کبھی تاریخ کا تقاضہ ہے
اسے بھی مرحلہ قرض جاں سمجھ لینا

مرے لہو کے چراغو میرے جگر پارو
تمہیں خبر ہے کہ انساں ہے خواہشات کا نام
خیال و خواب ہوں آزاد تو قفس بھی چمن
جو ہوں اسیر تو زنداں ہے کائنات کا نام

میرے لہو کے چراغو' مرے جگر پارو
تغیرات کی زد میں ہے زندگی کا نظام
زمیں کو اہل سیاست نے کردیا تقسیم
وگرنہ اہل زمیں میں ہے کوئی خاص نہ عام

میرے لہو کے چراغو' مرے جگر پارو
تم اب جہاں بھی ہو آباد اسی زمیں پہ رہو
خیال وخواب کی باتیں فسانہ و افسوں
یقیں ہے اصل حقیقت' سدا یقیں پہ رہو

میرے لہو کے چراغو' میرے جگر پارو
یہ ہاتھ ہاتھ میں لے لو کہ ہیں یہ پیار کے ہاتھ
یہ ہاتھ چھوڑ نہ دینا اگر زمیں ہے عزیز
کہ ان سے بڑھ کے نہیں کوئی اعتبار کے ہاتھ

ایسے عالم میں جہاں ہر سو اندھیرا ہو روشنی کی کرن بھی اجالا کر دیتی ہے اصل حقیقت خارجی سچائیوں کو داخلی سچائی میں ڈھال کر اظہار بیان میں ہوتی ہے ذیل کے بند دیکھئے۔

لاکھ پھینکے شب تاریک سویرے پہ کمند
کارواں صبح کا بڑھتا ہی چلا جائے گا
اپنے ہمراہ لئے سیکڑوں کرنوں کا جلوس
وسعت عالم آفاق پہ چھا جائے گا

ضعیف ہاں یہ ہے انساں کا خوں اسے پی کر
یہ "خواجگی" کبھی سر سبز ہو نہیں سکتی
ہزار دل کی سیاہی کو داغ زہد چھپائے
لہو کے داغ عبادت بھی دھو نہیں سکتی

یہ قبر قبر نہیں مکتب شعور ہے یہ
یہیں پہ زیست کے نقشے سنورنے والے ہیں
یہ شمع ہاں، اسی شمع مزار کی لو سے
ہزار ہا مہ و خورشید ابھرنے والے ہیں

یہ امید کہ ظلم کا خاتمہ ہوگا زندگی سنورے گی شاعر کو ایک خاص قسم کی توانائی بخشتی ہے اپنے عہد کے نظام پر ان کی بصیرت آمیز نگاہیں لگی ہوئی ہیں ساری دنیا جانتی ہے کہ کس طرح ایک حکمران دوسرے پر غالب آیا۔ بظاہر تو یہ علامتیں ہیں لیکن ان کے پیچھے تاریخ کا ایک ایسا باب پوشیدہ ہے جسے کھول کر بیان کرنے کی قطعاً" ضرورت نہیں' شاعر تاریخی ارتقا کے شعور سے آگاہ ہیں اسی لئے اپنی ذات کے کرب سے باہر نکل کر سماج کے کرب کا اظہار کرتے ہیں یہ حقیقت کے ادراک کا وہ لمحہ ہے جو جگ بیتی میں کسی کی آپ بیتی کے طور پر سامنے آتا ہے اس طرح بعض کیفیاتی نظموں میں شاعر چلتی پھری لاشوں کی اصل شناخت ہی نہیں کرتے انکے انجام پر بھی ان کی نگاہ رہتی ہے' تفکر آگاہ کرتا ہے کہ ان روسیاہوں کا انجام کیا ہوگا اور سماجی قوتیں کہاں تک زوال پذیر ہو سکتی ہیں۔ شاعر ظالم و جابر حکمرانوں کو ہی اپنے تیر کا نشانہ نہیں بناتے۔ بلکہ ہر وہ طاقت جو انسانوں کا استحصال کرتی ہے انسانیت کو فراموش کرتی ہے وہ شاعر کی نظر میں سوسائٹی کے لئے بدنما داغ ہے۔ حصول زر کی خاطر ناجائز کام کرنے والا ہر فرد حاکم سے لیکر طوائف تک سب ان کی نظر میں مجرم ہیں۔ نیپیئر روڈ کی طوائف ہو یا سوسائٹی گرل انکو بھی ان کی حیات کا انجام بتاتے ہیں اور ساری ذمہ داری نظام پر عائد کرتے ہیں۔

نیپیئر روڈ پہ تحدید بہت خوب مگر
نیپیئر روڈ پہ تحدید کا آخر انجام
چلتے پھرتے ہوئے کھمبوں سے اٹھاؤ تو غلاف
نیپیئر روڈ رواں ہے کہ نہیں گام بہ گام

جہل زندہ ہے تو رسوا ہی رہے گی تہذیب
بھوک زندہ ہے تو بکتے ہی رہیں گے اجسام

اسی طرح سوسائٹی گرل جو ماڈرن طوائف ہے اس کو اس کی حقیقت باور کراتے ہیں چکلہ کی طوائف اور سوسائٹی گرل میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ چکلہ پر رہنے والی بدنام ہوتی ہے ہر کس و ناکس کا اس کے کوٹھے پر گزر ہوتا ہے' راہ گیر کو بھی علم ہوتا ہے کہ وہ کس جگہ سے گزر رہا ہے کال گرل یا سوسائٹی گرل خفیہ طور پر جسم فروشی کرتی ہے جو آرٹ کی آڑ میں چھپا ہوتا ہے۔ یہ سماج کے لئے زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔ ان کا انجام بھی آخر کار طوائف خانہ کی زینت بنتا ہوتا ہے۔

تجھ کو احساس ہے اس طرز روش کے باعث
ایک بازار ہوئی جاتی ہے' محفل تیری
اپنے ماحول سے منہ پھیر کے جانے والی
نیپیئر روڈ سے آگے نہیں منزل تیری۔

تو کہ جس طرح سرِ راہ گزر کوئی سرائے
رات دلہن بنے اور صبح کو بیوہ ہوجائے

جابر حاکم اور معنوی حسن سے آراستہ طوائف دونوں ہی بھولے بھالے انسانوں کو اپنی انگلیوں پر نچاتے ہیں فرق اعلا اور ادنیٰ کا ہوتا ہے۔ اچھا شاعر اعلیٰ اور ادنیٰ انسانوں کے فرق کو واضح نہیں کرتا بلکہ سماجی زندگی کے رشتے سے بہت سے موضوعات پر اپنے تجربہ کا اظہار کرتا ہے۔ یہیں آکر شاعری بے باکی کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ ادراک تب ہی ممکن ہے جب شاعر پر خار راستوں سے گزرتا ہے اپنی ذات کا علم رکھنے والا شاعر فرش نخل سے گریز کرتا ہے اس کی انفرادیت اس کے لاشعور میں پروردہ خیالات کی عکاسی سے ہوتی ہے۔ جس راہ میں دقتیں ہی دقتیں ہیں ایسے راستے سے ہی گزرنے والا شاعر اپنی ذات میں مکمل اپنے شخصیت سے آگاہ اور اپنی اظہار سے الگ نمایاں ہوتا ہے شاعری یہ روش عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتی ہے اچھی اور بڑی شاعری تقلید سے نہیں اجتہاد سے وجود میں آتی ہے۔ شاعر کو اپنی ذات اور ماحول سے آگاہی تقلیدی کلاسیکی سے انحراف پر مجبور کرتی ہے۔ معاصرین کو اس کا احساس نہیں ہوتا لیکن آنے والا وقت اس کی غمازی کرتا ہے شاعر کو بھی اس کا احساس ہے درج ذیل اشعار اس کا ثبوت ہیں۔

تم میں اور ہم میں یہی فرق ہے' دنیا والو
ہم ہر اک بات سر بزم جہاں کہتے ہیں

ہر بت کو خدا کہتے اگر ہم بھی تو یارو
کچھ ہوتے مگر شاعر نادار نہ ہوتے

یہ الگ بات ہے کہ میں ہی نہیں یوسف ورنہ
بکنا چاہوں تو یہاں مصر کا بازار بھی ہے

ان کا عمل قصیدہ شاہانِ کج کلاہ
اپنا عمل عمامہ و دستار کھینچنا

سینے میں جو دل بن کے دھڑکتا نہ غم عشق
ہم اہل جنوں آج سرِ دار نہ ہوتے

نہ آدمی کی حقیقت، زندگی کا سراغ
فقط قصیدۂ دربار ہے میری تاریخ

یہ اشعار شاعر کی انفرادیت کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ حمایت علی شاعر کا غم جاناں اور غم دوراں نجی غم نہیں بنتے بلکہ غم مشترک کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تخلیقی سطح پر حقیقی بصیرت ارتقا کا ایک عمل ہے جسے شاعر نے صداقت کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کیا ہے موضوع کی صداقت میں زندگی کے حقیقی تجزیے پیش کئے ہیں جن میں طنز کا اسلوب بھی آیا ہے۔ یہ نادانستہ طور پر نہیں بلکہ جذبہ کی سچائی کو نکھارنے کے لئے ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے افکار میں الجھاؤ نہیں ہے۔ اس لئے افہام و تفہیم میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ باوجود اس کے کہ وہ شاعری کی بنی بنائی راہوں پر گامزن نہیں ہوئے تجربات کے شائق کی حیثیت سے ان کے ہاں درک حیات اور تاریخی جبر ان کے شعور اور فن میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ جبر کو تاریخ سے اور حیات کو درک سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ انسانی ذہن حالات کی چکی میں پس کر بنتا بگڑتا بدلتا اور سنورتا رہتا ہے اسی لحاظ سے ان کی شخصیت میں بھی اتار چڑھاؤ آئے ہیں لیکن ایک تفکر پسند انسان کے کلام میں دیوانگی میں ہوش، سکون میں اضطراب اور جنوں میں عقل کی کارفرمائی ہوتی ہے یہ ساری خصوصیات شاعر کے کلام میں بھی موجود ہے۔ ان کی شخصیت میں، کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے بلکہ ایک تسلسل ہے خوب سے خوب تر کی تلاش میں انہیں زندگی کے کسی ایک شعبہ میں قرار نہیں ملتا یہی وجہ ہے کہ ریڈیو سے صحافت، صحافت سے فلم اور فلم سے درسی اور پھر مراجعت تک روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان کی زندگی جمود سے خالی ہے مسلسل چلتے رہنے حیات کو دیکھنے معاشرے کو سمجھنے اور اسے بے نقاب کرنے ہی میں انہیں قرار آتا ہے۔ دوسرے شعراء کی طرح انہوں نے بھی مروجہ شعری اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن غزل سے زیادہ نظموں میں انکے جوہر کھلتے ہیں اپنی اضطرابی اور سیمابی کیفیت کو جب وہ نظم کے پیرائے میں ڈھالتے ہیں تو ان میں غزل کا لطف برقرار رہتا ہے شاعر کوئی بھی صنف سخن اختیار کرلے انسان زندگی اور کائنات کے بارے میں ان کے جو نظریات ہیں وہی ہر صنف میں جگہ پائیں گے البتہ اظہار کا لب و لہجہ بدل جائے گا جن میں بعض اوقات ضبط کا احساس نرم اور شیریں لے کی شکل میں ظاہر ہوگا کہیں غم و غصہ میں چیخ بھی شامل ہوگی جو تلخی کی صورت میں نظر آئے گی۔ یہ فکری تسلسل جدلیاتی ماحول کی عکاسی کے لئے از حد ضروری ہے۔ "بنگال سے کوریا تک" افسانوی نظم اس کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم کا موضوع جنگ ہے جو دوسری جنگ عظیم کے پس منظر سے شروع ہوتی ہے اور کوریا کی لڑائی پر ختم ہوتی ہے۔

آئینہ خانہ تصور میں
ایک اک نقش ابھر آتا ہے

جنگ تہذیب کا نشاں تھا ہے — اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
سارے عالم پہ چھائے جاتی تھی — آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے
دل میں کانٹے لبوں پہ پھول کھلائے — وہ برستے لپکتے شعلوں میں
خوں مسلسل بہائے جاتی تھی — دوڑتے چیختے چھپتے سر
جھونپڑوں کے چراغ گل کرکے — دیو ہیکل گرجتے طیارے
شہر کے شہر کھائے جاتی تھی — خاک برسر دھواں دھواں منظر
مستقل امن کی قسم کھا کر — سڑتی گلتی کریہہ لاشوں کے
زندگی کو مٹائے جاتی تھی — خون میں تر ہر اک راہ گزر

شام زخموں سے چور چور نڈھال — ایک میرا ہی گھر نہ تھا برباد
صبح کے لب خموش آنکھیں تر — سارا بنگال ہوچکا تھا تباہ
کس کو معلوم جنگ کا میداں — ہر تقدس کی کوکھ تھی ناپاک
کس کی دنیا کو خون دیتا ہے — ہر تعلق کا اندروں تھا سیاہ
اور کس کے جہان کو یکسر — مائیں، بیٹوں کے پہلوؤں میں دفن
اپنے شعلوں میں بھون دیتا ہے — بہنیں تھیں بھائیوں کی عشرت گاہ
میرے ٹیگور کی زمیں پر آج — پارہ پارہ تھا شیشہ تہذیب
لاشوں ڈھانچوں کا بس گیا تھا جہاں — گودیوں میں ہمک رہے تھے گناہ
اس قدر تھا کریہہ ہر منظر — سوچتا تھا کہ اس تباہی سے
جیسے قے کرچکا ہو قبرستاں — جنگ بازوں کو کیا ملا آخر
سارے بنگال کی زمیں تھی آج — کوئی محمود تو رہا محمود
موت کی ایک عجیب بازی گاہ — ہم ایازوں کو کیا ملا آخر

اس طویل نظم کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے شاعر کو ایک خط میں لکھا تھا۔

"بنگال سے کوریا تک" نہایت خوبصورت نظم ہے، اتفاق دیکھیئے کہ بالکل اسی موضوع پر ساحر لدھیانوی نے بھی ایک طویل نظم لکھی تھی، "پرچھائیں" لیکن میری رائے ہے کہ آپ کی نظم "پرچھائیں" سے بہتر ہے۔ "پرچھائیں" میں ایک تو ساحر نے میٹر کو بار بار بدلا ہے جس سے نظم کی روانی کو صدمہ پہنچا ہے۔ آپ کی نظم میں یہ نقص موجود نہیں ہے دوسرے ساحر نے جو کہانی پیش کی ہے نہ صرف معمولی ہے بلکہ بے ربط بھی ہے اور آخر میں اس نے وعظ کا رنگ اختیار کرلیا ہے آپ کی کہانی میں لوچ ہے ایک نقطہ عروج ہے اور پھر زندگی کے ایک مخصوص انداز کو طشت از بام کیا ہے۔"

شاعر کی نظمیں اپنی ماہیت، تازگی اور نکھار کے باعث متاثر کرتی ہیں جو دل و دماغ اور آنکھ کے معنوی ربط سے وجود میں آتی ہیں انہیں تشبیہ، استعارے، کنائے اور تمثیل کے ذریعے اپنے عہد کی مصورانہ کیفیت کے تخلیقی عمل کو جدت سے ہمکنار کرتی ہیں۔ بعض جگہ نئے الفاظ، نئی تشبیہیں اور علامتیں دور از کار نہیں ہوتی۔

قارئین ان کو پڑھ کر پیش آنے والے تجربے سے کماحقہ واقف ہوجاتے ہیں شاعر زبان کے معاملے میں بہت محتاط رہتے ہیں ان کے ہاں زبان بنیادی چیز ہے اور اپنے خیال کی ادائیگی کے لئے وہ زبان کے فن (استعمال) پر عبور رکھتے ہیں تکنیک کے لحاظ سے انہوں نے اپنی نظموں میں خوش آئند تجربے کئے ہیں۔ طویل کیفیت کے اظہار میں مسلسل غزل کی تکنیک سے کام لیا ہے تکنیک کے بارے میں یہ رائے زیادہ مناسب لگتی ہے کہ شاعر کے ہاں جس طرح کا خیال اکتساب فکر کرتا ہے اسی طرح کی تکنیک وجود میں آتی ہے۔ "تشنگی کے سفر" میں جو طویل نظمیں ہیں ان میں تمثیلی غنائی اور افسانوی تکنیک سے کام لیا ہے۔ ان کی ثلاثیوں کا بھی اپنا ایک مقام ہے افسوس کہ "مٹی کا قرض" (مجموعہ) جو غزلوں، نظموں اور ثلاثیوں پر مشتمل ہے راقم کو دستیاب نہیں ہوسکا اس لئے ان کی ثلاثیوں پر الگ سے لکھا جانا چاہیئے۔ شاعر جو کہنا چاہتا ہے اگر کم سے کم الفاظ میں مکمل صفائی سادگی اور شیرینی کے ساتھ بیان کردے اور قارئین اس تناظر میں سمجھ لیں کہ تو وہی کلام پروان چڑھتا

ہے۔ اسی اصول کے تحت حمایت علی شاعر کے کلام کو بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے بات ادھوری رہ جائے گی اگر شاعر کے کلام سے دوسرے پہلو کو تشنہ رہنے دیا گیا۔

اپنے عہد کے اسی فیصد انسانوں کی زندگی دیکھنے اور ان کی محرومیوں مجبوریوں کو محسوس کرکے جدید تقاضوں کے مطابق اپنی بصیرت کو فکر میں ڈھالنے، تعین اقدار میں اخلاقی حیثیت کو اہمیت دینے اور قدیم سرمائے کو یکسر نظر انداز نہ کرنے والا بے باک شاعر کبھی مایوسی کا شکار بھی ہوتا ہے کبھی کبھی اس کی ہمت بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ ذیل میں ایسے چند اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں۔

اب تو ہر شور طرب سن کے دہل جاتا ہے دل ایسے جینے سے بھلا کیا حاصل
جانے کس اندیشۂ فردا سے گھبراتا ہے دل زیست میں رنگ ہی باقی ہے نہ رس

آشیاں اور قفس ایک ہیں اب اپنے لئے بدن پہ پیرہن خاک کے سوا کیا ہے
بال و پر ہوں بھی تو کیا جرات پرواز نہیں مرے الاؤ میں اب راکھ کے سوا کیا ہے

اس میں دو رائے نہیں کہ سرحد کے اس پار میں جس طرح کے حالات رہے ان میں شاعر تو کیا اچھے اچھوں کے ہوش خراب اور جوش ٹھنڈے پڑ گئے۔ پاکستان کے تناظر میں اوپر پیش کیے گئے اشعار پڑھیئے تو یہ کوئی خاص مایوسی کا اظہار بھی نہیں کرتے کراچی کے بارے میں خود شاعر نے لکھا ہے کہ "کراچی ویسے بھی تجارتی شہر ہے اور زیادہ تر ان لوگوں سے آباد ہے جن کا رشتہ زمین سے ٹوٹ جانے سے بہت سی اقدار ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔ معاشی بنیادوں کی ناہمواری انسان کو خود غرض بنانے لگتی ہے۔ ایسے عالم میں اگر سیاسی حالات بھی متوازن نہ ہوں تو معاشرہ ایک ہمہ گیر بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے اور اصل حقیقتوں پر اس کا یقین کمزور پڑنے لگتا ہے ایسی صورت میں صرف تہذیب اور تاریخ ہی انسان کا سہارا بنتی ہے اور جب یہ سہارا بھی باقی نہ رہے تو انسان اپنی ذات میں محدود تر ہونے لگتا ہے۔"

اسی تناسب میں مایوس کن اشعار بھی شاعر کی شناخت میں معاون ہوتے ہیں ظاہر ہے شاعر پر ہمیشہ ایک ہی کیفیت طاری نہیں ہوتی اگر اس طرح کے کمزور لمحے نہ ہوں تو شاعر کے کلام میں پختگی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ ایک ذی عقل انسان ہی زندگی کی مشکلوں کو برداشت کرتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے لوہا لوہے سے کٹتا ہے "شیشہ و ساقی" نہیں۔

شاعر کے کلام میں داخلی کشمکش کے ساتھ موضوعات میں وسعت اور فکر میں گہرائی کے ساتھ آزادی ہے۔ کشمکش حیات کے چیلنج اور ان پر فتح پانے کی جستجو ہے۔ انتشار کے باوجود اپنی آواز کی شناخت اور گرد و پیش کے ساتھ اپنے رشتوں کی دریافت میں اظہار کی خواہش شامل ہے۔ وہ نظام نو کی تشکیل کے لئے فکر و عمل کے درمیان گہرا رشتہ قائم رکھتے ہیں جس میں مستقبل سے امید بھی وابستہ ہے اس کا موثر اظہار کلام کی افادیت کو دوبالا کرتا ہے اور یہ کہ کر انہیں چین ملتا ہے۔

جو کچھ بھی گزرتا ہے مرے دل پہ گزر جائے
اترا ہوا چہرہ مری دھرتی کا نکھر جائے

(مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی۔ قسط وار ۱۵ نومبر۔ ۲۲ نومبر۔ یکم دسمبر ۱۹۹۰ء)

نمبر۱ ڈاکٹر صاحب کو غلط فہمی ہوئی' حمایت علی شاعر نے بی' اے بھی سندھ یونیورسٹی سے کیا (مرتب)

نمبر۲ اس واقعہ کا ذکر حمایت صاحب نے اپنے ایک مضمون "پودے اور مسلم ضیائی" میں کیا ہے مگر قدرے مختلف انداز میں ..... یہ مضمون ان کی کتاب "شخص و عکس" (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) میں شامل ہے۔ (مرتب)

نوشتہ بین السطور

ڈاکٹر ارتکاز افضل

(مرہٹواڑہ یونیورسٹی۔ مہاراشٹر)

مری زمیں ہے مری ماں' میں ابن مریم ہوں
تمہارا خوں سے ہے رشتہ تو میرا دودھ سے ہے

حمایت علی شاعر کے شعری سفر کی شناخت وہ مشترکہ ورثہ ہے جس نے پوری ایک نسل کے شعور کی تربیت کی اور جس کی جڑیں ہجرت کی زمین میں پیوست ہیں شاعر اسی نسل کے شعور اور کرب شعور کی نمائندگی کرتا ہے جس نے ایک زمین سے کٹ کر دوسری زمین سے درد کا رشتہ باندھا ہے اور جس کی اکائی ذوالارضی تجربہ سے تشکیل پائی۔ یوں ہی شاعری کرلینا ایک بات ہے لیکن پوری ایک نسل کے اجتماعی تاریخی تجربہ اور تہذیبی صدمہ کو شعر کے آہنگ میں قید کرلینا جسارت قلندری و وسیع النظری کا متقاضی ہوتا ہے۔ فرعون مصر کے مظالم سے تنگ آکر قوم موسیٰ نے ہجرت کی ہو یا پھر یورپ کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر یہودیوں نے امریکہ میں جائے امان تلاش کی۔ زمین سے کٹ جانے کا کرب ہجرت کا سب سے بڑا المیہ ہے لیکن جب یہی تجربہ فن کے وسیلہ سے اظہار پاتا ہے تو ایک نسل کی محسوساتی تاریخ مرتب ہونے لگتی ہے نوبل انعام یافتہ امریکی ناول نگار سال بیلو کے مشہور ناول "آگی مارچ" "سیزڈے" وغیرہ اسی زمانے میں شائع ہوئے۔ جب حمایت علی شاعر تجربات کی بھٹی سے گزر کر شعر تخلیق کرنے لگے ہوئے تھے۔ ان ناولوں کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ سال بیلو نے اپنی تصانیف میں اس قوم کے فرد (یہودی) کی زندگی کی عکاسی کی ہے جو ایک نئی زمین' نئے ماحول اور نئی زمین پر تہذیبی آواگون کے عمل سے گزر کر نیا تشخص پانے کے مساعی میں لگا ہوا ہے۔

سال بیلو کے کردار "آگی" کے ساتھ نسلی تعصب برتا جاتا ہے معاشرہ کی مخصوص حد بندی اس کے ارتقاء کو متاثر کرتی ہے۔ معاشی حق تلفی اور سماجی عدم مساوات اس کے شعور کی تربیت کرتے ہیں۔ حمایت علی شاعر کے کسی بھی مضمون کو اٹھا کر دیکھ لیجیے' شعری حرف آغاز سے شعری تخلیق تک یہی مسئلہ حاوی نظر آتا ہے۔

کرب ہجرت سے تشکیل تشخص تک ایک ربط بندھا ہے' جو شاعر کی نہ صرف انفرادی شناخت بناتا ہے بلکہ شعری روایات میں اس کے اپنے ورثہ کے منصب کو بھی متعین کرتا ہے اپنی شعری روایات اور اپنے تہذیبی ورثہ کا جس قدر شدید احساس شاعر کے پاس ہے وہ شاید ہی ان کے ہم عصروں میں کسی اور کے ہاں ملے! تہذیبی ورثہ نے انہیں وہ شعور اور ادراک عطا کیا جو ذاتی تجربات کو تاریخی حدود سے آزاد کردیتا ہے۔ اور جو موجود سے ماورا' وجود سے عدم اور عصری تاریخ سے تاریخ انسانی تک ایک ایسا سلسلہ باندھ دیتا ہے جس کی کڑیاں قوموں کے شعور سے مربوط ہوتی ہیں شاعر کے نظم و ضبط کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے اپنے تجربہ کو تجربہ کی شدت کے باوجود منتشر نہیں ہونے دیا۔

ان کا پہلا مجموعہ کلام "آگ میں پھول" (۱۹۵۶) ان تجربات کو گرفت میں لیتا ہے جن میں احساس محرومی غالب ہے۔ حالات کی سرد مہری' فکر معاش' احساس زیاں' داخلی وحشت' ذاتی صدمے (مژدہ نو) فرقت و ہجر اور ایک دبا دبا سا نراجیت

پسندی کا عنصر۔ یہ تمام مل کر ان کی شعری کائنات کو المناک بنا دیتے ہیں اور نتیجتاً" اس مجموعے کی بیشتری نظموں و غزلوں پر یاسیت اور حزن و ملال غالب ہیں۔

میں اس ضمن میں رومانویت کی بحث کو اٹھانا نہیں چاہتا کہ حمایت علی کی شاعری میں رومانویت ذہنی لذت کوشی یا فرار نہیں بلکہ ایک شدید شعری رویہ ہے۔ عام طور پر رومانوی شاعری میں یا تو لاحاصل کا کرب ہوتا ہے یا پھر خیالی فرقت کا کرب۔ (یا خیالی قربت کا نشہ) لیکن شاعر کے پاس حاصل کا کرب حاوی ہے۔ "غم حاصل" جیسی نظم کو پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن ایسی متضاد کیفیت سے دوچار ہوجاتا ہے جس میں حاصل اور لاحاصل کا درمیانی فاصلہ ذہنی رویئے کی پیداوار نہیں بلکہ تاریخی حالات سے منسوب ہے۔ عشق اور غم زیست کا وہ تصادم جسے شاعری میں برت کر فیض نے اردو شاعری میں موضوع کا نیا باب کھولا۔ (اور غم زیست کو مقدم ٹھہرایا) شاعر کے پاس دو متوازی تجربات ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعر کے پاس فیض کی لطافتیں بھی ہیں مجاز کی شعلہ بیانی بھی اور جوش کا مشتعل ضبط ہے۔ لیکن ان سے بھی ہٹ کر شاعر کی شاعری میں احساس محرومی اس قدر غالب ہے کہ نہ عشق حاصل کا انبساط باقی رہتا ہے اور نہ ہی حسن محرم کی جولانیاں باعث تسکین شاعر نے ماضی (تھا، تھی، تھے وغیرہ) اور حال (ہے، اب، ابھی، آج وغیرہ) کے صیغوں کو جس انداز میں برتا ہے یا یوں کہئے کہ موضوع کے داخلی تقاضہ کے اعتبار سے ان صیغوں کو جس طرح شعر کی داخلی کیفیت یا داخلی زماں سے ہم آہنگ کیا ہے وہ خود متضاد تجربات کے درمیان زمانی فصل قائم کرتے ہیں۔ "حسرت قرب، ترک و طلب" وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں کیونکہ "آگ میں پھول" خود شاعر کی زندگی کے ایک اہم تاریخی دور پر محیط ہے۔ اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس مجموعے میں اپنے دوستوں، دوست ادیبوں فنکاروں وغیرہ سے بھی منسوب نظمیں ہیں جن سے شاعر کو خاص نسبت رہی۔ اسی طرح "وہ" ایک ایسی نظم ہے جس میں سرمستی وصال کا جذبہ اس قدر ہے کہ ہر لفظ سے کیف و خمار ٹپکتا ہے۔ لیکن ان خالص نجی تجربات سے ہٹ کر شاعر جب زندگی کے مسائل کو موضوع بناتا ہے تو غم و حسرت احساس محرومی، بے سمتی، ناداری، احساس زیاں اور جڑوں سے کٹ جانے کا کرب چپکے سے در آتے ہیں۔

جب بھی گھر کا خیال آتا ہے
قبرستان کی ویرانی سی
قلب و نظر پر چھا جاتی ہے
(وحشت بام و در)

چاند، پہرے کے سپاہی کی طرح استادہ
سوچ میں ہیں کہ جو تو جائے تو وہ چل دے
رہ "گزر" ایک طوائف کی طرح وامانده
ایسی لیٹی ہے کہ کون آئے اب رات گئے
(چل خسرو گھر اپنے)

میں کہ اس زندگی کے صحرا میں
اک بگولے کی طرح اڑتا رہا
کوئی منزل نہ ہم سفر کوئی
جس طرف راہ پائی مڑتا رہا
(غم رائیگاں)

یہ جہاں ایک دکاں ہے کہ جہاں صبح و مسا
آدمی بکتے ہیں نیلام کی چیزوں کی طرح
شب کی تاریکی ہو یا دن کا اجالا ہر وقت
راحتیں بٹتی ہیں محلوں میں کنیزوں کی طرح
(جبر عہد)

اب تو یہ عالم ہے، ہم ہیں اور ہماری گمرہی
راستے کے پیچ و خم میں کھو گئی، منزل کی بات
سینے میں چھپائے ہوئے اک آتش خاموش
ہم کب سے بہ ایں دیدۂ تر جاگ رہے ہیں
ہر نفس اک داستانِ غم ہے لب چپ ہیں تو کیا
کوئی آنکھ ایسی ہے جس میں خندۂ پُرنم نہیں

ان تمام باتوں کے باوجود اس مجموعے میں چند نظمیں اور کافی غزلیں ایسی ہیں جو نہ صرف موضوع کی سطح پر بلکہ اسلوب کے اعتبار سے بھی خارجی غم و اندوہ کا مداوا فراہم کرتی ہیں۔ لیکن اس بات کو مدِ نظر رکھا جانا چاہیے کہ انبساط کے لمحے نجی نوعیت کے ہیں۔

"حرفِ جاں" میں شامل چند غزلیں اس بے نیازی اور احساسِ تحفظ کی غماز ہیں جو صحرا میں لالہ کھلاتا ہے۔ اور ظلمت میں نور کی کرن بن جاتا ہے لیکن جس احساس کا مخزن خالص نجی اور محسوساتی اثاثہ ہے۔

غربت میں ہم سفر ترا سایہ قدم قدم
مایوسیوں میں آس کا امکاں ترا خیال
شہرِ خرد میں تیرا تصور ارم ارم
دشتِ جنوں میں خوابِ گلستاں ترا خیال
پرتو سے تیرے دھوپ میں بھی چاندنی کا رنگ
پت جھڑ کی رت میں صبحِ بہاراں ترا خیال

"جاوداں" میں بھی یہی نجی اثاثہ ایک نئے انداز میں سامنے آیا ہے۔ ان لمحوں کے علاوہ اگر کچھ ہے تو بس آسماں کی "کج روی" اور تاریخی حالات کا جبر۔

"آگ میں پھول" کے ضمن میں اوپر یہ بات بھی کہی جا چکی ہے کہ تجربہ کی شدت کے باوجود شاعر تجربہ کو منتشر نہیں ہونے دیتے۔ ہاں خیالات پریشاں اور بات ہے لیکن "مٹی کا قرض" (۱۹۷۴ء) شاعر کے ارتقاء اور شعری حیثیت کی ترتیب کے اس مرحلے سے متعلق ہے جہاں مشاہدہ شعور و ادراک کی حدوں کو چھونے لگتا ہے اور بصارت بصیرت بن جاتی ہے۔ "آگ میں پھول" اور "مٹی کا قرض" کے درمیان جو طویل فاصلہ ہے اس کا شاعر کو خود شدت سے احساس ہے اور غالباً" یہی وہ احساس ہے جو نہ صرف ایک منظم فکر کی تربیت کرتا ہے۔ بلکہ احساس کی تہذیب بھی اسکی مرہونِ منت ہے۔ تہذیبی آواگون کے عمل سے ایک نیا تشخص حاصل کرنے کا مسئلہ ان واقعات و تاریخی حالات کی معروضی تفہیم جو موضوعیت کی دھند میں لپٹے رہے، ناسازگار حالات سے گزر کر مادی و تہذیبی اقدار کے مابین حدِ فاصل کی شناخت، پرچھائیوں میں مجبور، شخصی وحدت کی بازیافت اور ان تمام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی اور فنی رویے، مٹی کا قرض، کی فنی شناخت، قائم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ابتدائی دور کی یاسیت اور جذباتیت پر ایک طرح کا خلاقانہ ٹھہراؤ حاوی نظر آتا ہے، لب و لہجہ اور اسلوب کے اعتبار سے

بھی طنز، استغراق، ٹھہری ٹھہری فکر اور مہذب شعور رومانی اشتعال پر غالب ہے۔

سورج تھا سر بلند تو محو نیاز تھے
سورج ڈھلا تو دل کی سیاہی تھی دیدنی
کوتاہ قامتوں کے بھی سائے دراز تھے
(ابن الوقت)

کب ہوا کی ہوئی تحریر نظر میں آئی
گر زمیں ہو تو ہر اک بیج میں امکان شجر
بے زمیں ہو تو ہر اک نقش نمو ہے کائی
(اساس)

غم یار اور غم دوراں کے سیلاب سے گزر کر جب فنکار کو فرصت ملتی ہے، جب فکر روزگار اور اندیشہ حال و فردا سے تھوڑی سی فرصت ملتی ہے تو فرصت شام و سحر، فرصت شعور و نظر بن کر واقعات و واردات کی تفصیل نہیں بلکہ تلمیح فراہم کرتی ہے۔ نظمیں ہو کر غزلیں مٹی کا قرض، سطحی مظاہر کے پس پردہ حقائق کی تجلی کو تشبیہوں، استعاروں، پیکروں اور علامتوں میں تلاش کرتی ہیں، اور نتیجتاً "فن مال سطور نہیں بلکہ بین السطور بن جاتا ہے

سوچتا تھا، یہ چمکتی فصل جب کٹ جائے گی
دامن مہتاب میں کھل جائیں گے چاندنی کے پھول
رات کے ماتھے سے گرد تیرگی چھٹ جائے گی
سوچتا تھا میں کہ دیکھا کہ رات ساری کٹ گئی
ایک سورج ناگہاں ابھرا، بعد جاہ و جلال
چاند کی دولت، سحر کے غاصبوں میں بٹ گئی
(منظر۔ پس منظر)

نظموں میں سمندر، بگولا، ہوا، سنگ میل، سنگ راہ، وغیرہ استعاروں کے ذریعہ شاعر نے زندگی کو سفر سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس سفر کا حاصل محض گرد راہ ہے اس کے برعکس غزلوں میں تشبیہوں اور استعاروں میں نظم و ضبط کا یہ عالم ہے کہ ہر شعر کسی نہ کسی زاویئے سے سفر ہی کے مرکزی استعارے کی تفسیر و تشریح لگتا ہے۔

منزل کے خواب دیکھتے ہیں پاؤں کاٹ کے
کیا سادہ دل یہ لوگ ہیں گھر کے نہ گھاٹ کے
راہ دشوار ہے، فرش گل تر ہونے تک
پاؤں کے زخم ہیں آغاز سفر ہونے تک

شاید ہمیں عزیز نہیں اپنی زندگی
لوٹ آئے لوگ راہ خطرناک دیکھ کر

اک نقش پا کی طرح سہی اس زمین پر
اپنی بھی ایک راہ بنائیں گے رہیں گے ہم

اے ریگزار سندھ ترا چاند بجھ نہ جائے
آئے ہیں اس کی چاہ میں ارض دکن سے ہم

اک عمر کی مسافت بے نام کی عوض
گر کوئی شے ملی بھی تو گرد سفر ملی

انفرادی سطح پر تو یقیناً "لا حاصلی کا ایک احساس جاگزیں ہے لیکن جہاں تک پوری مہاجر جماعت کی نئی شناخت کے استناد کا مسئلہ ہے، شاعر نے شان قلندر کے ساتھ قوت نمو کی نامیاتی جہت کے طرف بار بار اشارہ کیا ہے۔ لیکن تہذیبی تسلسل اور عرض، وحدت' کے تصور کے توسط سے شجر بے زمین کی باز آباد کاری کا عمل' نودمیدہ تشخص کا تہذیبی' تمدنی اور فلسفیانہ جواز شاعرانہ عظیم روایتوں' میں کامیابی کے ساتھ تلاش کرتا ہے جن سے ہر بنی نوع کا روحانی رشتہ ہے۔ بالخصوص اسلام کی روایات سے مستعار استعاروں اور تلمیحوں کی زبان میں وہ نہ صرف اپنے فنی سوز کا مداوا کرتا ہے بلکہ ہجر کے غم میں شریک اپنی نسل کے اجتماعی مسائل کا بھی حل تلاش کرلیتا ہے۔ وہ دبا دبا سا غصہ اور مہذب کرب جو مٹی کا قرض میں واضح ہے' جو ارتقاء کا ایک اور مرحلہ طے کرکے فلسفہ وجود کا قالب اختیار کرلیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ بات واضح ہے کہ شاعر کے فلسفہ وجود۔ فنی و تہذیبی دونوں ہی سطحوں پر' مہاجرین کے اجتماعی وجود ہی کے مسئلہ کا ترجمان ہے۔ نہ کہ یورپ سے مستعار کسی "فلسفہ وجودیت" کا مقروض' حمایت علی کے شعری سفر کا یہ تیسرا اور اہم مرحلہ "ہارون کی آواز" پر مرتکز ہوتا ہے۔

"ہارون کی آواز" ابھی ابھی شائع ہوئی ہے' انور سجاد نے خوشیوں کے باغ میں اپنے عصری معاشرے کی داخلی زوال آمادگی کی عکاسی کو اپنے ناول "خوشیوں کا باغ" میں اس قدر چابکدستی سے برتا ہے کہ تکنیک کے اعتبار سے اس ناول کا ثانی نہیں' لیکن سب سے بڑا کمال تو یہ ہے کہ عصری تاریخ کو ازمنہ قدیم کی تاریخ کے اس باب کے تناظر میں پرکھا اور ان تاریخی واقعات سے عصری واقعات کے ڈانڈے ملائے کہ ابہام اشارے کنارے اور استعاروں کے باوجود حق و باطل کی جنگ کا منظر نامہ کھل جاتا ہے' حمایت علی شاعر کے پاس بھی "ہارون کی آواز" ایک استعارہ ہے۔ شاعر کا یہ یقین کہ شاعر "تلمیذ الرحمان" ہوتا ہے ایک مخصوص معاشرہ کے سیاق و سباق میں' تو اہم ہے ہی لیکن اس کی عمومی صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا اس اعتبار سے شعر اگر "ہارون کی آواز" ہے تو وہ معاشرہ جس سے یہ آواز مخاطب ہے یقیناً فریب سامری کا شکار ہے۔

لوح کلیم ٹوٹ گئی' پارہ پارہ ہے
ہارون شرمسار کہ موسیٰ سے کیا کہے
گو سالے کو جب است موسیٰ خدا کہے
(گوسالہ)

افسانہ یاد آگیا اصحاب کہف کا
تاریخ لکھنے بیٹھا تھا میں اپنے دور کی
اک طرف اڑتے ابابیل' اک طرف اصحاف فیل
اب کے اپنے کعبہ جاں کا مقدر دیکھنا

کشتی ہے نگر ہم ہیں کوئی نوح نہیں ہے
حد سے نہ گزر جائیں کہیں کمترین لوگ
آیا ہوا طوفان خدا جانے کدھر جائے
موسیٰ کے انتظار میں ہیں بے زمین لوگ

کھینچی تھی جن کے خوف سے سد سکندری
سوئے نہیں ہیں آج وہ دیوار چاٹ کے

ان تلمیحات کے علاوہ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں کسی نہ کسی استعارے یا تلمیح ہی کے توسط سے اپنے دور کی تاریخ کا ادراک کرتی ہیں اور قاری تک ترسیل سطور کے ذریعہ نہیں بلکہ بین السطور میں ہوتی ہے

اخبار سے زیادہ ہے دیوار معتبر
میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ میری بات
شاید ہو آپ کے لئے یہ بات غور کی
خوشبو کی طرح اڑ کے ترے دل میں اتر جائے
پڑھنا ہے تو نوشتہ بین السطور پڑھ
یہ معجزہ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
تحریر بے حروف کے معنی پہ دھیان دے
اب دست سامری میں عصائے کلیم ہے

دراصل اس مجموعے کی سب سے بڑی فنی خوبی یہ ہے کہ شاعر کے شعور و احساس نے حالات کی بھٹی میں تپ کر اپنے فنی اظہار کے لئے استعارے اپنی ہی روایات میں تلاش کئے۔ ہجرت کا تجربہ جو اب تک محض جذباتی' تہذیبی اور معاشرتی بعد اور بے زمینی سے تعبیر ہوتا رہا اب ایک پائیدار استعارہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ خاص طور پر نئی زمین سے تہذیبی و انسانی رشتہ مریم کے استعارہ کے ذریعہ اپنی پائیداری کا استناد کرتا ہے یہ استعارہ فنی اعتبار سے اس لئے بھی حکم کا درجہ رکھتا ہے کہ ماں مریم کی پاکیزگی اور دوشیزگی زمین کی ازلی دوشیزگی کا استعارہ بن جاتی ہے اور خود ماں مریم مادر وطن کا استعارہ

مریم یہ خون بھی تو تمہارا ہی خون ہے
تم تو زمیں ہو مرکز تخلیق زندگی
کیوں تم نے اپنے خون سے بے اعتنائی کی
کیوں آج تم کو فکر ہوئی پارسائی کی
اس خون میں مہک ہے تمہارے ہی دودھ کی
میں اجنبی نہیں روح وطن' مجھے پہچان
کیوں ماتما پہ شرط ہے اب کتخدائی ہے
میرا تیرا خون ہوں' تیرا بدن' مجھے پہچان

اور آخر میں اپنے غیر مہاجر ہم وطنوں سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے

تمہارے ورثہ اجداد کو خدا رکھے
مجھے بھی پیار مرے شہر ہست و بود سے ہے
مری زمیں ہے مری ماں' میں ابن مریم ہوں
تمہارا خوں سے ہے رشتہ تو میرا دودھ سے ہے

(مطبوعہ روزنامہ "اورنگ آباد ٹائمز" ۔ حمایت علی شاعر نمبر ۔ ۲ ؍ جون ۔ ۱۹۸۵ء ۔ مہاراشٹر)

شاعر، اجتماعی انسان اور شاعری

پروفیسر سجاد حارث

"میری شاعری کو آسانی سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ غم جاناں، غم وطن اور غم کائنات۔ غم جاناں کے زمرے میں جو تخلیقات شامل ہیں ان میں یقیناً "میرا ذاتی غم موضوع شعر ہے" لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ میرا ذاتی غم میرا نجی غم بن کر نہ رہ جائے بلکہ سماجی زندگی کے رشتے سے یہ موضوع غم مشترک کی حیثیت اختیار کر جائے۔"

میں اور میرا فن .... حمایت علی شاعر

اردو کے ایک نوجوان شاعر نے اپنی نظموں کے مجموعے میں دیباچے کے طور پر (W.B. Yeato) کا تذکرہ کرتے ہوئے (Yeats) کے اس فقرے پر کہ "دنیا سے جنگ کرنے میں خطابت پیدا ہوتی ہے اور اپنے آپ سے برسرپیکار ہونے میں شاعری تخلیق ہوتی ہے۔ بڑی مایوس کن بحث کی ہے اس نوجوان شاعر نے (Yeats) کے اس دعوے کو جزوی طور پر تسلیم بھی کر لیا ہے۔ کیونکہ یہ نوجوان شاعر خود بھی ان فنکاروں کی صف میں شامل ہے جو کارزار حیات میں ہاتھوں میں سفید جھنڈے اٹھائے زندگی کا رجز گانے کی سعی لاحاصل کیا کرتے ہیں۔ جو دنیا سے جنگ کرنے سے زیادہ اپنے آپ سے برسرپیکار ہو جاتے ہیں اور دنیا کے شعر و ادب کی پوری تاریخ میں کسی ایسے فنکار کی مثال ڈھونڈنی مشکل ہے جس نے خود سے برسرپیکار ہو کر دنیا سے جنگ کرنے والوں کی رہنمائی کی ہو انہیں حوصلہ بخشا ہو یا ان کی قوت و صحت میں کسی قسم کا کوئی اضافہ کیا ہو، جو فنکار خود سے برسرپیکار ہو کر شاعری کی تخلیق کرتے ہیں وہ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر ایسے جہان آرزو کی تخلیق کر لیتے ہیں جہاں وہ اپنی "انا" کے کیڑے کو کارزار حیات کی خوشگوار اور صحت مند ہوا نہیں لگنے دیتے۔ وہ خطابت سے نفرت کرنے لگتے ہیں کیونکہ خطابت کے لئے مخاطب کا ہونا بنیادی شرط قرار پاتا ہے اور مخاطب کو رجوع کرنے کے لئے "انا" کے خول سے باہر انسانی معاشرہ کی تازہ اور صاف ہوا میں نکل کر آنا پڑتا ہے۔ خود سے برسرپیکار ہو کر جس قسم کی شاعری تخلیق ہوتی ہے اس میں انسانی معاشرے کا کوئی نارمل انسان پر بھی نہیں مار سکتا۔ کیونکہ اس شاعری کے جملہ حقوق بحق "انا بہ شاعر" محفوظ ہوتے ہیں اس شاعری میں شاعر کی صرف ان منفرد آرزوؤں اور خواہشات کا ہی اظہار ہو سکتا ہے جن کو کوئی دوسرا انسان محسوس نہ کر سکے جس میں کسی دوسرے انسان کی زندگی کا پرتو تک نہ پڑ سکے اور جو شاعر کے صرف اپنے ذاتی مسائل اور ذہنی الجھنوں کا ہی اظہار کر سکے۔

ادبی اصطلاح میں اسے شدید داخلیت پسندی یا مریضانہ انفرادیت پرستی بھی کہہ سکتے ہیں۔ بودیلئر، راں بو، ورلین اور میرا جی وغیرہ فنکار اس صف میں آتے ہیں یہ لوگ جانتے تھے کہ ان کو کس قدر مہلک مرض لگا ہوا ہے اور یہ اس مرض کا شدید احساس ہی تھا جس نے دراصل ان کو شاعری کے لئے اکسایا تھا۔ ان کے جذبات و احساسات پر ظلم و ستم دنیا نے ڈھائے۔ ان کی جبلتوں پر قدغن دنیا نے لگائی لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ وہ دنیا سے جنگ کرنے کے بجائے خود سے برسرپیکار ہوتے تھے گویا خود مجرم تھے ان کی مظلومیت تو خیر اظہر من الشمس تھی ہی لیکن حیرت تو یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ وہ خود ہی کو ظالم بھی

تصور کرتے تھے۔ اور ظلم و ستم کے اس اندھیرے میں وہ محض اپنے وجود کا ہی ادراک کرتے تھے' ان کی طرح دنیا کے دوسرے کروڑوں مظلوم انسان ان کے احاطہ نظر سے باہر رہتے تھے' اس علیحدگی نے ہی ان فنکاروں کو عمر بھر مختلف النوع ذہنی و جذباتی' نفسیاتی اور جنسی عوارض میں مبتلا رکھا۔

حمایت علی شاعر کا فن نظریہ زندگی اور شاعری خود سے برسرپیکار ہونے والے شاعروں سے علاقہ نہیں رکھتا حمایت علی نے جنگ کی ہے اور دنیا سے جنگ کرنے کے دوران انتہائی حسین اشعار کی تخلیق کی ہے ان اشعار میں حسن' توانائی' قوت' سادگی اور رعنائی سب کچھ موجود ہے۔ حمایت علی بنیادی طور پر کش مکش حیات کا ترجمان ہے۔ وہ دنیا سے جنگ کرنا اپنا پہلا فریضہ سمجھتا ہے اور اپنے فن کو پیکار حیات کا جز قرار دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ادب کو محض دل کا ایک مشغلہ ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے وہ دماغ کی زندگی سے تعبیر کرتا ہے اور وہ خود اس کے اپنے الفاظ میں "جو فنکار اس نکتہ سے آگاہ ہوتا ہے اور یہ راستہ اختیار کرتا ہے اس کے نزدیک نہ صرف اپنے عہد کی اقدار مقدم ہوتی ہے بلکہ وہ ان کی تعمیم کے راز کو بھی سمجھتا ہے۔" (Yeats) کے اس نظریئے میں جو خطابت' اور شاعری کی تخلیقی بنیادوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بڑا پیام موجود ہے اگر (Yeats) کے اس بیان کو من و عن تسلیم کرلیا جائے تو خود ییٹس کی شاعری اس بیان کی تکذیب کردیتی ہے ییٹس نے اپنے عہد کی اقدار کو اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Elcot) نے اپنے ایک مضمون میں ییٹس کی شخصیت اور شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔

وہ اپنے اس مضمون کے اختتام پر دو قسم کے شاعروں کا تذکرہ کرتا ہے ایک گروہ شاعروں کا وہ ہوتا ہے جن کی شخصیت اور شاعری کو ان کے مخصوص تاریخی عہد سے الگ کرکے سوچا جاسکتا ہے ان شاعروں کی تخلیقات کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں کسی قسم کی تاریخی اور سماجی پس منظر کو سمجھنا نہیں پڑتا لیکن دوسرا گروہ شاعروں کا وہ ہوتا ہے جن کی تخلیقات کو ان کے مخصوص تاریخی اور سماجی رابطے ہی سے سمجھا جاسکتا ہے اس نوع کی شاعری ایلیٹ کے قول کے مطابق اپنے عہد کے خدوخال لے کر ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ایلیٹ کے نزدیک ییٹس شاعروں کے موخرالذکر طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ ییٹس کے فن اور اس کی شخصیت کی تاریخ خود اس کے اپنے عہد کی تاریخ سے ماخوذ ہے اگر ایلیٹ کے نظریئے کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر ییٹس کے فن اور اس کے نظریات کو اس عہد کے سماجی شعور سے الگ کرکے سوچا نہیں جاسکتا۔

اب اگر ایک فنکار اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے اور اپنے فن میں اپنے عہد کی مختلف النوع اقدار کو سموتا ہے' ایسی صورت میں اس فن کار کا دنیا سے ٹکراؤ ناگزیر ہوجاتا ہے یہ فنکار اپنے مزاج' طبقہ' ذہن اور سماجی شعور کے مطابق اپنے عہد کی کچھ اقدار کو متاع عزیز سمجھتا ہے کچھ قدریں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو مٹا کر ان کی جگہ اپنی محبوب اقدار کو رائج کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس مقام پر آکر ہی دنیا سے جنگ کرنے کی نوبت آجاتی ہے ییٹس کی شاعری کے ہر دور میں ایسے مقام آئے ہیں جہاں وہ دنیا سے برسرپیکار نظر آتا ہے لیکن نہ تو ییٹس نے ہی کبھی اپنی شاعری کو خطابت سے تعبیر کیا ہے اور نہ ہی (Yeets) کے مستند نقادوں نے اسے خطیب شاعر کہہ کر پکارا ہے۔ آئرلینڈ کے ایسٹر بغاوت کے بعد تو ییٹس نے اپنے فن کو اپنے ملک کی اکثریت کے خلاف بھی استعمال کیا ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود ییٹس کی شاعری' شاعری ہی رہی خطابت نہ بن سکی لیکن آڈن اور اسپنڈر نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اگر مظلوم و مقہور انسانوں کی دست گیری کی کوشش کی تو ان

کی شاعری خطابت اور صحافت بن گئی تھی۔

ممکن ہے اردو کے بعض نقاد حمایت علی شاعر کی ان نظموں کو مملکت شاعری سے یکسر طور پر خارج کردیں جن میں دنیا سے جنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں بھوک، انسانی استحصال ظلم و جبر اور تنگدستی کی پیدا کردہ مضر سامانیوں کو جذبات و محسوسات کے خاکوں میں ابھارا گیا ہے ہمارے وہ ناقدین ادب، جو مختلف قسم کے نفسیاتی اور جنسی امراض کی تشہیر اور تجزیہ کو حقیقی شاعری اور ادب قرار دیتے ہیں۔ حمایت علی شاعر کے اس جذباتی مواد کو یقیناً " خطابت اور صحافت قرار دیں گے کیونکہ آج رجعت پسندوں کا ادب میں انتشار پھیلانے کا سب سے بڑا حربہ یہ بن گیا ہے کہ دانشور طبقے کو حقیقت کے ادراک سے بہرصورت دور رکھا جائے جو ادب رجعت پسند یا استحصالی طبقے کے مفاد کی نفی کرتا ہو اسے خطابت اور صحافت کہہ کہ بدنام کیا جائے اور جو صحافت یا خطابت اس طبقے کے لئے باعث خطرہ نہ ہو اسے ادب قرار دے دیا جائے، ادب، صحافت اور خطابت کے اس گورکھ دھندے میں بعض بڑے سلجھے ہوئے ادیب اور باشعور انسان بھی پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں جو دانشور حکیمانہ ادراک نہیں رکھتے اور نعروں کے پیچھے چلنے کے عادی ہوتے ہیں خاص طور پر اس افتراق و انتشار کے بری طرح شکار ہوجاتے ہیں۔

حمایت علی شاعر مجرد خیالات کا شاعر نہیں وہ اپنی شاعری کے لئے مواد اور اپنے ذہن کے لئے غذا زندگی کے عملی مسائل سے حاصل کرتا ہے۔ وہ خوابوں کے جزیرے میں آنکھیں نہیں کھولتا بلکہ گردوپیش کی حقیقی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کی شاعری اس کی پوری زندگی کا تجربہ ہے اور وہ یہ تجربہ ایک عام انسان کی طرح بیان نہیں کرتا بلکہ اپنی زندگی کے ان تجربات و محسوسات کے سانچوں میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایک فنکار کی تخلیقی حیثیت کا تعین پیش کردہ تخلیقی مواد کی نوعیت اور تکنیک ہی پر ہوتا ہے۔ ادب کی مختلف النوع اصناف کا تعین موضوعات سے نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اکثر ایک ہی موضوع پر نظم، افسانہ، ڈرامہ، ناول اور صحافتی نوٹ بھی لکھے جاتے ہیں۔ تقاریر بھی سنی جاتی ہیں فلسفہ اور تاریخ کی کتابوں میں بھی موضوع بحث لایا جاتا ہے اس لئے کسی شاعر کے تخلیقی فن کو موضوعات کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جاسکتا۔ بلکہ اس کے لئے ہمیں جذبات و محسوسات کی ایک مخصوص ہیئت کو شاعری کا بنیادی اصول مان کر چلنا پڑتا ہے۔ اور جب ہم اصول شاعری کی اس بنیاد پر حمایت علی کے فن کی تخلیقی حیثیت کو پرکھتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور اخلاقی مسائل اور موضوعات پر لکھنے کے باوجود شاعری کے منصب سے نہیں گرتا۔ وہ اپنے جذبات و محسوسات کو بے لگام نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ وہ اپنے خیالات، جذبات اور محسوسات میں نظم و ضبط پیدا کرکے اشعار کی تخلیق کرتا ہے۔
حمایت علی ادب برائے ادب جیسے نکمے نظریئے کو نہیں مانتا وہ ادب کو زندگی کا ترجمان اور آئینہ دار سمجھتا ہے۔

زندگی سے فن و ادب کے اس گہرے رشتے کو اس نے مکتبی علم اور نظریات سے نہیں سمجھا ہے بلکہ اپنی زندگی کی جدوجہد کے دوران اس حقیقت کا ادراک کیا ہے۔ جذبات و محسوسات میں شکست و ریخت اور انسانی رشتوں میں گڑبڑ صرف انسانی جبلتوں اور نفسیاتی کیفیات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کی بنیاد میں موجودہ معاشی اور معاشرتی نظام کی جدلی قوتیں کارفرما ہیں اور حمایت علی نے سماج میں زندگی کے اس جدلیاتی عمل کو جدوجہد و پیکار کے ذریعے ہی سمجھا ہے وہ اپنی زندگی کی جدوجہد کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ خود لکھتے ہیں۔

"مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں نے اپنا سربلند رکھنے کی خاطر معمولی سے

معمولی کام بھی کیا ہے اور اس آگ کو جو میرے سینے میں ہمیشہ دہکتی رہتی ہے کسی عنوان بجھنے نہیں دیا۔"
"مجھے اپنے طبقے، اپنے کچے مٹی کے مکان اور اپنی اس معمولی زندگی پر ناز ہے جس کی وساطت سے مجھے سماج میں زندگی کے جدلیاتی عمل کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔"

حمایت علی ایک غریب گھرانے کے چشم و چراغ ہیں وہ اپنی زندگی کی اس حقیقت کو اپنے لئے قابل فخریات سمجھتے ہیں ان کے دل میں عوام کے لئے بڑا احترام پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں شروع سے آخر تک جس بنیادی طرز احساس کی کارفرمائی نظر آتی ہے وہ عوام کی زندگی ہی سے مستعار ہے۔ انھیں اس بات پر یک گونہ اطمینان ہے کہ عوام کی زندگی سے روشناس ہونے میں خود ان کے اپنے ماحول، گھرانے اور معاشرت نے متعد بہ حصہ لیا ہے۔ حمایت کا یہ طرز احساس طبقاتی برتری کا محض ایک نفسیاتی تصور نہیں یعنی ایسا تصور جو احساس کمتری کے ایک انفعالی جذبہ سے پھوٹ کر حسین الفاظ کے تانے بانے میں اپنی محافظت کے لئے ایک مربوط فلسفے کی تخلیق کی سعی کرتا ہے جیسا کہ اکثر زوال پسند دانشوروں کے یہاں انفرادی زندگی کی کجروی اور کمزوری منطق، فلسفہ، ادب اور نفسیات کی اصطلاحات اور نظریات کے سہارے ایک مربوط نظام فکر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

حمایت علی کا یہ طبقاتی تفاخر زوال پسندوں کی مانند فکر و فلسفے کی پناہ گاہوں میں کسی نفسیاتی یا معاشرتی خوف کے باعث جادہ پیمائی نہیں کرتا بلکہ یہ انسانی معاشرت اور انسانی معاشرت کے ٹھوس مادی اور تاریخی حقائق پر اپنے ہر دعوے کی بنیاد استوار کرتا ہے۔ یہاں انفرادیت کے خول میں لپٹی ہوئی مریض "انا" اور اجتماعیت پسند انفرادیت کا فرق ایک ابھرے ہوئے خط کی مانند واضح نظر آتا ہے۔

ایک فنکار کی زندگی اور فن کے مطالعے میں جذبات و محسوسات کی نوعیت اور ان کی ہیئت ایک اہم اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ ایک فن کار کے ذہنی رویے کا تعین اس کے پیش کردہ جذباتی مواد کی صفت اور نوعیت ہی سے کیا جاسکتا ہے خاص طور پر واردات عشق میں اور جنسی مسائل کے بارے میں ہر فنکار کا رویہ منفرد اور مختلف ہوتا ہے اگرچہ بادی النظر میں جنسی جذبات کے بیان و اظہار میں اختلاف کی بہت کم گنجائش نظر آتی ہے لیکن مختلف مدرسہ ہائے فکر کی عشقیہ شاعری کو دیکھ کر اس اختلاف کو بہ آسانی سمجھا اور پرکھا جاسکتا ہے اس بات کی مزید وضاحت کے لئے لکھنؤ دبستان شاعری کے انحطاطی دور کے کسی شاعر کا دہلی اسکول کے کسی شاعر سے تقابل کر دیکھئے عشق اور جنسی جذبات کی نوعیت، ہیئت اور طریقہ اظہار میں دونوں شاعروں کے یہاں ایک امتیازی فرق ملے گا۔

بعینہ جدید اردو شاعری میں میراجی کا جذبہ حسن و عشق دیگر ہم عصر شعراء کے یہاں موجودہ جذبہ حسن و عشق سے ایک الگ اور انوکھی چیز نظر آتا ہے۔ فراق گورکھپوری کے یہاں اگر یہ جذبہ عشق گریباں ہستی کو پکڑنے کی سعی کا نام ہے تو فیض کی عشقیہ شاعری کوئے یار سے نکل کر کوئے دار تک جانے کی ایک داستاں نظر آتی ہے۔

اسی طرح اختر شیرانی کے یہاں حسن و عشق، صداقت، نیز عظمت و رفعت کا مترادف بن جاتا ہے قدیم و جدید اردو شاعروں کی طرح حمایت کی شاعری میں بھی حسن و عشق ایک مستقل موضوع ہے لیکن معاملات حسن و عشق میں وہ ان روایات کے ہرگز پابند نہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ اپنے فن پر لکھتے ہوئے وہ خود ایک جگہ اس بارے میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ "میں۔ نے زندگی کو ہمیشہ مادی حدود میں دیکھا ہے اور ان ہی مادی حدود میں اس کی تصویر کشی کی

ہے۔ میرا محبوب وہی ہے جو زندگی میں میرا محبوب ہے۔ میری طرح گوشت و پوست کا انسان۔ ظاہر ہے کہ اس کے محسوسات انسانی محسوسات سے مختلف نہیں ہوسکتے۔ اگر مجھے اس سے عشق ہے تو اس نے بھی مجھے چاہا ہے اگر میں اسے اپنا نہیں سکا تو میں نے گریبان چاک کرکے دشت نوردی کرنے کے بجائے' سماجی حالات میں اپنے عشق کی ناکامی کا جواز تلاش کیا ہے اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔"

عنفوان شباب میں زندگی اکثر حسن و عشق کے ہنگاموں سے دوچار ہوتی ہے اور اپنا گوہر مقصود حاصل کرنے میں بیشتر فنکاروں کو بڑی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ بظاہر یہ نقطہ انفرادی شکست کا نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت بالعموم اس کے برعکس ہوتی ہے عشق کی تشنہ کامیاں اکثراوقات مخصوص سماجی حالات کی پیدا کردہ ہوتی ہیں اب جو لوگ حزن و حسرت کے اس عالم میں اپنے عشق کی ناکامی کا جواز سماجی حالات میں تلاش نہیں کرتے وہ لوگ یا تو اپنے گریباں چاک کرکے دشت و صحرا کی خاک چھاننے لگتے ہیں (جیسا کہ قدیم اردو شاعری میں رواج تھا) یا اب موجودہ دور میں اظہار جنون کے معاملے میں اگر فرزانگی بھی دکھائی جاتی ہے تو عجب انداز سے یعنی اس طرح گویا دیوانے بھی ہیں اور فرزانے بھی جیسے جدید دور کا ایک فرانسیسی شاعر جب یہ کہتا ہے کہ میں شاعری خود اپنی ذات کے لئے کرتا ہوں۔ بغیر اس بات کی پروا کئے ہوئے کہ میرے علاوہ دنیا کا کوئی دوسرا فرد اسے کچھ سمجھ بھی سکتا ہے یا نہیں۔ تو بظاہر یہ بات ہرذی ہوش فرد کی نظر میں دیوانگی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے لیکن جب یہ شاعری سات سمندر پار کرکے ہماری زبان کے بعض نقادوں کے توسط سے ہم تک پہنچتی ہے تو یہ دیوانگی ایک پُراسرار فرزانگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جو شاعری صرف اپنی ذات کے لئے کی جاتی ہے وہ اگر شاعر کے "ذاتی غسل خانے" کی دیواروں تک ہی محدود ہے تو اس دعویٰ پر اعتراض کرنے کی چنداں گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن اگر اس ذاتی مقصد کے لئے کسی "پبلک غسلخانے" کا استعمال کیا جاتا ہے تو پھر یہ مسئلہ ذاتی ہرگز نہیں رہتا۔ سماجی' سیاسی اور ثقافتی نوعیت اختیار کرلیتا ہے اور یہ بات تو ایک معمولی ذہن کا انسان بھی باآسانی سمجھ سکتا ہے کہ جب قیامت کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو بات محبوب کی جوانی تک پہنچ ہی جاتی ہے۔ اب جو لوگ ادب کے سماجی مقصد یا اشعار کی سماجی تفہیم سے بدکتے ہیں اور اپنے تخلیقی گورکھ دھندے کو انسانی معاشرے میں رہتے ہوئے متنوع انسانی مسائل سے ماورا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں یا اپنے ذہنی عوارض کی بناء پر حیات و کائنات کے حقائق اور ان حقائق کے خدوخال دیکھنے' پرکھنے اور سمجھنے کی تاب و توانائی نہیں رکھتے۔

انیسوی صدی میں فرانسیسی شاعروں کا وہ گروہ جو ادب میں تحریک اشاریت پسندی(Symholist Movement) کا روح رواں کہلاتا ہے جب فن و ادب میں سائنسی حقیقت پسندی کی مخالفت پر کمربستہ ہوجاتا ہے تو زولا اور Heredis جیسے عظیم ترین فنکاروں کے ادبی نظریات اور فنی طریقہ کار کی نفی میں شمشیربدست ہوکر تہذیبی میدان میں کود پڑتا ہے تو کیا اس مخالفت کے ڈانڈے سیاست' ثقافت اور عمرانیات کے متنوع مسائل سے جاکر نہیں ملتے؟

اگر غور سے دیکھا جائے تو دراصل اشاریت پسندی کی یہ تحریک روز بروز فروغ پاتے ہوئے جمہوری نظریات اور خیالات کے خلاف شرفا یا اعلیٰ طبقے کا ایک ایسا ذہنی ردعمل تھا جو شاعری میں پہیلیاں بوجھنے کے طریقہ کار پر اس لئے زور دیتا تھا تاکہ فن و ادب چند حدود میں قیود میں گھرا رہے اور یہ عوام کی میراث نہ بن سکے یہی وجہ تھی کہ اس تحریک کے تقریباً سب ہی شاعر عوام الناس کے لفظ سے چڑتے تھے۔ اسی طرح جیسے فلابیر کو لفظ پبلک سے چڑ تھی۔

ملارمے اپنے عہد کی جمہوری اقدار اور اس عہد کے جمہوری کردار میں اپنی جذباتی اور ذہنی زندگی کی موت تصور کرتا تھا ان حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب حمایت علی شاعر اور فن کا تجزیہ کیجئے حمایت علی اشاریت پسندوں یا اردو زبان کے دیگر داخلیت پسند شعراء کی طرح اپنے فن اور فنی تخلیقات کو چند حدود قیود میں گھیر کر دانشوروں کے ایک مخصوص و محدود طبقے کے لئے ذہنی غذا مہیا نہیں کرتا۔ وہ واضح طور پر اپنے فن کا رشتہ عوام الناس سے جوڑنے کی سعی کرتا ہے اور ہمعصر جمہوری اقدار اور نظریات سے اس کی یہ ذہنی اور فنی مطابقت شعوری بنیادوں پر ادھارت ہے۔

آج کل جو لوگ مریض قسم کی داخلیت پسندی کا شکار ہیں اور میر کے تتبع میں اس قسم کی غزلیں لکھتے ہیں جن میں اپنی انفرادی زندگی کی بوالعجبیاں شکست و دریخت اور رنج والم کی بھرمار ہوتی ہے۔ اس نوع کی شاعری سے ان تمام لوگوں کیا سروکار ہو سکتا ہے جو اذیت پسندی یا اذیت کوشی میں انسانی مسرت اور صحت کی تلاش کو دیوانگی سے تعبیر کرتے ہیں۔

اذیت خواہ ذہنی ہو یا جسمانی کسی نہج سے بھی مستحسن قرار نہیں دی جاسکتی۔ جس طرح ہر انسانی معاشرے میں مریض افراد کی نسبت صحت مند لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ملک میں ایسے لوگ تعداد میں زیادہ ملتے ہیں جو زندگی سے حسن اور مسرت و راحت سے پیار کرتے ہیں اور زندگی کے متنوع آلام اور اس کی بوالعجبیوں سے نفرت کرنا چاہتے ہیں۔ مسرت کی تلاش اصل انسانی فطرت کا ایک اہم تقاضہ ہے۔

اب جو فنکار انسانی فطرت کے اس اہم تقاضے سے اپنے فن کو ہم آہنگ کرنے کی سعی نہیں کرتے وہ فنکار اپنے فن سمیت چند دنوں ہی کے بعد طاق نسیاں کی تاریکیوں میں گم ہوجاتے ہیں۔ ایک فنکار کو اس سے بڑھ کر دنیا میں دوسری کوئی سزا نہیں مل سکتی جو فنکار انسانوں کی اکثریت کو اور انسانی فطرت کو Discard کرتے ہیں انسانوں کی فطرت اور اکثریت ان تمام فن کاروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے Discard کردیتی ہے۔ دنیا کی ادب کی تاریخ میں بالخصوص جدید ادب کی تاریخ متعدد المیئے ملتے ہیں کہ ایک فنکار اپنی قبر میں اپنے فن کو بھی ساتھ لے گیا ہے مثال کے لئے ملارمے کی شاعری، فن نظریہ شاعری اور طریق کار کو ہی لیجئے۔ ۱۸۹۸ء میں ملارمے کی موت کے ساتھ اس کا فن اور نظریہ شاعری بھی مرجاتا ہے ایسا اس لئے ہوتا ہے کیونکہ اس نے انسان کی فطرت اور اکثریت کو اپنی زندگی میں Discard کیا تھا اور زندگی اور ذہن کی بوالعجبیوں سے پیار کیا تھا اس کے برعکس ایسٹاؤوسکی اور شیکسپیئر کے ڈرامے وغیرہ اگرچہ سینکڑوں برس پہلے کے تخلیقی کارنامے ہیں لیکن وہ آج بھی سینکڑوں اور ہزاروں برس گزرجانے کے باوجود ہمارے لئے دلچسپی کا باعث بنے ہوئے ہیں وجہ یہ ہے کہ ان فنی شہپاروں کو تخلیق کرنے والوں نے انسان کی فطرت اور اکثریت کو کسی مقام پر بھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔

حمایت علی شاعر اپنے ذہنی اور فنی رشتے سے اس دوسرے گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہو کر انسانوں کی اکثریت کے لئے ان کی مسرت و صحت کے لئے ان کے ذہنی اور مادی مرفہ حالی کے لئے ہمعصر معاشرے کے سنگلاخ کوہستانوں میں جوئے شیر کھودنا چاہتا ہے فن و ادب کا شہستہ اس کے ہاتھوں میں ہے اور وہ زندگی کی تمام ترکثافت گندگی اور شمگینی کو مٹا کر رود کوثر میں دھلی ہوئی زندگی دیکھنے کا متمنی ہے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار وہ ایک جگہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

کیسی دنیا ہے آدمی کو قبول
جس میں انسان میں بدتر از حشرات

یہ ہے کیسا نظام زیست کہ جو
چوس لیتا ہے آپ خون حیات
اپنا گھر

فکر و احساس کی یہ اجتماعیت پسندی ہی دراصل حمایت علی شاعری کے بنیادی خدوخال کا تعین کرتی ہے فکر و احساس کی اس اجتماعیت پسندی ہی میں شاعر کی ذہنی صحت مندی عظمت اور جذبہ انسانیت کے اسرار و رموز مضمر ہیں یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے وہ اپنی بوالعجب زندگی کے دکھڑے رونے والے تمام فنکاروں سے جدا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ خود لکھتا ہے۔
"یہاں کوئی مخصوص ہستی نزدیک رگ جاں یقیناً" نہیں ہے۔ لیکن ہر انسان کا دل دوسرے انسان کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہے۔ دھڑکنوں کی ہم آہنگی کے اس احساس نے میری فکر کو ایک نیا زاویہ عطا کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ انسان فرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اجتماع بھی ہے اور انسان کے ارتقاء کی 'کی انتہائی منزل اپنی ذات میں ضم ہونا نہیں، ایک "اجتماعی انسان" ہو جاتا ہے۔"

زندگی اور شاعری کے بارے میں حمایت علی کا یہ نظریہ ان کی ایک کامیاب کوشش "بنگال سے کوریا تک" نظم میں متشکل نظر آتا ہے۔ خود شاعر کے الفاظ میں "یہ طویل نظم جسے منظوم کہانی بھی کہا جا سکتا ہے۔ آپ بیتی نہیں لیکن آپ بیتی ہو سکتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار میں بھی ہو سکتا ہوں اور آپ بھی۔"
تکنیک کے اعتبار سے بلا شبہ یہ نظم ایک تجربے کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس نظم میں محض تکنیک کا تجربہ اس قدر اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ شاعر کا لب و لہجہ اور مشاہدات کا تدھلی ہیولا ایک قاری کے لئے باعث دلچسپی بن جاتی ہے۔ داخلیت اور انفرادیت کی پر پیچ راہوں سے گزرنے کے باوجود شاعر فکر و احساس کی اجتماعیت پسندی کے راستے سے ایک لمحے کے لئے جدا نہیں ہوتا۔ ہر منزل پر فنکار کا انفرادی غم ایک اجتماعی غم کا احساس دلاتا ہے۔ نظم کے آغاز میں ہی شاعر کے اس انداز فکر اور طریق احساس کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

آئینہ خانہ ، تصور میں
اک اک نقش ابھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھر تھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے
وہ میرا گاؤں' میرا اپنا وطن
میری جنت' میرا جہنم زار

چند اونچی حویلیوں کے گرد
زندہ لاشوں کی تربتوں کا دیار
سبز شاداب کھیتوں کے بیچ
بھوکی ننگی حیات کا بازار
ارتقائے جہاں کی پستی
ہر فریب حسیں کا آئینہ دار

حسن فطرت کا سادہ لوح میں
زر گزیدہ سماج کا ' شہکار

اور جب اس کہانی کا بنیادی کردار میدان جنگ سے اپنے وطن بنگال واپس آتا ہے تو وہاں قحط کی تباہ کاریاں دیکھ کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ میرا گاؤں جنگ سے دور رہ کر بھی آخر کیوں تباہ ہوگیا ہے۔ واپسی کے بعد اپنے گاؤں کو دیکھ کر وہ اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کرتا ہے۔

یہ میرا گاؤں۔ میری خلد زمیں — کوچے کوچے میں وحشتیں رقصاں
قبر کی طرح چپ، اداس اداس — ذرے ذرے پہ ثبت خوف و ہراس
زندگی جیسے عرصۂ سکرات — دل کو چپ چاپ کھائے جاتا ہے
کوئی آہنگ دور دور نہ پاس — دم بہ دم قرب مرگ کا احساس

اگر بات اس منزل پر ہی اگر ختم ہوجاتی تو شاعر کا نظریہ زندگی اور نظریہ شاعری خام کہلاتا کیونکہ اس صورت میں شاعری کا فن میکانکی حقیقت نگاری سے آگے نہ بڑھ پاتا لیکن شاعر میکانکی حقیقت نگاری سے آگے بڑھ کر بیان کردہ سماجی حقائق کی ان مادی بنیادوں کی جانب بھی ہلکے ہلکے اشارے کرتا ہے۔ جن کا تذکرہ نظم میں ازبس ضروری تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

زندگی کے ہر ایک گوشے میں — ہر تجوری میں قبر کی مانند
ایک ایک چیز کی کاروباری تھی — موت کے جوئے فیض جاری تھی
کھیت کے کھیت تھے گھروں میں دفن — دیوتا کعبہ کوئی دوکاں ہو
اور بھوکی خدائی ساری تھی — ہر طرف زر کی شہریاری تھی

جنگ تو ختم ہوچکی تھی مگر
جنگ، ایک ایک گھر میں جاری تھی

شاعر کا یہ انداز فکر جس کے سوتے ایک عظیم نظریہ زندگی سے پھوٹتے ہیں لگ بھگ ان کی ہر نظم میں صاف جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اپنی ایک نظم لاشوں کی بستی میں وہ زندگی کا مشاہدہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

زندگانی اک مسلسل موت ہوکر رہ گئی — موت سے کس کو مفر ہے موت کا ماتم نہیں
اس قدر خاموش ہیں سب جیسے کوئی غم نہیں — غم تو یہ ہے اس زمیں پر زندگی کا غم نہیں

ایک دکاں میں سمٹ کر رہ گئی ہے کائنات
جز تجارت قدر کوئی زیست کی محکم نہیں

یہاں وہ ہم عصر زندگی اور انسانی معاشرہ کی زبوں حالی کا تجزیہ ایک ایسے مفکر اور ماہر عمرانیات کی طرح کرتے ہیں جس کی قوت احساس میں اس کی فکر اور تجزیاتی قوتوں ہی کی طرح گہرائی اور گیرائی موجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حمایت علی جب اپنے نظریہ زندگی کو اشعار کی صورت میں ڈھالتے ہیں تو ان کے فکری زاویے کسی ادق فلسفے کے خشک اور بے جان مرقعے نظر نہیں آتے بلکہ ان کا پورا نظام فکر ایک ایسے ٹھوس مادے کی طرح محسوس ہوتا ہے جو جذبات و محسوسات کی آنچ سے پگھل پگھل کر قوس قزحی سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ حمایت علی شاعر میں جو ملائمیت ہلکا ہلکا سوز گداز، میٹھا میٹھا درد اور دلگداز چیزیں نظر آتی ہے یہ دراصل اسی شدت احساس کا پرتو ہے۔

(مطبوعہ۔ "نئی قدریں" (حیدر آباد) فکر جدید نمبر ۱۹۶۶ء)

من موہنا شاعر

پروفیسر آفاق صدیقی

حمایت علی شاعر کو میں پچھلے اکتالیس برسوں سے جانتا ہوں۔ ۱۹۴۷ء میں کچھ دن کراچی کی سیر کر کے میں نے سکھر کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ دو ڈھائی سال کی تگ و دو کے بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق اور پیر حسام الدین راشدی کی سرپرستی میں ہم نے انجمن فروغ ادب کے زیر اہتمام کل پاکستان اردو سندھی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ پھر ۱۹۵۳ء میں سندھ ادبی کانفرنس منعقد کی جس کے مندوبین میں حمایت کا نام بھی شامل تھا۔ اس کانفرنس کے بعد سکھر میں جتنے بھی ادبی اجتماعات اور مشاعرے ہوئے' نہ صرف ان میں ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں' بلکہ سندھ اور بیرون سندھ کی ادبی تقریبات میں اکثر و بیشتر باہمی میل ملاپ کی مسرتیں میسر ہوئیں۔

حمایت کی شخصیت سازی میں صحافت' ادب' ادارت' تدریس' ریڈیو' ٹیلی ویژن اور فلم کا جو حصہ رہا ہے' فی الوقت اس پر سیر حاصل گفتگو ممکن نہیں۔ انہوں نے شاعری اور نثر نگاری کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ اکثر چو مکھی بھی لڑی ہے اور جیسا کہ ان کی نثری تصنیف ''شخص اور عکس'' سے ظاہر ہوتا ہے' انہوں نے قلمی معرکہ آرائی میں کہیں بھی ادبیت کی شستگی اور شائستگی کو مجروح نہیں ہونے دیا۔

جہاں تک حمایت کی شاعری کا سوال ہے تو یہ عرض کرتا چلوں کہ سب سے پہلے ان کی اثر آفریں نظمیں اور غزلیں میں نے ان دنوں سنی اور پڑھی تھیں جب ان کا پہلا مجموعہ کلام ''گھن گرج'' کے نام سے زیر اشاعت تھا۔ اس شعری تصنیف کا حوالہ یونس احمر نے اپنے ایک انگریزی مضمون "The Muslim Daily" (مطبوعہ 21-1-1981) میں دیا ہے۔ مجھے تو ۱۹۵۶ء کی ان کی وہ کتاب ملی جس کا نام ''آگ میں پھول'' ہے۔

''آگ میں پھول'' کی سب سے طویل نظم ''بنگال سے کوریا تک'' اتنی دلکش نظم ہے کہ اسے مشاعروں اور نجی محفلوں میں بار بار سنا گیا۔ سجاد ظہیر نے اس خوبصورت نظم کے بارے میں لکھا تھا ''ایک وسیع کینوس میں انسانیت کی اس ابدی آرزو کی تصویر جسے امن کہتے ہیں'' ''آگ میں پھول'' کا پہلا ایڈیشن مذکورہ نظم کے علاوہ شعلہ بے دود' غم رائیگاں' آخر شب' اجنبی مہمان' منظر و پس منظر' مہاجر بستیاں' عظمت آدم اور غم حاصل جیسی نظموں پر مشتمل تھا۔ ان نظموں سے جو تاثر میں نے قبول کیا وہ حمایت کے تاریخی شعور' عصری حیثیت اور فکری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ فنی بالیدگی کا قائل ہونا تھا۔ نظموں کے مقابلے میں غزلیں بہت ہی کم تھیں۔ ایک غزل جو نسبتاً زیادہ پسند کی جاتی تھی۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو
پھر ہیں برق کی نظریں سوئے آشیاں یارو
پھول ہیں کہ لاشیں ہیں باغ ہے کہ مقتل ہے
شاخ شاخ ہوتا ہے دار کا گماں یارو

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میر کارواں یارو میر کارواں یارو

"مٹی کا قرض" حمایت علی شاعر کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو "آگ میں پھول" کے بعد منظر عام پر آیا۔ اس شعری مجموعے کے دو صفحات نثری "میزان" کے آئینہ دار ہیں اور یہ فکر انگیز نثر بھی شاعر ہی کے ذہن کی تخلیق ہے۔ پھر "گفتنی و ناگفتنی" کے زیر عنوان ۷۱اور ۷۰ اشعار کی دو تمہیدیں ہیں جن میں پہلی تمہید کا آخری شعر کچھ یوں ہے۔

میں اپنے آپ سے مصروف جنگ ہوں شاعر
لہولہان ہے دل دشت کربلا کی طرح

"کربلا" کا استعارہ ہماری شاعری میں خیر و شر کی معرکہ آرائیوں کا مظہر ہے اور اس استعارے کو بہت سے شاعروں نے اپنے طور پر برتا ہے، لیکن حمایت علی شاعر کا یہ شعر ایک ایسی جنگ مسلسل کو ظاہر کرتا ہے جو خود شاعر کے اپنے ذہن میں شدت سے جاری ہے۔ اس فکری و حیاتی جنگ کے کئی محاذ ہیں۔ کس محاذ کے نصیب میں فتح ہے اور کس کے مقدر میں شکست، اس کا تجزیہ مصروف جنگ رہنے والے کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں۔

"میں نہیں جانتا کہ روح اور بدن کی اس جنگ میں میرا کیا حشر ہوگا میں پرچھائیوں میں بٹے آدمی کے ملبے تلے دب کر رہ جاؤں گا یا اس شاعر کو بچالاؤں گا جو مر کر بھی زندہ رہنا چاہتا ہے، جو فنا میں بھی ثبات کے خواب دیکھتا ہے اور ظہور کے نت نئے پیرائے تلاش کرتا ہے۔"

کہتے ہیں کہ شاعر جب دوسروں سے جنگ کرتا ہے تو خطابت پیدا ہوتی ہے اور جب خود سے جنگ کرتا ہے تو شاعری جنم لیتی ہے۔ دوسروں سے جنگ کرنا جتنا آسان ہے اتنا ہی اپنے آپ سے کھل کر جنگ کرنا مشکل بہت مشکل ہے۔ اس مشکل پر شاعر نے کس حد تک قابو پایا۔ اس کا اندازہ کچھ تو "آگ میں پھول" سے لگایا جاچکا ہے۔ اور اب یہ مٹی کے قرض کی شاعری جسے شاعر اپنی روح کا استعارہ کہتا ہے۔ روح، جس کے بغیر مٹی، پانی، آگ اور ہوا سب کی معنویت ختم ہوجاتی ہے۔ روح، جو ہمیں زندہ رکھتی ہے۔ ہماری زندگی کو کبھی آگ میں پھول کھلانے کا حوصلہ دیتی ہے اور کبھی مٹی کا قرض ادا کرنے پر اکساتی ہے۔ جس کے لئے شاعر نے کہا ہے۔

میں ہوں اپنی روح پر لادے ہوئے مٹی کا قرض
کوئی شاعر کہہ رہا ہے، کوئی پیغمبر مجھے

شاعر کہلانے کا حق تو بہر طور اسے رہا ہے اور رہے گا۔ ہاں پیغمبر والی بات ذرا ٹیڑھی ہے، لیکن شاید ان معنوں میں سیدھی ہو کہ بقول کسے "شاعری جزویست از پیغمبری۔" یہی نہیں بلکہ، شاعری کے بارے میں اب تو یہ کہا جارہا ہے کہ اسے پورے عالم انسانیت کا مذہب سمجھا جائے۔

خود احتسابی، خود اعتمادی اور خود شناسی کے حوالے سے حمایت علی شاعر نے حیات و کائنات کو تاریخی شعور کی روشنی میں سمجھنے کے لئے اپنی شاعری کا محور بنایا ہے۔ بقول اس کے۔

"وقت کی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہے۔ میرا ہر عمل اس کی نگاہ کی زد میں ہے۔ میں جو کچھ بھی دیکھتا ہوں، جو کچھ سوچتا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں، لمحوں میں تقسیم ہو کر وقت کی اکائی میں سمٹ جاتا ہے۔ مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اس اکائی سے اپنے کسی عمل کو الگ کرسکوں۔ میں گزرتے لمحوں کو روک سکتا ہوں اور نہ آنے والے لمحوں کے احتساب سے بچ سکتا ہوں۔ میں چاہوں یا نہ چاہوں، میری فردِ عمل مرتب ہو رہی ہے اور میرے دل میں یہ دھڑکا بیدار ہے کہ تاریخ کا فیصلہ میرے حق میں کیا ہوگا۔"

چلیے یہ فیصلہ تاریخ ہی پر چھوڑ دیجیے اور "گفتنی و ناگفتنی" کے یہ چند اشعار ذرا غور سے پڑھ ڈالیے۔

کھلی کتاب کی مانند کائنات تمام
نظر ہے خلوتیِ گوشۂ حرا کی طرح
کھلا کہ لا ہی حقیقت ہے لا ہی افسانہ
عدم وجود میں پوشیدہ ہے خدا کی طرح
بس اک تسلسلِ جذب و گریز جاری ہے
ہر انتہا نظر آتی ہے ابتدا کی طرح

اور پھر یوں بھی کہ:

میری مٹی نے دیا تھا مجھ کو میرا رنگ روپ
ڈھالتی جاتی ہے دنیا اپنی صورت پر مجھے

ان اشعار کی معنویت فکر و شعور کے اعتبار سے شاعر کو شاعری رکھتی ہے یا پیغمبری کی بشارت بھی دیتی ہے۔ اس سوال کا جواب رواروی میں نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ شاعری میراثِ پیغمبراں کی حق دار ہے۔

آیئے اب آگے بڑھ کر ذرا ان اشعار سے لطف اندوز ہوتے چلیں جو شنہری مجموعے "مٹی کا قرض" کی ۴۸ غزلوں میں یہ قرض ادا کرنے کی سبیل پیدا کرتے ہیں۔

دستک ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو
طوفاں کی آرہی ہے صدا غور سے سنو
محسوس کر رہا ہوں میں کربِ شکستگی
تم بھی شگفتِ گل کی صدا غور سے سنو

اب میں بھی جل کے راکھ ہوں میرے جہاز بھی
کل میرا نام طارق ابن زیاد تھا

تم اس کو جبرِ وقت کہو یا ہوا کا رخ
اک نسبت قفس بھی رہی آشیاں کے ساتھ

وہ دھوپ چاندنی تھی وہ پتھر بھی پھول تھے
کیا جانے سحر کیا مری خاک وطن میں تھا

منزل کے خواب دیکھتے ہیں پاؤں کاٹ کے
کیا سادہ دل یہ لوگ ہیں گھر کے نہ گھاٹ کے

اب اپنے آنسوؤں میں ہیں ڈوبے ہوئے تمام
آئے تھے اپنے خون کا دریا جو پاٹ کے

ہر شخص اپنی فرد عمل کو سمیٹ کر
آئینہ دیکھتا ہے بڑے اضطراب سے

دیکھا تو آج اپنے مکینوں کی یاد میں
روتی ہوئی خموشی دیوار و در ملی
اک عمر کی مسافت بے نام کے عوض
گر کوئی شے ملی بھی تو گرد سفر ملی

اب کیوں نہ شاخ دار پہ آئے سروں کی فصل
شہروں کا خوں پیا ہے تو جنگل ہرے ہوئے

گھر کی دیواروں نے ڈالی ہے بنائے قید و بند
اب تو زنداں بھی نظر آتا ہے اپنا گھر مجھے

روٹی کے لئے طاق پہ رکھ دوں گا کتابیں
جینا مجھے اس طرح گوارا تو نہیں تھا
کیوں آئینہ دیکھا تو ندامت ہوئی مجھ کو
میں رزم گہ زیست میں ہارا تو نہیں تھا

دشت غربت میں ہوں آوارہ مثال گرد باد
کوئی منزل ہے نہ کوئی نقش پا رکھتا ہوں میں
میرا سایہ بھی نہیں میرا' اجالے کے بغیر
اور اجالے کا تصور خواب سا رکھتا ہوں میں

ہر پھول اک شرر ہے تو ہر شاخ اک برق
جنت کا خواب' دوزخ گلزار دے گیا

مختلف غزلوں کے یہ اشعار ان حیاتی تجربوں کے آئینہ دار ہیں جن سے دوچار ہوتے ہوئے شاعر نے اپنے لہجے میں جدید غزل کا بانکپن اجاگر کیا ہے۔ یہ جدیدیت اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے مبہم تجریدیت کا شکار نہیں۔ اس کی علامتیں واضح اشاریت اور ایمائیت کو اپنی گرفت میں رکھتی ہیں۔ ان اشعار میں شخصی اور ذاتی کرب ناکی کا اظہار بھی ہے اور اپنے گرد و پیش رونما ہونے والے واقعات و سانحات کا رد عمل بھی۔ ان میں تنقید حیات کا تیکھا پن بھی ہے اور تفسیر حیات کی شعوری رو بھی۔ ہمارے معاشی و معاشرتی مسائل کا ادراک و احساس بھی ہے اور ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے فکر و فن کا پاس بھی' لیکن روٹی کے لئے طاق پہ کتابیں رکھ دینے کے باوجود یہ زندگی کا رجائی پہلو اور روشن افق اسے رزم گہ زیست میں ہارنے نہیں دیتا' خصوصاً" ایسی گھٹن اور حق تلفیوں کے ماحول میں جہاں قدم قدم پر یاس و حرماں کی جراحتیں ہیں۔ جہاں ہر چیز جنس تجارت بن گئی ہے اور یہ تجارت بھی کھلی لوٹ کھسوٹ' چور بازاری اور کالے دھندوں پر مشتمل ہے۔

حمایت کی شاعری میں ایک صنف سخن "ثلاثی" کے نام سے موسوم ہے جس کے لئے ان کا کہنا ہے۔

یہ طرز خاص ہے ایجاد میری

علامہ نیازی فتح پوری نے اس بارے میں کہا تھا۔

"آپ کا یہ صنفی تجربہ مجھے پسند آیا۔ میرے خیال میں اس کا نام "ثلاثی" ہی بہتر ہے۔ یہ صنف اس ہیت کے ساتھ اردو میں پہلی بار آئی ہے اس لئے آپ ہی سے منسوب ہوگی۔ قدرے ہیئتی فرق کے ساتھ یہ نام فارسی میں بھی کہیں استعمال ہوا

ہے۔ فی الحال یاد نہیں آرہا۔ آپ شعرا العجم دیکھ لیں۔"

جناب اثر لکھنوی نے نیاز صاحب کی تائید کرتے ہوئے فرمایا۔ "ثلاثی کے بارے میں' میں بھی نیاز صاحب کا ہم خیال ہوں۔"

ان دو اکابرین ادب کی ہم خیالی سے قطع نظر "ثلاثی" کے معاملے میں خاصی نوک جھونک بھی ہوتی رہی۔ آپ چاہیں تو حمایت کی کتاب "شخص و عکس" میں اس کی جھلکیاں دیکھ لیں۔ حمایت کا کہنا ہے کہ "ثلاثی کہنے کا خیال میرے ذہن میں "رباعی" سے پیدا ہوا۔ یقیناً" یہ جو بات انہوں نے "ثلاثی" پر طبع آزمائی کے سلسلے میں کہی ہے ایسا ہی ہوا ہوگا۔ حمایت نے ہر ثلاثی کسی نہ کسی عنوان پر کہی ہے' مثلاً الہام' علم' زاویہ نگاہ' ارتقاء' ذوق تعمیر وغیرہ۔ مجموعی تعداد جو دوسرے مجموعہ کلام یعنی "مٹی کا قرض" میں ہے وہ ۳۴ ثلاثیوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً" پہلی ثلاثی "الہام" کے زیر عنوان کچھ اس طرح ہے۔

کوئی تازہ شعر اے رب جلیل
ذہن کے غار حرا میں کب سے ہے
فکر محو انتظار جبرئیل

ایک اور ثلاثی جو بہت پسند کی گئی "زاویہ نگاہ" پر ہے۔

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

"مٹی کا قرض" میں ملفی اور آزاد نظمیں بھی ہیں۔ ان نظموں کی ہیئت ان کے موضوعات اور ان کی فکری و حسیاتی جہتوں میں جو رعنائی خیال ہے' اسے محسوس کرتے ہوئے حمایت ہی کی یہ بات مجھے یاد آرہی ہے کہ۔

"شاعری حسن تخیل کا وہ طلسم ہے جو اکثر اپنے عہد کے تنقیدی شعور کو بھی کچھ دیر کے لئے مسحور کر دیتا ہے اور حواس کی بیداری کے باوجود روح میں در آتا ہے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے تبصرے میں اس طلسم کو "لہو میں پھول اگانے کے مترادف" کہا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں کچھ نئی نظموں اور نئی غزلوں کے ساتھ "آگ میں پھول" کا دوسرا اڈیشن منظر عام پر آیا۔ اس اڈیشن میں بقول شاعر۔

وہ کلام بھی شامل کر دیا گیا جو "چاند کی دھوپ" کے نام سے مرتب کیا جانے والا تھا۔ البتہ ضخامت سے بچنے کے لئے دو طویل نظمیں "مشعلے سے دود" اور "بنگال سے کوریا تک" کو اپنی تیسری کتاب "تشنگی کا سفر" میں شامل کر دیا ہے۔

دوسرے اڈیشن میں "حرف دل" اور حرف لب" کے زیر عنوان ۵۷ نظمیں ہیں۔ پھر "حرف جاں" والے حصے میں ۲۵ غزلیں۔ ان نظموں اور غزلوں پر ایک نثری تبصرے میں دس بارہ سال پہلے میں نے یہ کہا تھا کہ حمایت نے بہت کچھ لکھا ہے اور اچھا لکھا ہے۔ اس اچھی لکھت میں "آدمی کی کہانی" بھی ہے اور حیات و کائنات کی روانی بھی۔ مقامی رنگ آمیزی بھی ہے اور وسیع تناظر میں زمانی و مکانی فکر انگیزی بھی۔ حسن و جمال کی رنگینی بھی ہے اور احساسات و جذبات کی دروں بینی بھی۔ اپنے بچوں کی معرفت نئی نسل کے نام منسوب کی ہے۔

مرے لہو کے چراغو' مرے جگر پارو — میں اپنے ماضی مرحوم کی امانت تھا
سنو یہ میری نصیحت بھی ہے وصیت بھی — سو آج تم سے ہے منسوب یہ امانت بھی
میں آج تم میں ہوں موجود کل نہیں ہوں گا — مجھے جو غم ہے تو اتنا کہ اپنے ہی گھر میں
مگر جو تم ہو' تو میں ہوں سدا سلامت بھی — تمہارا ورثہ ہے' میرا عذابِ ہجرت بھی

یہ ہے اس نظم کا پہلا بند اور ایسے ہی پانچ پانچ ہم قافیہ اشعار کے اکیس بند حیات آمیزی اور حیات آموزی کے فلسفیانہ افکار کو تاریخی شعور' سیاسی بصیرت' قومی و ملی تشخص' جذبہ حب الوطنی اور اتحاد و یگانگت کے آئینوں میں اجاگر کرتے ہیں۔ مثلاً" نظم کے آخری دو بندوں میں کس دل سوزی سے درس محبت دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

جو اشک کہیں ہے تو زخم زخم کہیں — حقیقتیں تو ہزاروں ہیں تشنہ اظہار
وطن کے قرض کی صورت مرے ادب پر ہے — مگر وہ ایک حقیقت جو میرے لب پر ہے

۱۹۸۵ء میں حمایت کا ایک اور نیا مجموعہ کلام "ہارون کی آواز" کے نام سے نظر نواز ہوا۔ اس کتاب کی پہلی دو نظمیں محسن انسانیت' سید البشر' سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا خوانی سے عبارت ہیں۔ مگر ان نظموں کا رنگ و آہنگ نعتیہ شاعری کی عوائد رسمیہ اور مروجہ روایات سے کچھ الگ تھلگ ہے۔ مثلاً" پہلی نظم کے چند ابتدائی اشعار پیش کرتا ہوں۔

میں جس کا مدح خواں ہوں وہ انساں بھی ہے عظیم — اس نے کہا کہ برتر و افضل ہے آدمی
اور اس کا اس جہان پہ احساں بھی ہے عظیم — ہر شے ہے نا تمام مکمل ہے آدمی

ہر آدمی کے دل میں خدا کا وجود ہے
یہ آدمی ہے جس کے لئے ہست و بود ہے

"ہارون کی آواز" میں نئی غزلیں اور تازہ نظمیں شامل اشاعت ہیں۔ ان نظموں میں ایک طویل نظم "حرف حرف روشنی"

وہ لوگ جن کی محبت کی تم نشانی ہو — وہ دور جس کے تسلسل کی اک کڑی ہو تم
وہ راستے جو تمہیں اپنے عہد تک لائے — تمہارے سامنے ہے آج ہاتھ پھیلائے

یہ ہاتھ چھوڑ نہ دینا اگر زمیں ہے عزیز
کہ ان سے بڑھ کے نہیں کوئی اعتبار کا ہاتھ

حمایت کی شاعری پر مولوی عبدالحق' علامہ نیاز فتح پوری' ڈاکٹر سید عبداللہ' اثر لکھنوی' احتشام حسین' عابد علی عابد' سجاد ظہیر' خواجہ غلام السیدین' مخدوم محی الدین' ڈاکٹر اختر حسین' فیض احمد فیض' سبط حسن' ممتاز حسین' احمد ندیم قاسمی' ڈاکٹر وزیر آغا' یونس احمر اور عصر حاضر کے کئی دوسرے اہل قلم نے جو تبصرے کئے ہیں ان سے یہی تاثر ملتا ہے کہ پچھلے پچاس برسوں کی ذہنی تربیت اور عملی زندگی کے نشیب و فراز نے شاعرانہ طرز اظہار کو تحمل و تجسس کے ساتھ خوب سے خوب تر کی لگن میں رکھا ہے۔

حمایت نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے ادبی حلقوں کو متاثر کیا' بلکہ بیرونی ملکوں میں جہاں جہاں اردو شعر و ادب کے شائقین موجود ہیں' وہاں کی ادبی تقریبات میں بھی اپنی شاعری کا جادو جگایا ہے۔ کئی شاہ کار نظموں کا منظوم ترجمہ انگریزی' ہندی اور کچھ دوسری زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اعزازات بھی پائے ہیں اور انعام و اکرام بھی۔ یقیناً" تاریخ کا فیصلہ میرے من موہنے شاعر کے حق میں اچھا ہی ہو گا۔

(مطبوعہ ماہنامہ طلوع افکار' کراچی "گوشہ حمایت علی شاعر" جولائی ۱۹۹۵ء)

حمایت علی شاعر

سحر انصاری

حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام ؏

یہ تھا اس ادبی تقریب کا بنیادی موضوع جو ایئرپورٹ ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی بزم ادب نے ۲۳ نومبر ۱۹۷۲ء کو اپنے دفاتر کے سبزہ زار پر منعقد کی تھی۔ عروس البلاد کراچی کا سارا نکھار اور حسن اس کے تنوع اور طرح نو کا رہین منت ہے۔ اب اسی ادارے کو لے لیجیے۔ کراچی کے سوا شاید ہی کوئی بزم ادب ایسی ہو جسے ایئرپورٹ کے ساتھ ساتھ ادب کے ڈیولپمنٹ سے بھی گہری دلچسپی ہو۔ یہ شہر عجیب و غریب جہات کا حامل ہے۔ سمندر کی گود میں سانس لیتے ہوئے دخانی جہازوں اور سنگلاخ رن وے پر اپنی برق رفتاری کا نشان چھوڑ جانے والے طیاروں کے درمیان ایک پورا عہد' ایک پوری زندگی آباد ہے۔ بڑے صنعتی شہر کی ساری برکتیں اور نحوستیں اس شہر کے حصے میں آئی ہیں۔ فلک بوس عمارتوں میں پناہ گزیں بینک اور سود و سرمائے کے جال بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی درس گاہیں بھی ہیں' اجنبی موسیقی اور نامانوس رقص کو ایک غیر محسوس روایت کا حصہ بنانے والے نائٹ کلب بھی ہیں' اور عفونت زدہ بستیوں میں زندگی کی مشقت سہنے والی مخلوق بھی۔ گناہ و ثواب سے بے نیاز' بارونق بازار' جلتی بجھتی روشنیوں کے جلو میں اس "کل" کی آمد سے بے خبر اپنے کاروبار میں منہمک ہیں جس کی خواہش ناداروں اور مفلسوں نے اس توقع پر کی ہے کہ اس سے ایک حیات آفریں انقلاب عبارت ہوگا۔

حمایت علی شاعر کی شاعری کا بھرپور تعارف اسی شہر کی فضاؤں سے عبارت ہے۔ ان کا مولد اورنگ آباد ہے لیکن مسکن کراچی قرار پایا۔ جب وہ اورنگ آباد میں تھے تب بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ جب کراچی آگئے تو اس وقت بھی ان کی وابستگی اسی شعور سے رہی جس کی روشنی اب تک ان کی شاعری میں جادو جگا رہی تھی۔ لیکن فرق ضرور پیدا ہوا۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اورنگ آباد سے وابستہ شاعری کا مجموعہ کلام وہ "گھن گرج" کے نام سے ۱۹۵۰ء میں مرتب کر چکے تھے۔ جو طباعت و اشاعت کی منزل سے نہ گزر سکا اور جب کراچی سے ان کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تو اس کا نام "آگ میں پھول" تھا۔ حمایت علی شاعر کی شاعری کا تشکیلی دوران دو ناموں کے مابین مکمل ہوا ہے "گھن گرج" سے سفر کر کے جب وہ "آگ میں پھول" کی منزل تک آئے تو ان کی شاعری نعرے' غصے اور جذباتیت سے نکل کر سوز دروں' حسن سخن اور اثر آفریں شعور میں ڈھلنے لگی۔

مقامی اثرات و افتادات انسان کی ذہنی تعمیر پر کچھ کم اثر انداز نہیں ہوتے اور کبھی کبھی تو فن کے پردے میں ماحول کی عکاسی فی الاصل معاشرتی اور جغرافیائی حدود کی عکاسی بن جاتی ہے اور اپنی انفرادی عظمت دور افتادہ اور غیر متعلق علاقوں سے بھی منوا کر رہتی ہے۔ مقامی اثرات کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اپنی زبان اور اپنے وطن یا اپنے شہر کے اکابر کی عظمت کو وسیلہ فیضان بنایا جائے اور یوں سوچا جائے جیسے قانون وراثت کے بغیر ایک تہذیبی ورثے کی حفاظت کا کام آنے والی نسل کو سونپ

دیا گیا ہے۔ یہ ایک، بن لکھی اور بن کہی ذمہ داری ہوتی ہے جسے کوئی فرد خود ہی اپنے لئے قبول کرلیتا ہے۔

حمایت علی شاعر کو اس بات کا سنجیدگی سے احساس ہے کہ وہ ایک ایسے شہر سے وابستہ رہے جس کی فضا میں ولی، داؤد اور سراج ایسے شعرا کے نغموں کی اولین گونج سنائی دی تھی۔ خود ان کے عالم شعور میں مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اور اپنے رفقائے کار کے ذریعے اسے ایک علمی ادبی اور تہذیبی انفرادیت عطا کردی تھی۔ شاید اسی لئے وہ اس مخصوص روایت کو نئے ترقی پسند شعور سے ہم آہنگ کرکے ابتدا ہی سے اپنے فن میں برتتے رہے ہیں۔

روایت کو ہمارے یہاں اکثروبیشتر قدامت کے مترادف خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ کوئی روایت قدیم تو ہوسکتی ہے لیکن ہر قدیم شے روایت نہیں ہوتی۔ دراصل روایت تو ایک سلسلہ ہے، ایک کڑی ہے، ایک رشتہ ہے جو عہد بہ عہد نسل بہ نسل کبھی محسوس اور کبھی غیر محسوس طریقے سے منتقل ہوتا رہتا ہے۔ جب کسی عہد یا نسل کی غفلت سے یہ رشتہ روایت او جھل ہوجاتا ہے تو عموماً" اسے روایت کی شکست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ روایت کا عدم شعور، شکست روایت کیسے ہوسکتا ہے۔ اسی طرح جب کسی نئی روایت کا ذکر آتا ہے تو اسے زیادہ سے زیادہ روایت کی بازیافت کہنا چاہئے۔ کیونکہ انسان اور اس کے محسوسات، غم و آلام، اور نشاط و کیف کی ساری روایت بہت قدیم ہے۔ صرف اس کے پیرہن اور اظہار کے سانچے بدلتے رہتے ہیں۔ اسی کو ولی نے راہ مضمون تازہ سے تعبیر کیا ہے اور شاید اپنے بعد آنے والے تمام شعراء کے لئے شعر گوئی کا جواز پیدا کردیا ہے۔

راہ مضمون تازہ بند نہیں
تاقیامت کھلا ہے باب سخن

حمایت علی شاعر نے اپنے مجموعے "آگ میں پھول" کا آغاز ولی کے اس شعر سے کیا ہے۔ ان کے کلام میں اعتماد کی ایک لہر شاید اسی خیال کی دین ہے کہ سخن کسی کی میراث ہے اور نہ جاگیر۔ بڑے سے بڑے شاعر کی موجودگی کے باوصف ہر نئے شاعر اور ہر نئی آواز معاشرے کی ایک ضرورت ہے۔ اس کا اپنا ایک جداگانہ منصب ہوتا ہے جسے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ہی اس کے مرتبے کا بھی تعین کرتی ہے۔

حمایت علی شاعر اور مقامی اثرات کی بات کرتے ہوئے میں یہ نہیں بھولوں گا کہ مخدوم محی الدین اور ان کے ساتھیوں نے حیدر آباد کی فضا کو جس طرح انسانی شعور کے عالمی رشتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے بھی اس عہد کے دیگر نوجوان شعرا کی طرح حمایت علی شاعر کو بھی متاثر کیا۔ پھر انہوں نے زندگی کے ذاتی تجربوں کو اس شعور سے ہم رشتہ کرکے اپنا ایک الگ اسلوب سخن نکالا جسے جلد ہی قبولیت عام حاصل ہونے لگی۔ ان کی شاعری داخلی احساسات کی ترجمان اور قلبی واردات کی آئینہ دار ہے لیکن ان کے موضوعات کسی مادرائیت کے پابند نہیں۔ وہ مادی حقائق کو شعری پیرائے میں بیان کرنے کا ایسا سلیقہ رکھتے ہیں جس نے زندگی کے معاملات کو محض غم ذات بنانے کے بجائے ایک اجتماعی رنگ دے دیا ہے۔ یہ سلیقہ ان میں دو عناصر نے پیدا کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ فن کو لازمہ سخن سمجھتے ہیں دوسرے انہیں اپنے عہد کے محنت کش طبقے سے رشتہ جوڑنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ قصیدہ خوانی کے مضامین اخذ کرنے کے لئے امراء اور شاہی درباروں سے رشتہ جوڑنا پڑتا تھا اور زندگی کی برہنہ حقیقتوں کو سمجھنے اور انہیں تخلیقی سطح پر برتنے کے

لئے اس طبقے سے قریب ہونا پڑتا ہے۔ جسے ایک مدت تک کمتر طبقے سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔

"آگ میں پھول" کی اشاعت کے وقت شاعر کی عمر ۲۵ سال تھی۔ انہوں نے "میں اور میرا فن" کے زیر عنوان جو دیباچہ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عمر میں اور اس سے پہلے بھی جب ان کی نظمیں منظر عام پر پہلے پہل آئی تھیں، انہوں نے فن اور زندگی کے بارے میں کیا نظریہ اختیار کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں نے اپنا سر بلند رکھنے کی خاطر معمولی سے معمولی کام بھی کیا ہے اور اس آگ کو جو ہمیشہ میرے سینے میں دہکتی رہتی ہے، کبھی کسی عنوان بجھنے نہیں دیا۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہیں عرض کیا ہے کہ مجھے اپنے طبقے، اپنے کچی مٹی کے مکان اور اپنی اس معمولی سی زندگی پر ناز ہے جس کی وساطت سے مجھے سماج میں زندگی کے جدلیاتی عمل کو سمجھنے کا موقع ملا۔ مجھے وہ درد نصیب ہوا جو میرے شعور کی روشنی میں چمک کر شعلہ نہ بن سکا تو ایک انگار ضرور بن گیا۔"

جرات اظہار اور صداقت سے پیار کا یہی وہ پس منظر ہے جس نے انہیں انفرادی تجربات اور انسانی اقدار کی تفہیم کا ہنر سکھایا۔ ان کے کلام میں رسیدگی کا جو عنصر ابتدا میں انگارہ کی حیثیت رکھتا تھا وہ یقیناً "شعلے کا روپ اختیار کر رہا ہے۔

شاعر کے مجموعے کی اشاعت کو اب کوئی سولہ سال ہو چکے ہیں اس مدت میں معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں، اقدار کی شکست و ریخت، بالفاظ دیگر زندگی کا جدلیاتی عمل جاری رہا۔ شاعر نے وقتاً "فوقتاً" اپنے مخصوص اسلوب میں ان تغیرات کی عکاسی بھی کی ہے لیکن انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ یہ زیادتی کی ہے کہ اب تک دوسرا مجموعہ کلام شائع نہیں کرایا۔ رسائل اور منتخب ادب کے مجموعوں میں ان کا کلام یقیناً "دستیاب ہوتا رہا۔ لیکن کتاب کے مطالعے کی یک سوئی اور مجموعی تاثر منتشر رسائل کے مطالعے سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ امید ہے وہ اس طرف توجہ کریں گے۔

حمایت علی شاعر کی بعض نظمیں وقتی اور ہنگامی موضوعات پر تھیں۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب کوئی غیر معمولی واقعہ اس سماج میں رونما ہوتا ہے تو وہ کتنا ہی وقتی اور ہنگامی سہی شاعر کو بیدار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ "۸ جنوری" "انسان امر ہے" "مژدہ نو" پندرہ سولہ سال سے زائد مدت گزرنے کے بعد بھی اپنی تازگی اور تاثر برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات ہنگامی ضرور تھے لیکن تخلیقی اظہار ہنگامی نہیں تھا۔

شاعر جس زمانے میں کم شعر کہتے ہیں یا نہیں کہتے اس وقت ان کی ذہن کی کیا کیفیت رہتی ہے اس کا اندازہ گزشتہ برسوں کے دوران ہوا۔ اس تمام مدت میں ان کا زیادہ تر وقت تجزیہ ذات اور تجزیہ حالات میں گزارا اور ساتھ ہی یہ تلاش بھی رہی کہ تجربات حیات کو کس طرح لفظ اور منفرد پیرایہ شعر میں منتقل کیا جائے۔ اسی طرح کا ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب حمایت علی شاعر بمبئی میں مقیم تھے۔ شاعروں اور ادیبوں میں موضوعات اور ان کے فن کارانہ اظہار کے بارے میں بحثیں ہوتی تھیں۔ شاعر کی طویل نظم "بنگال سے کوریا تک" موضوع اور پیرائے اظہار کی اسی لگن کا نتیجہ ہے۔ یہ طویل منظوم کہانی ان کی تشکیلی دور کی اہم کڑی ہے۔ شاعر کی نیم رومانی اور نیم سماجی نظمیں "شعلہ بے دود" "غم حاصل" اور "آخر شب" کا لب و لہجہ خاصا مقبول رہا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی اس طویل نظم میں تکنیک اور ہیت کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ لہجے اور پیرایہ اظہار میں بھی تبدیلی کی۔ ایک زمانہ وہ تھا جب اس شہر میں غزل کے سوا کسی اور صنف سے وابستگی کا اظہار کرنا مشاعروں میں خطرہ مول لینے کے مترادف تھا لیکن شاعر کی اس طویل نظم کو نہ صرف پسند کیا جاتا تھا بلکہ غزل کے باوصف بار

بار فرمائش کر کے سنا بھی جاتا تھا۔ ایک زمانے میں اس نظم پر ادبی حلقوں اور ادبی رسالوں میں خاصی بحث بھی رہی۔ بعض مماثلتیں تلاش کر کے ساحر لدھیانوی کی طویل نظم "پرچھائیاں" سے اس کا تقابل کیا گیا۔ لیکن تاریخی شواہد، موضوعات، فنی و سترس و اسالیب کا فرق یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ ساری بحثیں معروضیت سے عاری تھیں اور بدگمانی اور بدنیتی پر مبنی تھیں ہے!۔

جنگ کے موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ جنگ اور امن پر بے شمار نظمیں اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ پھر شاعر کی نظم میں صرف جنگ ہی نہیں قحط بھی ایک اہم موضوع ہے۔ ساحر کی نظم میں رومانیت زیادہ غالب ہے جب کہ شاعر کے یہاں سماجی حقیقت نگاری کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ شاعر کی نظم کا کینوس مختلف ہے اور انسانی آدرشوں کی فتح اس کا سب سے نمایاں پیغام ہے۔ اس میں برصغیر کے فسادات کی خونیں فضا بھی جھلکتی ہے جس سے ہماری تاریخ کے ایک نازک ترین مرحلے کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ شاعر کی نظم کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک ہی بحر کو پوری کہانی میں برقرار رکھا ہے ہم عصر شعرا میں موضوعات کی مماثلت کوئی قابل گرفت بات نہیں۔ بلکہ جہاں یگانگت اور خلوص کی گنجائشیں زیادہ ہوں وہاں تو "من و تو" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ہم عصر شعراء سے تبادلہ خیال بھی کسی خیال کو جنم دے سکتا ہے۔ مغرب میں تو اس یگانگت کی مثالیں بہت آگے تک مل جاتی ہیں۔ کولرج کی مشہور نظم The Ancient Mariner کا مرکزی خیال ورڈسورتھ سے ایک گفتگو کے دوران طے ہوا۔ کولرج نے ورڈسورتھ کو ملٹن کے طرز پر ایک رزمیہ لکھنے کی ترغیب دلائی۔ رزمیہ اپنے اصطلاحی معنوں میں تو نہ لکھی جا سکی لیکن اس کی مشہور نظم The Prelude اسی قسم کی دوستانہ مشوروں کا نتیجہ تھی۔ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ کس نے موضوع کو کس انداز سے برتا ہے اور اس میں کوئی عنصر ایسا ہے یا نہیں جس سے کوئی تحریر دائمی ادب کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

نظم کی طرح حمایت علی شاعر کی غزل بھی ان کی انفرادیت کی غماز ہے۔ غزل کے بعض اشعار اپنی تفہیم اور شعری ساخت کی وجہ سے زباں زد خاص و عام ہیں۔ "آگ میں پھول" کی غزلوں میں اور بعد کی غزلوں میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ اب ان کی غزل میں رمزیت کا عنصر زیادہ غالب ہو رہا ہے۔ موضوعات میں ایک سمت تو ماحول کے مسائل ہیں اور دوسری طرف ذات کے حوالے سے ابھرنے والے سوالات۔

پھول ہے کہ لاشیں ہیں باغ ہے کہ مقتل ہے
شاخ شاخ ہوتا ہے دار کا گماں یارو!
راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میر کارواں یارو، میر کارواں یارو

چمن میں رہ کے مرا حال پوچھنے والو
قفس میں صرف اندھیرا ہے اور تنہائی
کوئی تو بات تھی ہم کو ملا جو رتبہ دار
وگرنہ شہر میں کچھ کم نہیں تھے سودائی

کس سے دل کی بات کہیے جس پہ پڑتی ہے نظر
اس کا چہرہ بول اٹھتا ہے خود اپنے دل کی بات

"آگ میں پھول" کی غزلیں ان اشعار کی وجہ سے آج بھی تازہ ہیں۔ اس کے بعد کی غزلوں کا رنگ ان اشعار سے نمایاں ہے۔

تو بھی محدود نہ ہو، مجھ کو بھی محدود نہ کر
اپنے نقش کف پا کو مری منزل نہ بنا

آئینہ خانہ میں ہے در کار کیا
چاہیے اک سنگ اگر چاہیے

کس لئے کیجئے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

میں آئینے میں بھی ہوں آئینے کے باہر بھی
مرے وجود کی وحدت میں یہ دوئی کیا ہے

یہ سنگ زنی میرے لئے بارش گل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ بدست دگراں اور

وہ قحط جنوں ہے کہ کوئی چاک گریباں
آتا ہے نظر بھی تو گزرتا ہے گماں اور

غزل اور نظم کے ساتھ ساتھ حمایت علی شاعر نے تین مصرعوں کی مختصر نظمیں بھی بالالتزام کہی ہیں۔ جنہیں وہ ”ثلاثی“ کہتے ہیں۔ عربی قواعد میں ”ثلاثی مزید“ اور ”ثلاثی مزید فیہ“ جیسی ثقیل اصطلاحیں موجود ہیں۔ ان سے نظم کی ایک صنف کا نام اخذ کر کے انہوں نے یقیناً شاعرانہ اپج کا ثبوت دیا ہے۔ دو مصرعوں میں شعر یا بیت کی تکمیل ہوتی ہے اور چار مصرعوں سے قطعہ یا رباعی کو مختص کر دیا گیا ہے۔ الٰہذا مختصر ترین نظم کے لئے شاعر کو تین مصرعوں کی ہیت ہی سب سے زیادہ موزوں نظر آئی ہیں۔ مثلث کی صنف اردو میں رائج ہے لیکن ضروری نہیں کہ مثلث ایک ہی بند میں ختم ہو جائے۔ اس کے کئی کئی بند ہوتے ہیں۔ شاعر نے ”ثلاثی“ کو تین مصرعوں تک محدود رکھا ہے اور ایک ثلاثی میں ایک مکمل خیال کو ہی تشبیہوں اور استعاروں، علامتوں اور اشاروں کی مدد سے نظم کیا ہے۔ ممکن ہے اس کے سرے جاپانی نظم Haiku سے بھی ملائے جائیں لیکن اختصار کے سوا شاید کوئی اور چیز دونوں میں مشترک نہیں ہے۔ شاعر کے یہاں رمزیت اور معنویت کی فضا بالکل مختلف ہے۔ ”ثلاثی“ کی تین مثالیں دیکھئے۔

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

شب میں سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

پھر کوئی فرمان اے رب جلیل
ذہن کے غار حرا میں کب سے ہے
فکر محو انتظار جبرئیل

”آگ میں پھول“ کی اشاعت کے بعد ”لہو جو سرحد پہ بہہ رہا ہے“ ”پس دیوار حرف“ اور ”لہو فکر“ جیسی نظمیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ حمایت علی شاعر کے شاعرانہ اسالیب میں برابر نکھار پیدا ہو رہا ہے اور وہ گرد و پیش کی فضا کے بارے میں ہمیشہ کی طرح آج بھی حساس ہیں۔ ”پس دیوار حرف“ اور ”لہو فکر“ حالیہ لسانی فسادات کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ ان کا تاثر وقتی اور مقامی بھی ہے۔ اور اگر ان کی ایمائیت اور رمزیت کے رشتوں کو ڈھونڈیئے تو یہ مسئلہ تمام اقوام عالم کے لئے ہے۔

”لہو فکر“ کئی لحاظ سے اہم ہے۔ ایک طرف تو اس نظم سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہنگامی موضوعات پر تخلیقی اور صحافتی نظموں میں فرق کرنے کے لئے کس قسم کی نظم کو معیار بنایا جا سکتا ہے۔ دوسرے اس نظم میں تحمل Restrain کا عنصر

جذباتیت کے بجائے تاریخی اور سماجی شعور کی سمت نمائی کرتا ہے۔ تیسرے اس نظم میں شاید پہلی بار سندھ کی لوک کہانیوں کے رمزیہ کرداروں کو اردو کی کسی تخلیقی نظم میں اس اپنائیت کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔ سندھی ادب کے تراجم اردو میں آج سے نہیں گزشتہ ربع صدی سے ہو رہے ہیں۔ وہ ترجمے بڑے کامیاب اور اہم ہیں۔ لیکن طبعزاد نظموں میں سندھی لوک کہانیوں کے کردار اس طرح نہیں آتے جس طرح مثلاً" لیلیٰ مجنوں' ہیر رانجھا یا شیریں و فرہاد آتے ہیں۔ پھر شاعر نے ان رومانی کرداروں سے تاریخ کی صداقتوں اور انسانی اقدار کی علامتوں کا کام لیا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے "سر مومل رانو" میں مومل اس کے محبوب رانو اور مومل کی بہن سومل کی داستان بیان کی ہے جو طلسمات و نیز نجات پر قدرت رکھتی تھی۔ اسی طرح سر ماروی میں عمر اور ماروی کی داستان بیان کی ہے جس سے ایک طرف عمر کی فیاضانہ فطرت اور احترام اقدار حیات کی نشان دہی ہوتی ہے اور دوسری طرف ماروی حب وطن' آورش سے محبت اور انفرادی آزادی کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔ ان کرداروں کی مدد سے شاعر نے اس انجام سے باخبر کرنے کی کوشش کی ہے جو تاریخی شعور سے بے بہرہ فریقوں کی باہمی آویزش کے نتیجے میں رونما ہو سکتا ہے۔

اس معرض فنا میں ذرا کل کی سوچئے
جینے کی آرزو میں نہ مقتل کی سوچئے
سومل کا پیرہن تو نظر کا فریب تھا — ملیر' ماروی کا رہے گا سدا مگر
رانو کی فکر کیجئے' مومل کی سوچئے — صدیوں کے ارتباط میں اک پل کی سوچئے

قوموں کی ہست و بود میں ایک "پل" کی بڑی اہمیت ہے۔ فریب خوردگی اور بے شعوری کی دلدل سے نکل کر حقائق کا جائزہ لے کر اس جدوجہد میں شامل ہونا ضروری ہے جو علاقائی عصبیتوں کو ختم کر کے انسان دوستی کی فضا پیدا کر سکتی ہے۔ اس نظم میں "پتھر" کی تکرار سے معنوی جہتوں میں بڑی خوبی سے اضافہ کیا گیا ہے۔ پتھر کہیں ہنر ہے اور کہیں فنا کا نقیب۔

پتھر خدا کے نام پہ تکبیر نا خدا
پتھر ہی سنگ میل بھی سنگ مزار بھی

پتھر کے یہ روپ انسان کے لئے ناگزیر ہیں۔ اور اس نظم کا بنیادی پیغام یہی ہے کہ شیشہ گروں کو ضرب سنگ سے بے نیاز نہ رہنا چاہئے۔

حمایت علی شاعر نے گزشتہ برسوں میں شاعر سے زیادہ اداکار' صداکار' فلمساز' ریسرچ اسکالر اور فلمی نغمہ نگار وغیرہ بننے پر اصرار کیا ہے اور شاعری کو ذریعہ عزت خیال نہیں کیا۔ تاہم تادم تحریر تو یہی ہے کہ ان کی شاعری ان کے دیگر دعوؤں اور مرتبوں پر حاوی ہے اور اس نے انہیں شاعر کے سوا کچھ اور بننے سے اب تک روکے رکھا ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے کیونکہ اس طرح کا منصب وہی شاعری سرانجام دے سکتی ہے جس میں قوت اور توانائی بدرجہ اتم موجود ہو۔ ایسی ہی شاعری زیست کے اجزائے پریشاں کو سمیٹنے کی جرات کر سکتی ہے۔

وہ مشت خاک ہوا نے جسے بکھیر دیا — سمیٹنے کی تگ و دو ہے آدمی کیا ہے

تبصرا "بنگال سے کوریا تک" اور "پرچھائیاں" کے ضمن میں بعض حقائق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس طرح صحیح نتیجہ اخذ کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ حمایت علی شاعر کی نظم کا زمانہ تصنیف ۵۱ء' ۵۲ء اور ۵۳ء پر محیط ہے۔ اس کے مختلف حصے برگ گل (۵۲ء) مشرب (۵۳ء) اور روح ادب (۵۳ء) میں شائع ہوئے۔ پھر رامق جونپوری کی ادارت میں "شاہراہ" (دہلی) نے ۵۴ء میں جو سالنامہ شائع کیا تھا اس میں شاعر کی یہ طویل نظم مکمل صورت میں شائع ہوئی۔ "آگ میں پھول" ۵۶ء میں شائع ہوا اس میں یہ نظم موجود ہے۔ سلیمان اریب نے "حیدر آباد کے شاعر (۲)" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا جو آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی حیدر آباد کی طرف سے شائع ہوا اس میں بھی شاعر کی یہ پوری نظم موجود ہے۔ ساحر لدھیانوی کی "پرچھائیاں" پہلی بار ۵۵ء میں شائع ہوئی۔ ہندوستان میں اس طرح کا کوئی ادبی تنازعہ رونما نہیں ہوا۔ اسی طرح

فکر جدید اور نمائندہ شاعر

نکہت بریلوی

فکر جدید کے مفہوم کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئی نسل کے کسی نمائندہ شاعر پر تفصیلی مطالعہ پیش کرنا، ممکن ہے اوروں کے لئے کچھ مشکل امر نہ ہو مگر مجھ جیسا کم سواد تو اس کام کی نوعیت کو ہرگز آسان نہیں سمجھ سکتا جب کہ اہل علم و صاحبان ادب کے درمیان اردو شاعری کے جدید معنی کی کوئی متفقہ حیثیت بھی متعین نہ ہوئی ہو اور نہ ایسے معیار و پیمانے ترتیب پاتے ہوں جن کے تحت نئی نسل کی تشکیل کو صحیح صحیح اور منصفانہ طور پر عمل میں لایا جاسکے۔

اب تک اس سلسلہ میں جو دستور رائج ہے اس کی صورت اپنی "ڈفلی اپنا راگ" سے مختلف نہیں، بہت کم ایسے حضرات نظر آتے ہیں جنہوں نے ادبی منصب کی ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اس ضمن میں راہ مستقیم اختیار کی ہو بہرحال مجھے اس سے غرض نہیں، میں نے جہاں تک سمجھا ہے ادب میں جدید کے معنی کا مکمل اظہار صرف "نئے" سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس مفہوم میں اس نئی روح کو دخل حاصل ہے جو عہد بہ عہد تبدیلی اقدار کے ساتھ ساتھ نئے نئے پیرہن بدل کر سامنے آتی رہتی ہے صرف اسلوب و ہیت کی بنیاد پر کسی ادبی تخلیق کو جدید کہنا صحیح نہیں۔ صحیح تو یہ ہے کہ نئی فکر و خیال کے بغیر اس قسم کے تمام تجربے غیر فطری ہوتے ہیں۔ دراصل فکر خود اظہار کی نئی نئی صورتیں ساتھ لے کر پیدا ہوتی ہے۔

شاعری میں جدید فکر کا مطلب یقیناً "یہ ہوگا کہ وہ اپنے عہد اور اس کی تمام تر پیچیدگیوں کا بھرپور ادراک رکھتی ہے۔

ایک سچا شاعر ہمیشہ اپنے عہد سے ہم آہنگی کی آرزو میں بے چین دکھائی دیتا ہے وہ زندگی کی حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرتا اور یہ جانتا ہے کہ فن بنیادی طور پر انسانی اغراض و مقاصد اور اس کی فلاح و ترقی سے تعلق رکھتا ہے شاعری بھی دراصل ایک سماجی عمل ہے اس عمل کی سچی لگن شاعر کو وہ تخلیقی ارمان بخشتی ہے جو فن اور زندگی دونوں کو حسن و اعتماد کی دولت سے سرفراز کرسکیں۔

اردو کے اعلیٰ شاعری انہیں بنیادوں پر استوار ہے اگر خلوص کے ساتھ، فنکارانہ صداقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مطالعہ کیا جائے تو میر سے تاحال ہماری شاعری کا ارتقائی سفر اسی طرح پر جاری ملتا ہے میر کا کلام صرف زبان و بیان کی ندرت و تازگی کی وجہ سے بلند دارفع نہیں ہے بلکہ اس کی بڑائی میں ان خصوصیات کا زیادہ حصہ ہے جو زندگی کے آہنگ سے منسوب ہوتی ہیں، زیادہ شعوری انداز میں نہ سہی تاہم میر کے ہاں ان کا عہد جھلکتا ہے۔

یہی جھلک غالب کے ہاں کچھ اور بلکہ بہت کچھ نمایاں ہوئی ہے ان کی شاعری سے ان کے زمانے کی گوناگوں پیچیدگیوں، تہذیبی تصادم کے اثرات، سیاسی، معاشی اور معاشرتی قدروں میں انقلابی کیفیات کا علم ہوسکتا ہے۔۔ اور یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ غالب نے عقل و بصیرت کے ذریعہ زندگی کی حقیقتوں کے ادراک کی سعی کی ہے اس لئے اردو شاعری میں نئے میلان کی نوید غالب کے نام کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔۔

حالی نئی شاعری کے بانی کہلاتے ہیں انہوں نے غالب ہی کے چراغ سے چراغ روشن کیا ہے وسعت بیاں کی خاطر تنگنائے غزل سے نکل کر نظم کا جو میدان انہوں نے ہموار کیا وہ بھی اپنے استاد کے اشارے سے شہ پاکر' بہرحال حالی نے اپنے زمانے کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے شاعری کو بھرپور طریقہ پر زندگی کا ترجمان بنانے کی قابل تعریف جدوجہد کی ہے ہرچند کہ حالی اور ان کے رفقائے کار اپنے مقاصد کو پورے طور پر نہ پاسکے لیکن ان کے ہاتھوں جو راہ بنی اس پر چل کر نشان منزل پالینے کی تمنا نے اقبال کا روپ دھارا۔

اقبال علم و شعور کے لحاظ سے اپنے پیش رووں سے بہت آگے تھے چنانچہ فکر و فن کے معاملے میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے انہوں نے اپنے عہد کی تمام تر حقیقتوں کو بغور محسوس کیا اور ان کے ادراک کو شاعری کا جامہ پہنا کر سامنے لائے شاعری میں سیاسی اور اجتماعی رجحان کی نشونما کے لئے اقبال کی مساعی کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا انہوں نے شاعری کو انسان دوستی' خلوص' مساوات اور اخوت کا پیامبر بنایا اس میں انقلاب کی روح بیدار کی' اور ایسے خوب صورت تصورات دیئے جن سے فن اور زندگی کے گلستاں سدا بہار ہوتے ہیں۔

یہاں میں جوش کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ہماری شاعری کو بے لاگ جارحیت' حقیقت نگاری' جوش اور ولولے کی ایسی دولت دی ہے جس نے بعد میں آنے والوں کے دم خم بڑھائے اور ان میں جسارت کی روح پھونک دی' جوش کے زمانہ شباب ہی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی یہ ادبی تحریک برصغیر پاک و ہند میں سرسید احمد خان کی علمی و سیاسی تحریک کے بعد سب سے بڑی اور اہم تحریک کا درجہ رکھتی ہے' اس تحریک نے زندگی اور ادب کے رشتہ کو واضح تر کیا' شعر و ادب کو سماج کی تشکیل و تعمیر کا ایک باشعور ذریعہ بنانے کی ضرورت محسوس کرائی۔ انسانیت کے بین الاقوامی روابط کے مطالعہ کی طرف توجہ دلائی اور اسلوب و شعر میں نئے نئے تجربوں کی راہ کھولی۔

میرے تحریک ترقی پسند تک اس سرسری جائزے سے اس بات کا اندازہ باآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ فکر شعر' علم و شعور کے سہارے زندگی کی مختلف صورتوں کے مطابق ہر دور میں اپنے انداز بدلتی رہتی ہے ترقی پسند تحریک کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہمارے ادب کو تفریحی غایت کے نرغے سے نجات دلا کر اسے اس کا صحیح مقام عطا کیا اب جو ہم ادب کے ذریعہ زندگی کی تکمیل و تعمیر کی ہمت رکھتے ہیں دراصل یہ اسی تحریک کا کرشمہ ہے یہاں میں اس بارے میں کسی مفصل بیان کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نئی نسل یا جدید فکر کا سلسلہ اس تحریک کے اثرات کو زیر غور لائے بغیر نہیں پایا جاسکتا بعض "عقلمندوں" کا کہنا ہے کہ ترقی پسند تحریک مرچکی ہے میرے نزدیک جو تحریکیں اپنے نصب العین کو پایہ تکمیل تک پہنچادیں وہ کبھی مرتی نہیں' امر ہوجاتی ہیں۔ ترقی پسند رجحانات آج بھی ہمارے ادب میں جاری و ساری ہیں اور میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ ان رجحانات کے بغیر ادب زندگی کا ساتھ ہی نہیں دے سکتا چنانچہ جو لوگ ان رجحانات سے منکر ہیں انہیں اکثر ادب پر جمود کے خواب دکھائی دیتے ہیں' ترقی پسند رجحانات نے مخدوم محی الدین' اسرار الحق مجاز' فیض احمد فیض' سردار جعفری' کیفی اعظمی' احمد ندیم قاسمی' جاں نثار اختر' ساحر لدھیانوی' غلام ربانی تاباں' معین احسن جذبی' وامق جونپوری' ظہیر کاشمیری' مجروح سلطانپوری اور نظر حیدر آبادی وغیرہم جیسے شاعروں کے ذریعہ شاعری کو جو حسن و توانائی بخشی ہے اس کے سلسلہ کبھی ماند نہیں پڑسکتے۔

آزادی کے بعد جو حالات رونما ہوئے ان کے نتیجہ میں ہماری شاعری' جذباتیت' زود رنجی یا پھر ماحول سے بیزاری کا

شکار ہوگئی اس سخت و شدید عالم میں فنی مراتب کا تحفظ متانت کا طلب گار تھا اور یہ متانت ایسے لوگوں ہی میں مل سکتی تھی جو زندگی اور کائنات کے بارے میں مخلص ہوں اور خون جگر سے تزئینِ فن کی ہمت رکھتے ہوں۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد آنے والے شاعروں کی تعداد کم نہیں لیکن ایسے نام بہت کم دکھائی دیتے ہیں جن سے شاعری کے مستقبل کی نسبت کچھ توقعات وابستہ کی جاسکیں اب تک جن شعراء نے اس طور پر اہل ذوق و ذی شعور حضرات کو کسی قدر اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ شاعرانہ شخصیت کو کسی حد تک نکھارنے میں کامیابی حاصل کی ہے ان میں عارف عبدالمتین، مصطفیٰ زیدی، عزیز حامد مدنی، خلیل الرحمان اعظمی اور حمایت علی شاعر کا نام کافی نمایاں ہے۔ چاند نگر اور "برگ نے" کی حد تک اس قبیل میں ابن انشاء اور ناصر کاظمی کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے لیکن بعد میں ناصر کاظمی بیچارے میر کے رعب میں آکر دبک رہے اور انشاجی کو ہالیا" صحافت کا دیوتا نگل گیا بہرحال مجھے سردست صرف حمایت علی شاعر سے واسطہ ہے اسی کے بارے میں اب تک جو کچھ سمجھ سکا ہوں بتانے کی کوشش کروں گا۔

اب سے کوئی گیارہ سال قبل میں نے حمایت علی شاعر کا نام سنا تھا پھر پاک و ہند کے بیشتر ادبی جرائد کے توسط سے کلام پڑھنے کا موقعہ ملا اگر سچائی کے برملا اظہار میں کوئی عیب نہیں تو مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ اس نئے شاعر نے مجھے فوراً "اپنا گرویدہ بنالیا تھا حالانکہ شاعری کے ضمن میں فوری طور پر گرویدہ ہو جانے کی بات زیادہ قابل اعتبار نہیں ہوتی اکثر شعراء نے کوندے کی طرح لپک کر قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ماند پڑگئے لیکن حمایت علی شاعر کا قاری اس ضمن میں بفضلہ مطمئن دکھائی دیتا ہے کیونکہ اس کی چمک دمک کوندے کی لپک سے مستعار نہیں وہ آفتاب کی طرح افق شاعری سے ابھرا ہے اور آہستہ آہستہ اپنی روشنی سے دنیائے ادب کو منور کرتا نظر آرہا ہے۔

۱۹۵۶ء میں اس کا پہلا مجموعہ "آگ میں پھول" کے نام سے شائع ہوا اگرچہ اس کی اشاعت کسی نامی گرامی مکتبہ سے منسوب نہیں تھی اور نہ اس کی فروخت میں کوئی اثر معاون ہوا اس کے باوجود ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اہل نقد و مبصرین کی رائے کچھ بھی ہو، میں نے یہ دیکھا کہ اس مجموعہ کے بعد حمایت کو پسند کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ آگے پیچھے آنے والے بہت سے نئے شاعروں کے ہاں اس کا اثر قبول کیا جانے لگا۔ سابق صوبہ سندھ کے علاقے میں تو نہ صرف اس کا انداز فکر اور خوش اسلوبی بلکہ پڑھنے کا ڈھنگ تک قابل تقلید ٹھہرا میں ایسے کئی شاعروں سے واقف ہوں جن کی شہرت میں حمایت کی تقلید کو بڑا دخل ہے ممکن ہے ان باتوں کو مشرب نقد میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کسی شاعر کو سمجھنے کے لئے ایسی چھوٹی موٹی باتیں بھی کام ہی کی ہوتی ہیں ان کے ذریعہ بھی اس کی اصل تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے۔

حمایت پر لکھنے والوں نے سب سے پہلے یہی لکھا ہے کہ وہ ایک ترقی پسند شاعر ہے میں یہ نہیں کہوں گا کیونکہ شاعر اگر واقعی شاعر ہے تو وہ ترقی پسند ہی ہوگا اور مجھے حمایت کی شاعرانہ صلاحیتوں پر کامل اعتماد ہے اس نے اپنے سیکڑوں ہمعصروں کی طرح ترقی پسندی کو محض فیشن کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ وہ رجحانات جنہیں شاعری میں ترقی پسندی کا عنوان دیا گیا ہے اسے اپنی زندگی سے ملے ہیں۔

وہ جس طبقہ سے متعلق ہے اس میں زندگی کے نشیب و فراز اور تلخ و ترش کا سلسلہ ابتدا ہی سے پیدا ہو جاتا ہے اس نے وراثت میں کچھ نہ پانے کے باعث ہر یافت کے لئے اپنی قوت بازو اور سوچ وچار سے کام لیا، ہر درپیش مسئلہ کی الجھنوں کو خود سلجھانے کی جدوجہد کی، اسی ماحول کی بدولت اسے سماج میں زندگی کے جدلیاتی عمل کو سمجھنے کا موقع ملا اور اس نے وہ درد پایا

جو شعور کی روشنی بن کر فن کے لئے مشعلِ راہ کا کام کرتا ہے۔

اس کم عمری اور مختصر مدت ریاض کے باوجود حمایت علی شاعر نے جو ترقی حاصل کی ہے اس کی وجہ شاعر کی فطرت سے آگہی اور ان نکات کا علم ہے جو شاعری کو حقیقی اور اہم بنانے کا کام کرتا ہے اس علم و آگہی کے ساتھ ساتھ اپنے فن کے بارے میں حمایت کے خلوص اور مسلسل جدوجہد کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اس نے جس طرح اپنی عملی زندگی کو بہتر اور خوشگوار بنانے کے لئے شب و روز سخت محنت و مشقت سے کام کیا ہے بالکل اسی طرح اپنی شاعرانہ حیثیت کے اہتمام میں بھی ہمہ اوقات توجہ صرف کی ہے اسی لئے اس کی نجی اور ادبی زندگی کے ارتقاء میں بتدریج یکسانیت پائی جاتی ہے جسے خیال و عمل کی یکجہتی سے بھی معنون کیا جاسکتا ہے

"آگ میں پھول" کی شاعری کے پیش نظر عام ناقدانہ طریقہ کار کے مطابق شاعر کو مختلف ہونے ان ہونے خصائص کے حصار میں لاکر کچھ اپنے زور قلم کی بنیاد پر اور کچھ اس کے اشعار کی تعبیروں کے ذریعہ بہت ساری باتیں کی جاسکتی ہیں۔ لیکن میں باتیں بنانے کو شاعری کے برعکس الگ ایک فن سمجھتا ہوں جو اپنے طور پر ہزار معتبر سہی لیکن شاعری کے معاملے میں اس کا بے دریغ اثر و نفوذ شاعری کو نامعتبر بنادیتا ہے۔ لہٰذا میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ "آگ میں پھول" حمایت کا پہلا مجموعہ کلام ہے یہ اس کا کوئی قد متعین نہیں کرتا بلکہ ان وسیلوں کا پتہ دیتا ہے جو اس کے خوش آئند مستقبل کی ضمانت ہیں۔

اس مجموعہ کلام کی خصوصیت یہ بھی نہیں ہے کہ لوگ چونک پڑیں حمایت نے شاعری کو اس کے پورے ادب و احترام کے ساتھ اپنایا ہے چونکا دینے والا پٹاخہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا ہے۔ اسی لئے اس کا رویہ اپنے بہت سے ہمعصروں کے مقابلے میں نہایت سنجیدہ دکھائی دیتا ہے۔

عام طور سے نئے شاعروں خاص کر ترقی پسند شاعروں پر روایت سے تنفر کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں "آگ میں پھول" کا پیش لفظ "میں اور میرا فن" سے ایک اقتباس نقل کئے دیتا ہوں جو نہ صرف حمایت بلکہ ترقی پسند نقطہ نظر کی بھی وضاحت کرتا ہے۔

> ہر نوزائیدہ قدر اپنا ایک روایتی تسلسل رکھتی ہے اور اپنی جگہ آئندہ امکانات کے ایک لامتناہی سلسلے کا نقطہ آغاز بنی رہتی ہے' بصیرت کا تقاضہ یہی ہے کہ فنکار اس لامتناہی سلسلے کی کھوج میں اپنے سفر کی ابتداء آغاز سے کرے

بصیرت کا مذکورہ تقاضہ حمایت کی پوری شاعری میں ملحوظ رکھا گیا ہے نیز یہ احتیاط بھی قدم قدم پر کارفرما نظر آتی ہے کہ شاعری محض دل کا مشغلہ ہو کر نہ رہ جائے بلکہ دماغ کی زندگی سے بھی تعبیر ہوتی رہے۔ چنانچہ غم جاناں کے تحت کوئی ذاتی غم بھی جب اس کے شعر کا موضوع بنا ہے تو اس نے اسے سماجی رشتے سے پیوست کرکے غم مشترک بنادیا۔ اور ایسے مسائل جن کی حیثیت قطعی وقتی ہوتی ہے اور جو ذاتی طور پر شاعر کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے جب اس کے اشعار میں بار پاتے ہیں تو دل کے راستے آکر اس کی زندگی کا جزو بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کے ہاں دل و دماغ کا ایک معنوی ربط برقرار رہا ہے اہل

نظر و صاحبان رائے کے نزدیک یہی ربط اچھی اور بڑی شاعری کا لازمہ ٹھہرتا ہے زبان کے بارے میں نئی نسل کی بے طوری سے حمایت کو سخت اختلاف ہے وہ خیال کی ترسیل کے لئے زبان کی تہذیب کو نظر انداز کردینے کے حق میں بالکل نہیں معلوم ہوتا۔ اسے زبان کے تقدس اور اس کے مزاج کی نزاکتوں کا پورا پورا احساس رہتا ہے حق بھی یہی ہے تخلیق شعر کا فن زبان کے آرٹ کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر شاعری کی تاثیر و ابدیت کھو بیٹھتا ہے بہرحال "آگ میں پھول" کا مجموعی تاثر حمایت علی شاعر کے فنکارانہ بلوغ اور فکری ارتقاع کا غماز ہے شعلہ بے دود "زندگی اور پتھر" 'غم رائگاں' آخر شب' منظر و پس منظر' غم فردا' شکست خواب' مزار قائد اور بنگال سے کوریا تک اس مجموعہ کی ایسی نظمیں ہیں جو شاعر کے بارے میں مندرجہ ذیل خصوصیات کی صداقت معلوم کرنے میں بہت معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

شعلہ بے دود اور بنگال سے کوریا تک طویل افسانوی نوعیت کی نظمیں ہیں یہ دونوں نظمیں موضوع کے اعتبار ہی سے اہم نہیں بلکہ اظہار اور اثر آفرینی کے لحاظ سے بھی نمائندہ نظمیں کہی جائیں گی۔ شعلہ بے دود میں متوسط طبقے کی سماجی نفسیاتی الجھنوں کا ایک کامیاب تجزیہ پیش کیا گیا ہے دوسری نظم بنگال سے کوریا تک، فکر و اسلوب پر دو اعتبار سے اعلیٰ پائے کی نظموں میں شامل ہوتی ہیں۔ اس میں دوسری جنگ عظیم سے بنگال کے قحط تک جو سیاسی مصلحتیں ایک المیہ بن کر ابھرتی ہیں شاعر نے انہیں احساس وجذبہ کی شدید کیفیات کے ساتھ نظم میں منتقل کردیا ہے یہ طویل نظم یادوں کی جھلکیوں کے سہارے آہستہ آہستہ ہر منظر و پس منظر کا مکمل اظہار کرتی ہوئی اپنا سفر طے کرتی ہے اس کا پیرائیہ بیان اگر یہ نہ ہوتا جو حمایت علی شاعر نے اختیار کیا ہے تو بہت ممکن تھا قاری اس کی طوالت اور موضوعی پیچیدگی کے باعث اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا۔ اور نظم بوجھل ہو جاتی۔

"آگ میں پھول" کے بعد ادھر کوئی چھ سات سال کے عرصہ میں حسب توقع حمایت کی شخصیت کچھ اور نکھری ہے دوش فردا فریب، آگہی' رات، تحریک' اور ہوا ایسی نظمیں ہیں جو حمایت کے اندر چھپے ہوئے شاعر کی بہترین صلاحیتوں کو بروئے نظر لاتی ہیں اور اس کی بلند قامتی کی بشارت دیتی ہیں ان نظموں میں وہ صرف مزید فکری وسعتوں کو پہنچا ہے بلکہ اس کے ہاں اسلوب و اظہار کے شگفتہ و پرمعنی انداز بھی معرض نمود میں آئے ہیں ادھر جو ہماری شاعری میں علامتی رجحان کا اثر زیادہ ہوا حمایت نے بھی اسے اپنایا لیکن اس طرح کہ علامتوں میں شاعری غائب نہیں ہوتی نئی نئی علامتوں کے ذریعہ پیش کئے جانے والے خیالات بھی اس کی شاعری میں قاری کو کسی دماغی ورزش میں مبتلا کرنے کے بجائے لطف و اثر سے نہال رکھتے ہیں۔

اکثر اس نوع کی کوششوں میں اس نے بعض مستعمل علامتوں سے بھی کام لیا ہے اور ان کو بالکل نئے معنی دے دیئے ہیں۔ میں ابتدا میں کہیں عرض کر آیا ہوں کہ حمایت اپنے فن کے معاملہ میں بہت مخلص ہے یہی خلوص ہے جو اسے محنت و اکتساب' علم و ریاض سے جی نہیں چرانے دیتا نتیجتاً" اس میں روز بروز وہ توانائی پیدا ہوتی جارہی ہے جو شاعری کے آرٹ کو حسین و پائیدار بناتی ہے۔

اپنی انفرادیت کے اظہار کا تجسس اسے تجربہ پر بھی آمادہ کرتا ہے جس کی مثال "ثلاثی" کے عنوان سے لکھی جانے والی نظمیں ہیں۔ یہ نئی صنف حمایت نے تجربہ کے طور پر اپنائی ہے اس کی ہئیتی ترکیب صرف تین مصرعوں میں ایک مکمل خیال کو پورے کیف و اثر کے ساتھ پیش کرنے پر مشتمل ہے نمونے کے لئے دو ثلاثیاں حاضر ہیں

شاعری پیغمبری

کوئی تازہ شعر اے رب جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر محو انتظار جبرئیل

پتھر

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

اس نئی صنف کی ایجاد کا سہرا حمایت کے سر بندھے یا نہ بندھے لیکن اس میں مقبول ہوجانے کے امکان بہت ہیں آخر میں یہ بتا تا چلوں کہ حمایت اپنی نسل میں تنہا ایسا شاعر ہے جو جذبہ کے ساتھ ساتھ ایک ایسا مقصد بھی اپنے فن کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے جس کی بدولت موجودہ دور کی تحیر خیزی یعنی سائنسی دریافتیں' اختراعات' انکشافات اسے ڈرا نہیں پاتے اور آنے والے زمانے کا کوئی خوف بھی اس پر تخلیقی جمود کا طلسم طاری نہیں کرنے پائے گا۔

(مطبوعہ "نئی قدریں" حیدر آباد۔ فکر جدید نمبر ۱۹۶۶ء)

(بقیہ = حمایت علی شاعر کے نظریات۔ مظفر ملا ٹھوی)

معلوم نہیں شاعر نے یہ طرز خاص مذہب کا مذاق اڑانے کے لئے اختیار کیا ہے یا اپنی پیغمبرانہ انا کی تسکین کے لئے یہاں ایک فکری تضاد بھی پیدا ہوگیا ہے وہ اس طرح کہ جب خدا کے وجود کا شاعر کو یقین ہی نہیں ہے تو پھر رب جلیل سے کچھ طلب کرنا بھی بے معنی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ حمایت کی شاعری میں جو رجحانات پائے جاتے ہیں اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فکری تضاد کا اظہار محض ذہن اور دل کی کشاکش کا نتیجہ ہے۔ دل مذہب سے قریب ہونا چاہتا ہے لیکن ذہن راضی نہیں ہے۔ مادی منفعت کے تحت حمایت کا ذہن مذہب سے برگشتہ نظر آتا ہے۔ نظم "گوسالہ" کا ایک شعر ہے

ہارون سر بہ زانو کہ موسیٰ سے کیا کہے
گوسالہ کو جب امت موسیٰ خدا کہے

مذہب کے متعلق حمایت کا یہ منفی انداز فکر عارضی ہے جب حمایت اشتراکی نظریات کو نظر انداز کر کے کوئی نیا نظریہ اپنانے کی کوشش میں ہیں تو یہ رد عمل ہونا تو لازمی ہے۔ یہ رد عمل کچھ دنوں تک رہے گا اور جلد ہی ایک ایسا وقت آئے گا جب حمایت مذہبی عقائد کی حقیقت کو قبول کرلیں گے اس لئے کہ مذہب اسلام ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور جب ایسا ہوگا تو حمایت کی شاعری ایک مرتبہ پھر مقبول عام ہوگی لیکن ان کی شاعری میں اشتراکیت کی نہیں بلکہ مذہب اسلام کی چھاپ ہوگی

(مطبوعہ روزنامہ "جسارت" کراچی ۷۶ء)

حمایت علی شاعر کے نظریات

مظفر ملانھوی

اس مضمون میں موجودہ صدی کے ایک معروف شاعر حمایت علی شاعر کی شاعری کے نظریات کی روشنی میں ان کی شاعری کا مستقبل تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے حمایت کی شاعری ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پروان چڑھتی ہوئی۔ "آگ میں پھول" کی منزل تک پہنچی۔ اشتراکی نظریات نے ان کی شاعری کو عوام میں مقبول کرایا۔ بالخصوص "بنگال سے کوریا تک" انکی مقبول ترین نظم ہے جس میں جنگ سے نفرت اور امن سے محبت کی تلقین کی گئی ہے۔

ناقدین کی آراء کے مطابق مثلاً" احتشام حسین صاحب کے خیال میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تقسیم کے بعد جن کے نام زیادہ نمایاں ہوئے ان میں آپ حمایت علی کا نام بھی نہایت اہم ہے۔ مخدوم محی الدین نے لکھا ہے "دکن کی مٹی کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا وہ سورج بھی نہیں، جو تمہاری شاعری میں "آمریت" کی علامت کے طور پر ابھرا ہے۔" سجاد ظہیر نے آگ میں پھول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس میں آگ کی سی گرمی ہے' پھول کی سی نرمی بھی اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شعور کی وہ رو بھی رواں دواں ہے جو سماجی حقیقت نگاری سے اشتراکی حقیقت نگاری کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔" ان حوالوں سے راقم کا مقصد حمایت علی شاعر کو ایک نظریاتی شاعر تسلیم کرانا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ حمایت علی شاعر اشتراکی نظریہ کے مقلد ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی شاعری میں اشتراکی نظریات کی چھاپ ہلکی ہے یا گہری ہے' کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حمایت کی شاعری میں پختگی پیدا نہیں ہو سکی ہے اور ہنوز ان کی شاعری کو کچی پکی شاعری کہا جاتا ہے۔ حمایت نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام "مٹی کا قرض" کے دیباچہ میں اپنے ذہنی انتشار کا اظہار کرکے سوچنے والوں کو تقویت پہنچائی ہے۔ لیکن اس دیباچہ کو غور سے پڑھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے الفاظ میں لکھنے والے کی روح شامل نہیں ہے اور یہ "مصنوعی انکساری" کا اظہار بن کر رہ گیا ہے۔

سجاد ظہیر نے حمایت کی شاعری میں شعور کی اس رو کی نشاندہی کی ہے جو اشتراکی حقیقت نگاری کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ حمایت خالصتاً" اشتراکی شاعر ہیں یہ بڑی محتاط پیش گوئی تھی جو سجاد ظہیر کر سکتے تھے۔ ورنہ احتشام صاحب تو حمایت کو ترقی پسند شاعروں میں صف اول کا شاعر تسلیم کرتے ہیں سجاد ظہیر غالباً" حمایت کی ذہنی افتاد کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور غالباً" انہیں اس بات کا یقین تھا کہ حمایت اشتراکی نظریات کے زیر اثر زیادہ دنوں تک شاعری نہیں کر سکیں گے۔ حمایت کی موجودہ شاعری بجز مذہبی عقائد کو مسخ کرنے کے کچھ نہیں جسے حفظ ماتقدم کے طور پر انہوں نے دیباچہ میں ذہنی انتشار کا نام دے رکھا ہے۔

"مٹی کا قرض شائع ہونے کے بعد لوگوں کو حیرت ہوئی ہو یا نہیں لیکن اشتراکی نظریے کے پرچاروں کو تعجب ضرور ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ اس مجموعہ میں جو نگارشات شامل ہیں' ان میں اشتراکی نظریات کے اثرات مدھم سے مدھم ہوتے چلے گئے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حمایت دانستہ اپنے نظریات میں تبدیلی لانے کی کوشش کررہے ہیں۔

ہمیں جو اس بات کا خدشہ ہے وہ یہ ہے کہ حمایت جو بلاشبہ اچھی شاعرانہ صلاحیت کے حامل ہیں ان سے اردو شاعری کو بڑی امیدیں ہیں کہیں ذہنی انتشار کی وجہ سے اشتراکی نظریات سے نہ صرف انحراف کر بیٹھیں بلکہ اپنی شاعری کو مذہبی عقائد و نظریات کے دائرہ میں محدود نہ کردیں۔ مٹی کا قرض' اور آگ میں پھول' کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ مایوس کن ہے اور شاعر کے مشتبہ رجحانات کی نشاندہی کرتا ہے۔ نظموں میں کثرت سے عقائد کو استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے' انہیں اس طرح اشعار کے قالب میں ڈھالا گیا ہے کہ ایک لمحہ کے لئے قاری ذہنی الجھن میں گرفتار ہوجاتا ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگتا ہے کہ آیا ان اشعار سے مذہبی عقائد و روایات کی تائید یا تردید کی گئی ہے یا ان کی تضحیک یا توصیف شامل ہے۔ عقیدہ سے متعلق یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ازل سے ہے ایک عذاب قبول و رد میں ہوں
کبھی خدا تو کبھی ناخدا کی زد میں ہوں

بڑا اچھا شعر ہے شاعر جب خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے تو ناخدا (سماج کے محافظ) کی بالادستی کا شکار ہوجاتا ہے اور جب خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے تو آفات ارضی و سماوی میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ یہاں ایک بات محل نظر ہے کہ مذہبی عقائد کے مطابق خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد رد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس سے شاعر کے عقیدہ کی ناپختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حمایت کے اس انداز فکر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاعر خدا اور مذہب کی حقیقت کو قبول کرنے سے خوف کھارہا ہے۔ وہ لادینی نظریات اور اشتراکیت سے بیزار ہوچکا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے

یہ میرے دل کی ہے دھڑکن کی فکر کی آواز — کھلا کہ "لا" ہی حقیقت ہے' "لا" ہی فسانہ
کوئی صدا سی ہے جبریل کی صدا کی طرح — عدم وجود میں پوشیدہ ہے خدا کی طرح
کھلی کتاب کے مانند کائنات تمام — بس اک تسلسل جذب و گریز جاری ہے
نظر ہے خلوتی گوشہ حرا کی طرح — ہر انتہا نظر آتی ہے' ابتدا کی طرح

یہاں حمایت کی فکر کی بنیاد یک لخت بدلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اپنی بیشتر نظموں میں انہوں نے جو تلمیحات' استعارے اور علامتیں استعمال کی ہیں وہ مذہبی عقائد سے وابستہ ہیں' ان کا مفہوم بدلا نہیں جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مختصر نظم "تجدید" ملاحظہ ہو۔

وقت' آوارہ ہوا کے مانند
شعلہ جسم ہے شبنم کی طرح
آ' مٹادیں یہ تفاوت یہ جمود
آ کہ ہو پھر کسی عیسیٰ کا ورود
تو بھی مظلوم ہے مریم کی طرح
میں بھی تنہا ہوں خدا کے مانند

بہت خوبصورت نظم ہے لیکن مفہوم تخیلک ہوگیا ہے' تثلیث کا جو عقیدہ ہے اس سے مفہوم کو تقویت نہیں پہنچتی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے۔ انہوں نے انسانیت کا درس دیا۔ دنیا سے ظلم و تشدد کو مٹانے کی تلقین کی۔ انہیں مسیحا بھی کہا جاتا ہے۔ شاعر نے اس نظم میں امن و آشتی کی تجدید کی تمنا کی ہے۔ اس نظم کا تخاطب کس سے ہے' واضح نہیں ہے' اگر انسانیت یا سکون کو پرسوئی فائی کیا گیا ہے تو مفہوم کسی قدر سمجھ میں آتا ہے حمایت کے یہاں عقیدہ میں جو الجھاؤ پایا جاتا ہے اس کا اندازہ ان کی ایک نظم "ہوا" سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

جو دور رہ کر بھی نزد جاں ہے
نفس نفس میں رواں دواں ہے
ہزار انداز سے عیاں ہے
مگر ہر اک آنکھ سے نہاں ہے
کبھی گماں ہے کبھی یقیں ہے
کہیں یہی تو خدا نہیں ہے

اب ذرا ان ثلاثیوں کی طرف آیئے جن کے بارے میں حمایت کا دعویٰ ہے کہ "یہ طرز خاص ہے ایجاد میری" ثلاثی میں تین مصرعے ہوتے ہیں پہلا اور آخری مصرعہ مع قافیہ ردیف ہوتا ہے بلاشبہ حمایت نے اس صنف میں اپنی شاعری کے جوہر دکھلائے ہیں لیکن جو مضامین ثلاثی میں پیش کئے گئے ہیں ان میں تنوع نہیں ہے۔ یہ عقائد اور مذہبی روایات کے اردگرد گھومتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ عقائد کے مقابلہ میں کفر و اسلام کے درمیان حد فاصل قائم کرنا مفتی کا کام ہے شاعر کا کام نہیں۔ تاہم شاعر کو قاری کے جذبات کا خیال رکھنا متدرل شاعری کے لئے ضروری ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں اور خود ہی فیصلہ کریں۔

کوئی تازہ شعر اے رب جلیل
ذہن کے غار حرا میں کب سے
فکر محو انتظار جبریل

اہل اسلام میں نہیں طبقات
اور فرمارہے تھے مولانا
اہل ثروت پہ فرض ہے خیرات

ہر لفظ آج یوں ہے معانی سے بے نیاز
لکھی ہو جیسے نام کی تختی مکان پر
قرآں' خدا رسول ہے سب کی زبان پر

(باقی صفحہ نمبر ۲۵۴ پر)

حمایت علی شاعر

پروفیسر سید عطاء الرحیم

(شعبہ فلسفہ۔ سندھ یونیورسٹی)

حمایت صاحب سے علیک سلیک پچھلے دس برسوں سے ہے میں اسے علیک سلیک اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے کبھی بھی اتنا موقع نہ ملا کہ ان سے تفصیلی بات کرسکوں کسی ہوٹل یا کیفے ٹیریا میں کچھ دیر ملاقات رہی اور بس لیکن اس کے باوجود وہ جس خلوص محبت سے ہمیشہ ملتے رہے ہیں اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ جس ہم ایک دوسرے کو ایک عرصے سے جانتے ہوں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد میں اکثران کی نظمیں اور غزلیں رسالوں میں پڑھتا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں اسلامیہ کالج ہالہ (سندھ) میں فلسفہ کا لیکچرار ہوگیا۔ ۱۹۵۷ء میں حمایت صاحب نے حیدر آباد سندھ سے ایک ماہنامہ "شعور" نکالا جس کے صرف دو یا تین ہی شمارے نکل سکے پرچہ بہت اچھا تھا لیکن سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے جلد بند ہوگیا۔ اس عرصہ میں میں فیصلہ ان سے خط وکتابت کی شعور کا خریدار بنا اور انہوں نے اپنا پہلا شعری مجموعہ "آگ میں پھول" مجھے بھیجا۔ حیدر آباد اکثر جانا ہوتا تھا اس وقت حمایت صاحب ریڈیو پاکستان حیدر آباد میں ملازم تھے اور اپنی آواز کا جادو جگاتے تھے آخر ایک دن ان کے گھر پر ان سے ملاقات ہوگئی مجھے دیکھ کر کہنے لگے "آپ ہیں پروفیسر عطاء الرحیم صاحب' حد ہوگئی ارے بھائی میں سمجھتا تھا بزرگ ہوں گے اور اگر داڑھی نہیں تو سر کے بال ضرور سفید ہوں گے اور آپ ہیں خود کو پروفیسر کہلواتے ہیں" میں خاموش رہا کیا کیا جائے پاکستان کی ایک برکت یہ ہے کہ ایم اے پاس ہو کر لیکچرار بننے والا ہر شخص اپنے آپ کو پروفیسر کہلوانا چاہتا ہے اس وقت سے حمایت صاحب سے صاحب سلامت ہے۔

حیدر آباد میں رہ کر انہوں نے بہت ہی خاموشی سے اردو میں ایم اے کرلیا اور آج کل ڈرامے کے موضوع پر سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کررہے ہیں کچھ عرصہ انہوں نے سچل کالج حیدر آباد میں اردو کی پروفیسری بھی کی۔

پچھلے چند سالوں سے وہ فلموں کے لئے گیت لکھ رہے ہیں اور "نگار ایوارڈ" حاصل کرچکے ہیں' ان کے' قتیل شفائی اور دوسر لوگوں کے آنے کی وجہ سے پاکستانی فلموں کے گانوں کا معیار کافی بلند ہوچکا ہے حال ہی میں انہوں نے اپنی ایک فلم "لوری" بنائی جو کہ مقبول ہوئی لیکن مالی اعتبار سے منفعت بخش نہ ہوئی۔

اپنے متعلق انہوں نے "آگ میں پھول" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ان کا تعلق ریاست حیدر آباد (اورنگ آباد) کے ایک انعام دار گھرانے سے ہے کچی مٹی کے گھر نے انہیں ننانوے فیصد انسانوں کی زندگی سے آگاہ کیا اور میرا خیال ہے کہ جو کچھ انہوں نے اس سے سیکھا ہے وہی شعر کی شکل میں میں قوم کو لوٹا رہے ہیں شاعری ان کی اپنی کاوش کا نتیجہ ہے کیونکہ ان کے گھر میں کسی کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

حمایت صاحب سے جو گھڑی دو گھڑی ملاقاتیں رہیں اس میں اکثر شعر و ادب کی باتیں بھی ہو جاتیں، وہ فیض صاحب کے بہت مداح تھے۔ چیخی شاعری اور نعرہ بازی سے ان کو چڑ ہے۔ کسی چیز کو محسوس کر کے اور اس میں ڈوب کر لکھنے کے عادی ہیں ان کی یہی چیز ہے جس نے مجھے اور دوسرے لوگوں کو متاثر کیا ہے ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کو کون سا نقاد پسند ہے۔ سوال مشکل تھا پھر بھی میں نے جواب دیا "احتشام حسین" وہ کہنے لگے "مجھے مجنوں گورکھ پوری پسند ہیں کیونکہ وہ کسی کے بارے میں بڑی نپی تلی رائے رکھتے ہیں انکی تنقید میں توازن ہوتا ہے۔" میں نے کہا "پسند و ناپسند کا مسئلہ بڑا مشکل ہے بہت سی باتیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے کسی کی پسند دوسرے کی ناپسند بن سکتی ہے۔" ایک دن کراچی میں مل گئے اور کہنے لگے میں نے ایک تجربہ کیا ہے تین مصرعوں والی نظم ہے جسے میں ثلاثی کہتا ہوں، مجھے تین چار نظمیں سنائیں (ان کی بحث آگے آئے گی) میں اور میرے ساتھیوں نے تعریف کی، فلموں کے متعلق انہوں نے بتایا کہ فلم بنانے اور اس کی نمائش تک کے مرحلوں میں کیسے کیسے مشکل مقامات آتے ہیں تقسیم کار کس طرح اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور کسی بھی فلم کو گرانے اور چڑھانے میں کیا کچھ کرتے ہیں سلیمان صاحب کے متعلق انہوں نے کہا کہ وہ بہت ہی ذہین ہدایت کار ہیں ان کی فلم "لوری" کی ہدایت کاری ان ہی کے ہاتھوں انجام پائی ہے پاکستانی فلمی صنعت سے وہ مایوس نہیں ہیں، لیکن وہاں کی گھٹن سے پریشان ضرور ہیں جب تک اس میں تعلیم یافتہ طبقہ نہیں آجاتا اس کی حالت سدھرنی مشکل ہے، ابھی حال ہی میں حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے "بھائی! آپ ہی لوگ بڑے مزے میں ہیں، یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں اور عیش کرتے ہیں، فلمی زندگی کو خیرباد کہنے کا ارادہ ہے، پی ایچ ڈی کا کام ہو جائے پھر آپ لوگوں کی صف میں آ جاؤں گا۔۔۔"

میں اور میرا فن کے عنوان سے حمایت صاحب نے اپنے فن کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے جو انکے شعری مجموعہ "آگ میں پھول" میں ہے۔ آیئے دیکھیں وہ اپنے متعلق کیا کہتے ہیں۔

"مجھے اپنے طبقے، اپنی کچی مٹی کے مکان اور اپنی معمولی سی زندگی پر ناز ہے جس کی وساطت سے مجھے سماج میں زندگی کے جدلیاتی عمل کو سمجھنے کا موقع ملا، مجھے وہ درد نصیب ہوا جو میرے شعور کی روشنی میں بھڑک کر شعلہ نہ بن سکا تو ایک انگارہ ضرور بن گیا یہی انگارہ کبھی ہوائے زمانہ سے بھڑک اٹھتا ہے تو میرے اور میرے فن کے لئے مشکل راہ بن جاتا ہے اور کبھی۔۔۔۔۔۔ چراغ سر مزار" (آگ میں پھول)

کچی مٹی کے گھر میں آنکھیں کھولنے والا بچہ زندگی کی تکلیف دہ حقیقتوں سے بہت جلد آشنا ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے وہ شعور کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے بہت سے سوالات اس کے ذہن میں اٹھتے ہیں جنکا وہ خاطر خواہ جواب نہیں دے پاتا اسی کے جیسے اور بھی افراد ہوتے ہیں جو کہ ان ہی مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں لیکن ان لوگوں کے مدمقابل کچھ اور لوگ بھی ہوتے ہیں جو کہ آرام اور عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں یہ تضاد ہر قدم پر اس کا دامن پکڑتا ہے کھانے، پینے، پہننے اور ضروریات زندگی پورا کرنے کے ہر عمل یہ تضاد ظاہر ہوتا ہے اور یہیں سے وہ کسک اور وہ درد نصیب ہوتا ہے جو کہ سوچ کو یکسر بدل دیتا ہے۔

شاعری کے متعلق حمایت صاحب فرماتے ہیں "شاعری میں میرا نقطہ نظر کسی غیر معمولی انفرادیت کا حامل نہیں، میں شعوری طور پر کسی ایسی جدت کا طرفدار نہیں ہوں جو فنکار کا رشتہ اپنے عہد اپنے عہد کی زندگی سے توڑ لے، میرے خیال میں

جتنی اہمیت ایک زندہ روایت کی ہوتی ہے اتنی ہی ان اقدار کی بھی ہوتی ہے جنہیں عصر رواں جنم دیتا ہے' میرے نزدیک فنکار اپنے عہد کا نمائندہ انہی معنوں میں ہوتا ہے اور ادب اپنے عہد کی تاریخ انہی معنوں میں مرتب کرتا ہے کہ وہ اپنے عصر کا شعور کا ترجمان ہوتا ہے۔"

(صفحہ ۴۱)

کسی غیر معمولی انفرادیت کا حامل ہونا' یہ ثابت کرتا ہے کہ حمایت صاحب شاعر کے کسی ایسے منصب یا انفرادیت کے قائل نہیں جس کی وجہ سے اس کا رشتہ عوام سے کٹ جائے شاعر کو اپنی انفرادی زندگی کی عکاسی کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ کسی اور کو ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ اپنی انفرادی زندگی کو اس انداز میں پیش کرے کہ وہ اجتماعی زندگی سے کٹ کر رہ جائے اور اس کا اپنا خول اتنا دبیز ہو جائے کہ نہ وہ خود اس سے باہر آسکے اور نہ کوئی دوسرا اس کی اندر جھانک سکے تو ایسی صورت میں وہ خود کو مطمئن تو کر سکتا ہے لیکن دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر وہ یہ کہے کہ صرف اپنے لئے ہی لکھتا ہے اور اسے کسی سے غرض نہیں تو ایسی صورت میں بات کرنا ہی بیکار ہے غرض حمایت صاحب کسی ایسی مجہول انفرادیت کے قائل نہیں ہیں پھر وہ اسکے بھی قائل نہیں ہیں کہ ایسی جدت ہو' جو فنکار کا رشتہ اپنے عہد یا اپنے عہد کی زندگی سے توڑ دے اپنے عہد سے ویسے کٹ جانا بہت مشکل ہے لاکھ آپ اپنی انفرادیت میں کھو جائیں اور کوئی ایسا طرز نکالیں کہ آپ زندگی کی حقیقتوں سے دور ہو جائیں، پھر زندگی کی حقیقتیں آپ کو مجبور کر دیں گی کہ آپ ان کا ذکر کریں۔

ادب میں اقدار کا مسئلہ کافی مشکل ہے بعض کہتے ہی کہ اقدار مطلق ہیں بعض کہتے ہیں کہ "اضافی" ہیں بعض کے نزدیک "یہ روحانی" یا ماروائی" ہیں اور بعض کے نزدیک مادی' اس مسئلہ سے بحث کا یہاں موقع نہیں ہے اگر چند اقدار مطلق ہیں تو چند اضافی بھی ہیں نہ سب اقدار مطلق ہیں اور نہ سب اضافی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چند اقدار ایسی ہیں جو کہ مطلق ہیں کیونکہ یہ انسانی زندگی اور معاشرہ کی بنیاد سمجھی جاتی ہیں لیکن یہ اضافی اس اعتبار سے بن جاتی ہے کہ ان کا مواد ہر اعتبار سے بنتا ہے اس اعتبار سے اپنے زمانے کی اقدار سے منہ توڑنا کسی بھی فنکار کو زیب نہیں دیتا۔ یہ اقدار ایک عصر میں پورے ماحول کے حرکی عمل سے بنتی ہیں جن میں معاشی' معاشرتی اور مذہبی غرض سب ہی پہلو کارفرما ہوتے ہیں زندگی ایک مکمل اکائی ہے اسے کسی ایک زمانے میں مقید کر دینا صحیح نہیں ہے فنکار اپنے عہد کا نمائندہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ اپنے دور کی نمائندگی کرے اور اس دور کے حالات کو بیان کرے یہاں میں نے حقیقتوں کے بجائے حالات کا لفظ استعمال کیا ہے اگر وہ بغیر کسی رائے کے ان حالات کا صرف ذکر کر دیتا ہے تو یہ کافی ہے اگر وہ اس کے مثبت یا منفی پہلو پر بحث کرتا ہے تو اس کا حق ہے جو کچھ وہ صحیح سمجھتا ہے کہہ سکتا ہے آزادی رائے کا اس کو حق ہے کسی بھی دو ہم عصر شاعر کے خیالات و نظریات میں مطابق یا تصادم ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اس تصادم کی وجہ صرف یہ ہے کہ حالات کا جس طرح ایک جائزہ لیتا ہے دوسرے کو اس اس طرح نہیں دیکھتا ہے۔

آگے چل کر حمایت صاحب فلسفہ کی دائرے میں داخل ہونا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "شعور حقیقت کے ادراک سے عبارت ہے اور حقیقت وہ نہیں ہوتی ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں بلکہ وہ ہوتی ہے جو پیش نظر شے میں درپردہ کارفرما ہوتی ہے" یہاں فلسفہ کا ایک سنگین مسئلہ درپیش ہے کیا حقیقت وہ ہے جو نظر آتی ہے یا وہ جسے ہم دیکھ نہیں سکتے؟ بقول حمایت صاحب وہ "شے کے درپردہ کارفرما ہوتی ہے۔" اگر وہ درپردہ کارفرما ہوتی ہے تو اس کا ادراک کیوں کر ہو اور اگر وہ ظاہر ہو جاتی ہے تو پھر

وہ حقیقت نہیں رہتی۔ خیر چھوڑیئے اس بحث کو

حمایت صاحب کو احساس ہے کہ حقیقت کی تلاش میں مختلف نظریات پیش کئے گئے لیکن ان کے نزدیک حقیقت کے لئے تاریخ کے جدلیاتی عمل سمجھنا ضروری ہے۔ "جب تک ہم تاریخ کے مادی حقائق کی کسوٹی پر بحث طلب مسائل کو نہیں پرکھیں گے کھرے اور کھوٹے کا فرق ظاہر نہیں ہوگا۔" یہ مسئلہ بھی کافی مشکل ہے کہ تاریخ صرف مادی حقائق کا نام ہے یا مادی اور غیرمادی حقائق کے عمل سے رد عمل کا۔ مادی حقائق کو اہمیت ضرور حاصل ہے لیکن یہ نہیں کہ یہی سب کچھ ہے انسان تاریخ کا نتیجہ نہیں وہ اس کا خالق بھی ہے۔

حمایت صاحب نے ادب کی ابدیت کا سوال بھی اٹھایا ہے بعض کے نزدیک ادب عالیہ شعوری طور پر ہر قسم کی حد بندی سے آزاد رہا ہے اور اسی میں اسکی ابدیت کا راز پنہاں ہے حمایت صاحب کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ "ہر داخلی تحریک کی جڑ خارج سے پیوست ہوتی ہیں اور خارج کے ساتھ ساتھ عمل کی داخلی حرکت میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔" ابدیت کوئی ایسی ماورائی چیز نہیں ہے اگر یہ سچ ہے کہ اس کا تعلق ہماری زندگی سے ہے تو اس کا تعین بھی ضروری ہے اگر یہ کہا جائے کہ محبت کا جذبہ ابدی ہے۔ حسن یا نفرت ابدی ہے تو یہ کسی حد تک صحیح ہے لیکن ہر زمانے میں اس کی شکل مختلف رہی ہے، اور بہت سی حرکات اس کی ماہیت کو متعین کرتے رہے ہیں اس اعتبار سے ہر دور میں محبت کے معنی متعین ہوتے ہیں اور یہ عمل خارجی اور داخلی عوامل کے عملی اور بین عمل سے ظہور پذیر ہوتا ہے محبت کے ان اجزاء کا جمع کرنا جو کہ ہر زمانے میں قابل غور رہے ہیں اور رہیں گے ایک مشکل مسئلہ ہے ہم اس کو ابدیت اس طرح دے سکتے کہ اس سے انسانی زندگی کو ہمیشہ سکون و آرام ملتا رہا ہے لیکن عمومی جز اس کے معنی کو متعین کرنے میں پوری طرح مدد نہیں کرتا ہے۔

غالب اور میر کا حوالہ دیتے ہوئے حمایت صاحب لکھتے ہیں کہ "عظیم شاعری دل و دماغ کے ایک معنوی ربط سے پیدا ہوتی ہے اور یہ ربط اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ ہماری نظر میں اپنا عہد اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ روشن ہو میری شاعری میں یہ پیچیدگیاں کسی نہ کسی حد تک اپنی جگہ بناتی ہیں۔" معاشرتی پیچیدگیوں کا ادراک، انکا شعور اور ان کی تحلیل ہی ایک فلسفہ اور ایک فکر کو جنم دیتے ہیں ان پیچیدگیوں کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان کی تہیں کھلتی جاتی ہیں تو نظر زیادہ گہری اور محیط ہوتی ہے وہ ان کے اندرونی رازکو پا جاتی ہے باقی ان کی سطحیت کو ہی سب کچھ سمجھ لیتی ہیں۔ "میں نے کوشش کی ہے کہ خیال مجرد طور پر کہیں میرے شعور کا موضوع نہ بنے بلکہ اس کی محسوس تشکیل میں میری صلاحیتیں صرف ہوں۔" شعر کا پھیکا پن اس وقت ظاہر ہوتا ہے جبکہ وہ سطحی جذبہ ہو اگر وہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تب اپنے لئے ایسا قالب ڈھونڈ لاتا ہے جو کہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتا ہے۔ سطحی نعرہ بازی مزدور اور غریب لوگوں کے ذکر کرنے میں اور ان کی زندگی کے دکھ اور درد کو صحیح طور پر سمجھنے کے بعد شاعری کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ اس فرق کو کیفی اعظمی اور فیض صاحب کے موازنہ سے سمجھ لیں جس کا نتیجہ مشکل ہے۔ فیض صاحب کے بجائے کیفی اعظمی کے مقابلے میں ساحر لدھیانوی کو لے لیں کو اثر آفرینی، نغمگی انداز بیان اور لفظوں کا انتخاب ساحر کے یہاں ہے، وہ کیفی اعظمی کے یہاں موجود نہیں ہے گوکہ دونوں ایک ہی مکتب خیال کے ہیں اس میں ان کی اپنی انفرادی صلاحیتوں کو بھی دخل ہے۔ فلسفہ زندگی کا ایک ہونا اور بات ہے اور اس کا سمجھنا اور برتنا اور چیز ہے۔

حمایت صاحب کی شاعری کو ان کے خیال کے مطابق تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے غم جاناں، غم وطن اور غم

کائنات۔ غم جاناں میں ذاتی غم موضوع شعر ہے لیکن سماجی زندگی کے رشتہ سے غم وطن، غم جاناں سے مختلف ہے اور نسبتاً تلخ، غم کائنات جس میں غم جاناں اور غم وطن دونوں شامل ہیں ان کی تخلیقات میں کہیں بے پناہ ضبط اور کہیں چیخ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔" میرے خیال میں غم کائنات جب ایک مرکب ہے غم جاناں اور غم وطن کا تو پھر اس کی الگ حیثیت مشکوک ہے غم کائنات کی شاعری ماورائی شاعری ہوتی ہے جو پوری کائنات کو اپنا موضوع بناتی ہے ایسی صورت میں کائنات کے غم میں جان اور وطن کا غم دب کر رہ جاتا ہے ضبط اور چیخ کو اگر ہمہ گیریت دی بھی جائے تو اسے غم دوراں کہہ لیجئے۔ غم کائنات جیسی چیز مجھے حمایت صاحب کی شاعری میں ابھی تک نہیں ملی (شاید آئندہ مل جائے)

حمایت صاحب کے نزدیک زبان بنیادی چیز ہے اور اس سے بے اعتنائی کے وہ شاکی ہیں ان کے نزدیک تخلیق کی ابدیت کا راز کی قید و بند میں پنہاں ہے نہ کہ بے راہ روی میں۔" نت نئے انداز کے وہ قائل ہیں لیکن "بے مقصد جدتیت" کے نہیں جس کا آج کل عام رواج ہے۔

موضوعات حسن و عشق میں وہ حقیقی محبوب کا ذکر کرتے ہیں "میرا محبوب وہی ہے جو کہ زندگی میں میرا محبوب ہے۔" روایتی عشق یا روایتی محبوب کا ذکر کہیں نہیں ہے انہوں نے، عشق کی ناکامی کا جواز سماجی حالات میں ڈھونڈا ہے اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ گھر کی روزانہ زندگی، اس کی مصیبتوں اور مسرتوں کا ذکر ان کی شاعری میں ہے بیوی کا تبسم اور بچوں کی ہلکی پھلکی شرارتیں ان سے شعر کہلواتی ہیں۔

حمایت صاحب کے لکھے ہوئے مضمون "میں اور میرا فن" کی روشنی میں ان کی شاعری کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے، اس وقت تک انکا صرف ایک شعری مجموعہ "آگ میں پھول" شائع ہوا ہے پچھلے دس سالوں میں انہوں نے بہت سی نظمیں اور غزلیں کہی ہیں اور کچھ نئے تجربات بھی کئے ہیں لیکن انکا بنیادی نقطہ نظر وہی ہے جو کہ "میں اور میرا فن" میں ہے۔

اس مضمون میں زیادہ تر بحث ان کے پہلے شعری مجموعہ کی روشنی میں کی گئی ہے "شعلہ بے درد" شعری مجموعہ کی پہلی نظم ہے اور ایک اچھی کوشش ہے فیض اور ساحر والا انداز صاف ظاہر ہے جو کہ اپنا ایک خاص اثر رکھتا ہے الفاظ کا انتخاب، معنویت اور اثر آفرینی پر خاص زور ہے، شعلہ بے دود میں محبت کے تاثرات، امارت و غربت کی جنگ ہے جس میں کہ فتح ہمیشہ امارت ہی کو رہی ہے غریب کو محبت کا صلہ صرف آنسو ملتے ہیں، اس میں عورت کی نفسیات کا بھی مطالعہ ہے۔

اس نے مجھ سے کہا تو کچھ بھی نہیں
مسکراہٹ نے اشک پی پی کر
اک تبسم تو اس کی بات ہی کیا
راز کتنے چھپائے کیا معلوم؟
میں نے ہنس کر جواب دے بھی دیا
آنکھوں آنکھوں میں دل کی دھڑکن نے
اور عورت کی کائنات ہی کیا
گیت کتنے سنائے کیا معلوم؟

آگے چل کر محبت کا یہ انجام ہوتا ہے

میں خلاؤں میں جھولتا ہی رہا
روپیہ روپے کو کھینچ گیا
(شعلہ بے دود)

دکھوں اور مصیبتوں میں انسان ایک ساتھی کی تلاش میں رہتا ہے، ''غم رائیگاں'' میں اسی کا ذکر ہے۔

دل کو ہر گام پر کسی دل کا
کسی انسان کی تلاش رہی
لوگ ملتے رہے بچھڑتے رہے
میرے کندھوں پہ میری لاش رہی
(غم رائیگاں)

ایسے عالم میں جب کوئی نہ مل سکے تو تخیل کے سہارے ہی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

ایسے عالم میں یوں بھی ہوتا ہے
خود کو انساں فریب دیتا ہے
کسی تخئیل کے سہارے ہی
زندگانی گزار لیتا ہے
(غم رائیگاں)

''ادھوری کہانی'' ہزاروں انسانوں کی کہانی ہے جہاں کہ زندہ رہنے کے لئے محبت کی امنگوں کو قربان کرنا پڑتا ہے جہاں کہ افلاس، آرزوؤں اور تمناؤں کے رنگ محلوں کو لمحہ بھر میں چکنا چور کر دیتا ہے لیکن پرخلوص محبت اس پر فتح پا لیتی ہے۔

تو دبے پاؤں چلی آئی میرے دل کے قریب
اور میں بھول گیا میری حقیقت کیا ہے
میں کہ افلاس میری جہد کا مسلسل کا صلہ
میری دنیا میں ترے پیار کی وقعت کیا ہے
بھوک کیا جانے کہ تعظیم محبت کیا ہے

○

تو کسی حال میں ہو ہنستی رہتی تھی سدا
تیری آنکھوں میں شکایت کا بھی مفہوم نہ تھا
تیرے ملبوس پہ پیوند ابھی ہیں کہ جو تھے
رنگ سنولائے چلا جاتا ہے چولہے کا دھواں
آنکھ کے گرد سیاہی بڑھی جاتی ہے
کھا گیا تیری جوانی کو ترا سوز نہاں
کتنا بے درد ہے، بے رحم نظام دوراں
(ادھوری کہانی)

"غم حاصل" میں شاعر کہتا ہے کہ غم زیست کی فکر سے عشق کا نشہ ہرن ہوچکا ہے اور خوابوں کا تاج محل مسمار ہوچکا ہے اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر راہ گزر پر اجل انتظار کر رہی ہے زندگی میں اگر آسائش کا ایک لمحہ نہ ہو تو ایسی زندگی کسی کام کی'

"غم فردا" میں شاعر اداس بیٹھی ہوئی ماں سے کہہ رہا ہے کہ بیٹا تمہاری اس اداسی سے خائف ہے تم اس کے لئے کیوں فکر مند ہو؟ آج حالات ٹھیک نہیں تو کیا ہوا ممکن ہے کل ایسا ہوجائے کیونکہ

ہر ایک زنجیر کٹ رہی ہے
بساط عالم الٹ رہی ہے
یہ بات ممکن ہے اپنی آنکھیں نہ دیکھ پائیں "صبح فردا"

مختلف نظموں کے بند پیش کر رہا ہوں تاکہ ان کے مطالب کا اندازہ ہوسکے۔

ہر قلب کی رگ رگ کو نچوڑا برسوں
جو ظلم بھی تھا بس میں نے چھوڑا برسوں
فطرت نے خود انساں کی عظمت کے لئے
انسان کی غیرت کو جھنجھوڑا برسوں
(عظمت آدم)

قدرت کی حقیقت کا ملا جب بھی سراغ
ہر عکس سے عکس رخ آدم ابھرا
(سراغ)

یہ انساں' ہند کے آزاد انساں
جھکے شانے' فسردہ رخ' نظر چپ
سنائیں کس کو آہوں کا فسانہ
خدا چپ' ناخدا چپ' بحر و بر چپ
اجنتا کا نظارہ کرنے والو
اجنتا سے یہ آبادی سوا ہے
اجنتا پتھروں کی زندگانی
یہ بستی زندگی کا بت کدہ ہے
(زندگی اور پتھر)

"منظر و پس منظر" میں ایک دکان کی منظر کشی ہے جس کے شوکیس میں ساڑھیاں سجی ہوئی ہیں ایک غریب عورت ان ساڑھیوں کو دیکھتی ہے اور اسی وقت ایک دوسری عورت کار میں آتی ہے اور اس دکان میں داخل ہوجاتی ہے۔

یہ تجارت یہ ارتقا کا کمال
کائنات اک دکاں پہ سر بہ سجود
ایک شو کیس ایک اک زنداں
بر اعظم سے تا بہ برصغیر

کچھ نہیں فکر بہ جز نان جویں، نان جویں
(مہاجر بستیاں)

وہ کھڑی دیکھتی رہی چپ چاپ
زندگی کے نشیب اور فراز
کاخ محمود سے ہے کتنی دور
گرد آلود در راہگزر ایاز
(منظر و پس منظر)

جہل زندہ ہے تو رسوا ہی رہے گی تہذیب
بھوک زندہ ہے تو بکتے ہی رہیں گے اجسام
(نیپئر روڈ)

"خوش بخت" والا مسئلہ آج بھی اسی طرح الجھا ہوا ہے جس طرح کہ آج سے تیس سال قبل تھا باہر سے آئے ہوئے لوگ جنہیں آج بھی مہاجر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آخر کہاں جائیں؟

نظروں سے ہوئے دور نظر میں آکر
منزل ہوئی معلوم سفر میں آکر
تاریخ میں ہوگا کوئی ہم سا خوش بخت
بے گھر ہوئے ہم اپنے ہی گھر میں آکر
(خوش بخت)

"اجنبی مہمان" جن حالات میں لکھی گئی تھی آج کے حالات ان سے قدرے مختلف ہیں آج ہم انکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتے ہیں پہلے تو وہ جو چاہتے تھے ہم سے کروا لیتے تھے شاید اب ایسا نہیں...!

"عوام" نظم میں صرف ایک مصرعہ ہے

رات سورج کو نگل سکتی ہے تاروں کو نہیں

بات بڑی معنی خیز ہے لیکن شاعرانہ انداز محل نظر ہے رات کبھی بھی سورج کو نہیں نگل سکتی وہ تو سورج کے چھپنے کے بعد آتی ہے غزل کے چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کس سے دل کی بات کہیے جس پہ پڑتی ہے نظر
اس کا چہرہ بول اٹھتا ہے خود اپنے دل کی بات

ان کی جو راہ تھی وہ اسی پہ چلا کیے
ناداں تھے ہم، چلے جو انہیں رہنما کیے

اہل دل، اہل خرد، اہل نظر سب سو گئے
سب کو بیداری کا دعویٰ تھا مگر سب سو گئے
صبح کی خاطر رہے جو رات بھر مشغول بحث
ایسی نیند آئی کہ ہنگام سحر سب سو گئے

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میر کارواں یارو! میر کارواں یارو
صرف زندہ رہنے کو زندگی نہیں کہتے
کچھ غم محبت ہو، کچھ غم جہاں یارو

چمن میں رہ کر مرا حال پوچھنے والو
کیوں ہوگئی اے شمع تری بزم سخن چپ
قفس میں صرف اندھیرا ہے اور تنہائی
دل چپ ہے، نظر چپ ہے، قلم چپ ہے، دہن چپ
کوئی تو بات تھی ہم کو ملا جو رتبہ دار
نعرہ نہ سہی، چیخ سہی، کچھ تو ہو یارو
وگرنہ موت کا شاعر ہے کوئی شیدائی
بیٹھے ہیں بڑی دیر سے ارباب وطن چپ

بنگال سے کوریا تک، ان کی بہت اچھی اور نمائندہ نظم ہے یہ ایک طویل نظم ہے جس کے ۱۲ حصے ہیں جن کے مختلف عنوانات ہیں لیکن معنوی اعتبار سے سب مربوط ہیں اور ایک خیال کو پیش کرتے ہیں اس میں حمایت صاحب نے مسلسل غزل کی تکنیک استعمال کی ہے جس کی وجہ سے اس میں ایک خاص حسن واثر پیدا ہوگیا ہے یہ کہانی یک سپاہی کی یادداشت کے طور پر ابھرتی ہے جو کہ جنگ سے اپنے گاؤں واپس آتا ہے ایک ایک کرکے تمام واقعات ذہن میں اجاگر ہوتے ہیں بنیادی طور پر "بنگال اور کوریا" رمزی طور پر آئے ہیں، بنگال قحط کا اشارہ ہے اور کوریا جنگ کا! بنگال ایک ایسا مقام ہے جو جنگ سے دور رہ کر بھی اتنا ہی تباہ ہوسکتا ہے جتنا کہ کوریا۔ شاعر کو جنگ سے نفرت ہے اور اس کی جلو میں کیا کچھ ہوتا ہے اور اس کے بعد کیا گزرتی ہے اس نظم میں یہ سب کچھ ہے، اس طویل نظم کے مختلف حصوں سے اقتباسات پیش کررہا ہوں۔

ہم میں کیا دشمنی ہے جس کے لئے
خوں اگلتا ہے جنگ کا میداں
زندگی کے سبھی ہیں شیدائی
میں بھی انساں ہوں وہ بھی ہیں انساں
(آگ میں پھول)

سوچتا تھا کہ میری غربت نے
اپنا سب کچھ لٹا کے کیا پایا!
ایک خوش حال زندگی کے لئے
جنگ کے کام آکے کیا پایا!
(حاصل غم)

کس نے دی زندگی کو یہ سوغات
کیسی دنیا ہے آدمی کو قبول
جس میں انساں ہیں بد تر از حشرات
یہ ہے کیسا نظام زیست کہ جو
چوس لیتا ہے آپ خون حیات
(اپنا گھر)

جھونک کر مجھ کو جنگ کے منہ میں
سارے گھر کر نگل چکی تھی بھوک
(اپنا گھر)

شاعر ہر نئے بنگال اور نئے کوریا کا مخالف ہے اور اس کی اس آواز میں جیسے دنیا کا ہر شخص شریک ہے۔

پچھلے دس برس میں حمایت صاحب نے کئی کامیاب نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں جیسے "دوش و فردا" "فریب آگہی" جواب، سمندر اور انساں، وغیرہ حالیہ ستمبر کی جنگ سے متاثر ہوکر انہوں نے ایک بہت ہی اچھی اور پر اثر نظم "لہو" لکھی جو کہ بہت مقبول ہوئی ان کی نظموں اور غزلوں میں وہی انداز ہے جو کہ "آگ میں پھول" میں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تجربات میں گہرائی اور انداز میں گیرائی بھی آتی جارہی ہے وقت کے ساتھ ساتھ ان کا فن بھی نکھر رہا ہے۔

ان کی نظم "جواب" (ٹیگور کا خیال) میں ان کی ایک پہلی نظم "عوام" کا تسلسل پایا جاتا ہے سورج کو یہ غرور تھا کہ اسی کے دم سے دنیا میں روشنی ہے اور جبکہ وہ جارہا ہے دنیا پھر تاریکی میں ڈوبے گی، اس وقت......

سورج یہ کہہ کے جا ہی رہا تھا کہ اک دیا
چپکے سے جل اٹھا اور اسے دیکھنے لگا

یہ شعر عوامی قوتوں کی طرف اشارہ ہے اور میرے خیال میں یہ ان کی پہلی نظم کی نسبت زیادہ واضح ہے۔
جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ حمایت صاحب نے ایک نیا تجربہ کیا ہے یہ تین مصرعوں والی نظم ہے جسے "ثلاثی" کہتے ہیں جوکہ ہم چار مصرعوں والے قطعات یا رباعیوں سے آشنا ہیں اس لئے یہ کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسے پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کچھ باقی رہ گیا ہو لیکن حمایت نے بعض نظموں میں مفہوم کو بڑے خوبصورت انداز میں ادا کیا ہے۔

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے شب میں سورج کہاں نکلتا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

کوئی فرمان اے رب جلیل کچھ بھی نہیں ہے فرق سفید و سیاہ میں
ذہن کے غار حرا میں کب سے ہے پھوٹی ہے جب بھی کوئی کرن، رات ہو کہ دن
فکر...... محو انتظار جبریل سائے نکل پڑے ہیں اجالے کی چاہ میں

حمایت صاحب سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں جس محنت اور خلوص سے وہ اپنے فن کو پروان چڑھا رہے ہیں اس سے ہمیں امید ہے کہ اردو ادب کو ان سے اور بہت کچھ ملنے والا ہے۔

(مطبوعہ "نئی قدریں" ۔ شاعر نمبر ۱۹۶۷ء شمارہ نمبر ۴)

(بقیہ = داستان رنگ و ہنگ کا شاعر۔ شاہدہ حسن)

ان تمام مختلف ہیئت کی تخلیقی کاوشوں کے مجموعی اور مربوط مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حمایت علی شاعر کا شعری وجدان بطور خاص ان مشاہدات اور مظاہر سے پرواز کی قوت حاصل کرتا ہے جو احساس و فکر، دونوں سطحوں پر انہیں پوری قوت سے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اس پرواز کی اصل قوت یہ ہے کہ ہر لمحہ زندگی کا مختلف زاویوں سے مشاہدہ کرنے والی آنکھیں کسی خواب کی سحر انگیزیوں میں گم رہنے سے زیادہ، حقائق و کشاکش حیات کی پرخار راہوں پر زخمی پیروں سے چلتے رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ زندگی سے مسلسل ربط و تعلق اور اس کے رویوں کی ہر سفاکی پر دل ہی دل میں مسکراتے رہنا ان کے وجدان کے بھرپور ہونے کا ثبوت ہے۔

(۱۳ اکتوبر ۹۴ء کو "شام ہمدرد" میں پڑھا گیا جب ہمدرد فاؤنڈیشن کی طرف سے حمایت علی شاعر کو "وثیقہ اعتراف" پیش کیا گیا)

جدید نسل کا ایک نمائندہ شاعر

عثمان عرفانی

کسی ایسی شخصیت اور اس کے فن کے بارے میں کچھ کہنا جس کے پڑھنے اور سننے والوں کا ایک مستقل حلقہ ہو اور جو روز بروز وسیع تر ہوتا چلا جارہا ہو بہت ہی مشکل کام ہے تاہم کسی بھی فن کار کی شخصیت اور اس کے فن کے تجزیے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تخلیقی کام کے ساتھ ساتھ اس کے ماحول اور عملی زندگی کا جائزہ لیا جائے۔

جدید نسل کے جس نمائندہ شاعر کا میں ذکر کرنے جارہا ہوں وہ ۱۹۳۱ء میں اورنگ آباد (دکن) کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا جو بیک وقت انعام دار بھی تھا' زراعت پیشہ بھی اور ملازمت پیشہ بھی۔ زندگی کی ان مختلف النوع مشغولیتوں کے طفیل وہ شعور کی عمر کو پہنچنے تک جن نشیب و فراز سے گزرا اس کے تلخ و شیریں عوامل سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کے سینے میں ایک ایسی آگ دہکنے لگی جو اگر شاعر کا روپ نہ دھار لیتی تو کسی اور زاویہ سے لاوا بن کر پھوٹتی چنانچہ یہی وہ آگ تھی جس کی بدولت اور یہی وہ وقت تھا جب اس نے شعر کہنا شروع کیا۔

وہ ایک ترقی پسند شاعر ہے لیکن ترقی پسند اور جدید ہونے کے باوصف بھی وہ شاعری کے روایتی آداب اور حدود کا التزام ضروری سمجھتا ہے۔ زبان و بیان کے بارے میں بھی وہ کبھی بے اعتنائی نہیں برتتا۔ وہ مروجہ زبان میں نت نئے الفاظ شامل کرنے اور نت نئے انداز بیاں کی طرف توجہ دینے کا حامی ہے۔ لیکن بے مقصد جدیدیت کا جس کا آج کل عام رواج ہے۔ قائل نہیں۔ وہ الفاظ کے دروبست میں اسلوب کی قدرت اور خیال کی شیرازہ بندی میں اس رکھ رکھاؤ کا پابند ہے۔ جس سے اردو زبان کا مزاج عبارت ہے۔ ہمارے بیشتر شعراء آج جس شاعری کو ترقی پسند یا جدید یا آزاد کہتے ہیں۔ وہ شاعری کی نسبت نثر سے زیادہ قریب ہے۔ حالانکہ شعر بھی انہیں الفاظ سے ترتیب پاتا ہے۔ جن سے نثر۔ پھر کیا وجہ ہے کہ شعر نثر سے زیادہ اثر آفریں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شعر اگرچہ انہی الفاظ سے ترتیب پاتا ہے لیکن الفاظ کی نشست و برخاست اور ان کی ایک مخصوص سانچے میں ترتیب ہی دراصل وہ چیز ہے جس سے نغمگی جنم لیتی ہے اور جب کوئی خیال' کوئی پیغام اپنی تمام تر افادیت کے ساتھ نغمگی کے آہنگ کے ساتھ پیش کیا جائے تو سننے یا پڑھنے والوں کے دلوں پر راست اثر انداز ہوتا ہے۔

میرے اس دعوے کی دلیل آپ کو اس سے بھی ملے گی کہ صوفیائے کرام کے ہاں جو سماع کا سلسلہ ہے وہ بھی دراصل اس اثر کے پیش نظر ہے خود قرآن کریم کی آیات میں بھی ایک نغمگی ہے جو سحر آفریں حیات آفریں ہے۔ ہندو مذہب میں تو اس نغمگی کے حصول کے لئے موسیقی عبادت کا ایک اہم جز ہے۔ پھر آپ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے کہ جب کوئی فوج لڑائی کے میدان میں جاتی ہے تو ہر شخص اپنے ذہن میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ موت کے منہ میں جارہا ہے۔ لیکن اس کے آگے آگے جو بینڈ نغمے سناتا جاتا ہے۔ اس سے ان جوانوں کے حوصلے بلند اور قدم تیز ہوجاتے ہیں ان میں ایک ایسا جوش ایک ایسا

ولولہ پیدا ہوجاتا ہے کہ موت کا کوئی خوف ان کے دلوں میں باقی نہیں رہتا۔
شعر کی جس صنف کو "نظم" کا نام دیا گیا ہے اس کی ہیئت اور تنظیم ہی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اس میں ایک ایسا نظم اور ضبط ہونا چاہئے جیسا کہ فوج کے دستوں میں ہوتا ہے کہ جب وہ چلتے ہیں تو ان کے قدموں سے ایک نغمگی پیدا ہوتی ہے۔ دکن میں تو فوج کے دستے کو اسی لئے "نظم جمیعت" کہتے ہیں۔
پس جو شاعری مخصوص قواعد کی پابند نہ ہو نغمگی اور سحر انگیزی سے خالی ہے۔ اور الفاظ کا تانا بانا اگرچہ وقتی طور پر کسی ایک خیال، کسی ایک قصے کی ترجمانی تو کردیتا ہے، لیکن دیرپا اثر نہیں چھوڑتا۔ جیسا کہ بقول ایک شاعرہ کے "الفاظ تو طوطے ہوتے ہیں جو اڑ جاتے ہیں" لیکن اگر ان "طوطوں" کو آداب اور قواعد کے پنجرے میں بند کردیا جائے تو پھر یہ "طوطے" اڑنے نہیں پاتے۔ طاہر احمر اپنے مضمون "جدید شاعری کا المیہ" میں لکھتے ہیں۔
"دراصل شاعری صرف الفاظ کے دریا بہانے کا نام نہیں۔ اگرچہ ان کی توانائی اور فیاضی کے بغیر حسین شاعری ناممکن بھی ہے لیکن الفاظ کے نپے تلے استعمال اور شعوری اظہار کے بغیر محض الفاظ بے اثر ہیں۔"
شعر کو چونکہ زندگی سے گہری وابستگی حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا مطمح نظر انبساط روح و قلب ہونا چاہئے نہ کہ علمیت اور نحت دانی کا اظہار۔ چنانچہ ادب میں جب بھی یہ کوشش کی گئی اس کی افادیت ختم ہوکر رہ گئی۔
اس شاعر کا پہلا مجموعہ کلام "آگ میں پھول" جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ ۲۴ نظموں، ۷ غزلوں، ۸ رباعیوں اور ایک افسانوی نظم "بنگال سے کوریا تک" پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ایسا تو نہیں جس سے وہ بلند قامت شاعر کے روپ میں نظر آتا ہو۔ البتہ کہیں کہیں ایسی علامتیں ضرور پائی جاتی ہیں جن سے مستقبل میں اس کے ایک بلند قامت شاعر ہونے کے امکانات روشن ہیں۔ اشعار دیکھئے۔

اشک ۔ دل کے مزار کی شمعیں
اشک ۔ طغیانیوں کا ساکت جوش
اشک ۔ تابوت مسکراہٹ کے
روش مژگاں پہ منجمد خاموش

اشک جن کے خنک شراروں نے
میری رگ رگ میں آگ دوڑا دی
آگ ۔ لاشوں کے قلب کی دھڑکن
آگ ۔ پیہم سکوت کا طوفان

ہر گناہ عظیم کے پیچھے!
کس خدا کا ہے دست کار دراز
(شعلہ بے دود)

دل کو ہر گام پہ کسی دل کی
کسی انسان کی تلاش رہی!
لوگ ملتے رہے بچھڑتے رہے
میرے کندھوں پہ میری لاش رہی
(غم رائیگاں)

چل کہ جن چہروں سے بڑھ جاتی ہے تیری وحشت
وہی چہرے ہیں مرے دل تیرا عنوان حیات!
(آخر شب)

اور اک لمحہ بے فکر بھی ہم نہ پاسکے
زیست کو زیست کا آئینہ بھی دکھلا نہ سکے
(ادھوری کہانی)

زمانہ جوں جوں گزر رہا ہے
ہر ایک زنجیر کٹ رہی ہے
بساط عالم الٹ رہی ہے
یہ بات ممکن ہے اپنی آنکھیں نہ دیکھ پائیں وہ صبح فردا
مگر نہ ننھا بچہ جس نے ابھی ابھی پاؤں چلنا سیکھا
تمہارے چہرے سے ڈر رہا ہے
(غم فردا)

صبح ہوتے ہی چیخ پڑتے ہیں قبروں کے دہن
اپنے مسکن سے نکل آتا ہے لاشوں کا ہجوم
(مہاجر بستیاں)

سکوت موج میں مضطر ہیں سینکڑوں طوفاں
تہہ سکوت کی طغیانیوں کو موت نہیں
(مزار قائد پر)

اجنتا...... پتھروں کی زندگانی
یہ بستی...... زندگی کی بت کدہ ہے
(زندگی اور پتھر)

شاہراہوں کے خشک کھیتوں میں
ابن آدم کی فصل ہے تیار!
(اجنبی مہمان)

رات سورج کو نگل سکتی ہے.... تاروں کو نہیں
(عوام)

طویل افسانوی نظم ”بنگال سے کوریا تک“ میں مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے۔

پتھروں کی رگوں میں کھولتی آگ
زندگی کے لہو کا نقطہ جوش
بھوک کی آگ اتنی تیز ہوئی
رہ گیا گل کے پتھروں کا شباب
دم بدم ڈوبتی ہوئی نبضیں!
دم بدم تیز سوچ کی پرواز
جیسے طے کر چکا ہو قبرستان
زندگی جیسے عرصہ سکرات
گودیوں میں ہمک رہے تھے گناہ

کوئی محمود تو رہا محمود!
ہم ایازوں کو کیا ملا آخر!
زندگی کے غرور کی معراج
چند لمحوں کی شان دارائی
کانپ جاتا ہوں جب کوئی انگشت
سوئی میں کوئی گل پروتی ہے
ایک سورج کی موت میں مضمر
کتنی کرنوں کی موت ہوتی ہے۔
(بنگال سے کوریا تک)

یہ تھے چند وہ اشعار جو اس کے ایک بلند قامت شاعر ہونے کے امکانات کا اظہار کرتے ہیں چنانچہ ۱۹۵۶ء کے بعد سے اب تک اس شاعر نے جو تخلیقات پیش کی ہیں اس میں سوچ اور فکر کے نئے نئے زاویے نمایاں ہوئے ہیں اس نے نئے نئے تجربے کیئے ہیں اور جس نے اسے واقعی ایک قد آور شاعر بنا دیا ہے کیونکہ شاعر حقیقی معنوں میں وہ ہوتا ہے جو ظاہری حسن اور روحانی مفہوم دونوں سے آشنا ہو کر اس کے اسرار و رموز ہمارے سامنے اس انداز میں پیش کرے کہ ہمارے قلوب کی آنکھیں روشن ہو جائیں اور ہم بھی ان رازوں کو شاعر کے ساتھ ساتھ بے نقاب دیکھ سکیں اور کائنات میں حسن و عجائب کے جو خزانے مضمر ہیں ان کی تلاش کی طرف متوجہ ہوں۔ ہم کائنات کے حسن اور رازوں سے ہر وقت مبہم طور پر متاثر تو رہتے

ہیں لیکن جب شاعر اپنی معجز بیانی سے اور تصویر کشی سے ان پردوں کو ہٹاتا ہے تو اس اثر کی گرفت مستحکم ہو جاتی ہے اور ان معنوں میں ہمارا یہ شاعر پورے طور پر کامیاب نظر آتا ہے۔

اس مجموعہ میں افسانوی نظم کے علاوہ تین طویل نظمیں ہیں۔ ورنہ عام طور پر وہ مختصر نظمیں کہتا ہے۔ جو ایک خوبی ہے اس لئے کہ جب ایک خیال کی تصویر کشی مکمل ہو جائے تو فالتو الفاظ کی بھرمار سے نظم کا تاثر زائل ہو جاتا ہے اور الفاظ یوں بھی ایسی چیز نہیں جن کو ضائع کردیا جائے طویل انداز صرف، وہ لوگ اختیار کرتے ہیں۔ جنہیں اپنے مافی الضمیر ادا کرنے پر قدرت حاصل نہ ہو۔ جیسا کہ طاہر احمر اپنے مضمون "جدید شاعری کا المیہ" میں رقم طراز ہیں۔

"الفاظ کے ثقیل اور بے مصرف پوٹلے شاعری کی جان نہیں۔"

"اچھی شاعری الفاظ کی گنتی نہیں بلکہ دل کی دھڑکنوں سے عبارت ہوتی ہے اور اس کو کم سے کم الفاظ چاہئے۔"

ممکن ہے ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کو یہ بات اچھی نہ لگے۔ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ نظم جب تک طویل نہ ہو نظم ہی نہیں۔ اختصار تو ان کے ہاں ایک خامی ہے۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک مضمون "شاعری اور پوئٹری" میں فرماتے ہیں کہ "مغرب کے شاعر بیس بیس ہزار شعروں کی نظمیں کہتے ہیں۔ جب کہ مشرق کا فن چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا ہے۔"

قطعہ نظر اس حقیقت کے کہ ہمارے یہاں ادب و شعر کی ترویج کے جو محدود ذرائع ہیں اور وہ کس حد تک اس طوالت کے متحمل ہوسکتے ہیں۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جو پیغام آپ بنی نوع انسان کو دینا چاہتے ہیں وہ محض آپ کی طوالت پسندی کے طفیل اگر اشاعت نہ پاسکے تو ایسی صورت میں شعر یا شاعر کی افادیت کیا ہوگی۔ پس ہمارے اپنے مخصوص سماجی اور معاشرتی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی ضروری ہے کہ اختصار کے ساتھ شاعر اپنی بات بطریق احسن کہہ دے۔ تاکہ اس کا تاثر بھرپور اور دیرپا ہو۔ اور یہی فن ہے۔ گو بقول طاہر احمر "اب بھی پرانی پرانی لکیریں پیٹنے والے اس بات پر مصر ہیں کہ بات طویل اور خطیبانہ ہونی چاہئے۔"

یہ شاعر ریڈیو پر ڈرامے، فیچر، گیتوں بھری کہانیاں، نغمے، ترانے، قومی نظمیں وغیرہ لکھتا ہے صداکار بھی ہے۔ مشاعروں میں بھی جاتا ہے۔ کالج میں پڑھاتا بھی ہے۔ خود پڑھتا بھی ہے فلموں کے لئے نغمات بھی لکھتا ہے۔ اتنا کچھ کرنے کے باوجود وہ دوستوں کی محفلوں میں بھی بیٹھتا ہے۔ ان کے مسائل میں دلچسپی لیتا ہے۔ ان کے غم اپناتا ہے۔ انہیں اپنی خوشیوں میں شریک کرتا ہے اور ان سب پر مستزاد یہ کہ کوئی عالم ہو سوچتا ہے وہ عملی زندگی میں جس طرح جدوجہد کا قائل ہے اپنی ادبی زندگی میں بھی اسی جدوجہد کا حامی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ادب میں اس کی ذات ایک منفرد حیثیت کی حامل ہو۔ اس کی تخلیقات ایک ایسی آفاقیت کی حامل ہوں جو حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہوں اور اس کا ثبوت آپ کو اس کی اس نظم سے ملے گا جس کا عنوان ہے "شاعری پیغمبری" ملاحظہ فرمایئے۔ "وہ شاعری جزویست از پیغمبری" نہیں کہتا بلکہ یقین محکم کے ساتھ کہتا ہے۔

"شاعری پیغمبری"

پھر کوئی فرمان آئے رب جلیل
ذہن کے غار حرا میں کب سے ہے
فکر محو انتظار جبرئیل

شاعر نے اس نظم میں ہیئت کے اعتبار سے ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ تین مصرعوں کی مختصر نظم جو اپنی ہیئت کے اعتبار سے بھی قواعد کے التزام کے ساتھ باعتبار فن ایک مکمل نظم ہے۔ اور بھرپور تاثر چھوڑتی ہے۔ آج تک کسی نے نہیں کی۔ پھر جن علامتوں کو اس نے استعمال کیا ہے ان کے لوازمات کا بھی پوری طرح سے خیال رکھا ہے۔ "فرمان" "رب جلیل" "غار حرا" اور "جبرئیل" کا جو رشتہ ہے اس کو اس نے اپنی علامتی نظم میں برقرار رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ غار حرا میں رب جلیل کی طرف سے جو فرمان نازل ہوا۔ وہ جس طرح ایک محکم حیثیت رکھتا ہے شاعر ادب میں بھی اسی قسم کے محکم فرمان کا متمنی ہے۔ یہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی روح اور فکر کس قدر بیتاب ہے کہ وہ ادب میں ایک ایسے (فرمان) شاہکار کی تخلیق کرے جو محکم ہو' اور یہی وہ وجہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر لمحے غور و فکر کرنے کا عادی ہے۔ کوئی عالم ہو کوئی مقام ہو' کوئی کام ہو وہ سوچتا ہے اور اس میں انوکھے زاویے پیدا کرتا ہے۔ اس کے بال بڑے بڑے ہیں۔ جنہیں وہ ہر لمحہ ہاتھ سے سنوارتا رہتا ہے۔ لیکن ہوا ہر لمحہ انہیں پریشان کرجاتی ہے۔ اور وہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اس کی فکر پرواز کرتی ہے۔

حضرت علی کا قول ہے "عرفت ربی بفسخ العزائم" (میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا) یعنی یقیناً کوئی ایک بلند و بالا قادر مطلق ہستی ایسی ہے جو انسانی عزائم کو توڑ کر اپنی قدرت کا اظہار کرتی ہے۔ چنانچہ جب شاعر دیکھتا ہے کہ باوجود اس کے بار بار سنوارنے کے ہوا اس کے بالوں کو پریشان کرجاتی ہے تو وہ ہوا کے متعلق سوچتا ہے اور یہ سوچ یہ فکر اس سے "ہوا" جیسی نظم تخلیق کرواتی ہے ملاحظہ فرمائیں۔

ہوا

جو دور رہ کر بھی نزد جاں ہے
نفس نفس میں رواں دواں ہے
ازل سے محو سفر ہے اب تک
حیات کی رہ گزر ہے اب تک
لطیف اتنی کہ یاد یاراں
کثیف اتنی کہ بار دوراں!

ہر ایک راز دروں کی محرم
کوئی تغیر ہو ایک عالم!
ہزار انداز سے عیاں ہے
مگر ہر اک آنکھ سے نہاں ہے
کبھی گماں ہے کبھی یقیں ہے
کہیں یہی تو خدا نہیں ہے

شاعر نے جب یہ کہا کہ "کہیں یہی تو خدا نہیں ہے" تو اس میں گو ایک تشکیک کا پہلو پایا جاتا ہے لیکن جن صفات کو اس نے ہوا کے ساتھ متعلق کیا ہے وہ سب صفات خدا کی ہیں اگرچہ آپ دیکھیں گے کہ ہوا کی از خود بھی یہی صفات ہیں اور یہ شاعر کے فکر اور فن دونوں کا کمال ہے کہ اس نے کوئی بات ایسی نہیں کہی جو کسی ایک کی تنقیص کرتی ہو۔

اس کی اس نظم سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ کوئی مذہبی آدمی ہے لیکن ہاں مذہب سے دور بھی نہیں۔ اس لئے کہ اس کے دل میں وہ احساس اور درد موجزن ہے جو انسانیت کی اعلیٰ ترین قدروں کا حامل ہوتا ہے اور مذہب جس کا علمبردار ہے۔

یوں بھی شاعر کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس کا مذہب کائنات اور انسانیت ہوتا ہے اور انسانیت کا یہی درد اسے ہر کروٹ ہر قدم پر بے چین رکھتا ہے لہٰذا راستہ چلتے جب اس کے قدموں سے ٹکرا کر کوئی پتھر لڑھک کر سڑک کے دوسرے کنارے پر جا پڑتا ہے تو وہ اس پتھر کو نظر انداز نہیں کرتا۔ بلکہ سوچتا ہے وہ اس پتھر کو ایک انسان کے روپ میں دیکھتا ہے۔ اور پھر "پتھر" جیسی نظم کہتا ہے۔

پتھر

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

انسانی ہستی کا اس سے زیادہ مکمل تجزیہ ممکن ہی نہیں۔ محبت یا عقیدت عرصہ زیست میں کارفرما ہو کر انسانی ہستی کو جو درجہ جو روپ عطا کرتے ہیں۔ اس کے بغیر انسان محض پتھر ہے۔

یہاں پر وہ انسان کو ایک درس دیتا ہے کہ وہ اس عرصہ زیست میں جدوجہد کر کے اس قابل بن جائے کہ یا تو وہ "صنم" بن جائے یا "خدا" ورنہ وہ راستے کے ایسے پتھر کی مانند ہے جسے مسافروں کی ٹھوکروں سے کبھی ادھر لڑھک جانا پڑے گا اور کبھی ادھر۔

عقیدت اور محبت کی جن علامتوں کو شاعر نے اپنی نظم میں استعمال کیا ہے اس میں محبت سے مراد بنی نوع انسان سے ہمدردی، بھائی چارگی نوع انسانی کے دکھ درد کا مداوا اور وفاداری ہے، اور عقیدت سے مراد وہ عظیم الشان کارنامے ہیں جو قوموں کی زندگیوں کو نئے موڑ عطا کرتے ہیں۔ وہ قربانیاں ہیں جن سے قوم و ملت کے عروج کے محل پنپتے ہیں۔ اور اگر یہ کچھ نہ ہو تو پھر انسان کی حیثیت ایک ایسے پتھر کی سی ہے جو راستے میں ٹھوکریں کھائے یا کسی مزار پر نشان کے طور پر رکھ دیا جائے۔ یہاں پر میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے ایک مضمون کا حوالہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے مضمون "شاعری میں سمبلزم کی تحریک" میں علامتی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "ان میں سے ایک صورت تو کرخت حقائق سے دامن بچا کر خواب کی سی طلسمی فضا میں بہہ نکلنے کی روش ہے چنانچہ یہ شاعری تکرار اور تقلید کی نذر ہو کر اپنی جاذبیت گنوا بیٹھی اور اب تقریباً" ختم ہو چکی ہے۔ دوسری طرف اردو میں آج کل جس علامتی شاعری کا آغاز ہوا ہے اس میں زبان و بیاں کی ناپختگی سب سے پہلے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، بیشتر علامتی نظمیں کہیں درمیان میں سے شروع ہوتی ہیں اور راستے کے کسی موڑ پر رک جاتی ہے۔ ان میں آغاز انجام کلائمکس (نکتہ عروج) کی ان خصوصیات کا قطعی فقدان ہے جو نظم کی فنی تکمیل کے لئے انتہائی ضروری ہیں اس کے علاوہ ان نظموں میں روح کی کسک موجود نہیں۔

تیسری اور آخری صورت ان خوبصورت نظموں کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو اردو زبان میں بڑے التزام کے ساتھ لکھی جا رہی ہیں اور جن میں محض ذات کا انکشاف ہی نہیں بلکہ خارج کی دنیا سے شاعر کا تعلق بھی قائم نظر آتا ہے۔ اگرچہ جہاں تک سمت کا تعلق ہے یہ نظمیں علامت پسندی کے رجحان سے متاثر ہیں۔ تاہم چونکہ ان نظموں نے خارج کی دنیا سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا۔ اس لئے انہیں خالص علامت پسندی کی تحریک سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظمیں تو تخلیقی فن کی اس بڑی تحریک سے وابستہ ہیں جو زمانوں کے آغاز سے اب تک جاری ہے اور جو زمان و مکان سے متاثر ہوتے ہوئے بھی ابدی کیفیت کی حامل ہے۔

یہی وہ تیسری صورت ہے جو اس شاعر کا طرہ امتیاز ہے اس لئے کہ جس فکر، سوچ اور درد سے وہ نظم تخلیق کرتا ہے۔ وہ یقیناً" آفاقیت کی حامل ہے، اور یہی وہ شاعری ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کے دل میں اپنی نوع کی بہبود کا کس قدر درد ہے۔ جس کا اظہار وہ شعروں کے ذریعہ کرتا ہے۔ وہ خارج سے متاثر ہو کر اپنی ذات پر اس طرح وارد کرتا ہے کہ قطعی داخلی

گمان ہوتا ہے۔ جو صرف ایک حساس دل اور حقیقی معنوں میں شاعر ہی کر سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص لیموں کھا رہا ہو تو بعض اوقات دیکھنے والا خواہ مخواہ اپنے منہ میں پانی محسوس کرتا ہے۔ وہ دانت کچکچاتا ہے اور ایک جھنجھناہٹ کے ساتھ اس کی کھٹاس کو محسوس کرتا ہے۔ حالانکہ وہ لیموں نہیں کھا رہا ہوتا۔ لیکن چونکہ وہ ایک حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے اور خود اس کے ذائقے سے آشنا ہوتا ہے اس لئے وہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ بالکل یہی حالت اس شاعر کی ہے وہ کسی کے درد کو نہیں دیکھ سکتا اور دیکھتا ہے تو خود پر وارد کرلیتا ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے کہ اس نے زندگی کے نشیب و فراز سے ایسے تلخ و شیریں ثمر چنے ہیں کہ جن کا ذائقہ آج بھی اس کی زبان ادراک پر تازہ ہو جاتا ہے جب وہ کسی کو ان تلخ و شیریں لمحات سے دوچار ہوتے دیکھتا ہے وہ بے چین ہو جاتا ہے اور اس کا شعور اس کا ادراک اور وجدان اس سے نظم کہلوالیتا ہے۔ جو ماحول اور معاشرے کے ان تلخ و شیریں عوامل کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے اور مرہم بھی۔

اسے اپنی ذات کا عرفان حاصل ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایسی تخلیقات نہیں کر سکتا تھا جو آفاقیت کی حامل ہو۔ وہ ایک ایسے فرمان کی تخلیق نہیں کر سکتا تھا جو محکم اور مستحکم ہو۔ مندرجہ ذیل نظم ملاحظہ فرمائیں۔

تحریک

وقت آوارہ ہوا کے مانند
شعلہ زیست ہے شبنم کی طرح!
آمتاویں یہ تفاوت یہ جمود...
آ کہ ہو پھر کسی عیسیٰ کا ورود
تو بھی مظلوم ہے مریم کی طرح
میں بھی تنہا ہوں خدا کے مانند

پہلی تثلیث کا تعلق روحانیت اور تقدیر سے تھا لیکن جس تثلیث کا اعادہ شاعر نے کیا ہے۔ اس کا تعلق مادیت اور تدبیر سے ہے۔ یہاں پر شاعر نے انسان کی "خالق ہونے کی قدرت" کا اظہار کیا ہے اور وہ انسانیت کو مریم کی طرح مظلوم اور خود کو خدا کے مانند تنہا قرار دے کر کسی ایسے عیسیٰ کی تخلیق کرنا چاہتا ہے جو زیست کے لئے مسیحا نفس ہو' اور یہی فلسفہ انقلاب ہے جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو کوئی ریفارمر مظلوم قوم کے اشتراک سے انسانیت کے لئے ایک ایسا نظام برپا کرتا ہے جو ان کے دکھوں کا مداوا کر سکے۔

اس کی شاعری غم جاناں' غم دوراں اور غم کائنات پر مشتمل ہے۔ لیکن غم جاناں یعنی رومانوی شاعری مشکل سے چھ سات نظموں پر مشتمل ہے جو "ان کہی" سے شروع ہو کر "آخری لمحہ" پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔

"غم دوراں" بھی چند غزلوں' بیس پچیس نظموں پر مشتمل ہے اور اس کے علاوہ تمام تر شاعری غم کائنات پر حاوی ہے اور جدید نسل کے اس نمائندہ شاعر کا نام ہے۔ "حمایت علی شاعر"

(مطبوعہ۔ "نئی قدریں" حیدر آباد۔ اپریل ۱۹۶۳ء)

داستانِ رنگ و سنگ کا شاعر

شاہدہ حسن

۱۹۴۵ء میں انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد کا سالنامہ "نورس" شائع ہوا تو اس میں "حمایت تراب" کے نام سے لکھی گئی ایک کہانی "فلسفہ اور حقیقت" شامل تھی پھر حیدر آباد دکن کے ایک مذہبی رسالے میں "ظہور قدسی" کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی تو اس کے چند اشعار کچھ اس طرح تھے..

یک بیک ابھرا زمیں سے آفتاب چارہ ساز
عارف و شیطاں کش، باطل شکن، بندہ نواز
واقفِ سرکن و دانائے رازِ زندگی
جلوہ فرما پیکرِ خاکی میں نورِ ایزدی
خاک پر تو نے کھلائے پھول اے ابرِ کرم
یہ خزاں آباد دنیا بن گئی رشکِ ارم

یہ وہ زمانہ تھا کہ بیشتر نوجوان لکھنے والوں کی تحریروں پر علامہ اقبال کی تراکیب لفظی اور پیرایہ اظہار کا سایہ لہراتا رہتا تھا اور اسی اثر کے تحت فارسی تراکیب کا استعمال بہت مقبول تھا۔ رسالے میں جب حمایت علی شاعر کا نام "میر حمایت علی شاعر اورنگ آبادی" چھپا دیکھا تو ان کے بہت سے اساتذہ یقین نہ کر سکے کہ ایک ۱۵۔۱۶ برس کے لڑکے کی شعری کاوش ایسی ہو سکتی ہے۔ پھر وقت کی دھول اڑتی رہی۔ جسم و جاں زخمی ہوتے رہے اور ۱۵۔۱۶ برس کی عمریں کھینچے ہوئے ان نقوش میں زندگانی کے تلخ و شیریں لمحات اپنے رنگ بھرتے رہے۔

حمایت علی شاعر نے جس داستان رنگ و سنگ کو کہیں اجمال اور کہیں تفصیل سے نظم کیا ہے، اسے بلاشبہ ان کی داستان حیات کہا جا سکتا ہے۔ اپنے شعری مجموعوں "آگ میں پھول" "مٹی کا قرض" "تشنگی کا سفر" اور "ہارون کی آواز" میں مختلف اصناف کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل ان کے شب و روز کی کہانیاں ہیں جنہیں وہ بسر کرتے چلے آئے ہیں اور آج بھی بسر کر رہے ہیں۔ غزلیں، طویل و مختصر نظمیں، ثلاثیاں سبھی انہوں نے لکھے ہیں، لیکن مجموعی مطالعے سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ حمایت علی شاعر نے جس صنف کو سب سے زیادہ برتا ہے وہ صنف "نظم" ہے.. اپنی مختصر اور طویل نظموں میں وہ احساسات و جذبات کے شہرِ نامعلوم کی جانب سفر کرتے ہوئے اپنے گرد آلود اور نڈھال وجود کے نقوش بناتے چلے جاتے ہیں۔ دراصل زندگی حمایت علی شاعر کے لئے ایک طویل اور مسلسل جدوجہد کا دوسرا نام رہی ہے۔ معاش سے لے کر تخلیق فن تک انہوں نے کچھ کھونے اور کچھ پانے کے کھیل میں مسلسل آنکھ مچولی کھیلی ہے۔ حقیقی ادبی زندگی کی تمنا حمایت علی شاعر کے لئے تمنا ہی رہی لیکن انہوں نے جبر معاش اور جبر زیست کے مجادلے میں اپنی آواز کی شناخت سسکیوں کو نہیں بننے دیا۔ حمایت علی شاعر کا کلام سسکیاں نہیں ہے، بلکہ یہ زندگی کی توانائیوں کا اپنے عہد کے ساتھ کیا ہوا ایک مثبت اور متوازن

مکالمہ ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنے مجموعہ ہائے کلام کے مختلف دیباچوں میں اپنے بے کیف شب و روز اور بے رنگ ماہ و سال کی جھلکیاں بھی دکھائی ہیں اور ان خوش رنگیوں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں جن سے ان کے وجود نے خوابوں کی دھنک ترتیب دی ہے۔ ان کے لہجے میں نہ تو خود رحمی کی کیفیت ہوتی ہے اور نہ بے اعتباری کا دکھ جھلکتا ہے' بلکہ ایک ایسا اعتماد اجاگر ہوتا ہے جو بساط حیات پر چلنے والی مخالف ہواؤں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ جس نوع کے تجربات کو حمایت علی شاعر نے اپنے موضوعات میں شامل کیا ہے' ان کے لئے رمز و کنائے کی تہہ داریوں اور لطیف پیرایوں سے زیادہ ایک بلند آواز اور جان دار اظہار بیان کی ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے افسانوی' تمثیلی' بیانیہ اور علامتی نظموں کے علاوہ ایک مختصر ترین نظم کا تجربہ "ثلاثی" لکھ کر کیا ہے۔ ان نظموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص دکھ کو اپنا موضوع بنا کر نظم کا آغاز کرتے ہیں۔ جب وہ اس دکھ کے اظہار کے لئے محض ایک اشارے پر اکتفا کر لیتے ہیں تو اس صورت میں کوئی ثلاثی یا کوئی مختصر نظم وجود میں آجاتی ہے۔ کبھی وہ کسی دکھ کی مسلسل کیفیتوں کے پس منظر میں مختلف انسانی چہروں اور کرداروں کو ان کے اصل رنگ میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش میں طویل نظمیں لکھتے ہیں۔ ایسی نظموں میں وہ موضوع کی مناسبت سے کبھی خود کلامی کرتے' کبھی مکالمہ کرتے کبھی کسی داستان گو کی طرح چھوٹی چھوٹی تحیر آمیز ساعتوں کو اجاگر کرتے اور کبھی بلند آواز میں اپنے جذبوں کی شدت کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔

ان کے مجموعہ کلام "تشنگی کا سفر" میں تمثیلی اور افسانوی نظمیں شامل ہیں۔ پہلی تمثیلی نظم "شکست کی آواز" ہے جو ۱۹۶۲ء میں لکھی گئی۔ اس کا بنیادی خیال' بقول شاعر' ایک فرانسیسی ادیب مارسل بائٹل کی کہانی سے ماخوذ ہے۔ اس نظم کا مرکز ایک ایسا کردار ہے جو اپنے افکار و عقائد' خوابوں اور خواہشوں کے نگر میں تنہا زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کے گرد رنگا رنگ آوازوں کی آندھیاں چل رہی ہیں' مگر خود اس کی آواز کرب کے احساس سے دبی ہوئی ہے۔ اس کا وجود کسی پچھتاوے کی صورت اس طرح خود کلامی کرتا ہے کہ اس کے اندر کے سارے دکھ نوحہ کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

اے خدا! اے مرے معبود کوئی راہ فراغ
جس قدر سوچتا جاتا ہوں الجھتا ہے دماغ
دور تک قبر کی مانند اندھیرا ہے محیط
دفن ہو جائے نہ اس میں مرے افکار کی دنیائے بسیط

"بدلتے زاویے" ایک اور تمثیلی نظم ہے۔ اس نظم میں بھی زندگی کا مکالمہ کرتا شاعر اپنے وجود کو وقت کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے اصل اور کھوٹ کی پہچان بتاتا ہے۔ اس پوری نظم میں صوتیات' مکالموں اور کیفیات کی دھیمی دھیمی لہروں کے پس منظر میں رنگ برنگی' ہمہ جہت اور ہمہ اوصاف زندگی کا گیت سنائی دیتا محسوس ہوتا ہے۔ نظم کے مصرعوں اور ان کے دروبست میں کیفیات اور احساسات کے ذریعے سے جو زیر و بم اور صوتی اثرات ابھرتے ہیں' انہوں نے اسلوب اظہار کو نہ صرف پر کیف بنا دیا ہے' بلکہ زندگی کے اثبات اور انسانی وجود کی ہمہ گیریت کے تاثر کو بھی گہرا کیا ہے۔

اسی مجموعے کی ایک اور نظم "شعلہ بے دود" ہے۔ یہ ایک افسانوی نظم ہے اور ایک متوسط طبقے کے نوجوان کی کہانی ہے جس کے شعور میں طبقاتی کشمکش جاری رہتی ہے اور جو محبت کی حقیقت اور جذب دروں کے سحر کو لایعنی سمجھ کر سیم و زر کی

پر کشش چکا چوند سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کشمکش میں جب اسے حقیقت کا ادراک ہوتا ہے اور اس کا دل اشک ندامت کے سیلاب میں غرق ہونے لگتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی خوشیوں کی اصل کہاں ہے اور ان اصل سرچشموں تک رسائی کا راز کیا ہے۔ اس نظم کے اختتامی مصرعے کچھ اس طرح ہیں:۔

میں نے اس سے کہا تو کچھ بھی نہیں
خامشی سے نظر کو پھیر لیا
اور پھر یک بیک مرے دل کو
سیکڑوں آنسوؤں نے گھیر لیا
وہ چلی تو گئی تھی محراب تک
آہٹ آہٹ پہ دل دھڑکتا ہے
بجھ گئی انتظار کی شمع
دل میں اک شعلہ سا بھڑکتا ہے

"بنگال سے کوریا تک" حمایت علی شاعر کی ایک طویل نظم ہے اس نظم کا پس منظر جنگ ہے اور یہ دوسری جنگ عظیم سے شروع ہو کر کوریا کی لڑائی یعنی تیسری جنگ کے بیان پر محیط ہے۔ جنگ کے اثرات میں قحط بنگال سب سے نمایاں ہے۔ اس نظم کے بارے میں خود شاعر رقم طراز ہیں۔ "یہ کہانی آپ بیتی نہیں، لیکن آپ بیتی ہوسکتی ہے اس کہانی کا مرکزی کردار "میں"۔ میں بھی ہوسکتا ہوں اور آپ بھی، کیوں کہ گزشتہ عالم گیر جنگ میں بنگال جنگ سے دور رہ کر بھی لاکھوں انسانوں کا مدفن بن گیا اور کوریا۔ تازہ ہیروشیما ہے اور یہ ہیروشیما جتنی تیزی سے پھیلتا جائے گا، بنگال کی وسعتوں میں بھی اسی سرعت سے اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس پس منظر میں اس کہانی کا مرکزی کردار انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی بھی ہے۔"

اس نظم کا "یادوں کے غبار میں" کے عنوان سے آغاز کرتے ہوئے وہ مختلف عنوانات کے تحت، ہمیں منظر در منظر ان گنت زندگیوں کے سفروں کی کہانیاں سناتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سکون پرور اور خوش خرام ساعتوں پر اچانک نفرتوں کی فوجیں شب خون مارتی ہیں اور جنگ کی بھیانک آگ اپنے شعلوں کی تپش سے ہر خوش رنگ خواب کو جھلس کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے بعد یہ سانحہ کسی ایک گروہ، کسی ایک جماعت یا کسی ایک خطے کا سانحہ نہیں رہتا، بلکہ پوری انسانی برادری کو اس کے خوش آئند خوابوں سے محروم کردینے کا المیہ بن جاتا ہے۔ ان موضوعات کو برتتے ہوئے حمایت علی شاعر نے ایک صاحب نظر اور صاحب دل کی طرح تحمل اور دردمندی کا مسلسل احساس دلایا ہے اور آنے والے لمحوں کی جانب پر امید نگاہوں سے دیکھنے کی ترغیب دی ہے۔

اپنے ایک مضمون میں حمایت علی شاعر نے اپنی اس نظم کے بارے میں بطور خاص لکھا ہے کہ "تکنیک کے اعتبار سے میں نے اس میں ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اکثر جگہ اظہار کی سطح پر مسلسل غزل کی تکنیک استعمال کی ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ نظم کے انداز بیاں میں ایک خاص قسم کی نرمی ملحوظ رکھی جائے۔ یہ ملائمت ایک ایسی نظم کے لئے بہت ضروری تھی جس میں کہانی ایک یادداشت کے طور پر ابھرتی ہو۔ یہ نظم ایک اور طریقے سے بھی کہی جاسکتی تھی یعنی مثنوی کے انداز

میں، لیکن چوں کہ میرا موضوع ایک تاریخی المیے سے اکتساب فکر کرتا ہے، اس لئے کہانی کے تسلسل سے زیادہ ان واقعات کی اہمیت تھی جو نظم کے بنیادی خیالات ہیں۔"

اس نظم میں حمایت علی شاعر نے ماضی سے حال کی طرف سفر کرتے ہوئے معاشی، سیاسی اور تہذیبی نظام کی شکست و ریخت کی طرف بامعنی اشارے کئے ہیں۔

حمایت علی شاعر کے مجموعہ کلام "ہارون کی آواز" میں غزلوں کے علاوہ مختلف عنوانات کے تحت جو نظمیں شامل ہیں، ان میں تاریخ، گوسالہ، یدبیضا، نسبت خاک، مریم سے ایک سوال، پرانے سلسلے نئے رابطے اور ہارون کی آواز بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں کے بارے میں حمایت علی شاعر خود لکھتے ہیں کہ "میری شاعری میں عہد پارینہ کی مخصوص حکایات اور ان کے مختلف کردار جو اپنی پرچھائیاں تلاش کرتے نظر آتے ہیں، ماضی و حال کے ایک جدلیاتی ربط کے آئینہ دار ہیں۔ میں اس آئینے میں ان حکایات کا نیا روپ اور ان کرداروں کے نئے چہرے دیکھتا ہوں اور اس آگ کی روشنی میں جو میرے تخلیقی جوہر کی امین ہے، اپنے عہد کے ان پس پردہ محرکات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں جن کے سبب تاریخ کبھی اپنے آپ کو دہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہی کبھی آگے بڑھتی ہوئی اور کبھی اس عالم میں جیسے اپنی جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہو۔"

حمایت صاحب کی ایک اور طویل نظم "حرف حرف روشنی" ہے اس نظم میں وہ اپنے لہجے کی تمام تر تلخیوں کے ساتھ نسل نو کو مخاطب کرتے اور یہ ہدایت کرتے نظر آتے ہیں کہ اپنی دھرتی اور اپنی تہذیبی تاریخوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں پوری ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہئے اور حرف و لفظ کی بھول بھلیوں میں گم کرنے والوں کے بیانات سے مسحور ہونے کے بجائے اپنے اصل سرچشموں کی شناخت کے لئے اپنے آپ کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ پھر اسی حوالے سے وہ نسل نو کو اپنی زمین اور اپنی روایتوں سے وابستگی کا درس دیتے ہوئے نظم کے آخری حصے کو اس طرح اختتام تک لاتے ہیں۔

وہ لوگ جن کی محبت کی تم نشانی ہو
وہ راستے جو تمہیں اپنے عہد تک لائے
وہ دور جس کے تسلسل کی اک کڑی ہو تم
تمہارے سامنے ہے آج ہاتھ پھیلائے
مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو
یہ ہاتھ ہاتھ میں لے لو کہ ہیں یہ پیار کے ہاتھ
یہ ہاتھ چھوڑ نہ دینا اگر زمیں ہے عزیز
کہ ان سے بڑھ کے نہیں کوئی اعتبار کے ہاتھ

حمایت علی شاعر نے طویل نظموں کے علاوہ "ثلاثی" لکھ کر نظم کی صنف میں مختصر ترین نظم کا تجربہ کیا ہے اور ہیئت کے اعتبار سے یہ انفرادیت اختیار کی ہے کہ تین مصرعوں میں ایک نکتے یا فکر کو پیش کیا جائے۔ نیز موضوع کا تعین کرتے ہوئے یہ التزام بھی رکھا جائے کہ پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم آہنگ ہو۔ تکنیک کے اعتبار سے یہ ایک انفرادی تجربہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ شاعر کسی خاص فکر کو محور بنا کر اپنے حسی تجربات اور ذہنی رویوں کے مختصر اظہار میں "بلاغت" کا حسن پیدا کر سکے۔

(باقی صفحہ نمبر ۲۶۷ پر)

صاحب کمال شاعر

نجمہ خان

"حمایت علی شاعر کا اچھے اور باکمال ہم عصر شعراء میں شمار ہوتا ہے" یہ رائے زنی جناب فیض احمد فیض نے ان کے مجموعہ کلام "مٹی کا قرض" کی تقریب تعارف میں صدارتی تقریر میں کی تھی۔ تقریباً دو عشرے گزر جانے کے بعد یہ رائے آج بھی اسی قدر بامعنی ہے۔ اس سے قبل ۱۹۵۶ء میں ان کے پہلے شعری مجموعے "آگ میں پھول" کے حوالے سے پروفیسر ممتاز حسین نے کہا تھا۔

"حمایت علی شاعر نے خارجی حقیقت کو داخلی حقیقت میں تبدیل کیا ہے اور حقیقت کو مجاز سے چمکانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کلام کی یہی خوبی ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے انکی شاعری اگر ایک طرف خود نوشت سوانح عمری ہے تو دوسری طرف تاریخ کا آئینہ بھی۔ ان کی آواز میں سکوت شب کا زیر و بم اور متلاطم سمندر کا مد و جزر دونوں ہی ہیں۔ وہ قوت گریہ اور قوت شعلہ دونوں ہی سے واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ نئے ادیبوں کی صف میں انہوں نے بہت جلد ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے۔"

"آگ میں پھول" کی دو نظمیں اس رائے کی تائید میں نذر قارئین ہیں۔

غریب بستیاں

صبح ہوتے ہی چیخ پڑتے ہیں قبروں کے دہن
اپنے مسکن سے نکل آتا ہے لاشوں کا ہجوم
مادر پاک کے خوابوں سے تراشے ہوئے جسم
عقل مجہول، نگہ کور، زباں بے مفہوم
اپنے امروز کا کچھ علم نہ فردا کی خبر
اپنی ہستی کی حقیقت ہی نہیں ہے معلوم
ایک ارواش کی پشتارہ غم سے بوجھل
ایک اک رگ کہ رم قطرہ خون سے محروم
ایک اک دل میں دہکتے ہوئے دوزخ لاکھوں
اور ذہنوں میں بسائے ہوئے خلد معدوم
کچھ نہیں فکر...... بجز نان جویں، نان جویں
اور ہوگی بھی تو کیا حاجت قلب مرحوم
شام ہوتی ہے تو پھر صبح کی بھوکی قبریں
چاٹ جاتی ہیں ہر اک سایہ و ہر نقش قدوم
نسل تا نسل اسی طرح گزر جاتی ہے
اپنی آنکھوں میں لئے گمشدہ منزل کی تلاش
اپنے سینے سے لگائے ہوئے ایمان کی لاش
زندگی موت کے پہلو میں اتر جاتی ہے

نیپیئر روڈ

نیپیئر روڈ پہ تجدید بہت خوب مگر
نیپیئر روڈ پہ تجدید کا آخر انجام
چلتے پھرتے ہوئے کھمبوں سے اٹھاؤ تو غلاف
نیپیئر روڈ رواں ہے کہ نہیں گام بہ گام
جہل زندہ ہے تو رسوا ہی رہے گی تہذیب
بھوک زندہ ہے تو بکتے ہی رہیں گے اجسام

جناب حمایت علی شاعر کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا یہ اعتراف اور ان کی شاعری کے روشن امکانات کے ضمن میں پروفیسر ممتاز حسین کی مذکورہ بالا رائے گویا ایسی پیشین گوئی کہی جا سکتی ہے جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ ایک صاحب کمال شاعر کی حیثیت سے ان کا شعری سفر گزشتہ چار دہائیوں سے پیش رفت کا سفر ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے مشکلات کا سامنا بھی کیا اور آزمائشوں سے بھی گزرے۔ انکی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی جہد مسلسل اور انتھک محنت سے عبارت ہے شاعری سے ان کا رشتہ ابتدا ہی سے بڑے سنجیدہ خطوط پر استوار ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ رشتہ عشق میں تبدیل ہوگیا۔

جناب حمایت علی شاعر کا شعری سفر تقریباً نصف صدی پر محیط ہے' انکے شعری سفر کا آغاز اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک کا سورج نصف النہار پر تھا اور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا اور ارض دکن پر اس کی روشنی' برصغیر کے دیگر حصوں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس سورج سے اکتساب نور کرنے والوں میں جناب حمایت علی شاعر بھی تھے۔ چنانچہ ان کی ابتدائی شاعری پر اس تحریک کی اتنی گہری چھاپ ملتی ہے جتنی اس دور کے دیگر ترقی پسند شعراء کی تخلیقات پر نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں انکی نظم "ایشیا" اپنے خیال کی تائید میں پیش کر رہی ہوں۔

آخرش جاگ اٹھا وقت کا خوابیدہ شعور
شب کے پروردہ اندھیروں کا فسوں ٹوٹ گیا
اک کرن پھوٹ کے چمکا گئی مشرق کا نصیب
دست اوہام سے ہر دامن دل چھوٹ گیا
کل تلک سرد تھی جن ذروں کے احساس کی آگ
آج تپ تپ کے وہ خورشید ہوئے جاتے ہیں
جن کو روندا گیا صدیوں وہی مجبور عوام
انقلابات کی تمہید ہوئے جاتے ہیں

لاکھ پھینکے شب تاریک سویرے پہ کمند
کارواں صبح کا بڑھتا ہی چلا جائے گا
اپنے ہمراہ لئے سیکڑوں کرنوں کا جلوس
وسعت عالم آفاق پہ چھا جائے گا
میرے گردوں پہ اگر رات مسلط ہے تو کیا
لو دیئے جاتی ہے شب تاب ستاروں کی جبیں
لاکھ ظلمات کا سیلاب امڈتا آئے
رات سورج کو نگل سکتی ہے تاروں کو نہیں

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک نے ایک عشرے کے عرصہ میں برصغیر کی ادبی فضا کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا اور برصغیر کی تمام اہم زبانوں کے لکھنے والے اس تحریک سے متاثر ہو کر لکھنے لگے۔ اس تحریک نے تمام اصناف ادب کے نئے تقاضے' نئے مفاہیم اور نئے اہداف متعین کئے۔ زندگی اور سماج سے ادب کے رشتے نئے خطوط پر استوار کئے اور حسن و عشق نے نئے معیارات اور نئے تناظر دریافت کئے مگر اس کے ساتھ ہی یہ تحریک انتہا پسندی کا شکار ہوگئی اور ادب کے جمالیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کرنے کی روش پر گامزن ہو کر رفتہ رفتہ بے اثر ہوتی چلی گئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بھیونڈی کانفرنس کی روداد اور اس کا اعلان نامہ اس دعوے کی دلیل ہے۔ اس شدت پسندی کا ادبی تخلیقات میں اظہار اس دور کا وطیرہ اور غالب رجحان تھا۔ ترقی پسند شعراء کے یہاں اس دور کی تخلیقات میں بلند آہنگی' نعرے بازی کی سرحدوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ اس دور کے ترقی پسند ادب کا خاصا بڑا ذخیرہ اس ذیل میں آتا ہے چنانچہ اس باب میں ادب اور غیر ادب کا موضوع زیر بحث آنا منطقی بات تھی ہنگامی موضوعات اور ہنگامی ادب کے نئے رشتے احتجاجی ادب اور مزاحمتی ادب میں ملتے ہی ہیں۔ یہاں محض اس کا سرسری تذکرہ کرنا مقصود تھا کیونکہ ان مسائل اور موضوعات کا گہرا تعلق جناب حمایت علی شاعر کے شعری سفر سے ہے اور ان حوالوں کو پیش نظر رکھے بغیر ان کے شعری سفر کے مراحل اور کامرانیوں کا صحیح ادراک ممکن نہیں۔

جناب حمایت علی شاعر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔

حیدر آباد دکن کا یہ شہر اورنگ آباد شہرہ آفاق اجنتا اور ایلورہ کے عظیم تہذیبی ورثے کی وجہ سے تاریخ عالم میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اسکے علاوہ علمی اور ادبی اعتبار سے بھی یہ شہر بڑی اہمیت کا حامل ہے اور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ برصغیر کے متعدد ایسے شہر ہیں جن کی وجہ سے شہرت کچھ شخصیات رہی ہیں۔ خاص طور سے علم و ادب کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ملیح آباد کو جوش کی وجہ سے مراد آباد کو جگر' بدایوں کو فانی' جونپور کو وامق' اور حفیظ کے حوالے جالندھر اور سرگودھا کو ڈاکٹر وزیر آغا کے حوالے سے جو فخر اور امتیاز حاصل رہا ہے۔ وہی کچھ میرے خیال میں اورنگ آباد (دکن) کو ولی دکنی کا سراج اورنگ آبادی اور حمایت علی شاعر کے حوالے سے ہے۔ میری رائے میں بہ حیثیت ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کے بعد جناب حمایت علی شاعر ارض دکن سے تعلق رکھنے والے سب سے معتبر اور صاحب کمال شاعر ہیں۔

یہاں میں اپنی پسند کے چند اشعار پیش کر رہی ہوں۔

میں کچھ نہ کہوں اور چاہوں یہ بات
خوشبو کی طرح اڑ کے تیرے دل میں اتر جائے
میں سایہ کئے ابر کے مانند چلوں گا
اے دوست جہاں تک تیری راہ گذر جائے
یہ بات ظرف کی ہے مگر کس سے کیجئے
قطرہ بھی ہے آج کل سمندر بنا ہوا
راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میر کارواں یارو میر کارواں یارو
صرف زندہ رہنے کو زندگی نہیں کہتے
کچھ غم محبت ہو' کچھ غم جہاں یارو

محسوس کر رہا ہوں میں کرب شکستگی
تم بھی شگفت گل کی صدا غور سے سنو
مجھے غروب نہ جانو جو میں افق پہ نہیں
بکھر گیا ہوں میں اندھیرے میں کہکشاں کی طرح
یہ سنگ نئی میرے لئے بارش گل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ بدست دگراں اور
وہ ایک لفظ جو شرمندہ بیاں نہ ہوا
اس ایک لفظ کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا
اس ایک اشک سے قائم ہے آبرو غم کی
جو دل میں ڈوب گیا آنکھوں سے رواں نہ ہوا

جیسا کے میں پہلے عرض کر چکی ہوں حمایت صاحب کی شاعرانہ زندگی نصف صدی سے قریب ہے۔ اور دو چار سال یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں ہے۔ اس کے باوجود میری رائے میں وہ سدا جواں فکر شاعر کی حیثیت سے بزم شعر و سخن کو Inspire کرتے رہیں گے۔ اور ان کے خیالات اور اظہار بیاں میں جوں سالی کی ترنگ اور بانکپن آج بھی ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی باقی رہے گا۔ ہماری نیک خواہشات اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ حمایت علی شاعر صاحب کا شعری سفر بھی ایک طویل عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ تیس کی دہائی کے ساتھ دنیا میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں انسانی تہذیبی سفر کا اہم ترین باب کہلانے کی مستحق ہیں۔ تیس کی دہائی کے ابتدا ہی سے جہاں بین الاقوامی اقتصادی افق پر شدید Recession کے اثرات ظہور پذیر ہوئے ہیں اور سرمایہ دار دنیا بحران سے پریشان ہوئی ہے۔ وہاں سیاسی افق پر جرمنی اٹلی اور پھر جاپان میں فسطائیت اور عسکریت پسندی کے عفریت نے خوفناک انداز میں سر ابھارا اور دیکھتے ہی دیکھتے افق عالم کو دھندلا دیا۔ دوسری طرف انقلاب اکتوبر سے نئے سفر پر گامزن سوویت یونین ایک نئی عالمی طاقت کے طور پر ابھرنے لگا اور نو آبادیاتی نظام میں جکڑے ہوئے غلام ممالک اشتراکیت کو نجات کا راستہ تصور کرنے لگے۔ تیس کی دہائی

کے خاتمے تک دنیا دوسری جنگ عظیم کے دہانے میں پہنچ گئی۔ اہل قلم نے پہلی دفعہ بین الاقوامی سطح پر فسطائیت کے خلاف ثقافت کے تحفظ کے لئے محاذ بنایا۔ دوسری جنگ عظیم میں سرمایہ دار دنیا اور اشتراکی دنیا حلیف کی صورت فسطائیت کے خلاف صف آراء ہوئی اور برصغیر میں آزادی کی تحریک اپنے آخری مراحل میں داخل ہوئی۔ مختلف سیاسی دھارے حالات کو اپنے طور پر متاثر کر رہے تھے۔ یہ بین الاقوامی اور قومی تناظر تھا جس میں حمایت علی شاعر صاحب نے اپنے شعوری سفر آغاز کیا اور ان کے شعری رویوں اور حسیت کی تہذیب ہوئی۔ انکی شاعری کے ابتدائی برسوں میں یہ شعری رویے اور حسیت ان کی ہر تحریر و نگارش میں نمایاں ہے۔ خاص طور پر ان کی مشہور معرکتہ الا آراء نظم "بنگال سے کوریا تک" کا مطالعہ اسی قومی اور بین الاقوامی تناظر میں کیا جانا چاہئے۔ حمایت علی شاعر کے آئینہ خانہ تصور میں جو عکس اور نقش ابھرے وہ ذیلی موضوعات کی صورت میں دراصل اس وقت کی ہم عصر انسانی تہذیب کو درپیش سوالات تھے جن کے جوابات کی تلاش ذہن شاعر پر حاوی رہی۔ اور نظم میں شعروں کی صورت میں ڈھلی۔ یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کے اردو شاعری میں اہم طویل نظموں کی جو فہرست سامنے آئی ہے "بنگال سے کوریا تک" اس فہرست میں شامل ہے۔ اور اپنی فلیش بیک ٹیکنیک کے حوالے سے اس نظم کی خصوصی اہمیت ہے۔ حمایت علی شاعر صاحب کی دوسری اہم طویل نظمیں "حرف حرف روشنی" "تشنگی کے سفر" میں شامل دوسری نظموں کی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلم ہے۔ "بنگال سے کوریا تک" میں ان کے شعری رویے اور حسیت کے اظہار میں جو پختگی اور ٹہراؤ پایا جاتا ہے وہ دراصل ان کے شعری اور شعوری ارتقائی سفر پر دلیل ہے۔ "بنگال سے کوریا تک" اور "حرف حرف روشنی" سے چند ابتدائی بند ملاحظہ کیجئے۔

بنگال سے کوریا تک

(یادوں کے غبار میں)

آئینہ خانہ تصور میں
اک اک نقش ابھر آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہیں
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے
وہ مرا گاؤں میرا اپنا وطن
میری جنت مرا جہنم زار
چند اونچی حویلیوں کے گرد
زندہ لاشوں کی تربتوں کا دیار
سبز شاداب کھیتوں کے بیچ
بھوکی ننگی حیات کا بازار
ارتقائے جہاں کی پستی کے
ہر فریب حسین کا آئینہ دار

حسن فطرت کا سادہ لوح امیں
زر گزیدہ سماج کا شہکار
اسی جنت اسی جہنم میں
غنچے چٹکے کھلے گلاب ہوئے
اسی چھاؤں کی نرم حدت میں
ذرے تپ تپ کے آفتاب ہوئے
نوجوانی کہ موج طوفاں جوش
نوجوانی کہ آندھیوں کا خروش
پتھروں کی رگوں میں کھولتی آگ
زندگی کے لہو کا نقطہ جوش
ایک فرزانگی جنوں کی سی
ایک دیوانگی بقید ہوش
ایک راحت نواز بے چینی
اک سکوں اضطراب در آغوش
کس قدر تھے حسین وہ دن رات
کتنا دلکش تھا زندگی کا روپ

اک ہی بات تھی مرے نزدیک چیتھڑوں کے کفن میں دفنا کر
چاندنی ہو کہ چلچلاتی دھوپ زندگی کو حسیں سمجھتے رہے
جہل زائیدہ فکر و احساسات اشک پی پی کے مسکراتے رہے
پتھروں کو نگیں سمجھتے رہے زہر کو انگبیں سمجھتے رہے
اک مقدس فریب میں آکر کس کو معلوم کوئی کیا جانے
آسماں کو زمیں سمجھتے رہے کس نے لوٹی حیات کی تقدیر
ہر توہم کے آستانے پر کن خداؤں کے جال میں ہے اسیر
سجدہ ریزی کو دیں سمجھتے رہے لیلیٰ کائنات کی تقدیر

حرف حرف روشنی

مرے لہو کے چراغو میرے جگر پارو تم اس عذاب کو اک امتحاں سمجھ لینا
سنو یہ میری نصیحت بھی ہے وصیت بھی تم اپنے غم کا نہ دینا زمیں کو الزام
میں آج تم میں ہوں موجود کل نہیں ہوں گا کوئی یقیں بھی دلائے گماں سمجھ لینا
مگر جو تم ہو تو میں ہوں سدا سلامت بھی وطن کے نام پہ کوئی زیادتی ہو اسے
تم اپنا نقطۂ آغاز ہی سہی لیکن عنایت نگہ دوستاں سمجھ لینا
تمہارے ساتھ رواں ہے میری روایت بھی یہ جبر وقت بھی تاریخ کا تقاضہ ہے
میں اپنے ماضی مرحوم کی امانت تھا اسے بھی مرحلہ قرض جاں سمجھ لینا
سو آج تم سے ہے منسوب یہ امانت بھی جو کوئی پوچھے تمہارا حسب نسب کیا ہے
مرے لہو کے چراغو' مرے جگر پارو تو میرے نام کو حرف زیاں سمجھ لینا

حمایت علی شاعر نے اپنی فکری اور شعوری زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے پہلے شعری مجموعے "آگ میں پھول" مطبوعہ 1956ء کے آغاز پر جو تحریر کیا تھا یہاں اس سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے

"میری ادبی زندگی کا آغاز 1947ء میں ہوا۔ پہلے مختصر افسانے اور مضامین لکھے اور بعد میں شاعری شروع کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غیر منقسم ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ مدت سے باہم دست گریباں رہ کر آخر اس منزل تک آگئیں تھیں کہ ملک کا تقسیم ہوجانا ناگزیر تھا۔ ادھر حیدر آباد جو اپنی ایک الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تیار کئے ہوئے تھا سیاسی اعتبار سے ایسے گروہ کے ہاتھ میں آگیا تھا جس کی سیاسی بصیرت اپنی مثال آپ تھی۔"

"شاعری میں یہ نقطۂ نگاہ کسی غیر معمولی انفرادیت کا حامل نہیں ہے۔ میں شعوری طور پر کسی ایسی جدت کا بھی طرف دار نہیں ہوں جو فنکار کا رشتہ اپنے عہد یا عہد کی زندگی سے توڑ لے۔ میرے خیال میں جتنی اہمیت روایت کی ہوتی ہے اتنی ہی ان اقدار کی بھی ہوتی ہے۔ جنہیں عصر رواں جنم دیتا ہے۔ میرے نزدیک فنکار اپنے عہد کا نمائندہ ان ہی معنوں میں ہوتا ہے اور ادب اپنے عہد کی تاریخ انہیں معنوں میں مرتب کرتا ہے کہ وہ اپنے عصر کے شعور کا ترجمان ہوتا ہے۔"

"تاریخ ادوار کے واقعاتی تسلسل پر نام نہیں بلکہ معاشرتی ارتقاء کے جدلیاتی تسلسل کا نام ہے۔ جب تک ہم تاریخ کے بحث طلب مسائل کو مادی حقائق کی کسوٹی پر نہیں پرکھیں گے کھرے کھوٹے کا فرق ظاہر نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام وہی فنکار انجام دے سکتا ہے جو ادب کو دل کا مشغلہ نہیں بلکہ دماغ کی زندگی سے تعبیر کرتا ہو اور ایسے فنکار کے نزدیک نہ صرف اپنے عہد کے اقدار مقدم ہوتی ہیں بلکہ روایتی اقدار بھی کیوں کہ ہر نوزائیدہ قدر ماضی میں اپنا ایک تسلسل رکھتی ہے اور اپنی جگہ آئندہ امکانات کے لامتناہی سلسلے کا نقطہ آغاز بھی بنی رہتی ہے۔"

"آج کل ادب میں جب بھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے تو ادب عالیہ کی بحث چھڑ جاتی ہے اور ایک حلقے سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ ادب عالیہ شعوری طور پر ہر قسم کی حد بندی سے آزاد رہا ہے اور اسی میں اس کی ابدیت کا راز پنہاں ہے۔ میرے خیال میں یہ بات نہیں ہے ہر داخلی تحریک کی جڑیں خارج میں پیوست ہوتی ہیں اور خارج کے ساتھ ساتھ عمل کی داخلی نوعیت میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔"

حمایت علی شاعر صاحب کو جہاں فطرت نے خلاقیت سے مالا مال کیا ہے وہاں خود شاعر صاحب نے اکتساب علم کی طرف بھی پوری توجہ دی ہے۔ چنانچہ وہ ان صاحب کمال شعراء میں شامل ہیں جن کا علم و فضل اتنا ہی وقیع ہے جتنی ان کی تخلیقات و نگارشات۔ چنانچہ مذکورہ بالا اقتباسات سے ان کے شعور و فکر کی تفہیم میں کوئی Confusion باقی نہیں رہتا اور ان کے ادبی نظریات کے سائے میں پروان چڑھنے والے شعوری رویئے، رجحانات اور حسیت کا ادراک بھی سہل ہو جاتا ہے۔ حمایت علی شاعر صاحب نے اپنے شعری مجموعوں میں اپنی نثری تحریروں کے ذریعے اپنے قارئین کی بڑی مفید رہنمائی کی ہے او ریہ سب کچھ وہی فنکار کر سکتا ہے جو اپنی روشنی طبع کو دوسروں تک پہنچانے کا ہنر جانتا ہو اور یہ ہنرمندی شاعر صاحب کے انداز بیان میں بدرجہ اتم موجود ہے انھوں نے اپنی ان نثری تحریروں سے اپنے فکری و شعوری سفر کا ابلاغ اپنے قارئین کے لیے خاصا آسان بنا دیا۔ میرے نزدیک حمایت علی شاعر صاحب اپنی شعری تخلیقات اور نثری نگارشات کے حوالے سے ایک بڑے موضوع کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور ان کی ہمہ جہت شخصیت اور ادبی زندگی کی کثیر الجہتی کئی تخلیقی اور تحقیقی مقالوں کا استحقاق رکھتی ہے۔ خود ان کی شاعری کے اتنے اہم گوشے ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف کرنے کیلئے ایک پوری جامع کتاب کی تالیف و تصنیف درکار ہے۔ غرض وہ ترقی پسند شعراء کی دوسری نسل کے شعراء میں ایک اہم شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ویسے تو پوری اردو دنیا میں وہ صرف جانے پہچانے ہی نہیں جاتے بلکہ بے حد پسندیدہ اور مقبول شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ ان چند شعراء میں سے ہیں جنھوں نے اس کرہ ارض کا بار بار بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور مشرق و مغرب کے تہذیبی و ثقافتی ورثے کی خوشہ چینی کی ہے۔ اپنے ذہنی افق کو وسعت دی ہے۔ اور اپنی متاع فکر و نظر کو وقیع تر بنایا ہے۔ انہوں نے ان مطالعوں اور مشاہدوں کا اپنی نگارشات میں موثر انداز میں اظہار کیا ہے چنانچہ ان کے یہاں آفاقیت کی پرچھائیاں بہت واضح طور پر نظر آتی ہیں انہوں نے امریکا اور یورپ کے علاوہ افریقہ کی سرزمین کے دل کی دھڑکن بھی سنی ہے افریقہ جو گزشتہ چار دہائیوں سے آزادی کی جنگ میں مصروف ہے اور کامران رہا ہے افریقی زبانوں میں احتجاجی اور مزاحمتی ادب سے جناب حمایت علی شاعر بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے شعری سرمائے میں ان کے مشاہدوں اور مطالعوں کی دین یقیناً ناقابل اعتنا نہیں کہی جا سکتی۔ کلام شاعر کے حالیہ مطالعے کے نتیجے میں میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ جناب حمایت علی شاعر ان شعراء میں سے ہیں جنھون نے اپنے عہد کا بھرپور اثر قبول کیا اور اسے اپنے لئے زاد راہ جانا۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے عہد کو متاثر کیا ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں ہمیشہ

نمایاں رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم انہیں رجحان ساز شعراء کی صف میں شامل کر سکتے ہیں۔ ان کی طویل نظموں کی صدائے بازگشت کے ساتھ ان کی ثلاثیوں (ثلاثی بحیثیت ایک صنف سخن جناب حمایت علی شاعر سے منسوب ہے) کی گونج بھی اردو دنیا کے شعراء کے کلام میں سنائی دیتی ہے ان کی شاعری میں روش عام سے ہٹ کر چلنے کی سعی دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ترقی پسند ادب پر عمومی طور پر اور ترقی پسند شاعری پر خصوصی طور پر ہونے والے سنجیدہ اعتراضات اور نکتہ چینی کو نظرانداز کرنے کے بجائے انکا خاطر خواہ نوٹس لیا اور اپنی شاعری میں پوری طرح داخل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انکی غزلوں کے علاوہ ان کی نظمیں "ان کہی" "آگ میں پھول" "دوسرا تجربہ" "پرتو" "آئینہ در آئینہ" "مدت کے بعد" "ہارون کی آواز" اور اسی قسم کی دوسری نظمیں ان خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ "آگ میں پھول" اور "آئینہ در آئینہ" ملاحظہ کیجیے۔

آگ میں پھول

جیسے آغوش محبت میں ہمکتی ہوئی ننھی بچی
اپنے بابا کو کسی فکر میں ڈوبا ہوا پاکر... خود بھی
کھیلتے کھیلتے چپ چاپ کسی سوچ میں کھو کر رہ جائے
اور پھر باپ کی پلکوں پہ لرزتا ہوا کوئی آنسو
اپنی بچی کے کھلے پھول سے رخسار پہ گر کر بہہ جائے

آئینہ در آئینہ

اس بار وہ ملا تو عجب اس کا رنگ تھا
الفاظ میں ترنگ نہ لہجہ دبنگ تھا
اک سوچ تھی کہ بکھری ہوئی خال و خط میں تھی
اک درد تھا کہ جس کا شہید انگ انگ تھا
اک آگ تھی کہ راکھ میں پوشیدہ تھی کہیں
اک جسم تھا کہ روح سے مصروف جنگ تھا
میں نے کہا کہ یار تجھے کیا ہوا ہے یہ
اس نے کہا عمر رواں کی عطا ہے یہ
میں نے کہا کہ عمر رواں تو سبھی کی ہے
اس نے کہا کہ فکر و نظر کی سزا ہے یہ
میں نے کہ سوچتا رہتا تو میں بھی ہوں
اس نے کہا آئینہ رکھا ہوا ہے یہ
دیکھا تو میرا اپنا ہی عکس جلی تھا وہ
وہ شخص میں تھا اور حمایت علی تھا وہ

ان کی چند ثلاثیاں پیش کر رہی ہوں جن میں نہ صرف فکر کا عنصر بہت غالب ہے بلکہ شعریت سے بھی مزین ہیں۔

زاویہ نگاہ

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

شرط

شب کو سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

الہام

کوئی تازہ شعر اے رب جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر ـــــ محوِ انتظارِ جبرئیل

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شعریت اور فکری اور جمالیاتی عنصر ان کی غزلوں، نظموں، ثلاثیوں، افسانوی اور تمثیلی نظموں میں ہر جگہ کارفرما ہے۔ ان کی پوری شاعری کا بہت کم حصہ ایسا ہے جس پر Verstification کا اعتراض برحق ثابت ہو۔ "آگ میں پھول" سے "ہارون کی آواز" تک کا سفر فیض احمد فیض کے برعکس علی سردار جعفری کی طرح رزم سے رزم کی طرف سفر ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "آگ میں پھول" کی تپش انکے دوسرے مجموعے "مٹی کا قرض" میں کم تر اور "ہارون کی آواز" میں تقریباً ناپید ہوگئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جذبہ و احساس کی تپش پر وقت کے ساتھ فکر و نظر کی وسعت Icing کرتی رہی ہے۔ ویسے بھی حمایت علی شاعر صاحب کے یہاں ان کے ہم عصروں حبیب جالب، اور حسن حمیدی کی طرح احتجاج اور مزاحمت کی رو تو نہیں رہی لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کلام شاعر میں Status Quo کے خلاف مضبوط آواز نہیں سنائی دیتی بلکہ فرق اس وجہ سے محسوس ہوتا ہے کہ حبیب جالب اور حسن حمیدی کی طرح حمایت علی شاعر کبھی عملی سیاست میں سرگرم عمل نہیں رہے۔ مگر ان کے نظریات اور سماج میں جبر و استحصال پر مبنی نظام کے خلاف انکا رویہ اور تیور کبھی مصالحانہ (Compromising) نہیں رہے۔ ان کی طویل نظموں کا غائر مطالعہ میرے اس دعوے کی دلیل ثابت ہو سکتا ہے اور یہ بات ان کی پوری شاعری پر بھی صادق آتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اگر فن کے معیار فکر و جمال کو پیش نظر رکھا ہے تو اس سے ان کے Commmitment پر قطعی کوئی حرف نہیں آتا۔ جو لوگ کلام شاعر میں اس سے متضاد شاعر کو دریافت کرتے ہیں تو وہ اپنے شعور و ادراک پر جناب حمایت علی شاعر سے کہیں زیادہ زیادتی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کے سب سے بڑے شاعر فیض احمد فیض کے علاوہ فراق گورکھپوری اور پروفیسر منظور حسین شور بھی جید ترقی پسند شعراء میں سے تھے۔ لیکن ان کے یہاں بلند آہنگی کا فقدان اگر ان کے زندگی اور سماج سے کمٹمنٹ کو متاثر نہیں کرتا تو کلام شاعر پر بھی اعتراض اپنی کم فہمی اور غلط زاویہ نگاہ کا قصور ہے۔ زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ادب تفہیم حیات اور تنقید حیات بھی ہے اور کلام شاعر ادب کے اس منصب کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتا ہے۔

(مکتوبہ ماہنامہ "طلوع افکار" (کراچی) گوشہ حمایت علی شاعر جولائی ۱۹۹۰ء)

تثلیث

(اردو نظم میں نیا تجربہ)

اثر فاروقی (بھارت)

ادب زندگی کے ہر شعبہ پر صرف اثر انداز ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ انسانی زندگی اور ماحول کو مناسب طریقے پر بدلنے اور اسے ارتقائی منزلوں سے گزرنے میں مدد بھی دیتا ہے۔ اور فطرت کے تقاضوں کی تکمیل میں بھی پوری طرح اعانت کرتا ہے۔ اچھی تخلیقات دوامی ادب کی تخلیق کا باعث ہوتی ہے۔ اور وہ اچھے ادب کی تاریخ بھی بناتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ادب کو قدامت شکن اور دور جدید کا ترجمان نہ کہا جاتا۔ بقول اختر انصاری "ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تنقید بھی۔ وہ زندگی کی ترجمانی کے ساتھ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سماجی' سیاسی اور معاشی ماحول کی صرف عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں رنگ بھی بھرتا ہے" مختصر یہ کہ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور زندگی پر اثر انداز بھی۔ ادب کو زندگی کی تفسیر بنانے کے لئے یہ بات لازمی ہے کہ ہر فنکار اپنے زمانے کے حالات اور واقعات پر نہ صرف گہری نظر رکھے بلکہ وہ اپنے اطراف کے ماحول کو پرکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں تاکہ اس کے بعد وہ جس ذریعے کو آسان اور سہل سمجھے اسے اپناتے ہوئے موثر طریقے پر احساسات اور جذبات کے ذریعے عوام تک پہنچا سکے اور اگر اس کی بات میں تاثیر نہ ہو تو یہ سمجھ لینا ہوگا کہ وہ اپنے طریقہ کار میں کامیاب نہ ہوسکا جس کے بعد اسے کسی اور راستہ کو اپنانا ہوگا۔ ادب میں تبدیلی' تغیر اور لب لہجہ کی تبدیلی کی خاطر تجربے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بالخصوص اردو ادب کی تاریخ تجربوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر دور میں فنکار نے ادب کو زندگی سے قریب کرنے اور اسے عوام کا ترجمان بنانے کی خاطر بعض نئی باتیں...... اور تجربے کئے۔ بنیادی طور پر ترقی پذیر ادب کے لئے تجربے ناگزیر ہیں۔ ورنہ ادب کی ترقی کی رفتار نہ صرف متاثر ہوسکتی ہے بلکہ اس میں اضافہ بھی نہیں ہوسکتا۔ تجربوں کے دوران اس بات کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تجربے کسی پیش بندی یا محض کسی تبدیلی یا تغیر کی خاطر نہ کئے جائیں۔ چونکہ ایسی حالت میں ادب کی بنیادی اقدار کے متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔ اردو نثر میں جس طرح محمد حسین آزاد' پنڈت رتن ناتھ سرشار سے لے کر موجودہ دور کے نثر نگاروں نے وقت کے تقاضوں کی خاطر اور اردو ادب میں ترقی یافتہ اصناف کے اضافوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نئے اسلوب نگارش کو اپنایا' اسی طرح شاعری میں بھی ہزارہا تبدیلیاں اور تجربے ہوئے ہیں۔ بالخصوص اردو نظم میں اقبال' حالی' جوش' اختر الایمان' احمد ندیم قاسمی' فیض وغیرہ کو جدت طرازی اور تغیر و تبدیلی کی حد تک امتیازی مقام حاصل ہے۔ اسی طرح غزل میں بھی قدیم شعراء سے لے کر اب تک کئی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ جو ضروری اور ناگزیر تھیں۔ اور جن کے بغیر اردو ادب میں اضافے ممکن نہیں تھے۔ ان تبدیلیوں کو عوام نے بھی قبول کیا اور ان کو اپنی زندگی اور اپنے ماحول کے مطابق پایا۔ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ کسی بھی قدیم استاد و شاعر خواہ وہ غالب ہو یا میر ان کے اشعار کا اثر فوری طور پر ایک معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اور چاہے وہ اس کی تمام نزاکتوں کو بخوبی نہ سمجھ پایا ہو مگر اس کا ذہن و قلب اس کے اثر کو فوری قبول کرلیتا ہے۔ اردو نظم میں تجربوں کے دوران اکثر و بیشتر ایسی باتیں ہمارے سامنے آئی ہیں جو نہ صرف تخلیق ادب کے پیداوار کا باعث بنی ہیں بلکہ

ان کے اثر کو عوام نے بھی کسی طرح قبول نہیں کیا۔ چنانچہ ایسے تجربوں کو وہ حیثیت حاصل نہ ہوسکی جو زندہ اور جاندار ادب کی تخلیق کا باعث بنتے۔ جدید اردو نظم میں میرا جی، ن۔م۔ راشد کے تجربوں نے بلاشبہ اردو نظم کے لئے ایک ایسا میدان مہیا کیا جس میں کامیاب اور خوبصورت آزاد نظموں نے اردو ادب میں جگہ پائی۔ مگر باوجود اس کے اکثر "Something New" کے فارمولے پر عمل کرنے والے شعراء نے اس تجربے کو بڑی حد تک غیر موثر بنا کر رکھ دیا۔ ہمارے بعض نقاد، شاعر اور ادیب، انگریزی یا کسی بھی غیر ملکی زبان کے اسلوب، لب و لہجہ سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ انہوں نے من و عن ان چیزوں کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ جو یہاں آکر ایک "عیب" کا درجہ حاصل کر گئی۔ حالانکہ یہی بات اس زبان میں خوبصورتی اور ندرت کا باعث ہے لیکن بنیادی طور پر اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ادب کو ترقی پذیر رکھنے اور اس میں اضافوں کے لئے "تجربوں" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حال ہی میں حمایت علی شاعر نے اردو نظم میں "ثلاثی" کے عنوان سے ایک نئے فارم کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس خصوص میں حمایت علی شاعر کا ادعا یہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں کہنا چاہتے ہیں کیونکہ اس سائنسی دور میں فنکار کو عوام تک مختصر و مفید پیمانے کو اپناتے ہوئے اپنی بات پہنچانی چاہئے۔ اردو ادب میں اس طرح کی کئی مثالیں موجود ہیں کہ اکثر فنکاروں نے کامیاب طریقہ پر مختصراً اپنا ادعا عوام تک پہنچایا ہے۔ خود اردو ادب میں اس کی واضح مثال رباعی ہے۔ اور حالی، جوش و امجد کی رباعیات اردو ادب میں نہ صرف اضافہ کا درجہ رکھتی ہیں بلکہ ان کا انداز بیان کامیاب اور متاثر کن ہے۔ یہی نہیں بلکہ غزل کا ایک کامیاب شعر بھی اس بات کی دلیل بن سکتا ہے مگر تجربوں کے دوران ہم ادب کے بنیادی اقدام کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جدید اردو نظم کے ساتھ یہ بڑی ٹریجڈی ہے کہ اسے بار بار پڑھنا پڑتا ہے یا پھر اس کے مفہوم سے صرف شاعر ہی واقف ہوتا ہے اور وہ کسی طرح عوام کے پلے نہیں پڑتی۔ جدید اردو نظم میں ابہام اسی بات کا نتیجہ ہے۔ ممکن ہے ہمارے شعراء ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اس نظریئے سے متاثر ہوں "یہ ضروری نہیں کہ شاعر جو کچھ کہے وہ سب کی سمجھ میں آسکے۔" مگر جب پڑھا لکھا طبقہ ان تخلیقات کو سمجھنے سے قاصر ہو تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو نسبتاً "کم شعور رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہی طبقہ غالب یا میر کے کسی بھی اچھے شعر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ حمایت علی شاعر اردو ادب میں نئی اقدار کے حامی ہیں اور ان کی تخلیقات اپنے ماحول کی عکاس و ترجمان بھی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر وہ رباعی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ثلاثیات کو رواج دینا چاہتے ہیں تو یہ بات صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ اس میں احساسات اور جذبات کو متاثر کرنے والی بات ہو۔ اور اسے عوام قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ ان کی بعض ثلاثیات پیش ہیں تاکہ رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔

پتھر

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

سایہ

شب میں سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

شاعری پیغمبری

پھر کوئی فرمان اے ربِ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر محو انتظار جبرئیل

ان تثلیثات کے گہرے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں تاثر کی بھرپور چاشنی ہے اور یہ قارئین کو متاثر کرنے کی قدرت رکھتی ہیں۔ ایسی صورت میں شاعر کے اس تجربے کی کامیابی کے امکانات موجود ہیں مگر صرف شرط یہ ہے کہ اس تجربے کو بھی کسی پابندی یا پیش بندی کی خاطر نہ کیا جائے۔ جس کی وجہ سے اس میں روکھا پن اور بے کیفی پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ حمایت علی شاعر ایک ذہین فنکار ہیں۔ وہ یقیناً "اس تجربے کی کامیابی کے لیے راہیں ہموار کرسکتے ہیں۔ اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہ تجربہ اردو ادب میں "ضرورت" کی پیداوار ہے یا نہیں۔ یقیناً اردو ادب میں تجربوں نے انحطاط پیدا کیا ہے مگر جہاں تک شاعر کے نکتہ نظر کا سوال ہے وہ اس تجربے میں ضرورت کو پیش نظر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اسے پوری طرح ثابت نہیں کرسکتے۔ ورنہ وہ مختصر نظمیں اور قطعات کی تخلیق کو "تثلیث" کے ساتھ ساتھ جاری نہ رکھتے۔

بہرحال حمایت علی شاعر کے اس تجربے کو جس کو مذہبی عقیدے "تثلیث" سے محفوظ رکھنے کے لیے رباعی کے وزن میں "ثلاثی" بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسی وقت دوامی یا مستقل شکل حاصل ہوسکتی ہے جب وہ اس قول پر "اچھی تخلیق کا یہ معجزہ ہوتا ہے کہ وہ پڑھنے والے کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ اس میں تغیر پیدا کرتی ہے اور جب کسی شے یا انسان میں تغیر پیدا ہوجائے تو اس کا لازمی اثر خارجی چیزوں مثلاً ماحول وغیرہ پر پڑے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا اور اندرونی تغیر کے بعد ماحول کو بدلنے کی کوشش نہ کی گئی تو سمجھئے کہ پڑھنے والے نے صحیح طور پر اسے سمجھا نہیں۔ اور لکھنے والا اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا" پورے اترے۔ حمایت علی شاعر اردو نظم کے مزاج اور اس کے ماحول سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس لیے تثلیث کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ان کے فنی خلوص، لگاؤ اور فن سے گہری وابستگی پر ہے۔ بصورت دیگر ان کا شمار بھی ان شعراء میں ہوگا جنہوں نے جدت طرازی کے نام پر مبہم نظموں کی تخلیق کی اور اردو ادب کو تنزلک و ناقابل فہم بنانے کا باعث ہوئے۔

(مطبوعہ ماہنامہ "الشجاع" کراچی، جون ۱۹۶۳ء

حرف تحسین

(منظوم)

راغب مراد آبادی

قطعات

رباعیات

گل باغ اورنگ آباد میں — ناز فطرت، جمال شاعر کا ہے
حمایت علی شاعر خوش مزاج — حسن قدرت کمال شاعر کا ہے
مبارک، کہ اے سرزمین دکن! — راغب ہو وہ "شخص و عکس" یا "آگ میں پھول"
سزاوار عظمت ہیں مثل سراج — دونوں سے عیاں، کمال شاعر کا ہے

میر حمایت علی، خوش نظر و خوش مزاج — فن کی خدمت ہے نیکنامی کا ثبوت
سرو بہشت دکن، گوہر تاج سراج — فنکار کی خورشید مقامی کا ثبوت
اپنی مثال آپ ہیں، اپنی نظیر آپ ہیں — "بنگال سے کوریا تک" اک نظم طویل
شاعر آفاق ہیں، خدمت اردو میں آج — شاعر کی ہے قادر الکلامی کا ثبوت

حمایت علی شاعر نیک نام — شاعر کے فن کی ایک دل کش تصویر
خوش، اخلاق، خوش فکر، شیریں کلام — الفاظ سے کی، تاج محل کی تعمیر
نہ کیوں ان پہ نازاں ہو برصغیر — خود "شیخ ایاز" بھی ہے اک زندہ ثبوت
یہ ہیں شاعر واجب الاحترام — "مٹی کا قرض" بھی ہے بے مثل و نظیر

دیدنی ہے حمایت علی کا ہنر — "ہارون کی آواز" سے کیوں دل نہ ہو شاد
وہ حمایت، کہ ہے شاعر معتبر — شاعر کی طبیعت ہے معانی ایجاد
آپ ہی رہنما، آپ ہی راہبر — لیلائے غزل کے بھی سنوارے خدوخال
قرب ساحل ہے اور "تشنگی کا سفر" — اور صنف "ثلاثی" کی بھی رکھی بنیاد

قطعہ

حمایت علی، شاعر نکتہ بیں ہیں
یہ مسند نشین صفِ اولیں ہیں
ہے توقیرِ فن انفرادیت ان کی
نہ غالب، نہ یہ میر کے خوشہ چیں ہیں

حمایت علی شاعر اک صاحبِ علم و من جملہ اہلِ فکر و نظر ہیں
حمایت علی شاعر اپنے اب وجد کے اوصافِ اعلیٰ سے بھی بہرہ ور ہیں
قدم جادہ مصلحت پر نہ رکھا کہ یہ زیب دیتا نہیں آدمی کو
حمایت علی شاعر اک مردِ حق ہیں، حق اندیش، حق طینت و حق نگر ہیں
نبرد آزما مشکلوں سے رہے ہیں کٹھن دور بھی آزمائش کا آیا
بھٹکنے کا اندیشہ ہے، وہم باطل رہ و رسمِ منزل سے یہ باخبر ہیں
غزل کی بھی زلفِ دوتا کو سنوارا رخ و گیسوئے نظم کو بھی نکھارا
ادب جن پہ نازاں رہے گا ہمیشہ، یہ شاعر ہیں ایسے یہ وہ دیدہ ور ہیں
ہو کیسے نہ روحِ سراج ان پہ نازاں کہ اربابِ دانش ہیں آج ان پہ نازاں
حمایت علی شاعر اورنگ آباد کے علم پرورده و باہنر ہیں
خراجِ عقیدت کرو پیش راغب یہ ہے رائے اربابِ دانش کی صائب
حمایت علی شاعر اس دورِ ناقدریِ فن میں اک شاعرِ معتبر ہیں

(۱۰ اگست ۱۹۸۷ء کو بہادر یار جنگ کلب میں حضرت راغب مراد آبادی نے یہ اشعار "حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام" میں سنائے تھے۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر کرار حسین، سابق وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی نے کی تھی اور انور عنایت اللہ (مرحوم) مہر الٰہی شمسی (مرحوم) احمد ہمدانی اور نکہت بریلوی نے مضامین پڑھے تھے اور روزنامہ "کلیم" (سکھر) کا حمایت صاحب سے متعلق ایک خصوصی شمارہ بھی شائع کیا گیا)

احمد رئیس

نذرِ شاعر

اے ڈی اے لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام (۲۳-۱۱-۷۲ء)

وہ ایک شاعر
وہ اک مغنی
جو گیت لکھتا ہے زندگی کے
جو پیار کرتا ہے آدمی سے
ہمیں محبت ہے بس اسی سے-----
وہ ایک شاعر
وہ اک مغنی
جو عصر حاضر کا ترجماں ہے
جو آنے والے
حسین لمحوں کا نغمہ خواں ہے
ہمیں عقیدت ہے بس اسی سے-----
وہ ایک شاعر
وہ اک مغنی
کہ جس کے اشعار میں اجنتا کا بانکپن ہے
وہ جس کی نظموں میں
خوبصورت، حسیں ایلورہ کا بھولپن ہے
مرہٹواڑے کی دلکشی ہے
وہ جس کی آواز-----
کل تلنگانہ کی سرخ تہذیب کا نشان ظفر بنی تھی
جو اب کراچی سے تا پشاور رواں دواں ہے
میرے وطن کے

پیالے محنت کشوں کے
غمگین اداس لمحوں کی ہم سفر ہے
جو محترم سے بھی محترم ہے
جو معتبر ہے
عظیم تر ہے
ہمیں بھی رغبت ہے بس اسی سے-----
وہ ایک شاعر
وہ اک مغنی
کہ جو سراج و ولی کا ہمزاد و ہم سخن ہے
وہ جس کو مخدوم نے دعا دی
اریب کہتا تھا جس کو بھائی
جلیس جس کی حسین راہوں میں اپنی پلکیں بچھا رہا ہے
ضیائی کو جس سے پیار سا ہے
ظفر بھی جس پر نثار سا ہے
ہمارا ہمدم ہے
یار سا ہے
اسے ہم اپنا
رفیق و دمساز جانتے ہیں
اسے ہم اپنے
لہو کی آواز مانتے ہیں
ہمیں بھی نسبت ہے بس اسی سے-----

یہ شام ابراہیم جلیس کے زیر صدارت منائی گئی تھی اور اس میں حمایت صاحب کی شخصیت اور شاعری پر ابراہیم جلیس کے علاوہ مسلم ضیائی، مرزا ظفر الحسن، سرور بارہ بنکوی، سحر انصاری اور محسن بھوپالی نے مضامین پڑھے تھے۔ منظوم نذرانہ محبت مجیب خیر آبادی اور احمد رئیس نے پیش کیا تھا۔ (مرتب)

(حمایت علی شاعر کے نام)

علی آذر

میں ایک شاعر جادو بیاں سے واقف ہوں
میں ایک محرم سر نہاں سے واقف ہوں
میں ایک صاحب الہام جاں سے واقف ہوں
میں ایک طائر جواں سے واقف ہوں
میں ایک طائر فکر جواں سے واقف ہوں!

شعور ذات کا زہراب پی لیا جس نے
خرد کے سیل میں خود کو ڈبو دیا جس نے
کی آشنائی ہر اک سے بجز خدا جس نے
کیا ہے خود کو حقیقت سے آشنا جس نے
میں ایک محرم سر انا سے واقف ہوں

ہیں شعر جس کے، نقیب خلوص و دانائی
دروغ و مکر کے آگے نہ کی جبیں سائی
عطا ہوئی اسے قلب و نظر کی بینائی
محبتوں کی امیں، اس کی نغمہ پیرائی
میں ایک شاعر رنگیں نوا سے واقف ہوں!

عیاں ہے سوز سخن سے شکستگی دل کی
سموئی اس نے غزل میں نمود بھی گل کی
نہ ناخدا کی ہے پروا اسے، نہ ساحل کی
مجھے لگے ہے کہ اس کو خبر ہے منزل کی
میں ایک مدعی سر "لا" سے واقف ہوں

جو شخص شمع کے مانند خامشی سے جلا
شکست و ریخت کی منزل سے کامراں گزرا
جو اپنی ذات کی پرچھائیوں میں بٹ بھی چکا
کسے خبر ہے کہ وہ اپنی ذات میں ہے کیا!
میں اپنی ذات کے اس دیوتا سے واقف ہوں

مٹی کا قرض

"مٹی کا قرض" دیکھ کے احساس یہ ہوا
گلدستہ معانی کا ہر رنگ، رنگ ہے!
اک بات خاص طور سے محسوس یہ ہوئی
شاعر کی خود سے اور خدا سے بھی جنگ ہے!

نذرِ شاعر

رشیدہ عیاں (امریکہ)

ہے باغِ فن انہیں کا شہادت کلی کی ہے
یہ گل بھی سرزمین دکن کے ولی کی ہے
ہے "بابِ علم" ان پہ اگر وا تو یہ سمجھ
حاصل انہیں ضرور حمایت "علی" کی ہے

کشور غنی (کینیڈا)

کھلائے آگ میں جو پھول ایسا شاعر ہے
اسے خبر ہے وہ کس عہد کے عتاب میں ہے
اسی عذاب سے اٹھا ہے شاعری کا خمیر
اسی خمیر کا جلوہ' ہنر کی آب میں ہے

دستگیر غازی (بھارت)

ترجمانِ حیات ہے شاعر
واقفِ سرِ ذات ہے شاعر
شاعری ہے محیطِ عالم پر
شاعرِ کائنات ہے شاعر

نیک دل خوش خصال ہے شاعر
آپ اپنی مثال ہے شاعر
شاعری کو دوام حاصل ہے
شاعرِ لازوال ہے شاعر

○

ہے ادیبِ عصرِ حاضر' شاعرِ فطرت بھی ہے
معترف اہلِ قلم ہیں' مالکِ شہرت بھی ہے
نظم ہو یا نثر ہو' تحریر میں جدت بھی ہے
منفرد انداز ہے' اظہار پہ قدرت بھی ہے
رونقِ محفل ہے ہستی' بزم کی زینت بھی ہے
اور ترنم شاعری کے واسطے رحمت بھی ہے
مختلف اصناف میں مشقِ سخن صد آفریں
صاحبِ دیوان شاعر' لائقِ مدحت بھی ہے
آج کے شاعر ہزاروں ہو تو سکتے ہیں مگر
کیا کسی کو آنے والے' دور سے الفت بھی ہے
صد نو کا ہے حمایت' شاعرِ عالی مقام
شاعری میں اس کی مضمر' زندگی کا ہے پیام

○

حکیم اورنگ آبادی (بھارت)

کیف و سوغات' بہاروں کی یہ لے کر آئے
پھر وطن میں جو "حمایت علی شاعر" آئے
اس کو بھولا کوئی کیسے کہے' جو صبح گیا
دیکھ کر رنگِ جہاں' شام کو جو گھر آئے
دانش و ذوقِ ادب کا ہے جو ہنگامہ بپا
شہر میں شعر سراپا کے یہ پیکر آئے
ہیں تہی دامنِ بزمِ سخن پاکستان
جھولیاں بھر کے جو بانٹے وہ سخنور آئے
شعر کہنے کی نہ تکلیف کریں آپ حکیم
دیکھ لیجئے کہ یہاں کتنے سخنور آئے

تجزیاتی مطالعہ

تضاد

(یہ نظم "بگولہ" کے عنوان سے مجموعہ کلام "مٹی کا قرض" میں شامل ہے)

میں سوچتا ہوں
میں ایک انساں ہوں، ایک مشتِ غبار ہوں میں
مگر میں کیا ہوں؟

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا
کہ ایک آواز سرسرائی فضا کی خاموش وسعتوں میں
پلٹ کے دیکھا
کوئی ہوائی جہاز پرواز کر رہا تھا
جو لحظہ لحظہ بلندیوں کی طرف رواں تھا
میں اس کو تکتا رہا مسلسل
نہ جانے کب تک!

نہ جانے اس لحظہ گریزاں کے تنگ دامن میں
کتنی صدیاں سمٹ گئی تھیں
نہ جانے میری نظر میں کتنے نئے افق جگمگائے
کتنے ہی چاند سورج ابھر کے ڈوبے
نہ جانے وہ کون سا جہاں تھا!
زمیں کہ پاؤں تلے کوئی فرشِ زر ہو جیسے
فلک کے سر پر ردائے آب گہر ہو جیسے

فضا..... منور
ہوا..... معطر
نفس نفس میں بسی ہوئی نکہتِ گلِ تر
خلاؤں میں مشتری و زہرہ کا رقص جاری،
تمام عالم پہ ہلکا ہلکا سرور طاری

نہ جانے میں کس خیال میں گم.....
کس ابر پارے پہ اڑ رہا تھا
غرور سے سر بلند کر کے ہر اک ستارے کو دیکھتا تھا
کہ ایک دلدوز چیخ گونجی فضا کی خاموش وسعتوں میں
میں چونک اٹھا
پلٹ کے دیکھا
گلی سے اک ہڈیوں کا ڈھانچہ گزر رہا تھا
جو چیخ کر ایک اک سے کہتا تھا..... "ایک روٹی"
"خدا تمہارا بھلا کرے گا"

میں سوچتا ہوں
میں ایک انساں ہوں، دہر کا تاجدار ہوں میں!
مگر میں کیا ہوں؟

تضاد کا جائزہ

("ادبی دنیا" لاہور میں "تجزیاتی مطالعہ" کا سلسلہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں برسوں جاری رہا...... یوں کہ "شاعر کا نام ہٹا کر" نظم "اہل فکر و نظر" کو بھیج دی جاتی اور پھر سب کے "تجزیئے" شاعر کے نام کے ساتھ رسالے میں شائع کر دیئے جاتے حتیٰ کہ خود "تخلیق کار" کا تجزیہ بھی۔ مرتب)

مجید امجد

اس نظم کو پڑھتے ہی' سب سے پہلے مجھے جس چیز نے متاثر کیا ہے وہ اس کی سطور کی بے ساختہ روانی' اظہار کی برجستگی اور الفاظ کی رواں دواں کیفیت ہے' موضوع کسی قسم کے ابہام سے ملوث نہیں' شاعر اپنی فکر کی موج کے ہمراہ نقرے نقرے مانوس الفاظ کے پھول چنتا چلا گیا ہے!

میں محسوس کرتا ہوں کہ نظم کا درمیانی حصہ خاص طور پر تیسرا اور چوتھا بند' بہت اہم ہے' اس حصے کے اندر نثر نما ٹکڑوں کے روپ میں ایک شعری کیفیت ابھری ہے جو ساری نظم کو سہارا دے گئی ہے' یہی حصہ' نظم کا سب سے بلند حصہ ہے' یہاں سرمستی جذبات اور خلوص بیان کی وجہ سے ایک خوبصورت اور موثر شعری پیرایہ نظم کی بنیادی خیال کو نصیب ہوا ہے۔ شاعر نے واقعی بے کراں فضاؤں میں اڑنے والے ایک طیارے کی پرواز سے' ایک حیرت مند مسرت کا احساس کیا ہے' اور اسے بڑے ہی حسن سے قلم بند کر دیا ہے' لیکن آگے چل کر یہی حیرت ایک سوچتی ہوئی بے بسی' اور ایک تڑپتی ہوئی بے چارگی کی شکل اختیار کر لیتی ہے' موضوع کے اندر رجعت کچھ اس انداز سے آئی ہے کہ پڑھنے والا شاید اسے قبول نہ کر سکے' نظم کا یہ موڑ' جہاں شاعر ہوائی جہاز کی اڑان سے نظریں ہٹا کر گلی سے گزرنے والی بھکاری کی آواز کی طرف متوجہ ہوتا ہے' کسی مشاہدے پر مبنی معلوم نہیں ہوتا' بلکہ ایک ایسی سوچی سمجھی کاوش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے جسکے پیچھے کوئی جذباتی تحریک نہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے' شاعر کا ذہن ہوائی جہاز کی حیران کن پرواز سے اخذ کیف کرنے کے بعد' ایک ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرف' جو ایک روٹی کے لئے پکار رہا تھا' کیوں منتقل ہوا؟ یہاں ایک تباہ حال' شکستہ بند گداگر کی ایک من گھڑت تصویر کیوں اس کے خیال میں جاگی؟ کہیں وہ اس یقین کا تو شکار نہیں کہ انسانی علم و دانش کی بلندیوں اور موجودہ انسانی معاشرے کی بے چارگیوں کے درمیان جو تضاد ہے' وہ کبھی ختم نہ ہو سکے گا' کہیں یہی یقین ہی اس نظم کی تخلیق کا باعث تو نہیں ہوا؟ اس کو ثابت کرنے کے لئے اس نے جس خارجی منظر کی ہیئت تراشی ہے وہ اس نے اپنے احساس سے حاصل نہیں کیا۔ بلکہ ذہن کی ایک شعوری جست سے حاصل کیا ہے۔

اور سب سے بڑی پر لطف بات یہ ہے کہ یہ جان کر کہ اس سے نظم کے اندر جو تصور پیدا ہوا ہے وہ اس کے ذہن کی پیدا کردہ اور شعوری کاوش کا نتیجہ ہے' شاعر نے اس تاثر کی تردید کے لئے دو بلیغ جملے' ایک نظم کے شروع میں اور ایک نظم کے آخر پر ایزاد کئے ہیں۔ شروع میں کہتا ہے۔

میں انساں ہوں ایک مشت غبار ہوں!
مگر میں کیا ہوں؟ اور آخر میں جا کر کہتا ہے

میں ایک انساں ہوں، دہر کا تاجدار ہوں میں!

مگر میں کیا ہوں؟

میری نظر میں، ان دو جملوں کو نظم میں رکھ کر اس نے متضادات فن سے آگہی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، اور اس طرح قاری کو ایک پر پیچ کیفیت سے دوچار کیا ہے۔ یہی وہ تضاد ہے، جو اس کی نظم کا موضوع ہے اور جو اپنی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ نمودار ہو گیا ہے، یہ تاثر اگرچہ گہرا اور گمبھیر نہیں ہے، چونکا دینے والا ضرور ہے۔

انجم رومانی

انسانی ارتقاء کی تاریخ میں موجودہ دور ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے، سائنسی ترقی کی بدولت انسان کو زمان و مکاں پر جو ایک گونہ اختیار حاصل ہوا ہے اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ تسخیر فطرت میں اس نمایاں کامیابی پر وہ جس قدر فخر کرے کم ہے۔ لیکن اس تصویر کا ایک رخ اور بھی ہے۔ اس کی اپنی زندگی کے بعض بنیادی مسائل پریشان کن صورت اختیار کرتے چلے گئے ہیں۔ بسا اوقات بعض افراد جسم و جاں کے رشتے کو برقرار رکھنے کے وسائل تک سے محروم نظر آتے ہیں اور سوائے دست سوال دراز کرنے کے ان کے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا۔ کائنات کو مسخر کرنے والے عظیم انسان کی یہ لاچاری اس نظم کے مرکزی کردار کو اس سوچ کی وادیوں میں لے جاتی ہے کہ آخر یہ "مجموعہ اضداد" کیا ہے؟ "مگر میں کیا ہوں؟"...... یہ سوال جو نظم کے پہلے اور آخری بند میں اٹھایا گیا ہے مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ متذکرہ بالا تضاد جو نظم کے درمیانی حصے میں پیش کیا گیا ہے اس سے مقصد معاشرے پر کسی قسم کی طنز نہیں، بلکہ قاری کے ذہن کو اس مابعد الطبیعاتی مسئلے کی طرف مائل کرنا ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا۔

"مگر میں کیا کروں؟" نظم کے آغاز میں ایک انسان کو اس ازلی اور ابدی سوال میں گم دکھایا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک ذہنی دھچکے سے کام لے کر اس کی سوچ کا رخ موڑ گیا ہے اور اسے انسانی کارناموں پر افتخار کی جنت میں ٹہلتا ہوا پیش کیا گیا ہے۔ اس دوران میں اسے ایک "دلدوز چیخ" سنائی دیتی ہے اور وہ چونک اٹھتا ہے اور انسانی لاچاری کے ایک منظر سے دوچار ہوتا ہے جو اسے پھر اسی مابعد الطبیعاتی سوچ میں گم کر دیتا ہے۔

یہ درست ہے کہ بعض اوقات مختلف النوع ذہنی دھچکے مابعد الطبیعاتی سوچ کے محرک ہوتے ہیں تاہم اس نظم میں ان دھچکوں کو پیش کرنے کے انداز میں کسی قدر سستا پن پایا جاتا ہے۔ چنانچہ "مگر میں کیا ہوں" کا سوال قاری کے ذہن میں پوری طرح شدت کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔

نظم کا درمیانی حصہ ایسے الفاظ اور علائم پر مشتمل ہے جو کچھ عرصے سے ہمارے یہاں ایک فیشن کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور نظم میں وہ فضا قائم نہیں ہو سکی جس کا اس کا مابعد الطبیعاتی موضوع متقاضی تھا۔

(نظم میں "پاؤں" کے لفظ کو فاعلن کے وزن پر باندھا گیا ہے، جو درست نہیں)

خلیل الرحمٰن اعظمی

اس نظم کے شاعر کو جس سوال نے پریشان کیا ہے اس کا ایک دلچسپ جواب تو نظیر اکبر آبادی کا "آدمی نامہ" ہے یعنی۔

دنیا میں ہے بادشاہ سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

لیکن نظم "تضاد" کے شاعر کی تسکین اس جواب سے نہیں ہو سکتی اور نہ اس نے یہ سوال ہم سے، آپ سے یا نظیر اکبر آبادی سے کیا ہے۔ اس نے یہ سوال خود اپنے آپ سے کیا ہے۔ یہ شاعر نظیر کی طرح نہ تو سیلانی ہے اور نہ پنچائتی کہ آدمیوں کے اس میلے میں جی بھر کے سیر سپاٹے کرے اور اس مسلمہ اصول کو مان کر کہ یہ خدائی کارخانہ ہے، اس قادر مطلق نے جس کو اس ناپائیدار دنیا میں بھیجا اس کی ایک تقدیر بنا دی اور قسام ازل نے ہر ایک کو وہی "قسمت" کیا۔

جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

ایسی صورت میں ہمیں کسی جھگڑے میں پڑنے کے بجائے اس کے لگائے ہوئے اس میلے کا تماشا دیکھنا اور اس سے لطف اٹھانا چاہئے بلکہ یہ شاعر اپنی قسم کا ایک فلسفی ہے جو اپنی ذات کے اندر ایک ذہنی سفر کرکے اپنے آپ کو دریافت کرنا چاہتا ہے اور پھر اسے ایک کلی حقیقت کا روپ دینا چاہتا ہے لیکن کوئی صحت مند داخلیت خارجیت سے یکسر اپنا دامن نہیں بچا سکتی۔ بعض اوقات خارجی حقائق سے منہ موڑ کر خواب کی دنیا میں بھی انسان پناہ لے لیتا ہے اور اپنی تخیلی دنیا عرش سے پرے بنا لیتا ہے لیکن اگر اس کے حواس بیدار ہیں، اور وہ مردہ و مفلوج یا کسی افیم کے نشے کی وجہ سے سن نہیں ہو گئے ہیں تو خارجی زندگی کا پرتو اس کے خوابوں کی دنیا پر ضرور پڑے گا۔

انسان کو اپنی دریافت کا موضوع بنانے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ عینی یا آورش وادی ہے۔ یہاں انسان اتنی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے کہ خدا سے بھی ٹکر لینے لگتا ہے اور اپنے کارناموں کو

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

کہہ کر اپنی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔ دوسرا طریقہ اس کی پستیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد اسے نفرت سے ٹھکرا دینے کا ہے یعنی یہ کہہ کر اس کی تحقیر کرنے کا کہ

اب تک تو فقط دم ہی جھڑی ہے پیارے

ایک اور طریقہ بھی اس کی ذات کے مطالعے کا یہ رہا ہے کہ اس کی مادی فتوحات کا اس کی روحانی نارسائیوں سے مقابلہ کرکے اس کے نامکمل ہونے کا احساس کیا جائے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

کبھی کبھی اس کی فطرت اور جبلت کے بعض متضاد عناصر پر غور کرنے کا عمل بھی رہا ہے مثلاً"

شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

لیکن نظم "تضاد" کا شاعر نہ تو آورش وادی ہے نہ روحانی بلندیوں کا شیدائی اور نہ اسے انسان کی شیطنت یا اس کی پاکیزگی سے سروکار ہے اس نے اپنا ذہنی سفر خالص حقیقی دنیا میں کیا ہے اور صرف مادی نقطہ نظر سے انسان کے وجود نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا ہے وہ انسان کو ایک کل یا ایک اکائی کی حیثیت سے سمجھنا چاہتا ہے۔ یہ نقطہ آغاز خالص فلسفیانہ نوعیت کا ہے۔ وہ جب اپنے آپ کو انسان سمجھ کر سے ایک اکائی سمجھ کر' ایک ایسی ذات سمجھ کر جو کل کی نمائندہ ہے' اپنی ہستی کے اندرون میں سفر شروع کرتا ہے تو لامحالہ خارجی انسان داخلی انسان بن کر اس کی ذات میں سامنے آتا ہے چنانچہ پہلے تو اس پر اس انسان کا سایہ پڑتا ہے جو مادی فتوحات سے ہمکنار ہے۔ اس انسان کا سایہ پڑتے ہی اس کے قدم زمین پر اوپر اٹھ جاتے ہیں اور وہ رنگ و نور کی حسین و جمیل وادی میں پرواز کرنے لگتا ہے۔

زمیں' کہ پاؤں تلے کوئی فرش زر ہو جیسے
فلک کہ سر پہ رواء آب گہر ہو جیسے

فضا...... منور
ہوا...... معطر
نفس نفس میں بسی ہوئی نکہت گل تر"
خلاؤں میں مشتری و زہرہ کا رقص جاری
تمام عالم پہ ہلکا ہلکا سرور طاری

لیکن شاعر نے یہ سفر پوری انسانی ہستی کی اکائی کی حیثیت سے کیا ہے اس لئے ابھی یہ سفر مکمل نہیں ہوا تھا' ابھی یہ پرواز جاری تھی اور اس خوبصورت سفر کا سرور طاری تھا کہ اس کل کے دوسرے جز نے اپنا سایہ ڈالنا شروع کیا یعنی انسان کی بے چارگی اور نارسائی اور اس کی مادی سطح کا دوسرا نقطہ جو اپنی پستی کی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ اس جز کا سایہ پڑتے ہی پہلے جز یا پہلے انسان کی پرچھائیں معدوم ہو جاتی ہے اور اسی لئے اس کا ساتھ شاعر نے جس منزل تک پرواز کی تھی وہاں سے بتدریج اترنے کے بجائے وہ دھم سے زمین پر آن گرتا ہے کیونکہ جن پروں کی مدد سے وہ اس بلندی تک پہنچا تھا وہ پر غائب ہو چکے ہیں اور یہ دوسرا سفر آن کی آن میں ختم ہو جاتا ہے اور نہ صرف ختم ہو جاتا ہے بلکہ اس پستی میں اچانک گرنے کے بعد اس کے جسم و جاں پر ایسی ضرب پڑتی ہے کہ اس کا سارا وجود ہل جاتا ہے۔ جس سوال کے جواب کی تلاش میں اس نے یہ ذہنی سفر کیا تھا اسے اس مقصد میں نہ صرف یہ کہ ناکامی ہوتی ہے اور سوال بدستور اپنی جگہ باقی رہتا ہے بلکہ کچھ اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔
یہ نظم اپنے نقطہ نظر' ہیئت اور طریقہ کار ہر اعتبار سے جدید ہے اور جس بے ساختگی' روانی اور تازہ کاری سے اس نظم میں ایک فضا تیار کی گئی ہے اور انسانی معاشرے کے تضاد کا المیہ پیش کیا گیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ نظم کی بحر میں پرواز کرنے اور حسین مناظر سے اپنی روح کو ہم آہنگ کرنے کا پورا سامان موجود ہے اور نقطہ عروج کے بعد اچانک اس کا خاتمہ

بھی فنکارانہ ہے۔ البتہ اس نظم میں دو ایک باتیں محل نظر ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ جب شاعر کے ذہن میں یہ سوال آیا کہ انسان کیا ہے؟ اور اس کے لئے اس نے دو مصرعے لکھے۔

میں ایک انساں ہوں' ایک مشت غبار ہوں میں

مگر میں کیا ہوں؟

تو "میں ایک انسان ہوں" کہنے کے بعد "ایک مشت غبار ہوں میں" کہہ کر اس سوال کی حیرت انگیزی اور تجسس کے عنصر کو کمزور کر دیا گیا ہے۔ گویا اپنی نارسائی کا اعتراف پہلے ہی کر لیتا ہے۔ اس صورت میں نفسیاتی طور پر اس کا ذہن اس پرواز کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا جس کا آغاز دوسرے بند میں ہوتا ہے۔ پھر ایک بات اور ہے "مشت غبار" کا استعارہ حیات انسانی کی بے ثباتی اور اس کے فانی وجود کی طرف ذہن کو متوجہ کرتا ہے اس لئے گمان ہوتا ہے کہ ممکن ہے شاعر نے انسانی فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد فنا اور موت کے گے اس کی بے بسی اور نارسائی اور اس کے ارادوں کی شکست کو بیان کیا ہو۔ اولاً تو اس نظم کا خاتمہ

گلی سے اک ہڈیوں کا ڈھانچہ گزر رہا تھا
جو چیخ کر ایک اک سے کہتا تھا "ایک روٹی"
"خدا تمہارا بھلا کرے گا"

موت کے بجائے بھوک اور مادی افلاس کی تلخ حقیقت کی طرف لے جاتا ہے لیکن بالفرض اگر شاعر' فنا یا موت پر ہی اپنی نظم کو ختم کرتا یا ہڈیوں کے ڈھانچے کو موت کا پیش خیمہ سمجھ کر ہم اس بیان کو فنا ہی سے تعبیر کریں یا مشت غبار سے محض انسان کی بے بضاعتی تصور کریں تو بھی نظم استفہام یا تجسس سے شروع ہوتی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ انجام یا المیہ سے متعلق کسی ہلکے سے اشارے کو بھی پہلے سے قاری کے سامنے نہ لایا جائے ورنہ اس نظم کی رمزیت اور اس کا تاثر دونوں مجروح ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آخر میں جو مصرعے دیئے گئے ہیں۔

میں سوچتا ہوں
میں ایک انسان ہو' دہر کا تاجدار ہوں
مگر میں کیا ہوں!

میرا خیال ہے کہ یہ مصرعے بھی زائد ہیں اور نظم کے تاثر میں اضافہ کرنے کے بجائے اسے ہلکا کرتے ہیں اور "پھر دہر کا تاجدار" بھی کچھ بے جوڑ سا ٹکڑا ہے ایک تو "تاجدار" کے استعارے میں کوئی تازگی نہیں' دوسرے انسان کی فتوحات کو نظم کے آغاز میں جس پرواز سے تعبیر کیا گیا ہے لفظ "تاجدار" کی معنویت کو صدمہ پہنچتا ہے اور اس کا بلاغت اور وسعت میں خلل انداز ہوتا ہے۔ یہ نظم

"خدا تمہارا بھلا کرے گا"

پر ہی ختم ہو جائے تو اس کی معنی خیزی اور اشاریت میں نہ صرف یہ کہ اضافہ ہوگا بلکہ جس کرب انگیز حیرت اور کشمکش کو شاعر پیش کرنا چاہتا ہے اور جو اس تضاد سے نمایاں ہوتی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ حیرت اپنے لئے الفاظ کا سہارا نہ ڈھونڈے بلکہ اس زبردست استفہام کو اپنی خاموشی سے ہی ظاہر کرے تاکہ اس سوال کی پیچیدگی اور اس تضاد کی کرب انگیز کشمکش

اسے ایسے نقطے پر لا کر چھوڑ دے جہاں سے قاری کو کوئی راستہ نہ دکھائی دے۔ جس کے رد عمل کے بعد ایسی تاریکی ہو کہ کسی لفظ کا وجود بھی محسوس نہ ہو۔

ز فرق تا بقدم جیسے اک اتھاہ سکوت

جمیل ملک

اسے آپ تلازمہ خیال کہہ لیجئے یا جذبہ خود نمائی' بہرحال یہ حقیقت ہے کہ میں نے جب یہ نظم پڑھی تو فوری طور پر جو چیز میرے ذہن میں در آئی وہ میرا اپنا ہی شعر تھا۔

چاند میں بستیاں بسا لینا
مجھ کو ڈھونڈو کہ میں بھی دنیا ہوں

زیر نظر نظم "تضاد" کا موضوع بھی کم و بیش یہی ہے ایک طرف تو انسان کی عظمت کا ذکر ہے۔ اس کی تدریجی ذہنی ترقی اور مادی ارتقاء کی طرف اشارہ ہے جس کے بل بوتے پر وہ چاند تاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ فضا میں اڑتے ہوئے میزائل اور سپوتنک دراصل انسان کی اچھی ہی اڑان کے مظاہر ہیں۔ مگر دوسرا المناک پہلو یہ ہے کہ تسخیر زمان و مکاں کی اس دھن میں مشینی دور کے اس شور و غل میں وہ اپنی روح کی آواز نہیں سن پاتا۔ وہ چاند تاروں تک تو پرواز کر سکتا ہے مگر دکھی زمین کے آنسو نہیں چن سکتا۔ وہ انسانی روح کے زخموں پر پھاہا رکھنا بھول گیا ہے۔ انسان اس تضاد میں ہم آہنگی اب تک پیدا نہیں کر سکا اور یہی اس کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

نظم کا موضوع خوب ہے۔ چھوٹی سی نظم میں انسان کا پورا تشخص اور کردار سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظم میں انسان کے مثبت اور منفی' دونوں پہلوؤں کا ذکر ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کی باہمی آویزش نظم کو نقطہ عروج کی طرف بڑھاتی ہے۔

نہ جانے میں کس خیال میں گم
کس ابر پارے پہ اڑ رہا تھا
غرور سے سر بلند کر کے ہر اک ستارے کو دیکھتا تھا
کہ ایک دلدوز چیخ گونجی فضا کی خاموش وسعتوں میں
میں چونک اٹھا
پلٹ کے دیکھا
گلی سے اک ہڈیوں کا ڈھانچا گزر رہا تھا
جو چیخ کر ایک اک سے کہتا تھا۔ "ایک روٹی"
"خدا تمہارا بھلا کرے گا"

یوں شاعر مادی ارتقا پر ایک بلیغ طنز کرتا ہے۔ اور قاری کی ساری ہمدردیاں اس ہڈیوں کے ڈھانچے کے لئے وقف ہو جاتی

ہیں جو ایک ایک سے چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔

"....　تمہارا　بھلا　کرے　گا"　ایک　روٹی......　خدا

اسلوب کے اعتبار سے بھی نظم عمدہ ہے' بات ذات سے شروع ہوتی ہے اور حیات و کائنات تک پھیل جاتی ہے یوں "مشت غبار" کا قصہ شاعر کا ذاتی تجربہ بن کر مکان و لامکاں کی وسعتوں پر محیط ہو جانا چاہتا ہے مگر زمین سے اس کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ انسانیت کی ایک ہی دلدوز چیخ اس طائر لا ہوتی' کا رخ آسمانوں سے زمین کی طرف پھیر دیتی ہے البتہ نظم کے دوسرے بند میں "ہوائی جہاز" کا استعارہ کھٹکتا ہے اس زمانے میں جب میزائل اور سپوتنک کا ذکر خاصا چل نکلا ہے یہاں تک کہ یہ الفاظ آہستہ آہستہ نظموں میں بھی اپنی جگہ بنا رہے ہیں' انسان کی ذہنی اور مادی ترقی کے مظہر کے طور پر ہوائی جہاز کا استعارہ نہ صرف پرانا ہی معلوم ہوتا ہے بلکہ خاصا کمزور بھی ہے۔

نظم کا تیسرا اور چوتھا بند مصوری اور تشبیہات کے لحاظ سے جاذب نظر ہے۔ جب ایک لمحہ گریزاں میں صدیاں سمٹ آئیں' زمین پر "فرش زر" اور فلک پر "روائے آب گہر" کا دھوکہ ہو۔ تو شاعر کے ساتھ قاری پر بھی ہلکا ہلکا سرور طاری ہونے لگتا ہے۔

پانچویں بند میں نظم کا نقطہ عروج ملتا ہے۔

"..........ایک روٹی"

"خدا تمہارا بھلا کرے گا"

اس زوردار اور خوبصورت نقطہ عروج کے بعد نظم کا آخری بند یا تین مصرعے' کسی صورت میں بھی نظم کو مزید تقویت نہیں پہنچاتے بلکہ نظم کا Anti Climax یا نظم کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں اور نظم کے تاثر کو کمزور کر دیتے ہیں' شاید مصنف نے نظم کی ابتدا اور انتہا کی کڑیاں ملانے اور تکنیک میں توازن برقرار رکھنے کے لئے آخری بند کو ضروری سمجھا ہو۔ مگر مجھے تو آخری تین مصرعوں میں خاصا تکلف نظر آتا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ نظم' موضوع اور اسلوب' دونوں لحاظ سے کامیاب ہے۔

محمد منور

اس نظم میں شاعر نے انسان کی بلندی و پستی کے تضاد پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے انسان پست ہو کر بھی بلند ہے اور بلند ہو کر بھی پست ہے.... پہلا حصہ استفسار ہے کہ انسان جو بظاہر ایک مشت غبار ہے کیا اس کی حقیقت یہی کچھ ہے"

"میں انساں ہوں' ایک مشت غبار ہوں میں"
"مگر میں کیا ہوں؟................"

شاعر اسی سوچ میں گم ہے کہ ایک ہوائی جہاز کی آواز فضا میں سرسرائی...... ہوائی جہاز بلند ہو رہا ہے۔ اس کے پیش نظر نادیدہ اثیری دنیائیں ہیں .... نئی زمینیں' نئے آسمان....... یہ فضا دور اختراع ایک ہی لحظ میں ہزارہا سال پر محیط انسانی جدوجہد کی تاریخ کے روشن باب نگاہوں کے سامنے کھول کر رکھ دیتی ہے..... شاعر سوچتا ہے کہ انسان اپنی سعی کی سابق باثمری کے

بل بوتے پر جانے کون کون سے جہاں مسخر کرنے کا تہیہ کر رہا ہے.... وہ مذہب و مطلا زینیں...... وہ مرقع و تابندہ آسمان...... وہ منور و معطر فضائیں

"تمام عالم پہ ہلکا ہلکا سرور طاری"

"مگر جب اچانک کوئی بھک منگا چیخ کر خدا کا واسطہ دیتے ہوئے ایک روٹی کا مطالبہ کرتا ہے تو شاعر کی نگہ میں بسا ہوا انسانی کامرانیوں کا عطا کردہ سارا پرکیف غرور زائل ہو جاتا ہے...... آخری حصہ پر پھر سوال ہے کہ انسان جو دہر کا تاجدار ہے کیا واقعی ایسا ہے؟......

"میں سوچتا ہوں' میں ایک انساں ہوں' دہر کا تاجدار ہوں میں
مگر میں کیا ہوں......."

انسان تسخیر سموات پر تلا بیٹھا ہے مگر اس کا اپنا موجودہ ارضی معاشرہ تا حال جوں کا توں ناہموار ہے.... یہاں اب تک منعم و فقیر کی تفریق موجود ہے.... گویا ساری نظم سمٹ کر فارسی کے اس شعر کا قالب اختیار کر لیتی ہے۔

تو بکار زمیں رانکو ساختی
کہ باآسماں نیز پرداختی

ایک چیز جو خاص طور پر جاذب توجہ ہے وہ یہ ہے کہ شاعر نے انسانی بلندی کے مناظر مادی لباس میں پیش کیے ہیں۔ ایک طرف مادی قوت کی یہ افراط ہے کہ وہ فضا کی پہنائیوں میں سما نہیں سکتی...... دوسری طرف مادہ پرستی کی یہ تفریط ہے کہ انسان اپنے ابنائے جنس کے منہ کا نوالہ چھین کر انہیں فاقوں کی نذر کر رہا ہے اور گداگری کے قعر ذلت میں پھینک رہا ہے...... شاعر نے عروج بھی مادی دکھایا ہے اور زوال بھی مادی...... اور اگر انسان کا مابہ الافتخار محض مادی قوت ہے جس کی پرورش میں شعور انسانیت (جس کی اساس اخلاق و روحانی ہے) دخیل نہیں تو اس افراط و تفریط کا بھی کوئی علاج نہیں۔

نظم کا طلوع و عروج نسبتاً" زیادہ زوردار ہے..... مگر ہبوط میں اچانک پن سا آگیا ہے.... حالانکہ لطیف وجود چھن چھن کر بڑی ادا سے نزول کرتے ہیں..... خاتمہ کے اچانک پن کی توجیہہ بھی کی جا سکتی ہے۔ وہ یوں کہ خیالی مراحل تو عالم خواب کی وسعتوں سے وابستہ ہوتے ہیں..... بیداری خوابوں کی کائنات کو آناً" فاناً" تحلیل کر کے رکھ دیتی ہے...... اس تحلیل میں تناسبات کے مراحل نہیں ہوتے..... لہٰذا نظم کا خاتمہ اچانک پن کوئی غیر طبعی سی بات نہیں..... اگرچہ اس عدم تناسب سے تاثیر کا دامن پھیلنے نہیں دیا۔

نہ جانے میں کس خیال میں گم......
کس ابر پارے پہ اڑ رہا تھا
غرور سے سربلند کر کے ہر اک ستارے کو دیکھتا تھا
کہ ایک دلدوز چیخ گونجی فضا کی خاموش وسعتوں میں
میں چونک اٹھا

نظم کا موضوع بہت وقیع ہے۔ مگر وقیع نہ بھی ہو تو فنکار شاعر ہے' خود وقیع بنا لیتا ہے.... مگر حق یہ ہے کہ نظم نے بھرپور تاثر نہیں چھوڑا..... شاعر نے جن نادیدہ بہاروں سے نا دمیدہ گل و سمن چننے چاہے ہیں ان کا تصور شاید خود شاعر کے اپنے دل پر پوری ساحریت کے ساتھ قابض نہ تھا..... ورنہ قارئین بھی یقیناً" کچھ مستی و کیف ضرور محسوس کرتے..... ابلاغ کے اعتبار سے یعنی شاعر کے مافی الضمیر کے اظہار کی حد تک نظم خاصی کامیاب ہے..... یہ میرا ذاتی تاثر ہے..... اور تاثر کا معاملہ تار پرنیاں سے زیادہ نرم اور لچکیلا ہوتا ہے۔

حمایت علی شاعر

برادرم آغا صاحب۔ تسلیمات

کسی تخلیق پر اعتراضات تو کئی قسم کے ہوسکتے ہیں لیکن اگر جزوی باتوں کو نظر انداز کردیا جائے تو کم از کم تین پہلو ایسے ضرور ہوتے ہیں۔ جن کی روشنی میں اس کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھا جاسکے۔ موضوع' انداز بیاں اور تاثر..... چنانچہ میں نے بھی انہی زاویوں سے اپنی نظم پر غور کیا ہے۔ ہر تخلیق میں بنیادی اہمیت موضوع کو حاصل ہوتی ہے اور موضوع کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمہ گیر ہی نہیں' فکر انگیز بھی ہو۔ جہاں تک اس نظم کے موضوع کا تعلق ہے' میرے خیال میں اس میں یہ خصوصیات موجود ہیں۔ لہٰذا قطع نظر اس کے کہ یہ موضوع منفرد یا اچھوتا ہے یا نہیں.... اس پر کوئی اعتراض ممکن نہیں۔ رہی منفرد ہونے یا اچھوتے پن کی بات تو ظاہر ہے کہ کسی فن پارے کے لئے یہ امر لازمی نہیں ہے۔ علامہ اقبال بہت پہلے اسی خیال کو (قدرے فرق کے ساتھ) مجھ سے کہیں زیادہ اچھے پیرائے میں نظم کر چکے ہیں۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

پھر اس نظم میں ایسی کیا بات ہے یا وہ کونسی تحریک تھی جس کے زیر اثر میں نے یہ نظم کہہ ڈالی اور دو صفحے سیاہ کردیئے......؟؟ اس کا جواب اس کے انداز بیان میں پوشیدہ ہے۔

جہاں تک انداز بیاں کا تعلق ہے' اس نظم میں تمثیل نگاری کے فن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مونولاگ کی تکنیک استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی بنیادی خیال تک پہنچنے کے لئے ایک ایسا راستہ اختیار کیا گیا ہے جو مختلف ان جانے خم و پیچ سے گزرتا ہوا یکایک منزل سے جا ملتا ہے اور پڑھنے والے کے ذہن میں ایک سوالیہ علامت بن کر رہ جاتا ہے۔ تکنیک کی یہی جدت اس نظم کو اس موضوع پر کہی ہوئی اور نظموں سے الگ کرتی ہے لیکن اس تکنیک کے برتنے میں جو سب سے بڑی ذمہ داری شاعر پر عائد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نظم کی زبان موضوع سے ہم آہنگ بھی رہے اور شاعری کے لطیف ترین تقاضے بھی پورے ہوجائیں۔ چنانچہ اس نظم پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ بیانیہ طرز اظہار اور ایک آدھ لفظ (ہوائی جہاز.... جو استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے) کی ثقالت نے اسے "شاعری" سے کسی حد تک دور کردیا ہے۔

یقین مانیئے' نظم کہتے ہوئے بھی میرے دل میں یہ اندیشہ بیدار تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس انداز بیان سے کہیں کہیں شعریت کا دامن چھوٹ رہا ہے لیکن جس خیال سے مشعل بکف ہم سفر کی طرح قدم قدم پر میری رہنمائی کی وہ یہ تھا کہ

شاعرانہ تخیل جب مادی حقیقتوں کے ہمراہ سفر کرے گی تو کہیں کہیں یہ سفر بے کیف بھی ضرور ہوگا، اس لئے اس لحاظ سے یکسر نظر انداز کردینا چاہیے...... لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ میں اس بدمزگی کا بھی علاج سوچ لوں اور انداز بیان کی سلاست میں وہ روانی پیدا کردوں کہ پڑھنے والے کسی استعارے کی گرانی محسوس نہ کرسکیں۔ چنانچہ میں نے پوری نظم سہل ممتنع میں کہنے کی کوشش کی، زیادہ سے زیادہ ہلکے پھلکے اور سبک الفاظ منتخب کئے اور لفظوں کی ان ننھی منھی کشتیوں کو "بحر رواں" میں چھوڑ دیا کہ یہ بہتی ہوئی آپ ہی کنارے سے جا لگیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس شعوری کوشش میں مجھے کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے میں جانتا ہوں کہ تاثر...... موضوع اور انداز بیان کے متوازن، امتزاج سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہ بھی خبر ہے کہ اگر یہ ترکیب پڑھنے والے کے مزاج کے مطابق نہ ہو تو نتائج غلط بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس لئے میں اس نظم کے اہم پہلو "تاثر" کے بارے میں کوئی بات، نہیں کہوں گا۔

آخر میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے انسان کی خود آگہی کے مدارج کا مطالعہ اس کے اپنے ذہنی ارتقاء کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس مہین روشنی کے پس منظر سے معاشرتی تنزل کے جو مہیب منہ کھولی ہوئی قبروں کی طرح جھانک رہے ہیں وہ لحظہ بہ لحظہ انسان اور اس کی انسانیت کو نگلتے جارہے ہیں...... میری نظر میں ایک سوالیہ علامت بن کر ابھر آئے ہیں کہ

میں ایک انساں ہوں، دہر کا تاجدار ہوں میں
مگر میں کیا ہوں؟

ظاہر ہے کہ اس متضاد ارتقائی عمل نے انسان اور آدمی کے درمیان جو وسیع خلیج حائل کردی ہے وہ پوری انسانیت کا المیہ اور آج دنیا کے ہر شخص کی زبان پر یہی سوال ہے۔

(مطبوعہ "ادبی دنیا" لاہور۔ دور پنجم شمارہ دوم جون۔ جولائی ۶۰ء)

(بقیہ۔ ممتاز احمد خاں کا خط)

یہ مہر و نوازش لطف و کرم اک چھیڑ نہیں تو پھر کیا ہے آنے پہ ہوئے آپ آمادہ، بیمار کو کچھ تسکین ہوئی
ہر اشک ہے موتی بننے کو، اب ہم کو ہنسایا جاتا ہے اب آپ بھلا کیا آئیں گے، اب آپ سے آیا جاتا ہے

تمہارا انڈیا جانے کا کیا پروگرام ہے۔ اگر جشن اختر میں شرکت ہو تو روداد ضرور لکھ بھیجنا مع مجموعہ کلام کے جو شاید اب شائع ہوچکا ہو۔ تمام دوست احباب کو میرا پیار بھلا سلام کہنا اور خوب خوب حال پوچھنا۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ کبھی ان سب سے ضرور ملاقات ہوگی۔ قلمی رسالہ "جگنو" کی کاپیاں ممکن ہے عباس کے پاس محفوظ ہوں۔ "شاہین" غالبا منظور احمد خان کے بھائی، جمیل احمد خان (مرحوم) کے بیٹے کے پاس محفوظ ہوں جو شاید منظور کے داماد ہیں۔ تمہارا رسالہ "شرارہ" تھا وہ کہاں ہے۔ اسی دور میں ایک اور قلمی رسالہ "شفق" بھی نکلا تھا غالبا ایک ہی شمارہ جو یقینا معدوم ہوچکا ہوگا

اچھا خدا حافظ۔ امید ہے کہ تم لوگ خیر و عافیت سے ہوں گے۔ بچوں کو دعائیں۔ تمہیں اور بھابی معراج کو ہم دونوں کی طرف سے پرخلوص سلام، جواب میں تاخیر کے لئے معذرت۔ وقتاً فوقتاً لکھتے رہا کرو

تمہارا ممتاز

مکتوبات

(۴)

واجدہ تبسم

حیدر آباد دکن (آندھرا)

۱۵-۱۲-۱۹۵۶ء

بھیّن مورے

بہت پیارا سا خط ملا۔ ٹھہرو مگر، پہلے ایک بات پر ڈانٹتی چلوں، کیوں جی، تم قوم کے ایک ذمہ دار فرد ہونا، شاعر بھی "کہلاتے" ہو، اور اتنی غیر ذمہ دار حرکت کرتے ہو؟ یعنی کہ خط پر تاریخ نہیں ڈالتے۔ تھو! تمہیں معلوم ہے تاریخ بعض مرتبہ کتنے اہم کام انجام دیتی ہے؟ نہیں معلوم؟ تبھی تو ایسی حماقت کرتے ہو۔ اچھا آئندہ سے ایسا کیا نا تو بھابھی کو کہہ دوں گی کہ تم اپنے دولہے کو بجائے حمایت کے "حماقت علی شاعر" کہنا شروع کردو۔ کیا سمجھے بھیا....؟

اچھا جی، تمہیں میری عمر کی پڑی ہوئی ہے کہ دجن بہن تم سے بڑی ہے یا چھوٹی۔ ایک بات معلوم ہے۔ (ہائے اللہ تمہیں تو کچھ بھی نہیں معلوم....) ایسا مشہور ہے کہ ہم عورتیں، اور تم مرد بھی اپنی عمر اور آمدنی ٹھیک نہیں بتاتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ کم از کم میری حد تک تو یہ سراسر تہمت ہے۔ کیونکہ میں نے آج تک اپنی عمر نہیں چھپائی۔ سن لو میرو.. عمر ابھی تین ماہ قبل میں نے اپنی زندگی کے بیس سال پورے کرلئے۔ مطلب یہ کہ کتاب زندگی کا اکیسواں ورق الٹا ہے۔ یا بہت ہی شاعرانہ طرز میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے باغ زندگی سے اب تک ۲۰ پھول توڑ لئے ہیں۔ (زیادہ صحیح لفظوں میں کانٹے.....!) کہو یقین آیا۔ نہیں نا؟ مجھے معلوم تھا اصل بات یہ ہے کہ ادھر میں نے اس عمر میں اتنی بری بھلی کہانیاں لکھ ڈالی ہیں کہ کوئی یقین ہی نہیں کرتا کہ میں، میں ہوسکتی ہوں۔ حالانکہ یہ میرے ساتھ بہت زیادتی ہے۔ تم پوچھتے ہو میں قیصر سے بڑی ہوں یا چھوٹی، سن لو۔ قیصر ہمارے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہے اور میں تقریباً سب سے چھوٹی۔ قیصر کے اور میرے بیچ تقریباً نو دس سال کا فرق و فاصلہ ہے۔ ہم کل آٹھ بہن بھائی ہیں۔ نتیجے کے طور پر کیا حاصل ہوا۔ کچھ سمجھے؟ ڈانٹ۔ گھرکیاں۔ سب کا کام اور وہ مثل کہ چھوٹے بننے سے اچھا ہے کتا بننا............. بہرحال (اچھا تم بھی اپنی آمدنی بتادو) تم نے لکھا کہ تم ہر ہر جملے سے "بڑی" محسوس ہورہی ہو۔ بالکل ٹھیک لکھا..... بات یہ ہے کہ چونکہ گھر میں تو مجھے کوئی لفٹ نہیں ملتی۔ عزت نہیں ہوتی۔ بس میں نے کیا طریقہ اپنایا ہے کہ اپنے سے بڑوں کو بھی تم کہہ کر مخاطب کرنے لگی ہوں، اس رویئے سے بہت سے ایڈیٹر مرعوب ہوئے ہیں اور عالم یہ ہے کہ "وجو بھنوں" ہوں اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے برعکس بھی حادثے جنم لیتے ہیں تمہیں تو یوں ڈانٹ کر خط لکھا کہ آگے بھی دو خط لکھ چکی تھی (آں؟ اب خیال آگیا یہ بتاؤ تم نے ان خطوں کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔ ان سے جواب تمہیں بتاؤ کیا سزا دی جائے؟" نہیں مجھے تاؤ ہی تو آگیا اور تمہیں ڈانٹ بھرا خط لکھ بھیجا۔ جی نہیں میں ایسی بے وقوف نہیں ہوں کہ آپ کو اپنی برابری کا، یا اپنے سے "بڑا" مان لوں..... آپ مجھ سے چھوٹے ہی بھلے لگتے ہیں تاکہ موقع پڑنے پر میں مزے سے آپ کے، آپ کی بیگم کے، اور آپ کی پوری اولاد کے کان کھینچ سکوں........ چھوٹا بننے میں یہ سہولت کہاں ملے گی بھلا؟

اب رہی بھرپور پیار دینے کی بات.... تو اتنا سن لو کہ میرے دل میں ماںتا اور پیار و محبت کا سمندر سا ٹھاٹھیں مارتا ہے۔

تمہیں اتنی کچھ ماتنا اور محبت دے دوں گی کہ تم سہار بھی نہ سکو گے۔ تم تو شاعر ہو نا، تمہیں عورت کے قلب کی گہری اور وسعت کا علم نہیں۔ دیکھو تو مجھے خود یہ کتنا زعم ہے، ایسا لگتا ہے کہ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے تو اس کائنات کا ذرہ ذرہ رقص کرنے لگتا ہے اور کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری آنکھوں میں آنسو جھل جھلا اٹھیں تو اس کائنات کی ساری وسعتیں ڈوبتی سی نظر آتی ہیں۔ یہ خوش فہمی نہیں بھیا۔ بھلا تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ عورت کے، ماں کے قدموں تلے جنت کیوں بنا دی گئی ہے؟ تخلیق کا جان لیوا اور زندگی بخش عمل؟ میں تو اپنی بلندیوں کے آگے آپ ہی جھکا دیتی ہوں۔ تم نے کبھی بھابھی کو سمجھنے پرکھنے کی کوشش بھی کی یا بس لڑنے جھگڑنے اور منا لینے کو ہی زندگی کی معراج سمجھتے رہے؟ (ہاں اب مجھ سے لڑیئے نہیں۔ معلوم ہے آپ بہت پیار کرتے ہیں انہیں!)

یہ کیا پوچھ بیٹھے بھیا تم، اپنی زندگی کے بارے میں بھی کچھ لکھ دینا، بظاہر یہ چھوٹا سا جملہ ہے مگر کس قدر وسعت لیے ہوئے ہے۔ ”زندگی“، زندگی کے بارے میں کیا لکھوں بھیا، بس یہیں آ کر تو میرا قلم رک سا جاتا ہے۔ دل رہ رہ کر دھڑکنے لگتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ تمہاری طرح اور بھی کتنوں نے یہ سوال مجھ سے کیا۔ مگر نہ آنکھیں نہ اٹھا سکی، ہونٹ نہ ہلا سکی، میں نے کئی کہانیاں صیغہ واحد متکلم میں لکھیں اور یہ سمجھ لو کہ تھوڑے بہت تصرف کے ساتھ وہ میری اپنی داستانیں تھیں مگر وہ تو سمندر میں سے ایک قطرہ تھا۔ پھر بات کیسے بنے؟ یہ تو بہت پرانی سی بات ہے بھیا! یہ سمجھ لو میں کائنات کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک درد بھرا آنسو ہوں، جو کسی دامن میں جذب نہ ہو سکا۔

ہاں، یہ پرچہ تو اب تک بھیج رہے ہو نا، قسم اللہ کی بھیا، عاجز آ گئی تم سے، اب کہہ رہے ہو کہ دونوں پرچے ساتھ بھیج دوں گا، دیکھ لوں گی، اور یہ خبر تو تم نے اچھی سنائی کہ ”شعور“ ماہنامہ ہو گیا ہے اور یہ کہ پابندی سے نکلا کرے گا۔ پہلی خبر شاید صحیح ہو مگر دوسری تو ایکدم غلط ہے۔ (ذرا غصہ ہو جاؤ نا!)

ایک مزے کی بات سناؤں، کراچی کے ایک پرچے میں میری ایک کہانی چھپ رہی ہے۔ نام جانتے ہو میں نے کیا رکھا ہے، ”آگ میں پھول“ دیکھنا بہت سے لوگ، یہ سمجھیں گے کہ شاید یہ تمہاری کتاب پر تبصرہ ہے، یا اس قسم کی اور کوئی بات۔ تم پڑھو گے تو ضرور۔ اپنی رائے لکھ بھیجنا۔ آج کل میری بہت سی کہانیاں چھپنے والی ہیں۔ پاکستان (کراچی) سے ”تخلیق“ نکلا ہے نا، اس کے مدیر کا خط میرے نام آیا تھا۔ کہانی مانگی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ میری کہانیاں کراچی کے ادبی حلقوں میں بہت پسند کی جاتی ہیں۔

تم تصویر مانگ رہے ہو۔ تصویر اس لیے نہیں دوں گی کہ میں پردہ نہیں کرتی۔ (بات شاید تمہاری عقل میں بیٹھی نہیں) ہاہاہا! ارے بھولے بھیا، یہاں جان پہچان والوں کو معلوم نہیں ہے کہ میں واجدہ تبسم ہوں، اور اگر تصویر چھپ گئی تو سب کو پتہ چل جائے گا اور مجھ سے ملنا چاہیں گے۔ اور میری مصیبت ہے کہ میں ابھی کم از کم دو چار سال اسی طرح رہنا چاہ رہی ہوں۔ ہٹاؤ اس جھگڑے کو۔

آپ کے ”دوستوں“ کو یعنی جاوداں، روشو اور روبی (جاوداں میر، روشن جمال اور فروزاں علی) کو بہت سارے پیار اور بھابھی سے کہنا کہ یہ تین پر اڑ کر کیوں بیٹھ گئیں۔ کیا دنیا میں یہی ایک ہندسہ رہ گیا کیا؟ ارے بھئی چار ہے، پانچ ہے، چھ، سات اور بھی ہیں۔ (ویسے مجھے لگتا ہے کہ بھابھی خود ”سمجھدار“ ہیں؟)

اور سناؤ بھیا، یا میری ہی سنے جاؤ گے؟ جس دن خط ملے اسی دن جواب دینا اور پرچے بھی، سمجھے نا؟ (سچ کہو اتنے شدید سے پن سے کسی نے آج تک پرچہ مانگا تھا؟)

تمہاری پیاری بہن

واجدہ

احمد فراز

اسلام آباد

۱۶ر۵ر۹۴ء

حمایت بھائی محبتیں

محبت نامہ مع کتاب موصول ہوا۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ کسی شخص نے مجھے گھر بلایا اور کہا 'ایک خاص چیز آپ کے لئے ہے' خیر کھانے پینے کے بعد پوچھا تو اس نے میری غزل جسے جگجیت سنگھ نے گایا ہے' وہ سنا دی' میں نے کہا' یہ کیا خاص چیز تھی' کہنے لگا' میں حیران اس بات پر ہوں کہ شاعر پٹھان اور گانے والا سکھ۔ تو اس میں اتنی تاثیر کہاں سے آگئی۔ بہرحال میری تو ایک غزل تھی' تمہاری تو پوری کتاب سکھ کے ہتے چڑھ گئی۔ سوائے تعزیت کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ خیر یہ تو تفریح کی بات تھی۔

میرا نمبر "جریدہ" والے نکال رہے ہیں۔ یہاں جنازہ نکالنے کے محاورے میں استعمال ہوا ہے) بلکہ پریس میں پہنچ چکا ہے' تم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ کچھ حصہ میرے بارے میں تم نے لکھا ہوا ہے' اگر اس کو مضمون کے طور پر بھیج سکو تو نوحہ گروں کے ٹولے میں تمہاری حاضری بھی لگ جائے گی۔

میں ۲۵ر مئی کو امریکہ اور کینیڈا وغیرہ جاؤں گا۔ تمہارا کیا پروگرام ہے۔ بہرحال عید مبارک

تمہارا

فراز

مصطفیٰ زیدی

گوجر خان (کہ اک دیار ہے عالم میں بے مثال)

۱۴ مارچ ۵۷ء

حمایت بھائی

مسعود نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ آپ لاہور ہیں۔ ان دنوں میں سیالکوٹ تھا۔ پھر اب سیالکوٹ سے ہوتا ہوا "شعور" یہاں "گوجر خان" میں مجھے ملا۔ دس پندرہ دن ہوئے' سیالکوٹ میں مجھے یہ احکام ملے کہ پنڈی اور پنڈی کے نواحات میں جاکر دودھ کی نہریں نکالو اور بے ستون کی روایات زندہ کرو۔ میں مطمئن تھا کہ یہی پیشہ اجداد کا پیشہ ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اس کام کو Settlement Work کا نام دیا گیا۔ چنانچہ اب مارے مارے پھرتے ہیں۔ تین ماہ تک کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اگلے دس بارہ دن بہرحال گوجر خان میں گزریں گے۔ آپ اس عرصے میں اسی پتے پر لکھیں' بعد میں پرچہ بھیجیں تو Asst Commisoner Rawalpindi کے پتے پر بھیجیں۔

"شعور" سے آپ نے چند کتابیں بھی چھاپی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ سے یہ کتابیں مانگوں۔ کم از کم آپ کی اپنی کتابیں اور خالد کا "زر داغ دل" نہ جانے ممکن ہوگا یا نہیں۔ لاہور سے "کارواں" والے میری نظموں کا مجموعہ "شہر آذر" کے نام سے اگلے ماہ تک چھاپ رہے ہیں۔ اس کے اعلان کی بھی کوئی جگہ نکال لیجئے۔

میں خود "شعور" میں اس وقت کوئی نظم بھیجوں گا جب بھیجنے کے قابل کوئی نظم ہوگی۔ پچھلے ۶ ماہ سے تو بالکل بانجھ ہوں۔

آپ کا

مصطفیٰ زیدی

HALQA-E-ARBAB-E-ZOUQ
GERMANY
H-10. NORDRING-35
6110. DEIBURG

قمر اجنالوی
جرمنی
۹ر۱۱ر۹۳ء

جناب حمایت علی شاعر
سلام مسنون

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ میں نے اپنے پبلشر مکتبہ القریش کو ہدایت کی تھی کہ وہ آپ کو میری دو کتابیں ''بنام خیر الانام'' اور ''چاہ بابل'' ضرور بھیج دیں۔ لاہور سے ان کا خط آیا ہے کہ ''بنام خیر الانام'' آپ کے پتہ پر بھیج دی گئی ہے مگر ''چاہ بابل'' آؤٹ آف اسٹاک ہے۔ نیا ایڈیشن شائع ہونے پر وہ بھیج دی جائے گی۔

میرے بیٹے نعیم اے قمر کی آپ سے ملاقات ضرور ہوئی ہوگی۔ میں نے نعیم قمر ہی کے ذریعہ آپ کو اپنی طویل نظم ''جاگیر کے خدا'' سے متعلق تنقید و تبصرہ پر مشتمل ایک اخباری رپورٹ بھجوائی اور اس کے ساتھ ''جاگیر کے خدا'' پر دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اس وقت میرے اصل پاس مسودہ نہیں تھا۔ اب مکتبہ القریش نے لاہور سے نظم کی کتابت شدہ کاپی بمع اصل مسودے کے پروف ریڈنگ کی خاطر مجھے بھیج دی۔ جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں تاکہ آپ اصل نظم بھی پڑھ سکیں اور دیباچہ نویسی کا مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوسکے۔ آپ سے پہلی مرتبہ ایک فرمائش کی ہے' وہ بھی عجب حالات میں۔ کتاب بالکل تیار ہے صرف آپ کے دیباچے کی کسر باقی ہے۔ توقع ہے کہ آپ میری اس مجبوری کو پیش نظر رکھیں گے۔

دیباچے کے ساتھ اپنا ایک فوٹو بھی نعیم قمر کو ضرور دیجئے گا۔ تاکہ اسے شامل کتاب کیا جاسکے۔ اصل نظم' اس پر تنقید و تبصرہ (یہ نظم اخبارات میں موضوع بحث بنی رہی تھی) اب آپ کے پاس لکھنے کے لئے سب کچھ موجود ہے۔ جرمنی میں میرا پتا درج ذیل ہے اگر بار خاطر نہ ہو۔ تو مجھے جواب سے مطلع فرمایئے گا۔ والسلام

مخلص
قمر اجنالوی

ساقی فاروقی
لندن
۸ر۳ر۹۵ء

پیارے حمایت' ''احوال واقعی'' مل گئی پرسوں۔ آج ہی ختم کی ہے۔ کئی چیزیں تو ''شخص و عکس'' ہی میں پڑھ لی تھیں۔ بہت بہت شکریہ۔ چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

۱۔ قابل کو کلاسیکی انداز میں اچھے مصرعے اور شعر کہنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ وہ حیدر آباد سندھ کے اہم شاعر ضرور تھے مگر عمر کٹ جانے کے باعث ہندو پاک تو کیا پاکستانی ادب میں بھی ان کا کوئی خاص کنٹروبیشن نہیں ہے۔

۲۔ تم قابل اور محسن سے زیادہ اہم ہو۔ تمہاری شہرت پورے اردو ادب کے حوالے سے ہے (صرف سندھ یا پنجاب کی وجہ سے نہیں) ''روئیں ہے رخش عمر....'' پڑھ کر تمہارے ''گناہوں'' کا اندازہ ہوا۔ غضب' غضب تم نے اتنا کچھ کیا۔ زندہ باد۔

۳۔ ''بنگال سے کوریا تک'' اور ''پرچھائیاں'' دو مختلف نظمیں ہیں (ایک ہی موضوع پر سہی) میں قمر جمیل اور محسن بھوپالی دونوں سے اختلاف کرتا ہوں اس بارے میں۔

۴۔ ایک مصرع کی مماثلت کے باوجود مدنی کی نظم سے تمہاری نظم قطعی الگ ہے اور نہایت خوبصورت نظم لکھی ہے تم نے

۵۔ فلمی گانے میں تم اختر شیرانی کے بہت قریب آگئے ہو۔ اس سے پرہیز ضروری تھا۔ اسی طرح اس دیئے اور سورج والی نظم کے آخر میں یہ لکھ دو (ٹیگور کے ایک خیال سے ماخوذ)

۶۔ "سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی" ایک بانکا اور علم اور محنت سے لبریز مضمون ہے۔ اس سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ استفادہ ٹھیک ہے مگر لوگوں کے مصرع کے مصرعے اور شعر کے شعر جوں کے توں چرا لینے پر نہ غالب کو بخشا جا سکتا ہے نہ حسرت کو نہ فیض کو۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ تم نے بخشش عام کردی ہے حالانکہ ان بے ایمانیوں کی طرف نفرت اور حقارت سے دیکھنا چاہئے۔ پہلے سوچے اور لکھے کوئی اور بعد میں مشہور کوئی اور ہو' اسے ڈاکہ کہو نہ کہ توارد۔ ورنہ خیال اور احساس کا سفر جاری نہ رہ سکے گا اور لوگ خود دکھ اٹھائے بغیر دوسروں کے کلیشے میں تے کرتے رہیں گے۔

خدا کرے تم خوش ہو۔ "ضمیمہ نابالغ شاعری" میں (جو میری نئی کتاب "ہدایت نامہ شاعر" میں شامل ہے' سنگ میل' لاہور۔ اشاعت مئی ۹۵ء) تمہارا ایک فقرہ بھی شامل ہے۔

بے شمار محبتیں

تمہارا ساقی

عاشور کاظمی

لندن ۱۶ اکتوبر ۹۴ء

میرے اچھے حمایت بھائی

السلام علیکم

آپ تو خط لکھنے کے معاملے میں ہمیشہ سے بے نیاز رہے۔ البتہ اب کچھ دنوں سے میں بھی خاصا کاہل ہو گیا ہوں نتیجہ یہ ہے کہ عرصے سے خط و کتابت بند ہو گئی ہے.............. اور پھر اچانک بذریعہ ڈاک ایک کتاب "احوال واقعی" ملی۔ حمایت بھائی۔ برسوں سے آپ کی ذات سے سلسلہ محبت ہونے کے باوجود اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ میں حمایت علی شاعر کو مکمل طور پر نہیں جانتا تھا۔ کتاب پڑھی تو آپ کے کئی گوشے سامنے آئے جو آپ کی کسر نفسی کے سبب پوشیدہ تھے۔

.... آپ نے تلخیوں کا جواب نہیں دیا۔ بہت اچھا کیا۔ سنجیدہ لوگ اس خاموشی کی عزت کرتے ہیں۔

...... مرزا سلیم بیگ نے بھی کہیں سطح سے نیچے گر کر بات نہیں کی۔

اس دور میں جب لوگ ادبی اختلافات کو بھی ذاتیات پر لے آتے ہیں آپ کی بردباری قابل ستائش ہے۔

ایک اور دلچسپ اندازہ ہوا آپ کے متعلق' اور وہ یہ کہ حمایت بھائی آپ تو بہت باقاعدہ شخصیت ہیں۔ یہ اتنے سارے حوالے اپنے مضامین' تقاریر' اخباری تراشے اور ان کی تاریخوں کو یاد رکھنا۔ خدا کی پناہ۔ ہمیں تو یہ یاد نہیں پچھلے ہفتے کہاں سے پتھر آیا تھا اور ایک آپ ہیں کہ ہر خبر کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا۔ آپ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہوتے تو قیامت کی اکاؤنٹنگ کرتے۔

آپکے دوست عمران الارشد' جہاں موقع ملتا ہے پتھر مارتے رہتے ہیں (بھوپالی ہیں نا) لیکن میں "سنت حمایت" پر عمل پیرا ہوں۔ یعنی خاموشی۔ مجھے آج تک پتہ نہ چل سکا کہ موصوف کی ناراضگی کا سبب کیا ہے؟ چلئے چھوڑیئے یہ تو یوں ہی برسبیل تذکرہ کہہ دیا۔ مقصد شکایت کرنا نہیں تھا۔ بانو بہرحال اچھی خاتون ہیں ہمیشہ عزت سے ملتی ہے۔

آپ' اب کب یورپ پر حملہ آور ہونے والے ہیں اب تو کافی دن ہوگئے ہیں حمایت بھائی۔

پرسان حال۔ اگر کوئی ہو تو' کی خدمت میں سلام

آپ کا اپنا بھائی

عاشور کاظمی

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

چیئرمین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی
حکومت اتر پردیش، لکھنؤ

۲۶ فروری ۹۵ء

برادر محترم!

سلام مسنون

ارادہ کر ہی رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں اور اپنے پتہ کی تبدیلی سے مطلع کروں کہ آپ کا نوازش نامہ اور زریں یٰسین کا مجموعہ کلام "میرے خواب" موصول ہوا۔ آپ کے امریکہ جانے کی خبر تو مختلف حوالوں سے مل چکی تھی مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس مرتبہ آپ کن کن شہروں میں گئے اور آپ کی فتوحات کیا کیا رہیں۔ اس تمام عرصہ میں، میں بخیر و عافیت رہا۔ صرف مکان کی تبدیلی کے باعث ڈاک کا نظام بہت دنوں تک درہم برہم رہا۔ اور جب ٹیلی فون نئی رہائش گاہ پر منتقل ہوا تو اس کا نمبر بھی تبدیل ہو گیا۔ جس کے باعث بہت سے احباب سے رابطہ منقطع ہو گیا اب سب لوگوں کو خطوط لکھ رہا ہے تاکہ ان کو نیا پتہ اور ٹیلی فون نمبر معلوم ہو جائے اور تجدید تعلقات ہو سکے۔

یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ سفر میرا معمول اور مشاعرہ میرا مقدر بن چکا ہے۔ امریکہ سے واپس آنے کے بعد کوئی غیر ملکی سفر تو نہیں ہوا۔ مگر ملک کے اندر کی مصروفیات کم نہ تھیں۔ مشاعرہ کے علاوہ اس عرصہ میں ایک سوانحی کتاب "رقص شرر" تحریر کر ڈالی ہے جس میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز، اشعار و اکتسابات کا تذکرہ ہے۔ کتاب کافی دلچسپ ہے اور معاصر منظر نامہ پر تیز روشنی ڈالی ہے۔ یہ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ بغیر آپ کے تفصیلی تذکرہ کے یہ کتاب نامکمل ہوتی۔ امید ہے کہ سال رواں کے آخری مہینوں میں یہ چھپ کر منظر عام پر آجائے گی۔ کتابت کا آغاز ہو چکا ہے۔ کمپیوٹر سے یہ مرحلہ جلد طے ہو جاتا مگر ابھی اپنے ملک کے اردو حلقوں کی آنکھیں اس کی عادی نہیں ہوئی ہیں۔

اسی خط کے ساتھ ایک خط یٰسین اور دوسرا حنیف اخگر کو امریکہ لکھ رہا ہوں۔ امریکہ اور کینیڈا کا ایک اور سفر آپ کے ہمراہ کرنا چاہتا ہوں۔ خود تو ان حضرات سے عرض مدعا نہیں کر سکا ہوں مگر امید ہے کہ آپ اشارتاً اپنے اصرار کے ساتھ ہدایات ان کو پہنچا دیں گے۔

حال ہی میں بمبئی سے واپس آتے ہوئے میرا بریف کیس چوری ہو گیا۔ جس میں غیر ملکی دوستوں کے پتہ اور ٹیلی فون نمبر والی ڈائری بھی تھی۔ اس لئے ابھی تک نیر جہاں صاحبہ کو خط نہیں لکھ سکا ہوں۔

امید ہے کہ اس عرصہ میں آپ مع متعلقین کے بخیر و عافیت ہوں گے۔ سب کو حسب مراتب دعا و سلام کہئے۔ دل کے عارضہ کا جو خدشہ سان فرانسسکو میں پیدا ہو گیا تھا۔ امید ہے کہ وہ مکمل طور پر رفع ہو چکا ہوگا۔ امریکہ یا خلیجی ممالک میں جہاں بھی خط لکھئے میرا نیا پتہ اور ٹیلی فون نمبر ضرور تحریر کر دیجئے۔ کراچی کے احباب سے سلام کہئے۔ نکہت صاحب سے بھی رابطہ منقطع ہے۔ میرا سلام کہہ دیجئے گا۔

خیر اندیش

ملک زادہ منظور احمد

حامدی کشمیری
سری نگر (کشمیر)
۱۴/۳/۸۶

برادر عزیز حمایت علی شاعر صاحب
آداب و نیاز

تاخیر سے خط لکھنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔
کراچی اور اسلام آباد میں آپ سے مل کر دلی مسرت ہوئی۔ آپ کو آپ کی تحریروں کے ذریعہ نہ جانے کب سے جانتا ہوں اور پھر ٹیلی ویژن پروگرام "کسوٹی" میں آپ کو لگاتا دیکھ کر آپ سے گہری انسیت اور تعلق خاطر کا احساس فروغ پاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی میں آپ سے مل کر محسوس ہوا جیسے ہمدم دیرینہ سے مل آیا ہوں۔
آپ کی کتابوں کی سوغات الماری میں قرینے سے رکھ دی ہے۔ فرصت ملتے ہی مطالعہ شروع کروں گا۔ آپ نے تو کمال ہی کیا ہے۔ بیک وقت کئی اصناف کو زیر تگیں کرلیا ہے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست
پاکستان کے ادیبوں اور نقادوں سے مل کر مجھے محسوس ہوا کہ تنقید' تخلیق کے پیچھے رہ گئی ہے۔ یہ کوئی خوش آئند بات نہیں۔ تخلیقی رویوں کی صحت اور معنویت کو برقرار رکھنے کے لئے تنقیدی احتساب لازمی ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ تنقید محض تحسین ہو کر رہ گئی ہے یا اگر تحسین و مدح نہیں تو علمیت سے گرانبار ہو گئی ہے۔
اتنی ساری کتابیں لکھنے کے بعد اب کس موضوع پر لکھ رہے ہیں؟ لگتا ہے کہ آپ شش جہات پر جھنڈے گاڑنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔
میں نے معاصر تنقید پر اپنا کام مکمل کیا ہے۔ اب کتاب کی اشاعت کا مرحلہ ہے۔ دیکھئے کیا صورت نکلتی ہے۔
مریم آپ کو آداب کہتی ہیں۔ بھابھی کی خدمت میں ہمارا آداب۔
آج صبح ہی سے سری نگر میں زوروں کی برف باری ہو رہی ہے۔ آپ تو بحری ہوا اور ساحلی دھوپ سے محظوظ ہو رہے ہوں گے۔ ہو سکے تو مٹھی بھر دھوپ ہمارے لئے بھیجئے گا۔
بے حد شکریہ

آپ کا مخلص
حامدی کشمیری

پروفیسر نظیر صدیقی
(پیکنگ یونیورسٹی)' بیجنگ۔ چین
۱۳۔۱۲۔۱۹۹۰ء

پیارے حمایت۔ میں یہاں ۴ اکتوبر کو پہنچ گیا تھا۔ ۵ اکتوبر کو اکرم ذکی صاحب (سفیر پاکستان) سے ملا اور میں نے تمہارا پیغام ان کو پہنچا دیا۔ بتانے لگے کہ انہوں نے تم کو یہاں لانے کی ہر ممکن کوشش کی' یہاں تک کہ وہ تمہارے بیٹے کی ملازمت (پاکستان کالج میں اوج کمال کے لئے لیکچرر شپ) کا بھی یہاں انتظام کر رہے تھے لیکن تم بوجہ یہاں آنے پر راضی نہ ہوئے۔
میں جو تمہارا پتہ لکھ کر لایا تھا' وہ گم ہو گیا تھا۔ وہ پتہ اب جا کر ملا ہے تو تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ اس دوران میں' میں

نے دو ایک دوستوں کو تمہارے پتے کے لئے خط لکھے لیکن کسی نے جواب نہیں دیا۔ عالی صاحب سے تمہارا پتہ مانگا تو اب معلوم ہوا کہ وہ امریکہ کی سیر کر رہے ہیں وسط جنوری تک واپس آئیں گے۔

بیجنگ بہت خوبصورت اور شاندار شہر ہے۔ اہل چین خوش مزاج، خوش اخلاق اور پاکستان نواز لوگ ہیں۔ لیکن چین پیسے کمانے کی جگہ نہیں میں کسی دھوکے میں نہیں آیا۔ مجبوراً آگیا ہوں تقریباً آٹھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ہے۔ اندازہ کر سکتے ہو کہ آج کل بیرونی ملازمت کی یہ تنخواہ کیا معنی رکھتی ہے۔

اچھا پیارے، مجھ پر ایک احسان کرو۔ تم اپنے دل نواز ترنم میں اپنی پسندیدہ غزلوں کا ایک کیسٹ تیار کرکے جلد سے جلد میرے نام بھیج دو ان غزلوں میں وہ غزلیں ضرور ہونی چاہئے جن کے قافیے اور ردیف یہ ہیں (۱) دل نہ بنا (۲) لوگ۔

یہاں شعبہ اردو بلکہ اردو سیکشن (جو مشرقی زبانوں کے شعبہ کا ایک حصہ ہے اور جو شعبہ ۱۴ زبانوں پر مشتمل ہے) ۱۹۵۴ء سے قائم ہے۔ اسسال پہلی مرتبہ ایم اے کا ایک طالب علم آگیا ہے۔ اسکے لئے نصاب بھی تیار کرتا جا رہا ہوں۔ اور اسے پڑھاتا بھی جا رہا ہوں۔ قدیم و جدید شاعری کا نصاب زیر ترتیب ہے۔ تم اپنی پسندیدہ پانچ غزلوں اور تین نظموں (جو طویل نہ ہوں) کی نشاندہی کردو تو میرے لئے انتخاب کا کام آسان ہو جائے بلکہ وہ غزلیں اور نظمیں بھیج دو۔ باقی تمہارا خط آنے پر۔

خیر طلب
نظیر صدیقی

عاصی کرنالی

۱۵ جون ۸۸ء

برادر محترم حمایت علی شاعر صاحب

اسلام علیکم۔ آپ سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے، مہینوں اس کا نشہ رہتا ہے۔ ایسی مروت، وضع داری، تہذیب، اور بے غرض دوستی کا بے ساختہ پن اب عنقا ہوتا جا رہا ہے اس لئے جہاں اور جب محبت کی یہ خوشبو حاصل ہوتی ہے۔ اسے اپنے وجود میں جذب کر لیتا ہوں اور مدتوں باطن کا موسم خوشگوار رہتا ہے۔

ہر سہ تصانیف، چمن، نعتوں کے گلاب اور لب خنداں ارسال کر رہا ہوں۔ بہت دیر سے آپ کی یہ امانت پڑی تھی، صحیح پتہ دستیاب نہ ہونے کے سبب تاخیر ہوئی۔ خدا کرے کوئی شعر، کوئی جملہ کام کا نکل گیا ہو، ورنہ اتنی بھی امید نہیں ہے۔

اب ایک ادبی بات جس میں تفہیم کے لئے آپ کی رہنمائی درکار ہے۔ آپ نے "کہروڑپکا" کے مشاعرے میں دوسری نظم (ملکی حالات سے متعلق) عطا کی۔ اس میں ایک مقام پر آپ نے تماشہ (ہائے مختفی کی صورت میں) تماش کے وزن پر استعمال کیا ہے۔ کسی مستند شاعر کے یہاں اس صورت میں بندھا ہو تو مجھے مطلع کیجئے۔ میرے خیال میں تماشا (آخر میں الف کے ساتھ) پنج حرفی وزن میں (مدا و تقاضا کی صورت میں) زیر استعمال رہا مثلاً

اے تماشا گاہ عالم روئے تو۔ تو کجا بہر تماشا می روی

تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ست

تماشا کر اے محو آئینہ داری

بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

تماشا دکھا کر مداری گیا
ان آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

خدا کی قسم! شاعر بھائی! یہ ساری بات میں نے اپنی الجھن دور کرنے کے لئے لکھی ہے اسے کوئی اور معنی نہ پہنائیے۔ والسلام

آپ کا بھائی عاصی کرنالی

نوٹ:۔ حمایت علی شاعر صاحب نے اپنی نظم "وطن ۔ پیارا وطن" (وطن کی فکر کر ناداں، قیامت آنے والی ہے) میں اس "لفظ" کی وجہ سے "مصرعہ" بدل دیا ہے۔ (مطبوعہ "مجلہ عثمانیہ" کراچی اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء) مرتب

۴

۷ جولائی ۱۹۹۱ء

برادر محترم حمایت علی شاعر صاحب

پہلے مجھے اس "تشویش" کا جواب دیجئے کہ آپ اس قدر اچھے کیوں ہیں۔ آپ کے پاس کون سی گیدڑ سنگھی ہے کہ جو دو لمحے آپ کے آ بیٹھے، ہمیشہ کے لئے آپ کا ہو جائے۔ قمر زیدی صاحب کے بارے میں، میں نے آپ کو دو سطری خط لکھا کہ ان کی سرپرستی کیجئے۔ آپ نے منوں اور ٹنوں کے حساب سے ان کو بہت سا وقت دیا۔ فہرست سازی سے لے کر شعراء سے رابطے تک کے مرحلوں میں آپ نے ان کی عملی مدد کی۔ دو بار ان کی تقریب افتتاح اور مشاعرے میں زحمت کی اور اپنی بے پناہ شفقت کے بیکراں خزانے لٹائے۔ میری رائے میں آپ کی عالم گیر ہر دلعزیزی کا یہی راز ہے کہ آپ سرتاپا محبت ہیں، چشمہ زمزم کی طرح جس سے ہر تشنہ کام سیراب ہوتا ہے۔

خدا آپ کو سلامت رکھے کہ آپ تہذیبی اقدار کی پاسبانی کر رہے ہیں اور آپ سے مل کر شرافت کے معانی و مفاہیم تک رسائی ہوتی ہے۔ خدا کرے ہماری بھابی اب صحت یاب ہو چکی ہوں۔ بچوں کو دعا

آپ کا بھائی
عاصی کرنالی

عزیز قیسی
بمبئی
۲۲ دسمبر ۸۵ء

ڈیئر حمایت ۔ محبتیں

تم کو گئے تین مہینے ہو رہے ہیں۔ میں بھی خط لکھنے کا اتنا ہی گنہ گار ہوں جتنے تم ہو۔ میری بیٹی منزہ تو ہر ڈاک میں تمہارے خط کو ڈھونڈھتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کبھی کبھی خط نہ لکھنے کا کوئی خاص سبب نہیں ہوتا۔ میں ان تین مہینوں میں بے حد الجھا رہا۔ دوبار حیدر آباد جانا پڑا۔ ایک فلم کے سلسلے میں، وہاں بھی احباب (جو بے حد کم رہ گئے ہیں) سے نہیں مل سکا۔ صرف دو ایک بار اختر حسن اور مغنی سے ملاقات ہوئی۔ شاذ کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم ان میں تھا جو میرے دل کے بہت قریب رہے ہیں۔ اگر چہ اختلافات بھی ہوئے، جھگڑے بھی۔ یہاں تک کہ ایک بار مار پیٹ تک بات پہنچی۔ مگر جو تعلق خاطر تھا وہ نہ ٹوٹا اور

اس عمر میں جب ہم رشتوں اور محبتوں کی پیاس میں لوگوں سے ملتے ہیں۔ شاذ انہیں دنوں کا دوست تھا۔ اس کی موت کی خبر سن کر جو غیر متوقع نہیں تھی۔ بے حد دکھ ہوا۔ یہاں ایک تقریب کی نشست میں تو رقت کے سبب تقریر بھی ٹھیک سے نہیں کرسکا۔ حیدر آباد گیا تو ستمبر کے دوسرے ہفتے میں اس کے گھر بھی پرسے کے لئے گیا۔

تم پر، تمہاری برسوں کے بعد ملاقات اور یہاں کی مصروفیات، یہاں کے احباب کی پذیرائی اور سرد مہری وغیرہ کے سلسلے میں بہت تفصیل سے لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن برا ہو فلمی خرافات کا۔ دو دو اسکرپٹ ان دنوں مکمل کئے۔ کہانی، منظر نامہ اور مکالمے۔ اتنے جان لیوا ہوتے ہیں کہ دن بھر ان میں مغز کھپانے کے بعد، ذہن، میری دلی ہو جاتا ہے۔ جس سے کئی لشکر گزرے۔ یقین کرو، کسی کو خط لکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اب ان خرافات سے تھوڑی سی فرصت ملی ہے تو کئی کتابوں پر تبصرے لکھنے ہیں۔ ایک دو مضامین لکھنے ہیں اور تم پر بھی لکھا ہے۔ ایک دو دن میں یہ کام ہو جائے گا تم کو مضمون کی ایک کاپی بھیج دوں گا۔ دعا پر دست ملتا رہتا ہے۔ لیش چوپڑا، جنہوں نے طے کرلیا کہ تم سے ایک فلم کے گیت لکھوائیں گے۔ اپنی فلم کی ریلیز کے سلسلے میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کی پچھلی دو بڑی فلمیں فلاپ ہوئی تھیں۔ اس فلم میں انہوں نے ایک نئے Pair کو لیا ہے۔ اس لئے بے حد تشویش میں ہیں کہ پتہ نہیں کیا ہو، ممکن ہے تم کو بھی انہوں نے لکھا ہوگا۔ تم سے نومبر میں ملنے کی امید بھی بہت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔

مجاہد تمہارے جانے کے بعد دو بار ملے تھے۔ انہوں نے یہ خبر دی تھی کہ تم نے اپنے وہاں پہنچنے کی اطلاع تار کے ذریعے اورنگ آباد دی تھی۔ اور یہ بھی اطلاع دی تھی کہ تم نے یوسف ناظم کو اور مجھے خط لکھا ہے۔ خط تو اب تک نہیں ملے۔ مجاہد کے لئے میں نے ایک کرائے کے گھر کی بات چیت کی تھی۔ انہیں دنوں وہ اورنگ آباد چلے گئے۔ میں کوشش میں ہوں انہیں کہیں Settle کرنے کے لئے۔

ہاں ابھی ۲۱ اگست کو اورنگ آباد گیا تھا۔ وہاں پن چکی میں مشاعرہ تھا۔ مجھے Conduct کرنا پڑا۔ اس سے پہلے یہاں کے ٹی وی سے ایک مشاعرہ ٹیلی کاسٹ ہوا تھا جسے میں نے ہی Conduct کیا تھا۔ اس کی شہرت میرے لئے مصیبت بن گئی۔ اورنگ آباد کا مشاعرہ Conduct کرنا پڑا۔ بہت پرانے لوگ ملے۔ تم بہت یاد آئے وحیدہ نسیم بھی اس مشاعرہ میں تھیں۔

منرہ تمہارے خط کی اس لئے بھی انتظار میں ہے کہ تم شاید اس خط کے ساتھ وہ تصویریں بھیجو جس میں منرہ ہے۔ میرا بیٹا تمہیں سلام کہہ رہا ہے۔ منرہ کی طرف سے آداب قبول کرو۔ بھابی اور بچوں کو میرا سلام اور دعائیں کہنا۔ میری کتاب "ذکر دیار" وہاں پہنچی یا نہیں۔ "تخلیقی ادب نمبر" جس میں میری نظمیں ہیں ذرا مشفق خواجہ سے اس کی توثیق کرو اور اگر ایسا ہے تو وہ رسالہ انہیں بھیجنے کے لئے کہو۔ مختصر جواب۔ تمہارا

عزیز قیسی
۲۴ ستمبر ۸۵ء

پروفیسر راجندر سنگھ ورما

شعبہ انگریزی، پنجابی یونیورسٹی

پٹیالہ (بھارت)

پیارے دوست۔ سلام شوق

شکریہ۔ ابھی ابھی آپ کا مورخہ ۹ ستمبر کا خط ملا۔ لیکن ابھی تک "بنگال سے کوریا تک" کے انگریزی ترجمے کی رسید اور رائے کا تار نہیں ملا۔ ترجمہ میں نے ۱۷ ستمبر کو رجسٹرڈ بھجوایا تھا۔ ایک اور دوست نے ۱۹ ستمبر کو لاہور سے دوسری کاپی سپرد ڈاک کی ہوگی۔ حیرت ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی کاپی نہ ملی۔ شاید یہ خط ملتے ہی مل جائے۔ بذریعہ تار مطلع فرمایئے۔

پروفیسر احمد علی صاحب برصغیر کے عظیم شاعر اور ادیب ہیں اگر وہ پیش لفظ لکھ دیں تو کیا کہنا پروفیسر صاحب میرے بھی کرم فرما ہیں۔ بہت پیارے پیارے لمبے لمبے خط لکھتے ہیں اس ناچیز کے قدر دان ہیں ان کی چند انگریزی نظموں کا میں نے منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ جو انہیں بہت پسند آیا۔ شاید "نقوش" کے کسی شمارے میں چھپے بھی ہیں۔

جی الانہ صاحب بھی میرے کرم فرما ہیں نہایت پیار سے دعوت دیا کرتے ہیں۔ اس وعدے کے ساتھ کہ جب کبھی کراچی آؤں، شہر بھر کے ادیبوں کو وہ ڈنر پر بلائیں گے۔ ان دونوں شعراء اور چند دیگر پاکستانی شعراء کے تراجم میں نے کئے ہیں ہند کے تمام ممتاز انڈو انگلش شعراء کے بھی۔ یہ کتاب تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اس میں شاہکار نظموں کا منظوم ترجمہ شامل ہوگا تمام تراجم پسند کئے گئے ہیں اس طرح مجھے ہندو پاک کے تمام ممتاز اردو اور انگریزی شعراء سے تعارف کا شرف بھی حاصل ہے غائبانہ ہی سہی.......... آپ اپنے تراجم بھی وہاں چھپوایئے اور مجھے لکھئے کہ کون کون سے انگریزی رسائل تراجم شائع کرتے ہیں۔ ان کی پتے اور جو نظم آپ کی چھپے، اس کی ایک کاپی بھی عطا کریں۔ منیر نیازی صاحب نے لکھا ہے کہ وہ کوئی ایسا سلسلہ شروع کر رہے ہیں اور مجھ سے نظمیں منگوائی ہیں کراچی میں تو انگریزی کا بول بالا ہوگا۔

اس ناچیز کا تعارف کیا! آپ نے ازراہ کرم پوچھ لیا ہے تو مختصراً یہ ہے کہ انگریزی اور پنجابی میں پنجاب یونیورسٹی اور فارسی میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کئے ہوئے ہوں۔ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں انگریزی پڑھاتا ہوں اور کافی بدنام ہوں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر ادبی موضوعات پر تقاریر، بک ریویو اور کلام شاعر پیش کرتا رہتا ہوں۔ "آواز" اور "AKASHWANI" میں اگر چیزیں بطور انتخاب چھپتی رہتی ہیں رسائل میں آپ کے یہاں، "تخلیق" اور "سب رس" میں حال ہی میں چند غزلیں چھپی ہیں ویسے میں نظم کا شاعر ہوں، نہایت معمولی سا......... بیشتر وقت پڑھنے لکھنے اور تراجم میں گزارتا ہوں "گوشہ نشین سا آدمی ہوں، لیکن احباب کا کرم ہے کہ غریب خانے پر دور دور سے تشریف لاتے رہتے ہیں۔ سوائے ادبی مشاغل کے اور کوئی شغل نہیں۔ دیکھنے میں سکھ ہوں لیکن مذہبی دلچسپی صفر کے برابر ہے۔ بیٹی کا ذکر کر چکا ہوں اور گم شدہ بیٹے کا بھی۔ بیگم بی اے ہے لیکن "چراغ خانہ" اردو داں ہیں اس لئے آپ کے اشعار سے لطف اندوز ہو چکی ہیں۔ خصوصاً "بنگال سے کوریا تک" کے اس ٹکڑے سے جو بیٹی کے وداع پر آپ نے لکھا ہے بے پناہ ٹکڑا ہے۔ کتنے ہی پنجابی اور انگریزی کتب کا اردو میں ترجمہ کر چکا ہوں۔ قرۃ العین حیدر صاحبہ کی ایک کتاب "پت جھڑ کی آواز" کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔ محکمہ السنہ کی فرمائش پر۔ ہند اور پاک اردو شعراء کی شاہکار نظموں کا انگریزی ترجمہ آج کل توجہ گیر ہے۔

میں نے کئی پاکستانی دوستوں کو (مع پاک ہند پریم سبھا کے صدر، جناب رئیس امروہوی کے..... جن کے ایماء پر میں نے پنجاب میں ہند پاک پریم سبھا بنائی تھی) یہ سوچنے کی دعوت دی ہے کہ جب کہ ہند میں کتنی ہی، پاکستانی شعراء اور ادباء کی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں۔ پاکستان میں ہند کے شعراء کی کتابیں کیوں نہیں چھپتیں؟ سیاسی لوگ جو چاہیں کیا کریں ہمارا مسلک تو ایک ہے۔ خیر سگالی کا جذبہ ہے پھر اس کا اظہار اس طرح کیوں نہیں ہوتا۔ شاید آپ اس سلسلے میں پہلا قدم اٹھا سکیں۔

اب کے ستمبر کا امریکی پروگرام تو رد ہوا۔ اگلے سال فروری میں شاید بات بن سکے۔ ہماری طرح آپ کے یہاں بھی فروری مارچ تو پڑھائی کا مصروف ترین دور ہوتا ہے مارچ کے آخر میں طلبا چلے جاتے ہیں ہمیں اپریل سے جولائی نصف تک موسمی تعطیلات ہوتی ہیں۔

پروفیسر احمد علی صاحب کا دیر سے خط نہیں ملا، مجھے تشویش رہتی ہے ملاقات ہو تو آداب و نیاز پہنچا دیجئے۔ خدا انہیں عمر دراز اور صحت کامل عطا کرے اور عید کارڈ اور کئی خطوط کا جواب نہیں ملا۔ ادب سے گلہ بھی کر دیجئے میری جانب سے امید

ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
راجندر سنگھ ورما
۲۷-۹-۸۳ء

پروفیسر لطیف الزماں خاں

(ملتان)

۲۰ اگست ۱۹۸۶ء

یار عزیز، سلام مسنون

یہ محض اتفاق ہے کہ عاصی صاحب سے ملاقات ہوگئی اور معلوم ہوا کہ تم نے تین کتابیں میرے لئے بھیجی ہیں، میں نے کل شام ایک طالب علم کو بھیج کر کتابیں منگوالیں ورنہ کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا۔

میں نے زندگی بھر کتابیں خرید کر پڑھیں لیکن اگر کوئی دوست یا کرم فرما ازراہ خلوص کتابیں دے تو انکار بھی نہیں کیا جب کبھی تم ملتان آئے ملاقات ضرور ہوئی لیکن نہ میں نے کتاب طلب کی نہ تم نے دی۔ اب جو کتابیں ملی ہیں تو جی خوش ہوا

میں ایسے نامہذب شہر میں رہتا ہوں جہاں اچھی کتابیں ملتی ہی نہیں۔ کراچی جانا تو سال دو سال بعد ہوتا ہے اور لاہور بھی جانا اب کم ہی ہوتا ہے۔ ایک خرابی یہ کہ لاہور کا پبلشر اور کتب فروش کراچی کی مطبوعہ کتب فروخت کرنے کے لئے منگاتا ہی نہیں۔

"شخص و عکس" میں نے خرید لی تھی اور دو حضرات کو اس کتاب کے بارے میں لکھتا رہا۔ ایک پروفیسر اور دوست شفیق احمد صاحب (کراچی) کو جنہوں نے میری تحریر کو بہت سراہا دوسرے پروفیسر نظیر صدیقی صاحب کو جنہوں نے کتاب کو معمولی قرار دیا اور جب میں نے ذرا تیز باتیں لکھیں، تو انہوں نے خاموشی اختیار کرلی۔

راجندر سنگھ ورما صاحب کے خطوط بھی آتے ہیں اب میں ان کے ترجمے پڑھوں گا اور انہیں اپنی رائے سے آگاہ کروں گا۔ ترقی پسند دوست جو کچھ کہتے ہیں اسے تو پڑھتا ہی ہوں لیکن مخالفین کی تحریروں کو زیادہ غور سے پڑھتا ہوں کہ اگر ہم نے غلطی کی ہے تو اسے درست کرلیں ورنہ ہٹ دھرمی کا سلیقہ سے جواب دیں۔ "شخص و عکس" میں جس طرح تم نے شائستگی اور شرافت سے مخالفین کو جواب دیا وہ میرے لئے قابل فخر ہی نہیں باعث تسکین بھی ہے اور میں اکثر لوگوں کو لکھتا رہا ہوں کہ سخن وریوں سراکہتے ہیں۔

اردو کالج میں تم سے یاری کی ابتداء اس وقت ہوئی جب تم نے "بنگال سے کوریا تک" سنائی تھی۔ سامعین نے توجہ سے سنا، ماحول پر جیسی فضا طاری ہوئی جیسی خاموشی تھی اور ہر مصرعہ جس طرح دل میں اترتا چلا گیا تھا۔ وہ آج بھی دل پر نقش ہے اور یہی سچی اور اچھی شاعری کی پہچان ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ اور اثر قاری میں دل و دماغ پر گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ کالج میں آخری ملاقات تم سے منٹو کے انتقال پر دوسرے دن ہوئی تھی اور جب میں اور تم آمنے سامنے ہوئے تو رو پڑے تھے۔

میں یونیورسٹی چلا گیا اور تم غالباً" حیدر آباد تمہارے مجموعے چھپتے رہے مگر مجھے کبھی نہ ملے۔ تم سے ملاقات بھی ہوتی رہی لیکن کتابیں پھر بھی نہ ملیں۔ اب تو یہ کرم کرو کہ باقی ماندہ کتابیں پبلشر سے کہہ کر بذریعہ وی پی بھجوا دو۔

میں گزشتہ مارچ میں ملازمت سے ریٹائر ہوگیا۔ اب اطمینان سے لکھنے کام کروں گا اس وقت میں رشید احمد صدیقی صاحب کے خطوط تقریبا (۲۷۵) پر حواشی مکمل کررہا ہوں ستمبر میں کراچی جانے کا خیال ہے اگر تم وہاں کا پتہ لکھ دو تو ملنے پہنچوں گا ورنہ ایک روز کے لئے تمہاری یونیورسٹی آجاؤں گا۔

امید کرتا ہوں کہ تم خط لکھتے رہو گے

بھائی جان کو آداب۔ بچوں کو دعائیں۔ بچوں کا حال لکھو۔

تمہارا۔لطیف الزماں خاں

پروفیسر اکبر رحمانی

(ایڈیٹر "آموزگار")

جلگاؤں (مہاراشٹر) بھارت

۱۳۔۷۔۸۳ء

مکرمی حمایت علی شاعر

گلہائے محبت و عقیدت

آپ کا خط موصول ہوتے ہی "آموزگار" کے فروری کے شمارے میں اس کا جواب بھی ارسال کردیا تھا۔ پتہ نہیں وہ شمارہ آپ تک پہنچا یا نہیں۔

جواب دینے میں مزید تاخیر اس وجہ سے ہوئی کہ درسی کتابوں کی ترتیب و تدوین کے جانگسل کام نے فرصت ہی نہ لینے دی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جس درسی کتاب میں آپ کی نظم شامل ہے اس کی سرکاری منظوری کا مرحلہ باقی تھا۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ منظوری مل چکی ہے۔ اب یہ کتاب اپریل ۸۴ء میں طبع ہوکر منظر عام پر آجائے گی اور جون ۸۴ء کے تعلیمی سال سے جماعت دہم کی کلاسوں میں پڑھائی جائے گی۔ مہاراشٹر میں یکساں نظام تعلیم ہونے کی وجہ سے تقریبا ۵۰ ہزار طلبہ اس سے مستفید ہوں گے۔ رائلٹی کے سلسلے میں آپ کا دیا گیا پتہ نوٹ کرلیا گیا ہے۔ جلد ہی آپ کے بھائی کے نام فارم روانہ کئے جائیں گے۔ اگر کوئی فارم آپ کو بھیجا جائے تو اس پر دستخط کرکے اپنے بھائی کو روانہ کردیں۔

گزشتہ دنوں اورنگ آباد جانا ہوا۔ ادبی محفلیں منعقد ہوئیں۔ آپ کا ذکر بھی رہا۔ سکندر علی وجد کے انتقال کے بعد آپ کی ذات "فخر اورنگ آباد دکن" قرار پائی۔ مگر اب تک معدودو چند کے' اکثر اہلیان اورنگ آباد آپ کے نام اور کام سے نا آشنا ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ میں خود ہی پہل کروں کہ "آموزگار" کا ایک خاص نمبر آپ کے نام سے شائع کروں۔ اس سلسلے میں آپ کے تعاون کی شدید ضرورت رہے گی۔ بغیر آپ کے تعاون کے یہ کام انجام نہ دے سکوں گا۔ اس سے قبل میں چاہتا ہوں کہ "آموزگار" کے ذریعہ یہاں کے حلقے میں آپ کا اچھی طرح تعارف کرادوں۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ اپنی چند تخلیقات "آموزگار" کے لئے جلد از جلد ارسال فرمائیں۔ ایک سالنامہ زیر ترتیب ہے۔ اس سالنامے میں یہ تمام تخلیقات شائع کرنا چاہتا ہوں۔ امید کہ آپ مایوس نہ کریں گے۔ "اورنگ آباد" سے متعلق کچھ یادیں بھی لکھ کر بھجوا دیں تو بڑا ہی اچھا ہوگا۔

آپ کی جو نظم درسی کتاب میں شامل کی گئی ہے اس کا عنوان "جواب" ہے۔ اسے آپ کے مجموعہ کلام "مٹی کا قرض"

سے لیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ آپ نے سکندر علی وجد کو دیا تھا۔ انہوں نے مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کو وقف کر دیا تھا۔ اور اس طرح آپ کے کلام کو پڑھنے اور اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

"آموزگار" میں تفہیم درسیات و نصاب کا ایک مستقل کالم شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کالم میں درسی کتابوں میں شامل اسباق کی تفہیم و تشریح کے لئے خود اس سبق کے تخلیق کار کو دعوت دی جاتی ہے۔ اس طرح اساتذہ اور طلبہ کو اس سبق کی فہمائش میں مدد ملتی ہے۔ آپ کی جو نظم شامل درس کی گئی ہے اس کے متعلق آپ بھی اپنے تاثرات روانہ کریں۔ وہ نظم لکھنے کا خیال کیسے آپ کے ذہن میں آیا؟ اس نظم کے ذریعہ آپ کیا پیغام دینا چاہتے ہیں نیز اس کی فنی خوبیوں پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس درخواست کو شرف قبولیت بخشیں گے۔

پاکستان سے کئی رسائل تبادلے میں آرہے ہیں۔ کتابیں بھی آرہی ہیں مگر ان کی رفتار بے حد دھیمی ہے۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ میں اپنی تمام کتابیں روانہ کردوں گا۔ پوسٹ سے بھیجنے میں کافی اخراجات ہوں گے۔ اس لئے کسی مناسب شخص کے ہاتھ روانہ کردیں تو بہتر ہے۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ اگر میرے کوئی شناسا یا عزیز وہاں سے آنے والے ہوں تو ان سے کہہ دوں کہ وہ آپ سے ملاقات کرکے آئیں۔

یوں تو میرا ارادہ بھی پاکستان آنے کا ہے مگر اپنی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے امسال ممکن نہیں۔ آئندہ سال ہی سوچا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے نظام تعلیم سے متعلق اگر کوئی مضمون نظر سے گزرے تو روانہ کردیں۔ آپ کے متعلق جن جن رسائل میں مضامین شائع ہوئے ہیں ان کے تراشے بھی بھجوا دیں تو "خاص نمبر" ترتیب دینے میں سہولت رہے گی۔

اہل خانہ کی خدمت میں حسب مراتب سلام، آداب۔ جواب کا شدید انتظار رہے گا۔

نیاز مند
اکبر رحمانی

۳

محترم سلام مسنون

۳۰ مارچ کا خط ۲۰ اپریل کو موصول ہوا۔ ۱۹ مئی کو کتاب کو آخری شکل دی جائے گی اور اسی میٹنگ میں منظوری بھی۔ آپ کی جو نظم جماعت دہم کی درسی کتب کے لئے انتخاب کی گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے "جواب" آپ پہلی بار یہاں (ہندوستان میں) درسی کتابوں میں متعارف ہو رہے ہیں مجھے اس کی خوشی ہے کہ اپنے وطن کے ایک نامور شاعر کو متعارف کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

یہ اچھا کیا کہ آپ نے اپنے بھائی کو خط لکھ دیا۔ ماہ مئی میں ایک خط رائلٹی اور کاپی رائٹ کے سلسلے میں انہیں بھیجا جائے گا۔ وہ اس فارم کو جلد از جلد پر کرکے روانہ کردیں۔ اگر نامزدگی کے لئے ضرورت پیش آئے تو آپ وہیں سے اپنے بھائی کو تحریر کردیں کہ میری تمام تخلیقات کے لئے رائلٹی کا حقدار میرا بھائی ہوگا۔ آپ کی معلومات کے لئے عرض کردوں کہ مذکورہ کتاب جماعت دہم، یعنی میٹرک کے نصاب کے لئے ہے۔ جب تک یہ کتاب رائج رہے گی آپ کو سالانہ رائلٹی ملتی رہے گی اس ریاست میں تقریباً ۵ سال یا ۷ سال تک کتاب تبدیل نہیں ہوتی۔

اورنگ آباد جانا ہوا تو بھائی سے ضرور ملاقات کروں گا۔ اگر میرے پاس آپ کی شاعری کے مجموعے ہوتے تو دیگر درسی کتابوں کے لئے بھی طلبا کے لائق چیزیں منتخب کرالیتا۔ اس وقت میں مہاراشٹر کی اردو درسی کتابوں کی کمیٹی کا نہ صرف رکن ہوں بلکہ میری نگرانی میں تمام مضامین کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ مذکورہ کتاب میں پاکستان سے نظیر صدیقی، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب اور حفیظ جالندھری مرحوم کی تخلیقات منتخب ہوئی ہیں۔ نظیر صدیقی نے منظوری بھیج دی ہے۔ مرزا ادیب اور قاسمی

صاحب کو دوبار خطوط بھیج چکا ہوں اور ''آموزگار'' بھی۔ ہنوز جواب سے محروم ہوں۔ اگر آپ کے ان صاحبان سے تعلقات ہوں تو فوری طور پر میرے نام خط لکھنے کی درخواست کریں۔

آپ اپنی تمام مطبوعات کسی نہ کسی صورت روانہ کریں۔ رسائل اور کتابیں پاکستان سے یہاں بذریعہ ڈاک برابر آرہی ہیں۔ ''آموزگار'' کے تبادلے میں کئی پاکستانی رسالے مل رہے ہیں۔ اس طرح تبصرے کے لئے بھی کتابیں آرہی ہیں آپ تین تین چار چار کتابوں کا پیکٹ بذریعہ ڈاک روانہ کردیں مجھے یقینی طور پر مل جائے گا۔ آئندہ سال کچھ اور درسی کتابیں ترتیب دینا ہیں۔ اگر آپ کے مجموعے پیش نظر رہے تو ممکن ہے مزید انتخاب ہوجائے اور اس طرح آپ کے بھائی کی امداد کا سامان نکل آئے۔

''آموزگار'' آپ کو پابندی سے روانہ کیا جاتا رہے گا۔ برصغیر میں ہندوپاک میں کوئی تعلیمی رسالہ نہیں تھا۔ اس کمی کو میں نے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تنہا اس بار کو ناتواں کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں' کاغذ طباعت کی روز افزوں گرانی نے آموزگار کے دامن کو تنگ کر رکھا ہے۔ کوشش کررہا ہوں کہ ''تنگ دامنی'' کا گلہ جاتا رہے جون میں سالنامہ شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اس کے لئے اپنی تازہ تخلیقات سے نواز کر ممنون فرمائیں۔

آپ کی یونیورسٹی میں کوئی صاحب ذوق ''پاکستان میں اردو تعلیم'' کے موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہے تو ''آموزگار'' ان کے خیالات کی اشاعت اپنے لئے باعث فخر سمجھے گا۔

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

نیازمند

اکبر رحمانی

۲۲-۶-۱۹۸۷ء

برادر محترم حمایت علی شاعر صاحب

السلام علیکم

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ کراچی میں پھر سے شروع ہوئے فسادات کی خبریں پڑھ کر تشویش ہورہی ہے۔ خدا کرے آپ مع اہل و عیال بخیر و عافیت ہوں۔ اورنگ آباد میں آپ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کا نقش اب بھی دل میں تازہ ہے۔ یوں تو ریڈیو پاکستان سے آپ کو کئی بار سن چکا ہوں مگر اورنگ آباد کے مشاعرے میں جو لطف آیا وہ کچھ اور ہی بات تھی۔

میں نے رخصت ہوتے وقت اپنی زیر طبع کتاب ''تحقیقات و تاثرات'' کا ایک نامکمل نسخہ اس لئے دیا تھا کہ آپ اس کے لئے پیش لفظ تحریر کردیں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میں کراچی پہنچتے ہی اس کام کو انجام دوں گا۔ قریب دو ماہ کا عرصہ ہورہا ہے۔ کتاب اب تک نامکمل حالت میں پڑی ہے۔ براہ کرام بواپسی ڈاک اپنے تاثرات روانہ کرکے ممنون فرمائیں۔ آپ نے لمعہ حیدر آبادی کے متعلق بھی کچھ واقعات لکھ کر بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ بعض ناقدین نے لمعہ کی بے نیازی اور شعری ادب سے لاتعلقی کی بناء پر انہیں ایک فرضی شخصیت قرار دیا ہے اور ان کے نام علامہ اقبال کے خطوط کو جعلی قرار دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔ میں نے اپنے مضامین (کتاب میں شامل حصہ اقبالیات) میں لمعہ کی صلاحیتوں کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ علامہ اقبال اور ٹیگور سے ان کے مراسم پر روشنی ڈالی ہے۔

آپ نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ نیرنگ خیال کا تاثیر نمبر ۱۹۷۴ء اور عبدالواحد معینی کی کتاب نقش اقبال بھی روانہ کرنے

کی کوشش کروں گا۔ ان کے علاوہ خود کے شعری مجموعے روانہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ سب وعدے خود میری کتاب پر آپ نے تحریر کر لئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وعدے "وعدہ محبوب" نہ ثابت ہوں گے۔ لمعہ حیدر آبادی اور اقبال پر تحقیقی کام کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم بھی تعاون کر رہے ہیں۔ لمعہ صاحب کا کلام بھی دستیاب ہو چکا ہے۔ نثری مضامین کا مجموعہ بھی مل گیا ہے۔

مکرمی خواجہ حمید الدین شاہد صاحب نے بھی وعدہ کیا تھا کہ پاکستان سے جس کتاب کی ضرورت ہو لکھئے اور اس طرح تبادلہ کتب کا ہونا طے پایا تھا۔ میں نے ان سے مندرجہ ذیل کتابیں طلب کی ہیں۔

۱۔ مظلوم اقبال	اعجاز احمد
۲۔ زندہ رود	جاوید اقبال
۳۔ روزگار فقیر	وحید الدین
۴۔ منتخب اللباب	قاضی خان۔ نفیس اکیڈمی کراچی
۵۔ منتخب التواریخ	عبدالقادر بدایونی
۶۔ سفر نامہ برنیئر	
۷۔ خدوخال اقبال	امین زبیری

براہ کرم آپ بھی خواجہ حمید الدین صاحب کی توجہ اس وعدے کی طرف مبذول کروائیں اور انہیں لکھئے کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو بلا تکلف لکھئے۔

آموزگار کے دو شمارے آج ہی آپ کے نام سپرد ڈاک کیا ہوں۔ اپنی تازہ تخلیقات اور نگارشات "آموزگار" کے لئے ضرور روانہ کیجئے۔ اہل خانہ کی خدمت میں سلام و آداب۔ گزشتہ دنوں اورنگ آباد شادی کی تقریب میں شریک ہونے کے لئے گیا تھا۔ بھائی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ خیریت و عافیت سے ہیں۔

آپ کے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔

نیاز مند

اکبر رحمانی

عمران الارشد

لندن

۱۸ اگست ۹۳ء

پیارے حمایت

حسب معمول بارہ بجے رات تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد "سناٹا" سا ہو گیا ہے۔ (بالو ارشد) بھی ۱۰ اگست کو امریکہ چلی گئی۔ ۳۱ تک واپسی ہوگی۔ تمہارا "جنگ" کا انٹرویو ابھی تک نہیں آیا۔ یوسف فاروقی نے بھی "وطن" کے لئے تمہارا تعارف مجھ سے لے لیا ہے۔ تصاویر کے ساتھ چھپے گا۔ ("وطن" ہفتہ وار ہے) میں نے آج سلیم قریشی (انڈیا آفس لائبریری) کو فون کیا تھا۔ تم کو براہ راست مطلوبہ کاغذات بھیج رہے ہیں۔ میں بھی اگلے ہفتے ان سے ملوں گا۔ تمہاری ہدایت کے مطابق ابا (مولانا ارشد تھانوی) کی بیاض وغیرہ ان کو دیدوں گا۔ تمہاری کتابوں کی رسید مل گئی ہے۔ شاہ صاحب (معین الدین شاہ) نے آج فون کیا تھا۔ ان کا حکم ہے کہ حمایت کو لکھو کہ وہ "دو یا سا گر احمد" پر اپنا مضمون فوراً بھیج دیں۔

کتاب میں شامل کرنا ہے۔ ان کی کتاب ہندوستان میں چھپے گی۔ میرے افسانے بھی مانگے تھے ان کو بہت پسند آئے۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تمہارے نہیں ہیں۔ صرف تمہارے نام سے چھپے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ حمایت نے لکھ کر میرے نام سے چھپوا دیئے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ کیا ہے وہ فارسی شعر؟

من تو شدم' تو من شدی (وغیرہ وغیرہ)
تا کس نہ گوید بعد ازیں' من دیگرم تو دیگری

تم تو اب جدہ میں ہوں گے' ثواب کتنا کمالیا؟ تھوڑا سا میرے لئے بھی رکھنا۔ پرسوں (پیر کو) ساقی نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اس نے اپنی کتاب "بازگشت بازیافت" پڑھنے کو دی۔ ایک کاپی ہے۔ میری حقیر رائے مانگی ہے۔ پھر کل (منگل) کو وہ ۴ بجے رات کو میرے پاس آیا اور ہم لوگ Rest Home یعنی (Pub) میں جاکر بیٹھ گئے۔ اور پرانی اور نئی باتیں کرتے رہے۔ بقول ساقی "غیبت کا شامیانہ" تنا رہا اور بہت سی "سچائیاں" کھل کر سامنے آگئیں۔ ہاں' افتخار عارف نے ایک انگریزی رسالہ نکالا ہے (سہ ماہی) ساقی کو بھیجا ہے۔ مجھے کیوں بھیجے گا۔ نہ وہ مجھے مانتا ہے نہ میں اسے۔ ایک اور بات یاد آگئی۔ محمد احمد سبزواری (بڑے بھائی جان) جن کو تم نے اپنی کتاب "قفس در قفس" دی تھی۔ اور پھر وہ تمہارے شیدائی ہوگئے۔ "بھوپال کی کہانی" لکھ رہے ہیں۔ اگر وہ پوری ہوگئی ہو اور شائع ہوچکی ہو تو اس کی دو کاپیاں (ایک میرے لئے اور ایک برٹش لائبریری کے لئے) میں چاہتا ہوں۔ یہ کہانی گزشتہ چھ سو سال کی تاریخ ہے۔ ادبی' سیاسی' بھوپال کا وجود میں آنا۔ وہاں کے نوابوں وغیرہ کی زندگی' رسالوں' اخباروں کے نام' ترقی پسند مصنفین کی بنیاد' بڑے کام کی کتاب ہوگی۔ صہبا لکھنوی کو معلوم ہوگا۔ محمد احمد سبزواری ان کے محلے دار تھے۔ میں نے پچاس صفحات پڑھے تھے۔ باقی پڑھنے کے لئے بے چین ہوں۔ سرشار اور شاہد شفق کو سلام کہنا۔

تمہارا

عمران

جمشید مسرور

اوسلو (ناروے) ۱۱-۱۱-۹۲ء

محترم شاعر صاحب

السلام علیکم

زہے نصیب۔ آپ کا خط پاکر بے پایاں مسرت حاصل ہوئی آپ نے جتنی محبت سے میری کاوشوں کو سراہا ہے اس کے لئے میں تہہ دل سے ممنون ہوں۔

جب میں نے اس کام کا بیڑہ اٹھا ہی لیا تو پیش نظر ایک ہی بات تھی کہ اس کا معیار اتنا ہی بلند ہو' جتنا کہ اس کے قارئین ہوں گے۔ آپ کی شاباشی نے مجھے سچی خوشی عطا کی ہے یوں لگا جیسے میرا محنتانہ مجھے مل گیا آپ نے صحیح کہا کہ اس سے پہلے ایسا رسالہ مغرب میں تیار نہیں ہوا۔ چھوٹے موٹے تو کئی نکلتے ہیں۔ اس میں میرے کم از کم ڈھائی سال اور بہت سا بلڈ پریشر شامل ہیں۔

یہاں کی مرکزی لائبریری نے ایک نہایت معقول رقم کے عوض مجھ سے دس پرچے خریدے ہیں۔ چند دوستوں نے بھی

خریداری کی ہے لیکن حیف ہے انگلینڈ میں رہنے والے اہلِ "ادیبوں پر" جب عمران نے انہیں خطوط لکھے تو..... صرف ایک بلبل کاشمیری تھے جنہوں نے اسے فوراً پیسے بھیج کر رسالہ منگوالیا۔ باقیوں کا قول یہ تھا کہ ہم ڈاک خرچ دینے کے بجائے جب پاکستان جائیں گے وہاں سے خریدلیں گے۔ چہ بوالعجبی است........

اب میں ذاتی طور پر ان کو سخت سست کہنے والا ہوں تاکہ کچھ تو گرہ ڈھیلی کریں۔

وہاں کینیڈا سے بھی چھ پرچوں کا آرڈر فون پر آیا تھا اور یہ فون کرنے والے رفعت نور تھے۔

لکھنؤ سے ایک خاتون نے فون کرکے پرچہ بک کروایا اور کہا کہ وہ بل ادا کریں گی۔ البتہ میں نے انہیں پرچہ تحفتاً" روانہ کردیا ہے خلوص اور شوق ہو تو ایسا۔

آپ جن دنوں یہاں آئے تھے میں معاشی اور معاشرتی بھول بھلیوں میں اوسلو سے بہت دور ایک قصبے میں گم تھا اس لئے چاہنے کے باوجود کسی سے بھی نہ مل سکا۔ امید ہے کہ اب تک آپ یوسف کامران کی کتاب حاصل کرچکے ہوں گے۔ ان کے بارے میں آپ کے جذبات نے آبدیدہ کردیا۔

ناروجین ادب کے بارے میں عرض ہے کہ چند ایک ہم عصر شعراء کا کلام منظوم ترجمہ کرکے پیش کرچکا ہوں۔ اب میں ایک مشہور شاعر کی ایک کتاب کے منظوم ترجمے سے ابھی فارغ ہوا ہوں یہ کتاب انشاء اللہ اپریل تک سنگ میل لاہور سے شائع کروانے کا ارادہ ہے۔ ۹۴ء کے آخر تک ایک اور کتاب کا منظوم ترجمہ بھی تیار ہوجائے گا۔

آپ لوگ جب آئے تھے تو چاولہ صاحب نے رائٹرز یونین والے دفتر میں آپ لوگوں سے ناروجین ادیبوں کی ملاقات کے بارے میں ذکر کیا تھا کہ شاید ایک آدھ ادیب آیا تھا اور وہاں بھی ابلاغ کا مسئلہ قائم رہا۔

میرا یہ ہے کہ میں ان کے قبیل سے ہوں اس لئے کبھی بلاؤں تو "چٹی بھرا" سمجھ کر آجاتے ہیں۔

ایک شاعر Harald Sverdrup دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں جب میں نے ادبی نمبر کے لئے ان کی نظمیں مانگیں تو بولے۔

"اس کام سے تمہیں فائدہ (مالی) کوئی نہ ہوگا محنت ہے۔ کرتے جاؤ....." لیکن کیا اچھے شاعر تھے۔

آپ کی دعا اور رہنمائی سے انشاء اللہ میں دوسرے کام بھی کامیابی سے کروں گا۔ ناروجین زبان پر مجھے اتنا عبور ضرور حاصل ہے کہ پچھلے دنوں میں نے کسی کی فرمائش پر "کھول دو" کا ترجمہ کیا۔ اس میں صرف تین نہایت معمولی اغلاط نکلیں۔ جنہیں نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔

آپ نے مجھے جو راستے دکھائے ہیں اور مشورے دیئے ہیں ان پر کاربند رہوں گا۔

فن تھیسن سے بھی میری ملاقات ہے۔ مزے کا آدمی ہے گیارہ زبانیں جانتا ہے..... لیکن مصروف بہت ہے اس لئے اپنے کام میں مگن رہتا ہے۔ اردو علی گڑھ کے لہجے میں بولتا ہے فارسی اس سے بھی اچھی بولتا ہے۔ پچھلے دنوں میں ایک محفل میں اس کے قابو آگیا۔ اس نے فارسی کی اتنی بوچھاڑ کی کہ میں ہانپنے لگا۔ فارسی سے تھوڑی شدبد مجھے بھی ہے لیکن اتنی بھی نہیں۔ یعنی بہت زیادہ بولنے کی مشق نہیں۔

سائیں سچا ۱۹۹۰ء میں اوسلو میں ملاقات کے بعد اب تک غائب ہے (میری حد تک) اس سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔ کلکتہ والے ف۔ س۔ اعجاز بھی دوست ہے اور اس سے بھی رابطہ رہتا ہے۔

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ روبینہ کی طرف سے سلام قبول کریں۔

جمشید مسرور

نایاب حسین

سویڈن

۱۹/۵/

حمایت علی شاعر۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم شاید بیتی ہوئی یاد بن چکے ہیں لیکن آپ جیسے دوستوں کی محبت پاکر ایک بار پھر سے کھل اٹھنے کو جی چاہا۔ آپ کی کتابیں پڑھیں' لطف آگیا۔ واپسی کا سفر بہت خوشگوار رہا۔ دس بارہ گھنٹے تک آپ کی شاعری کے سحر میں کھویا رہا۔

اگر آپ متفق ہوں تو میں چاہتا ہوں کہ "بنگال سے کوریا تک" کے چیدہ چیدہ حصے سویڈش اور اسکینڈے نیویا کی دوسری زبان میں Translate ہوں۔ اگرچہ میں زبان اور شاعری دونوں سے دور ہوں لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ "بنگال سے کوریا تک" ایک پاور فل نظم ہے اور تھیم اور سمبلز کے اعتبار سے ہنوز اتنی ہی Green ہے جتنی کہ اپنے تخلیق کے Period میں تھی۔ میرا تعلق یہاں کے Peace Movement سے تھوڑا سا ہے۔ اگر اس نظم کا اس طرح کا Tablo تیار کیا جائے جیسا کہ ہم نے ۲۰ سال پہلے کیا تھا (۱۹۵۹ء میں یہ نظم سندھ یونیورسٹی میں اسٹیج کی گئی تھی) تو یہ اسکینڈے نیویا کے لئے بہت Appeling ہوگی۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا ممکن ہے تو اسے ایک بار پھر سے ٹیبلو کے رنگ میں Record کرائیں۔ اس کا سویڈش' ڈینش اور نارویجین ترجمہ یہاں کرالیا جائے گا۔ اس کے بعد اس ٹیبلو کا ریکارڈ یہاں بھیج دیں تاکہ ہم یہاں کے فنکاروں کے ذریعہ اس کی تیاری کرالیں۔ اسکے بعد آپ کو ٹکٹ بھیج دیں گے تاکہ آپ کے ساتھ یہاں ایک اچھی سی شام منائی جاسکے۔ ٹیبلو کا اسکرپٹ وغیرہ مع ڈائریکشن پوائنٹس کے مجھے بھجوا دیں تاکہ میں ترجمہ وغیرہ کرسکوں۔ کچھ چیدہ نظمیں' غزلیں وغیرہ بھی بھیج دیں جو آپ کی شاعری کی نمائندہ ہوں۔ نیز اپنا Bio-Data اور ایک اچھی سی تصویر بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ دو ہفتے پہلے آجایئے تاکہ ڈائریکشن وغیرہ آپ کی ہدایات کے مطابق کی جاسکے۔ یہاں ہمارا ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے اور آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ بہرحال یہ بعد کی باتیں ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس زمانے میں ٹیبلو میں ہم نے ایک غزل بھی شامل کی تھی "اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو" بڑی Appealing تھی ۔ شفیق اور مسعود جعفری نے گائی تھی۔ نظم کو آپ تحت اللفظ ادا کریں۔ اسی ڈرامائی تاثر کے ساتھ۔ گیت یا غزل جو اس میں شامل ہوں ان کے لئے البتہ کسی فنکار کی مدد لینا پڑے گی۔ ریکارڈنگ بھی میرا خیال ہے اقبال جعفری کرسکتے ہیں۔ وہی پرانے لوگ ہوں تو اچھا ہے

بہرحال یہ سب ایک چھوٹا سا پلان ہے جس کے محرک آپ ہیں اور آپ کی وہ ونڈر فل شاعری جس نے ہمیں مسحور کر رکھا تھا اور اب بھی ہم اسی کے سحر میں گرفتار ہیں۔ اگر آپ متفق ہوں تو ضرور لکھیں۔ ہوسکتا ہے ہم اسٹاک ہوم کے علاوہ ڈنمارک' ناروے اور یورپ کے ایک آدھ اور شہر میں آپ کے ساتھ ایک شام منانے میں کامیاب ہوجائیں۔ امید ہے جواب جلد دیں گے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ دسمبر تک اس پروگرام کو Finalise کرلیا جائے

اپنی بیگم کی خدمت میں ہمارا آدب اور سارے بچوں' بچیوں اور ان کی اولادوں کو دعا پیار' سارے دوستوں کو سلام

نایاب حسین

(نوٹ :۔ نایاب حسین صاحب نے "بنگال سے کوریا تک" کا سوئڈش زبان میں ترجمہ بھی کروادیا تھا مگر اسی دوران ان کا انتقال ہوگیا۔ سنا ہے کہ وہ ترجمہ سویڈن میں ان کے مسودات میں محفوظ ہیں (مرتب)

ممتاز احمد خان
لاہور
۸ مارچ ۸۸ء

ایڈیٹر "پرواز" ۔ "ہمدرد"
(حیدر آباد، دکن)

عزیزی حمایت، سلام خلوص، میرے خط کے جواب میں، چند روز پہلے تمہارا بہت ہی پرخلوص اور تفصیلی محبت نامہ ملا تھا۔ ساتھ ہی دو رسالے "سب رس" اور "نکار انٹرنیشنل" بھی۔ ان سب کو دیکھ کر اور پڑھ کر دل واقعی باغ باغ ہوگیا۔ تم نے اپنے خط میں ہم لوگوں کی ماضی کی دو کاوشوں "ہمدرد" اور "پرواز" کے بارے میں مستقبل کے امکانات کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے میں حرف بہ حرف متفق ہوں۔ یہ سوچ تمہارے بے پایاں خلوص اور گہرے تاریخی شعور کا نتیجہ ہے۔ سائنس اور علم کی وسعت کے ساتھ ساتھ تحقیق اور ریسرچ کے میدان بھی وسیع ہوتے جارہے ہو اور جیسا کہ تم نے لکھا ہے، ہوسکتا ہے آئندہ سو پچاس برسوں بعد، کسی مورخ تا تحقیق کے لئے یہی چند اوراق بڑی اہمیت کے حامل ہوں اور ان کے آئینے میں وہ ایک خاص عہد کی ساری حقیقتوں اور صداقتوں کا مشاہدہ کرسکے۔ بہرحال اطمینان رکھو، "پرواز" کے تمام شمارے ایک طرح تمہاری امانت کے طور پر، میرے پاس ہر طرح سے محفوظ ہیں۔ اس کی حفاظت اب پہلے سے زیادہ کی جائے گی اور کسی وقت یہ سب، تمہاری نذر ہوں گے۔ جہاں تک "ہمدرد" کا تعلق ہے افسوس کہ اس کا کوئی شمارہ میرے پاس محفوظ نہیں۔ تمہیں یاد ہوگا "ہمدرد" کی اشاعت کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کے فنانسر سے ہمارا جھگڑا ہوگیا تھا جس کے بعد ہم لوگ اس سے بے تعلق ہوگئے تھے۔ اس کے نتیجے میں چند ہی روز بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔ افسوس کہ اس کی کاپیاں ہم لوگ سنبھال نہ سکے اور مجھے یقین ہے کہ قابل فنانسر نے سارے اخبارات بطور ردی فروخت کردیئے ہوں گے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔

ہاں۔ اس سلسلے میں مجھے یاد ہو کہ ہمدرد میں تم "ابلیس فردوسی" کے نام سے مزاحیہ طنزیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ معلوم نہیں اب تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، کسی کالم میں تم نے غالباً" اس قسم کا کوئی جملہ لکھا تھا۔ "یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے ہمدم" ان دنوں اتفاق سے ایک معاصر "ہمدم" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ اس کالم پر "ہمدم" کے مدیر بے حد چراغ پا ہوگئے۔ یہ سمجھ کر کہ ان پر چوٹ کی گئی ہے۔ اچھا خاصا طوفان بدتمیزی کھڑا کردیا۔ "نظام گزٹ" کے دفتر میں گرما گرم بحث رہی۔ انہیں سمجھایا بجھایا، لیکن کوئی وضاحت بھی قبول نہ ہوئی اور موصوف، جو "ہمدرد" کی مقبولیت سے پہلے ہی نالاں تھے، ایک عرصہ تک اپنے اخبار "ہمدم" میں ہم لوگوں کے خلاف واہی تباہی لکھتے رہے۔ یقین ہے ہم لوگوں کے نکلنے اور اس اخبار کے بند ہونے سے انہیں سکون قلب حاصل ہوا ہوگا۔ ہمارے بھی تھے مہربان کیسے کیسے، مجھے یاد ہے اخبار "ہمدرد" میں تمہارے مجموعہ کلام کا اشتہار بڑے خوبصورت انداز میں شائع ہوتا رہا۔ مجموعہ کا نام "دکن کرج" تھا۔ غالباً تمہاری کچھ نظمیں بھی اس میں شائع ہوئی تھیں اور شاعر عزیز قیصی کی بھی جو ان دنوں ہمارے ساتھ تھے، کاش یہ پرچے بھی کسی طرح محفوظ ہوتے۔

"پرواز" اور اس کے عہد کے تعلق سے کچھ لکھنے کا تمہارا عزم لائق مبارکباد ہے۔ یہ اخبار ایک خاص عہد کی صداقتوں کا آئینہ دار ہونے کے علاوہ، اظہار کی بے باکی، ترتیب کے نئے انداز، حساس اور نازک مسائل کی صحیح عکس کشی، موضوعات کے تنوع اور ایسی ہی بہت سی منفرد خصوصیات کا حامل تھا۔ کاروباری اعتبار سے اتنے قلیل سرمایہ اور اس قدر کم افرادی قوت کے ساتھ اس کی اشاعت پذیری یقیناً ایک بڑا واقعہ تھا جس کا آج کے دور اور موجودہ حالات میں تصور بھی بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ "پرواز" کا ذکر کرتے ہوئے، علمی و ادبی کاوشوں اور تخلیقی سرگرمیوں کے بارے میں تم نے اپنے جن نظریات کا

اظہار کیا ہے کہ دوسروں کے آئینوں میں اپنا چہرہ دیکھنے سے بہتر ہے کہ آدمی اپنے کام پر نظر رکھے اور خلوص دل سے کرتا رہے۔' ان کی اصابت اور سچائی سے انکار ممکن نہیں۔ غالباً یہی سب سے بہتر اور صحیح راہ عمل ہے۔

تم نے اپنے بچوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے' اسے پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ اچھے' نیک' ہونہار اور لائق بچے قدرت کا بہت بڑا انعام ہیں۔ مقام شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دولت لازوال سے مالا مال کیا ہے۔ خدا تمہیں نظر بد سے بچائے اور زندگی کی بہترین خوشیاں عطاء فرمائے۔ یقیناً اس بات کا سارا کریڈٹ تمہیں اور بھابی معراج کو جاتا ہے کہ ان پودوں کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ اعلیٰ تعلیم دلائی' اس قدر عملی تربیت کی اور ان کے لئے بہترین رہنمائی مہیا کی۔ ایمانداری سے دیکھا جائے تو سب تمہاری کاوش پیہم' جہد مسلسل اور انتھک محنت کا ثمر ہے۔ اس دیار غیر اور مکمل اجنبی ماحول میں مشقتوں اور ریاضتوں کا ایک طویل اور کٹھن سفر طے کرتے ہوئے تم نے نہ صرف اپنی شخصیت کی تعمیر' بلکہ عالی شان تعمیر کی اور اپنے لئے ایک ممتاز مقام حاصل کیا بلکہ اپنے بچوں کی شخصیت کی تعمیر میں اپنے خوابوں کی انتہائی بیش قیمت اور قابل رشک تعبیریں بھی حاصل کرلی ہیں اور یہ سب اتنی عظیم کامیابیاں ہیں جن پر جتنا بھی ناز اور فخر کیا جائے' کم ہے۔ یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ جاوداں' روشن خیال اور فروزاں نے ریسرچ کا کام شروع کیا ہے۔ خدا انہیں شاندار کامیابیوں سے ہمکنار فرمائے۔ ان بچوں نے جو موضوعات چنے ہیں وہ کافی اہم اور نئے ہیں۔ ان کی تخلیقات اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔ ریشمی رومال تحریک' ایک دلچسپ اور قدرے ادق موضوع ہے اور جانکاہی کا طلبگار' اگر مطلوبہ مواد فراہم ہوجائے تو ادب کو یقیناً ایک عمدہ تصنیف میسر آئے گی۔ "کار انٹرنیشنل" میں نے کافی دلچسپی سے پڑھا۔ عمدہ اور دیدہ زیب رسالہ ہے اور اردو میں اپنی نوعیت کا منفرد پرچہ اگر Marketing Side پر منظم محنت کی جائے تو Establish ہونے کے کافی امکانات ہیں۔ کراچی میں خاص کر اس شعبہ میں' میدان بڑا وسیع ہے۔ اگر اس کا Side Business مستحکم ہوجائے تو فروغ پذیر ہوسکتا ہے۔ جہاں تک Get Up' ترتیب و مضامین کا تعلق ہے۔ اس میں تنوع بھی ہے' دلکشی بھی۔ خدا اوج کمال کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ ورنہ جیسے کہ تم نے لکھا ہے' وہ انجینئر ہے اور آٹو موبائل کا میدان بڑا وسیع ہے۔ انشاء اللہ وہ ہر طرح کامیاب رہے گا۔

میں ممنوں ہوں کہ تم نے "سب رس" کی ایک کاپی خصوصی طور پر مجھے بھیجی۔ میں نے پورا رسالہ پڑھا۔ عمدہ اور معیاری ادبی رسالہ ہے۔ اور ادبی رسالوں کی اس نے قحط سالی میں "ابر رحمت"' اختر الزماں ناصر کی شخصیت اور فن پر تمہارا مقالہ پڑھا۔ تم نے بڑے خلوص اور مہارت سے ناصر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور اورنگ آباد کی علمی و ادبی زندگی میں انکے مقام اور اہمیت کو متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اشعار کا کم ذخیرہ دستیاب ہونے کے باوجود' ان کے متن پر اور اس کے نمایاں خدوخال پر تمہارا تبصرہ کافی مبسوط اور جامع ہے۔ زبان اور فن عَروض پر ناصر کو جو قدرت حاصل ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ روایتی شاعری کی ڈگر پر چلنے کے باوجود اختر کا اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ جو خوبصورت بھی۔ دلکش بھی اور جذبے و تفکر کا حسین امتزاج بھی۔ انہوں نے یقیناً بہت کم کہا لیکن جو کچھ بھی کہا وہ اپنی جگہ مکمل اور قابل توجہ ہے۔ بہرحال تم نے بہت ہی مبسوط اور مکمل مضمون سپرد قلم کرکے انہیں ایک بہترین اور بھرپور خراج تحسین پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ مضمون علمی و ادبی حلقوں میں پوری توجہ اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ دیکھیں اختر صاحب کا اپنا ردعمل اس پر کیا ہوتا ہے۔ تمہارے مقالے میں صفحہ (۱۹) پر جو پہلا شعر لکھا گیا' وہ شاید اصل شعر سے مختلف ہے جہاں تک مجھے یاد ہے' یہ اشعار کچھ اس قسم کے تھے۔ (باقی صفحہ نمبر ۳۰۵ پر)

بدلتے زاویے

(ایک غنائی تمثیل)

حمایت علی شاعر

(ایسی موسیقی جس سے وقت کے گزرنے کا احساس ہو)

آواز..... زندگی.... ایک سفر
وقت.......اک راہ گزر
آدمی..... جیسے کرۂ دہر کا رنگیں پیکر
اپنے آزر کا تراشا ہوا اک نقش.... مگر
خود نگر.... خود شکن و خود گر
جس کی تقدیر سفر اور سفر

(ساز چھڑ جاتے ہیں، مختلف آوازوں میں ایک نغمہ ابھرتا ہے)

کورس.......

جہاں کن کے رازداں ہیں کون.... ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون.... ہم
نقیب زندگی ہیں ہم
رفیق روشنی ہیں ہم
حریف تیرگی ہیں ہم
نوید صبح کی ہیں ہم
نئے جہاں کے پاسباں ہیں کون.... ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون.... ہم
جہاں کن کے رازداں ہیں کون.... ہم

(نغمے کی آواز پس منظر میں چلی جاتی ہے)

آواز.......

اور یہ پابند سفر
غم ہستی کا شکار
اپنے اطراف سے محو پیکار
منزل زیست کی جانب نگراں
افتاں خیزاں
آفرینش سے بہ این عزم جواں
وقت کی راہگذر پر ہے رواں

(نغمے کی آوازیں دوبارہ ابھر آتی ہیں)

کورس.......

جہاں کن کے رازداں ہیں کون.... ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون.... ہم
یہ مہر و ماہ و کہکشاں
ہماری گرد کارواں
ہمارا پرچم بلند
زمیں سے تا بہ آسماں
چہار سمت حکمراں ہیں کون .... ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون.... ہم
جہاں کن کے رازداں ہیں کون.... ہم

(نغمے کی آوازیں آہستہ آہستہ ڈوب جاتی ہیں اور کسی ایک ساز پر ایسا تاثر ابھرتا ہے جس سے تھکن اور مایوسی کا احساس ہو)

آواز.......

رہ نوردی میں مگر پاؤں بھی تھک جاتے ہیں
راستے گرد سر رہ سے بھی ڈھک جاتے ہیں
تیرہ و تار فضا ہو تو کبھی دل کا یقین بھی کھٹک جاتا ہے
راہ پر چلتا مسافر بھی کبھی راہ بھٹک جاتا ہے

(غمگیں سروں میں ایک گیت شروع ہوتا ہے)

گیت......

دنیا سے کیا پریت...... دوانے
دنیا سے کیا پریت
ہنستا بھی موت ہے یہاں پر، پوچھ کلی کے من سے
اجیارے کی چاہ میں شمعیں جل جاتی ہیں تن سے
جھوٹے پریت کے سب افسانے
جھوٹے پریم کے گیت
دنیا سے کیا پریت... دوانے
دنیا سے کیا پریت

چاند اور سورج ساتھی ہوکر ساتھ نہیں ہیں دونوں
ایک ہی دیس کے باسی ہوکر ساتھ نہیں دونوں
اپنے بھی ہیں یاں بیگانے
کوئی نہیں ہے میت
دنیا سے کیا پریت... دوانے
دنیا سے کیا پریت

(گیت کی آواز آہستہ آہستہ ڈوب جاتی ہے اور سازوں پر مدہم سروں میں دھیرے دھیرے ایسا تاثر ابھرتا ہے جس میں امید کا احساس نمایاں ہو)

آواز......

ایسے عالم میں کسی شمع کی مانوس جھلک
کسی بجلی کی چمک
دل میں جاگ اٹھتی ہے اک عزم کی مشعل لیکر
اور مسافر بہ صد آلام سفر
باندھ کر جسم پہ احرام دگر
وقت کی راہ پر چل پڑتا ہے
زیست کی سمت نکل پڑتا ہے

(یکایک سازوں کا امید افزاء تاثر کورس کی آوازوں میں بدل جاتا ہے)

کورس......

دو دو چار قدم بس اور کہ ساتھی منزل دور نہیں دو چار قدم
یہ راہ گزر ہستی ہے، پر خار سہی
ہم راہ نوردوں کے حق میں تلوار سہی
اس راہ کے ہر ہر گام پہ سوز آزار سہی
لہراؤ علم
دو چار قدم
دو چار قدم بس اور کہ ساتھی منزل دور نہیں دو چار قدم

چلنا ہے مقدر ہم سب کا، ہاں چلتے رہو
جلنے میں ہے جیون جوت نہاں بس جلتے رہو
سورج کی طرح ہر روز ابھرتے ڈھلتے رہو
سب ہو کے بہم
دو چار قدم
دو چار قدم بس اور کہ ساتھی منزل دور نہیں دو چار قدم

(کورس کی آوازیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں اور سازوں پر ایک اضطراری کیفیت جاری رہتی ہے)

پرانا آدمی

کیسی آوازیں مرے کانوں سے ٹکراتی ہیں
کیسا نغمہ یہ فضاؤں میں ابھر آیا ہے
یک بہ یک توڑ دیا کس نے خموشی کا طلسم
کون غم خانہ تاریک میں در آیا ہے
دل کی دھڑکن ہے کہ ہر لمحہ ہوئی جاتی ہے تیز
کوئی افسوں ہے کہ رگ رگ میں اتر آیا ہے
اک جہنم سا دہک اٹھا ہے سینے میں کہیں
سیل آتش ہے کہ دل تابہ جگر آیا ہے
خوں میں حل ہوگئے بجلی کے شرارے جیسے
دوڑتے جاتے ہیں طوفاں کے دھارے جیسے

(سازوں کی اضطراری کیفیت ختم ہوجاتی ہے اور کچھ لمحوں کے لئے سناٹا چھاجاتا ہے)

پرانا آدمی

کچھ نہیں، وہم فقط وہم کی شوریدہ سری
غالباً خواب پریشاں تھا کوئی، ٹوٹ گیا
ذہن میں شعلہ بکف تھا کوئی آوارہ خیال
جس کے ہاتھوں سے سر دامن دل چھوٹ گیا
دل کی بستی پہ کسی درد نے شب خون مارا
اور شاید وہی بیدرد اسے لوٹ گیا
کتنی ویران فضا ہے، کوئی نزدیک نہ دور
ایک گمبھیر اندھیرے میں ہے دنیا مستور

(جمائی لیتا ہے)

خیر، یوں بھی کبھی ہوتا ہے خیالو آؤ
نیند کی گود میں سر رکھ کے ذرا سو جاؤ

(سازوں کی خواب گوں کیفیت یکایک رجزیہ کورس میں بدل جاتی ہے)

کورس.....

بیدار رہو
اے دنیا کے رکھوالو
ہشیار رہو

تاروں کے اشارے کہتے ہیں
بجلی کے شرارے کہتے ہیں
ساحل کی موجیں چیختی ہیں
طوفان کے دھارے کہتے ہیں
آنکھوں میں جنہوں نے شب کاٹی
وہ چاند ستارے کہتے ہیں
صدیوں سے ہیں جو دل مہر بہ لب
وہ ظلم کے مارے کہتے ہیں

بیدار رہو
اے دنیا کے رکھوالو
ہشیار رہو

اس دنیا کے معمار ہو تم
ہستی کی علم بردار ہو تم
تخریب پرستوں کے حق میں
اک سونتی ہوئی تلوار ہو تم
باطل کے مقابل جو گونجے
سچائی کی وہ للکار ہو تم
ہیں کوہ بھی جن کے آگے نگوں
وہ سر بہ فلک دیوار ہو تم

بیدار رہو
اے دنیا کے رکھوالو
ہشیار رہو

(کورس کی آواز پس منظر میں چلی جاتی ہے)

پرانا آدمی..... (جھلاہٹ کے لہجے میں)

پھر وہی شور، وہی نالۂ شب جاگ اٹھا
پھر اسی نغمۂ جاں سوز کے شعلے لپکے
پھر وہی آگ بھڑک اٹھی جو شب بھر بھڑکی
ایک لمحہ بھی تو بیتا نہ تھا پلکیں جھپکے

(قدموں کی آواز)

نیا آدمی..... (مسکراتے ہوئے)

تم کو ان گیتوں پہ شعلوں کا گماں ہوتا ہے
تم کو یہ نغمۂ بے باک بہت کھلتا ہے
یہ ہے اس دور کا وہ زخم جگر سوز کہ جو
سینۂ وقت میں مدت سے یونہی پلتا ہے
آج وہ زخم جگر پھوٹ بہا ہے اے دوست
اک شرر، شعلۂ جوالہ ہوا ہے اے دوست

یہی شعلہ ہے چراغ تہہ دامان حیات
سی شعلے سے منور ہیں تمہارے دن رات

پرانا آدمی (نظرانداز کرتے ہوئے) ہونہہ

وقت تو ایک بگولا ہے کہ اڑتا ہی چلا جاتا ہے
زندگانی میں کوئی لمحہ شاداب نہیں
روح حیران ہے' آنکھوں کے جزیرے ویراں
دل کے صحرا میں کہیں چشمہ مہتاب نہیں
دور تک ایک سلگتا ہوا سناٹا ہے
کٹ گئی شب مگر آنکھوں میں کوئی خواب نہیں
اور اب صبح بھی آئی ہے تو کیا آئی ہے
ساغر گل میں بھی شبنم کی مئے ناب نہیں
ایسے عالم میں بھلا کوئی جئے تو کیسے
جان کر جرعہ زہر اب پئے تو کیسے

نیا آدمی ..... (سمجھاتے ہوئے)

زندگی جرعہ زہر اب نہیں جان عزیز
بات کچھ اور ہے' جس کی نہیں تم کو تمیز
سالہا سال سے انسان ہے جس غم کا اسیر
اس کو انساں ہی نے پالا ہے بنام تقدیر
آدمی جس بت سفاک کا ہے سجدہ گزار
اس کا خالق بھی ہے انساں ہی کا ذہن بیدار
خیر و شر.... خاک کے پیکر کی ہیں اقدار نہاں
اہرمن بھی ہے وہی اور وہی ہے یزداں
یہ دوئی... ایک اکائی کی ہیں تصویر کے رخ
کہیں تخریب کے رخ ہیں کہیں تعمیر کے رخ
آدمی ہی نے سدا اپنے لئے دام بنے
اسی چمن زار سے کچھ پھول تو کچھ خار چنے
خار و گل ایک ہی موسم کی ہے سوغات مگر
ان کو بانٹا گیا دنیا میں بہ عنوان دگر
یہ ہے اک راز کہ جو پردہ افلاک میں ہے
جس کی پرکاری فن' فطرت چالاک میں ہے
یہ صدی کھول رہی ہے انہیں اسرار کا بھید
دست اوہام کے ڈھالے ہوئے افکار کا بھید
جب بھی اس جال سے انسان نکل آئے گا
اپنی دنیا کا یہ ماحول بدل جائے گا

پرانا آدمی... (بات کاٹتے ہوئے)

محض دھوکا ہے' یہ دنیا نہیں بدلے گی کبھی
اس شب تار کی قسمت میں کوئی صبح نہیں
صبح آئے بھی تو ہوگی وہ کسی شب کا فریب
گردش وقت سے بھی زیست بدلتی ہے کہیں
مجھ کو معلوم ہے' دنیا کی حقیقت کیا ہے
محض اعجاز نظر ہے یہ مہہ و مہر و زمیں
ہم سب آئینہ در آئینہ ہیں اک عکس خیال
زندگی اسکے سوا کچھ بھی نہیں،کچھ بھی نہیں

نیا آدمی.........

کتنے ناداں ہو۔ مگر جو ہے' وہ ہے تو اے دوست
"ہے" کو ہم کیسے "نہیں" کہہ کے گزر سکتے ہیں
عکس و آئینہ کے جس ربط کا حاصل ہے حیات
اس تعلق کو زمیں کہہ کے گزر سکتے ہیں

جس عقیدے سے عبارت رہا انساں کا وجود
اس عقیدے کا جگر چاک بھی کرنا ہوگا
آگہی نے جو چراغاں سا کئے رکھا ہے
اس سے "امکان" کا ادراک بھی کرنا ہوگا

وہی امکان جو ہر عہد کے باطن کا ہے عکس
"غیر ممکن" میں ہمیشہ سے جو ممکن کا ہے عکس
اسی "ممکن" سے عبارت ہے سفر کی تاریخ
فکر' احساس' خبر اور نظر کی تاریخ

اسی تاریخ میں پوشیدہ ہے انساں کا خمیر

صرف انساں سے ہے ارض و سماء کی توقیر
یہ زمیں روزِ اول کیا تھی بجز تودہ خاک
کس نے اس خاک کے تودے کی جگائی تقدیر

ذرہ خاک میں انساں نے کی وسعت کی تلاش
ورنہ آفاق تھے خود اپنی نگاہوں میں حقیر
یہ مہ و مہر' یہ افلاک' یہ دنیا وہ جہاں
انکے اسرار کی دریافت ہے کس کی تسخیر
کس کے افکار و عمل کی ہے یہ دنیا غماز
کس کے خوابوں سے ہوئی دونوں جہاں کی تعمیر
لوحِ محفوظ سے کاغذ کے ان اوراق تلک
ذہن سے تا بہ قلم کس کا ہے نقشِ تحریر
کس نے خاموش تصاویر کو حرکت بخشی
گنگ ہونٹوں کو دیا کس نے یہ اذنِ تقریر
کس نے رفتار کو یہ برق روی سکھلائی
کس کے زیرِ کفِ پا' وقت ہوا ہے زنجیر
آج کتنے ہی تصور ہیں حقیقت بہ کنار
آج کتنے ہی تخیل ہیں یقیں کی تصویر
کتنے اوہام کا مامن تھا' جہانِ گزراں
کتنے افسوں کے حصاروں میں تھا ہر عہد اسیر
کس نے پتھر سے تراشا ہے وہ آئینہ فکر
جس میں ہر خواب نے دیکھی ہے خود اپنی تعبیر
کائنات ایک پراسرار حقیقت ہے ضرور
اس پراسرار حقیقت کا ہے انسان ہی سفیر

تم بھی انسان ہو' دیکھو کہ یہ دنیا کیا ہے
زندگی کیا ہے' خدائی کا تماشہ کیا ہے

(نیا آدمی' پرانے آدمی کو کائنات کی سیر کراتا ہے' صوتی اثرات سے یہ مناظر نمایاں ہوں اور انھیں کے امتزاج سے آرکسٹرا ہم آہنگ ہوکر یہ نغمہ چھیڑ دے جو مختلف اکاروں سے مزین ہو)

نغمہ

ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
زمیں سے تا بہ آسماں حیات ہی حیات ہے
گلوں میں گلستاں نہاں
زمیں میں آسماں نہاں
جہاں میں دو جہاں نہاں
ا میں بھی حیات ہے' ثبات ہی ثبات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
یہ صبح اور شام کیا
خرام اور قیام کیا
یہ فکر گام گام کیا
یہ وسعتیں یہ فاصلے' بس اک قدم کی بات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
چراغ زندگی ہیں ہم
ایاغ سرخوشی ہیں ہم
سراغ روشنی ہیں ہم
ہمارے دم قدم سے اس جہان کو ثبات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
چلو بہ عزم مستقل
قدم قدم ہو متصل
کہ مہر و ماہ ہوں خجل
چلو کہ اپنے زیرِ پا' تمام شش جہات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے

(نغمہ اپنی اکاروں کے ساتھ پس منظر میں چلا جاتا ہے اور سازوں پر ایک ایسا غنائی تاثر نمایاں ہونے لگتا ہے جس کے سر ابتدائی کورس سے ہم آہنگ ہوتے ہیں)

پرانا آدمی.....

آدمی اتنا ہمہ گیر ہے' معلوم نہ تھا
اپنے ہی خواب کی تعبیر ہے' معلوم نہ تھا

اور مری فکر کے بے جان ہیولوں میں فقط
میرا خاکہ، میری تصویر ہے، معلوم نہ تھا
میں جسے نقطۂ موہوم سمجھ بیٹھا تھا
وہ مرا نقطۂ تعمیر ہے، معلوم نہ تھا
میری پیشانی پہ لکھا ہے جو اک حرف غلط
خود مرے ہاتھ کی تحریر ہے، معلوم نہ تھا
اپنی دانست میں جس دام سے آزاد تھا میں
وہی اس پاؤں کی زنجیر ہے، معلوم نہ تھا
میری نظروں سے نہاں تھی جو حقیقت اب تک
اس حقیقت کی یہ تنویر ہے، معلوم نہ تھا
موت بھی زیست کا اک روپ ہے، یہ نکتۂ راز
ذہن فطرت ہی کی تدبیر ہے، معلوم نہ تھا
میرے ہر ایک عمل، رد عمل میں پنہاں
میرے ادراک کی تطہیر ہے، معلوم نہ تھا
دست فطرت میں مری ذات کھلونا ہی سہی
میرے بس میں مری تقدیر ہے، معلوم نہ تھا

زندگی مجھ کو بھی آواز دے.... میں آتا ہوں
مجھ کو بھی اذنِ تگ و تاز دے... میں آتا ہوں

(ابتدائی کورس ابھر آتا ہے)

کورس.....

جہانِ کن کے رازداں ہیں کون.... ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون.... ہم
نقیب زندگی ہیں ہم
رفیق روشنی ہیں ہم
حریف تیرگی ہیں ہم
نوید، صبح کی ہیں ہم
نئے جہاں کے پاسباں ہیں کون .... ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون .... ہم
جہانِ کن کے رازداں ہیں کون .... ہم

(پس منظر میں کورس کا آرکسٹرا بجتا رہتا ہے)

آواز.....

زندگی........ ایک سفر
وقت .... اک راہ گزر
آدمی....... بت کدہ، دہر کا رنگیں پیکر
اپنے آزر کا تراشا ہوا اک نقش.... مگر
خود نگر..... خود شکن و خود گر
جس کی تقدیر سفر اور سفر

(کورس کی آواز ابھر کر کچھ لمحے نمایاں رہتی ہے پھر دھیرے دھیرے دور ہوجاتی ہے ..... گویا سفر جاری ہے)

(بقیہ "شاعر- نیا شاعر" مسلم ضیائی)

سب نظمیں سنی بھی ہیں اور پڑھی بھی ہیں اور ان میں وہ مچلتی ہوئی زندگی پائی ہے 'شاندار مستقبل۔ زریں مستقبل' وہ اجالوں کا نقیب ہے اندھیرے کا پیغام بر نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی اس کے فن میں پوری پختگی نہیں اور کہیں کہیں سپاٹ پن ہے لیکن جہاں آورد نہیں وہ ایک پختہ مشق فنکار نظر آتا ہے' اس کے سامنے ایک مقصد ہے اور ایک منزل۔ ترقی پسندوں کا مقصد اور ترقی پسندوں کی منزل' انسان دوستوں کا مقصد' انسان دوستوں کی منزل' اسے یقین ہے کہ ہمارے مقصد میں ہمیں کامیابی ہوگی۔ ہم اپنی منزل پر پہنچ کر رہیں گے اور قدرت کو ہماری پیش کی ہوئی شرطیں قبول کرنی ہوں گی۔

(مطبوعہ ماہنامہ "ایوان" حیدر آباد نمبر ۱۹۵۱ء حیدر آباد دکن)

شخص و شاعر

شاعر .... نیا شاعر

مسلم ضیائی

دوسری جنگ عظیم شباب پر تھی۔ ہٹلری درندے انسان کو فنا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ زمین و آسماں چیخ رہے تھے۔ انسان پریشان تھا کہ مستقبل کے پاس دنیا کو دینے کے لئے کیا ہے؟ آزادی اور امن یا غلامی اور موت۔ ایسے زمانے میں اورنگ آباد کی بزم اقبال نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے بمبئی اور حیدر آباد کے احباب کو "یوم اقبال" میں شرکت ہونے کی دعوت دی۔

اقبال نے اردو ادب میں زندگی کی ایک نئی طرح ڈالی اور نئے راستے دکھائے۔ بغاوت نام ہے قید و بند، ظلم و جبر اور ہر قسم کی گھٹن کے خلاف جہاد کرنے کا۔ اقبال نے انگریزی سامراجی بندشوں سے بے چین ہو کر بغاوت کا نعرہ بلند کیا۔ اور "فریاد افرنگ و دل آویزی افرنگ" کہہ کر اپنے پڑھنے والوں میں سامراج کے خلاف شعور بیدار کیا۔ وہ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب سے متاثر تھے۔ اسی لئے "خضر راہ" میں غالب کے "کوہ کن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب" کی قوت اور مستقبل کا نقشہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اب مشرق و مغرب میں اس کے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ مگر اقبال نہ موسیٰ تھے نہ مارکس۔ ان کا نعرہ مزدور کا نعرہ نہ تھا۔ ایک بیرسٹر کا نعرہ تھا۔ اس لئے وہ طلسم سامری نہ تھے۔ اور تصور کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گئے۔ جس "دین گوسفنداں" کی مخالفت کی تھی اسی دین گوسفنداں کے ایک عرصہ تک شکار رہے اور پھر بیس سال بعد

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو

کہنے پر مجبور ہوئے مگر اس مرتبہ بھی مانجھی کے ساتھ پتوار ہاتھ میں لئے ہوئے کشمکش کرتے نظر نہیں آتے ہیں بلکہ ساحل پر کھڑے ہوئے خیر و شر کا نظارہ کرتے اور طوفاں سے لڑنے والے مانجھی کو مشورہ دیتے ہیں لیکن وقت کے تقاضے کسی کا انتظار نہیں کرتے وہ پورے ہو کر ہی رہتے ہیں۔ پہاڑی چشمے اپنے ساتھ خس و خاشاک بہائے لے جاتے ہیں اور پہاڑ اگر بہت اونچا ہو تو رخ بدل کر کترا کر منزل مقصود تک پہنچتے ہیں۔ ایشیاء کی مغلوب، محکوم دبی ہوئی کچلی قومیں پیدا ہو رہی تھیں، اس لئے کشمکش بڑھ گئی۔ شعور جاگتا گیا، انسانیت آگے قدم بڑھاتی رہی، بڑھتی رہی اور بڑھتی ہوئی روشنی نے بھاگنے والوں کو آگے بڑھنے کی تعلیم دی۔ کشمکش میں نوجوان اور گرم خون بہا۔ لیکن بہتے بہتے ایک راستہ بھی بنا گیا ایک ایسا راستہ جو ہمیشہ منزل ہی کی طرف لے جاتا ہے۔

بمبئی اور حیدر آباد سے اقبال کے ہم زبان قافلے اورنگ آباد روانہ ہوئے۔ میں بمبئی کے قافلے کے ساتھ تھا۔ صبح ہوتے ہی ہم لوگ اورنگ آباد پہنچے فضا پر، اجنبیت چھائی ہوئی تھی اور ہلکی سرمئی دھند میں سے پھوٹتی ہوئی معصوم سی سرخی جیسی سکنش مرحوم کے چہرے پر تھی یا مخدوم اور جلیس کے چہروں پر نظر آتی ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر پہنچتے پہنچتے سرخی اور بڑھ گئی اور سلانے والی لوریوں کے بجائے ہلکے مدھم سروں میں نئے دن اور اس کے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے زمزمے ہمارا استقبال کرنے لگے۔

آنجہانی ریاست حیدر آباد کے مقابلے میں اورنگ آباد آب و ہوا کے اعتبار سے بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور مردم خیزی کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ ولی اور سراج کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ اورنگ آباد ایک پرانا شہر ہے لیکن نظام کائنات حرکت پسند ہے' تغیر پسند ہے۔ ترقی پسند ہے اور ہر لحہ کن فیکونی عمل جاری ہے اورنگ آباد بھی اس نظام کائنات کے تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے کھنڈروں کے پہلو بہ پہلو نئی عمارتیں نظر آئیں۔ پرانی سڑکوں کی پسلیوں سے نئی سڑکیں پھوٹتی دکھائی دیں۔ قبرستان بھی نظر آئے اور کتب خانے بھی' پرانے محل بھی دکھائی دیئے اور ٹاؤن ہال بھی۔ فرد اور جماعت' جامعات اور فرد۔ ہر طرف انفرادیت اور اجتماعیت میں کشمکش تھی۔ عمل اور رد عمل' ترقی و جمود ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ پرانی اور نئی عمارتیں' پرانے اور نئے شاعر' پرانا ادب اور نیا ادب' جوڑ توڑ' تخریب و تعمیر' شکستہ دیواروں پر پلاستر چڑھا کر مضبوط ظاہر کرنے کی کوششیں' چھتوں کو "اڑانا" لگا کر روکنے کی کوششیں' تنگ و تاریک بوسیدہ حویلیوں میں ایک ادھر ایک ادھر کھڑکی کھول کر انہیں نئے زمانے کے مطابق ظاہر کرکے دوسروں کو اور خود اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش ہر طرف نظر آئیں۔ غزلوں کو سامع نواز اور خواب آور طرزوں میں گا کر واہ واہ کے نغمے حاصل کرنے کی کوششیں بھی تھیں۔ لیکن نوجوان ایک بڑے سیلاب کے مانند ہوتے ہیں وہ اس قسم کے فریبوں کے جال میں نہیں پھنستے۔ وہ آگے بڑھتے ہیں اور بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ وہ کھنڈروں کو زمین کے برابر کرکے ان کی جگہ نئی عمارتیں بناتے ہیں' تاریک' پست اور بند مکان کی جگہ روشن' بلند اور کشادہ بنگلے بناتے ہیں۔ اور خس کے بجائے نرم و نازک بیلوں اور پھولوں سے اس کے در و دیوار آراستہ کرتے ہیں۔ وہ مزدور ہوتے ہیں' کسان ہوتے ہیں' خالق ہوتے ہیں' وہ نہ دفتروں میں کرسیوں پر بیٹھنے والے عہدہ دار ہوتے ہیں اور نہ گدیوں پر بیٹھے ہوئے روپیہ سے روپیہ بنانے والے سیٹھ۔ ان کے خون میں جمود نہیں ہوتا' افسردگی نہیں ہوتی' جوش ہوتا ہے گرمی ہوتی ہے۔ وہ پرویز نہیں کوہ کن ہوتے ہیں۔

اورنگ آباد کے سرگرم جواں سال اور جواں ہمت نوجوانوں نے محبتوں نے ہمیں بلایا تھا راستوں پر پڑے ہوئے کنکر اٹھا کر پھینک دیئے اور چٹانوں کو ہموار کردیا میں نے ان شہری نوجوانوں کے فونٹین پین سے لکھنے والے ہاتھوں کو دیکھا اور ایک شاندار پنڈال کو بھی۔ پنڈال بن چکا تھا شامیانہ تان دیا گیا تھا۔ میں نے ان شہری ہاتھوں کو دیکھا جنھوں نے مزدوروں اور کسانوں کی طرح کام کیا تھا اور جن کی ہتھیلیوں سے خون' لال لال نوجوان خون' گرم گرم اچھلتا ہوا' ابلتا ہوا' گاتا ہوا' خون چمک رہا تھا۔ کئی ہاتھوں میں آبلے تھے ان نوجوانوں نے اورنگ آباد کی سنگلاخ زمین کھود کر چٹانیں توڑ کر شامیانے کے لئے میخیں گاڑیں اور رسیاں تان کر شامیانہ کھڑا کردیا تھا۔ یہ ان نوجوانوں کا اجنتا تھا۔ یہ ان کی تعمیر تھی۔ یہ ان کی تخلیق تھی۔ یہ ان کے جوش عمل' ترقی پسندی اور زندگی کا ثبوت تھا۔

ان ہی نوجوانوں میں ایک لڑکا تھا حمایت علی اور شاعر تخلص اس کے باپ نے اس کا نام حمایت علی رکھا تھا۔ شاید "اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ" کے بیٹے کے نام پر لیکن ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے نام کے ساتھ شاعر کا اضافہ کرلیا۔ اپنے آپ کو نظام کے بیٹے سے ممتاز کرنے کے لئے۔ یہ خاموش خاموش گھبرایا سا "لڑکا" باہر سے آئے ہوئے ادیبوں کو ایک اعلیٰ اور ارفع مخلوق سمجھ رہا تھا۔ مرعوب سا۔ بڑی سعادت مندی سے دوڑ دوڑ کر کام کرنے والا۔ مہمانوں کے احکام کا ہر وقت خندہ پیشانی سے منتظر۔ جلسے ہوئے' تقریریں ہوئیں' غزلیں پڑھی گئیں اور نظمیں بھی بزم اقبال کا جلسہ کامیاب ہوا۔ نوجوان کامیاب ہوئے۔ دلوں کی کھڑکیاں اور دروازے ان کے لئے بلا تکلف کھول دیئے گئے۔ اس

جلسہ میں حمایت نے ایک نظم سنائی جس کا ایک شعر تھا۔

سامراجی بربریت کے تلے کچلے ہوئے
ہند کے مردہ دلوں کو پھر سے گرمائیں گے ہم

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے حمایت کو ادیبوں کے خادم کی بجائے ادیبوں کے بھائی کی حیثیت سے دیکھا۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے اپنی قیام گاہ پر بھی اس سے کئی نظمیں سنیں۔ جنہیں اس نے گھبرا گھبرا کر سنایا۔ اس کے فن میں پختگی نہ تھی لیکن اسکا شعور بیدار ہو چکا تھا۔ اس کے خیالات اپنے اکثر ہم عصروں کے مقابلے میں پختگی حاصل کر چکے تھے۔ اس نے نیا راستہ دیکھ لیا تھا۔ انسانیت کا راستہ، محبت کا راستہ وہ اس راستے پر چل چکا تھا مگر اسے اپنے فن پر اعتماد نہ تھا۔ وہ چور نگاہوں سے بار بار باہر سے آئے ہوئے دیوتاؤں کی طرف دیکھ لیتا تھا اور وہ اپنی تیز روشن بے چین اور معصوم نگاہوں سے مہمانوں کے دلوں کو ان کی آنکھوں میں پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ ان کے تاثرات جاننا چاہتا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ دیوتاؤں کے قریب ہوتا گیا اور سمجھنے لگا کہ دیوتا بھی میری طرح گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں اور میں خود بھی دیوتا ہوں۔ ان کی طرح بڑا نہ سہی چھوٹا ہی سہی۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں اور کوئی وجہ نہیں کہ ایک روز ان سے بھی آگے نہ بڑھ جاؤں، اور کوئی وجہ نہیں کہ ایک روز میں ان دیوتاؤں کی طرح نہ بلایا جاؤں اور بلانے والے اسی طرح میری بھی پوجا نہ کریں جس طرح آج کا شاعر آنے والوں کی پوجا میں مصروف ہے۔

یہ تھی میری پہلی ملاقات حمایت سے۔

میں اس مرتبہ اجنتا نہ دیکھ سکا لیکن میں نے نئے شاعر کو دیکھا۔ ایک ابھرتے ہوئے فنکار کو دیکھا۔ اجنتا کئی صدیوں اور کئی کلاکاروں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ سنگ تراشی اور مصوری بھی شاعری کے مظاہر ہیں۔ ان کا تعلق بھی انسانی جذبات اور احساسات سے ہے۔ مصور اور سنگ تراش جذبات اور احساسات کو صفحہ قرطاس یا سینہ سنگ پر رنگوں یا تیشہ کے ذریعہ مرتسم کرتے ہیں۔ شاعری کے مانند ترقی پسند مصوری اور سنگ تراشی بھی ہے۔ ان میں بھی ایک آہنگ، ایک حرکت، ایک اضطراب، ایک طاقت، ایک پاکیزگی، ایک جھنکار، ایک تناسب، ایک روانی، ایک نغمگی، ایک سرور انگیز ہیجان اور ایک پہاڑی چشمے کی سی رواں دواں بے کراں زندگی ہوتی ہے۔ لیکن اجنتا زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے والوں کا نہیں۔ زندگی کو تیاگنے والوں، زندگی سے بھاگنے والوں کا نقشہ ہے اس میں کشمکش نہیں، اس میں اضطراب نہیں اس میں سوز نہیں، اس میں زندگی کی جھنکار نہیں۔ اس کے آرٹسٹ اس سماج کی زندگی پیش کرتے ہیں جس کا فیصلہ ہے کہ یہ زندگی مایا ہے بجھے ہوئے چراغ کا دھواں ہے تپتی ریت میں پانی کی بوند ہے۔ سراب ہے، بلبلہ ہے، اسے چھوڑ دو، انسانوں سے دور رہو، جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لو، اس میں شانتی ہے اسی میں مکتی ہے۔ اسی میں اطمینان ہے اور اسی میں زندگی ہے۔ یہ زندگی تیاگنے کے لئے ہے، زندگی کو تیاگ دو، زندہ جاوید بن جاؤ گے۔

اجنتا کو دیکھ کر میری نظروں میں ایک ایسی الھڑ نوجوان لڑکی آجاتی ہے جس کی کلائیوں میں چوڑیاں ہوں لیکن بھینچی ہوئی ہوں اتنی بھینچی ہوئی کہ بج نہ سکیں چوڑیاں بجنے کے لئے ہیں، ٹکرانے کے لئے ہیں، کھنکھنانے کے لئے ہیں، ٹکرانا، کھنکھنانا خون کی گرمی کی دلیل ہے۔ بے تابی کی دلیل ہے۔ جوانی کی دلیل ہے۔ زندگی کی دلیل ہے، لیکن اجنتا میں وہ گرمی نہیں۔ وہ بے تابی

نہیں جوانی نہیں، وہ زندگی نہیں اس میں ٹھہراؤ ہے، سکون ہے، جمود ہے، خاموشی ہے، قرار ہے، افسردگی ہے، بڑھاپے کی سنجیدگی ہے اور موت کا سا سکوت ہے۔ اجنتا حسین ہے اور اسے حسن کار ہاتھوں نے بنایا ہے لیکن اس کے فنکار فرار پسند تھے۔ یہ فرار پسندوں کی تخلیق ہے۔ لیکن نیا آرٹسٹ زندگی کی کشمکش میں حصہ لیتا ہے۔ وہ زندگی سے بھاگتا نہیں، موجوں سے کشمکش کرتا ہے۔ آندھیوں سے مقابلہ کرتا ہے۔ بندوق ہاتھ میں لیکر وطن اور انسانیت کی حفاظت کرتا ہے ریگستان کو گلستان بناتا ہے۔ پہاڑوں کو توڑتا اور جواہرات نکالتا ہے فرد کے لئے نہیں، جماعت کے لئے۔ وہ انسان کو کائنات کا مالک سمجھتا ہے اور زمین کی چیزوں کو چھوڑنے کے بجائے ان پر قبضہ کرنا چاہتا ہے وہ فطرت کی قوتوں سے ڈرنے کے بجائے ان پر غلبہ حاصل کرنا اور انہیں نوع انسانی کے کام میں لانا چاہتا ہے وہ انفرادیت کو پیچھے دھکیل کر اجتماعیت کو سربلند کرنا چاہتا ہے۔

شاعر نے آنکھ کھولی تو اورنگ آباد بہمنیوں اور مغلوں کا نہیں تھا مشرق و مغرب میں مزدور کے دور کا آغاز ہوچکا تھا اس کی دنیا میں مارکس اور لینن پیدا ہوچکے تھے۔

پھر گھر کی مالی حالت نے اسے کم عمری میں مجبور کردیا کہ وہ لعل اپنی قیمت کو پہنچنے کے لئے اپنا بدخشاں چھوڑ کر حیدر آباد آگیا اور زندہ رہنے کے لئے کشمکش کرنے لگا اور عالی شان محلوں اور بڑے بڑے بنگلوں کے باوجود اسے ایسی ہی جگہوں پر راتیں گزارنی پڑیں جیسی جگہوں پر گورکی اور اس جیسے عظیم فنکاروں کو ذلیل بورژوا نظام کے باعث راتیں گزارنی پڑی ہیں اور جہاں پولیس والے اگر اسے دیکھ پاتے تو فوراً کافی مرمت کے بعد سرکاری مہمان بنادیتے۔ اور اگر وہ کسی وقت غلط کروٹ لیتا تو پچیس تیس فٹ نیچے موسیٰ ندی کی نکیلی چٹانوں کا شکار ہوتا۔ لیکن شاعر غلط کروٹ لینے والوں میں سے نہیں۔ اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ مسکراتا رہا، گنگناتا رہا، اس نے اخبار میں کام کیا۔ ریڈیو میں نوکر ہوا، اور پھر کچھ عرصہ بعد عشق اور حسن مل گئے۔ شاعر کو اس کی "معراج" حاصل ہوگئی اور پھر معراج اور "شاعر جاوداں" بن گئے۔ زندگی ایک مثلث ہے، جو عشق و حسن اور نغمے سے بنتا ہے۔ شاعر معراج اور جاوداں سے بنتا ہے۔ یہ مثلث ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔ یہ ٹوٹتا ہے اور بنتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا، نغمہ کبھی حسن بن جاتا ہے اور کبھی عشق اور پھر عشق اور حسن مل کر نغمے کی تخلیق کرتے ہیں شاعر کا انفرادی احساس معراج اور جاوداں کو پاکر مطمئن سا ہوگیا۔ لیکن نیا شاعر غم عشق سے سکون پاکر بھی غم روزگار میں مبتلا رہتا ہے۔ حسن کی پرستش زندہ رہنے کے لئے کافی نہیں، پہننے کے لئے سردیوں میں گرم کپڑے یا رہنے کے لئے صاف ستھرے مکان اور کھانے کے لئے صحت مند غذا کی ضرورت ہے لیکن زندگی کی تمام بنیادی ضرورتوں پر ایک خود غرض، دس فیصد سے بھی کم تعداد میں چھوٹا سا طبقہ قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ جس کی تنخواہیں بڑھتی رہتی ہیں۔ جس کا مکان پھیلتا رہتا ہے جس کی موٹروں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن باقی نوے فیصد انسانوں کی ہر چیز اسی تناسب سے گھٹتی رہتی ہے۔ شاعر پہ تخفیف کا کلہاڑا چلایا گیا اس کی ملازمت چھین لی گئی۔ اسکی زندگی کا وسیلہ چھین لیا گیا۔ ملک پر مصیبت آن پڑی، قربانی کی ضرورت ہے۔ عوام کو قربانی دینی چاہئے۔ ہفتہ میں چھ روز فاقہ کرو، سات روز ملیں اور کارخانے چلاؤ، کھیتوں میں غلہ اگاؤ اگر مرجاؤ گے تو امر ہوجاؤ گے، دیس کی بپتا دور ہوجائے گی۔ اور ہمارا ہندوستان جنت نشان ہوجائے گا۔ ان ارشادات عالیہ کی روشنی میں شاعر نوکری سے علیحدہ کردیا گیا۔ ٹیگور اور اقبال کی روح سڑکوں پر اخبار اور رسالے بیچنے لگی۔ معراج کے چہرے پر افسردگی چھاگئی اور چھ ماہ کی جاوداں کا چہرہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔ جیسے پوچھتا ہو کہ امی، میرا دودھ کہاں ہے؟ امی، ابا کا پیار کہاں ہے؟ امی تم چپ چپ سی کیوں؟ امی تم گاتی کیوں نہیں؟

اور پھر ایک روز شاعر بمبئی چلا گیا۔ لیکن بمبئی کی ادب نواز حکومت نے رسالہ نکالنے سے پہلے ہی رسالہ نکالنے والوں سے ایک بڑی رقم ضمانت کے طور پر طلب کی "تم فنکار لوگ عوام کے دشمن ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم عوام کو بھڑکا دو اور وہ کہنے لگیں پہلے ہمیں کھانے کو دو تب ہم کام کریں گے پہلے ہمیں کپڑا اور مکان دو تب ہم ووٹ دیں گے۔" رسالہ نہیں نکلا اور ایک مرتبہ پھر شاعر سڑکوں پر مارا مارا پھرنے لگا۔ بمبئی کی فلک بوس عمارتوں کے درمیان رولس رائسوں سے جان بچاتا ہوا میرین ڈرائیو پر بھنڈی بازار میں' مالابار ہل پر طوفانوں کو دیکھتا اور طوفانوں کا مقابلہ کرتا ہوا۔

اب اس کی شاعری کو نئے نئے موضوع مل رہے ہیں۔ وہ زندگی کے نئے نئے رخ دیکھ رہا ہے۔ وہ مٹتی ہوئی سیاہی اور ابھرتی ہوئی روشنی کو دیکھ رہا ہے' ماضی کی قسمت میں فنا ہونا ہے' ماضی فنا ہو رہا ہے نیا دور سیڑھیوں پر تیزی سے چڑھ رہا ہے' وہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ بلندی خود اسے دعوت دے رہی ہے وہ ستاروں سے آگے کی دنیاؤں تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے' وہ سماجی انتشار اور آنے والے انقلاب کو دیکھ رہا ہے' وہ گیسوئے ہستی کو سنوارنا چاہتا ہے' اسکا پیغام لوری نہیں جھکوری ہے۔ مبہم نہیں روشن ہے' اس کا دماغ پرانے شاعروں کے دماغوں کی طرح کفن پوش نہیں۔ اس کے سامنے بہار اپنی قوت مرتکز کر رہی ہے مجمع پرندے پرواز کر رہے ہیں مسرتیں مسکراتی ہوئی گا رہی ہیں اور اس کے قدم چومنے کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں۔

ایبٹ آباد پہاڑوں سے گھرے ہوئے علاقہ میں واقع ہے' شاعر کو پہاڑوں سے سخت کوشی مل رہی ہے اور ایبٹ آباد سے جمالیاتی ذوق۔ اس نے اسکول کا زمانہ خواب آوارگی میں گزارا ہے' باپ سے چھپ چھپ کر چوری سے سینما دیکھنا۔ محرم کے زمانے میں اپنے ساتھیوں کا غول بنا کر دھما چوکڑی کرنا' آموں اور سنتروں کے باغوں پر چھاپے مارنا اس کے محبوب مشغلے رہے ہیں۔ ان سب "حرکتوں" اور حیدر آباد کی چند ماہ کی بے گھر بے درد زندگی نے اسے عوام سے قریب کیا۔ پولیس سے خاندانی قربت کے باعث اسے ان مظالم کا اندازہ ہوا جو چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر غریبوں اور مظلوموں پر کئے جاتے ہیں۔ اس کے تحت الشعور میں یہ چنگاریاں سلگتی رہیں............ سلگتی رہیں اور شعلے بننے کے لئے بے تاب رہیں۔ ملازمت نے ان چنگاریوں پر ریت ڈال دی تھی' راکھ پڑ جانے سے چنگاریاں روپوش ہو جاتی ہیں۔ یو جی ہو جاتی ہیں مگر بجھتی نہیں' اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہیں' بے تاب رہتی ہیں' تخفیف نے چنگاریوں پر سے راکھ کا غلاف اٹھا دیا۔ اور چنگاریاں پھر شعلہ بننے کے لئے بے تاب ہو گئیں۔

اس نے جبہ و دستار پہننے کے لئے مولاناؤں کو قرآن و حدیث کے حوالے دیتے ہوئے سادہ دل' بندوں کو فریب دیتے پایا' اس نے لکھ پتی ٹھگوں کو شاندار دعوتیں کھاتے' آنکھیں مسکاتے' کندھے ہلا ہلا کر باتیں کرتے اور شرابیں اڑاتے دیکھا۔ ادب' امن اور انسانیت پر تقریریں سنی ہیں' جب عوام صرف ہوا کھاتے ہیں اور پانی پی کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس نے آزادی کے دور میں بھی ادیب کے قلم کو ٹوٹا ہوا پایا۔ زبانوں پر تالے لگے ہوئے دیکھے۔ اور حسن کار دماغوں کو سلاخوں کے پیچھے سے جھانکتے پایا' اس نے اس فریب زدہ پبلک کو دیکھا جسے افیم کھلا کر تھپک تھپک کر سلایا جاتا ہے جس سے الیکشن کے زمانے میں خوشامدیں کر کے ووٹ لئے جاتے ہیں اور انتخابات کے بعد اسے طاق نسیاں میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ یا گندی نالیوں میں سڑنے کے لئے پھینک دیا جاتا ہے۔ اس طرح جیسے کوئی بچا کھچا شربت ادھر ادھر پھینک دے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھی کی ہر سانس ایک نالہ ہے اور ہر چوٹ کی ساتھ ایک غمگین جھنکار سنائی دیتی ہے' ویسی ہی جیسے کسی ستار کے تار ٹوٹتے وقت پیدا ہوتی ہے وہ اس اجتماعی غم میں شریک ہو جاتا ہے وہ بے باک ہے' استعاروں میں باتیں کرنا چاہتا' وہ مشتعل الفاظ میں گھرے معانی تلاش نہیں کرتا اور اب سیدھی سادی زبان میں لکھ رہا ہے اس کا ایک مجموعہ "گھن گرج" تیار ہے۔ میں نے اس کی

(باقی صفحہ نمبر ۳۳۲ پر)

لڈو سے الائچی کے پان تک

مرزا ظفرالحسن

(اقتباس)

حمایت کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ نشرگاہ اورنگ آباد سے بچوں کے پروگرام میں ایک لڈو کے عوض کوئی لطیفہ یا چھوٹی موٹی کہانی یا ایسی ہی کوئی چیز سناتے تھے۔ پھر یہ حیدر آباد آگئے۔

ایک مرتبہ پریم چند سوسائٹی کی جانب سے یوم پریم چند پر مشاعرہ کیا گیا جس میں حمایت علی شاعر نے تحت اللفظ ایک نظم سنائی۔ انکے ترنم کا جوہر کراچی کا عطیہ ہے۔ مجھے نظم سے زیادہ حمایت کی آواز نے اور اس سے بہت زیادہ ان کے چہرے مہرے نے چونکایا۔ چہرے پر ملاحت تو ماشاء اللہ آج بھی ہے مگر اس عمر میں یہ اچھے خاصے نمک پاش ہوا کرتے تھے۔ ناک نقشے پر غور کیا تو یاد آیا ارے یہ تو وہی لڑکا ہے جو بچوں کے پروگرام میں بیٹھا لڈو کھایا کرتا تھا۔ اپنے پاس بلایا' پوچھا کیا کرتے ہو؟ جو کرتے تھے صاف صاف بتادیا۔ یعنی جناح اخبار میں پچاس روپے پر ملازمت۔ پوچھا نشرگاہ میں نوکری کرو گے؟ کہا ہاں۔ اپنا کارڈ دیا اور کہا کل آنا۔ دوسرے دن آئے' آواز کی جانچ پڑتال کی اور انہیں اناؤنسر بنالیا۔

سقوط حیدر آباد کے بعد حمایت کراچی آگئے۔ بخاری صاحب کہا کرتے تھے۔ حیدر آباد کا زوال' ریڈیو پاکستان کے عروج کا سبب بنا' چنانچہ بخاری صاحب ہی کے باعث حیدر آبادیوں کا بڑا بول بالا تھا۔ قیوم' ماجد' وراث بدر رضواں' حمایت' جہاں آراء سعید' عزیز رضوی وغیرہ کی وجہ سے کراچی اسٹیشن ایک اور حیدر آباد کالونی نظر آتا تھا۔ رہی کسر میں نے پوری کردی تبادلے پر پشاور سے میں بھی کراچی آگیا۔ ان دنوں قدیم ٹھمری دادرے کو جو بلاشبہ ہماری موسیقی کو نہایت اہم اصناف ہیں غیر پاکستانی دیدیا گیا تھا۔ میری فرمائش پر حمایت نے اردو میں چند دادرے لکھے۔ ایک دن من میں سمائی کہ کلفٹن کی شام پر کوئی پروگرام کروں۔ حمایت کو اس کے نغمے لکھنے تھے مہدی ظہیر کو موسیقی ترتیب دینی تھی اور محسن صبیح کو پروگرام نشر کرنا تھا۔ ہم چاروں ایک شام کلفٹن گئے دو تین گھنٹے وہاں ٹھہر کر "مطالعہ بحر" کیا یعنی مہدی ظہیر موجوں کی موسیقی میں غوطے لگانے لگے اور حمایت تھپڑوں کے زیر و بم میں فاعلاتن' فاعلاتن فاعلات سننے لگے۔ ہم چاروں کا متفقہ خیال تھا کہ ہم نے نہایت خوبصورت اور منفرد پروگرام ریڈیو پر پیش کیا ہے مگر ہمارے افسر ناراض ہوگئے۔ چاروں نے کان پکڑے' افسروں کے نہیں' اپنے' کہ آئندہ کوئی جولانی طبع نہیں دکھائیں گے۔ ناراض افسر اور ناخوش بیوی ٹھیک طرح نوکری نہیں کرنے دیتے۔

پھر یہ ہوا کہ حمایت حیدر آباد سندھ چلے گئے۔ وہاں کے ریڈیو سے آٹھ سال تک وابستہ رہنے کے بعد استعفیٰ دیدیا اور سچل سرمست کالج میں استاد ہوگئے۔ پھر فلمی دنیا میں داخل ہوگئے لوری دی' کسی نے سنی اور کسی نہ ان سنی کردی۔ گڑیا بنائی۔ کوئی گڑیا سے کھیلا کسی نے حمایت کو گڈا بنادیا۔ رسالے نکالے' انجمنیں بنائیں' ڈرامے کئے' گانے اور مکالمے لکھے' نام کمایا' نادا گنوایا' یعنی دھن دولت کے معاملے میں ٹائیں ٹائیں فش۔

شاید آپ پوچھیں پیشوں کے تعلق سے میں نے حمایت کی قلابازیوں کی کتھا کیوں سنائی؟ اس لئے کہ ایک صاحب نے اپنے

پڑوسی سے پوچھا۔

''اماں تمہارے دوست کی بیٹی کا رشتہ آیا تھا کیا ہوا اس کا؟ لڑکا پسند آیا؟ کیسا ہے؟

''اچھا ہے''

''بھئی عادتوں کا اچھا ہے یا نہیں؟''

''ہاں سمجھ لو اچھا ہی ہے' بس کبھی کبھار الائچی کا پان کھاتا ہے۔''

''یہ تو کوئی بری بات نہیں''

''ہاں بری بات تو نہیں' جب ٹھرہ پی لیتا ہے تو پان کھا لیتا ہے۔''

''یہ تو برا ہے' گویا شرابی ہے''

''شرابی تو نہیں البتہ تاش واش میں ہار جاتا ہے تو کچھ پی لیتا ہے۔''

''یہ تو اور بھی برا ہے یوں کہو کہ جواری بھی ہے۔''

''اے جواری کہاں ہوا' وہ تو بس ریس ویس میں ہارتا ہے تو اپنا نقصان پورا کرنے کے لئے تاش کھیلتا ہے۔''

''اچھا تو صاحبزادے کو گھوڑ دوڑ کی بھی لت ہے۔''

''لت اسے نہیں کہتے' کبھی ہفتے دو ہفتے کڑکی رہی' کسی کی جیب نہ کاٹ سکا تو ریس میں اپنی قسمت آزما لیتا ہے۔''

''تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ لونڈا جیب کترا ہے۔''

حمایت کی مختصر داستان حیات کے فوراً بعد جیب کترے کے الائچی والے پان کا قصہ سنانے کا مقصد یہ نہیں کہ حمایت ٹھرہ پیتے ہیں..... غلط

تاش میں ہار جاتے ہیں...... سراسر غلط

ریس میں اپنا گھوڑا دوڑاتے ہیں..... سراسر غلط

جیب تراشی؟ تو یہ صحیح ہے' فرق صرف اتنا ہے کہ جیب حمایت کی کٹتی رہی ہے اور الائچی کا پان دوسرے کھاتے رہے ہیں۔ رشتہ چاہے بیٹی کا آئے یا پیشے سے جوڑا جائے' بے حد اہم ہوتا ہے۔ جوڑ دو تو ٹوٹ نہیں کیونکہ رشتہ بار بار نہیں آتا۔

آج کل یہ رسم پڑ گئی ہے کہ جس کتاب کی رونمائی ہوتی ہے صاحب کتاب سے زیادہ کتاب کے نام پر زیادہ بحث کی جاتی ہے میں کوئی مرزا غالب تو ہوں نہیں جو وبائے عام میں مرنے سے انکار کروں۔ تو ایک اعتراض میری طرف سے بھی کہ ''مٹی کا قرض'' تو کوئی نام نہ ہوا۔ ایک تو قرض کا ذکر کر کے ہم مسلمانوں کے جذبات مجروح کئے گئے ہیں جن کا قومی مزاج قرض لینا ہے لوٹانا نہیں' دوسرے یہ کہ جب ہم جانداروں کا قرض چکانا نہیں جانتے تو چہ مٹی کا تودہ۔

آخر میں ایک آدھ چھینٹا حمایت کے کردار پر بھی۔ بہت کنجوس ہیں۔ میرے ہم عمروں میں مسلم ضیائی نے اور کم عمروں میں حمایت علی شاعر نے مجھے اپنے خلوص و محبت کے علاوہ بھی اور کچھ دیا ہے۔ ہاں اگر نہیں دیا تو کوئی رسالہ یا کتاب۔ دونوں کے اس مشترکہ گناہ کا کفارہ اس سے ادا ہو کہ حمایت نے بجا طور پر اپنی کتاب میرے ہمدم دیرینہ مسلم ضیائی کے نام معنون کی ہے۔ جنکی بے پناہ محبت سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ شاعر بگڑ کر مرثیہ خواں نہ ہو جائے۔

اس مضمون میں اگر میرے پیار کی کوئی جھلک ملے تو اس کا ضمنی سبب من حاجی بگویم کے مصداق ہے کہ حمایت نے دو تین سال پہلے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ آپ تو میری ساری زندگی سے واقف ہیں' ابتدا میں آپ ہی کی انگلی پکڑ کر میں نے

(باقی صفحہ ۳۵۱ پر)

حمایت...... میرا یار

انور عنایت اللہ

بعض کمزور انسانوں کی طرح مجھے بھی کئی مرض لاحق رہے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم اور قابل ذکر ڈائری لکھنے کا مرض ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اس مرض کی وجہ سے مجھے اپنے تخلیقی کاموں میں اکثر بڑی مدد ملی۔ لیکن افسوس، شادی کے بعد میں نے نہ صرف ڈائری لکھنے کی خطرناک عادت سے توبہ کرلی بلکہ اپنی پرانی ڈائری کے بہت سے صفحے بھی سینے پر پتھر رکھ کر ضائع کردیئے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے گھر کا امن کسی وقت بھی خطرے میں پڑسکتا تھا۔ اگر وہ تمام صفحے ہوتے تو حمایت علی شاعر کی شخصیت اور ان کے فن کے بارے میں، میں آپ کی نسبتاً" زیادہ موثر طور پر سمع فراشی کرسکتا۔ مثلاً" میں آپ کو بتا سکتا کہ معراج بیگم سے ان کی شادی سے پہلے وہ کیسے شعر کہا کرتے تھے۔ میں آپ کو ان کے دو اشعار سنا رہا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ کو دل میں وعدہ کرنا ہوگا کہ ان اشعار کے پس پردہ کون سا جذبہ کارفرما تھا اس کا آپ برملا ذکر نہیں کریں گے۔ کیونکہ اب حمایت کے بچے ماشاء اللہ بڑے ہوگئے ہیں، حمایت نے شادی سے پہلے جو غزلیں اور نظمیں کہی تھیں ان میں یہ اشعار ہمارے حلقے میں یعنی ان کے رازداروں کے حلقے میں بہت مقبول تھے۔

دل نے چپکے سے کہا شاعر آوارہ مزاج
تیری بے نام تمنا کی یہی ہے معراج
انہیں قدموں میں جھکا دے سر مغرور اپنا
یہی خاک کف پا ہے تیرے ہر غم کا علاج

اپنے غم کے علاج کے سلسلے میں حمایت نے خاک کف پا تک کی منزل کیسے طے کی اور ان کی شادی کی شام کو اردو محل میں کیسے کیسے واقعات رونما ہوئے ان کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ فی الحال تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حمایت کا چہرہ دیکھ کر، اس کا ایک ایک شعر سن کر مجھے وہ زمانہ یاد آجاتا ہے جب ہم جوان تھے، دنیا سے بھوک، بیکاری اور غربت کو مٹا دینے کے عزائم سے سرشار تھے، اپنے لئے اور اپنے ہی جیسے کروڑوں انسانوں کے لئے بہت کچھ حاصل کرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ہم نے اپنے چالیس، بیالیس سالہ ادبی سفر میں کیا کھویا اور کیا پایا، یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حمایت علی شاعر اور میری طرح اور کئی ہمارے عزیز دوست اور ہم رکاب ساتھی ہیں، جو ایک ہی دور کی پیداوار ہیں، جو ایک ہی شمع کی روشنی سے منور ہوکر ادبی سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ ہماری ادبی زندگی کے اس روشن مینار کا نام اردو محل تھا اور اس میں رہنے والے فقیر کا نام مسلم ضیائی۔ اردو محل کی لمبائی اور چوڑائی گزوں میں نہیں فٹوں میں ناپی جاسکتی تھی کیونکہ یہ صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا جس سے ملحق ایک غسل خانہ بھی تھا۔ اسی کمرے سے ہماری ادبی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ یہیں ہم نے فاقے بھی کئے تھے، خواب بھی دیکھے تھے، عشق اور محبت کے ترانے بھی گائے تھے اور جب آزاد حیدرآباد کا سورج دن دہاڑے غروب ہوا تھا تو ہم نے مل کر آنسو بھی بہائے تھے اور پھر پاکستان منتقل ہونے کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔

اس زمانے میں ہم سب مجرد تھے' اسی لئے اس زمانے میں حیدر آباد دکن کی سب سے اونچی عمارت مجرد گاہ کی سب سے بلند منزل کے ایک مختصر کمرے میں ہمارا زیادہ وقت گزرتا تھا۔ وقت کیسے گزرتا تھا اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

عموماً" شام اپنے ساتھ اداسیاں لے کر آتی ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہ جسمانی سکون کا پیغام بن کر آتی ہے' دن بھر پیٹ خالی ہو تو رات کی تاریکی کا شدت سے انتظار فطری عمل ہے۔ یہاں میں نے عمداً" ذہنی سکون کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ہم سب اس سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہم زندگی کے اس دور میں ہیں' جب ہر چمکتی چیز سونا نظر آتی ہے' ایسا سونا جو ہمیں لبھاتا ضرور ہے لیکن پھر بام مچھلی کی طرح ہمارے ہاتھوں سے پھسل کر دور نکل جاتا ہے اور ایک مسلسل ذہنی اضطراب دے جاتا ہے۔ ایسے ہی حالات میں تخلیقی عمل کی ابتدا ہوتی ہے۔ سو ہمیں بھی یہ مرض لاحق ہو چکا ہے ابتدائے عشق ہے اس لئے عزائم بلند ہیں۔ میرے چند افسانے شائع ہو چکے ہیں' حمایت کی چند غزلیں اور نظمیں' خواجہ معین الدین کا ایک طویل ڈرامہ کامیابی سے اسٹیج ہو چکا ہے اور عزیز کا ایک کارٹون بمبئی کے ایک مشہور رسالے کی رونق بن چکا ہے۔

ان تمام کامیابیوں کے باوجود ہمیں رات کی تاریکی کا پہنچنے سے انتظار ہے کیونکہ جو کام ہم کرنے والے ہیں' اسے دن کی روشنی میں کرنے کی ہم میں ہمت نہیں کیونکہ ہم سب سفید پوش شرفاء ہیں۔ مجرد گاہ کے عقب میں ترپ بازار ہے جہاں ایک بھڑ بھونجے کی دکان ہے جس کے گرم گرم چنوں کی خوشبو دور دور تک پھیل کر بھوک کی اشتہاء کو بڑھایا کرتی ہے۔ جہاں چنوں کے اور بہت سے فائدے ہیں وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دو آنے کے چنوں سے پیٹ آسانی سے بھرا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہمیں حمایت علی شاعر کا شدت سے انتظار ہے کیونکہ وہی ہم سب میں رئیس اعظم ہے۔ اسے نشرگاہ' حیدر آباد سے تنخواہ پابندی سے ملتی ہے جو برائے نام ہونے کے باوجود بلاناغہ ہے۔ میری تنخواہ تو کئی مہینوں سے بند ہے کیونکہ اب تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ میرا تعلق حکومت کے کس محکمے سے ہے۔ یہ حکومت کبھی سرکار عالی حضور نظام کی تھی۔ اب یہ بھارت کی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ میرا آبائی محکمہ' محکمہ زراعت ہے جو مجھے امریکہ بھیجنے کی تیاری کر رہا تھا' کبھی کہا جاتا ہے کہ میرا اصلی محکمہ نشرگاہ' حیدر آباد ہے جہاں نام نہاد پولیس ایکشن سے چند ہفتے پہلے مجھے مرزا ظفر الحسن کی رفاقت لے گئی تھی۔ غرضیکہ دونوں محکمے کے کھاتوں میں سے میرا نام کاٹ دیا گیا ہے۔

میرا آبائی محکمہ کون سا ہے؟ میرا آبائی وطن کون سا ہے؟ میرے آباو اجداد کا وہ کون سا گناہ ہے؟ جس کا کفارہ ادا کرنے کے لئے میں اس وقت مجرد گاہ کی نیم تاریک سیڑھیوں پر عزیز اور حمایت کے ساتھ بیٹھا منتظر ہوں کہ رات اور گہری ہو جائے تو عبدالرحیم بھڑ بھونجے کی دکان کا رخ کیا جائے' چنے کھانے کے بعد اردو محل کے گھڑے کا ٹھنڈا پانی پیا جائے اور پھر مجرد گاہ کی چھت پر بستر سجا کر تخلیقی کاروبار شروع ہو۔ دن بھر پیٹ خالی تھا۔ ایسے میں جو ادب تخلیق ہوتا ہے وہ بھی اتنا ہی نحیف اور بے رونق ہوتا ہے' جتنا کسی یرقان زدہ مجہول کا چہرہ!

آج ان واقعات کو چالیس سال ہو رہے ہیں ان کے بارے میں غور کرتا ہوں تو حمایت علی شاعر کے ساتھ گزارے ہوئے ان گنت لمحے یاد آتے ہیں۔ آج انہیں اپنے پھلتے پھولتے کنبے کے ساتھ دیکھتا ہوں تو مجھے وہ شام یاد آتی ہے جب مجرد گاہ کے ایک کمرہ میں ہم نے انہیں دولھا بنایا تھا۔ ان کے لئے شیروانی کا انتظام مسلم ضیائی کرتے ہیں۔ یہ ان کے مرحوم دوست ضیا کی دلکش شیروانی ہے جو حمایت کے بالکل فٹ آتی ہے جوتوں پر پالش ہو چکی ہے۔ ٹوپی کی تلاش شروع ہو جاتی ہے تو عزیز کارٹونسٹ کی ٹوپی کام آتی ہے کیونکہ صرف وہی صاحب ٹوپی ہیں اور اس کی دولت سے مالا مال ہیں۔ مسلم ضیائی سے ٹوپی نہیں لی جا سکتی کیونکہ وہ ان کی شخصیت کا اٹوٹ انگ ہے۔ ہماری ٹوپیاں تو باٹا کے جوتے کی مقبولیت کو دیکھ کر عرصہ ہوا اڑ چکی ہیں۔

عزیز کی ٹوپی حمایت کے سر پر لگتی تو ٹھیک ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک نازک مسئلہ ہے کثرت استعمال سے اس کا حلیہ ایسا ہے کہ کسی قدر اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس نازک عمل کے لئے قرعہ فال میرے نام نکلتا ہے اور میں ٹوپی لے کر غسل خانے کا رخ کرتا ہوں۔ جوں ہی صفائی کی کوشش کرتا ہوں مجھے احساس ہو جاتا ہے کہ اگر یہ کاروائی فوراً" روکی نہیں گئی تو ٹوپی نہ میاں عزیز کے کام کی رہے گی اور نہ دولھا میاں کے۔ اس کے معمولی نقص کو کس طرح ہم نے پھولوں میں چھپانے کی کوشش کی یہ علیحدہ کہانی ہے۔

یہاں عرض کرنا ہے کہ حمایت کی شادی اور ان کی شاعری کے پروان چڑھنے اور بلندیوں تک سفر کرنے کا بڑا راست تعلق ہے۔ شادی کے فوراً" بعد ان کی شاعری کا رومانی دور ختم ہو گیا کبھی وہ ایسے شعر کہا کرتے تھے۔

میں سایہ کئے ابر کی مانند چلوں گا
اے دوست جہاں تک بھی تری راہگذر جائے

پھر ان کی سوچ بدل گئی' لہجہ بدلا اور اس کے ساتھ ہی وہ ایسے شعر کہنے لگے جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ شاعر کو اب صرف غم دوراں ہی یاد ہے' اس میں سرشار ہو کر' سسکتی انسانیت کی بے بسی سے تڑپ کر وہ شعر کہنے لگا ہے۔

سہمی سہمی کھل رہی تھی ایک کلی
میں نے پوچھا' کیا خزاں کا خوف ہے۔
جی نہیں..... ایک دن خزاں تو آئے گی
پھر؟
سنا ہے' اس نے چپکے سے کہا۔
اس چمن کا باغباں گلچیں بھی ہے!

حمایت ایک بے حد حساس انسان ہیں۔ انھوں نے زندگی کو اپنی تمام تر عریانیت کے ساتھ دیکھا ہے انسانیت کو' امارت اور آسودگی کے پس دیوار سسکتے دم توڑتے دیکھا ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں وہ درد ہے وہ کرب ہے جس کا وہ اپنی زندگی کے ہر دور میں شکار رہے ہیں۔ آخر ان کی اور میری نسل کو' ایسی ہی لعنتوں' ایسے ہی عذاب میں سے گزرنا پڑا ہے۔ حمایت جب اپنے اردگرد بے حس اور غافل انسانوں کا جم غفیر دیکھتے ہیں تو مایوس ہو کر کہتے ہیں۔

کس لئے کیجئے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

اس کا حساس ذہن ہواؤں کا رخ دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ طوفان اب ہم سے کتنی دور ہے یہ احساس اسے بے حد تڑپاتا ہے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

کشتی ہے مگر ہم میں کوئی نوح نہیں ہے
آیا ہوا طوفان خدا جانے کدھر جائے

اس کے لیے یہ احساس جان لیوا ہے کہ جن ہاتھوں میں انسانیت کی نجات کی کنجی تھی، وہی ہاتھ اب انسانوں ہی کی جان کے درپے ہیں۔ شاعر بڑے درد کے ساتھ بین کرتے ہیں۔

یہ معجزہ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
اب دست سامری میں عصائے کلیم ہے

اپنے وطن سے، اس کی مٹی سے، اس میں رہنے بسنے والے کروڑوں انسانوں سے انہیں محبت ہے کہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

جو کچھ بھی گزرنا ہے، میرے دل پر گزر جائے
اترا ہوا چہرہ مری دھرتی کا نکھر جائے

یوں تو مجھے ان کے بے شمار شعر بہت پسند ہیں لیکن اس وقت میں ان کے صرف تین شعر سنانا چاہتا ہوں جو ان کی گہری سوچ اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کی بڑی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔

سر پر جو بدلیاں تھیں، ہواؤں میں اڑ گئیں
اب سر پہ آسماں تو ہے، شانوں پہ سر کہاں

شوق سفر میں گرد نہ اتنی اڑا کہ پھر
منزل پہ جاکے سانس بھی لینا محال ہو

یہ الگ بات کہ میں ہی نہیں یوسف ورنہ
بکنا چاہوں تو یہاں مصر کا بازار بھی ہے

آپ کو یہ اشعار سناتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب ہم پہلی بار اختر حسن کے گھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں ملے ہوں۔ لیکن یہ کل کی بات کیسے ہو سکتی ہے جب وقت برق رفتاری سے گزر رہا ہے۔ اس دوڑ میں کل کیسا تھا، اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ کل کیسا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کل بھی حمایت علی شاعر کا اتنا ہی روشن اور شاندار ہوگا جتنا آج ہے۔ کہنے کو آج حمایت اور میں ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔ لیکن وقت نے ہم دونوں کو اس حد تک مصروف کردیا ہے کہ مہینوں کے بعد کبھی کبھار ملاقات ہوتی ہے۔ اس کے باوجود دوستی کا وہ رشتہ جو اردو محل میں قائم ہوا تھا آج بھی اسی طرح مستحکم ہے جس طرح اس دور میں جب ہم نے ایسے دن اور ایسی راتیں ساتھ گزاری تھیں جب ہماری جیب اکثر خالی رہتی اور مسلم ضیائی سے چھپ کر ہم مجرد گاہ کی تاریک سیڑھیوں پر بیٹھ کر گرم گرم چنوں سے پیٹ بھرا کرتے۔ یہ رشتہ اس لئے بھی اور مضبوط ہوگیا ہے کہ خدا کے فضل سے ہم دونوں کا قلم ابھی تھکا نہیں ہے۔ حمایت کو ابھی ادب کو اور بہت کچھ دینا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ برسہا برس تک انشاء اللہ اسے ضرور مالا مال کرتے رہیں گے۔

(۱۰ اگست ۷۸ء کو بہادر یار جنگ کلب میں "حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام" کے موقع پر پڑھا گیا)

حمایت علی شاعر

(چند تاثرات)

ڈاکٹر انور معظم

(عثمانیہ یونیورسٹی۔ آندھرا پردیش)

جب میں حمایت علی شاعر سے اپنی دوستی کے بارے میں سوچتا ہوں تو ذہن میں آج سے تیس پینتیس برس پہلے کے ایک نوجوان کی دلکش تصویر ابھرتی ہے جو اورنگ آباد (دکن) کے بازاروں اور محفلوں میں ایک قلم اور چند کاغذات سنبھالے گھومتا رہتا تھا۔ ایک قلم اور چند کاغذ' یہی اس کی شناخت کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ یہی اس کا کل سرمایہ تھے اور آج بھی ہیں۔ قلم سب سے بڑا ہتھیار ہے جو انسان نے ماحول کو اپنے مطابق ڈھالنے کے لئے ایجاد کیا ہے۔ انسانی تہذیبی تبدیلیوں کی تاریخ اسی سے وجود میں آئی ہے لیکن بہت کم لوگ قلم کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ایسا سلیقہ آتا ہے اپنے ماحول کو بہتر بنانے کی شدید خواہش پر اور یہ سلیقہ عبارت ہے سرکشی سے' سرکشی غیر ذمہ دارانہ خود غرضی کا نام نہیں۔ سرکشی نام ہے ماحول کے منفی عناصر کے آگے سپر ڈالنے سے انکار کے حوصلے کا۔ اگر مجھے حمایت علی شاعر کی شخصیت کے بنیادی عنصر کی نشاندہی کے لئے کہا جائے تو میں کہوں گا "سرکشی"

میں نے آج سے ۳۷-۳۸ سال پہلے حمایت کو اورنگ آباد کی ادب اور علم سے سرشار محفلوں بازاروں میں یوں دیکھا کہ وہ کسی گروہ میں شامل ہونے کو تیار نہ تھا۔ غالباً اس کے دوستوں کا حلقہ بھی بہت محدود تھا اور اس کے شعر ملک کے مختلف جرائد میں شائع ہوتے اور وہ سب سے انہیں کے ذریعہ ملتا جلتا اور تنہا بولتا تھا۔

حمایت علی شاعر کی ساری زندگی (جس قدر بھی میں واقف ہوں) سرکشی میں گزری جو محنت کشی میں اپنی پر اعتماد جڑیں رکھتی ہے۔ اس نے بڑی محنت اور چاؤ سے اپنی شعری اور سماجی زندگی بنائی ہے۔ پاکستان میں اس کی زندگی کے مختلف اتار چڑھاؤ چڑھاؤ آزادانہ گزر کرنے کی خواہش کا اظہار ہے۔ مختلف پیشوں اور مصروفیتوں سے اس کی وابستگی بھی یہی بتاتی ہے۔ ریڈیو پر ڈرامہ نگار صداکار اناؤنسر اور پروڈیوسر' صحافی' فلمی مکالمہ نگار' نغمہ نگار اور اب کئی برسوں سے سندھ یونیورسٹی حیدر آباد میں ایک استاد۔ ان پیشوں کی تبدیلی اس کے مزاج کے تلون کی نہیں بلکہ اس سرکشی کی غماز ہے جو اس کے شعری مزاج کا بھی ایک عنصر بن چکی ہے۔ اورنگ آباد میں ابتدائی زندگی کے چند برس گزارنے کے بعد (آزادی کے فوراً بعد) حمایت علی شاعر حیدر آباد دکن ریڈیو پر اسٹاف آرٹسٹ کی طرح کام کرنے لگا۔ صاحبان اقتدار سے نہیں نبھی تو اسے ملازمت سے ہٹا دیا گیا۔ اس کی شریک حمایت کو بھی اسی سلسلے میں ملازمت چھوڑنی پڑی۔ حمایت نے احتجاجاً" ہاکر بن کر اخبار فروخت کئے اور حیدر آباد کے باہر بمبئی اور دوسرے شہروں کے اخبارات نے سرخیوں میں اسکی اطلاع چھاپی۔ پھر حمایت نے حیدر آباد چھوڑا

اور بمبئی میں قسمت آزمائی۔ بالآخر وہ پاکستان منتقل ہو گیا۔ وہاں ریڈیو پاکستان میں جگہ ملی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا کراچی میں اس کی ابتدائی زندگی کا حال خود اس کے الفاظ میں یہ تھا۔

"یہاں میں نے زندگی اس عالم میں شروع کی تھی کہ تن کے کپڑوں اور رہنے کے لئے ایک جھونپڑی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ کراچی کی لمبی لمبی سڑکوں پر اکثر پیدل گھومتا اور بھٹیار خانوں میں ایک یا دو وقت کھانا کھاتا کبھی کبھی فاقے بھی کرنے پڑتے' اپنے کپڑے خود دھوتا اور اکثر بغیر استری کے پہن لیتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے عالم میں شہر کے سفید پوشوں کے درمیان میرا گزر ممکن نہ تھا۔ ریڈیو کے افسران بالا بھی یک نظر دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ اس کا ردعمل میری اس دور کی شاعری میں موجود ہے۔ دل میں باغیانہ جذبات سلگتے رہتے اور میں انہیں اپنے اشعار میں منتقل کر کے اپنی دانست میں یہ سمجھ لیتا کہ میں نے انقلاب کیلئے زمین ہموار کر لی دراصل یہ نوجوانی کی رومانی سوچ تھی جو مجھے خوش فہمی میں مبتلا کر کے مطمئن ہو جایا کرتی تھی"

پھر حمایت ۱۹۵۵ء میں حیدر آباد (سندھ) ریڈیو پر آگیا اس کے لئے یہ دور بقول خود اس کے اس کی زندگی کا اہم ترین دور تھا جب اس کے تخلیقی اظہار نے پوری وسعت پائی' معاشی اطمینان نے راہ ہموار کی۔ اس نے خوب لکھا' اس کی کتابوں پر اہم (سرکاری و غیر سرکاری) ادبی انعامات ملے اور اہل ذوق کی داد بھی۔ اسی دور میں اس نے فلم کے لئے بھی لکھنا شروع کیا۔ فلم کے ماحول میں تجارتی مقاصد ادبی مقاصد پر ترجیح رکھتے ہیں۔ شاعر نے رفتہ رفتہ اس ماحول میں شرمندگی اور تلخی محسوس کی۔

روٹی کے لئے طاق پہ رکھ دوں گا کتابیں
جینا مجھے اس طرح گوارہ تو نہیں

پندار یوسفی ہی سہی ' پندار ہی تو ہے
بازار کی یہ شے سر بازار ہی تو ہے
میں بھی انا پرست ہوں اقرار کیا کروں
میرے لبوں پہ آج بھی انکار ہی تو ہے

حمایت علی شاعر نے ٹیلی ویژن اور فلم کو چند دن استعمال کیا۔ بالآخر ۱۹۷۶ء میں سندھ یونیورسٹی کی فضا راس آگئی۔ اس لئے نہیں کہ ایک یونیورسٹی میں ہر طرح کی آزادی اور سکون ملتا ہے بلکہ اس لئے کہ یہاں ذوق اور پیشے میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب حمایت کی عمر بھر کی بے قراری کو قرار آگیا' وہ ادب کے میدان میں اب بھی سب سے الگ تھلگ ہے۔ جیسا میں نے اسے اورنگ آباد میں دیکھا تھا۔ اپنی باتوں پر اصرار کرتے اور دوسروں سے "بر سر پیکار" اس کے تنقیدی مضامین کے مجموعے "شخص اور عکس" کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف ادبی رجحانات کے ادیبوں اور نقادوں سے اس کی کشمکش اب بھی جاری ہے۔

سرکشی ہوشمندی بھی مانگتی ہے ہوش مندی انسان کو بھلے برے میں تمیز بھی سکھاتی ہے۔ حمایت نے افکار کو شخصیات میں نہیں الجھایا' وہ ادیب جن کے بعض خیالات یا نظریات پر اس نے شدید تنقید کی' ان سے حمایت کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اس طرح اس نے اپنے پر ہونے والی تنقید کو کسی شخصی عناد پر نہیں کیا نہ اپنے نقادوں کے بارے میں اس کی رائے

شخصی نفرت اور دشمنی میں تبدیل ہوئی۔ ایسا کرنا ایک ضدی اور سرکش آدمی کے لئے بڑا صبر و تحمل طلب کرتی ہے۔ حمایت میں صبر و تحمل بدرجہ اتم موجود ہے۔ شاید اس لئے کہ حمایت کے صحیفہ وفا میں مرکزی حیثیت خیال اور نظریئے کی ہے شخص کی نہیں وہ فکر کے توسط سے فکر پر حملہ کرتا ہے' صاحب فکر کے توسط سے فکر پر حملہ اس کی فقہ میں جائز نہیں' اس ہوش مندی نے اسے اپنی شاعری کے بارے میں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار ہونے سے بھی محفوظ رکھا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تاریخ ادب میں جگہ ملنا ادیب کی زندگی میں طے ہونے والا مسئلہ نہیں' اپنا اظہار ہی اصل حقیقت ہے اور بس!

حمایت علی شاعر کی سرکشی اس کی تخلیقات میں کبھی زیر لب اور کبھی بلند آہنگ ہوجاتی ہے۔ شاعری میں سرکشی کا اظہار ضروری نہیں کہ ویسا ہی ہو جیسے تنقید میں ہوتا ہے۔ شعر میں اس کی سرکشی نے حسن و عشق کے بیان میں ٹھوس حقیقتوں کو نظر انداز ہونے سے بچایا ہے وہ خالصتاً رومانی یا تخیل پرست شاعر نہیں شاید اس میں اس کی ترقی پسند تحریک سے گہری وابستگی کا بھی حصہ رہا ہو۔ حقیقت کو نظرانداز کرنا' محض تخیل میں پناہ نہ لینا ایک مسلسل آزمائش ہے' زیاں کا سودا ہے' اس میں زیادہ تر آدمی اپنا حوصلہ کھو دیتا ہے۔ حمایت علی شاعر کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ عشق کے سہارے سے' عشق جو آزمائشوں میں اس کا شریک رہا

دل نے چپکے سے کہا شاعر آوارہ مزاج
تیری بے نام تمنا کی یہی ہے معراج
انہیں قدموں میں بچھا دے دل سرکش اپنا
یہی خاک کف پا ہے' تیرے ہر غم کا علاج

یہ شاعر کی ابتدائی شاعری کا دور ہے جب وہ ہندوستان میں تھا اس وقت بھی محض حسن و عشق نہیں' آس پاس کے مسائل پر بھی وہ اپنا ردعمل پیش کررہا تھا۔

۱۹۵۰ء میں شاعر نے مہاتما گاندھی کے قتل پر ایک نظم "ملامت" لکھی

وہ شمع جو پروانوں کے لئے محفل میں جلی
اس شمع کو پروانوں نے خود بھی پھونک دیا
وہ آگ جو شعلہ خوں بن کے ہر دل میں جلی
وہ آگ وہ شعلہ خوں آخر اشکوں میں ڈھلا
اب بیٹھ کے سب روتے ہیں اور سر دھنتے ہیں
مٹی میں ملے اشکوں کے موتی چنتے ہیں

ہوش مندی کی ایسی مثالیں شاعر کے کلام میں بکھری پڑی ہیں۔ ان میں آس پاس کے ماحول پر تنقید کا رویہ بہت واضح ہے اس لہر نے شاعر کی شاعری میں ایک فضا بنانے میں مدد پہنچائی ہے۔ شاعر کے شعری احساس کا اندازہ اس کی غزلوں کے چند اشعار سے کیجئے۔

ہر قدم پر نت نئے سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

کس لئے کیجئے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جبکہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

شمع کے مانند اہل انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ
شاعر ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

یہ سرکشی جنون نہیں، پندار عشق ہے
گزرے ہیں دار سے بھی اسی بانکپن سے ہم

اے رہگزار سندھ ترا چاند بجھ نہ جائے
آئے ہیں اس کی چاہ میں ارض دکن سے ہم

منسوب میری موت ہے جب تیرے نام سے
کیوں اور نام ہو سر مدفن، ترے سوا

جوڑے میں جو پھول تھا کل اب گود میں ہے
دیکھ کے اس کو بیتے دن یاد آئے بہت
جس سمی کمرے میں رہو تو اچھا ہے
باہر تیز ہوا تو دھول اڑائے بہت

تو بھی محدود نہ ہو، مجھ کو بھی محدود نہ کر
اپنے نقش کف پا کو مری منزل نہ بنا

یہ آرزو ہی رہی کوئی آرزو کرتے
خود اپنی آگ میں جلتے جگر لہو کرتے
ترے خیال میں گم ہوکے اک غزل کہتے
اور اس غزل کو نہ رسوائے کو بہ کو کرتے

ہمیں یقیں ہے کہ گر تو قریب بھی ہوتا
تو دور جاکے کہیں تیری جستجو کرتے

حمایت علی شاعر کے اشعار اور تنقیدی مضامین ایک اور اعتبار سے بھی قابل توجہ ہیں وہ یہ کہ ان کے توسط سے ہم ہندوستان کے قارئین کو پاکستان کی پچھلے ۳۷ سال کی تاریخ سیاست تہذیب کے بارے میں بعض بنیادی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پاکستان عہد حاضر میں ایک انوکھا تہذیبی تجربہ ہے اس کا کچھ اندازہ پاکستان میں چند روز گزارنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ یوں تو ہندوستان بھی مختلف زبانوں اور تہذیبی روایات کا ملک ہے۔ جیسا کہ پاکستان ہے لیکن پاکستان میں ایک اور چیز ہے جو یہاں نہیں۔ پاکستان میں مہاجرین کی کثیر تعداد کی موجودگی نے (جو زیادہ تر کراچی اور سندھ میں سکونت پذیر ہیں) پاکستان کی تہذیب کو ایک انوکھا پن دیا ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں ایک پہلو مہاجر ادیبوں کی جذباتی اور نفسیاتی کشاکش ہے۔ ہجرت ہندوستان سے پاکستان جانے والوں خصوصاً ادیبوں کے لئے ایک گہرا نفسیاتی اور تہذیبی مسئلہ بنی ہوئی ہے وہاں کے کئی اہم شاعروں اور افسانہ نگاروں کی حسیت میں ہجرت اور اس کی ذہنی اور جذباتی نسبتیں شامل ہیں، اس کے محسوس کرنے اور سوچنے کا انداز پاکستان کے مختلف علاقوں کے بسنے والوں کے احساس اور فکر سے قدرے مختلف ہے۔ ان کی تحریروں کا تقابل اگر پنجاب سرحد اور سندھ کے اردو ادیبوں کی تخلیقات سے کیا جائے تو یہ فرق صاف نظر آجائے گا مثلاً" ناصر کاظمی، انتظار حسین، شکیب جلالی یا سلیم احمد کی تحریروں نے ہجرت میں جو کیفیت پیدا کی ہے۔ وہ غیر مہاجر لکھنے والوں کے یہاں موجود نہیں۔ حمایت علی شاعر بھی انہی ہجرت قضاء ادیبوں اور شاعروں میں شامل ہیں۔ ان میں بھی شاعر کے یہاں ہجرت اور ہجرت کی نسبت سے دوسرے رد عمل زیادہ کھل کر سامنے آتے ہیں کہ اس کا اسلوب ہی اک کھلا ہوا اسلوب ہے۔

اگر آپ اس کی نظم و نثر کو تاریخی اعتبار سے پڑھ جائیں تو پاکستان کے اس انوکھے تہذیبی تجربے کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جس کا ذکر میں کررہا ہوں۔

یہ ایک سرسری سا تعارف تھا۔ شاعر اور اس کے اشعار کا، تفصیلی اور گہری ملاقات تو اس کی تحریروں کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور مناسب بھی

(مطبوعہ روزنامہ "اورنگ آباد ٹائمز" حمایت علی شاعر نمبر مورخہ ۲ جون ۱۹۸۵ء)

حمایت علی شاعر...

نکہت بریلوی

اب سے کوئی ۴۴ برس قبل (۱۹۵۴ء) میں حمایت علی شاعر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اب تک جاری ہے۔ یہ ملاقات سکھر کے ایک کل پاکستان مشاعرے کے توسط سے ہوئی تھی۔ اس وقت تک مشاعروں میں غزل کا دور دورہ تھا اور خوش گلوئی سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی۔ یہ مشاعرہ بھی حسب رواج اسی رنگ میں رچا ہوا تھا۔ ریشمیں غزلوں اور خوش گلو شاعروں پر داد تحسین کے ڈونگرے برس رہے تھے کہ اسٹیج سیکریٹری نے حمایت علی شاعر کو دعوت کلام دی۔ ایک نوجوان' درمیانے قد' چھریرے بدن' سانولے رنگ' ملیح چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں والا سیاہ شیروانی میں ملبوس نوجوان بڑے اعتماد کے ساتھ اسٹیج پر آیا' نوجوان نے مائیک کو اپنی طرف سرکایا' پنڈال پر ایک طائرانہ نظر ڈالی' پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو سیدھے ہاتھ کی انگلیوں سے اوپر اٹھایا' پہلے کھنکارا پھر تحت اللفظ نظم شروع کردی۔

یہ بہت دور' دور مغرب سے
ارض مشرق سجانے آئے ہیں
ایشیا کے اڈتے طوفاں سے
ایشیا کو بچانے آئے ہیں

نظم کا عنوان "اجنبی مہمان" تھا اور یہ امریکی وزیر خارجہ ڈلس کی پاکستان آمد سے متعلق ایک نئے انداز کی خیر مقدمی نظم تھی جس میں سامراجی عزائم کے خطرات کی طرف برملا اشارے کئے گئے تھے۔

تپتے جسموں کے پاؤں کے نیچے
چھاؤں اپنی بچھانے آئے ہیں
مصر کی طرح ارض پاک کو بھی
ایک "ترکی" بنانے آئے ہیں
اک دکاں کی بساط الٹا کر
ایک دوکاں جمانے آئے ہیں

مشاعرے پر غزل اور ترنم کا جادو چلا ہوا تھا ایسے میں ایک غیر رومانی نظم اور وہ بھی ترنم کے بغیر۔ پنڈال میں بھنبھناہٹ ابھری' ہم ڈرے کہ یہ مارا گیا' لوگ تالیوں اور سیٹیوں پر رکھ کر اڑا دیں گے' لیکن دوسرے ہی لمحے منظر بدل گیا' پنڈال میں آپریشن تھیٹر کا سا سکوت طاری ہوگیا۔ نظم کے تاثر اور شاعر کی تہ دار و تفکر آمیز آواز نے پانسہ ہی پلٹ دیا ایسا لگتا تھا جیسے

شاعر نے نظم نہیں کوئی منتر پڑھ کر سامعین پر پھونک دیا ہو۔ وہ دائیں جانب گھومتا تو سارے سر اسی جانب گھوم جاتے' وہ بائیں طرف مڑتا تو سب اسی طرح مڑ جاتے۔ ایک لہر سی اٹھی تھی جو پنڈال میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آ جا رہی تھی۔ نظم ختم ہوئی تو سکون ایک دھماکے کے ساتھ ٹوٹا' اتنے سارے لوگوں کی ایک ساتھ تالیوں کی گونج' ایک دھماکہ سی محسوس ہوئی تھی' ہر طرف سے کچھ اور کچھ اور کی آوازیں بلند ہوئیں' شاعر نے معذرت چاہی لیکن مجمع بضد تھا صدارت شوکت تھانوی مرحوم کر رہے تھے جو اس میدان کے تجربہ کار کھلاڑی تھے اور مشاعروں کی فضا کے رمز شناس تھے فوراً سامعین کا موڈ تاڑ گئے اور خود بھی شاعر سے کچھ اور سنانے کی فرمائش کر دی اس بار شاعر نے ترنم سے غزل شروع کی لیکن یہ ترنم اور ہی تھا اس میں کہیں مرکی تھی نہ گٹکری' گلے کی بکھیری کی بجائے سیدھے سادھے لحن میں الفاظ کو توڑے پھوڑے بغیر تلفظ کے ساتھ ادائیگی کا انداز شعر کے معنوی حسن میں اور بھی نکھار پیدا کر رہا تھا۔

اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو
پھر ہیں برق کی نظریں سوئے آشیاں یارو
پھول ہیں کہ لاشیں ہیں باغ ہے کہ مقتل ہے
شاخ شاخ ہوتا ہے دار کا گماں یارو

یہ اس زمانے کے سیاسی حالات کا تاثر تھا جس نے غزل میں ایک اور طرح کی لذت پیدا کر دی تھی۔ سامعین عالم سرشاری میں ایک ایک شعر کو کئی کئی بار سن رہے تھے اور جب یہ شعر آیا

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میر کارواں یارو' میر کارواں یارو

تو جیسے ایک کہرام سا برپا ہو گیا۔ مشاعرے کی چھتیں اڑنے کا محاورہ اس رات سمجھ میں آیا' معلوم نہیں اس شعر کو کتنی بار سنا گیا صبح کو شہر میں اس شعر نے کی بازگشت گونج رہی تھی۔ بس اس مشاعرے کے بعد اندرون سندھ کے مشاعرے اور حمایت علی شاعر لازم و ملزوم ہو گئے۔ حیدر آباد اور سکھر و خاص مرکز تھے' ان کے علاوہ جیکب آباد' خیرپور' لاڑکانہ' نواب شاہ اور وہ کون سا شہر تھا جہاں حمایت علی شاعر بطور خاص نہ بلایا جائے ان کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی۔ ۵۲-۵۳ء میں انہیں مشاعروں کی بدولت ہم نے ان کی طویل نظمیں ان کی زبانی سنیں' منظر پس منظر' غم فردا' ان کہی' چل خسرو گھر اپنے' بنگال سے کوریا تک۔ سنجیدہ حلقوں میں "بنگال سے کوریا تک" نوجوانوں میں "ان کہی" کی دھوم تھی یہ چونتیس سال پہلے کی بات ہے اب تو ان کی شاعری کی آنچ دور دور تک پہنچ رہی ہے۔ ملک و بیرون ملک جہاں بھی مشاعرے منعقد ہوتے ہیں انہیں بلایا جاتا ہے پاکستان' بھارت اور بنگلہ دیش تو گھر کی بات ہے گھر سے باہر مشرق وسطیٰ' یورپ' امریکہ اور کینیڈا کے بہت سے شہروں کی سیر یہ مشاعروں کی سلسلے میں کر چکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ بند نہیں ہوا ہے۔

یہ جو ہم نے حمایت کے ساتھ اتنے شد و مد سے مشاعرے کا تذکرہ کیا ہے تو اس سے کوئی غلط فہمی نہیں پیدا ہونا چاہئے۔ مشاعرے کو ہم بھی شاعری کے کھوٹے کھرے کو پرکھنے کی کسوٹی نہیں سمجھتے نہ اسے شاعر کے مرتبے کے تعین کے لئے کوئی معتبر آلہ جانتے ہیں۔ یہ تو بڑی ظالم چیز ہے۔ شاعر کو بناتی نہیں بگاڑتی ہے' وہ واہ واہ' سبحان اللہ کے بھرے میں آ کر شعر کہنا

بھول جاتا ہے مشاعرے کی مانگ کے مطابق مال تیار کرنے لگتا ہے بالآخر تخلیقی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ حمایت جو مشاعرے کے مقبول و محبوب شاعر ہیں ان پر مشاعرہ اب تک اپنا اثر نہیں ڈال سکا بلکہ یہ خود مشاعرے پر اثر انداز ہوتے آرہے ہیں۔ ثبوت میں ان کے چار مجموعے ''آگ میں پھول' مٹی کا قرض' تشنگی کا سفر'' اور ''ہارون کی آواز'' موجود ہیں جن میں مشاعرہ ٹائپ شاعری کا سراغ نہیں ملتا۔ انہوں نے تو مشاعرے کے شائقین میں صحیح شعری ذوق کے رجحان کی کاشت کے لئے تخم ریزی کی ہے۔ یہ مشاعرے کے سامعین کی خواہشات کے سانچے میں کبھی نہیں ڈھلتے۔ اپنی مرضی کے مطابق انہیں ''بنگال سے کوریا تک'' سمندر اور انسان' ہوا' اندیشہ اور جواب جیسی نظمیں سناتے رہے۔ اس کے باوجود کامیاب ہیں' اس کامیابی کا راز کیا ہے۔ اب یہاں تک آگئے ہیں تو چلئے اس راز کو جاننے کی بھی کوشش کر دیکھیں' ہمارے خیال کے مطابق اس میں تین عوامل کام کررہے ہیں' ایک یہ کہ ان کا طریقہ ترسیل سادہ اور آسان ہے عام فہم زبان میں انہیں اپنے محسوسات و خیالات کا اظہار کا سلیقہ آتا ہے۔ دوسرے یہ ان کی سوچ ذاتی نہیں ہوتی جو احساسات بیان کرتے ہیں ان میں اوروں کے دلوں کی دھڑکنیں بھی شامل ہوتی ہیں انکی خواہشات اور آرزوں کی تشفی کا سامان بھی ہوتا ہے ان کے مسائل اور معاملات بھی موضوع سخن بنتے ہیں تیسری اور آخری بات یہ کہ انہیں جذبے کو لفظ کے قالب میں روح کی طرح اتارنے کی حکمت معلوم ہے' ان سب پر مستزاد ان کی آواز' ان ادائیگی کا انداز ہے۔

پہلی ملاقات کا ذکر تھا۔ حوالے میں مشاعرہ آگیا پھر مشاعرہ چل پڑا اور ملاقات کی بات بیچ میں رہ گئی۔ اب سنئے کہ ہمارے تعلقات کی عمر بھی خیر سے چونتیسواں سال پورا کررہی ہے' ہم نے انہیں دور سے بھی دیکھا ہے اور قریب سے بھی' ان کے منظر میں کوئی فرق نہیں آتا' یہ خوبی یا وصف بہت کم لوگوں میں ملے گا اور آج کی نسل میں تو اس کی تلاش ہی عبث ہے۔

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ

یہ نہایت منظم' خوش وضع' باخلاق اور دردمند آدمی ہیں ان سے ایک مرتبہ مل لیجئے تو ہمیشہ ملتے رہنے پر مجبور ہوجائیں گے' ان کی شخصیت میں ایسا لاسہ ہے کہ اک ذرا آدمی چپکا تو بس چپک کر ہی رہ جاتا.... چھٹ نہیں پاتا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کوئی شاعر انسان بہت اچھا ہوتا ہے لیکن اس کی شاعری اتنی اچھی نہیں ہوتی اور اتفاق سے کسی کی شاعری اچھی ہوتی ہے تو وہ انسان اتنا اچھا نہیں ہوتا' حمایت یہ پالا بھی مار گئے ہیں' حیرت ہے کہ خود بھی اچھے ہیں اور ان کی شاعری بھی اچھی ہے۔ ان میں بڑی انسانیت ہے اور ان کی شاعری میں انسانیت کے گرد ہی حصار باندھتی ہے اور یہ اس لئے ہے کہ ان کے احساسات ان کی فکر' ان کی شاعری ان کی زندگی کا اسلوب ہے۔ یہ زندگی کی طرح شاعری کو بھی پوری توجہ اور ذمہ داری کا مستحق سمجھتے ہیں اور اس حق کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے کی تگ و دو ان کا مشن بن گئی۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی زندگی اور شاعری کا ارتقائی سفر ساتھ ساتھ چلتا ہے انہوں نے جتنی محنت اپنی سماجی حیثیت کو بنانے سنوارنے کے لئے کی ہے اسی قدر جانفشانی سے اپنے فن کی تعمیر و ترقی کے لئے بھی مسلسل منہمک رہے ہیں۔ چنانچہ دونوں حیثیتوں میں ان کی کامیابی کا گراف بڑھا ہے اور بڑھتا ہی جارہا ہے۔

یہ بڑے خوددار' صاحب پندار اور اصول پسند آدمی ہیں' زندگی کے امور ہوں کہ شاعری نظم و ضبط ہر صورت میں برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے معمولات میں بڑی چوکسی اور چابکدستی ہے معمولی بات کو بھی یونہی نہیں ٹالتے اس کے بھی ہر پہلو پر غور

کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مطالعہ کرتے ہوئے کتاب ہی پر اپنے نوٹس قلم بند کرتے جاتے ہیں' ان کی ذاتی لائبریری کی ترتیب و تنظیم کو دیکھ کر رشک آتا ہے' رشک کی بات تو یہ ہے کہ ان کے ہر انداز پر آتا' ادیب و شاعر عموماً "گھریلو معاملات کے سلسلے میں بہت زیادہ ذمہ دار نہیں ہوتے' حمایت کسب معاش کے لئے گھر سے باہر ہی رہے ہیں کبھی لاہور میں فلم سازی و نغمہ نگاری کی خاطر کبھی حیدر آباد اور کبھی مشاعرے کمانے کے لئے ملک اور بیرون ملک کے مختلف شہروں میں' لیکن کہیں بھی گھر کی فکر سے آزاد اور گھر والوں کے خیال سے غافل نہیں رہے۔ جب یہ لاہور میں "لوری" بنا رہے تھے اور ایک ہوٹل میں رہا کرتے تھے ان دنوں میں بھی ان کے ساتھ رہا ہوں' روزانہ دیکھتا کہ یہ صاحب صبح صبح بیٹھے نہایت خشوع خضوع کے ساتھ لکھتے ہوتے۔ دو چار دن تو دیکھتا رہا پھر مجھ سے نہ رہا گیا ایک دن پوچھ بیٹھا "حضرت یہ روزانہ اتنی پابندی سے صبح صبح کیا لکھا کرتے ہیں" مسکرائے اور بولے "یار خط لکھ رہا ہوں" ہم چونکے پوچھا "کیا عشق وشق کا چکر ہے" بولے ہاں ہے تو یہی چکر لیکن بہت مدت ہوئی چل چکا اب اسے نبھانے کا مرحلہ طے کر رہا ہوں' ہم کچھ نہ سمجھ کر چپ ہو گئے' ہمارے تذبذب کو بھانپ کر قہقہہ بلند کیا۔ اور بتایا کہ تمہاری بھابھی کے نام پیغام امروز کے طور پر دن کا آغاز اسی خط سے کرتا ہوں' روٹی کے چکر نے بچوں سے دور لا ڈالا ہے' اس طرح میں انہیں اپنی غیر موجودگی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ بیوی سے گھرداری کے بارے میں تبادلہ خیالات بھی ہوتا رہتا ہے۔ پھر لمبی سانس لے کر کہنے لگے' بچوں کی تعلیم و تربیت کی زیادہ فکر ہے۔ اب دیکھئے ان کے آٹھ بچے ہیں چار لڑکیاں اور چار لڑکے چھ بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں ایک لڑکا نیوی میں لیفٹیننٹ ہے دوسرا انجینئر اور تیسرا ایم ایس سی' تین بیٹیاں ایم اے بی ایڈ اور کالجوں میں پڑھا رہی ہیں' سب سے چھوٹا بیٹا ایم بی بی ایس کے تیسرے سال میں زیر تعلیم ہے اور سب سے چھوٹی بیٹی سیکنڈری کلاسوں میں ہے' ایک بیٹے اور تین بیٹیوں کی شادی کے فریضے سے بحسن و خوبی سبکدوش ہو چکے ہیں' ان باتوں کا شعر و ادب سے بظاہر کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا لیکن حقیقتاً "یہی باتیں' علم و ادب کا معنوی باطن ہوتی ہیں اور انہیں سے شاعر کا ضمیر ترتیب پاتا ہے۔ حمایت علی شاعر کی شاعری اور انکی نثری تحریروں میں جو زندگی ملتی ہے اور اس زندگی کے بارے میں جو غور و فکر پایا جاتا ہے اس میں آپ دیکھئے کہ ان کے اس معنوی باطن کی روشنی کہاں تک پھیلی ہے۔

(مطبوعہ' روزنامہ "کلیم" سکھر۔ گوشہ حمایت علی شاعر۔ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۸۷ء)

(بقیہ لڈو سے الائچی تک۔ مرزا اظفر الحسن)

اس راہ پر چلنا سیکھا۔" لڑکپن میں حمایت نے ہماری انگلی پکڑی اب ہوشیار ہو گئے ہیں اس لئے ہمارے بڑھاپے میں اپنا پہنچا پکڑنے نہیں دیتے۔ ضمنی سبب کے بعد پیار کا اصلی سبب بیان کردوں اور وہ ہے حسین اور قیمتی یادیں جو اس لاڈے کے لڈو والی عمر سے شروع ہوتی ہیں' حمایت کے شعر پر اور حمایت ہی کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔

مری متاع سخن ہے تمہارا سرمایہ
اسے سنبھال کے رکھنا متاع جاں کی طرح

(مطبوعہ غالب' کراچی اپریل جون ۷۵ء)

جذبوں کی آواز اور حمایت علی شاعر

نور الحسنین

(آل انڈیا ریڈیو۔ اورنگ آباد۔ مہاراشٹر)

ہواؤں میں پھر ایک بار کبوتر اڑ رہے تھے اور میری نظریں پاکستان کے عظیم شاعر حمایت علی شاعر کا طواف کررہی تھیں اور ذہن میں وہ منظر ابھر آیا تھا جب میری طفلانہ عمر تھی' طفلانہ فکر تھی اور طفلانہ ذہن تھا۔ پورے تیئیس سال پرانا منظر' وہ منظر جب ایک سفید کبوتر اچانک آسمان کی وسعتوں سے اڑتا ہوا میرے صحن کے ایک چھوٹے سے پودے کے سائے تلے آبیٹھا تھا اور میرے بزرگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بیٹے یہ تمہارے بھائی پاشا ہیں۔ اردو کے بہت بڑے شاعر' پاکستان سے آئے ہیں۔

میں حیرت زدہ نظروں سے بڑے شاعر کی عظمت کو ٹٹولنے کی کوشش ہی کررہا تھا کہ اچانک انہوں نے مجھے اپنے سینے سے چمٹالیا۔ مجھے جھٹکا سا لگا کہ یہ کیسے بڑے شاعر ہیں کیونکہ اسی طفلی عمر میں ایک مشاعرے میں بڑے شاعروں کو میں دیکھ چکا تھا۔ میں سہما سہما اپنی آٹو گراف بک لئے ہر اس بڑے شاعر کی طرف لپکتا اور وہ اسی شان بے نیازی سے آٹو گراف دیتا گویا میں آٹو گراف نہیں بلکہ اپنی سود پر دی ہوئی رقم طلب کررہا ہوں۔

میں سوچنے لگا کیا ایسا بھی بڑا شاعر ہوسکتا ہے جو بچوں سے اس طرح پیار کرے کہ وہ سب کچھ بھول کر اس کے گرویدہ بن جائیں۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ میں بس ہمیشہ حمایت علی شاعر کے ساتھ ہی رہوں۔ پھر میں نے انہیں خاندان کے دیگر افراد سے ملتے دیکھا۔ ہنستے ہوئے دیکھا' روتے ہوئے دیکھا' بچوں کی طرح معصوم باتیں کرتے ہوئے دیکھا' وقت کب ختم ہوا پتہ ہی نہیں چلا اور آخر کبوتر نے پھر ایک لمبی اڑان بھری اور دوبارہ پاکستان چلے گئے' اس رات میں بہت رویا تھا۔

صبح اٹھ کر میں نے اپنے بزرگوں سے پوچھا "جب وہ ہمارے بھائی پاشا ہیں تو پھر پاکستان کیوں چلے گئے؟" میرا یہ طفلانہ سوال بازگشت بن کر بارہا میرے بزرگوں کے احساسات پر بجلی بن کر گرتا رہا۔ یا پھر میرے ہی اندر گونجتا رہا رفتہ رفتہ مجھ پر ان رازوں کا بھی انکشاف ہوگیا کہ آخر حمایت علی شاعر کیوں پاکستان آباد ہوگئے۔

ان کا ذکر' ان کی باتیں' ان کی شرارتیں انکا بانکپن' یہیں آباد رہا۔ کبھی دلوں میں اور کبھی زبان پر۔ اور پھر میرے سامنے حمایت علی شاعر کی ایک ایسی شبیہ ابھر آئی جس میں زندگی سے جدوجہد کرنے کا بھرپور حوصلہ تھا' مردانگی تھی' اپنی راہ کے تعین کرنے کا سلیقہ تھا ناگفتہ بہ حالات سے ٹکرانے کا عزم اور منزل مقصود پر پہنچنے کا یقین کامل وہ میری ذات مین ایسے در آئے کہ میرے آئیڈیل ہوکر رہ گئے۔ اور میں اکثر عالم تصور میں ان کے شب و روز کا مطالعہ کرتا رہتا ان کے حوصلوں کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کبھی جدوجہد اور کبھی خدائے ذوالجلال سے دعائیں مانگتا کہ اے رب جلیل میرے نصیب میں بھی وہ سب کچھ ڈال دے جس کی آگہی میں تپ کر میں حمایت علی شاعر نہ سہی ان کا پرتو ہی بن سکوں۔

حمایت علی شاعر فطری طور پر ایک حساس انسان ہیں محسوسات کی یہی شگفتگی ان کے کلام کو قاری کے دل کی دھڑکن بنادیتی ہے ان کا لہجہ بڑا میٹھا اور اپنائیت سے بھرپور ہے۔

اچھا کیا تو نے مرا گھر ہی ڈھا دیا
یوں بھی یہ اک فریب ہی تھا سنگ و خشت کا

میں سایہ کیے ابر کے مانند چلوں گا
اے دوست جہاں تک بھی رہ گزر جائے
میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اڑ کے ترے دل میں اتر جائے

پاکستان جانے کے بعد شاعر کو زندگی کی حقیقت سے آگاہی ہوئی' وہ جان گئے کہ ماحول اور حالات کیا چاہتے ہیں؟ طے شدہ خدوخال میں پیدا ہونے والے لوگ کہاں تک اپنی حد بندی کر سکتے ہیں' کہاں تک اپنے ہی خاطر اپنے آپ سے الجھتے ہیں۔ شاعر کو زندگی نے حوادث محسوسات' جذبات اور مشاہدوں کی شکل میں جو کچھ دیا تھا وہ شعر کے قالب میں ڈھل گیا اور پھر صفحہ قرطاس پر ایک ایسی سوانح ابھری جس میں ایک تہذیب ایک تاریخ کی مکمل داستان محفوظ تھی۔

یوں ان کی شاعری کو اس چھوٹے سے مضمون میں سمیٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور خصوصاً" میرے جیسے کم مایہ طالب علم کے لئے۔ میں شاعر کے کلام سے اس حصہ کو اس جذبے کے باہر لانے کی کوشش کر رہا ہوں جو کبھی کرب کا ایسا لمحہ ہے جیسے بجلی کا کرنٹ بدن سے چھو جائے اور کبھی ایسا لطیف احساس کہ دماغ میں شہنائیاں گونج اٹھیں۔

جیسے آغوش محبت میں ہمکتی ہوئی ننھی بچی
اپنے بابا کو کسی فکر میں ڈوبا ہوا پا کر' خود بھی
کھیلتے کھیلتے چپ چاپ کسی سوچ میں کھو کر رہ جائے
اور پھر باپ کی پلکوں پہ لرزتا ہوا کوئی آنسو
اپنی بچی کے کھلے پھول سے رخسار پہ گر کے بہ جائے
(مٹی کا قرض)

چل رہے تھے وائپر
کار کا شیشہ مگر شفاف تھا' میں ہنس پڑا
بھیگی آنکھیں پونچھ کر
(ہارون کی آواز)

یہ اور بات' خشک ہیں آنکھیں مگر کہیں
کھل کر برس رہی ہے گھٹا غور سے سنو
(مٹی کا قرض)

زندگانی کا حسیں روپ بھی دیکھو پل بھر
افق ذہن کے اس پار...... جہاں
نیلگوں چرخ کی پہنائی میں
چاند کے پاس ستارہ ہے
جو چپکے چپکے
چاند کی نقرئی باہوں میں سمٹ آیا ہے
(تشنگی کا سفر)

اجنتا کا نظارہ کرنے والو
اجنتا کے بتوں میں کیا رکھا ہے
اجنتا پتھروں کی زندگانی
یہ بستی...... زندگی کا بت کدہ ہے
(آگ میں پھول)

حمایت علی شاعر کا یہ حساس رویہ محض اپنی ذات کے اندر کرب کا مرثیہ نہیں پڑھتا بلکہ وہ عالمی بے اعتباری کا شاکی بھی ہے آج دنیا میں بڑھتی ہوئی خود غرضی' مفاد پرستی اور خوف و ہراس کی فضا محض ہند و پاک کا مسئلہ نہیں ہے۔

سہمی سہمی کھل رہی تھی اک کلی
میں نے پوچھا
کیا خزاں کا خوف ہے
جی نہیں۔ اک دن تو آئے گی
پھر؟
سنا ہے۔ (اس نے چپکے سے کہا)
اس چمن کا باغباں گلچیں بھی ہے

(مٹی کا قرض)

کیا یہ اندیشہ خوف برصغیر کے سیاسی مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے بین الاقوامی سطح پر ضرب نہیں لگاتا؟ امریکہ اور روس جن کے ہاتھوں میں ایک طرف دنیا کی ترقی کی کلید ہے تو دوسری طرف کیا تیسری عالمی جنگ کا سرکش گھوڑا نہیں ہے؟ اس گلچیں باغباں کے خدشے سے آج کون نہیں لرز رہا ہے یہ خوف ایک طرف جہاں زندگی اور زندگی کی مسرتوں کو چھین رہا ہے وہیں سوچنے کے انداز اور اقدار پر کاری ضرب بھی لگا رہا ہے' آج اپنا بھی کوئی بچھڑتا ہے تو لگتا ہے کہ جیسے قیامت کا پیچھا چھوٹا۔

لو یہ اک مژدۂ نو بھی سن لو
میرے زنداں کے نئے دربانو
میرے محبوب سیاست والو
لو یہ ایک مژدۂ نو بھی سن لو
آج اک اور ستارہ ٹوٹا
زندگی کا کوئی پھوڑا پھوٹا
ایک انسان سے پیچھا چھوٹا

(آگ میں پھول)

اور یہی کرب، کہیں حقیقت وجود سے منحرف ہو کر محض مٹی کا کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔

میں تم سے کہتا بھی کیا رفیقو
کہ میں تو خود بھی ہوں ایک کھلونا
جو بیچنے کے لئے سجایا گیا ہے دکان شیشہ گر میں
تمہاری ہی طرح میں بھی صدیوں سے ہوں گرفت نظام زر میں (آگ میں پھول)

میں خواب دیکھوں تو کوئی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دے
قدم اٹھاؤں تو کوئی میرے قدم پکڑ لے
پلٹ کے دیکھوں تو کوئی پیچھے نہ کوئی آگے
بس ایک سایہ
مری حقیقت کا ایک کنایہ
مری حقیقت کہ میں اندھیرے کی رہنمائی میں چل رہا ہوں
ازل سے اک سامری کے سانچوں میں پل رہا ہوں (ہارون کی آواز)

اور کہیں یہی احساس زمانہ فراموشی چیخ اٹھتا ہے

میں چاہ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے
کہ چشم یعقوب تو مرے غم میں کل بھی گریاں تھی
آج بھی ہے (ہارون کی آواز)

لیکن اس کے باوجود شاعر اس زمانہ فراموشی اور اس اندھیرے سے مایوس نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کرب کی طویل رات یا تیسری جنگ کی خوفناک اڑانیں کائنات کو تہس نہس نہیں کرسکتیں۔ زندگی پھر بھی باقی رہے گی۔ ظلم کا کوئی ہیولا ہو یا روشنی کا عظیم ترین ضبح اس خوش فہمی میں نہیں رہ سکتا کہ اس کے بعد اس عالم کا کیا ہوگا۔

سنو یہ حالات زندگانی
سدا تو یوں نہیں رہیں گے
کہ لوگ کب تک ستم سہیں گے
یہ ٹھیک ہے اپنے دیس میں آج زندگی، زندگی نہیں ہے
مگر کوئی ایک دل بھی ایسا ہے جس میں برگشتگی نہیں ہے
یہی ہے اثباتِ زندگانی
(آگ میں پھول)

جذبوں کی یہی تازگی جذبوں کی یہی چمک اور مستقبل سے پرامیدی حمایت علی شاعر کو اردو ادب میں ایک ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتی ہے اور انہیں بقائے دوام کا منصب عطا کرتی ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ ''اورنگ آباد ٹائمز'' حمایت علی شاعر نمبر، مورخہ ۲ جون ۱۹۸۵ء)

تثلیث.........وہ اور میں

قمر اقبال

تین مصرعوں پر مشتمل صنف سخن کو پہلے اردو شاعری میں حمایت علی شاعر نے ''تثلیث'' کا نام دیا تھا اور بعد ازاں احمد ندیم قاسمی کے مشورے پر تثلیث کو ''ثلاثی'' کا نام دیدیا۔ عام طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تثلیث یا ثلاثی اصل میں یہ صنف سخن کس زبان سے اردو میں منتقل ہوئی ہے؟ اس کا بڑا اچھا جواب حمایت علی شاعر نے اپنی ایک تحریر میں دیا ہے کہ ''ہمارے یہاں روش عام ہوگئی ہے کہ ہربات کا جواز اپنے ادب کے بجائے غیر ملکی زبانوں کے ادب میں تلاش کیا جاتا ہے۔'' یہ بڑی مدلل بات ہے موصوف نے اس تعلق سے جاپانی صنف سخن ''ہائیکو'' کا حوالہ دینے والوں سے بڑا اچھا سوال کیا ہے کہ اگر تثلیث یا ثلاثی جاپانی صنف سخن سے آئی ہے تو آزاد نظم لکھنے کا خیال عبدالحلیم شرر کے ذہن میں کہاں سے آیا' اور پھر یہ ن م راشد سے کیوں منسوب ہوگئی اسی طرح سانٹ کا خیال شیرانی کے ذہن میں کہاں سے آیا بلکہ اردو شاعری کی تمام اصناف سخن کہاں سے آئی ہیں؟ اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے حمایت علی شاعر نے تثلیث کو ''ایجاد بندہ'' کہنے والوں سے بڑا معقول سوال کیا ہے کہ کسے یاد ہے کہ رباعی اور غزل کس کی ایجاد ہے اور اس بحث کو انہوں نے یہاں لا کر ختم کیا ہے کہ ایجادیں ہر زبان کے ادب میں ہوتی ہیں اور خود ایجاد کرنے والے ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں جو ان کے بعد زیادہ موثر انداز میں تجربے کو وسعت دینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ آخر میں حمایت علی شاعر نے اس راز سے پردہ اٹھایا ہے کہ ثلاثی کا خیال ان کے ذہن میں کیسے آیا وہ ایک جگہ لکھتے ہیں..........

''ثلاثی کہنے کا خیال میرے ذہن میں رباعی سے آیا۔ رباعی سب سے مختصر اور شاید سب سے مشکل صنف سخن ہے یہی وجہ ہے کہ بہت کم شعراء اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ (اس کی ایک وجہ چند مخصوص بحروں کی پابندی ہے) غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ اکثر رباعیوں میں دوسرا مصرعہ اضافی ہوتا ہے اور محض ہیئت کی پابندی کی خاطر لکھا جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر پہلا مصرعہ ہی ہر طرح مکمل ہو تو دوسرے مصرعے کا احسان اٹھانا نہیں پڑے گا اور خیال بھی کم سے کم الفاظ میں سمٹ آئے گا اس طرح میں نے اپنے تئیں الفاظ کی ''فضول خرچی'' سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔''

مجھے تثلیث یا ثلاثی کے تعلق سے اس قدر تمہیدی و تفصیلی کلمات لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ قارئین تثلیث کی اصلیت سے واقف ہوجائیں۔

میں حمایت علی شاعر کے خیال سے پوری طرح متفق ہوں کہ شاعری میں ''تجربہ'' کے عمل کو ایجاد نہیں کہا جاسکتا کیونکہ پہلے پہل تجربہ کرنے والا ناکام بھی ہوسکتا ہے البتہ جو تجربہ میں کامیاب ہوجاتے ہیں' ایجاد کا صحیح کریڈٹ انہیں ہی جاتا ہے میں نے حمایت علی شاعر کی ثلاثی جب پڑھی تو مجھے یہ تین مصرعوں کا تجربہ اچھا لگا اگر میں اس تجربے سے متاثر نہ ہوتا تو میری تثلیث کا پہلا مجموعہ ''تتلیاں'' شاید چھپ کر اتنی مقبولیت حاصل نہ کرتا۔ میں نے بیشتر ادبی نشستوں اور ادبی جلسوں میں

دیکھتا ہے کہ تثلیث کو نہ صرف دلچسپی سے سنا جاتا ہے بلکہ سننے والے بہت متاثر ہوتے ہیں اور رباعی کی طرح اسے یاد رکھ کے لوگ اشعار کی طرح ایک دوسرے کو سناتے بھی ہیں۔ میں ایک ایسے شخص سے بھی واقف ہوں جسے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن وہ ایک ادبی محفل میں "لایا گیا ہوں" کے بہ مصداق آگئے تھے تو میری تثلیث سن کر بے پناہ متاثر ہوئے تھے بلکہ اب جب بھی ملتے ہیں تو علیک سلیک کے بعد سب سے پہلے میری کوئی تثلیث خود مجھے سناتے ہیں۔ یہ بات میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ تثلیث جیسی مختصر ترین لیکن کامیاب ترین صنف سخن کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکے۔ میں یہاں حمایت علی شاعرؔ سے معذرت خواہ ہوں کہ مجھے تین مصرعوں والی اس صنف کا نام تثلیث ہی زیادہ مناسب و موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ "ثلاثی" میں تثلیث جیسی غنائیت نہیں ہے بلکہ کرختگی ہے میں نے تثلیث میں اپنے طور پر جو کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام تثلیثات ایک ہی بحر میں کہی ہیں یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ کسی نئی صنف سخن کے لئے ایک مخصوص فریم بھی ہونا چاہئے جس سے اس کی انفرادی شناخت ممکن ہوسکے خود حمایت علی شاعر نے میرے مقررہ فریم میں چند تثلیثات پہلے کہیں ہیں مثلاً ان کی ایک تثلیث ہے۔

مجھ سے بہت

شب کو سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

حمایت علی شاعر نے مختلف بحروں میں تثلیث کہی ہے مثلاً" ان کی ایک بحر طویل میں تثلیث ہے۔

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت، تراش لے تو یہی خدا ہے

چونکہ میں تثلیث کی اپنی انفرادی شناخت کا خواہاں تھا کہ وہ رباعی کی طرح ایک ہی فریم میں ہو لہٰذا سب سے پہلے میں نے اپنا راستہ حمایت علی شاعر سے الگ منتخب کیا اور جتنی بھی تثلیثات کہیں ہیں وہ ایک مقررہ بحر ہی میں ہیں اپنی علاحدہ پہچان رکھنے کے باعث ہندوستان میں بھی تثلیث پر نئے شعراء طبع آزمائی کررہے ہیں۔

حمایت علی شاعر اپنی تثلیث کا کوئی ایک عنوان بھی رکھتے ہیں میں نے تثلیث کی تین مصرعوں والی صنف پر عنوان کا بھی رڈالنا مناسب نہیں سمجھا جیسا کہ رباعی کا کوئی عنوان نہیں ہوتا۔ تثلیث کا بلا عنوان و بلا تبصرہ ہونے کے مترادف ہے۔ تثلیث جیسی نازک صنف عنوان سے بھی زیر بار کیوں ہو بلکہ عنوان سے یوں لگتا ہی کہ جیسے تین مصرعوں پر مزید نصف مصرع ٹانک دیا گیا ہو۔

میری تثلیثات کا مجموعہ "تتلیاں" تقریباً دو برس قبل چھپ کر منظر عام پر آیا تھا افسوس کہ اس ایک ہی کاپی حمایت علی شاعر تک پہنچ سکی یہ ان کی محبت ہے کہ انہوں نے اس کاپی کو بھی پاکستانی ادبی حلقوں سے متعارف کروایا۔ "تتلیاں" پر خود تبصرہ لکھ کر چھپوایا اور اس طرح پاکستان بھر میں قمر اقبال کا نام بھی تثلیث کے ساتھ لیا جانے لگا۔ جس کا انکشاف خود حمایت علی شاعر نے اورنگ آباد آکر مختلف ادبی جلسوں میں کیا ہے۔ میں ان کے تعاون کے لئے بہت ممنون ہوں، بہرکیف۔

تثلیث ہو یا ثلاثی اس کا کوئی عنوان ہو یا بلا عنوان ایک بات ہے کہ اس کا کریڈٹ اورنگ آباد ہی کو جاتا ہے کہ میں اور حمایت علی شاعر دونوں ہی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے ہیں۔

مجھے اس بات پر کوئی اصرار نہیں ہے کہ تثلیث کے لئے میں نے اپنے طور پر جو بحر مقرر کی ہے وہی ہو مگر میں اپنی دانست میں اور اپنی حد تک اس بحر کو موزوں سمجھتا ہوں دوسرے یہ کہ میری تثلیث سے متاثر ہو کر میرے بعد آنے والوں نے بھی اس بحر کو اپنی فکر کا محور بنایا ہے۔ لوگ تثلیث کے تعلق سے کہتے ہیں کہ تین مصرعے ہی کیوں؟ سیدھے سیدھے دو مصرعے کا شعر کیوں نہیں! تو مجھے کہنے دیجئے کہ دو مصرعوں کے آگے بھی ایک دنیا ہے اور اب تثلیث محض ایک تجربہ ہی نہیں ہے بلکہ بے پناہ کامیابی کے بعد باضابطہ ایک صنف ادب تسلیم کی جاچکی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میں اپنی حد تک کتنا کامیاب ہوا ہوں تاہم حمایت علی شاعر نے میری تثلیث کو جس انداز میں پسند کیا ہے وہ میرے لئے بڑی بات ہے۔

آخر میں اپنی چند تثلیثات درج کررہا ہوں جو حمایت علی شاعر کی نذر کی ہیں۔ میں نے اپنا چراغ انھی کے چراغ سے جلایا ہے اور روشنی جہاں بھی ہو لوگ اس سے کچھ حاصل کرتے ہیں۔

وہ پڑوسی جو ملک ہوتے ہیں　　کرب سے پاش پاش ہے پانی
ان کے بچھڑے ہوئے سبھی رشتے　　نقش دیکھے کوئی چٹانوں کے
سرحدوں سے لپٹ کر روتے ہیں　　خود بھی اک سنگتراش ہے پانی

خود سے منہ موڑنے سے کیا حاصل　　ہے زمیں پر خدائی سورج کی
گھر کے باہر بھی آئینے ہیں بہت　　اور میں ہوں وہ قطرہ شبنم
آئینہ توڑنے سے کیا حاصل　　پیاس جس نے بجھائی سورج کی

روشنی کون کس کو دیتا ہے　　نور قندیل میں اترتا ہے
شام ہوتی ہے جب تو سورج بھی　　آج کی رات جاگ کر دیکھیں
اپنی کرنیں سمیٹ لیتا ہے　　چاند کب جھیل میں اترتا ہے

آپ اپنا پیام وہ لائے　　پل میں بجھ جائیں پل میں روشن ہوں
کون پیغمبروں کی سنتا ہے　　جھلملاہٹ وہ اس کی آنکھوں کی
اب اگر آئے تو خدا آئے　　جیسے جگنو کنول میں روشن ہوں

یاد ہے وہ فساد کا منظر　　رہ کے خاموش خود کو سمجھا لے
رورہی تھی، گلی میں ایک بچی　　غم کسی کو بھی حادثے کا نہیں
اپنی گڑیا کو گود میں لیکر　　سب ہیں تفصیل پوچھنے والے

ساتھ رہ کر جدا سمجھتی ہے　　صبح دم گھر سے بھاگنے والے
چھین لوں جسم کا لباس ابھی　　کیسے بیدار ہوں گے سن کے اذاں
زندگی خود کو کیا سمجھتی ہے　　سائرن سن کے جاگنے والے

(مطبوعہ روزنامہ "اورنگ آباد ٹائمز" حمایت علی شاعر نمبر مورخہ ۲ جون ۸۵ء)

قمر اقبال کی تتلیاں

حمایت علی شاعر

۱-۱-۸۵

پاکستان میں جب اہل ادب مجھ سے پوچھیں گے کہ تم جدید دکن سے ہمارے لئے کیا لائے ہو؟ تو میں بڑی مسرت اور فخر کی ساتھ ان کی خدمت میں قمر اقبال کی "تتلیاں" پیش کروں گا سرسید نے ایسی ہی بات عالم بالا کے حوالے سے مولانا حالی کے مسدس کے بارے میں کہی تھی۔ لیکن قمر چونکہ "مولانا" نہیں ہے صرف ایک شاعر ہے' اس لئے قصہ زمیں' بر سر زمیں ہی رہے تو اچھا ہے۔ قمر اقبال نے ان تتلیوں کا تعاقب میری فرمائش پر نہیں کیا اس لئے میں پاکستانی اہل ادب سے یہ تو نہیں کہوں گا کہ صاحبو! یہ "ثلاثیاں" میں قمر اقبال سے لکھوا لایا ہوں.......... ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ جس صنف سخن کی میں نے آبیاری کی' قمر کی شاعری میں وہ پھول پھول لے آئی' اور اب ادب کی پھلواری میں جو خوبصورت "تتلیاں" اڑتی نظر آرہی ہیں وہ قمر اقبال کے خون جگر کی نمود ہے جو کسی معجزہ فن کے امکانات کا بھی سراغ دے سکتی ہے۔ قمر نے ان مختصر ترین نظموں کو ابھی تک "تثلیث" کا نام دے رکھا ہے جبکہ عرصہ ہوا میں نے علامہ نیاز فتح پوری' حضرت اثر لکھنوی اور احمد ندیم قاسمی کے مشورے سے اس صنف سخن کا نام "تثلیث" سے بدل کر "ثلاثی" کردیا ہے اور اب یہی نام اس کا مقدر بن چکا ہے۔

میں قمر اقبال کو مشورہ دوں گا کہ وہ بھی یہی نام اپنالیں' یہ مشورہ اس روایت پسندی کے جذبے سے دے رہا ہوں جس نے ان کی اور خود میری شاعری کو بے مہار ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ روایت' مغربی ادبیات سے مستعار ہو کر مشرقی ادب کے تسلسل میں سانس لے رہی ہو تو اظہار کی تہذیب میں تاریخی کردار ادا کرتی ہے۔ ایلیٹ کے الفاظ میں 'ادب میں جدت کی کونپل' حال اور ماضی کی اسی ارتباط سے پھوٹتی ہے۔ اردو ادب کا تابندہ مستقبل بھی' میرے خیال میں اس متوازن ربط میں پوشیدہ ہے۔ قمر اقبال "ثلاثی" کہہ رہے ہوں کہ غزل۔ ان کی شاعری میں یہ توازن موجود ہے۔ وہ جدید شاعر ہونے کے باوجود روایت کی تہذیبی برکتوں سے محروم نہیں ہیں۔ وہ روایت کی توانا لہروں کو اپنی بانہوں میں لئے' وقت کی منجدھار پر اپنا ادبی سفر طے کررہے ہیں۔ "تتلیاں" کا آغاز اس "ثلاثی" سے ہوتا ہے۔

تھے عجب کرب و اضطراب میں ہم
خود کو لفظوں میں منتقل کرکے
سو گئے چین سے کتاب میں ہم

یہ نیند اس تخلیقی آسودگی کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہر اچھے شاعر اور سچے فنکار کو وقتی طور پر نصیب ہوتی ہے مگر جیسے ہی آنکھ کھلتی ہے۔ کرب و اضطراب کا ایک نیا عالم جنم لیتا ہے اور پھر نئی تخلیق تک فن کار کو چین نصیب نہیں ہوتا' قمر اقبال بھی کرب و آسودگی کے اس عمل سے دوچار رہتے ہیں' اور یہی کشمکش اس کے تخلیقی مستقبل کی ضامن ہے اور یہ مستقبل مجھے بہت روشن دکھائی دے رہا ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ "اورنگ آباد ٹائمز" حمایت علی شاعر نمبر مورخہ ۲ جون ۱۹۸۵ء)

حمایت علی شاعر کینیڈا میں

پروفیسر عبدالقوی ضیاء

(لارنیشن یونیورسٹی - سڈبری - کینیڈا)

(ماخوذ۔ مشاہیر ادب' کینیڈا میں - عبدالقوی ضیاء)

سننے میں آیا ہے کہ حمایت صاحب کراچی پریس کلب کی کسی ادبی تقریب میں شرکت کے لئے پہنچے تو ان کے ایک قریبی دوست نے ان کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "ارے حمایت صاحب! آپ یہاں کیسے؟ بتایئے کب تشریف لائے اور کب تک قیام کا ارادہ ہے؟" حمایت صاحب مسکراتے ہوئے بولے "ارے بھائی! میں تو اسی شہر میں رہتا ہوں کراچی تو میری مستقل رہائش گاہ ہے۔"

"اچھا یہ کب سے" وہ صاحب بولے......

"This is a news to me" میرے لئے یہ ایک تازہ خبر سے کم نہیں"

کہا جاتا ہے کہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہئے مگر حمایت علی شاعر کے تعلق سے حقیقت یہی ہے کہ وہ جہانیاں جہاں گشت ہیں کبھی وہ ناریک براعظم کے جنوبی حصہ میں ہیں اور اردو زبان کی توسیع و اشاعت کی خاطر گئے ہوئے ہیں تو کبھی وسط ایشیا میں مارے مارے پھر رہے ہیں کبھی ناروے میں بیٹھے ہیں تو کبھی سویڈن میں۔ آج برطانیہ میں ہیں تو کل مسقط یا دبئی یا دوحہ میں اور اگر وہاں نہیں گئے ہیں تو ہندوستان یاترا کر رہے ہیں۔ اور اگر ان مقامات کی سیر سے ان کو فرصت ملی تو شمالی امریکہ اپنے دوستوں کی دعوت پر آگئے اور پھر جو ایک بار وہ یہاں تشریف لائے تو یہ علاقہ ان کو ایسا پسند آیا کہ اسے وہ اپنا وطن ثانی سمجھنے لگے۔ خدا کرے کہ وہ کینیڈا اور امریکہ کو ہمیشہ ایسا ہی سمجھتے رہیں۔

حمایت سے میری ملاقات اس صدی کی پانچویں دہائی کے اوائل میں ہوئی تھی جب وہ حیدر آباد سندھ کے کسی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے اور میں وہاں سٹی کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہا تھا اس کے بعد جب اس شہر میں ریڈیو پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو وہ وہاں مستقلاً" اس ادارے سے منسلک ہوگئے اتفاقاً" ریڈیو اسٹیشن میرے گھر کے سامنے ہی تھا لہٰذا ان سے کسی نہ کسی بہانے روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقات دوستی اور پھر دوستی بھائی چارے میں بدل گئی حتیٰ کہ کچھ دنوں بعد یہ امتیاز بھی مشکل ہوگیا کہ وہ دوست زیادہ ہیں یا بھائی۔ لیکن میں ان کو دوست ہی سمجھتا رہا کہ "دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت" بھائی سب بن جاتے ہیں مگر دوست بننا اور پھر دوستی نبھانا ذرا مشکل امر ہے۔ ۱۹۶۰ء میں پاکستان چھوڑا اور امریکہ بغرض تعلیم چلا آیا اور اس وقت تک ہمارے تعلقات نشیب و فراز کے باوجود قائم رہے اور آج تک قائم ہیں۔

میرے امریکہ آنے کے بعد ان سے کچھ دنوں خط و کتابت کا سلسلہ چلا پھر وہ بھی منقطع ہو گیا مگر دلوں میں جو گنجائش نکل آئی تھی اور جگہ پیدا ہوئی تھی وہ اسی طرح قائم رہی۔ پانچ سال بعد جب میں کراچی گیا تو اتنی مصروفیت تھی کہ باوجود کوشش کے حمایت سے ملاقات نہ ہوسکی اور جب وہ ۱۹۸۱ء میں کینیڈا تشریف لائے تو میں آفیسر ریسرچ گرانٹ کے تحت عازم ہندوستان ہوچکا تھا۔

کینیڈا میں اردو بولنے والوں کی تعداد کچھ ایسی زیادہ تو نہیں ہے مگر یہاں کی آبادی کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسی کم بھی نہیں ہے۔ جب میں یہاں پہنچا ہوں تو ہندوستانی پاکستانی ملا کر لگ بھگ ۲۰ ہزار ہوں گے۔ مگر اب یہ تعداد اس سے چھ سات گنا زائد ہے قطع نظر اس کے کہ جنوبی ایشیا سے ہجرت کرنے والے اور اس ملک میں بس جانے والوں کے اغراض و مقاصد کیا تھے یا اب کیا ہیں؟ مگر ایک مقصد واحد ہے اور وہ ہے اپنی زبان کی خدمت اور اپنی ثقافت کا تحفظ۔ اس مقصد کے تحت تمام اردو بولنے والے چاہے وہ ہندوستان سے آئے ہوں یا پاکستان سے یا برطانیہ یا دنیا کے کسی اور حصے سے ایک جھنڈے کے نیچے کھڑے ہوگئے ہیں اور خدمت اردو ان سب کا نصب العین بن گیا ہے۔

کینیڈا کے معاشرے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ مختلف تارکین وطن جن کے دم قدم سے یہاں کی ثقافتی زندگی میں ایک تنوع اور رنگا رنگی پیدا ہوگئی ہے وہیں ان کے اندر ایک ادارے نے بھی جنم لیا ہے کہ اگر وہ اپنے ادب و زبان و تہذیب کی خدمت سے غافل رہے تو کینیڈین معاشرے میں گھل مل جائیں گے اور اپنی انفرادیت اور شناخت کھو بیٹھیں گے۔ اس اعتبار سے یہاں کی زندگی امریکی طرز معاشرت سے ذرا مختلف ہے۔ وہ تمام تہذیبوں اور زبانوں کا Melting Pot ہے اور کینیڈا ان سب کا خوبصورت اور خوشنما Mosaic یا امتزاج ہے۔ یہاں سو سے زائد مختلف رنگ و نسل اور تہذیبوں کے گروہوں نے بود و باش اختیار کرنے کے بعد اس ملک کی کثیر الثقافتی زندگی میں گراں قدر اضافہ کیا ہے اور اس کو متنوع اور مضبوط بنایا ہے اس عنوان سے کینیڈا کی ثقافت کا ایک اہم عنصر یہی ہے کہ خود اس کی انفرادی تہذیب نہیں ہے بلکہ وہ مجموعہ اضداد ہے۔ مختلف النوع ثقافتی اور تہذیبی اقدار کا اور اسی بات پر کینیڈا والوں کو ناز ہے۔

وہ تمام باشندے جو انٹاریو میں آکر بسے ہیں ان میں سے نصف لوگوں نے رہائش ٹورنٹو جو اس صوبہ کا صدر مقام ہے' وہاں اختیار کی ہے۔ جنوبی ایشیاء سے آئے ہوئے لوگ بھی زیادہ تر یہیں پڑے ہیں اور اس اعتبار سے یہ شہر اس برصغیر کی ثقافت کا مرکزی مقام بن گیا ہے۔ اردو کی ترویج اور نشو و نما میں سب سے بڑھ چڑھ کر اسی شہر کے اردو بولنے والوں نے حصہ لیا ہے۔ یہیں سب سے پہلے اردو اخبارات نکلے۔ نت نئی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا۔ یہیں جشن فیض منایا گیا' یوم اقبال' یوم حالی' یوم سرسید اور یوم قائد اعظم محمد علی جناح بھی۔ یہیں سے ٹی وی پر اردو کے پروگرام نشر ہوئے اور یہیں سے ریڈیو پر غزلیں' قوالیاں' گیت اور نظمیں بھی گائی گئیں یا پڑھی گئیں۔ دیکھتے دیکھتے اس شہر کو اردو کے تعلق سے مرکزیت حاصل ہوگئی اور اس کا شمار دوسرے شہروں کے مقابلے میں ایسا ہی ہونے لگا جیسے کوہ نور ہیرا دوسرے ہیرو کے مقابل میں

حکومت کینیڈا کے اعداد و شمار کے مطابق ٹورنٹو میں اردو بولنے' سمجھنے اور لکھنے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زائد ہوگی جس میں ۶۰ ہزار کے لگ بھگ ہندوستانی ہوں گے یا پاکستان یا ویسٹ انڈیز کے باشندے ہیں ان سب نے مل کر اردو زبان کی خدمت اور اس کی مقبولیت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کا تذکرہ اس مضمون میں ممکن نہیں۔ اس کے لئے علیحدہ ایک مضمون درکار ہے جو میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ چکا ہوں بہرکیف یہاں کے لوگوں نے ہندو پاک سے

موسیقاروں کو بھی بلایا' فنکاروں کو بھی' اداکاروں کو بھی اور ادیبوں اور دانشوروں کو بھی' اور پھر ایک بار جو یہ سلسلہ چلا تو آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں فیض احمد فیض تشریف لائے ۱۹۸۰ء میں ہندوستان سے شعراء اور ادباء کا ایک پورا قافلہ جس میں علی سردار جعفری' اخترالایمان' کیفی اعظمی' واجدہ تبسم' مینا قاضی' بیکل اتساہی' عزیز قیسی' حسن کمال وغیرہ شامل تھے۔ جناب حفظ الکبیر قریشی اور ان کی قائم کردہ اردو سوسائٹی کی دعوت پر یہاں پہنچا اور پھر ٹورنٹو کے علاوہ ملک کے دوسرے شہروں کا بھی دورہ کیا۔

اسی سال یعنی ۱۹۸۰ء میں فیڈریشن آف پاکستانی کینیڈینز کا قیام عمل میں آیا جس کے کرتا دھرتا سلطان اختر تھے اور جس کی تحفظ ثقافت (Cultural Heritage) کمیٹی کے صدر اطہر رضوی تھے۔ انہوں نے پاکستان سے شاعروں کو مدعو کرنے کا پروگرام بنایا اور اس سلسلے میں وہ کراچی تشریف لے گئے جہاں حمایت صاحب نے ان کی تجویز پر لبیک کہا اور پھر دونوں نے مل کر پورے پروگرام کو ترتیب دیا اور کن کن شاعروں کو بلایا جائے' یہ فہرست بھی مرتب کی۔ مجھ تک حمایت کا سلام بھی اطہر رضوی کے ذریعہ پہنچا اور ان کا یہ پیغام بھی کہ وہ کینیڈا آنے کا قصد رکھتے ہیں میری آنکھیں نہ جانے کب سے ان کو دیکھنے کے لئے ترس رہی تھیں مگر جب وہ آئے تو میں ملک سے باہر تھا۔

حمایت کے ساتھ آنے والوں میں جمیل الدین عالی' قتیل شفائی' ضمیر جعفری' پروین فنا سید اور صہبا اختر شامل تھے ان تمام پاکستانی شعراء کا کینیڈا آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ ان سب نے یہاں کے بارے میں سن تو بہت کچھ رکھا تھا (کچھ اچھا' کچھ برا) مگر اب جو وہ یہاں آئے تو ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اردو کی قدر و قیمت اس دیار میں برطانیہ سے کچھ کم نہ تھی بلکہ بعض اعتبار سے زیادہ ہی تھی ممکن ہے کہ اشاعت اردو کا کام یہاں اس شد و مد سے نہ ہو رہا ہو جتنا کہ برطانیہ میں یا وہ مواد اور Primary Sources یہاں قابل حصول نہ ہوں جتنے کہ لندن میں ہیں مگر مشاعروں میں شرکت کرنے والوں کی تعداد' شائقین کا اژدہام' شعرائے کرام کی تواضع نجی محفلوں اور نشستوں کا انعقاد' ضیافتیں' ملاقاتیں آٹوگراف لینے والوں کا مجمع' یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ جن کی انہیں توقع نہ تھی اور پھر سب سے بڑھ کر ان حضرات کو جو خلوص' جو محبت اور یگانگت ملی اس نے ان لوگوں کے دلوں میں ایسی جگہ پیدا کی کہ ان میں سے اکثر بار بار آئے اور ان بار بار آنے والوں میں جمیل الدین عالی اور حمایت علی شاعر پیش پیش تھے۔

یہاں کے محبان اردو کے لئے بھی یہ پہلا اتفاق تھا کہ پاکستان کے اتنے عظیم المرتبت شعراء کینیڈا تشریف لا رہے تھے۔ نہ ان کی خوشی کی کوئی انتہا تھی اور نہ ان کی مسرت کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ حکومت کینیڈا کی مالی اعانت بھی ان لوگوں کی تشریف آوری میں شامل تھی اور اس لحاظ سے وہ سب یہاں کے چار اداروں کے مہمان تھے۔ ۱۔ حکومت کینیڈا' ۲۔ پاکستانی فیڈریشن' ۳۔ پاکستانی تارکین وطن' ۴۔ محبان اردو۔

ان چار عناصر نے مل کر نہ صرف شعرائے کرام کو خوش آمدید کہا بلکہ قدم قدم پر ان کے لئے دیدہ دل فرش راہ کر دیئے تھے۔ ان سب کے ٹھہرنے کا انتظام ایک اعلیٰ ہوٹل میں کیا گیا تھا اور ان کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا گیا تھا۔

۸ اگست ۱۹۸۱ء کی شام کو ایک شاندار آڈیٹوریم میں ان شاعروں کے اعزاز میں محفل شعر و سخن سجائی گئی۔ اس کی صدارت عالی صاحب نے فرمائی اور نظامت کے فرائض اطہر رضوی نے انجام دیئے۔ ہاں مشاعرہ شروع ہونے سے قبل ہی

ٹھساٹھس بھر گیا تھا۔ پرستاران عالی و حمایت جوق در جوق وہاں پہنچے تھے جنہوں نے داد سخن بھی دی اور سخنوروں کی ہمت افزائی بھی کی۔ مشاعرہ رات گئے تک چلتا رہا مگر سننے والوں کے شوق کی تسکین نہ ہوئی اگر یہ محفل کئی دن اور کئی راتیں یونہی جاری رہتیں تو جاں نثاران اردو اسی طرح کرسیوں پر جمے رہتے واہ واہ کے نعرے لگاتے رہے اور شاعران کرام کا دل بڑھاتے رہے۔

۱۰ اگست کو فیڈریشن والوں نے ایک سمپوزیم کا انتظام ٹورنٹو میں کیا۔ اس کا موضوع تھا "اردو ادب کے جدید رجحانات" اس میں حصہ لینے والوں میں مقامی حضرات کے علاوہ حمایت علی شاعر اور جمیل الدین عالی تھے۔ حمایت جس موضوع پر بولے اس کا عنوان تھا "ترقی پسند ادب ۔ تنظیم اور تحریک" پورا مذاکرہ نہایت کامیاب رہا۔ فکر انگیز مقالے پیش کئے گئے خیال افروز تقریریں ہوئیں۔

حمایت نظم ہو یا نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کو اپنا پورا کلام حتیٰ کہ "بنگال سے کوریا تک" جیسی طویل نظم بھی زبانی یاد ہے۔ ان کا حافظہ ایسا غضب کا ہے کہ اس پر رشک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ خدا نے ان کی آواز میں وہ سوز، وہ نغمگی عطا کی ہے کہ جب وہ اپنا کلام مشاعروں میں ترنم سے پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے شعلہ سا لپک گیا ہو۔ سننے والے سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں وہ گھنٹوں شعر پڑھتے رہتے ہیں اور گھنٹوں پورے ذوق کے ساتھ ان کا کلام سنتے رہتے ہیں حمایت تھک کر ہتھیار ڈال سکتے ہیں۔ سننے والوں کے شوق میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی۔

تقریباً یہی حال ان کی تقاریر کا ہے وہ جب بولتے ہیں تو کبھی موضوع سے باہر نہیں جاتے۔ اصل موضوع سے نہیں ہٹتے۔ بے معنی باتیں نہیں کرتے بغیر شواہد و اسناد گفتگو نہیں کرتے اور یہ شواہد ان کے نوک زباں پر اس طرح رکھے ہوتے ہیں جیسے انہیں کے تحریر کردہ ہوں ان کو میں نے کئی ادبی جلسوں میں مختلف موضوعات پر بولتے سنا اور مجمع کو حیرت زدہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے طرز بیان سحر انگیز، طرز تکلم مسحور کن، چاہے ڈرامہ ہو یا ناول، تنقید نگاری ہو یا شعر و شاعری، ان سے ذرا بات چھیڑ کر دیکھئے پھر دفتر کا دفتر کھل جاتا ہے۔ وہ ادب کی مختلف اصناف پر ایک گہری نظر رکھتے ہیں۔ بات سمجھ بوجھ کر کرتے ہیں۔ دوسروں کے ذہنی افق کو مد نظر رکھ کر کرتے ہیں۔ جیسی محفل، ویسا ہی موضوع سخن، وہ کور ذوقوں کے درمان جواہر پارے نہیں بکھیرتے اور اعلیٰ معیار اور سخن دانوں کے بیچ یاوہ گوئی نہیں کرتے۔ بات سوچ سمجھ کر اور مجمع کا ذوق سمجھتے ہوئے کرتے ہیں۔ اس عنوان سے وہ مردم شناس بھی ہیں اور سخن شناس بھی۔

میں نے حمایت کو ایک ایسی محفل میں بھی تقریر کرتے سنا ہے جس میں ان کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ بھی ذاکرین کی فہرست میں شامل ہیں مگر جب وہ بولنے کھڑے ہوئے تو سننے والوں کو یہی محسوس ہوا کہ جیسے وہ اس موضوع کی تیاری پر مہینوں سے لگے ہوئے تھے اور حیرت میں ڈالنے والی بات یہ تھی کہ جو لوگ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے ان کی تقریر نہ میں وہ Substance تھا اور نہ طرز ادائیگی میں وہ کونفنس جو حمایت کی تقریر میں تھا۔ ۱۰ اگست کے مذاکرے میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کی ابتداء سے چالیس، پینتالیس سالہ سرگزشت کہ وہ اس عرصہ میں کس طرح فعال اور متحریک رہی ہے مختصر انداز میں تجزیہ کر ڈالا یہ تجزیہ مدلل بھی تھا اور بامعنی بھی۔

۱۱ اگست کو شعراء کرام کا یہ قافلہ اٹاوا پہنچا، جہاں فیڈریشن کے صدر سلطان اختر خود سب کو خوش آمدید کہنے کے لئے بہ نفس نفیس موجود تھے۔ اسی دن شام کو یونیورسٹی آف اوٹاوا کے کرنل بائی ہال میں بزم شعر و سخن سجائی گئی یہاں شائقین

کی تعداد اس قدر تو نہ تھی جتنی کہ ٹورنٹو میں کہ یہاں صرف وہی لوگ آباد ہیں جو سرکاری دفاتر میں کام کرتے ہیں یا نیم سرکاری اداروں سے وابستہ ہیں۔ مگر جتنے بھی ہیں وہ صاف ستھرے قسم کے لوگ ہیں۔ علم کے پرستار، فن کے قدر داں، اس نکتے سے واقف کہ زبان اور ادب کی بقا اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم اپنی تہذیب کی بقا کا خیال رکھیں۔ بہتوں نے مغربی روایات کو اپنالیا ہے اکثر نے اس کو رد بھی کردیا ہے مگر دونوں صورتوں میں ان کے تمدنی تصورات، ان کی اپنی سرزمین سے گہری وابستگی رکھتے ہیں ماضی کی روایات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا نہیں جاسکتا اور انگریزی سے رغبت کا اظہار کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اردو سے سارے رشتے توڑ دیئے جائیں چنانچہ وہ سب اردو کی چاہت میں اور شعراء سے ملاقات کی خواہش میں مشاعرہ گاہ پہنچے اور بقدر ظرف داد سخن دی۔ اوٹاوا سے رخصت ہوکر یہ مشاہیر مانٹریال کی جانب رواں دواں ہوئے۔

مانٹریال میں کئی اردو انجمنیں ہیں مثلاً بزم اردو ادب کے شانہ بشانہ 'پاکستان کینیڈا ایسوسی ایشن' کیوبک، وغیرہم قائم ہیں یہ سب اردو زبان اور ادب کی نشو و نما کے جذبے سے سرشار ہیں۔ اس بار شاعروں کو مدعو کرنے کا سہرا علی عباس حسنی کے سر جاتا ہے۔ جو بعد میں ایسوسی ایشن کے صدر بھی منتخب ہوئے اردو بولنے والوں کی تعداد یہاں بھی ٹورنٹو والوں کے مقابلے میں کم ہے مگر اوٹاوا سے زیادہ ہے اور پھر کون شاعری کا دلدادہ ہوگا کہ جو سید ضمیر جعفری، جمیل الدین عالی، حمایت علی شاعر، قتیل شفائی، صہبا اختر، پروین فنا کا کلام سننے نہ جائے گا یہ مواقع روز بروز کہاں آتے ہیں چنانچہ یہی ہوا کہ لوگ جوق در جوق پہنچے۔ مشاعرہ جما اور خوب جما، حمایت کا رنگ بھی چمکا اور صہبا اختر کا رنگ بھی چوکھا آیا۔ لوگ سنتے رہے اور داد سخن دیتے رہے پھر بھی نہ ان کے ذوق کی پوری تسکین ہوپائی اور نہ ہی تشنگی مٹی۔

مانٹریال میں کسی نجی محفل کا انتظام اس وجہ سے ممکن نہ تھا کہ ڈیٹرائٹ (Detriut) جو امریکی شہر ہے، وہاں ۱۴ اگست کو پاکستان ڈے منایا جارہا تھا اور اس میں ان حضرات کی شرکت متوقع تھی چنانچہ دوسرے دن یہ لوگ مانٹریال کو خیرباد کہہ کر ڈیٹرائٹ پہنچے یوم پاکستان کی تقریب میں بھی شرکت کی مشاعرہ بھی پڑھا اور صبح ہی صبح شکاگو کے لئے روانہ ہوگئے کہ ۱۶ اگست کی شب کو وہاں مشاعرہ منعقد ہونا تھا یہاں عزیز قیسی کے بھائی احمد خان میزبان بھی تھے اور مشاعرے کے منتہمم بھی۔

شکاگو صوبہ Illinonis کا صدر مقام ہے۔ انتہائی پرکشش اور جاذب نظر ایک ہی شہر میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں اور یونیورسٹی آف شکاگو میں اردو کی چیئر بھی ہے اور اعلیٰ سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام بھی۔ چوہدری محمد نعیم یہاں اردو کے پروفیسر ہیں جو Journal of Urdu Studies بھی نکالتے ہیں اور بحیثیت نقاد ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اردو کے تعلق سے معیاری کانفرنسیں، کنونشن، جلسے اور مشاعرے زیادہ تر یہیں منعقد ہوتے ہیں۔ اس شہر میں متعدد میوزیم اور Observatories ہیں اور یہ سائنسی علوم کا مرکز ہیں افسوس کہ شعراء حضرات کو اس شہر کو دیکھنے اور سمجھنے کا پورا موقع نہیں ملا کہ اب ان سب کو پھر کینیڈا واپس لوٹنا تھا اور ایڈمنٹن، کیلگری وغیرہ جانا تھا۔ ایک تو وہ مشاعروں میں دیر تک جاگنا اور پھر دوسرے دن لمبے سفر پر روانہ ہونا دوسری جگہ پہنچ کر کمر بھی سیدھی کرنہ پاتا کہ کسی نشست یا مشاعرے میں شرکت کے لئے چل کھڑے ہونا، ذرا تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ تھکادینے والی بات تھی، اکتاہٹ پیدا کرنے والا سلسلہ تھا۔ یہ انہیں شعراء کرام کا دل گردہ تھا کہ ان تمام صعوبتوں کو برداشت کرنے، تھکن سے چور چور ہونے کے باوجود ایک مشاعرے کے بعد دوسرا مشاعرہ پڑھنے کے لئے تیار ہوجاتے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنے شائقین کو دل گرفتہ نہیں دیکھنا چاہتے اور اردو کے پرستاروں کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ایڈمنٹن جو صوبہ البرٹا کا صدر مقام ہے وہاں اردو بولنے والوں کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے۔ یہ شہر کینیڈا کے مغرب میں واقع ہے یہاں Rockie Mountains کا سلسلہ قدرتی حسن کا اعلیٰ نمونہ ہے ہزاروں کی تعداد میں سیاح اس حصے کو دیکھنے آتے ہیں۔" ڈاکٹر ژواگو" فلم کی شوٹنگ زیادہ تر اسی علاقے میں ہوئی تھی' سارے صوبے کی آبادی چھدری چھدری ہے۔ اسی اعتبار سے ہندوستانی' پاکستانی بھی وہاں زیادہ تعداد میں نہیں ہیں مگر جتنے بھی ہیں وہ صاحب علم' صاحب فہم و فراست' اردو کے دلدادہ' اچھی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ یہیں ڈاکٹر عبدالخالق نے جو ماہر امراض کینسر تھے اور جن کا انتقال ۸ جنوری ۱۹۸۹ء کو ہوگیا' اردو سوسائٹی بنائی تھی اردو لائبریری کی بنیاد رکھی تھی اور سال بہ سال نہایت شاندار طریقہ پر مشاعرہ کا اہتمام کرتے تھے۔ ڈاکٹر سلیم قریشی اور ان کی بیگم ریگولا جو سوئس نژاد ہیں یونیورسٹی آف البرٹا میں پروفیسر ہیں۔ سلیم' ڈین آف سوشل سائنسز بھی رہ چکے ہیں' متعدد کتابوں اور مقالوں کے مصنف ہیں' ریگولا نے تصوف کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ علم موسیقی سے ان کو دلی شغف ہے۔ خود ستار بھی بجاتی ہیں اور غالب' آتش' داغ' کی غزلیں بڑے پیارے انداز میں سناتی ہیں۔ ان کے علاوہ کشور غنی' چوہدری گلزار احمد' ڈاکٹر محمد تقی وغیرہ اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں یہیں ۱۸ اگست کو البرٹا میوزیم کے آڈیٹوریم میں بزم شعر و سخن سجائی گئی۔ یہاں سب ہی شاعر کامیاب رہے مگر سچ پوچھیے تو حمایت اور صہبا اختر نے مشاعرہ لوٹ لیا دوسرے دن یہ سب کے سب عازم کیلگری ہوئے جو ایڈمنٹن سے ۲۵۰ میل مغرب کی جانب واقع ہے اور پھر وہاں مشاعرہ نپٹا کر ۲۰ اگست کو وینکوور (Vancouver) کی محفل میں شرکت فرمائی۔

وینکوور شہر اسی نام کے جزیرے پر آباد ہے' نہایت ہی حسین و جمیل شہر ہے' مغربی ساحلی علاقے پر بسا ہوا یہ شہر کشمیر کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے' جزیرے کے مغرب میں بحرالکاہل (Pacific Ocean) ٹھاٹھیں مارتا ہے' اپنی دلکشی کی وجہ سے یہاں ہالی ووڈ کے بہت سے اداکاروں نے اپنے بنگلے اور Summer Resort بنوائے ہیں۔ یہاں کے بسنے والے عموماً" لکھ پتی اور کروڑ پتی ہیں ہمارے شاعروں نے یہاں مشاعرہ میں پڑھا اس کے بعد کشتی کے ذریعے وہ جزیرہ وکٹوریہ بھی گھومنے گئے اور قدرتی عجائبات کا وہاں نظارہ کیا۔ وکٹوریہ شہر کینیڈا کی حد آخر ہے۔ شاعر حضرات وہاں سے چلے تو پھر عازم امریکہ ہوئے لاس انجیلز' بوسٹن' نیویارک' ہوتے ہوئے واپس اپنے وطن کو۔

مجموعی طور پر شعراء پاکستان کا یہ سفر کامیاب بھی رہا اور دلچسپ بھی۔ ان کی آمد نے یہاں کے بسنے والوں کے دلوں میں اپنے وطن کی یاد تازہ کردی' اردو کے لئے مزید چاہت پیدا کردی اور خدمت اردو کا جذبہ فزوں تر کردیا۔ جانے کو وہ لوگ واپس چلے گئے مگر زبان اور ثقافت کی ترویج و اشاعت کے لئے غیر دانستہ طور پر اتنا کچھ کر گئے جس کا اظہار آسانی سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد یہاں کے اردو پروگراموں میں گرانقدر اضافہ ہوا۔ ریڈیو' ٹی وی پر ان کی آواز گونجنے لگی۔ اخبارات اور جرائد پوری شان و شوکت سے نکلنے لگے۔ مشاعروں اور مذاکروں کا ایسا چلن شروع ہوا کہ ہر سال میں کئی بین الاقوامی مشاعرے یا سمپوزیم ہونے لگے اور اس طرح اردو کی دھوم جو پہلے ہی سب جگہ تھی اب کینیڈا میں بھی ہوگئی۔

۱۹۸۵ء میں جب "اوسلو" (ناروے) میں عالمی اردو مشاعرے کا انعقاد ہوا تو ہندوستان اور پاکستان کے شعراء میں حمایت علی شاعر بھی شامل تھے۔ اس وقت تک کینیڈا میں اردو سوسائٹی کے علاوہ اشفاق حسین کی کوششوں سے رائٹرز فورم کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا اس کے اراکین نے اسی سال اکتوبر کے مہینے میں فیض کی برسی منانے کا ارادہ کیا۔ اوسلو آئے ہوئے ادباء اور شعراء کو یہاں آنے کی دعوت دی گئی۔ مگر حمایت چوں کہ ڈربن (جنوبی افریقہ) سے اوسلو (ناروے) پہنچے تھے اور

افریقی ممالک کے ادبی پروگراموں میں سے ایک ہفتہ نکال کر ادھر آئے تھے اس لئے انہیں وعدے اور شیڈول کے مطابق واپس جنوبی افریقہ تشریف لے جانا تھا لہٰذا انہوں نے ہماری دعوت قبول نہیں کی اور معذرت چاہ لی۔ افریقہ میں حمایت کا قیام تین ماہ رہا۔ وہ جنوبی افریقہ کے مختلف شہروں کی ادبی محفلوں میں شریک ہو کر گیبرون (بوٹس وانا) چلے گئے۔ پھر دوبارہ ڈربن ہوتے ہوئے ماریشس گئے اور وہاں اپنا رنگ جمایا۔ ادھر کینیڈا میں ان کے احباب اور پرستار آنکھیں بچھائے رہ گئے۔ حمایت نے پاکستان جا کر بذریعہ خطوط دوستوں سے معافی چاہی۔

دو سال بعد پھر پتہ چلا کہ حمایت صاحب ناروے اور سویڈن کے دورے پر یورپ آئے ہوئے ہیں ان سے پھر کینیڈا تشریف لانے کی درخواست کی گئی مگر اس بار وہ United Arab Emirates جانے کا پروگرام بنا چکے تھے اس لئے شمالی امریکہ تشریف نہ لا سکے اور ہم لوگ ایک بار پھر ان کی دید سے محروم ہو گئے۔ کئی لوگوں کو یہ شبہ ہونے لگا کہ شاید وہ کینیڈا آنا پسند نہیں کرتے۔

مگر یہ بات حقیقت سے کوسوں دور تھی کیونکہ جب ۱۹۸۸ء میں حنیف اخگر صاحب صدر حلقہ فن و ادب نیو یارک نے ان کو اپنے سالانہ مشاعرے میں شرکت کے لئے بلایا تو وہ فوری تیار ہو گئے۔ ان کو ان دنوں کہیں اور نہیں جانا تھا۔ پاکستان سے پیرزادہ قاسم بھی مدعو تھے اور ہندوستان سے آنے والوں میں وسیم بریلوی، بیگم ممتاز مرزا وغیرہ بھی مدعو تھیں۔

حمایت ایک عرصہ بعد شمالی امریکہ آئے اور بڑی سج دھج کے ساتھ آئے اور ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ شاعر پسند اور شعر شناس حلقے نے یہ محسوس کیا کہ جیسے دھان کے سوکھے کھیت میں پانی پڑ گیا یا مرجھائے پھولوں پر تروتازگی آگئی اور میرے ہاتھ تو گویا نعمت غیر مترقبہ آگئی۔

اکتوبر ۱۹۸۸ء نیو یارک کے مشاعرے میں میری ان سے تجدید ملاقات ہوئی مگر جب ملے تو یہ محسوس ہوا کہ کبھی بچھڑے ہی نہ تھے۔ نہ جانے کتنی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں کتنی زخم ہرے ہو گئے۔ باتوں کا جو دفتر کھلا تو بند ہونے پر ہی نہیں آیا۔ یہ بھی بھول گئے کہ مشاعرہ پڑھنا ہے۔ نیو یارک سے ہندو پاک کے شاعروں کا کارواں بوسٹن پہنچا، جہاں بانی محفل معارج کرمانی نے ان سب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہاں سے نکلے تو امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی جا پہنچے کہ وہاں علی گڑھ المنائی ایسوسی ایشن نے یوم سرسید منانے اور مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا۔ ڈاکٹر عبد اللہ ان سب کی خاطر تواضع میں پیش پیش تھے۔ وہاں سے چلے تو ڈاکٹر مظفر فاروقی اور حبیب الدین احمد کی دعوت پر شکاگو آ گئے۔ ایک مزیدار بات یہ تھی کہ حمایت دوسرے شعراء کی طرح مدعو تو مہمان شاعر کی طرح ہوتے تھے مگر وہ اس قدر جلد لوگوں میں گھل مل جاتے اور دلوں میں گھر کر لیتے کہ ہر جگہ نظامت کے فرائض ان کے سپرد کر دیئے جاتے اور وہ بلا تامل یہ ذمہ داری قبول کر لیتے۔ جب مائیکرو فون پر آتے تو برجستہ ان کے منہ سے یہی نکلتا کہ میں آپ کے شہر آیا تو مہمان کی حیثیت سے تھا مگر اب میرا شمار میزبانوں کی صف میں ہوتا ہے۔ گویا جو فریضہ صاحب مشاعرہ کے کارکنان کو انجام دینا تھا وہ انہوں نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اور اسکی ادائیگی اس طرح کی کہ جیسے وہ اس شہر میں برسوں سے رہ رہے ہیں اور سب کے شناسا ہوں سچی بات یہی تھی کہ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کو اردو سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے اور وہ ان کے نام نامی اور اسم گرامی سے واقف نہ ہو اور ان سے ایک بار بات کرنے کے بعد اس کو کیا سب کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ حمایت سے شناسائی برس ہا برس کی ہے۔

حمایت کی اور بہت سی خوبیاں ہیں۔ ایک خوبی یا خرابی یہی ہے کہ وہ مصنوعی اور کرم خوردہ تہذیبی اقدار کے پرستار نہیں

ہیں وہ تصنع آمیز باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ روایت پسندی سے انحراف کرتے ہیں۔ صاف دل سے ملتے ہیں اور ملنے کے بعد ہی دل میں جگہ کرلیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دوست کیا دشمن بھی ان کے اپنے بن جاتے ہیں۔ جو لطافت شیرینی اور بے ساختہ پن ان کے کلام میں ہے وہی انکے بیان میں۔ جو شگفتگی اور شیفتگی ان کے اشعار میں ہے۔ وہی ان کی باتوں میں۔ وہ نہ کسی سے دکھانے والی باتیں کرتے ہیں اور نہ ہی کس کو گزند پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دل دکھانے والی بات کہہ بھی جائے تو وہ اس کو پی جاتے ہیں یا درگزر کرجاتے ہیں۔ کہنے والا خود شرمندہ ہوجاتا ہے۔ وہ دوستی کے رموز سے بخوبی آشنا ہیں اس کے نکات سے وہ پوری طرح آگاہ ہیں' انہیں دلوں کو موہ لینے کا فن آتا ہے اور دلوں کی تہہ میں اتر جانے کے طریقوں سے واقف ہیں' وہ جن جن جگہوں پر گئے وہاں اپنے واقف کاروں اور پرستاروں کی ایک بڑی تعداد چھوڑ آئے' جب لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حمایت امریکہ یا کینیڈا آنے والے ہیں تو ان کی پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ ان کے شہر بھی ضرور تشریف لائیں' تقاضے کرتے ہیں' اصرار کرتے ہیں اور ہر ممکن کوشش کرکے انہیں اپنے یہاں بلاکر چھوڑتے ہیں۔

محبت اور رفاقت ایک دو طرفہ عمل ہے۔ یہ ایک ایسی تالی ہے جو دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے لوگ اسی سے بڑھ چڑھ کے ملتے ہیں۔ اسی سے قربت محسوس کرتے ہیں جو خود ان سے بلا تکلف' بلا تصنع' محبت آمیز انداز میں ملے۔ لوگ حمایت کے جو اتنی جلد قریب آجاتے ہیں اور ان کی طرف کشاں کشاں بڑھتے چلے جاتے ہیں تو اس کا سبب یہی ہے کہ وہ خود سراپا محبت ہیں۔ رواداری اور پاسداری ان کی فطرت کا تقاضہ ہے اور دوستی اقدار نباہنا ان کو بخوبی آتا ہے' امریکہ کے اتنے شہر انہوں نے دیکھے۔ جابجا گھومے' مشاعرے پڑھے نشستوں میں شرکت کی ہے کہ اتنی تعداد میں کم لوگوں نے وہ شہر دیکھے ہوں گے۔

وہ جب ہیوسٹن میں تھے تو ایک خاص یہ واقعہ پیش آیا کہ مسلسل سفر اور مستقل تکان کی وجہ سے ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ وہاں ڈاکٹر عبد العلی دل کے امراض کے ماہرین میں سے ہیں۔ انہوں نے حمایت کی جو یہ حالت دیکھی تو اپنے کلینک لے گئے' سارے معائنے کئے۔ اس کے بعد برمن ہسپتال داخل کیا کہ مزید ٹیسٹ ہوسکیں۔ پھر ان کو مشورہ دیا کہ دل کی حالت نازک تو نہیں ہے مگر فوری علاج لازم ہے۔ اس کے لئے تمہیں ہفتہ عشرہ یہاں رکنا پڑے گا۔ حمایت گھبرا گئے۔ پوچھا کہ علاج معالجہ پر کتنا خرچ آئے گا؟ جواب ملا' لاکھ۔ ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ۔ اتنی بڑی رقم کا فوری انتظام ممکن نہ تھا۔ گھر ٹیلی فون کیا۔ بچے بھی گھبرا گئے۔ مگر اپنے باپ کو تسلی دی کہ آپ فکر نہ کریں' ہم کسی نہ کسی طرح اس رقم کا انتظام کرلیں گے۔ آپ اپنا علاج تسلی بخش طریقہ پر کرالیں۔ بہرحال علاج ہوا اور خاطر خواہ ہوا مگر ڈاکٹر صاحب نے ایک پائی بھی بطور فیس یا اخراجات نہیں لی۔ امریکہ جو اپنی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور خود غرضانہ جبلت کے لئے مشہور ہے وہاں یہ اخلاص' یہ بے لوثی' یہ مروت' یہ انسان دوستی' اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ مگر ایسا رویہ یہاں کا ڈاکٹر ہر ایک کے ساتھ نہیں برت سکتا۔ یہ خصوصی طرز عمل حمایت ہی جیسے با مروت اور بے لوث انسان کے ساتھ برتا جاسکتا ہے جو اس دیار میں ایک عظیم فنکار اور ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کی ضروریات اور ان کی صحت کا پورا خیال رکھنا' ہم سب اردو بولنے والوں پر فرض تھا۔ شکر ہے کہ یہ فرض نباہا گیا۔

کچھ اسی نوعیت کا واقعہ سڈبری میں بھی پیش آیا۔ جب حمایت یہاں تشریف فرما تھے۔ ان کے دانتوں میں درد ہوا' میں نے ایک جاننے والے ماہر دندان ساز اور (Dentist) سے رابطہ قائم کیا اس نے کہا کہ ڈیڑھ مہینے بعد دیکھ سکتا ہوں کہ ساری تاریخیں مریضوں سے بھر چکی ہیں۔ ان کو صورت حال سمجھائی تو کہنے لگے کہ اچھا لنچ کے اوقات میں لے آؤ۔ لہٰذا میں ان کو

لے گیا۔ ان کی ایک داڑھ خراب تھی اور تکلیف دے رہی تھی۔ اس نے کہا کہ اس کو نکال دیجئے۔ حمایت نے مجھ سے پوچھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے کہا جس سہولت اور آسانی سے درد کا ازالہ اور دانت کا علاج یہاں ہو سکتا ہے غالباً" وطن جا کر ممکن نہ ہو سکے گا۔ اس لئے اس کا نکال دینا ہی مناسب ہے۔ حمایت راضی ہو گئے اور ڈاکٹر نے جو درد کی جڑ تھی' اس کو اکھاڑ پھینکا۔ جب فیس دینے کا سوال اٹھایا تو ہنس کر کہنے لگے کہ اتنے بڑے شاعر کے میں کام آیا یہی سعادت میرے لئے کیا کم ہے۔ وہ ڈاکٹر اطالوی تھا اور اطالوی نسل کے لوگ۔ دام و درہم کے مقابلے میں بڑے کھرے اور کھردرے ہوتے ہیں مگر وہ علم کی عزت کرتا تھا اور دوستی کی اقدار سے واقف تھا۔ اس کے بعد حمایت جب بھی کینیڈا آئے' ان کی زبان پر یہی بات ہوتی کہ بھئی میرا سڈبری جانا لازم ہے کہ وہاں میری داڑھ گڑی ہوئی ہے۔ جہاں لوگوں کی نال گڑی ہوتی ہے اسے لوگ اپنا وطن سمجھتے ہیں' میں سڈبری کو کم از کم اپنا شہر تو سمجھ سکتا ہوں۔

جب کوئی شخص کسی براعظم کے مختلف شہروں میں گھوم پھر رہا ہو تو پھر اس کو نہ جانے کتنے حادثوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک دلچسپ واقعہ' جب حمایت ۱۹۸۹ء میں امریکہ تشریف لائے ہوئے تھے پیش آیا۔ حلقہ ارباب قلم کا سالانہ مشاعرہ ڈیٹرائٹ میں ہونا تھا جو امریکی شہر ہے۔ یہ مشاعرہ حلقہ کے بانی عروج اختر زیدی نے ترتیب دیا تھا۔ جو خود ونڈسر میں رہتے ہیں اور حکومت اونٹاریو میں کینیڈا میں ایک اچھے عہدے پر مامور ہیں۔ حمایت کے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں۔ اس مشاعرے میں جو شاعر مدعو تھے وہ سب کے سب ڈیٹرائٹ میں مختلف حضرات کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ صرف حمایت اور اقبال صفی پوری عروج اختر کے مہمان تھے۔ وہیں میں بھی آکر ٹھہرا۔ جب ہم لوگ مشاعرے میں شرکت کے لئے عروج اختر کی گاڑی جو Station Wagon تھی' روانہ ہوئے تو ایک سرحد سے گزر کر دوسرے ملک کی حدود میں داخل ہونا تھا۔ گاڑی میں ماشاء اللہ کافی آدمی تھے۔ چیک پوسٹ امیگریشن آفیسر بہت سے لوگوں کو ایک گاڑی میں دیکھ کر ذرا چوکنا ہوا اور ہم سب کو گاڑی سے اتر کر دفتر میں جانے کے لئے کہا۔ چنانچہ سب کے سب بادل نخواستہ دفتر کے اندر داخل ہو گئے۔ وہاں ایک دوسرے آفیسر نے یہ کہنا شروع کیا کہ آپ میں سے کوئی بھی دس ہزار ڈالر سے زائد اپنے ساتھ کینیڈا سے امریکہ نہیں لے جا سکتا۔ اس کم بخت کو کیا معلوم کہ یہاں جیبوں میں دس ڈالر بھی نہ تھے' دس ہزار کی بات تو بہت بڑی تھی۔ ہم سب میں حمایت چہرے مہرے' صورت شکل اور لباس کی وجہ سے زیادہ متمول یا سرمایہ دار قسم کے نظر آ رہے تھے۔ لہٰذا اس نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے سادگی سے جواب دیا کہ میں ڈائریکٹر نشر و اشاعت ہوں (Publications) تو پھر اس کا شبہ اور بھی یقین کو پہنچ گیا اور لے گیا ان کے علیحدہ دوسرے کمرے میں اور پوری تلاشی لی۔ جب ایک دمڑی بھی نہ نکلی تو کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا باہر آگیا اور ہم سب کو سرحد پار کرنے کی اجازت دیدی۔ اس کے بعد ہم سب نے حمایت کو چھیڑنا شروع کیا کہ بھئی تم آئندہ سے امیر کبیر لگنا بند کردو ہم جیسوں کی طرح رہا کرو اور ہم جیسوں کی طرح سفر کیا کرو گویا تم بھی مفلوک الحال بنے رہا کرو۔

یہ ۱۹۸۹ء کی بات ہے حلقہ فن و ادب اور نیرجہاں نے مل کر پھر سالانہ مشاعرے کی بنیاد ڈالی تھی اس بار پاکستان سے حمایت کے علاوہ دلاور فگار' قتیل شفائی' اقبال صفی پوری' عبداللطیف اثر' گلنار آفریں' نجمہ خان اور بعد میں احمد فراز بھی شامل ہو گئے۔ تشریف لائے تھے۔ ہندوستان سے آنے والوں میں ندا فاضلی' بشیر بدر اور کلیم عاجز معروف شعراء میں سے تھے۔ سال گزشتہ کی طرح اس بار بھی شعراء کرام واشنگٹن ڈی سی' نیویارک' کلیولینڈ' شکاگو' بوسٹن' ڈیلس' میامی' ہیوسٹن'

لاس اینجلس وغیرہ تشریف لے گئے۔

ان کے بعد عروج اختر کی دعوت پر دو ایک کو چھوڑ کر باقی حضرات ڈیٹرائٹ کے مشاعرے میں شرکت کی غرض سے آئے اور اس کے دوسرے دن ٹورنٹو میں جناب اطہر رضوی نے مشاعرہ اور مذاکرہ کا انتظام کیا تھا، وہاں آگئے۔

مذاکرہ کا عنوان تھا "اردو ادب کی تہذیبی قدریں" مقامی لوگوں میں محترمہ عقیلہ شاہین، اشفاق حسین اور سفیر پاکستان مراد خیری صاحبان بحیثیت اسپیکرس شامل تھے۔ مہمانوں میں جمیل الدین عالی اور حمایت علی شاعر کو بولنا تھا۔ حمایت نے اردو زبان کی ترویج میں صوفیائے کرام کا حصہ جیسے موضوع پر بولنا بند کیا۔ اور سچ پوچھئے تو جب وہ بولنے کھڑے ہوئے تو امیر خسرو اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے جو اردو زبان کی تشکیل اور تعمیر میں حصہ لیا تو اس سے بہت پہلے سے بات اٹھائی اور اردو ادب کی پوری تاریخ کنگال کر رکھ دی۔ دوسرے سننے والوں کا کیا حال ہوا۔ یہ تو ان کے چہرے اور آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ حیرت سے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے مگر میری زبان سے بے ساختہ یہی نکلا۔

Oh! Himayat I hate your guts.

جمیل الدین عالی نے اردو کے متعلق کچھ اعداد و شمار پیش کئے کہ کون کون سی زبانیں کتنی جگہ بولی جاتی ہیں اور کتنے لوگ بولتے ہیں۔ بعد میں خیری صاحب نے خوش حال خان خٹک، شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے تعلق سے اردو تہذیب کے ارتقا کا جائزہ لیا۔

مشاعرے میں دو باتیں بڑی دلچسپ ہوئیں۔ ایک تو کینیڈا کے شاعر جب پڑھ چکے تو ابھی امریکہ کے شاعر بھی نہیں بلائے گئے تھے کہ ناظم مشاعرہ نے قتیل شفائی کا نام پکار لیا۔ حالانکہ کہ ابھی حمایت، اقبال صفی پوری اور جمیل الدین عالی کو پڑھنا تھا۔ قتیل صاحب اس محفل میں سب سے بزرگ تھے اور بحیثیت شاعر کے ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ عالی نے سب سے پہلے اعتراض کیا۔ حمایت نے ناظم کے ہاتھ سے مائیکروفون لیکر قتیل صاحب سے اس غلطی کی معافی چاہی اور ناظم سے اشارتاً کہا کہ وہ قتیل صاحب سے معذرت کرلیں انہوں نے بغیر تامل قتیل شفائی سے معافی مانگ لی اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ٹورنٹو سے حمایت صاحب نکلے تو اقبال صفی پوری کے ساتھ ایک بار پھر ایڈمنٹن (۷ نومبر) پہنچ گئے۔ کشور غنی بانی محفل تھیں اور ناظم مشاعرہ بھی۔ وہاں سے چلے تو ۱۸ نومبر، اقبال حیدر کی دعوت پر کیلگری گئے اور پھر واپس نیویارک۔ اس کے ہم دونوں مانٹریال کے مشاعرے میں آفاق حیدر کے گھر ملے۔

آفاق حیدر، لکھنؤ کے پاس ایک ضلع امیٹھی کے رہنے والے ہیں۔ جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر سال ایک بزم مشاعرہ ضرور سجاتے ہیں اور شعراء اور سامعین کی دل کھول کر خاطر تواضع کرتے ہیں۔ ان کے گھر بالکل اپنے گھر کا سا سماں رہتا ہے۔ نہ کوئی تکلف نہ کوئی بیگانگی۔ نہ یہ احساس کہ کسی غیر کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہنستا، بولنا، لطیفے سنانا، مذاق کرنا، زور زور سے قہقہہ لگانا سارے ہی شاعروں کا مسلک ہوتا ہے۔ چونکہ سب انہیں کے گھر ٹھہرے ہوتے ہیں۔ یہیں صبح کے ناشتہ کی میز پر ایک ادبی موضوع چھڑ گیا اور اب جو حمایت صاحب نے اس کے بارے میں بولنا شروع کیا۔ بے ساختہ اور بے تحاشہ تو لوگ نوالہ ہاتھ میں پکڑے رہ گئے اور یہ بھی بھول گئے کہ انہیں ٹوسٹ انڈے کھانے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا موضوع چھڑا اور حمایت سب کے بارے میں اپنی رائے نہایت وثوق کے ساتھ دیتے رہے۔ یہ اندازہ اس وقت ہوا کہ حمایت ہر موضوع پر اتنی ہی روانی اور سلاست سے بولتے ہیں جس طرح وہ شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار

کرتے ہیں۔

اس مشاعرے میں جناب سید مراد علی خیری' سفیر پاکستان بھی شریک تھے۔ دوسرے دن انہوں نے مشاعرہ سفارت خانے میں رکھا اور ہم سب کو دعوت سخن دی۔ یہ ۳۱ دسمبر کی رات تھی۔ انتہائی قیامت خیز' تباہ کن برف باری صبح ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ سردی بھی شدید تھی۔ ریڈیو سے برابر یہ اعلان ہورہا تھا کہ بجز سخت مجبوری' کار کے ذریعہ Highway پر سفر نہ کریں مگر ہم لوگوں نے نہ تو موسم کی خرابی کا خیال کیا نہ برف باری کی طرف توجہ دی۔ بس گاڑیوں میں بیٹھ کر مانٹریال سے اوٹاوا کی جانب بلا تاخیر شام کو چل دیئے۔ جو سفر ڈیڑھ یا دو گھنٹے میں کٹ جانا چاہیے اس میں چار پانچ گھنٹے صرف ہوئے راستے میں ایک کار کا حادثہ بھی ہوا مگر کسی کے چوٹ نہیں آئی۔

ہم لوگ جو خیری صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے تو دوسرے مہمانوں کا انتظار کے مارے برا حال تھا۔ کئی لوگ واپس چلے گئے۔ پہلے کھانا ہوا پھر محفل شعر و سخن کا آغاز ہوا۔ رات گئے تک شعر و شاعری ہوتی رہی اس بزم میں بہت سے سن رسیدہ شاعر حضرات بھی تھے۔ مگر خیری اور ان کی بیگم نے صدارت حمایت کے سپرد کی جو انہوں نے بڑی خوبصورت سے نبھائی۔ نظامت ولی عالم شاہین نے کی اور مشاعرے کے بعد ہم سب انہیں کے مہمان ہوئے۔ اس کے بعد حمایت وہاں سے ہملٹن ہوتے ہوئے سڈبری آگئے اور اسی طرح چند روز ان کے ساتھ گپ شپ کرتے گزر گئے۔ ان کا امریکہ کی واپسی کا ٹکٹ براہ مانٹریال سے تھا۔ لہٰذا ہم دونوں پھر اسی سمت روانہ ہوئے۔ ایک شب شاہین کے یہاں پھر قیام کیا اور پھر دوسرے دن انہیں ایک گاڑی میں عازم مونٹریال ہوئے جہاں ہم سب کے ٹھہرنے کا انتظام رفیع اللہ کے ہاں تھا۔ دوسرے دن ایک مخصوص نشست کا انتظام علی عباس حسنی کے یہاں تھا۔ یہاں جو لوگ مدعو تھے ان کا کہنا تھا کہ مانٹریال کے مشاعرے میں حمایت صاحب جو نظم کراچی اور سندھ کے حالات کے تعلق سے سنا گئے تھے اس نے تہلکہ مچادیا ہے۔ سب کی خواہش تھی کہ وہی نظم پھر سنائی جائے۔ حمایت کچھ ہچکچائے مگر پھر سب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے وہ نظم بھی سنائی اور دوسری کئی نظمیں بھی سنائیں۔

اب نئے سال کا آغاز ہوچکا تھا۔ جنوری ۱۹۹۰ء کی چار یا پانچ تاریخ ہوچکی تھی۔ حمایت مانٹریال کی محفلیں جگا کر نیویارک سدھارے اور میں واپس سڈبری چلا آیا۔ مگر خوش قسمتی دیکھئے کہ اس سے اگلے ماہ یعنی فروری کی ۲۵ کو لکھنؤ میں فراق گورکھپوری کے سیمینار میں پھر ملاقات ہوئی اور اس طرح کئی دن اس شہر میں ان کا میرا ساتھ رہا۔

مانٹریال ایک طرح سے اردو زبان اور ادب کا ایک اہم مرکز اور قابل قدر گہوارہ بن گیا ہے۔ ۱۰ تا ۱۲ مئی ۱۹۹۰ء کو ڈاکٹر شفیق علوی جو معاشیات کے استاد ہیں اور علمی اور ادبی محفلوں کے انعقاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور اردو بزم ادب کے صدر ہیں' ان کی کوششوں سے "جشن غالب" کا انعقاد ہوا۔ پاکستان سے شرکاء میں احمد فراز' حمایت علی شاعر اور نکہت بریلوی تھے۔ ہندوستان سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اور برطانیہ سے شاہد ملک اور عبید صدیقی تشریف لائے تھے۔ مدعو اور بہت سے حضرات بھی تھے مگر چند در چند وجوہ وہ شریک نہیں ہوسکے تھے۔

اس محفل کا آغاز ایک استقبالیہ اور شام غزل سے ہوا اور افتتاحی رسم وزیر ملٹی کلچرازم کے ہاتھوں انجام پائی۔ دوسرے دن مذاکرہ تھا جس میں سارے مہمان بحیثیت اسپیکر اور مبصر شریک تھے اور دوسرے مذاکروں کی طرح حمایت نے یہاں بھی غالب کی شخصیت کے تعلق سے بہت سے دلچسپ نکات اور خیالات پیش کیے۔ جشن غالب نہایت خوبصورتی اور کامیابی کے

ساتھ اختتام کو پہنچا۔ اس کے بعد مشاعروں کا سلسلہ ایک بار پھر زور و شور سے شروع ہوا۔ جشن غالب کے بین الاقوامی مشاعرے میں جناب خیری صاحب تشریف فرما تھے۔ انہوں نے پھر سب کو اوٹاوا آنے کی دعوت دی جہاں ایک مشاعرہ پاکستان' کینیڈا' ایسوسی ایشن کی جانب سے منعقد ہوا اور دوسری محفل حسب معمول خیری صاحب کی قیام گاہ پر جمی۔ اس کے بعد کینیڈا کی ممتاز شاعرہ نسیم سید نے کنگسٹن میں جہاں وہ رہتی ہیں' دو محفلوں کا انتظام کیا۔ ایک تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اعزاز میں تہنیتی تقریب تھی کہ ان کو حال ہی میں حکومت ہند کی جانب سے پدم شری کا خطاب ملا تھا اور دوسری بزم مشاعرہ تھی جس میں ٹورنٹو کے بعض شعراء نے بھی شرکت فرمائی۔ اس مشاعرے کی صدارت حمایت نے کی۔

کنگسٹن ہی میں حمایت' نکہت اور ملک زادہ چند روز اور مقیم رہے۔ اب جہاں یہ لوگ جاتے ساتھ ساتھ جاتے۔ ملک زادہ اور نکہت بریلوی شمالی امریکہ پہلی بار تشریف لائے تھے۔ لہٰذا یہاں کے آداب اور طرز معاشرت سے زیادہ واقف نہ تھے اور نہ ہی واقف کاروں کا حلقہ وسیع تھا اس کے برخلاف حمایت کے جاننے والوں کا حلقہ نہ صرف وسیع بلکہ وسیع تر تھا انہوں نے شہر بہ شہرا پنے دوستوں اور رفقاء کو ٹیلی فون کرکے اپنے دونوں ساتھیوں کی خاطر مشاعروں کا انتظام کروایا کہ وہ حضرات بھی اس دیار میں زیادہ سے زیادہ گھوم لیں اور جتنی بھی جگہیں دیکھ سکتے ہیں دیکھ لیں۔ اس قسم کے احساسات اپنے دوستوں کے لئے کم ہی لوگوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں۔ مگر حمایت دوست پرست انسان ہیں اور دوستوں کو آرام اور آسائش پہنچانے کی خاطر اپنی تکالیف اور مصائب کا بھی خیال نہیں رکھتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ان کے اندر انا بھی بہت ہے۔ اپنی عزت اور وقعت کے آگے وہ مال و دولت یا عہدے کی پرواہ نہیں کرتے۔ کچھ عرصہ پہلے ان کا تقرر بیجنگ یونیورسٹی' چین کے شعبہ Foreign languages میں ہوا۔ مگر جو شرائط ان کے سامنے کارکنان ادارہ نے پیش کئے وہ ان کو قابل قبول نہ تھے۔ لہٰذا اس Appointment کو انہوں نے ٹھکرا دیا اور جب انکی شرائط بیجنگ یونیورسٹی والوں نے قبول کرلئے تو وہاں جانے پر تیار ہوگئے اور غالبا وہ "چلتے ہو تو چین کو چلیے" والی بات پر عمل کرتے ہوئے دنیا کے سب سے زیادہ مردم خیز علاقے میں جلد ہی پہنچ جائیں۔

حمایت علی شاعر کے لگ بھگ نصف صدی کے ادبی کارنامے نہ صرف برصغیر بلکہ اردو جہاں جہاں بولی جاتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کے ہاتھوں خراج تحسین حاصل کرچکے ہیں انہوں نے اپنے شعری تخلیقات اور نثری نگارشات کی بدولت جو شہرت حاصل کی ہے' وہ ابدی ہے۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ اپنے عہد کی بدلتی ہوئی قدروں اور اپنے عصری تقاضوں سے بے بہرہ نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہم رشتہ ہیں۔ یہ ان کی فکری جہتوں اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ نسل کیا' آگے آنے والی نسلیں بھی ان کے فکر و شعور سے استفادہ کرتی رہیں گی۔

شمالی امریکہ بشمول کینیڈا میں انکے احباب اور انکے پرستاروں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اگر ان سب کے نام گنوانا شروع کردوں تو اس کی ضخامت اس مضمون سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ وہ جہاں بھی گئے ایک داستان چھوڑ آئے اور لوگ ان کے جانے کے بعد یہ داستان اس وقت تک دہراتے رہتے ہیں جب تک وہ دوبارہ یہاں تشریف نہیں لے آتے۔ اور اب جبکہ یہ مضمون اختتام کو پہنچ رہا ہے پھر

"ہے خبر گرم ان کے آنے کی"

(۹ر اکتوبر ۱۹۹۰ء)

حمایت علی.........شاعر اور شخص

(ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی شکاگو' امریکہ)

دکن کی سرزمین سے کئی خوش نوا شاعر اٹھے ہیں۔ نواب بہادر یار جنگ کی صورت میں حرف و صوت کا حسین امتزاج اور فصاحت و بلاغت کا دریا بھی یہیں سے بہہ نکلا تھا۔ جس نے اقطاع ہند کے گوشے گوشے کو سیراب کردیا۔ کلام موزوں صوتی آہنگ اور نغمہ جاں فزا کے ساتھ ادا ہو تو دل و دماغ معنی و مطالب کے عرفان کے ساتھ ساتھ آواز کی لہروں پر جھوم اٹھتے ہیں۔ مخدوم محی الدین' سکندر علی وجد' شاہد صدیقی' شاذ تمکنت' سرور ڈنڈا اور سلیمان خطیب کی صفحہ قرطاس پر بکھری ہوئی شاعری کو پڑھیئے اور ان لوگوں سے پوچھیے جنہوں نے ان شعراء کو سنا ہے تو وہ گواہی دیں گے کہ اسٹیج سے پیش ہونے والے کلام موزون کا اثر ہی کچھ اور ہے۔ اس کی پہنچ بہت دور تک جاتی ہے یہی حال حمایت علی شاعر کا ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ کتابی شاعری کی عظمت کو کم کیا جائے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صوت و نوا کا غنائی انداز شاعر کے اثر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

حمایت علی شاعر سے ۱۹۸۸ء میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ اس وقت حمایت علی شاعر عالمی مشاعرے میں شرکت کے لئے شکاگو تشریف لائے تھے۔ اکتوبر کی ہلکی ہلکی سردیاں شروع ہوچکی تھیں ہم مشاعرے کے انتظامات میں بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ میں انہیں لینے ایرپورٹ نہیں جاسکا۔ بردرام نجم الدین فاروقی نے حمایت علی شاعر کو میرے گھر پہنچادیا تھا میں جب ہاسپٹل کے کام سے فارغ ہوکر گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں ایک صاحب قمیض شلوار میں ملبوس' کچن میں ناشتے کی میز پر کہنی لگائے بڑے انہماک سے ٹیلیفون پر کسی سے بات چیت کررہے ہیں ان کا آدھے سے زیادہ چہرہ لامبے لامبے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بال ذرا سا اور بڑے ہوتے تو زلفوں کی تعریف میں آسکتے تھے۔ ان بالوں کو دیکھ کر ذہن میں نیم زلفی کا تصور جاگ اٹھا۔ ٹیلیفون پر اتنے انہماک سے گفتگو کرتے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کسی اہم شخصیت سے بات ہورہی ہوگی۔ لہٰذا میں نے تعارف میں جلدی نہیں کی صرف انتظار کرتا رہا۔ میری بے چینی کو بھانپ کر موصوف نے ٹیلیفون جلد ہی بند کردیا۔ اس کے بعد پھر تعارف ہوا۔ گفتگو کا سلسلہ چل پڑا۔ شام کا کھانا کھایا گیا۔ کھانے میں دہی کی کڑی اور بیسن کی بھجیاں تھیں۔ حمایت علی شاعر نے چٹخارے لئے ہوں گے جیسے میں لیتا ہوں۔ یا پھر انہوں نے منہ زبانی کڑی کی تعریف کی ہوگی۔ تب پتہ چلا کہ حمایت علی شاعر میں ابھی تک حیدر آباد' سندھ والے کی نہیں۔ دکن والے کی بوباس بسی ہوئی تھی۔ رات کے ۹ بجے کے قریب اعجاز نسرین اور ان کے شوہر نسیم سرور صاحب تشریف لائے اور حمایت علی شاعر ان کے ساتھ چلے گئے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی شام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی ایسوسی ایشن کا تاریخی عالمی مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس کی یاد آج تک لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہے۔ اتفاق سے اس مشاعرے میں حرف و صوت کے ماہر فن کار شریک تھے۔ صبیحہ صبا' وسیم بریلوی' بیگم ممتاز مرزا' پیرزادہ قاسم صدیقی' حنیف اخگر اور حمایت علی شاعر۔ لیکن مشاعرے کے اختتام پر ہر شخص ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ "حمایت علی شاعر نے شکاگو کا دل جیت لیا۔"

مشاعرے میں ہر ایک کا دل جیت لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ نکہت بریلوی نے ۱۹۵۳ء کے ایک کل پاکستان مشاعرے

کے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ وہ مشاعرہ شاید سکھر میں ہوا تھا اور نکہت بریلوی کی پہلی ملاقات حمایت علی شاعر سے اسی مشاعرے کے توسط سے ہوئی تھی۔ اس مشاعرے میں حمایت علی شاعر نے پہلے ایک نظم ''اجنبی مہمان'' سنائی تھی۔ حمایت علی شاعر کے کلام سنانے کے انداز پر نکہت بریلوی یوں رقم طراز ہیں ''جیسے شاعر نے نظم نہیں کوئی منتر پڑھ کر سامعین پر پھونک دیا ہو۔ وہ دائیں جانب گھومتا تو سارے سر اسی جانب گھوم جاتے۔ وہ بائیں جانب گھومتا تو سب اسی طرف مڑجاتے۔ ایک لہری تھی جو پنڈال میں ادھر ادھر اور ادھر سے ادھر آجارہی تھی۔'' شکاگو کے مشاعرے میں ہم نے کیا دیکھا وہ ہم آگے بیان کریں گے پہلے اس نظم ''اجنبی مہمان'' پر کچھ بات ہوجائے۔

''اجنبی مہمان'' ۴۰ سال پہلے کی لکھی ہوئی نظم ہے۔ ترقی پسند تحریک کا ارتقاء ایک نقطہ پر آکر ٹھہر گیا تھا اور وہ ایک لٹے ہوئے مسافر کی طرح کھوئی کھوئی نئی منزل کی تلاش میں تھی۔ تحریک آزادی کے دوران انقلابی شعراء نے سامراج کے خلاف بے پناہ غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لئے جن نعروں کو ایجاد کیا تھا ان پر اب نظر ثانی کررہے تھے کہ آزاد ملک میں کیا حکمت عملی ہونی چاہیئے۔ تحریک آزادی کے دوران وہ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو گھروں سے باہر نکال لائے تھے تاکہ ان کے آنچل کو پھانسی کے پھندے میں بدل دیں کیونکہ آزادی کی جنگ عدم تشدد پر لڑی جارہی تھی۔ تلوار اور کرپان کے استعمال سے خون بہتا ہے اور عدم تشدد اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ بعض شعراء نے جنگ کے دوران پیام محبت کو ترک کرنا آدابِ عشق کے خلاف جان کر انتقام لینے کا انوکھا طریقہ دریافت کرلیا تھا۔ بجلی کے کھمبے تلے انگریز دوشیزہ کے عارضِ گلنار کو چوم کر انتقام کی بھڑکتی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا طریقہ کار نہایت ہی مقصدی تھا۔ اس پس منظر میں ''اجنبی مہمان'' ایک نئی آواز محسوس ہوتی ہے۔ اس نظم کا خالق مختلف نظامِ خیال کے عمرانی اثرات کا گہرا شعور اور ادراک رکھتا ہے۔ سامراج کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور ایسے متوازن ذہن کا مالک ہے کہ چونکا دینے والی جنسی لذتیت سے بھری ہوئی انوکھی تجاویز سے سامع کو برانگیختہ کرنے کے بجائے جذبہ کو کمال ہنرمندی سے ایسے شعلہ میں بدل دیتا ہے کہ سامراج کا خرقۂ سالوس بھسم ہو کر اصل شکل میں سامنے آجائے۔ اس نظم کے یہ بند ملاحظہ فرمایئے اور محسوس کرلیجئے کہ کیا اس نظم میں آج کے ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی پیش گوئی نہیں ملتی؟ ارضِ مشرق کے شاداب میدانوں کو ویران اور بنجر زمینات میں تبدیل کرنے والے عزائم کا پتہ نہیں چلتا۔؟

یہ بہت دور دور مغرب سے
ارضِ مشرق سجانے آئے ہیں
ایشیا کو امڈتے طوفاں سے
ایشیا کو بچانے آئے ہیں
تپتے جسموں کے پاؤں کے نیچے
چھاؤں اپنی بچھانے آئے ہیں
مصر کی طرح ارضِ پاک کو بھی
ایک ترکی بنانے آئے ہیں
اک سیاسی بساط پر اپنے
چند مہرے بٹھانے آئے ہیں

آج اپنے وطن میں ان کے لئے
سج رہا ہے حیات کا بازار
دستِ گلچیں سے ہو رہا ہے پھر
صحنِ گلشن میں اہتمامِ بہار
ہر کمیں گاہ ماہ و انجم سے
ہونے والی ہے صبح پر یلغار
ایک نیا کوریا ہے زیرِ وجود
ہو رہی ہے نئی زمین ہموار
موت سے ہے غمِ حیات کا لطف
غم نہیں ہے تو ہر خوشی بیکار

نکہت بریلوی مزید رقم طراز ہیں کہ نظم کے بعد سامعین کے اصرار پر شاعر نے ترنم سے

اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو
پھر ہیں برق کی نظریں' سوئے آشیاں یارو

مطلع والی غزل شروع کی۔ گلے کی کاریگری کے بجائے سیدھے سادھے لحن میں الفاظ کو توڑے مروڑے بغیر تلفظ کے ساتھ ادائیگی کا انداز شعر کے معنوی حسن میں اور بھی نکھار پیدا کر رہا تھا۔ سامعین عالم سرشاری میں ایک اک شعر کو کئی کئی بار سن رہے تھے اور جب یہ شعر آیا۔ راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر

میر کارواں یارو' میر کارواں یارو

تو جیسے مشاعرے میں ایک کہرام برپا ہوگیا۔ مشاعرے کی چھتیں اڑنے کا محاورہ اس رات سمجھ میں آیا۔
۲۹ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی اس سحر آ گہیں شب' شکاگو میں ہمیں بھی اس محاورے کی عملی شکل دیکھنے کو ملی۔
اس رات حمایت علی شاعر نے ثلاثیاں' نظمیں اور کئی غزلیں سنائیں' میر تقی میر کی شہرہ آفاق زمین میں جب شاعر نے یہ غزل شروع کی

نالہ غم' شعلہ اثر چاہیے
چاک دل اب تا بہ جگر چاہیے

تو سامعین پر بے خودی کا عالم طاری ہوگیا رومانیت اور نغمگی سے بھرپور لحن کے ساتھ نالہ غم شعلہ اثر بننے کی آرزو کے ساتھ بلند ہوا۔ اور اتنا بلند ہوا کہ خلاء کے بیکراں سناٹے کو چیرتا ہوا اجرام فلکی اور قدسیوں کے دل و جگر کو بھی چاک کر دیا۔
پھر دوسرا شعر۔

کتنے مہ و نجم ہوئے نذر شب
اے غم دل اب تو سحر چاہئے

سامعین کی سماعتوں سے ٹکرایا تو ہر ایک کے زخم دل دعائیں دیتے ہوئے جاگ اٹھے اور زبان حال سے پکار اٹھے' لاؤ حمایت وہ سحر جس کی آرزو میں ہم وقت کے بے رحم صحرا میں آبلہ پائی کا کرب برداشت کرتے کرتے بے حال ہوچکے ہیں' کہاں ہے وہ منزل تو حمایت نے جواب دیا۔

منزلیں ہیں زیر کف پا مگر
ایک ذرا عزم سفر چاہیے

تو مشاعرہ گاہ کی چھت واقعی اڑ گئی' پھر حمایت علی شاعر نے یہ شعر پڑھا۔

تشنگی لب کا تقاضہ ہے اب
بادہ ہو یا زہر مگر چاہیے

تو یقین جانئے کہ مجھے بالکل یاد نہیں کہ سامعین کی کیا حالت ہوئی تھی' کیونکہ میں خود اپنے آپ میں نہیں تھا' اب جب

بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو حمایت علی شاعر کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے۔

لوٹ آ' دورنِ دل سے پکارے کوئی مجھے
دنیا کی آرزو میں نہ جا اپنے آپ سے

اس شعر کا مطلع ہے۔

کب تک رہوں میں خوف زدہ اپنے آپ سے
ایک دن نکل نہ جاؤں ذرا اپنے آپ سے

تو واقعی میں اپنے آپ سے نکل جاتا ہوں اور اس مقام سے اپنے اطراف نظر ڈالتا ہوں تو چند تلخ حقائق کا عرفان ہوتا ہے فطرت حسن مطلق کی جلوہ نمائی سیکڑوں نامیاتی وجود کے توسط سے ظاہر کرتی رہتی ہے اور گلاب ان کا سرتاج ہے حسن ازلی کی تلاش میں بھٹکنے والی روحیں ان نامیاتی وجود کے دیدار سے محبوب کے سراپا کا ادراک کر لیتی ہیں۔ یہ عمل ارتقاء آدمیت کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کی نشو و نما کے لئے مادی احتیاجات' لیکن صنعتی کلچر نے مادی آسائشوں کا ایسا سحر طاری کردیا ہے کہ انسان نے اپنے ہی ہاتھوں فطرت کے معصوم وجود میں زہر بھر دیا ہے' خوشبو حسن ازلی کا غیر مرئی مظہر ہے یہ روح کو معطر کرتی ہے اور جذبات خیر کو بیدار کرتی ہے' لیکن انسان نے خوشبو کو مسموم کردیا ہے۔ آج کرہ ارض بارود اور خون کی بساند سے متعفن جنازہ محسوس ہوتا ہے۔ جنسی ہیجان' رنگ و نور سے خالی کینوس اور مسموم فضا اگر ہم اپنے آپ سے خوف زدہ ہیں تو کیا یہ واجبی نہیں ہے۔ مسابقتی دوڑ میں گر پڑنے کا خوف' انجانی جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہونے کا خوف' کیا ہم اس نفسیاتی خول سے نکل کر چھوٹی چھوٹی باتوں سے مسرت اور سکون حاصل کرسکتے ہیں۔ بلبل کا نغمہ' کوئل کی کوک' کبوتروں کی غٹرغوں' چڑیوں کی چہچہاہٹ' نرگس کی آنکھ میں شبنم کے آنسو' رات کی رانی کی مہک' چنبیلی' موگرے اور گلاب کی روح افزا خوشبو' ظلمات میں جگنو کی جھلملاتی چمک' گھنے بادلوں سے ٹپکنے والے آب حیات کی لڑی کا محبوب کی زلفوں میں الجھ جانا۔ سہاگنوں کی چوڑیوں کی کھنک' بچوں کی معصوم مسکراہٹ تو بوڑھوں کے طفل نما خدوخال اور پوپلے منہ سے علم و عرفان کی باتیں ہم کیوں ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے لطف اندوز نہیں ہوپاتے۔ ہمیں علم نہیں ہے کہ ہم اپنے سے ہیں اندر سے بہت ہی خوف زدہ ہیں۔ اسی کو اعجاز بیانی کہتے ہیں۔ شاعر اپنے داخلی محرکات کے خام مال (Raw Material) سے ایسا شفاف آئینہ ڈھال لیتا ہے کہ خارجی عوامل کا عکس' اس میں واضح نظر آنے لگتا ہے۔

۱۹۹۰ء میں حمایت علی شاعر چوتھی بار شکاگو تشریف لائے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی ایسوسی ایشن کا پانچواں مشاعرہ تھا' اس وقت حمایت علی شاعر کے ساتھ محسن بھوپالی بھی تھے۔ اس مشاعرے میں حمایت علی شاعر کی شخصیت کا ایک دلنواز روشن پہلو ہمارے سامنے آیا۔ حمایت علی شاعر دوستوں کے دوست تو بہرحال ہیں لیکن ادب اور انسانیت کے ناتے وہ مخالفین کو بھی گلے لگا سکتے ہیں۔ اس کا ہمیں علم نہیں تھا۔ محسن بھوپالی ایک عرصے تک حمایت علی شاعر کے خلاف لکھتے اور لکھواتے رہے ہیں۔ "شخص و عکس" (مقالات و مباحث حمایت علی شاعر ۱۹۸۴ء) کا ایک گوشہ اس کا آئینہ دار ہے۔ اور احوال واقعی' (مرتبہ مرزا سلیم بیگ ۱۹۹۴ء) کے صفحات ان تفصیلات سے بھرے پڑے ہیں' لیکن محسن بھوپالی نے جب گلے کے کینسر میں مبتلا ہوکر آپریشن کے بعد اپنی آواز کھودی تو حمایت علی شاعر پچھلی ساری تلخیوں کو فراموش کرکے محسن بھوپالی کو امریکہ میں

متعارف کرانے کے لئے ساتھ لے آئے۔ جب یہ لوگ شکاگو پہنچے تو ہمیں پتہ چلا کہ محسن بھوپالی آواز' غذا کی نالی سے نکالتے ہیں۔ جیسے ڈکار لی جاتی ہے۔ ہم بے انتہا نروس تھے کہ نامعلوم مشاعرے میں محسن بھوپالی کے ساتھ کیا سلوک ہو۔ لیکن ڈاکٹر عابد اللہ غازی نے محسن بھوپالی کی پذیرائی کے لئے پہلے سے اسٹیج سیٹ کردیا۔ تعارف غیر معمولی رقت آمیز اور حکیمانہ تھا۔ جگر کے اس شعر سے تعارف کا آغاز کیا۔

دل مضطرب سمجھ سکے شاید
اک شکستہ رباب کا عالم

اور کہا "محسن نے اپنی جادو بیاں آواز میں بڑے خوبصورت' شعر سنائے ہیں۔ گلے کے موذی کینسر نے ان کی آواز چھین لی ہے لیکن وہ فکر ابھی جوان ہے جس نے محسن کو قبولیت عام بخشی ہے" پھر محسن نے غذا کی نالی سے نکلنے والی کھرکھری آواز میں چند قطعات پیش کیے اور ایک غزل سنائی۔ تو سامعین پر ایک جادو کا سا اثر ہوا۔ اس کے بعد حمایت علی شاعر اسٹیج پر تشریف لائے اور بہ چشم نم اعلان کیا" یہ ہمارے عہد اور ہمارے ادب کا ایک بڑا سانحہ ہے کہ جو آواز ہندوستان' پاکستان اور دور دور کے ملکوں تک گونج رہی تھی وہ آواز اپنے ہی کلام کو سنانے اور پیش کرنے سے محروم ہوگئی' لیکن شاعر اپنی کتابوں میں زندہ رہتا ہے۔ اپنے اشعار میں زندہ رہتا ہے۔ اور اس کی آواز محرومی کے باوجود صدیوں پر پھیل جاتی ہے۔ مجھے یہ سعادت حاصل ہورہی ہے کہ میں محسن بھوپالی کو آپ تک پہنچاؤں "محسن نے بڑے لاجواب شعر کہے ہیں۔" اس تعارف کے بعد حمایت علی شاعر نے چند ایک چیدہ چیدہ شعر سنائے اور محسن کی خوبصورت نظم "تسلسل ٹوٹ جائے گا" جو نازک جذباتی کا حسین افسانہ ہے' سنائی۔ نظم کی شبنم میں ڈھلی ہوئی زبان' جذبات اتار چڑھاؤ' اور حمایت علی شاعر کی پر سوز آواز ایسا معلوم ہوا کہ کیف غم روح کا نغمہ خاموش بن کر سرود بربط ہستی سے ہم آغوش ہوگیا۔

یہ منظر وڈیو کیسٹ میں محفوظ ہے۔ محسن بھوپالی' حمایت علی شاعر کے دائیں جانب کھڑے ہیں اور حمایت علی مائیک کے سامنے "تسلسل ٹوٹ جائے گا" سنا رہے ہیں۔ سامعین شدت جذبات سے مغلوب ہو کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ کچھ لوگ تالیوں کے شور میں دونوں شاعروں کو تحسین پیش کررہے ہیں اور کچھ عالم حیرانی میں مبہوت' اس لمحہ جاودانی کو احساس کے کینوس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلینے کی آرزو میں منہ کھولے ساکت کھڑے ہیں۔ میں اکثر ٹی وی پر اس منظر کو دیکھتا ہوں اور ہر بار یہی احساس ہوتا ہے کہ شاید مشاعروں کی تاریخ میں ایسا انوکھا واقعہ کہیں اور نہیں ہوا ہو۔ اس تاریخی لمحے نے ایک شاندار اور نہ مٹنے والی روایت کو جنم دیا ہے۔ ایک شاعر نہ صرف اپنی آواز بلکہ دل اور اپنی شخصیت کا ایک روشن باب اپنے ہم عصر کی جھولی میں ڈال رہا ہے۔ اور ہم تاریخ کے گرد آلود جھروکے سے نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ اس تاریخ ساز لمحے کے عینی شاہد ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ عبقری شخصیت اپنا سب کچھ اپنے ہم عصروں پر نچھاور کرکے اور بلند قامت ہوجاتی ہے تو کیا یہ مبالغہ ہوگا؟

اس واقعہ کے بعد حمایت علی شاعر کی عزت و توقیر میرے دل میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ ۱۹۹۲ء میں جب میں نے ہندوستان کا دورہ کیا تو کراچی جا کر حمایت علی شاعر سے ملنے کی خواہش کو دبا نہ سکا۔ چنانچہ مصروفیت کے باوجود صرف دو دن نکال کر میں کراچی پہنچا۔ اور وہاں حمایت علی شاعر نے مجھ جیسے غیر معروف شخص کو جس انداز سے کراچی کے علمی اور ادبی حلقے سے

(باقی صفحہ ۳۸۴ پر)

احوال واقعی

مرزا سلیم بیگ

(لیکچرار سندھ یونیورسٹی)

(مطبوعہ ۱۹۹۳ء)

غالبا ۸۳ء کی بات ہے ہم چند طلبا نے حمایت علی شاعر صاحب سے اصرار کیا تھا کہ وہ اپنے ان تمام جوابی مضامین اور خطوط کو کتابی شکل میں شائع کریں جو متنازعہ ادبی مسائل اور شخصی اختلافات سے متعلق ہیں اور گزشتہ ۲۵ سال سے مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں بکھرے پڑے ہیں۔

وجہ یہ تھی کہ اسی سال شیم احمد کی کتاب "برش قلم" شائع ہوئی تھی اور اس میں "باب زرد" کے تحت ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید وغیرہ اور "باب سرخ" کے تحت احمد ندیم قاسمی' پروفیسر ممتاز حسین' سبط حسن' صہبا لکھنوی' شہزاد منظر' انور خواجہ اور پروفیسر عتیق احمد کے ساتھ حمایت علی شاعر کے خلاف بھی ایک ایسا غیر مہذب مضمون شائع ہوا تھا اور جو بقول ان کے ۶۳ء کا تحریر کردہ تھا اور اس کتاب کا واحد غیر مطبوعہ مضمون تھا۔ انہی دنوں یعنی ۲۰ مئی ۸۳ء کو جب "برش قلم" کے اقتباسات جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ "جسارت" (کراچی) کے ادبی صفحہ پر شائع کئے گئے تو حمایت صاحب نے بھی آواز اٹھائی اور جوابی مضمون کے طور پر "جسارت" ہی میں شیم احمد کا نفسیاتی تجزیہ کر ڈالا جو ۱۰ جون ۸۳ء کو شائع ہوا۔ شیم احمد جھلا اٹھے اور مذکورہ اخبار میں ۲۴ جون ۸۳ء کو حمایت علی شاعر کے خلاف ایک طویل خط نما مضمون چھپوایا' جس میں بے شمار "ناشائستہ اور رکیک الفاظ" استعمال کئے گئے تھے....

شیم احمد کے تہذیب سے گرے ہوئے انداز تحریر اور بے بنیاد الزامات کے خلاف چوں کہ قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی جاچکی تھی اور مشہور ترقی پسند شاعر اور وکیل حسن حمیدی نے متعلقہ حضرات کو غالبا" ہتک عزت کا نوٹس بھی بھجوادیا تھا' اس لئے مدیر "جسارت" نے "مخصوص الفاظ" نکال کر ان کی جگہ نقطے لگادیئے۔ بقول خانہ بگوش (مشفق خواجہ

"نظیر اکبر آبادی کے دیوان کی طرح شیم صاحب کے مراسلے میں متعدد مقامات پر آپ کو نقطے نظر آئیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض الفاظ یا اسمائے صفات ہم سے "پڑھے" نہیں جاسکے' مجبورا انہیں حذف کرنا پڑا اور نکتہ مشتی سے کام لینا پڑا۔ (جسارت ۲۴ جون ۸۳ء)

شیم احمد کی ان تحریوں کو ادبی حلقوں میں' کس نگاہ سے دیکھا جاتا تھا! اس کا ذکر اس لئے مناسب نہیں کہ اب ان کا انتقال

ہوچکا ہے (خدا ان کی مغفرت کرے) اس دوران قمر جمیل نے بھی بقول ان کے "برش قلم" سے "گمراہ ہوکر" اور بعض افراد کے اکسانے پر "نوائے وقت" (کراچی) میں حمایت علی شاعر کے خلاف اپنے "ادبی کالم" میں کچھ پیراگراف لکھ دیئے تھے (مطبوعہ ۱۲۲پریل ۸۳ء) مگر جب اسی اخبار میں ۲۴جون ۸۳ء کو حمایت صاحب کا جوابی مضمون (اپنے مطبوعہ کلام کے تاریخی حوالوں کے ساتھ) شائع ہوا تو نہ صرف قمر جمیل صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا بلکہ حمایت صاحب سے معافی بھی مانگ لی۔ شیم احمد بھی خاموش ہوکر بیٹھ گئے اور سلیم کی خاطر' حمایت علی شاعر نے شیم احمد کو معاف بھی کردیا (بحوالہ روزنامہ "حریت" ۱۹اگست ۸۳ء اور "کلیم" سکھر' ۲۶ اگست ۸۳ء)

ابھی یہ غبار بیٹھا ہی تھا کہ ایک دن یکایک محسن بھوپالی صاحب نے (بقول ان کے) "ڈنکے کی چوٹ" پر یہ اعلان کیا کہ حمایت علی شاعر کے خلاف سب سے پہلے لکھنے کا اعزاز انہیں حاصل ہے۔ اور یہ کہ شیم احمد اور قمر جمیل نے جو الزامات عائد کئے وہ سب سے پہلے محسن صاحب نے لگائے تھے وغیرہ وغیرہ (بحوالہ روزنامہ "جسارت" ۲۶ اگست ۸۳ء روزنامہ "کلیم" سکھر ۲ ستمبر ۸۳ء اور روزنامہ "حریت" ۲۳دسمبر ۸۳ء)

شیم احمد کے مضامین میں محسن بھوپالی کے حوالوں اور بعض اخبارات مثلاً "حریت" اور "مشرق" کے ادبی کالموں کے بین السطور اشاروں سے یہ تو گمان تو ہورہا تھا کہ ۔

کون معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

مگر چونکہ شیم احمد' سلیم احمد اور قمر جمیل' تینوں عموماً ترقی پسند ادب کے خلاف لکھتے رہتے تھے' اور محسن صاحب کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہوتا تھا' اسلئے لوگوں کا ذہن ان کی طرف نہیں گیا مگر اس انکشاف کے بعد سوچنا پڑا "ڈنکے کی چوٹ" پر وہ حمایت صاحب کے مخالف اور درپردہ شیم احمد کے دوست کیوں بن گئے؟

ظاہر ہے کہ اس مخالفت کا سبب وہی ایک مختصر سا مضمون تھا جو محسن صاحب کے پہلے مجموعہ کلام "شکست شب" کی تقریب رونمائی (نومبر ۶۱ء) کے لئے حمایت صاحب نے لکھا تھا' اور جس میں زبان کی دو تین غلطیوں کی نشاندہی بھی کردی تھی۔ اس کے بعد محسن صاحب نے حمایت صاحب کی مخالفت پر کمر باندھ لی..... مگر تحریری طور پر پہلی بار ان کا ایک مراسلہ قلمی ہفتہ وار "کردار" بابت ۲۱ ستمبر ۶۳ء کو شائع ہوا جو حمایت صاحب کے ایوارڈ یافتہ نغمے "کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو" کے خلاف تھا (حمایت صاحب نے اس وقت اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

قلمی ہفتہ وار "نگار" اور "کردار" میں تقریباً تین ماہ تک (اگست تا اکتوبر ۶۳ء) حمایت صاحب کی مخالفت اور موافقت میں مراسلے چھپتے رہے۔ محسن صاحب نے ماہنامہ "الشجاع" (کراچی) میں "ثلاثی" کے خلاف بھی ایک خط لکھا اور وقفے وقفے سے کسی نہ کسی بہانے اور طریقے سے ان کی مخالفت میں مصروف رہے۔ مجبوراً حمایت صاحب نے بھی چند ایک خطوط کے جوابات دیئے۔ اصلی اور فرضی ناموں سے لکھے ہوئے کچھ متنازعہ خطوط اور ان کے جوابات اس کتاب میں شامل کردیئے گئے ہیں تاکہ لکھنے والوں کے مزاج اور طرز تحریر کا اندازہ ہوجائے۔

شیم احمد اور قمر جمیل ہوں کہ محسن بھوپالی..... حمایت صاحب کی مخالفت میں تینوں کی تحریروں میں ایک خاص بات مشترک نظر آتی ہے۔

"ایک جھوٹ کو اتنی بار دہراؤ کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگے۔"

ایسا لگتا ہے کہ ان حضرات نے اس مقولے پر ایک منصوبے کے تحت عمل کیا تھا۔

قلمی دنیا کو خیرباد کہنے کے بعد حمایت صاحب جب سندھ یونیورسٹی میں پڑھانے لگے (غالباً ۷۷ء کے اواخر میں) تو حیدر آباد (سندھ) کی ادبی فضا میں پھر ایک لہر آگئی۔ تدریس کے ساتھ ساتھ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شعبہ اردو کا مجلہ "صریر خامہ" کا "اقبال نمبر" مرتب کیا جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر انفرادی اہمیت رکھتا ہے۔ پھر ۷۸ء میں انہوں نے اس مجلّہ کا "نعت نمبر" مرتب کیا جس میں ان کا مقالہ "اردو نعتیہ شاعری کے سات سو سال" کے ساتھ ہی' ان ہی کی منتخب کردہ سات سو برس کی نعتوں کا انتخاب بھی شعراء کی مختصر سوانح حیات کے ساتھ شامل ہے۔ ۷۹ء میں انہوں نے ایک اور بڑا کام کیا۔ اور وہ یہ کہ جدید سندھی ادب کے منفرد شاعر شیخ ایاز کے منتخب کلام کے منظوم ترجمہ "حلقہ مری زنجیر کا" (مترجمہ فہمیدہ ریاض) پر ایک طویل مقدمہ لکھا جو ایاز صاحب کی شخصیت اور شاعری کا تجزیہ بھی ہے اور محاکمہ بھی۔ (مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی' جام شورو) پھر اسی سال یہ مقدمہ شیخ ایاز کے منتخب اردو کلام اور مختلف اہل قلم کے منتخب تراجم کے ساتھ ایک الگ کتاب کی صورت میں "شیخ ایاز" (شخص اور شاعر) کے نام سے پروفیسر آفاق صدیق کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا۔ ۸۰ء میں حمایت صاحب نے اپنے پہلے مجموعہ کلام "آگ میں پھول" (طبع اول ۵۶ء) کا دوسرا ایڈیشن کچھ اضافوں کے ساتھ شائع کیا اور ۸۱ء میں اپنی چار طویل افسانوی اور تمثیلی نظموں کا مجموعہ "تشنگی کا سفر" کے نام سے اہل ادب کے سامنے پیش کر دیا۔

ان کتابوں کے بعد حمایت صاحب نے اپنے منظوم اور منثور ریڈیائی ڈراموں "فاصلے" سندھی لوک کہانیوں کا تمثیلی روپ "مہران موج" قومی نغمات "اپنے پرچم تلے" اور اپنی ثلاثیوں کا مجموعہ مرتب کرنے میں مصروف تھے کہ ۸۴ء میں شمیم احمد کی کتاب "برش قلم" آگئی اور پھر کچھ "دوستوں" نے وہ "فرض دوستی" انجام دیا کہ حمایت صاحب کو بھی ادھر متوجہ ہونا پڑا اور جوابی مضامین لکھ کر اپنی پوزیشن صاف کرنا پڑی۔ یہ سبھی "کرم فرما" کراچی کے کسی نہ کسی اخبار کے "کالم نگار" تھے' چنانچہ حمایت صاحب کو جوابی مضامین کی اشاعت میں دشواریاں بھی پیش آئیں۔ ایسے عالم میں روزنامہ "کلیم" سکھر کے مالک و مدیر مہرالٰہی شمسی اور نگہت بریلوی صاحبان نے حمایت علی شاعر کا ساتھ دیا۔ حمایت صاحب کی ہر جوابی تحریر تاریخی حوالوں کے ساتھ روزنامہ "کلیم" کے شماروں میں محفوظ ہے مگر ظاہر ہے کہ اس اخبار کی رسائی محدود تھی۔ مخصوص ادیبوں اور شاعروں تک اسے ضرور پہنچایا جاتا مگر "جسارت۔ نوائے وقت۔ حریت اور مشرق" جیسے اخبار پڑھنے والوں کی نظر سے حمایت صاحب کی تحریریں نہیں گزرتیں۔ وہ حمایت صاحب کے "محسنوں" ہی کی تحریروں سے متاثر ہوتے۔

ہم طالب علم جو نئی نسل کے نمائندے تھے اور جو ادبی دنیا میں تازہ وارد تھے۔ جن کے ذہن مختلف سنے سنائے واقعات سے پراگندہ تھے۔ جو اپنے عہد کی ادبی شخصیت کے بارے میں واضح طور پر جاننا چاہتے تھے..... سخت الجھن میں مبتلا تھے۔

ہم نے حمایت صاحب سے اصرار کیا کہ وہ بھی اپنی تمام جوابی تحریریں کتابی صورت میں شائع کردیں تاکہ ہم جیسے طالب علم بھی حقیقت سے واقف ہوسکیں اور ہمیں تجزیہ کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ حمایت صاحب نے وقت کے تقاضے کو سمجھتے ہوئے نہ صرف متنازعہ تحریریں بلکہ اپنے وہ تمام مضامین بھی جو اکتوبر ۵۳ء سے اپریل ۸۴ء تک ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل اور اخبارات میں بکھرے پڑے تھے "شخص و عکس" کے نام سے (اشاعتی حوالوں اور متعلقہ مطبوعہ کلام کے عکس کے ساتھ) کتابی صورت میں شائع کریں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مخالفین کے مضامین' خطوط اور ہر اس کلام کی فوٹو کاپی بھی جس پر سرقے یا چربے کا الزام لگایا تھا (متعلقہ شعراء کی پوری نظموں کی فوٹو کاپیوں کے ساتھ) "چراغ بکف" کے

نام سے مرتب کر کے مختلف لائبریریوں میں رکھوادیں تاکہ اہل نظر خود فیصلہ کر سکیں کہ "حقیقت" کیا ہے اور "افسانہ" کیا؟

"شخص و عکس" کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا......

۱۔ تجزیہ (۱۲) تنقیدی اور تاثراتی مضامین

۲۔ تبصرہ (۳۰) کتابوں پر تبصرے

۳۔ تزکیہ (۳۰) سے زیادہ جوابی مضامین اور خطوط

(۴۷۶) صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۸۴ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ نئی نسل کو بہت سی حقیقتوں سے آگاہی ہوئی اور بیشتر غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ انہیں حمایت صاحب کی علمیت اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوا' اور اس قوت برداشت اور عالی ظرفی کا بھی' جو ان کے مضامین سے جھلکتی ہے۔ انہوں نے اپنی کسی تحریر میں "جواب آں غزل" کا انداز اختیار نہیں کیا۔ ان کے مزاج کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ جب یہ کتاب زیر طبع تھی تو سلیم احمد کا انتقال ہو گیا۔ (یکم ستمبر ۸۳ء)

حمایت صاحب پر جو گزری' اسکا اندازہ اس مضمون سے ہو سکتا ہے کہ جو "شخص و عکس" میں شامل ہے انہوں نے سارے اختلافات بھلا کر نہ صرف مضمون لکھا (مطبوعہ روزنامہ "کلیم" سکھر مورخہ ۲۳ ستمبر ۸۳ء) بلکہ اپنی ایک "ثلاثی" کے ساتھ کتاب کا انتساب بھی سلیم احمد کے نام کر دیا۔

وہ ایک شخص کہ سایہ بھی تھا اجالا بھی
ہر اختلاف کا مرکز رہا مگر اب تک
رقابتوں میں محبت کا تھا حوالہ بھی

"شخص و عکس" کو شائع ہوئے ابھی دس سال بھی نہ گزرے تھے کہ محسن بھوپالی صاحب نے حمایت صاحب کے خلاف ایک اور مہم شروع کر دی۔

قابل اجمیری کے بارے میں ڈاکٹر ساجد امجد سے ایک سوانحی ناول لکھوایا گیا جو پہلے "سرگزشت" ڈائجسٹ (کراچی) میں اکتوبر ۹۲ء کو شائع ہوا۔ پھر "قومی اخبار" (کراچی) کے ہفتہ وار میگزین میں ۵ مارچ سے ۹ اپریل ۹۳ء تک مسلسل چھ اقساط میں چھاپا گیا۔

اس ناول میں حمایت صاحب کا نام لئے بغیر ایسے واقعات بیان کئے گئے تھے جو نہ صرف ان کی توہین کے مترادف تھے بلکہ انہیں "قابل دشمن" حتیٰ کہ قابل صاحب کا "قاتل" تک لکھ دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ادبی اخلاقیات ہی نہیں' سماجی اخلاقیات کے بھی منافی تھی۔ چنانچہ حمایت صاحب نے اپنے نام کی بجائے جب قلمی نام ابن مریم کو "وسیلہ تحقیق" بنایا (مکتوب بنام ایڈیٹر "قومی اخبار" مطبوعہ ۱۹ اپریل ۹۳ء) تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس ناول کے پیچھے بھی جناب محسن بھوپالی کا ہاتھ تھا۔ ساجد امجد نے اپنے وضاحتی مکتوب (مطبوعہ "قومی اخبار" ۳۰ اپریل ۹۳ء) میں موصوف کا "ذکر خیر" ان الفاظ میں کیا ہے....

"..... قابل اجمیری کے ایک ہم عصر جناب محسن بھوپالی کے مشورے خاص طور سے شریک تحریر رہے۔ وہ کئی ایسی باتوں کے عینی شاہد ہیں جو کہیں شائع نہیں ہوئیں۔"

اس کے علاوہ ساجد امجد نے "تحقیقی وسائل" کے طور پر جن تین رسالوں کی نشاندہی کی' وہ یہ تھے.....

۱۔ پندرہ روزہ "رہنما" کے دو شمارے (۱۰ اگست اور ۱۷ اگست ۴۳ء)
۲۔ "طالب علم" ڈائجسٹ (قابل نمبر) فروری ۷۰ء
۳۔ ہفتہ وار "فکر و عمل" (قابل نمبر) اگست ۷۷ء

آخری دونوں رسائل اس دور میں شائع ہوئے جب حمایت صاحب کا قیام حیدر آباد میں نہیں تھا وہ اپنی قلمی مصروفیات کے سبب لاہور میں رہتے تھے۔

ان رسائل میں بھی محسن بھوپالی اور ان کے "رفیق خاص" حسن ظہیر (ایک دفتر کے کلرک) کے مضامین جن میں حمایت صاحب کا نام لئے بغیر اسی تنقیدی نشست اور اسی مشاعرے کا حوالہ تھا جس کی رپورٹ پندرہ روزہ "رہنما" (قابل صاحب کی زندگی ہی میں) شائع ہو چکی تھی۔

اب یہ سوچنا ضروری ہو گیا کہ مذکورہ ناول میں بیان کردہ دیگر واقعات ساجد امجد کو کیسے معلوم ہوئے جبکہ انہوں نے اپنے وضاحتی مکتوب میں واضح طور پر یہ لکھ دیا تھا کہ ....

"وہ کبھی قابل صاحب سے نہیں ملے اور کبھی حیدر آباد میں نہیں رہے۔" (ساجد امجد ۴۸ء کو رامپور میں پیدا ہوئے' خدا جانے پاکستان کب آئے' قابل صاحب کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۳ یا ۱۴ سال تھی)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محسن صاحب نے ساجد امجد کو ساری معلومات اپنے انداز میں "زبانی" فراہم کی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس سال یہ ناول شائع ہوا یعنی ۱۹۹۲ء میں...... اسی سال محسن صاحب کا سفرنامہ امریکہ (حیرتوں کی سرزمین) بھی چھپ کر بازار میں آگیا۔ اس میں تو محسن صاحب' حمایت صاحب کے بہت ممنون نظر آتے ہیں مگر ساجد امجد کو جو "مواد" فراہم کیا وہ ان کے کسی اور ہی جذبے کی نمائندگی کرتا ہے۔ ۸۶ء میں سندھ یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر جب حمایت صاحب کراچی چلے گئے تو مختلف اخبارات سے ایسی خبریں بھی ملتی رہیں.... جن سے اندازہ ہوا کہ اب محسن صاحب اپنی "پچھلی حرکات" سے باز آچکے ہیں۔ انہوں نے خود دس سال پہلے لکھے ہوئے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ "کلیم" سکھر ۳۰ مارچ ۸۴ء) اور حالیہ انٹرویوز (مطبوعہ "نوائے وقت" ۱۹ نومبر ۹۲ء اور "فیملی میگزین" ۲۵ جنوری ۹۳ء) میں بھی یہ اعتراف کیا کہ وہ "جوانی کی غلطیاں" تھیں اور اب وہ اس دور سے نکل آئے ہیں۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا "وہ دور" ساجد امجد کے سپرد کر دیا اور خود حمایت صاحب کے "حلقہ ارادت" میں آگئے...... کیوں نہ ہو' آخر وہ (بقول خود) حمایت صاحب سے "دو سال" چھوٹے ہیں اور اس بنا پر اب انہیں "اپنا بزرگ دوست اور سربراہ" ماننے لگے ہیں (بحوالہ "حیرتوں کی سرزمین" مطبوعہ ۹۲ء صفحات نمبر ۱۰۔ ۱۳ اور ۳۰) خیر..... ہم نے حمایت صاحب کو پھر مجبور کیا کہ وہ اس "ناول" کا محاسبہ کریں اور حقیقت پس پردہ سے نئے لکھنے والوں کو بھی آگاہ کریں۔ ظاہر ہے کہ قابل صاحب کے انتقال کے (۳۰) سال بعد ایک بالکل ہی غیر متعلق اور ناواقف شخص کا......... "ایسے چشم دید واقعات لکھنا........" آخر کیا معنی رکھتا ہے۔ ایسی تحریر سراسر کردار کشی کی تعریف میں آتی ہے۔ یہ کس قسم کا ادب ہے جو ہمارے پیش رو ہمیں ورثے میں دے رہے ہیں۔

ہمارے اصرار پر حمایت صاحب پھر آمادہ ہوگئے۔ ہم نے مطلوبہ رسائل اور بعض مضامین کی فوٹو کاپیاں انہیں فراہم کردیں اور انہوں نے تاریخی حوالوں کے ساتھ ایک تفصیلی مضمون لکھ کر "قومی اخبار" کو بھیج دیا جو اس کے ہفتہ وار میگزین میں قسط وار شائع ہوتا رہا (۴ جون تا ۹ جولائی...... جملہ چھ اقساط)

ہمارا خیال تھا کہ حقیقت نمایاں ہونے پر قمر جمیل کی طرح محسن بھوپالی بھی (جو موجودہ حالات میں حمایت صاحب کے "بہت ممنون" رہنے لگے ہیں) اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے معذرت چاہ لیں گے' اور یہ تکلیف دہ سلسلہ ختم ہوجائے گا...... مگر انہوں نے اخباری کالم نگاروں سے اپنے تعلقات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے (پھر حمایت صاحب کے خلاف جلی سرخیاں لگوا کر "جواب آں غزل" کی روایت کے مطابق نہ صرف جوابی مضامین لکھنے شروع کردیئے (مطبوعہ "قومی اخبار" ۹ جولائی، ۱۶ جولائی اور ۲۳ جولائی ۹۳ء) بلکہ حسب سابق "قربتی ناموں" سے مراسلے بھی چھپوائے (مطبوعہ "قومی اخبار" ۲۰ اگست ۹۳ء)

جن دنوں یہ مضامین چھپ رہے تھے' حمایت صاحب ملک سے باہر تھے' پہلے مختلف مشاعروں کی دعوت پر انگلینڈ' ناروے اور سویڈن وغیرہ گئے تھے پھر تقریباً تین ماہ امریکہ اور کینیڈا میں مختلف سیمینار اور مشاعروں میں مصروف رہے۔ جنوری ۹۴ء میں واپس آئے تو جدہ سے بلاوا آگیا...... اپنی بیگم کے ہمراہ عمرہ کرکے واپس آئے تو میں مبارکباد دینے کراچی پہنچا اور اپنے ساتھ وہ تمام رسائل لیتا گیا جن میں ان کے خلاف یہ تحریریں چھپتی رہیں۔ "قومی اخبار" کے علاوہ ایک غیر معروف ہفتہ وار "دو پنچ لوک" میں بھی (۱۴ اگست ۹۳ء اور ۲۰ ستمبر ۹۳ء کے شماروں میں) حمایت صاحب کے خلاف شمیم احمد (مرحوم) کا وہ مضمون جو انہوں نے ۱۹۶۶ء میں لکھا تھا اور پہلی بار اپنی کتاب "برش قلم" (مطبوعہ ۱۹۶۸ء) میں شائع کیا گیا تھا...... حسب روایت جلی سرخیوں کے ساتھ دو قسطوں میں چھاپا گیا (یہ وہی مضمون ہے جس سے "گمراہ ہوکر" قمر جمیل نے "نوائے وقت" میں دو ایک کالم لکھے تھے اور بعد میں شرمندہ ہوکر حمایت صاحب سے معافی مانگ لی تھی اور پھر سلیم احمد کی نا طرح...... حمایت علی شاعر نے شمیم احمد کے خلاف دائر کیا جانے والا ہتک عزت کا مقدمہ بھی واپس لے لیا تھا (ان تمام واقعات کی تفصیل تاریخی حوالوں کے ساتھ "شخص و عکس" میں موجود ہے) اس سلسلے کی چند ضروری تحریریں "احوال واقعی" میں بھی شامل کردی گئی ہیں تاکہ بقول محسن صاحب "ریکارڈ درست رہے" لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ (۳۰) سال بعد شمیم احمد (مرحوم) کے اس "مطعون اور رکیک" مضمون کی دوبارہ اشاعت، آخر کس مقصد سے عمل میں آئی؟

یہی نہیں...... حال ہی میں حیدر آباد (سندھ) سے ایک نیا رسالہ "ذوقی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے مارچ۔مئی ۹۴ء کے شمارے میں (۲۴) سال پہلے کے "طالب علم" ڈائجسٹ (قابل نمبر) فروری ۱۹۷۰ء میں شائع شدہ ایک "تقابلی" مضمون "وادی مہران کی تین آوازیں" (شاعر۔ محسن۔ قابل) دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مصنف کی "لا علمی" سے قطع نظر...... اس مضمون میں حمایت صاحب کو' محسن بھوپالی سے بھی کم تر درجے کا شاعر دکھانا مقصود تھا۔ جابجا ان کے ترنم کا حوالہ ہے' بقول مصنف وہ "صف اول" کے شاعر شمار ہوتے ہیں تو صرف اپنی "مسحور کن آواز" کے سبب...... یہ مضمون مصنف کا پہلا اور آخری مضمون ہے۔ اس کے بعد ان کی کوئی تحریر کہیں نظر نہیں آئی۔ مضمون میں چونکہ محسن صاحب کے عہدے "محکمہ تعمیرات میں انجینئر" ہونے کی اطلاع (جب کہ وہ صرف ڈپلوما ہولڈر تھے) کے علاوہ ان کی شاعری کی متعدد خصوصیات کا بھی ذکر ہے۔ اس لئے گمان ہوتا ہے کہ یہ مضمون بھی انہیں کی "رہنمائی" میں لکھا گیا ہوگا اور اب اس کی اشاعت ضرورت یوں پیش آئی کہ "ایک خاص مقصد" کے تحت شمیم احمد (مرحوم) کا مضمون بھی کراچی کے ایک ہفت روزہ میں چھپوایا جا چکا تھا۔

حمایت صاحب نے قابل صاحب کے بارے میں اپنے تفصیلی مضمون "آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے" (مطبوعہ "قومی اخبار" مورخہ ۴ جون ۹۳ء) کی پہلی ہی قسط میں ایک "خاص منصوبے" کی طرف اشارہ کردیا تھا اور ماہ بہ ماہ چھپنے والی

مخالفانہ تحریروں کی فہرست بھی تاریخ وار دیدی گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ (۲۵) اور (۳۰) سال پہلے کے مطبوعہ مضامین کی دوبارہ اشاعت اسی منصوبے کی کڑیاں ہیں کہ نئی نسل کو حمایت صاحب کی طرف سے بدگمان کیا جائے۔ سیدھے اور صاف ذہنوں میں ایسی غلط فہمیاں پیدا کی جائیں کہ ادب اور معاشرے میں ان کا کردار "مسخ" ہو کر رہ جائے..... کاش محسن صاحب اور حمایت صاحب کے مخالفین جانتے کہ رقت "ناچینا" نہیں ہوتا۔ "طالب علم ڈائجسٹ" کے "قابل نمبر" میں بھی اس قسم کے مضامین کی شمولیت، محسن صاحب کی مرضی سے عمل میں آئی تھی "اظہار تشکر" کے طور پر رسالے کے ایڈیٹر نے خود اعتراف کیا تھا کہ......

"قابل نمبر کے مضامین نظم و نثر کے حصول اور ترتیب و تدوین کے سلسلے میں..... سرفہرست محسن بھوپالی کا نام آتا ہے..... انہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی ہے۔" (صفحہ ۱۲)

حمایت صاحب سے جب میں نے اس "تازہ واردات" کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے زیر لب مسکرا کر پروفیسر منظور حسین شور کی ایک رباعی پڑھی

آدھا ہو کوئی شخص کہ پونا ہو کوئی
ہاتھوں میں ادب کے نہ کھلونا ہو کوئی
قدر قد و قامت میں کوئی عیب نہیں
فکری قد و قامت کا نہ بونا ہو کوئی

پھر انہوں نے اپنی میز کی دراز سے ایک ایسا مضمون نکالا جو کہیں شائع نہیں ہوا تھا، یہ مضمون کسی عالم صاحب نے محسن بھوپالی کے "جوابی مضامین کے جواب میں" لکھا تھا اور بذریعہ رجسٹری ۲۹ اگست ۱۹۹۳ء کو ایڈیٹر "قومی اخبار" (الیاس شاکر) کے نام پوسٹ کر دیا تھا جب اسے شائع نہیں کیا گیا تو انہوں نے اس کی ایک کاپی (مع رجسٹری کی رسید) اس خواہش کے ساتھ حمایت صاحب کو بھیج دی کہ وہ اسے کہیں اور چھپوا دیں..... مگر..... حمایت صاحب ٹال گئے۔ یہ مضمون چونکہ تحقیقی اہمیت بھی رکھتا ہے اور تاریخی اہمیت بھی...... اس لئے اس (تحقیقی) کتاب میں اس کی اشاعت ضروری سمجھتے ہوئے میں نے اسے بہ اصرار حمایت صاحب سے لے لیا اور اب انکی اجازت سے کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ عنوان ہے

پردہ چشم اٹھا، دیدہ تحقیق سے دیکھ

محسن صاحب واقعی نیک و غریب آدمی ہیں، حمایت صاحب نے ان کی شاعری کے ابتدائی مجموعے میں ایک دو غلطیوں کی نشاندہی کیا کر دی کہ ساری زندگی ان کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک محاذ پر پسپا ہوئے تو دوسرا محاذ کھول دیا۔ قابل اجمیری مرحوم کے حوالے سے ایک تنقیدی نشست کی گفتگو کو ان کی جان کا عذاب بنا دیا۔ اس بہانے انہیں کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ کیسے کیسے الزام ان کے سر نہ رکھ دیئے گئے حتیٰ کہ ان کے خلاف ایک چھوٹا ناول تک لکھوا دیا گیا..... اس کے برعکس حمایت صاحب نے جوابی مضامین لکھ کر صرف اپنی پوزیشن صاف کی۔ ان کے کسی دوست تک نے کبھی کسی پر کوئی الزام نہ رکھا نہ کوئی بدزبانی کی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ محسن صاحب کی اس روش کو کیا نام دیا جائے۔ فی الحال انہیں کا ایک قطعہ یاد آ رہا ہے

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے
اس حادثہ وقت کو کیا نام دیا جائے
میخانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

میں نے "احوال واقعی" میں (تاریخی حوالوں کے ساتھ) وہ تمام تحریریں یکجا کردی ہیں جو بالخصوص حیدر آباد کے "ادبی مثلث" قابل اجمیری، حمایت علی شاعر اور محسن بھوپالی..... ان کے باہمی تعلقات، اختلافات اور اس شہر کی ادبی فضا کا مختلف زاویوں سے جائزہ پیش کرتی ہیں اور ان محرکات کا بھی سراغ دیتی ہیں، جن کے سبب حمایت صاحب نے اپنی کتاب "شخص و عکس" مرتب کی اور نسبتاً" وسیع پس منظر میں ایک خاص دور کے ادبی ماحول کا محاسبہ کیا لیکن اس کتاب میں چونکہ حمایت صاحب نے صرف اپنے "جوابی مضامین" شائع کیے تھے اس لئے محسن صاحب کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی.....

"یہ گوشہ (شخص و عکس کا ایک باب "تزکیہ") چونکہ یکطرفہ تحریوں اور اپنی من پسند تاویلات پر مشتمل ہے اس لئے ایک اور گوشے کا متقاضی ہے۔" (مطبوعہ "قومی اخبار" ۲۱ جولائی ۹۳ء)

(یہ اعتراض غور طلب ہوتا اگر حمایت صاحب "چراغ ہمت" ایسا مجموعہ مرتب نہ کردیتے) خیر "احوال واقعی" مرتب کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کسی بدگمانی کا جواز پیدا نہ ہوسکے۔ میں نے تاریخ وار محسن بھوپالی کی تحریریں بھی جمع کردی ہیں اور حمایت صاحب کے جوابات اور تصریحات بھی اور گردو پیش کے ان لکھنے والوں کے رشحات قلم بھی، جو ان مسائل پر اپنے اپنے انداز سے روشنی ڈالتے ہیں تاکہ غیر جانبدار اہل ادب و دانش، ٹھنڈے دل سے سوچ سکیں کہ حیدر آباد اور کراچی کے (گزشتہ ۳۰ - ۳۵ سالہ ادبی ماحول میں) ان مخصوص اہل قلم نے کیا کردار ادا کیا اور کیسے "کارہائے نمایاں" انجام دیئے۔

مکتبہ "نئی قدریں" نے حمایت علی شاعر صاحب سے "چراغ ہمت" کی اشاعت کی اجازت بھی حاصل کرلی ہے۔ انشاء اللہ جلد اسے بھی کتابی صورت میں شائع کردیا جائے گا۔

(پیش لفظ۔ تحقیقی کتاب "احوال واقعی" مرتبہ۔ مرزا اسلم بیگ۔ مطبوعہ ۱۹۹۴ء۔ مکتبہ نئی قدریں۔ حیدر آباد۔ سندھ)

بقیہ حمایت علی۔ شاعر اور شخص۔۔ ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی)

متعارف کروایا وہ نہ مٹنے والے نقوش میرے دل و دماغ پر چھوڑ گیا۔ وہیں میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ حمایت علی شاعر کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کروں گا۔ اسی بہانے میں نے حمایت علی شاعر کی ساری کتابیں ہتھیالیں اور اب لکھنے بیٹھا ہوں تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ مزید اور کیا لکھوں، خاکہ نگاری نہ میرا فن ہے اور نہ میں شاعری کے ابجد سے واقفیت کا دعویٰ کرسکتا ہوں۔ لہٰذا لکھوں تو کیا لکھوں۔ پھر جس شخصیت پر قلم اٹھانا چاہتا ہوں وہ اتنی ہمہ گیر اور پہلودار ہے کہ جو بھی لکھوں گا وہ نامکمل اور تشنہ ہی ہوگا۔ لیکن ایک خیال باعث تسکین ہے کہ آدم جس شے کا نام ہے اس کی مکمل تصویر کسی زبان و بیان کی تنگ دامنی کے احاطہ میں آہی نہیں سکتی۔ تو کیوں نہ اس مضمون کو یہیں ختم کردوں۔ نامکمل اور تشنہ۔

(مطبوعہ "پاکستان لنک" (Pakistan Link) لاس اینجلس۔ امریکہ۔ ۱۹۹۴ء)

بیگم حمایت علی شاعر

درونِ خانہ

(ایک گفتگو)

شائستہ فرحت

جرزف۔ نیوٹن کا قول ہے کہ "دنیا میں سب سے زیادہ سکھی بیوی وہ نہیں جس کی شادی کسی عظیم آدمی سے ہوجاتی ہے بلکہ سکھی بیوی وہ ہے جس نے شوہر کو عظیم بنادیا" حمایت علی شاعر صاحب کی بیوی کا شمار بھی ایسی ہی بیویوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے شوہر کو عظیم شاعر بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات تو سب ہی اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ایک شاعر کی زندگی کیا ہوتی ہے اور وہ گھریلو زندگی پر بھرپور انداز سے توجہ نہیں دے سکتا حمایت علی شاعر صاحب خوش قسمت ہیں کہ انہیں ایسی بیوی ملی جس نے انہیں زندگی میں کبھی ذہنی انتشار سے ہراساں نہیں ہونے دیا اور زندگی کے سفر میں ہر قدم پر ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ جس کی وجہ سے آج وہ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔

بیگم حمایت علی شاعر سے ملاقات کے لئے جب ہم ان کے گھر پہنچے تو گول میز کانفرنس کا سا سماں تھا اور ممی ڈیڈی کے سامنے تمام بچے اپنی اپنی دن بھر کی رپورٹ پیش کر رہے تھے۔ شاعر صاحب سگریٹ کے دھوئیں میں اپنے بچوں کے مسائل حل کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اگلے دن شاعر صاحب کے شاعر و ادیب قسم کے دوستوں کی دعوت تھی جس کے لئے بیگم اور بچیاں پکوان کی منصوبہ بندی میں مصروف تھیں۔

شاعر صاحب کو جب بتایا گیا کہ ہم ان کی بیگم کا انٹرویو لینے آئے ہیں تو کہنے لگے "کہ آخر میری بیگم سے کیا قصور سرزد ہوگیا ہے؟" ہم نے کہا کہ "لوگ اخبارات میں آپ کے متعلق اکثر و بیشتر پڑھتے رہتے ہیں لیکن ہم آپ کی بیگم اور گھریلو زندگی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں کہ آپ جب فرصت میں ہوتے ہیں تو کیسا وقت گزارتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کی بیگم ہی صحیح رہنمائی کرسکتی ہے۔"

شاعر صاحب نے کہا کہ پھر آپ ان کا انٹرویو کیجئے میں باہر چلا جاتا ہوں۔ ورنہ میری موجودگی میں یہ ٹھیک طرح سے میری برائیاں نہیں کرسکیں گے اور بیگم سے یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے کہ آپ دل کھول کر میری برائیاں بیان کیجئے۔ آج آپ کے بولنے کا دن ہے۔"

حمایت علی شاعر کی بیگم معراج نسیم سنجیدہ گھریلو خاتون ہیں ان کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔ وہ ایک ایسی خاتون ہیں جنہوں نے بچپن سے شاعر صاحب کو دیکھا ہوا ہے وہ دونوں آپس میں رشتہ دار بھی تھے اور ان لوگوں کا بچپن ساتھ ہی گزرا۔ بچپن ہی سے انہیں مطالعے کا بے انتہا شوق رہا ہے جو اب بھی برقرار ہے اس کے علاوہ بچوں کے لئے مضامین اور کہانیاں

بھی لکھا کرتی تھیں جو کہ مسلم ضیائی کے رسالے "تارے" میں شائع ہوتے تھے۔ ابتداء میں حیدر آباد دکن میں کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی اور بلونت سنگھ کو بہت پڑھا اور ان سے متاثر ہو کر افسانے بھی لکھے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب جیلانی بانو اور واجدہ تبسم نے بھی افسانے لکھنا شروع کیے تھے۔ ان کا ایک افسانہ ۱۹۵۰ء میں ہفتہ وار "پرواز" (حیدر آباد دکن) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک افسانہ ۱۹۵۴ء میں "تجلّی" کراچی' میں چھپا تھا جو کہ تحسین سروری نکالتے تھے۔ اس وقت بچے بہت چھوٹے چھوٹے تھے میں ان چیزوں پر زیادہ وقت صرف نہیں کر سکتی تھی لہٰذا بعد میں وہ صرف بچوں کی پرورش ہی میں مگن ہو گئیں جس سے ذہن بٹ گیا اور اب صرف مطالعہ ان کا آخری مشغلہ رہ گیا ہے وہ آج کل قرۃ العین حیدر کو بہت زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں سے ان کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ انہوں نے شاعری کبھی نہیں کی البتہ ہر شاعر کو پڑھا ہے لیکن زیادہ تر انتخاب پڑھا ہے۔ شاعروں میں فیض صاحب کی غزلیں بے انتہا پسند ہیں کیونکہ ان کی غزلیں بہت ملائم اور انداز بیان بہت شیریں ہوتا ہے۔ غیر ملکی مصنفین میں گورگی' ٹالسٹائی کی کتابوں کے علاوہ مشہور ناول "ڈاکٹر ژواگو" بھی پڑھا ہے۔

حمایت علی شاعر کے بارے میں محترمہ معراج نسیم نے بتایا کہ بعض اوقات پہلی نظر میں کوئی شخصیت بڑی پرکشش نظر آتی ہے مگر دوبارہ ملنے پر اس کا سحر ٹوٹ جاتا ہے مگر شاعر صاحب کی شخصیت ایسی نہیں ہے۔

بے حد مصروفیات کے باوجود شاعر صاحب گھریلو زندگی میں بھرپور حصہ لیتے ہیں بچوں کی تعلیم و تربیت کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور بڑے بچوں کے ساتھ ان کی دلچسپیوں میں حصہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بہت اچھے باپ ہیں۔ اپنی چاروں بیٹیوں کو شاعر صاحب بے انتہا چاہتے ہیں لیکن خاص بات یہ ہے کہ ہر بیٹی سے علیحدگی میں یہ کہتے ہیں کہ "میں تمہیں سب سے زیادہ چاہتا ہوں" اور جب چاروں آپس میں مل کر بیٹھتی ہیں تو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ جملہ باری باری سب سے کہا جا چکا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس طرح بیٹیوں کے دل چھوٹے نہیں ہوتے اور وہ سمجھتی ہیں کہ ڈیڈی سب کو برابر چاہتے ہیں۔

شاعر صاحب بہت اچھے شوہر بھی ہیں' لڑتے بالکل نہیں ہیں' انہیں غصہ کبھی نہیں آتا اور جب آتا بھی ہے تو جلد ہی صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ بعد میں معصومانہ انداز میں کہتے ہیں کہ کیا مجھے ابھی غصہ آیا تھا۔ ہم نے پوچھا کہ آپ کو کبھی شاعر صاحب کی بے پناہ مصروفیات پر غصہ نہیں آتا! تو انہوں نے جواب دیا کہ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں ایک نامور اور شہرت یافتہ شاعر کی بیوی ہوں اور یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔

میں کوشش کرتی ہوں کہ انہیں کسی قسم کی ذہنی پریشانی میں مبتلا نہ کروں۔ جتنا ان کو ذہنی سکون ملے گا اتنا ہی تخلیق کا مرحلہ آسان ہوگا اور عوام کے سامنے بہتر چیز پیش ہو سکے گی۔ میں ان سے ہر وقت تعاون کرتی ہوں میں ان کو گھرداری کے مسائل میں الجھنے نہیں دیتی۔ انہیں گھر کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ کر دیا ہے۔ تاکہ ان کا ذہن منتشر نہ ہو اور وہ اپنا کام بہتر طور پر سرانجام دے سکیں۔ وہ ۱۹۵۲ء سے مشاعروں میں جا رہے ہیں شادی کے ابتدائی عرصے میں رات کو اکیلے بھی رہنا پڑتا تھا لیکن ان کی خوشی اور شہرت کی خاطر خوشی خوشی سب برداشت کر لیتی تھی۔ اب بھی یہی حال ہے کیونکہ مجھے خود بھی اس سے بہت خوشی حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ شاعر صاحب کوئی نئی نظم یا غزل کہنے کے بعد جب تک وہ گھر میں سب کو سنا نہ لیں بے چین رہتے ہیں۔ پھر تمام بچے تبصرے کرتے ہیں اور اپنی معلومات کے مطابق رائے دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر ایک نشست میں غزل مکمل نہیں ہوتی' کبھی دو دن لگ جاتے ہیں کبھی ایک ہفتہ لگ جاتا ہے۔ جب تک غزل مکمل نہ ہو جائے

بہت بے چین رہتے ہیں۔

اپنی گھریلو مصروفیات کی روداد سناتے ہوئے انہوں نے کہا کہ صبح کے وقت سارے بچے ناشتہ کرکے یونیورسٹی، کالج اور اسکول چلے جاتے ہیں اور آخر میں ہم دونوں اور گڑیا رہ جاتے ہیں۔ صبح شاعر صاحب بیڈٹی پیتے ہیں جس کا سلسلہ دس گیارہ بجے تک چلتا رہتا ہے۔

ہمارے گھر شاعر صاحب کے اکثر دوست احباب، آتے رہتے ہیں شعر و سخن کی محفلیں جمتی ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کیونکہ میں خود بھی ادب کا شغف رکھتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں گھر کا سارا کام کاج خود ہی کرتی ہوں، ظاہر ہے اس سے کام کا بار تو بڑھ جاتا ہے لیکن مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے ویسے بھی جب کوئی دوست احباب، یوں ملنے آجائے تو شاعر صاحب اتنے مگن ہوجاتے ہیں کہ دس گیارہ بجے کے جانے والے دو بجے جاپاتے ہیں۔ اس سے گھر کے نظام میں تبدیلی تو ہوتی ہی ہے لیکن بہرحال ناگوار نہیں گزرتا۔ شاعر صاحب بڑی گمبھیر شخصیت کے مالک ہیں اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ شعر کی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں اور رکشہ و ٹیکسی وغیرہ گھر سے کافی آگے نکل جاتا ہے اور انہیں خبر تک نہیں ہوتی۔ یہ ان کے بھلکڑپن کی صرف ایک مثال ہے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ انہیں شاعر صاحب کی شاعری کا کون سا انداز پسند ہے تو انہوں نے کہا کہ یوں تو ابتدا سے اب تک سبھی کچھ پسند ہے لیکن ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۴ء تک شاعری میں جو فرق آیا ہے وہ مجھے بے حد پسند ہے۔

ایک ذاتی سا سوال یہ بھی تھا کہ شاعر صاحب نے کوئی نظم یا غزل آپ پر بھی کہی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ خاص طور پر کوئی نظم یا غزل نام لے کر نہیں کہی جاتی۔ ہمارے بے حد اصرار پر انہوں نے بتایا کہ ان کے مجموعہ کلام "آگ میں پھول" میں "رفیقہ حیات" کے نام سے ایک نظم ہے یہ اس وقت کہی گئی تھی جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت یہ نظم پڑھ کر بہت خوشی حاصل ہوتی تھی۔ لیکن اب وہ صرف ایک نظم اور ایک شاعر کے محسوسات ہیں۔

شاعر صاحب کے آٹھ بچے ہیں ان کے نام رکھنے میں بھی انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے کام لیا ہے یعنی لڑکیوں کے نام جاوداں، فرزاں، غزالاں، زرافشاں اور لڑکوں کے نام روشن خیال، اوج کمال، ذوالجمال، بلند اقبال وغیرہ ان کی دو بڑی بیٹیاں جامعہ کراچی میں زیر تعلیم ہیں غزالاں میٹرک کا امتحان دے رہی ہیں اور گڑیا یعنی زرافشاں ابھی گود میں ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ "مشرق" کراچی ۳۰ اپریل ۱۹۷۵ء)

(بقیہ۔ ایڈیٹر "جواز" کے نام)

فی الحال اپنی کتابوں کی ایک فہرست بھیج رہا ہوں، اسے اگلے شمارے میں (بطور اشتہار) شائع کردینا، وہاں کم از کم میری کتابوں کی اطلاع تو پہنچ جائے۔

مجھے وارث علوی کی کتابوں کی بھی تلاش ہے کوئی صورت ممکن ہوسکتی ہے؟ میرے پاس ان کا پتا نہیں اور پتا ہو بھی تو کیا فائدہ۔ انہیں شاید میرا نام ہی یاد ہوگا۔ ملاقات کہاں یاد ہی ہوگی۔ محض اتنے سے تعلق پر کتابوں کی فرمائش کس طرح کرسکتا ہوں۔

ہاں، میں اپنی کتابیں بھیج دوں گا (شاید "کتاب نما" میں اس کا پتا مل جائے) پھر شاید وہ اخلاقاً توجہ کرلیں۔

اچھا یار... خدا حافظ..... یار زندہ صحبت باقی

(مطبوعہ "جواز" مالیگاؤں فروری ۱۹۸۷ء)

ترقی
بذریعہ
بہترین کارکردگی

وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کی ہدایت پر بلدیہ عظمیٰ کراچی اہلیان شہر قائد کو زیادہ سے زیادہ شہری سہولتوں کی فراہمی کے لئے رو بہ عمل ہے۔
وزیراعظم کی کراچی سے خصوصی دلچسپی اور لگاؤ کے نتیجہ میں کراچی پیکیج کے تحت متعدد ترقیاتی منصوبے شروع کیے گئے۔
ان ترقیاتی فلاحی منصوبوں کی تکمیل سے شہر قائد میں ایک مثبت تبدیلی اور سماجی و معاشی انقلاب آئے گا۔

ہمارا ایمان ہے کہ باتوں سے بہتر وہ کام کرنا ہے جو عوام کے بہترین مفاد میں ہو۔

جن منصوبوں کا افتتاح ہو گیا

- صافی جلانی بائی پاس
- ماکس بے ٹرک اسٹینڈ
- نیو میٹر بعد خان لانڈھی

کرڑا شرین

- کورنگی اسپورٹس کمپلیکس
- عمر یوسف ڈیڈ ایل (دھوراجی گوٹھ)
- ممنون شہید پل (ٹالا پل)
- لیڈیز اسپورٹس کمپلیکس لیزا
- لیڈیز پارک گارڈن ایسٹ
- مختلف علاقوں میں پانچ لائبریریوں کا قیام

بلدیہ عظمیٰ کراچی

حمایت علی شاعر کے خطوط

مرزا ادیب کے نام

خلیل خلیل الرحمان اعظمی..........؟

"اسی روش پہ رقیبوں کے واقعات تو دیکھ"

ادب لطیف میں آپ نے پڑھنے والوں کے خطوط کا سلسلہ شروع کر کے ایک نئی دلچسپی کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ اسی طرح نئے نئے موضوعات چھڑیں گے۔ نئی بحثوں کا آغاز ہوگا۔ آج کل جبکہ دو ماہی اور سہ ماہی رسائل زیادہ شائع ہونے لگے ہیں اور لوگوں کا رجحان بھی زیادہ تر اسی طرف ہے تو ماہناموں کا انداز ترتیب بدل جانا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ اگر ماہناموں میں زیادہ سے زیادہ ایسی چیزیں شامل ہوں جو لوگوں کو سوچنے، لکھنے اور پڑھنے کی طرف مائل رکھیں۔

تازہ شمارے میں پڑھنے کا مواد کافی ہے۔ میں بعض چیزوں کے بارے میں تفصیل سے لکھنا چاہتا تھا... لیکن خلیل الرحمان اعظمی کا خط پڑھ کر ارادہ بدل دیا۔

بھئی یہ حضرت تو بڑے دلچسپ نکلے۔ صاف بدل گئے ہیں۔ ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیبوں کا موصوف نے کچھ انداز میں مذاق اڑایا ہے جیسے ان کا اس تحریک سے کبھی کوئی تعلق رہا ہی نہیں اور ان سے کبھی کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس کے مرتکب بے چارے ترقی پسند شعراء ہوتے ہیں یعنی......

یہاں تو بھیڑ چال کی کیفیت ہے کبھی ترقی پسندی کی ہوا چلی تو ہر شخص چونی کا ممبر ہو کر اور دو چار بھونڈے نعرے لگا کر اپنے آپ کو مستند ادیب اور شاعر سمجھنے لگا اور جو جتنا فن کے آداب سے بیگانہ ہوا اتنا ہی اپنے آپ کو ترقی پسند کہنے لگا۔ کبھی آزاد نظم کا فیشن چلا تو ہر شخص ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اور ایرے غیرے تشاعروں نے مضحکہ خیز نظموں کا اتنا انبار لگا دیا کہ اچھے شعراء کی بہترین کاوشیں بھی اس میں گم ہو گئیں۔ اب ادھر ترقی پسندی کے نام پر جو بے جان اور وقتی نظمیں سیاسی پارٹیوں کے اشارے پر یا ان کی خوشامد میں لکھی گئی تھیں اور "اس طور پر ان کے بل پر" تھوڑی بہت شہرت حاصل کی گئی تھی ان کی بے وقعتی اور بے مائیگی دو چار سال ہی میں ظاہر ہو گئی۔ تو ان حضرات نے نظم گوئی سے توبہ کر لی اور غزل پر ٹوٹ پڑے کہاں تو غزل لکھنا مراجعت پسندی کی علامت تھی اور یہ صنف جاگیردارانہ دور کی یادگار تھی اور کہاں صرف اس پر گزارا کیا جانے لگا۔"

اس انداز تحریر پہلی بات تو یہ ظاہر کرتی ہے کہ موصوف خود شدید احساس کمتری میں مبتلا ہیں، ورنہ "ایرے غیرے" شعراء پر اپنا غصہ نہ اتارتے

دوسری بات یہ کہ "ادب کا مخلص طالب علم" بننے کے موڈ میں وہ یہ بھول گئے کہ کبھی وہ ترقی پسند ادب کے بھی مخلص طالب علم تھے اور سیاسی پارٹیوں پر یا ان کی خوشامد میں ہمیشہ "ہیجان اور وقتی نظمیں" لکھ لکھ کر تھوڑی بہت شہرت حاصل

کرنے کی فکر میں نظر آتے تھے۔ اس دوران موصوف نے بھی شاید ہی کوئی غزل کہی ہو۔ لیکن جب سے وہ "ادب کے مخلص طالب علم" بن گئے ہیں' "غزل پر ہی گزارا کر رہے ہیں" تو کیا ان "ایرے غیرے" شاعروں میں جناب خلیل الرحمان اعظمی کا شمار نہیں ہے؟ اور کیا یہ تمام فقرے جو انھوں نے دوسروں پر چست کیے ہیں' خود ان کی شخصیت کو آئینہ نہیں دکھاتے؟ مزید براں اب جس قسم کی نظمیں اور غزلیں موصوف کہہ رہے ہیں کیا وہ سب کی سب ادب کے معیار پر پوری اترتی ہیں؟ اور انکو پڑھ کر کیا ہم یقین کرلیں کہ موصوف فن کے آداب سیکھ کر واقعی ادب کے مخلص طالب علم بن گئے ہیں' اور اب ان کی "ادبی واقفیت" (حد درجہ) مشتبہ نہیں رہی ہے؟

وامق جونپوری کی ایک کمزور غزل کی مثال دیکر انہوں نے اسے "ترقی پسندی" سے تعبیر کیا ہے

میں وامق کی اس غلطی کے جواز میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ محض سہو ہے کیونکہ غزل کے دوسرے تمام مصرعوں کا آہنگ ایک ہے ایسی غلطیاں اکثر ہو جاتی ہیں کہ ۔

بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

ہرچند اس قسم کی غلطیاں غیر محسوس طور پر ہوتی ہے۔ تاہم غلطی ضرور ہے اور شاعر کو اس سلسلے میں چوکنا رہنا چاہئے۔ لیکن اعظمی صاحب نے محض دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر اسے ترقی پسندی کا نام دیدیا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ اعظمی صاحب کا مجموعہ کلام "کاغذی پیرہن" جو اس قسم کی غلطیوں کا پشتارہ ہے اس کے بارے میں کیا کہا جائے؟ خود اعظمی صاحب تجویز کریں کیونکہ ان کی غلطی تو "ترقی پسند" نہیں ہو سکتی۔

پچھلے دنوں موصوف نے اپنا مجموعہ کلام مجھے بھیجا تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ نئی نسل کا یہ "ذہین نقاد اور منفرد شاعر" عروض و قوافی کا فن تو کجا الفاظ برتنے کے آداب سے بھی واقف نہیں۔ غزل کی طرف ان کا بڑھتا ہوا رجحان دیکھ کر میں نے پہلے اس مجموعہ کی غزلیں پڑھنے کی کوشش کی۔ پہلی غزل ہی میں ایک شعر وزن سے گرا ہوا تھا۔

سن لو کہ شاید نہ پھر سن سکو گے
کہنی ہیں تم سے کچھ ایسی باتیں

لیکن میں نے اسے محض سہو سمجھ کر نظرانداز کردیا اور دوسری غزل پڑھنی شروع کی اس میں کچھ اور ہی گل کھلے ہوئے تھے ایک دو شعر سن لیجئے.....

جو وہ ہیں جان محبوب تو کتنے بو الہوس ٹھہرے
چمن کی تیرگی میں اور بھی وہ گل سنورتا ہے

دونوں مصرعوں میں ربط کیا ہے آخر؟ اور "گل سنورتا ہے" کیا زبان ہے؟

اسیران قفس پھر چونک اٹھے شور بہاراں سے
نہ جانے گل کھلے کیا' آج صیادوں میں چرچا ہے
(خالص روایتی شعر ہے)

اکتا کر میں نے نظموں کا رخ کیا، پہلی ہی نظم میں زبان اور عروض کی متعدد غلطیاں نظر میں آئیں۔ نظم کا عنوان تھا "میرا گھر نہ میرا ویرانہ"

یہ وہ گھر ہے کہ جو شاید کبھی ہو سکتا تھا گھر

اس قسم کے مجہول مصرعے تقریباً ہر بند میں موجود ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو

میں جو اس وقت نظر آتا ہوں یہ میں نہیں ہوں
میری تصویر ہے، دھندلا سا ہے یہ سایہ مرا

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے کس قدر چست اور مناسب انتخاب ہے، "اس وقت" کا محل استعمال دیکھئے اور "نہیں" کی نشست ملاحظہ فرمائے۔ دوسرے مصرعے میں "تصویر" اور دھندلے سائے" کی مناسبت بھی غور طلب ہے۔ مترادفات کی تلاش میں شاعر کتنا کامیاب ہے اور پھر "دھندلا" کا کا استعمال بروزن "دھن لا" بھی داد طلب ہے۔

مزید براں ہر بند میں حشو و زائد کی اتنی بھرمار ہے کہ بس شاعر کی "ادبی واقفیت" کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔ طوالت کے خیال سے تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ ہاں چلتے چلتے قافیوں کا لطف اٹھا لیجئے۔ آپ نے "لکھ" کا قافیہ "کہہ" باندھا ہے اور "بنا" کا قافیہ "مرجا" باندھ دیا ہے۔ مگر خیر! میری ان باتوں کو اعظمی صاحب جہالت یا قدامت پسندی سے تعبیر کریں گے کیونکہ ان کی "پشت پر ادب عالیہ کا سرمایہ" ضرور ہے مگر زبان و بیان کی "غیر ضروری" قید و بند کے غالباً وہ قائل نہیں ہیں۔ میر صاحب تو "عالم کا جان مارا" تک لکھ گئے ہیں اور سنا ہے کہ اعظمی صاحب کو عرف عام میں "بندہ میر" بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اس "بندہ میر" سے یوں اپنا مزاج نہیں ملے گا۔ بیچ سے کوئی نظم آنکھ بند کر کے نکالی جائے۔ شاید کوئی نظم ایسی نکل آئے کہ منہ کا مزہ بدل جائے۔ مختصر سی نظم نکلی "دوری" ایک دو نہیں پورے چھ مصرعے بحر سے خارج۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کتنی نظمیں پڑھی جا سکتی تھیں چنانچہ میں نے اختتامیہ پڑھنا شروع کر دیا۔ کہ دیکھیں اسلوب احمد انصاری اس شاعر کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ اسلوب انصاری صاحب نے بھی دوستی کا حق خوب ادا کیا ہے۔ بہترین اشعار کا جو کچھ انتخاب کیا ہے اس کے ایک شعر سے اندازہ ہو جائے گا۔

زخم کھا کھا کے سنورتی ہی چلی جاتی ہے
میری دنیا نہیں یہ کوئی دلہن ہے صیاد

پہلے تو یہ دیکھئے کہ ردیف کتنی مضبوط ہے اور کس قدر صحیح اور پھر مطلب پر غور کیجئے۔ شاعر نے اپنی دانست میں جدلیات کا فلسفہ حل کیا ہے۔

اگر اعظمی صاحب اپنے ہم عصروں کی اس ذہنی کجروی کو دور کرنے کا مقدس فرض انجام دے رہے ہیں تو واقعی وہ ادب کے "مخلص طالب علم" ہیں۔

اک بات اور......... اور وہ یہ کہ بھئی ترقی پسندوں نے تو غلطیاں کیں اور ان کی سزا بھی پائی۔ اعظمی صاحب انہیں ادب کا مخلص طالب علم سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ لیکن یہ انہیں کا ظرف ہے کہ انہوں نے اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف بھی

کیا اور ہنوز اپنی تربیت میں مصروف ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو شروع سے اس تحریک کے مخالف تھے اور غزل کو سہل انگاری کے مترادف سمجھتے تھے۔ آج کل وہ بھی تو دھڑا دھڑ غزلیں کہہ رہے ہیں پھر اعظمی صاحب کا نزلہ بے چارے ترقی پسندوں پر ہی کیوں گرا؟

دوسری بات یہ کہ (صرف) میر کی پیروی کے نام پر (جسے نوکلاسیکیت کا نام بھی دیا جاتا ہے) یا جدت طرازی کے عنوان سے (جو صرف تجرید پرستی تک محدود ہے) آج کل جو کچھ لکھا جارہا ہے اور اعظمی صاحب جسے ادب عالیہ سے استفادہ فن سے خلوص اور انفرادیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ آخر اس کی میعاد کتنی ہے؟

کیا واقعی یہ شاعری فنی لحاظ سے پختہ' زبان و بیان کے اعتبار سے مرصع اور فکری اعتبار سے اتنی بلند ہے کہ اسے "بڑی شاعری" کہہ سکیں؟ کیا اعظمی صاحب بتاسکیں گے کہ فکری اعتبار سے اس شاعری کا رخ کدھر ہے؟ اور وہ کس فلسفہ حیات کے تابع ہے؟ اگر وہ اسے صرف محسوساتی شاعری کا نام دیتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا اب شاعری کا منصب یہی رہ گیا ہے؟ کیا دنیا کا بڑا ادب یا خود ہمارا ادب عالیہ صرف اسی دائرے میں محدود رہا ہے؟ کیا اب اردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی' غالب' اقبال اور جوش کی شاعری کی کوئی اہمیت نہیں رہی؟ کیا میر کے (غلط یا صحیح) تتبع نے اس عظیم ورثے کو دفتر بے مایہ بنا کر رکھ دیا ہے؟ کیا اب شاعری کا زندگی کے تغیر پذیر مادی عوامل سے کوئی رشتہ نہیں رہا؟ کیا عظیم شاعری کے امکانات ماحول سے بے نیاز داخلیت کی عکاسی ہی میں پوشیدہ ہیں؟ کیا آج کے دور کا سب سے بڑا شعراء کہا جائے گا؟

ادھر پھول تھے اور ادھر پھول تھے
مگر چاند نے سب کے سب کھالئے

کیا اس انداز شعرگوئی کا جواز یہ نہیں ہے کہ جس دور میں آج کے شاعروں نے آنکھ کھولی ہے وہ دور ان کی نظروں میں سیاسی' اقتصادی اور تہذیبی اعتبار سے ایک بھول بھلیاں ہو کر رہ گیا ہے اور ہم لوگ یہ سوچنے سے قاصر ہیں کہ اس سے نکلنے کا راستہ کدھر ہے؟ اور اسی لئے جدھر منہ اٹھا' چلنے لگے ہیں۔ اگر اسی افراتفری اور ذہنی انتشار کی پروردہ مجہول شاعری کو اعظمی صاحب "جاندار" سمجھتے ہیں؟ تو وہ جانیں......!

میں مانتا ہوں کہ ترقی پسند تحریک کے جلو میں جو شعری ادب تخلیق ہوا ہے اس کا کچھ حصہ ہلکا بھی ہے لیکن ہر غلطی کو "ترقی پسندی" کا نام دینا نہ صرف زیادتی ہے بلکہ احسان فراموشی بھی ہے (یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں کہ اس تحریک کے زیر اثر ادب میں کیا کچھ اضافے ہوئے ہیں) اچھی اور بری تخلیقات ہر دور میں وجود میں آتی ہیں۔ لیکن بری تخلیقات کو مثال بناکر اس تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کم از کم اعظمی جیسے آدمی کو زیب نہیں دیتی۔ تیغ الہ آبادی کی جو غزل انہیں بہت پسند آئی ہے اسی غزل کا ایک شعر انہیں پھر سنانا چاہتا ہوں۔

بس ایک ہم تھے جو تھوڑا سا سر اٹھا کے چلے
اسی روش پہ رقیبوں کے واقعات تو دیکھ

(مطبوعہ "ادب لطیف" لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء)

اختر انصاری اکبر آبادی کے نام

(سلیم احمد کی جنسی شاعری اور سندھ میں ادبی خدمات)

برادرم اختر صاحب۔ تسلیم

سالنامہ ملا۔ شکریہ۔ حسب معمول اس شمارے میں چند ایسی چیزیں شامل ہیں جن کے بارے میں پہلے بھی کئی بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ اور اب بھی اگر تم سامنے ہوتے تو میں یہ خط نہ لکھتا بلکہ شاید اس بار تم سے لڑ پڑتا۔ اب میں تم سے صرف ایک ہی سوال کروں گا۔

آخر تم نے یہ چیزیں کیا سوچ کر شائع کیں؟

میرا اشارہ سلیم احمد اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے شعراء کی طرف ہے۔ اس شمارے میں ظفر اقبال کی دونوں غزلیں پڑھ کر کوفت ہوئی ارے بھائی یہ تو اچھے شعر کہا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے انہیں بھی اب اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا۔ یا انہیں جو شہرت ملی ہے اس سے وہ مطمئن نہیں ہیں۔ اس لئے سلیم احمد کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔

ذرا ملاحظہ کیجئے یہ اشعار

یہ "غزل" کے شعر ہیں

ہم بھی گئے تھے گرمیِ بازار دیکھنے
تھی اتنی بھیڑ، چوک میں تانگہ الٹ گیا

گھر والی کے واسطے بچی نہ پیالی چائے کی
کتے، بلی آن کر کھا گئے کیک، مٹھائیاں

چلتا پھرتا گود میں نیلا گولہ اون کا
نرم گلابی انگلیاں، گہری سرخ سلائیاں
پھرتا ہوں بازار میں، رک جاؤں لیتا چلوں
اس کے لئے بریزیر، اپنے لئے دوائیاں

اور ہاں پہلی غزل کا ایک اور شعر سنو........

نقاد کہنہ پر اثر شعر نو ہے یہ .....
... پڑھ کر غزل غریب کا بھیجا الٹ گیا

سبحان اللہ کیا نیا شعر ہے۔ اگر یہی نئی شاعری ہے تو اسے دور سے سلام۔ اب ذرا اس نئی شاعری کے امام سلیم احمد کے اشعار سنئیے

اب نہیں حیرت کہ ہوتیں کاش میری سالیاں
ایک محترمہ نے لکھ بھیجی ہیں مجھ کو گالیاں

نئی شاعری کی دھن میں اب سلیم احمد الفاظ کی صحت کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ "محترمہ" کا تلفظ غور طلب ہے۔ یاد رہے یہ وہی سلیم احمد ہیں جن کا ایک شعر یہ بھی ہے

کس انجمن گل کی تکن ہے کہ چمن میں
نکلا ہی نہیں پاؤں نسیم سحری کا

میر صاحب کی زمین میں ایسا شعر کہنے والا سلیم احمد آج کل کیا کہہ رہا ہے

گانٹھتے ہیں پھٹے ہوئے جذبات
ہو کے سید بنے سلیم چمار

مگر اب اس کا کیا علاج کہ جو شہرت اس قسم کے اشعار سے مل رہی ہے اس کا مزاج ہی کچھ اور ہے۔ بقول کسے تیر بہ ہدف نسخہ ہاتھ آیا ہے۔ جس محفل میں جائیے سلیم احمد کا ذکر۔ پہلے یہ شہرت عام کہاں حاصل تھی۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔

مجھے اس کا افسوس ہے کہ سلیم احمد جیسا شاعر "بدنامی" کو بھی شہرت کے ہم معنی سمجھ رہا ہے۔ اس نے اپنے جمالیاتی حسن کو جنسی جذبے کی قبر میں دفنا دیا ہے اور اس کا جواز یہ نکالا ہے کہ

میں اگر لکھ دوں تو فحاشی کی مد میں آئے گا
شہر میں ویسے بہت بہتی ہیں گندی نالیاں

ہر چند یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سعادت حسن منٹو نے بھی یہی جواز پیش کیا تھا۔ قطع نظر اس بات کے کہ شہر میں کتنی گندی نالیاں ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ ان نالیوں کو ترتیب دے کر "غزل" کا نام کیوں دیا جا رہا ہے اور اس غلاظت کو ہم ادب کیوں سمجھیں۔ سلیم احمد جس سماجی پس منظر میں یہ اشعار کہہ رہے ہیں۔ ایسے اشعار میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ نے بھی اپنے اپنے انداز میں کہے ہیں اور ان کے معتقدین نے تبرک کے طور پر ان کے کلیات میں بھی انہیں شامل کر دیا ہے۔ ہاں کہیں تہذیب آڑے آگئی تو اس مخصوص لفظ کی جگہ نقطے لگا دیئے ہیں ایک طرح سے وہ نظمیں بھی اپنی دور کے اسی سماجی پس منظر کی نمائندگی کرتی ہیں۔

آؤ سیلی..... کھیلیں، بیٹھے سے بیگار بھلی (نظیر)
کہتے ہیں اسی واسطے اس کام کو ہت رس (نظیر)

یا

میر صاحب کا یہ مصرعہ......

؎ اس کی پیدائش احتلام سے ہے

لیکن میر اور نظیر کی تمام عظمتوں کے باوجود ناقدین نے ان کے کلام کا مجموعی اثر یہ لیا کہ "پستشں غائت پست اور بلندش غائت بلند" کہہ دیا۔ اور پھر بلندیوں ہی پر میر صاحب کی شخصیت کو پرکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے برعکس سلیم احمد اینڈ کمپنی "پستشں غائت پست" کے دور میں اپنی شخصیت کی نمائش کر رہے ہیں اور اس کے جواز میں دوسرے لوگوں کے پیچے پٹائے دلائل پیش کر رہے ہیں۔ ان دلائل کو پیش کرتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سعادت حسن منٹو بھی صرف ان افسانوں کی وجہ سے بڑا فن کار نہیں جو کسی جنسی کج روی سے متعلق ہیں۔ بلکہ اس نے اور بہت کچھ لکھا ہے جو ان افسانوں سے زیادہ وقیع ہیں۔

شاید سلیم احمد کو یہ خیال ہو کہ اس قسم کا تجربہ یگانہ چنگیزی نے بھی کیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ کہوں گا کہ یہ تجربہ کرتے ہوئے بھی یگانہ نے "بلندش غائت بلند" کو نظرانداز نہیں کیا وہ اپنی زندگی سے لیکر اپنی شاعری تک ہر مقام پر اسی نظریئے کے حامل رہے۔ خیر، یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ یگانہ کتنے بڑے کردار کا انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ آج کے شعرائے کرام جو ایک طرف سرکاری ملازم ہیں اور دوسری طرف اپنی بغاوت کے علم بردار۔ کس طرح یگانہ چنگیزی کی پیروی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ انھیں منٹو کے الفاظ بھی دہرانے کا حق حاصل نہیں ہے اس لئے کہ وہ بھی اپنی طرز کا ایک ہی آدمی تھا۔ اس کی شخصیت بھی (زندگی سے لیکر افسانہ نگاری تک) ایک ہی رخ کی حامل تھی۔

ہاں۔ میں سلیم احمد کی اس قسم کی شاعری کو اس وقت اہم سمجھتا جب وہ اپنے "قدیم رنگ شعر" سے روگردانی نہ کرتے۔ سلیم کی ادبی تنقیدوں کا وہ مجموعہ بھی تمہیں یاد ہوگا۔ میں اس وقت اس کا نام بھول رہا ہوں، تم ہی نے تو شائع کیا تھا...... ذرا اسے اپنے ذہن میں تازہ کرو اور "نئی نظم اور پورا آدمی" پڑھو۔ کیا وہ سلیم احمد اس مجموعے میں کہیں نظر آتا ہے۔ حالانکہ مجھے نظریاتی طور پر اس سے بھی اختلاف تھا۔ کیونکہ وہ ترقی پسند ادیبوں سے "بغض معاویہ" کی ایک مثال تھا۔ خیر ان مقالات میں پھر بھی فکر میں ایک رو جاری و ساری تھی، لیکن میں اس لئے اسے اہمیت دیتا تھا کہ بہرحال حسن عسکری بھی اپنی جگہ ایک مکتب فکر کی داغ بیل ڈال رہے تھے۔ جس طرح میں مجنوں گورکھپوری اور ممتاز حسین سے متاثر ہوں اسی طرح سلیم احمد کو بھی حق حاصل تھا کہ وہ حسن عسکری کی راہ پر چلیں لیکن "نئی نظم اور پورا آدمی" میں تو بقول کسے شاگرد اپنے استاد سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گیا۔ اور صحیح سمت میں نہیں بلکہ غلط سمت میں۔ سلیم احمد نے اوپر والے اور نچلے دھڑ کی جو تخصیص کی ہے اور اس پیمانے سے مختلف شاعروں کو جس انداز سے جانچا ہے اب میں کیا عرض کروں......... کاش سلیم احمد کے ذہن میں رفیع الدین خان کا نام بھی رہ جاتا۔ پھر تو بات اسی نام سے شروع ہوتی اور میراجی پر آکر ختم ہو جاتی۔ یا پھر وہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے اور جرات، رنگین اور انشاء کی ریختی سے بات شروع کرتے۔ ارے بھائی یہ جدید شاعری (جس میں نئی نظم بھی شامل ہے) اسی ریختی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا (سلیم احمد کے انداز بیان میں) کہ پہلے کچھ حمل ساقط ہوئے۔ اور پھر مدت پوری ہونے کے بعد شاعری نے جنم لیا۔

اختر صاحب۔ میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ ایک تہذیبی تنزل نے ریختی کو جنم دیا تھا دوسرے تہذیبی تنزل نے موجودہ نام نہاد "جدید شاعری" (سلیم احمد کی وضاحت کی روشنی میں) کو جنم دیا ہے۔ یہ سب ہمارے ذہنی دیوالیہ پن کی علامتیں ہیں۔ یورپ بھی ایک تہذیبی تنزل کا شکار ہے اور ہم چونکہ ہر اعتبار سے ابھی غلام ہیں اس لئے

ان کی ہر چیز قبول کیئے جا رہے ہیں ظاہر ہے کہ ہر عبوری دور میں یہ انتشار رہا ہے۔ موجودہ ذہنی انتشار بھی وقتی ہے اور یہ نئی شاعری جس کا اتنی زور سے ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ اسی طرح ایک دن ختم ہو جائے گی جس طرح ریختی کا رواج ختم ہو گیا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان نئے شاعروں میں (سلیم احمد وغیرہ ٹائپ) کوئی بھی سماجی زندگی میں قبولیت عام حاصل نہ کر سکا۔ آج بھی جس ذوق و شوق سے فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری اور اختر الایمان وغیرہ کو پڑھا جاتا ہے۔ میراجی وغیرہ کو نہیں پڑھا جاتا۔ ان مقدم شخصیتوں کے علاوہ ۴۷ء کے بعد نمایاں ہونے والے شاعروں میں جتنی توجہ سے عزیز حامد مدنی، ابن انشاء، ناصر کاظمی (برگ نے تک) اور مصطفیٰ زیدی وغیرہ کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے کسی اور کا نہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے.......... یہ حقیقت ہے۔ اس دور میں جتنی اچھی غزلیں عزیز حامد مدنی کہہ رہے ہیں شاید ہی کوئی کہہ رہا ہو اسی طرح ابن انشاء نے جو نظمیں اور ناصر کاظمی نے اب سے دو برس پہلے تک جو غزلیں کہی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ چوتھا اہم نام مصطفیٰ زیدی کا ہے ان کے چاروں مجموعے ان کی ارتقائی منزلوں کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ تیزی سے اس منزل کی طرف رواں دواں ہیں جو اپنے مخصوص عہد آفرینی کی منزل ہے۔ بلاشبہ ہم انہیں ایک ''صحت مند جدید شاعر'' کہہ سکتے ہیں۔

اس شمارے میں مصطفیٰ زیدی پر کریم الدین کا جو مضمون شائع ہوا ہے وہ معلوم ہوتا ہے کہ رواروی میں لکھا گیا ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کریم صاحب کے پیش نظر زیدی کے تمام مجموعے نہیں رہے۔ زیدی کی موجودہ شاعری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ''نیام'' میں رہنے کے باوجود ان کے اشعار میں ابھی تک ''تیغ'' کی دھار نمایاں ہے۔ یہی دھار ان کی شاعرانہ شخصیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ کبھی وقت ملا تو زیدی کی شاعری کے بارے میں تفصیلی مضمون لکھوں گا۔ خدا کرے یہ فلمی دنیا تھوڑا سا وقت مجھے دیدے۔ آج کل بے حد مصروف ہوں۔ یہ خط بھی بڑا رواروی میں لکھ دیا۔

تمہارا

احباب کو سلام

حمایت علی شاعر

لاہور

۹ مارچ ۱۹۶۳ء

(مطبوعہ ماہنامہ ''نئی قدریں'' حیدر آباد، اپریل ۱۹۶۳ء)

(۴)

برادرم اختر صاحب

پروفیسر کریم الدین نے بہت صحیح لکھا ہے۔ شاعری دسویں پاس لوگوں کا کام نہیں، لیکن بھائی، موجودہ تنقید کا المیہ تو دیکھئے کہ اسے دسویں پاس بھی نہیں ملے۔ شمیم احمد کا شمار ایسے ہی ''پڑھے لکھوں'' میں ہوتا ہے۔ بات سلیم احمد کی تھی اور نئی نسل کے فاضل تنقید نگار نے مجھے اور عتیق احمد کو نواز دیا۔ شاید انہوں نے ''حق برادری'' ادا کیا ہے۔ سلیم احمد کے چھوٹے بھائی جو ٹھہرے۔ آخر ''چھوٹا پن'' کسی طرح تو ظاہر ہونا ہی چاہئے تھا۔ مجھ پر انہوں نے جو چھینٹے اڑانے کی کوشش کی ہے اس کے پیچھے بھائی کی محبت کلبلا رہی ہوتی تو میں اس جذبے کی قدر کرتا۔ لیکن ان صاحبزادے کی دراز دستی کا یہ عالم ہے کہ خود تو سر بازار اپنے بڑے بھائی کو ننگا کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اگر کوئی دوسرا آدمی ان کی برہنگی پر نظر ڈالنے یا ستر پوشی کرنے کی

کوشش کرے تو چراغ پا ہو جاتے ہیں اور جامے سے باہر ہو کر خود اپنا قد و قامت ظاہر کر دیتے ہیں۔ عتیق احمد پر انہوں نے جو احسان جتایا ہے وہ اس کا کھلا ثبوت ہے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ برادر عزیز' کسی پڑھے لکھے آدمی کو اگر کسی رسالے کا ایڈیٹر نہیں بنایا جاتا تو اس سے اس کی قابلیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ آج کل ہمارا ادب جس گروہ بندی کا شکار ہے اس کی وجہ سے بیشتر صاحب علم اور صاحب علم قعر گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ عتیق احمد کو کراچی کے اکثر لوگ جانتے ہیں۔ میں بھی ذاتی طور پر ان سے واقف ہوں۔ وہ آپ سے بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور ادب کی بھی بڑی اپ ٹو ڈیٹ اسٹڈی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ عتیق صاحب گزشتہ کئی برس سے لکھ رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے بہت کم مضامین شائع ہو سکے ہیں کیا کریں۔ بے چارے خوددار آدمی ہیں جس طرح آج شمیم احمد نے سر عام احسان جتا دیا۔ اسی طرح اگر اور لوگ بھی کرنے لگیں تو جینا دوبھر ہو جائے۔ اسی لئے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ شرفاء کا یہی طرز عمل ہوتا ہے۔ رہی گالی کی بات تو یہ شمیم احمد کی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ چونکہ وہ خود لوگوں پر کیچڑ اچھالنے کے عادی ہو گئے ہیں اس لئے دوسروں کی صحیح باتیں بھی انہیں کیچڑ کے دھبے نظر آتی ہیں۔

عتیق احمد نے "انشاء" میں جو مضمون لکھا تھا وہ دراصل فرائڈ کی روشنی میں سلیم احمد کے جنسی اور نفسیاتی تجزیے کی کوشش کی تھی۔ عتیق احمد نے بالکل ایک علمی مسئلہ اٹھایا تھا جسے شمیم احمد گالی سمجھ بیٹھے۔ اگر خاطر نازک پر بار نہ گزرے تو میں سلیم احمد کے اچھے دنوں کی غزلوں میں سے ایک شعر سناؤں اور اگر شمیم احمد کھسیانے ہو کر کھمبا نہ نوچنے لگیں تو انہی کی اصلاح میں یہ بھی لکھ دوں کہ سلیم احمد نے یہ شعر آتش سے "اچک" لیا ہے

وہ چوب خشک ہوں محروم آتش سوزاں
کہ بن جلائے جسے قافلہ روانہ ہوا
(سلیم)

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا
(آتش)

اور اس کے بعد تازہ غزلوں میں سے ایک شعر سنئے

زور وہ اور ہے' پاتا ہے بدن جس سے نمو
لاکھ کو دے کوئی رانوں میں دبا کر موسل

اب شمیم احمد صاحب اس "چوب خشک" اور اس "موسل" کا نفسیاتی ربط دریافت فرمائیں اور اس کے بعد اپنے بھائی صاحب کا جنسی تجزیہ کریں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ آتش کے اتنے بڑے ذخیرے میں سے "چوب خشک" ہی کو سلیم احمد نے اپنے لئے کیوں منتخب کیا؟ اس نکتہ خاص کو زیادہ واضح طور پر سمجھنے کے لئے کراچی کے فلمی ہفتہ وار "نگار" کے خاص نمبر میں سلیم احمد کا وہ انٹرویو بھی پڑھ لیں' جس میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ فلمی کہانی میں سب سے زیادہ وقت انہیں کس منظر نامے کے لکھنے میں پیش آتی ہے تو جواب "انہوں نے کہا تھا کہ رومانی' وجہ پوچھی گئی تو فرمایا۔ امپوٹنسی

اگر عتیق احمد بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں تو یہ بات گالی کیسے ہوگئی! شمیم احمد کو یاد ہوگا کہ ایک بار انجم اعظمی نے "سات رنگ" میں سلیم احمد کو مشورہ دیا تھا کہ وہ شادی کرلیں۔ اگرچہ سلیم احمد کو یہ بات بڑی ناگوار گزری تھی اور انہوں نے بڑے عامیانہ انداز میں اس کا یہ جواب دیا تھا کہ وہ کسی لڑکی کا انتظام کردیں۔ حالانکہ انجم اعظمی کا مشورہ انتہائی خلوص پر مبنی تھا۔ شادی ایک سماجی ذمہ داری کا مسئلہ ہے اس سے انسان کی جذباتی زندگی میں نہ صرف ایک توازن پیدا ہوجاتا ہے بلکہ بعض اخلاقی اقدار کا ادراک بھی ہوجاتا ہے۔ انکا منشا یہ تھا کہ شادی کے بعد جب سلیم احمد کے اندر ایک باپ کا وقار جنم لے گا تو وہ ایسے اشعار کہتے ہوئے خود شرمائیں گے اور انہیں یہ بھی احساس ہوگا کہ ان اشعار کی اشاعت کتنے گھرانوں کے لئے سوہان روح ہے (حالانکہ یہ احساس "نیا دور" والوں کو بھی ہونا چاہیے۔ جس کی مجلس ادارت میں ایک خاتون کا نام بھی شامل ہے) خود میرا حال یہ ہے کہ جب نیا دور آتا ہے تو گھر لے جانے سے پہلے وہ صفحات پھاڑ دیا کرتا ہوں جن پر سلیم احمد کا "کلام بلاغت نظام" چھپا ہوتا ہے۔ نیا دور بہرحال ایک ادبی پرچہ ہے۔ اور اسے خالص ادبی سمجھتے ہیں گھر کا ہر فرد پڑھتا ہے۔ اور کم از کم میرے گھر کا ہر فرد اتنا بالغ نظر نہیں کہ جتنے سلیم احمد یا نیا دور والوں کے متعلقین۔ میں نے اپنے خط میں اسی دکھ کو محسوس کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ "نئی قدریں" میں ایسے اشعار کیوں شائع کئے جاتے ہیں جنہیں ادب کہنا ادب کی توہین ہے۔ کیا ایڈیٹر کا اپنا کوئی مطمح نظر نہیں ہوتا؟ آج ہمیں کسی اخلاقی قدر کی ضرورت نہیں؟ اگر یہی بات ہے تو ان رسائل میں فحش تصاویر بھی شائع کردی جایا کریں تاکہ کوئی پردہ ہی درمیان میں نہ رہے اور میں تو کہوں گا کہ سلیم احمد خود اپنی ننگی تصاویر چھپوادیں تاکہ انہیں احساس ہوجائے کہ وہ آدھے آدمی ہیں یا پورے آدمی اور میرا خیال ہے "نیا دور" اس معاملے میں بھی ان کی پوری پوری اعانت کرے گا۔ اس طرح نہ صرف انہیں بھرپور شہرت مل جائے گی بلکہ ان کے چھوٹے بھائی کو بھی۔
عتیق احمد کی اس بات پر شمیم احمد بہت بگڑے ہیں کہ اس نے انہیں سلیم سے بریکٹ کیوں ہے؟ میرے خیال میں یہ بات اتنی ہی صحیح ہے جتنی عبداللہ سگریٹ کا یہ اشتہار.......

Smoking is strickly prohabited even — "Abdullah"

ان صاحبزادے کی ادبی پوچھ گچھ کی ساری بنیاد "سستی مخالفت" پر ہے' کبھی اس پر چھینٹا اڑایا' کبھی اس پر۔ پہلے شوکت صدیقی، طفیل احمد جمالی اور جمیل الدین عالی وغیرہ سے الجھنے کی کوشش کی مگر جب انہوں نے منہ نہ لگایا تو اپنے بڑے بھائی کے دامن میں پناہ ڈھونڈی۔ سلیم احمد نے اچھی غزلیں کہنا چھوڑیں اور شمیم احمد کے لئے مخالفت کا مواد فراہم کردیا۔ اب وہ لکھتے ہیں اور یہ ان کے بخیے ادھیڑتے ہیں بس اسی ایک ہنر پر شہرت کا کاروبار چل رہا ہے۔ اور اب شاید یہی ہنر وہ مجھے بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ لکھتے ہیں ہمیں حمایت علی شاعر سے کچھ کام کی باتوں کی توقع تھی۔

برادر عزیز' مجھ سے آپ کوئی توقع ہی نہ رکھیں' میں نہ تو آپ کی شہرت کا ذریعہ بن سکتا ہوں اور نہ مجھے آپ کی سی شہرت چاہئے۔ آپ اپنی راہ چلیں اور مجھے اپنی راہ چلنے دیں زمانہ خود اس بات کا فیصلہ کردے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ مجھے آپ جیسے "پڑھے لکھوں" کی داد کی ضرورت نہیں ہے بے بے داد کی۔ سلیم احمد کے رشتہ سے (سلیم احمد نے اپنی کتاب "نئی نظم اور پورا آدمی" مجھے دیتے ہوئے لکھا تھا ..... اپنے "سوتیلے بھائی" حمایت علی شاعر کے لئے) اگر میرا "برادرانہ" مشورہ مانیں تو آپ یوں کریں کہ کسی سکول میں داخلہ لے لیں اور تحصیل علم کے بعد اپنے اور دوسروں کے قد کو ناپنے کی کوشش کریں۔

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ "نئی قدریں" (حیدر آباد) ستمبر ۱۹۶۳ء)

(۴۰)

برادرم اختر صاحب! لاہور، ۱۴ دسمبر ۶۳ء

کوئی کچھ کہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ سندھ میں ادبی چہل پہل تمہارے دم سے ہے اور اس کی بہترین مثال میرپور خاص کا ادبی کنونشن ہے، مجھے افسوس ہے کہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے میں صرف مشاعرے میں شرکت کر سکا لیکن دیگر احباب سے جو تفصیلات معلوم ہوئی ہیں اس کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک تاریخی اجتماع تھا۔ (کاش میں بھی شرکت کرپاتا) بہر حال اس کنونش کے انعقاد اور اس کی کامیابی پر تمہاری جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہاں اگر تم مناسب سمجھو تو ان تعریفی کلمات کا ایک حصہ ہمارے محترم دوست علمدار رضا صاحب کی خدمت میں پیش کردو۔ کیونکہ میرے خیال میں اگر ان کی معاونت تمہیں حاصل نہ ہوتی شاید یہ ادبی اجلاس اس قدر کامیاب نہ ہوتا، خوش نصیب ہیں میرپور خاص کے لوگ کہ انہیں ایک علم دوست افسر ملا۔

علمدار رضا صاحب سے میری پہلی ملاقات مشرقی پاکستان (سید پور) کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی "صدر ہونے کے باوجود" وہ اس انہماک سے شعراء کا کلام سن رہے تھے اور قابل تحسین اشعار پر داد دے رہے تھے کہ میں اسی وقت ان کے شستہ ادبی ذوق کا قائل ہو گیا۔ اب میرپور خاص میں ان کی ادبی دلچسپیاں اظہر من الشمس ہیں اور پھر ایسی خدمات کے لیے تم پر ان کی نگہہِ انتخاب کا پڑنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مردم شناس ہی نہیں قدر شناس بھی ہیں۔

تم نے گزشتہ آٹھ دس سال میں سندھ میں اردو کی جو خدمت انجام دی ہے ۔ کوئی صاحب نظر اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اب ہر ایماندار شخص کو تمہاری اہمیت تسلیم کرلینا چاہیے۔

تم نے یہاں سے رسالہ نکالا اور مسلسل شائع کر رہے ہو (حالانکہ میں نے "شعور" کی مشعل جلائی تھی لیکن کچھ ہی دور جاکر تھک کر بیٹھ گیا، اور تم اپنی راہ پر گامزن ہو)

تم نے شہر شہر جاکر ادبی جماعتیں قائم کیں اور اب تک وہ جماعتیں اپنے اپنے حدود میں کام کر رہی ہیں۔

تم نے مختلف چھوٹے چھوٹے شہروں میں بابائے اردو کی یاد میں کتب خانے کھلوائے۔

تم نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی تخلیقات کو نمایاں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہی "نو آموز ادیب" اب تمہارے مخالف ہوگئے ہیں اور تمہارے احسانات کو فراموش کر کے تم پر احسان دھرنے لگے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہیں اس بات کا بھی غم ہو، لیکن میرے بھائی، یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا غم کیا جائے۔ ہر دور میں کچھ کم ظرف لوگ بھی ہوتے ہیں۔ وہ "محسن کشی" ہی میں فخر سمجھتے ہیں تم اپنا کام کئے جاؤ، زمانہ تمہاری خدمات کو فراموش نہیں کرے گا۔ ان لوگوں کے الزامات کی پروا نہ کرو جو زندگی بھر "ناجائز کمائی" سے پیٹ بھرتے ہیں اور ادبی جلسوں میں انسانیت اور عوام دوستی کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔ اس طرح کوئی شخص سربلند ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ وہ اشعار جھوٹے ہیں جن کے ایک ایک حرف میں دوسرے انسانوں سے نچوڑا ہوا لہو چمک رہا ہے۔ ہر ادبی تخلیق اپنے خمیر کی آئینہ دار ہوتی ہے اور جو لوگ زندہ ضمیر ہوتے ہیں ان کی شخصیت دوہری نہیں ہوتی، جو ان کا اصلی نام ہوتا ہے وہی ان کا ادبی نام ہوتا ہے۔ یہی اصل نکتہ ہے۔ اور دنیا جانتی ہے کہ تمہارا ایک ہی نام ہے یعنی اختر انصاری اکبر آبادی، تمہیں اپنا ایک شعر سناتا چلوں۔ دیکھیں اسے پڑھ کر کون کون چراغ پا ہوتا ہے۔

یہ بھی ہے ماہتاب پرستی کی اک ادا
جب اس کو چھو نہ پائے تو خاک اس پہ پھینک دی

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ "نئی قدریں" حیدر آباد سندھ، شمارہ نمبر ۱، ۶۴ء)

ایڈیٹر "اخبار جہاں" کے نام

(فیض کا متنازعہ شعر)

"اخبار جہاں" میں فیض صاحب کی تین غزلیں شائع ہوئی ہیں اچھی غزلیں ہیں ان کے اپنے اسلوب کی نمائندہ۔ مگر ایک غزل میں ایک ایسا شعر بھی شائع ہوگیا ہے جو ان کا نہیں، ذرا جانے یہ توارد ہے یا کسی غلطی سے اس غزل میں شامل ہوگیا ہے۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

یہ شعر تو بہت مشہور ہے اور ہم برسوں سے سنتے آئے ہیں میں تو یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ شعر انہیں کا ہے جن سے منسوب ہے ممکن ہے کسی پرانے استاد کا ہو۔

یہ شعر فیض صاحب نے غزل کے آخر میں یوں استعمال کیا ہے جیسے مصرعہ طرح استعمال کیا جاتا ہے ویسے یہ شعر نظام دکن میر عثمان علی خان کے والد میر محبوب علی خان کے نام سے منسوب چلا آرہا ہے۔ میرے ایسی پرانی کتابیں موجود ہیں جن میں کہیں صرف یہ شعر اور کہیں پوری غزل ان کے نام سے چھپی ہوئی ہے اسی غزل کا ایک اور مشہور شعر ہے۔

الفت کا جب مزہ ہے کہ دونوں ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

میرا گمان ہے کہ یہ شعر امیر مینائی، مرزا داغ دہلوی یا جلیل مانک پوری کا ہو سکتا ہے۔ یہ تینوں شعراء کرام حیدر آباد دکن میں رہے ہیں اور دربار شاہی سے ان کی وابستگی بھی رہی۔ جلیل مانک پوری تو نظام دکن کے باضابطہ استاد بھی تھے اور ایسی مثالیں والیان ریاست کے باب میں موجود ہیں کہ ضرورت مند شاعر کا سرمایہ فکر حکمران وقت کے تصرف میں آگیا اور پھر انہیں کی ملکیت قرار پایا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ یہ محض میرا گمان ہے کیونکہ میر محبوب علی خان کا شمار، بہادر شاہ ظفر کی طرح باضابطہ شعراء میں نہیں ہوتا، جبکہ محمد حسین آزاد نے استاد ذوق کے تلمذ کے واسطے سے ان کے کلام پر بھی شبہ کا اظہار کیا ہے۔ خیر یہ شعر کسی کا ہو فیض صاحب کا قطعی نہیں۔

یہ خط شائع ہونے کے بعد ممکن ہے اصل شاعر کا سراغ بھی مل جائے اور حق، بحق دار رسید کے مصداق شاعر کو اس کا صلہ مل جائے۔

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ "اخبار جہاں" شمارہ ۲۰ تا ۲۶ دسمبر ۱۹۸۲ء)

۴

۲۲ تا ۳۰ جنوری ۸۳ء کے شمارہ "اخبار جہاں" میں اقبال احمد صدیقی صاحب کا خط بہ سلسلہ "فیض کا متنازعہ شعر" شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے بغیر کسی حوالے کے پوری غزل جناب مصطفٰی خان شیفتہ سے منسوب کردی ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس زمین میں شیفتہ کا صرف ایک مقطع ملتا ہے جو بہت مشہور ہے۔ اور وہ بھی یوں ہے۔

شائد اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

اس مقطع کے سوا اس غزل کا کوئی شعر کسی دیوان میں نہیں ملتا۔ مولانا صلاح الدین احمد نے بھی اس امر پر حیرت کا اظہار کیا ہے وہ اپنے مرتب کردہ "دیوان شیفتہ" مطبوعہ ۱۹۵۴ء کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ.....

"یہ غزل کسی' دیوان کے کسی ایڈیشن میں موجود نہیں ہے' میں نے اس بارے میں نواب، محمد خلیل خاں صاحب سے بھی (جو شیفتہ کے پوتے ہیں) رجوع کیا۔ لیکن انہوں نے بھی اس غزل کے وجود سے لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ دیوان کے پہلے ایڈیشنوں میں سوائے حسرت ایڈیشن کے یہ شعر فردیات' کے زمرے میں درج ہے۔ حسرت نے اس شعر کا اپنے دیباچے میں حوالہ ضرور دیا ہے لیکن "فردیات" میں درج نہیں کیا ہے اور خود غزل کا سراغ ہمیں کہیں نہیں ملا" (صفحہ ۳۶)

غور طلب بات یہ ہے کہ "کلیات شیفتہ" (مرتبہ کلب، علی خان فائق شائع کردہ مجلس ترقی ادب' لاہور' طبع اول ستمبر ۱۹۶۵ء) میں یہ مقطع "فردیات" میں بھی شامل نہیں ہے (فائق صاحب نے اپنے مقدمے میں اسکا ذکر کیا ہے نہ ہی عدم شمولیت کا کوئی جواز پیش کیا ہے)

اس طویل اقتباس اور حوالے کا مقصد یہ ہے کہ اقبال احمد خاں کی مذکورہ غزل شیفتہ کی نہیں ہی اس مقطع کے علاوہ جتنے شعر موصوف نے لکھے ہیں وہ سب کے سب نظام دکن میر محبوب علی خاں آصف کے ہیں۔ یا حضرت امیر مینائی کے۔ مجھے شبہ یوں ہے کہ یہ غزل دو مختلف مقطعوں کے ساتھ مجھے دو پرانی کتابوں میں ملی۔ ایک کتاب کا نام ہے "چراغ ہارمونیم یا گنج موسیقی" مصنفہ و مولفہ' پروفیسر چراغ دین ہارمونسٹ (سیالکوٹی) مطبوعہ ۱۹۲۴ء بمبئی' اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اس دور کی مشہور اردو اور فارسی غزلوں' دادرے اور ٹھمریوں کے علاوہ آغا حشر کاشمیری کے اسٹیج ڈراموں میں گائے جانے والے گیتوں اور بھجن کی دھنیں بھی کلاسیکی موسیقی کے اصولوں کے مطابق مختلف راگ راگنیوں کے حوالے کے ساتھ لکھی ہوئی ہیں۔

اس کتاب کے صفحہ ۱۵۶ پر یہ غزل محبوب علی خان آصف کے نام سے شائع ہوئی ہے اور اس کی دھن "راگ بروا" میں مرقوم ہے۔

تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی	کافی ہے ہم کو پہلے ہی ٹھوکر لگی ہوئی
یارو بجھے گی آگ یہ کیوں کر لگی ہوئی	الفت کا جب مزا ہے کہ دونوں ہوں بے قرار
لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں	دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی	آصف ذرا سمجھ کے یہاں کیجئے مقام
جائیں گے کس امید پہ ہم اس کے کوچے میں	منزل ہے دور' دوسری سر پر لگی ہوئی

دوسری کتاب کا نام ہے "نونہال ہند عرف جلوہ خواجہ" یہ کتاب بھی بمبئی سے شائع ہوئی ہے مگر اس پر مولف کا نام اور سنہ طباعت نہیں دیا گیا ہے اس کتاب میں پوری غزل یہی ہے صرف دو مصرعے یوں ہے۔

۱۔ جائیں گے تیرے کوچے میں ہم کس امید پر
۲۔ الفت کا جب مزا ہے کہ وہ بھی ہوں بیقرار

اور مقطع مختلف ہے یعنی

کچھ خوف روز حشر ہے دل میں تیرے امیرؔ
ہے زندگی سے موت برابر لگی ہوئی

اس مقطع سے گمان ہوتا ہے کہ یہ غزل حضرت امیر مینائی کی نہ ہو متذکرہ دونوں کتابیں چونکہ میری نظر میں مستند نہیں ہیں اس لئے میں نے دو مستند کتابیں بھی دیکھیں۔ "محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن" (مولفہ 'ابو تراب محمد عبد الجبار ملکاپوری' مطبوعہ ۱۳۲۹ف ۔ حیدر آباد دکن) اس میں شامل نہ ہو محبوب علی خاں آصف کے کلام میں یہ غزل تھی' نہ داغ' امیر مینائی اور جلیل مانک پوری کے انتخاب کلام میں کہیں نظر آئی۔ امیر مینائی کے مجموعہ غزلیات "صنم خانہ عشق" میں بھی یہ غزل نہیں ہے (ممکن ہے کسی اور مجموعہ کلام میں ہو)

اب فیض صاحب کی غزل کی طرف آیئے۔ فیض صاحب کی جو غزل "اخبار جہاں" میں شائع ہوئی اور ان کے تازہ مجموعہ کلام "مرے دل مرے مسافر" مطبوعہ ۱۹۸۱ء میں بھی موجود ہے۔ وہ یقیناً مصرعہ طرح کے طور پر کہی ہوگی کیونکہ اس شعر (ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ)

لاؤ تو قتل نامہ "مرا" میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

کے علاوہ مطلع میں بھی اسی غزل کا ایک مصرعہ استعمال کیا گیا ہے

سننے کو بھیڑ ہے سر محشر لگی ہوئی
"تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی"

اپنی کتاب میں چونکہ فیض صاحب نے اس مصرعے اور مندرجہ بالا شعر کے بارے میں کوئی حوالہ یا اشارہ نہیں دیا ہے اس لئے عام قاری کو یہی گمان ہوتا ہے کہ غزل کے سبھی شعر فیض صاحب کے ہیں ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

اسی ضمن میں میرا دھیان ذوق کی غزل کی طرف بھی گیا تھا جس کا مقطع بہت مشہور ہے۔

اے ذوق دیکھ' دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مگر دیوان ذوق دیکھنے پر یہ گمان جاتا رہا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ غزل کس کی ہے؟ ممکن ہے فیض صاحب ہی کچھ بتا سکیں یا پھر وہ اہل تحقیق جو حق دار کو اس کا حق دلاتے ہیں ممکن ہے کسی کے مدلل انکشاف سے یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

(مطبوعہ "اخبار جہاں" ۲۱ تا ۲۲ مئی ۸۳ء)

سرِ بلہ............!

"مرے دل ۔ مرے مسافر" جب شائع ہوئی تو فیض صاحب پاکستان سے باہر تھے' چنانچہ کتاب کی طباعت میں ناشر نے احتیاط سے کام نہیں لیا' یہ "متنازعہ اشعار" عبد اللہ ملک کے رسالہ "احتساب" لاہور' شمارہ (A'۷) اگست' ستمبر ۷۹ء میں ایک نظم کی صورت "لاؤ تو قتل نامہ مرا" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں ان اشعار میں دوسرے مصرعے یعنی "تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی" پر Inverted Commas بھی لگے ہوئے ہیں اور آخری شعر میں

"لاؤ تو قتل نامہ مرا"

پر بھی یہی علامت موجود ہے۔ مگر شعر کے باقی حصے پر کوئی علامت موجود نہیں ہے البتہ نظم کے عنوان کے نیچے "نذر داغ" چھپا ہوا ہے۔

شاید فیض صاحب کو یہ گمان رہا کہ یہ داغ کی غزل کے اشعار ہیں جو غلط فہمی پر مبنی ہیں اس زمین میں داغ کی غزل موجود ہے' مگر یہ اشعار اس غزل میں نہیں ہیں۔

یہ غزل اور بالخصوص ایک شعر......

لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

بقول مرزا ظفر الحسن صاحب' میر محبوب علی خان آصف ہی کا ہو سکتا ہے میرے استفسار پر ظفر صاحب نے مجھے ایک واقعہ سنایا جو حیدر آباد دکن کے امراء میں بہت مشہور تھا۔

اس کی شان نزول یہ بیان کی جاتی ہے کہ میر محبوب علی خاں آصف کی تخت نشینی کے دوران بعض امرائے سلطنت نے انگریز وائسرائے سے یہ شکایت کہ یہ شہزادہ عیش پسند ہے اور بادشاہت کے لائق نہیں ہے اس لئے ان کی بجائے کسی اور شہزادے کو یہ منصب عطا کر دیا جائے۔ کہتے ہیں کہ اس سازش کا حال جب میر محبوب علی خاں پر کھلا تو انہوں نے یہ شعر کہا۔

کچھ اور حضرات سے بھی اس واقعے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مگر یہی غزل "حضرت امیر" کے نام سے بھی تو چھپ چکی ہے اور اس غزل میں ان کا مقطع بھی موجود ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اسماعیل احمد مینائی مدیر "فاران" سے بھی گزارش کی تھی مگر وہ بھی یہ لکھ کر خاموش ہو گئے کہ "مستند حوالوں اور صحیح کتابوں کی کمیابی کی بنا پر اس بارے میں اپنی جستجو اور تحقیق کی تکمیل نہ کر سکا۔"

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ "فاران" کراچی ۔ مارچ ۸۳ء)

اعجاز راہی کے نام

(زبان اور اہل زبان)

آپ کے مختصر اداریوں میں آپ کی "جرات فکر و گفتار" نمایاں ہے جن مسائل کو آپ چھیڑتے ہیں' وہ اس عہد کے اہم مسائل ہیں یہ ایک رسالے کی خوبی ہے کہ لوگ پہلے "اداریہ" پڑھنے کی طرف مائل ہوں۔ "پہلی بات" بھی قابل مطالعہ ہوتی ہے اور دوسری بات بھی۔ آج کل رسائل اور اخبارات کی روش یہ ہو چکی ہے کہ لوگ اداریوں کی طرف توجہ نہیں دیتے کیونکہ بقول غالب لوگوں کو یقین ہو گیا ہے کہ

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

بالخصوص ہفتہ وار رسائل کا یہی عالم ہے

"زبان اور اہل زبان" کے سلسلے میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان سے آپ کو بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ بحث اب غیر ضروری ہے۔ اب تو وہ لوگ بھی جو اردو کو پاکستان اور "اسلام کے مترادف" سمجھتے تھے اس خوش فہمی کے جال سے باہر نکل آئے ہیں۔ یہ سارا جال جو ایک خاص دور میں بنا گیا تھا قیام پاکستان سے قبل مخصوص سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے تھا عام ذہن جو تاریخ اور تہذیب کے تقاضوں سے بے خبر تھے' اسے بنیادی حقیقت سمجھ بیٹھے اور کچھ عرصہ اسی پر تشکیل و تعمیر کے نقشے بناتے رہے' لیکن جب تاریخی اور تہذیبی صداقتیں سامنے آئیں تو بیشتر لوگوں نے اعتراف کر لیا۔ اب تو ادب میں بھی "اہل زبان" کو وہ اہمیت حاصل نہیں رہی جو "لکھنوی" اور "دہلوی" ہونے کے ناطے مستند سمجھے جاتے تھے۔ خود ان کے گھرانوں میں نئی نسل کی زبان۔ حتیٰ کہ تہذیب بھی بدل گئی معاشی ضرورتوں کے تحت اکثر گھرانے کراچی میں آباد ہیں اور کراچی ایک "کاسموپولیٹن" شہر ہے۔ ایسے شہر کی کوئی مخصوص "تہذیبی پہچان" نہیں ہوتی یہاں آکر تو اندرون پاکستان کا آدمی بھی اپنی تہذیب سے کٹ جاتا ہے تو وہ لوگ جن کی صدیاں ایک "خاص پہچان" سے وابستہ تھیں جغرافیائی رشتے بدل جانے کے بعد کس طرح اپنے ماضی سے ہم کنار رہ سکتے ہیں' زبان تو زبان' یہاں تو "قدریں" تک بدل گئی ہیں۔

کراچی کو موجودہ عہد کے "کنعان" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ جہاں "سامری کے طلسم" نے "گوسالہ" کی پوجا کی روایت تازہ کر دی ہے ظاہر ہے کہ اس عالم میں "طور سینا" پہ کہیں "لوح کلیم" محفوظ بھی ہو تو کسے فرصت ہے کہ اس کا مطالعہ کرے سرمایہ دارانہ نظام میں "ید بیضا" بھی چاندی کا سکہ نظر آتا ہے۔ رہا "عصا" کا مسئلہ تو بقول شاعر (حمایت علی شاعر)

یہ معجزہ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
اب دست سامری میں عصائے کلیم ہے

ادب کے حوالے سے دیکھئے تو ان شیروانیوں کے بٹن بھی کھلے ہوئے ہیں جو سلیم احمد اور ان کے بھائی شمیم احمد کے گلے میں لگی ہوئی ہے۔ انہیں بھی "اہل زبان" ہونے پر اصرار نہیں ہے۔ شیروانی کے ناطے کچھ "مخصوص اقدار" کی باتیں ان کی تحریروں میں ضرور مل جاتی ہیں اور وہ بھی اس حد تک جو کبھی لکھنؤ اور دہلی میں تھیں اور آج کراچی اور لاہور میں ہیں۔ یعنی

ناصر کاظمی کے مقابلے میں فرید جاوید کو پیش کردیا جائے یا علامہ اقبال کی مخالفت، حسن عسکری کے نقطہ نگاہ سے کردی جائے۔

تو یہ تقابل و اختلاف بھی براہ راست "زبان اور اہل زبان" کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ اس کے پس منظر میں کوئی اور ہی "تعلق" کارفرما ہے۔ شاعری کی "باقیات الصالحات" میں اب صرف دو ہی معروف نام کسی حد تک نمایاں رہ گئے ہیں۔ ایک حضرت شاعر لکھنوی اور دوسرے حضرت تابش دہلوی، یہ دونوں بزرگ اتنے شریف ہیں کہ آپس میں بھی نہیں لڑتے (ہاں کسی زمانے میں انفرادی برتری کے سلسلے میں ضرور ٹکرا جاتے تھے) اب تو دونوں ہی گوشہ نشیں ہیں۔

تو بھائی اب زبان کا مسئلہ ہے نہ اہل زبان کا مسئلہ ہے۔ رہا "قومی زبان" کا معاملہ تو میں بھی احسن علی خان کا ہم خیال ہوں ایک گھریلو کہاوت ہے کہ

جسے پیا چاہے، وہی سہاگن کہلائے

"پیا" کا مقام عوام کو حاصل ہے عوام ہی فیصلہ کریں گے کہ علاقائی اور قومی اعتبار سے کون سی زبان۔ یا زبانیں ان کے باہمی ربط اور ان کے علیحدہ علیحدہ اور اجتماعی فروغ کے لئے ضروری ہیں۔ زبان بلاشبہ کسی کی جاگیر نہیں۔ اسکی پیدائش بھی اجتماعی عوامل کی مرہون منت ہے اور اس کی افزائش بھی۔ اس کے الفاظ بندھے ٹکے ہوتے ہیں، نہ اس کی قواعد دائمی اصولوں کی پابند ہوتی ہے۔ زبان کے معاملے میں "خواص" کے فیصلے بھی "عوامی اعتبار" کے پابند ہوتے ہیں اور اردو میں تو بے شمار الفاظ اور تراکیب ایسی موجود ہے جو اہل زبان کے مروجہ قوانین کو توڑ کر لسانی اعتبار پا چکی ہیں اور اکثر ایسی کوششیں ناکام ہوگئی ہیں جو فوری طور پر زبان کو مخصوص سانچوں میں ڈھالنے کے سلسلے میں کی گئیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ صاحب علم حضرات کو لسانیات کے سلسلے میں کوئی تحقیقی کام کرنا ہی نہیں چاہیئے۔ زبان کا کام ہر سطح پر جاری رہنا چاہیئے۔ فیصلہ خود بخود ہو جائے گا۔ یعنی وقت کے ہاتھوں بقول محشر بدایونی۔

جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

اہل علم کی تحقیق عوام تک پہنچے گی اور عوامی سطح کی تحقیقات، اہل علم تک۔ اور پھر ایک ایسی قدر مشترک جنم لے گی کہ زبان کی نئی تشکیل کو زندگی مل جائے گی۔

میں تو یہاں تک قائل ہوں کہ اردو اور انگریزی میں بھی حاکم و محکوم کا فرق ملحوظ نہ رکھا جائے۔ گزشتہ دو سو برس میں انگریزی کے جو الفاظ اردو میں آگئے ہیں اور متبادل نہ ہونے کے سبب جنہیں عوام اور خواص نے قبول کرلیا ہے۔ انہیں اب "اردو کا سرمایہ" سمجھ لیا جائے، انہیں غیر ضروری طور پر مفرس اور معرب بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ جس طرح ہندی اور سنسکرت کے الفاظ اردو میں رچ بس گئے ہیں، اسی طرح انگریزی کے بھی اکثر الفاظ ہمارے لسانی قوام کا حصہ بن گئے ہیں۔ انہیں زبردستی نکالنے کی کوشش کا انجام محض کتابی ہوگا اور ان کے متبادلات کو کبھی قبولیت عام حاصل نہ ہوگی۔

حیدر آباد دکن میں یہ تجربہ ناکام ہوچکا ہے لاؤڈ اسپیکر کو "آلہ مکبر الصوت" کوئی نہیں کہتا۔ اسی طرح فائل کو مثل یا مسلہ جات ایک مخصوص طبقہ ہی وقتی طور پر کہہ سکا عمومیت کسی ایسے لفظ کو حاصل نہ کرسکی جو عوام کے لئے اجنبی تھا خاص طور پر دفتری زبان کو ہمیں اس غرابت اور اجنبیت سے بچانا چاہیئے جو فارسی اور عربی کی بے جا شمولیت سے زبان کو بوجھل بنادے۔

اردو میں جب ہر زبان کا لفظ شامل ہوسکتا ہے تو انگریزی کے ہر لفظ کا متبادل تلاش کرنا اور دوسرے ملکوں (ایران و عرب) کی زبانوں کے نامانوس الفاظ اور تراکیب کو اپنی زبان پر مسلط کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اگر یہ کام کسی مخصوص قومی مفاد

(باقی صفحہ نمبر ۴۰۷ پر)

ایڈیٹر "اورنگ آباد ٹائمز" کے نام

(حمایت علی شاعر نمبر)

عزیزم۔ عزیز خسرو صاحب

سلام خلوص

۲ جون ۱۹۸۵ء کو جب میں اورنگ آباد سے بمبئی کے لئے رخت سفر باندھ رہا تھا۔ طلوع صبح کے ساتھ "اورنگ آباد ٹائمز" کا وہ نمبر بھی مل گیا ہے جس آپ نے میرے نام سے منسوب کیا ہے۔ پھر آپکی عنایت کردہ پچاس عدد کاپیاں بھی مل گئیں لیکن وہ دن ایسی مصروفیت میں گزرا کہ میں آپ تک اپنا حرف تشکر نہ پہنچاسکا۔ گاؤں گاؤں سے آئے ہوئے عزیز و اقربا جمع تھے سارا دن الوداعی ملاقات میں گزر گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ۲۴ برس بعد میں اپنے آبائی شہر میں آیا تھا' مجھ پر جو عالم طاری تھا' اس کا اندازہ آپ کرسکتے ہیں۔ مسرت و غم کے ایسے جذبات تھے کہ ہونٹوں پر ہنسی اور آنکھوں میں آنسو...... بات کرتا تو آواز بھر آتی۔ کسی کو سینے سے لگاتا تو محسوس ہوتا اب دل سینے سے باہر آجائے گا' بچپن سے لیکر اس عمر تک تمام رفاقتیں اور محبتیں میرے وجود میں گھل کر ایک بار پھر غیر معینہ مدت کے لئے مجھ سے جدا ہو رہی تھیں میں گویا ایک عالم اعراف میں تھا۔ دل و دماغ ' ماضی و حال کو اپنے اپنے دامن میں سمیٹے ایک ایسا کشاکش میں تھے کہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں کیا کچھ یہاں چھوڑ جاؤں گا اور کیا کچھ اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور جب رات ' احباب ' عزیز اور رشتہ دار مجھے خدا حافظ کہنے لگے تو میں محسوس کررہا تھا کہ میں صرف اپنا جسم ساتھ لئے جارہا ہوں۔

بمبئی میں پانچ دن گزارنے کے بعد ۷ جون کی رات جب میں کراچی پہنچا اور میرے بچے مجھے ایئرپورٹ پر لینے آئے تو ان کے چہروں پر مجھے وہ تمام چہرے دکھائی دینے لگے جنہیں میں اورنگ آباد چھوڑ آیا تھا' گھر پہنچا تو گھر میں مجھے اورنگ آباد ہی بسا ہوا نظر آیا اور آج حیدر آباد سندھ سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں تو خود کو حیدر آباد دکن اور اورنگ آباد میں ہی پا رہا ہوں۔

"اورنگ آباد ٹائمز" کا نمبر جس جس نے دیکھا' اس کی آنکھیں رشک سے چمک اٹھیں' ایسی محبت شاید ہی کسی کو ملی جو میرے اہل وطن نے مجھے عطا کی ہے اور یہ سب کچھ مجھے عزیز خسرو کی معرفت ملا ہے عزیز خسرو۔ جو خاک وطن کے ناطے میرے وجود میں بس گیا ہے جو پاکستانی اہل ادب کی نظر میں محبت اور قدردانی کی ایک مثال بن گیا ہے اور اس نمبر کی معرفت ان تمام اہل قلم کا آئینہ ' جنہوں نے مجھ پر اور میری شاعری پر مضامین لکھے اور اپنی پرخلوص اور روشن فکر پاکستان تک پہنچائی جنہوں نے یہ ثبوت فراہم کردیا کہ اپنی مٹی سے محبت کرنے والے جغرافیائی حدود سے گزر کر بھی اس خوشبو کو سمیٹ لیتے ہیں جو بظاہر انکی دسترس سے دور ہوتی ہے۔ میں بھی اسی خوشبو سے سرشار ہوں' خدا مجھے توفیق دے کہ میں بھی اس مٹی کا قرض ادا کرسکوں۔ اونگ آباد میں قیام کے دوران اپنے بزرگوں اور ہم عصروں کے علاوہ نئے لکھنے والوں نے بھی مجھے بہت متاثر کیا ہے مجھے یقین ہے کہ یہ تمام اہل قلم بہت جلد پاکستان کی ادبی دنیا کے لئے بھی اجنبی نہیں رہیں گے' کچھ نوجوانوں کی نگارشات

میں اپنے ساتھ لایا ہوں اور جن حضرات تک میری رسائی نہیں ہو سکی آپ کی معرفت ان سے بھی عرض کروں گا کہ وہ بلا تکلف مجھے اپنی تخلیقات بھیجیں تاکہ میں انہیں اپنے یہاں کے اہل ادب تک پہنچاؤں' یہی گزارش میں اپنے بزرگوں اور ہم عصروں سے بھی کروں گا جہاں تک معروف اہل قلم کا مسئلہ ہے مثلاً" قاضی سلیم' اختر الزماں ناصر' انور معظم' صفی الدین صدیقی' ڈاکٹر عصمت جاوید' بشر نواز' رفعت نواز' ڈاکٹر معین شاکر اور نئے لکھنے والوں میں محمود شکیل اور قمر اقبال وغیرہ۔ ان سب کی تحریریں نظر سے گزرتی رہتی ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو رسائل اور کتب کی عدم یافت کے سبب عمومی طور پر آنکھ سے اوجھل ہیں۔ مقتدر نجم' جے پی سعید' ڈاکٹر ارتکاز افضل' محمد تقی' یوسف عثمانی اور ان کی بیگم' میر ہاشم علی' نور الباسط نور' رعنا اورنگ آبادی' جلیل احمد' نور الحسنین' علی رضوان' قاضی رئیس اور مجاہد علی وغیرہ (کچھ نام اور بھی ہیں جو اس وقت مجھے یاد نہیں آرہے' جس کا مجھے افسوس ہے) یہ سب ایسے لکھنے والے ہیں جن کی آواز پاکستان میں بھی پہنچنی چاہئے بلاشبہ یہ سب اہل نظر ہیں اور ہمارے لئے قابل مطالعہ بھی۔

جیسا کہ میں نے آپ سے اور قاضی سلیم سے کہا تھا کہ اورنگ آباد سے ایک ادبی جریدہ بھی نکلنا چاہئے اورنگ آباد کی اپنی ایک تاریخ ہے اور ایک شخصیت بھی۔ اس کا تحفظ اور اس کی نمود' آپ کے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا مستقبل تلاش کررہی ہیں۔ اور مجھے آپ کی تنظیمی صلاحیت سے امید ہے کہ آپ اس مقصد کے لئے راہ ہموار کردیں گی۔ قاضی سلیم بھی یقیناً اس کام کے لئے وقت نکالیں گے اور ہند و پاک کے تمام اہل قلم کا اسے تعاون حاصل رہے گا۔ میں نے جناب شیخ احمد صاحب کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ اورنگ آباد کی ادبی تاریخ مرتب کی جائے۔ اس سلسلے میں جو خدمت میرے سپرد کی جائے گی میں احساس فخر کے ساتھ اسے انجام دوں گا بالخصوص ان شعراء اور ادباء کے تعلق سے جو پاکستان چلے آئے' یہ کام محنت طلب ضرور ہے مگر تکمیل تک پہنچ جائے تو ایک تاریخی کارنامہ ہوگا۔

"اورنگ آباد ٹائمز" کا "فیض نمبر" بھی میں نے مختلف احباب کو دکھایا ہے' سبھی متاثر ہوئے اور بہت تعریف کی' کاش "وجد نمبر" بھی میرے پاس ہوتا' "حمایت علی شاعر' مختلف کتب خانوں میں محفوظ کردیا جائے گا" ہو سکے تو ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں بھی اسے بھیج دیجئے۔ اس طرح "فیض نمبر" اور "وجد نمبر" بھی محفوظ ہونے چاہئیں۔ یہ نمبر ایک دور میں تاریخ کا سرمایہ بن جائیں گے اور مستقبل میں اہل تحقیق و ادب کے کام آئیں گے کاش آپ کا اخبار کبھی کبھی دیکھنے کو ملتا رہے کیا کوئی ایسی سبیل ہو سکتی ہے؟ امید ہے کہ آپ اور تمام احباب بخیر و عافیت ہوں گے سب کو میرا سلام پہنچادیں۔ وہ تصاویر جو آپکے دفتر میں لی گئی تھیں ان میں سے کچھ مجھے بھی بھجوادیں' خاص طور پر آپکے ساتھ' اختر الزماں ناصر' قاضی سلیم' انور معظم' قمر اقبال' صفی الدین صدیقی اور نور الحسنین کے ساتھ.......... میرے البم کے لئے اور ممکن ہو سکے تو "وجد نمبر" بھی

والسلام

آپ کا۔ حمایت علی شاعر

سندھ یونیورسٹی۔ جام شورو)

(مطبوعہ "اورنگ آباد ٹائمز" مورخہ ۳ اگست ۱۹۸۵ء)

(بقیہ اعجاز راہی کے نام)

کے پیش نظر ضروری بھی ہے تو اپنی علاقائی زبانوں میں ان کے متبادل لفظ تلاش کئے جائیں اور انہیں عام کیا جائے تاکہ ہمارے قومی ربط و ضبط کی راہ ہموار ہو۔

(مطبوعہ ہفت روزہ "سفیر" پشاور' ۲۸ جون ۱۹۸۳ء)

مجتبیٰ حسین کے نام

(ابراہیم جلیس کے بھائی۔ عالمی اقبال سیمینار)

بمبئی
۱۰ اپریل ۱۹۸۶ء
برادر عزیز مجتبیٰ حسین صاحب۔ سلام خلوص!

آج ہی صبح آپ سے فون پر بات ہوئی، مگر جی چاہا کہ آپ کو خط بھی لکھ دوں؛ شاہد علی خاں کو میں نے اورنگ آباد سے پیش لفظ اور ایک کتاب "ہارون کی آواز" بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ روانہ کی تھی امید کہ دونوں چیزیں مل گئی ہوں گی۔ اورنگ آباد میں مغنی تبسم اور انور معظم سے اس سلسلے میں بات ہوئی اور آپ نے بھی تو مغنی سے کہا تھا (گیسٹ ہاؤس میں) وہ کہتے ہیں آپ کی طرف سے اطلاع ملتے ہی انشاء اللہ کتاب کی رونمائی کی تیاریاں ہوجائیں گی۔ حمایت اللہ اور دیگر احباب بھی اس تقریب کے آرزو مند ہیں۔ اچھا ہوتا کہ عالمی اقبال سیمینار کے دوران یہ یادگار تقریب بھی ہوجائے مگر یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب کتاب تیار ہوجائے۔ اس لئے شاہد علی خاں پر منحصر ہے۔ خدا کرے وہ اس دوران کتاب چھپوادیں چنانچہ اس کام کا سہرا بھی آپ ہی کے سر بندھتا ہے۔ شاہد علی خاں کو علیحدہ خط لکھ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں اس کتاب کے حقوق کے سلسلے میں انہیں خط لکھ دوں۔ میرا خیال تھا کہ دیباچے کے ساتھ میں نے وہ خط بھی بھیج دیا ہے۔ مگر اب دیکھا تو وہ خط بھی میرے ہی بریف کیس میں رہ گیا تھا۔ بہرحال اب بھیج رہا ہوں۔ "اس کتاب یعنی "حرف حرف روشنی" کی اشاعت پر مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ خوشی ہے اور اس کے حقوق میرے چھوٹے بھائی میر عنایت علی کے نام محفوظ ہیں" اگر اس سلسلے میں کوئی کاروباری معاملت ہو تو اس سے کی جائے اس کا پتہ میں شاہد علی خان صاحب کو دے آیا تھا۔ آپ کو مزید لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں "عنایت" کے خط کی ضرورت ہو تو وہ بھی بھیج دوں گا۔

آپ کا اپنا
حمایت علی شاعر

(۲)

کراچی
۱۲ جون ۸۶ء
برادرم مجتبیٰ حسین صاحب! سلام خلوص

میں ۲۹ اپریل کو کراچی پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے کاموں میں اتنا مصروف رہا کہ دم مارنے کی فرصت نہیں ملی۔ پچھلے ماہ گرمی بھی شدید تھی۔ ایک تو رمضان اور دوسرے موسم کا ستم۔ کئی بار ارادہ کیا کہ بیٹھ کر خط لکھوں۔ مگر رہ گیا۔

اب تو یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوگئی ہیں۔ مسلسل دو ماہ تک کراچی میں رہوں گا اور سارے کام نپٹاؤں گا۔

پچھلے سال جب میں ہندوستان آیا تھا تو آپ سے تعلق صرف ایک خط تک تھا۔ میں سوچتا تھا کہ یہ شخص کیسا ہوگا۔ کیا اس میں بھی ابراہیم جلیس کی سی خوبیاں ہوں گی۔

اس وقت میں نے آپ کے صرف چند مضامین پڑھے تھے لیکن مضامین اکثر دھوکہ بھی دے دیتے ہیں۔ تحریروں میں جو آدمی بہت شگفتہ نظر آتا ہے زندگی میں اکثر اس کے برعکس ملتا ہے۔ مجھے یہ تجربہ ہو چکا ہے۔ مثلاً شفیق الرحمان، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ یہ لوگ زندگی میں نہایت سنجیدہ، خاموش طبع اور Reserve قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ بہت کم کھلتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اچھے لوگ نہیں، ان کی اور خوبیاں اپنی جگہ مگر تحریروں میں جو تصور بندھتا ہے۔ وہ کچھ اور ہوتا ہے۔

آپ کو اس اعتبار سے میں نے بالکل ابراہیم جلیس کا آئینہ پایا۔ بے تکلف، مجلسی، دوست دار، ہنس مکھ۔ یہی خوبی ابن انشاء میں بھی تھی اور سید ضمیر جعفری میں ہے۔ یہ خوبی شخصیت کو سماجی طور پر بھی پرکشش بنا دیتی ہے۔

آپ کی مقبولیت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ پچھلے سال جب میں ہندوستان گیا تھا آپ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ البتہ حیدر آباد دکن کے دوران قیام میں آپ کی ایک کتاب مل گئی تھی "بہرحال" ...... میں اسے خرید لایا تھا۔ اس کتاب میں کچھ خاکے ہیں۔ میں نے سب سے پہلے عزیز قیسی کا خاکہ پڑھا تھا اور میں آپ کو کچھ اور بھی قریب محسوس کرنے لگا تھا۔ ابراہیم جلیس کی وساطت سے آپ سے جو جذباتی تعلق تھا۔ وہ اپنی جگہ مگر اس خاکہ نے گویا ایک قدر مشترک پیدا کر دی تھی۔

اور اس بار جب دہلی میں آپ سے ملا۔ کچھ دن ساتھ رہا، اور پھر اورنگ آباد اور حیدر آباد دکن کی مزید قربتیں....... تو یوں محسوس کرتا ہوں۔

"یہ وقت اور فاصلہ دھوکہ نظر کا تھا"

آپ میرے اتنے قریب آ چکے ہیں کہ دوری کا احساس بھی نہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ تحریروں میں بھی جیسا سوچا تھا زندگی میں بھی ویسا ہی پایا۔ دہلی میں آپ نے جو دو کتابیں دی تھیں، قصہ مختصر، اور قطع کلام دونوں کتابیں میں نے دہلی اور اورنگ آباد کے سفر کے دوران پڑھ لیں تھیں۔ خیال تھا کہ حیدر آباد جا کر دوسری کتابیں بھی مل جائیں گی۔ وہاں آپ ایسے مصروف تھے کہ آپ کو بھی خیال نہ رہا۔ حالانکہ ہم نے دہلی میں پروگرام بنایا تھا کہ حسامی بک ڈپو سے کتابیں حاصل کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پر اپنا ایک مطالعہ لکھوں اور ایک خواہش یہ بھی پیدا ہوتی ہے کہ آپ کے مضامین کا ایک انتخاب پاکستان میں بھی چھپنا چاہیئے۔ ممکن ہو تو خود نشاندہی کر دیں یا پھر میں اپنی پسند سے کر لوں۔ مگر اس کے لئے سب کتابوں کا میرے پاس ہونا ضروری ہے۔ کیا میں امید کروں کہ بقیہ کتابیں آپ مجھے بھیج دیں گے۔ دہلی کے دوستوں کو میرا سلام پہنچا دیں۔ خصوصاً گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی، رفعت سروش، زبیر رضوی اور کمار پاشی وغیرہ کو...... ممکن ہے اگلے سال مارچ میں پھر ملاقات ہو جائے۔ بھابی کو سلام کہیئے اور بچوں کو دعائیں۔

ویسے آپ لکھتے خوب ہیں، نہایت شگفتہ، نہایت لطیف، مجھے آپ کا انداز پسند ہے۔ آپ نے جتنی جلد ادبی دنیا میں نام پیدا کیا اور مقبولیت کی حدود میں داخل ہو گئے قابل رشک ہے۔ میری محبتیں اور دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اچھا اب اجازت چاہتا ہوں۔ وقت ملے تو خط کا جواب ضرور دیں۔

حمایت علی شاعر

مطبوعہ "شگوفہ" مجتبیٰ حسین نمبر۔ حیدر آباد دکن)

ایڈیٹر "جواز" (مالیگاؤں) کے نام

(بھمڑی کانفرنس)

بھائی عارف۔ سلام مسنون

اورنگ آباد کی محفل ہرچند بہت مختصر تھی تاہم یاد رہے گی فضیل جعفری' عزیز قیسی' بشر نواز' آپ اور دیگر احباب جن سے ملے برسوں ہوگئے تھے۔

پھر یوں ملے کہ جیسے کبھی دور ہی نہ تھے۔

اس رات آپ کو پہلی بار سنا' کیا خوبصورت غزلیں سنائیں' آج تک لطف لے رہا ہوں دوسرے احباب کا کلام پہلے بھی سن رکھا تھا اس لئے قند مکرر کا مزا آیا۔

خیال تھا کہ بمبئی میں آپ سے پھر ملاقات ہوگی میں تقریباً ۱۲ دن رہا پھر "عالمی اقبال سیمینار" میں شرکت کے لئے حیدر آباد (دکن) جانا تھا' اس لئے آپکا انتظار نہ کرسکا۔ فضیل جعفری سے آپ کی مصروفیات کا علم ہوتا رہا۔ غالباً میرے دوران قیام آپ ایک یا دو دن کے لئے بمبئی آئے بھی تھے۔ میں شاید اس دن' ادب والوں کی دسترس سے دور تھا۔ ہاں بھائی' کیا کریں' ایک عرصہ فلمی دنیا میں بھی تو گزارا ہے۔ اس دن لیش چوپڑا سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ وہیں خیام بھی مل گئے' اندیور اور فلمی دنیا کے دوسرے شعرا بھی۔

مجروح صاحب نے جس شب دعوت دی تھی' خیال تھا کہ وہاں آپ سے ملاقات ہوجائے گی موسیقار نوشاد بھی تھے (بہ حیثیت شاعر) اور ظ۔ انصاری کے علاوہ فضیل جعفری' قتیل شفائی' حسن کمال' یوسف ناظم' عزیز قیسی' رفیعہ شبنم عابدی' واجدہ تبسم اور بھی کئی اہم لوگ تھے بس ایک آپ ہی غائب تھے۔

میں نے فضیل سے پوچھا تو کہا شاید چلے نہ گئے ہوں' بہرحال بمبئی میں آپ سے ملاقات نہ ہوسکی جس کا بہت افسوس ہے۔

فضیل نے یا عزیز قیسی نے آپکے عنایت کردہ "جواز" کے شمارے مع ایک ضخیم نمبر مجھے دے دیئے تھے۔ کن الفاظ میں تعریف کروں' مالیگاؤں جیسا شہر' اور "جواز" ایسا رسالہ' خالص ادبی' جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کچھ پڑھا بھی ہے۔ "جواز" میں پہلے بھی دیکھتا رہا ہوں کبھی "افکار" کے دفتر میں کبھی غالب لائبریری میں۔ لاہور میں بھی بعض رسائل کے دفتروں میں دیکھا ہے اور حسرت ہی رہی کہ کاش مجھے بھی باضابطہ ملتا۔ اب آپ سے معلوم ہوا کہ آپ کو میرا ٹھکانہ ہی معلوم نہیں تھا اور ملاقات پر یہ بھی کھلا کہ ہم کتنے پرانے دوست ہیں۔ برسوں بعد ہندوستان پہنچا تھا نا' تقریباً ۲۵ سال بعد' کہاں یاد رہتا ہے کہ کون دوست کہاں ہے' کس حال میں ہے (ویسے تو ہر شخص لوہے کے جال میں ہے) آغا حشر کاشمیری کا ایک مکالمہ یاد آگیا۔ سرکشی کی سزا بھی تو ہوتی ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ "جواز" مل گیا اور اب تک زیر مطالعہ ہے' سارے شمارے پڑھے اور برسوں کی حسرت کا انتقام لیا' کتنی ہی چیزیں ایسی ملیں جن کے بارے میں صرف سنا تھا۔ فضیل کا مضمون میراجی کی نثر پر خوب ہے۔

میں نے میراجی کی نثری کتابیں مشرق و مغرب کے نغمے' اس نظم میں' نگار خانہ' پڑھ رکھی تھیں اور اپنی ایک رائے بھی

رکھتا ہوں مجھے شاعر سے زیادہ بہ حیثیت نثر نگار وہ ہمیشہ سے پسند رہے ہیں' شاعری تو "چیزے دیگر" والی بات ہے۔ صرف اسلوب کی جدت یا اپنے دور کی روش سے مختلف ہونا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں شاعر کو الگ حیثیت ضرور عطا کرتی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ سب کے لئے قابل قبول ہوں۔ شاعری میں ان کا ایک کڑا انتخاب ہونا چاہئے۔ ایسا جو فنی اعتبار سے بھی ان کی اہمیت منوا سکے۔ میرا جی متنوع موضوعات کے شاعر ہیں لیکن شہرت ایک ہی موضوع کو ملی ہے اور اسے انکی ذات سے اس طرح ملوث کردیا گیا ہے کہ عام آدمی کے ذہن میں بطور شاعر...... تین گولے' ایک تاش کی گڈی اور ایک مالا کے کوئی تصور ہی نہیں بنتا۔ یہ ان کی شخصیت کا انفرادی روپ ہے' اور بظاہر یوں لگتا ہے کہ ایک دنیا بیزار شخص ہے' ادب کی ہر روایت سے منحرف' اپنے وقت کا جدید لیکن کھلنڈرا آدمی' ظاہر ہے کہ میرا جی بالکل ایسے نہیں تھے۔ ان کی نگاہ ادب کے ہر رویے پر تھی۔ وہ جستجو پسند تھے۔ ان کا مطالعہ قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے سواد میں نہایت وسیع اور گہرا تھا۔ جہاں ان کی نگاہ ہندوستانی اساطیر پر تھیں وہیں وہ مغرب کے بدلتے ہوئے رجحانات کے بھی نبض شناس تھے۔ مشرق و مغرب کے وہ تمام شاعر جنہیں اپنے عہد کا "قطب" کہنا چاہئے' ان کے دائرہ فکر میں رہ چکے تھے۔ اپنی شاعری میں انہوں نے کس طرح سب کو جذب کیا اور اپنے اظہار کا وسیلہ اختیار کیا۔ تجزیہ طلب موضوع ہے۔

فضیل جعفری نے نثر کی دنیا میں انہیں جس زاویے سے دیکھا اور جو نکات دریافت کئے' وہ ان کی نکتہ رسی اور تخلیقی فکر کی دلیل ہیں فضیل چونکہ خود بہت اچھے شاعر اور نقاد ہیں اس لئے ان کے اخذ کردہ نتائج پر غور کیا جا سکتا ہے۔

فضیل جعفری کے علاوہ شمس الرحمان فاروقی کے مقالات (جو ان شماروں میں' مکالماتی اور تشریحاتی انداز کے ہیں) "افسانے کی حمایت میں" اور "شعر شور انگیز" وغیرہ مطالعے پر اکساتے ہیں۔

اختلاف اور اتفاق تو ہر تحریر سے ہو سکتا ہے' چنانچہ وارث علوی کا طویل مقالہ "فکشن کی تنقید کا المیہ" فاروقی صاحب کے مضمون "افسانے کی حمایت میں" پر ایک دلچسپ اور غور طلب جائزہ ہے۔ ان کا انداز تحریر بعض لوگوں کی نظر میں قدرے ناپسندیدہ ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس پر چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں' عسکری صاحب سے لیکر سلیم احمد تک اس انداز تحریر کا ایک سلسلہ ہے' جس میں کہیں چٹخارہ' بے مزہ بھی ہو گیا ہے اور اکثر طبع نازک پر گراں گزرا ہے

وارث علوی کی تحریر بظاہر غیر سنجیدہ نظر آتی ہے مگر اس کے بین السطور میں ایک سنجیدہ فکر بھی ہے' ہمیں اس پر اعتبار کرنا چاہیے۔ اعتبار کا مطلب اتفاق نہیں...... مطلب یہ کہ آج کل ادب میں "غیر سنجیدگی" ہمہ گیر رویے کے طور پر در آئی ہے (اور غالباً" یہ رویہ بھی محض متوجہ کرنے کے لئے ہوتا ہے) اگر وارث علوی چھیڑ چھاڑ کا انداز اختیار کرتے ہوئے قدرے بے تکلف ہو جاتے ہیں تو اسے ان کے مزاج کی خصوصیت سمجھتے ہوئے لطف بھی لینا چاہئے اور ان کی باتوں پر سنجیدگی سے غور بھی کرلینا چاہئے۔ رہی یہ بات کہ ان کی تحریر سے جو کسی کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہے' وہ شاید ایک ذاتی رد عمل ہے خدا جانے کب کے جلے پھپولے ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں' ویسے میں اتنا جانتا ہوں کہ

بازار میں آئے ہیں تو بولی بھی لگے گی
فن' جنس ہی ٹھہرا ہے تو گاہک کی خطا کیا

یہ شعر میرا ہے اور میں نے بھی کسی خود احتسابی کے لمحے میں کہا ہوگا۔

شمس الرحمان فاروقی سے اس بار حیدر آباد دکن میں' عالمی اقبال سیمینار کے دوران پہلی ملاقات ہوئی' خاصے زندہ دل

آدمی ہیں۔ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے ہیں۔ پڑھے لکھے بے شک ہیں لیکن ایسے نہیں کہ مجلس میں بیٹھیں تو دوسروں کو بور کریں۔ شگفتہ فقرے بھی کہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ فقرہ سننے کی تاب بھی رکھتے ہیں۔ حیدر آباد میں ہم لوگ جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے، وہاں اکثر میرے کمرے میں یا شہریار کے کمرے میں، احباب کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور فاروقی صاحب احباب کی خاطر ''موڈ'' کے ہر مرحلے میں شریک رہتے تھے۔ وہ نئی نسل کے سرخیل تو ہیں ہی مگر میں نے آل احمد سرور جیسے بزرگوں کو بھی ان کا مداح پایا، نقطہ نظر کا اختلاف اپنی جگہ...... یہاں سلیم احمد کے ساتھ بھی یہی ماحول رہتا تھا۔ جب تک سلیم زندہ رہے، کراچی کے ادبی حلقوں میں گھما گھمی کے ساتھ ساتھ زندہ دلی اور خوش گفتاری کا بھی عالم رہا۔ وہ لوگ بھی سلیم کو عزیز رکھتے تھے جو اکثر اس کی زد پر آجاتے تھے۔ پروفیسر ممتاز حسین جیسے ثقہ اور صاحب علم نقاد سے لیکر عزیز حامد مدنی جیسے خاموش طبع شاعر تک۔ احمد ندیم قاسمی کو سلیم سے محبت تھی۔ اور احمد ہمدانی جیسا ترقی پسند نقاد بھی اس کا شیدائی تھا اور سلیم احمد کی شاعری میں ترقی پسندی کے امکانات تلاش کرتا رہتا تھا حالانکہ سب جانتے ہیں کہ احمد ہمدانی کی اس ''تلاش'' پر خود سلیم احمد کا کیا رد عمل تھا۔ وہ فقرہ چست کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔

یہی رویہ سلیم کا میرے ساتھ تھا۔ مجھے جب بھی اپنی کتاب دی تو اس پر یہی لکھا کہ اپنے سوتیلے بھائی، حمایت علی شاعر کے لئے، مگر ہمارے درمیان باہمی محبت کی بھی ایک ایسی فضا تھی جو آج، جب وہ ہم سے دور چلا گیا ہے ہم اس کی یاد میں روتے ہیں............ تو میرے بھائی فاروقی اور وارث علوی میں ایسا بعد المشرقین بھی نہیں۔ وارث علوی کسی زمانے میں سخت ترقی پسند بھی تھے۔ بھیونڈی کانفرنس میں ان سے ایک سرسری ملاقات ہوئی تھی ۱۹۴۹ء میں۔ وہ احمد آباد سے آئے تھے۔ ان کے سوالات اس وقت بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ خصوصاً ''ڈاکٹر عبد العلیم کے مضمون پر...... بڑی گرما گرم بحث تھی۔ ڈاکٹر ملک راج آنند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اختر الایمان، عصمت چغتائی، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، عادل رشید، نیاز حیدر، صفیہ اختر، احسن علی خان، محمد مہدی، مدھو سودن، عبد الغفور انیس، ملک زادہ منظور احمد، حبیب فخری اور اختر سعید کے درمیان ایک آواز وارث علوی کی بھی تھی جو اپنے جوش و خروش میں دوسروں سے کسی طرح کم نہیں تھی حالانکہ یہ ان کی عمر کا وہ دور تھا کہ جب بڑوں اور بزرگوں کے درمیان کم ہی بولا جاتا ہے، میں بھی نوجوانوں میں شامل تھا۔ مگر حیدر آبادی تہذیب کا مارا ہوا۔ ادب سے بیٹھنا اور ادب سے سننا، ہماری تہذیبی تربیت کا اولین شرط تھی۔ ہم لوگ اجلاس کے بعد اپنے ہم عمروں میں تو بہت زور و شور سے بحث کرتے تھے مگر بڑوں کے درمیان ہمہ تن گوش رہتے۔

اس کے برعکس وارث علوی کے تیور اسی وقت سے گویا ''آج'' کی تحریروں کا سراغ دے رہے تھے بھیونڈی کانفرنس کے بعد میری وارث علوی سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اب صرف اس کے مضامین کے حوالے سے اس کے بارے میں سوچتا ہوں، اور اسے تو شاید بھیونڈ والی ملاقات یاد بھی نہ ہو۔

خیر...... پچھلے دنوں قرۃ العین حیدر پر بھی اس کا مقالہ پڑھا، یہ مقالہ مجھے لندن میں پڑھنے کا اتفاق ہوا، افتخار عارف کے پاس کسی نے فوٹو کاپی بھیجی تھی، اردو مرکز میں......... اور پھر اسی پر گفتگو رہی۔ یہ بات نومبر ۸۵ء کی ہے۔ میں اوسلو (ناروے) کی ادبی محفل میں شرکت کرکے کچھ ہفتوں کے لئے لندن چلا گیا تھا ہاں یاد آیا اس وقت ''جواز'' کا یہ ضخیم نمبر شائع ہو چکا تھا۔ ساقی فاروقی کے پاس دیکھا تھا اور ساقی نے بطور خاص، سردار جعفری کے نام لکھے ہوئے خطوط مجھے پڑھ کر سنائے اور پھر میں نے شمس الرحمان فاروقی کے نام اس کے خطوط بھی پڑھے۔ وارث علوی کا مضمون البتہ اب پڑھا۔ طویل بھی بہت ہے۔ نا، پورے سو صفحات، اب ''جواز'' کے یہ شمارے سامنے ہیں تو کتنی باتیں، اور کب کب کی باتیں، یاد آرہی ہیں، خط بھی

خواہ مخواہ طویل ہوتا جارہا ہے' تم بور تو نہیں ہوگئے؟ برسوں کے بعد ملو گے اور اپنے کارنامے یاد دلاؤ گے تو یہی ہوگا بھئی۔ مالیگاں جیسے مقام سے "جواز" جیسا رسالہ نکالنا' کارنامہ ہی تو ہے' یاد کا ذکر چھڑا تو تمہاری ہی غزل کے دو شعر ذہن میں تازہ ہوگئے۔

ٹھیک ہے اجلی یاد کا رشتہ اپنے دل سے ٹوٹا بھی
دریا دریا آگ اگلتا لیکن تم نے دیکھا بھی
موسم موسم یاد میں تیری تنہا ہم نے کاٹ دیئے
اک لمحے کے میل کا رشتہ' سچ ہے کوئی رشتہ بھی

جن اشعار کے آئینے میں' میں اپنی مختصر ملاقات اس کا لطف اور اس کے کرب کو محسوس کررہا ہوں اور اسے بھلانے کی کوشش کررہا ہوں' خدا جانے دوبارہ کب ملیں تمہارا ایک ہی شعر ہے نا

شاید ہمارا لوٹ کے آنا نہ ہوسکے
پچھلے سفر کی گرد تو ہنس ہنس کے جھاڑدی

اچھا یار' اب خط کو بھی مختصر کرتا ہوں' چند باتیں کہنا ہیں۔

ایک یہ کہ اب "جواز" مجھے پابندی سے ملنا چاہئے۔

نمبر دو یہ کہ فضیل جعفری کی کتاب "کمان اور زخم" کا تم نے صرف جلوہ دکھایا تھا۔ کتاب جلد بندی کے مراحل میں تھی خیال تھا کہ جب بمبئی پہنچوں گا تو تیار ہوچکی ہوگی۔ اب فوراً بھیج دو۔

نمبر تین...... اپنی کوئی کتاب بلکہ سبھی کتابیں بھیجو۔ "دھوپ کا آخری ٹکڑا" چھپ گئی ہوگی۔

فضیل نے اپنا شعری مجموعہ "رنگ شکستہ" مجھے بمبئی میں دیا تھا مگر ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "پانی اور چٹان" انکے پاس نہیں تھا اگر کسی طرح مل جائے تو بھیج دو' میں نے اس سلسلے میں فضیل کو بھی تاکید کی تھی' مگر اس کا مزاج تم جانتے ہو۔

میں بھی اپنی تمام کتابیں حسب وعدہ جمع کرکے جلد ہی بھیج دوں گا۔ کسی ایسے صاحب کے ذریعے جو اورنگ آباد یا بمبئی جارہے ہوں۔ وہاں سے تمہیں پوسٹ کردیں گے۔

میرے کلام کا ایک انتخاب' ہندوستان میں قیام کے دوران' مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا تھا۔ "حرف حرف روشنی" کتاب، چونکہ جلد بندی کے مراحل سے گزر رہی تھی اور مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب کی خواہش تھی کہ میرے قیام کے دوران ہی اس کی تقریب اجرائی بھی عمل میں آجائے۔ اس لئے صرف چند کاپیاں تیار کرکے مجتبیٰ حسین کے ہاتھ حیدر آباد دکن بھجوادی تھیں۔ وہیں عالمی اقبال سیمینار کے دوران اس کی تقریب منعقد ہوگئی۔ شمس الرحمان فاروقی' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' ڈاکٹر مغنی تبسم' ڈاکٹر انور معظم اور مجتبیٰ حسین وغیرہ نے تقاریر کیں اور پروفیسر شیو کے کمار شرما نے صدارت..... کتاب' وہیں بٹ گئی اب میں نے مکتبہ جامعہ کو لکھا ہے کہ کچھ نسخے مجھے بھی بھجوادو تاکہ احباب کو پیش کرسکوں تمہیں ممکن ہے کہ انہوں نے وہیں سے بھیج دی ہو' اگر مل گئی ہو تو تبصرہ کردینا۔

(باقی صفحہ نمبر ۳۸۷ پر)

علی احسن اور فضل شہاب الدین کے نام

(ایشین پوئٹری فیسٹیول، ڈھاکہ)

۱۴ مارچ ۱۹۸۷ء

محترم علی احسن صاحب
(چیئرمین ایشین پوئٹری فیسٹیول ڈھاکہ ۸۷ء)

اور

محترم فضل شہاب الدین
(سیکریٹری بنگلہ دیش پوئٹری سینٹر ڈھاکہ)

السلام علیکم

"ایشین پوئٹری فیسٹیول" اپنی نوعیت کی پہلی اور نہایت کامیاب ادبی تقریب تھی جو تین روز تک ڈھاکہ میں منائی گئی۔ اس تقریب کا اہتمام جس قرینے اور پر خلوص لگن اور محنت کے ساتھ کیا گیا تھا، اس کے لئے نہ صرف بنگلہ دیش کے اہل قلم قابل مبارکباد ہیں بلکہ حکومت بنگلہ دیش بھی، جس کا تعاون اس عظیم کانفرنس کو حاصل رہا۔ بالخصوص صدر بنگلہ دیش عالی جناب حسین محمد ارشاد صاحب جو خود بھی ایک اچھے شاعر ہیں۔

اس فیسٹیول کی معرفت ایشیاء کے مختلف ممالک کو ذہنی اور قلبی طور پر ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا۔ شاعری چونکہ دلوں کے سچے جذبات اور اعلیٰ افکار کی ترجمان ہوتی ہے اس لئے میرے خیال میں ایک دوسرے کی روح میں سفر کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ ہم فکری اعتبار سے جتنا مغربی ممالک کو جانتے ہیں اور ان کے اسالیب شاعری سے واقف ہیں، ایشیائی ممالک سے کم ہی آگاہ ہیں، حالانکہ اس براعظم کے رہنے والوں کی حیثیت سے ہمیں ایک دوسرے سے زیادہ باخبر رہنا چاہئے۔

آپ نے اس سلسلے میں پہلا قدم اٹھا کر ایک طرح سے سبھی ایشیائی ممالک کی رہنمائی کی ہے۔ پاکستانی ادیب و شاعر آپ کے اس اقدام کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ آپ کے دوش بدوش چلنے میں فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔

اس تقریب کے ہر اجلاس میں نہایت فکر انگیز مقالے پڑھے گئے۔ مختلف ادبی مسائل پر گفتگو ہوئی اور ایشیاء کی مختلف زبانوں کی شاعری کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اس طرح ہمیں احساس ہوا کہ ہم ایشیائی بھی ادب و شعر کی دنیا میں کسی سے کم نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنا ایک مخصوص تشخص رکھتے ہیں ہمارا ماضی بھی شاندار تھا اور ہمارا حال بھی جاندار ہے۔ اس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا مستقبل بھی تابناک ہوگا۔

فیسٹیول کے آخری اجلاس میں جو ترجمہ کمیٹی اور جو بین الاقوامی مشاورتی بورڈ تشکیل دیا گیا، وہ بہت اہم خدمات انجام دے سکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر آپ کا شکر گزار ہوں مجھے اس بورڈ کا رکن نامزد کیا گیا۔ میں ان تمام قراردادوں کی تائید کرتا

ہوں جو Plenary-Session مورخہ ۲ فروری ۸۷ء کے اجلاس میں منظور کی گئیں۔

میں نے ایشین پوئٹری فیسٹیول کے بارے میں اپنے تاثرات ایک مضمون کی صورت میں پاکستان کے ایک نہایت اہم جریدے "قومی زبان" (انجمن ترقی اردو کراچی) کے لئے قلم بند کئے ہیں۔ یہ مضمون انشاء اللہ اسی ماہ شائع ہوگا اور آپ کو بھیج دیا جائے گا۔

میں چونکہ بیس سال بعد آپ کے (اپنے) خوبصورت ملک میں آیا تھا' اس لئے محسوسات کا عالم ہی اور تھا' چنانچہ ایک رپورتاژ بھی لکھنا چاہتا ہوں خدا کرے کہ اتنی فرصت مل جائے۔ میرے لائق جو بھی خدمت ہو' تحریر فرمائیں۔

آپ کا حمایت علی شاعر

اظہار حیدر کے نام

(بسلسلہ جشن احمد ندیم قاسمی عرب امارات)

جوہانس برگ (انٹرنیشنل ایئرپورٹ)

جنوبی افریقہ

۱۴/اکتوبر ۱۹۸۷ء

برادر عزیز سلام خلوص

کراچی میں آپ سے مختصر ملاقات رہی۔ میں افریقہ کے سفر کی تیاریوں میں تھا۔ یہ خط آپ کو جوہانس برگ انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے پوسٹ کررہا ہوں میں یہاں سے بوٹس وانا چلا جاؤں گا اور گیبرون میں کچھ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شرکت کرنے کے بعد مختلف افریقی ممالک چلا جاؤں گا۔ یہاں مجھے سات' آٹھ گھنٹے فرصت کا وقت ملا ہے سوچا' اس دوران آپ ہی سے مخاطب کیوں نہ ہوجاؤں۔

مرا سفر طویل ہے' تقریباً تین ماہ لیکن انشاء اللہ ایسے وقت کراچی پہنچ جاؤں گا کہ ابوظہبی جانے والے احباب کا ساتھ دے سکوں۔ آپ حضرات جشن احمد ندیم قاسمی جس شاندار پیمانے پر منارہے ہیں وہ آپ کی اپنے ملک' اپنے ادب اور اپنی زندہ شخصیتوں سے محبت کی بے مثال دلیل ہے۔ کاش ہم بھی قاسمی صاحب کے لئے ایسا ہی اہتمام کرتے۔

قاسمی صاحب اردو ادب کی ان چند قد آور شخصیتوں میں سے ہیں جن پر ہمارے وطن کی تاریخ ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ شاعری' افسانہ اور صحافت تینوں شعبہ ہائے فنون میں انہیں ایک مخصوص انفرادیت حاصل ہے۔ شاعری میں آفاقیت' افسانے میں اپنی ثقافت اور صحافت میں وطنیت کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی رشتہ اخوت ان کی پہچان ہے۔

جتنے اچھے وہ ادیب ہیں' اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں' مجھے عرصہ دراز تک انہیں پڑھنے اور کچھ عرصہ ان کی رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے ادب کی حد تک ہماری نسل نے ان سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے اور جہاں تک رفاقت کا تعلق ہے مختلف ملاقاتوں سے قطع نظر' جب میں فلم انڈسٹری سے وابستہ تھا بحیثیت فلم ساز لاہور میں اپنی پہلی فلم "لوری" بنارہا تھا۔ قاسمی کی رفاقت' سرپرستی کی حد تک مجھے نصیب رہی۔ "لوری" کے مکالمے قاسمی صاحب ہی نے لکھے ہیں اور اس فلم کو جہاں اور کئی ایوارڈ ملے بہترین مکالمہ نگاری کا ایوارڈ احمد ندیم قاسمی کو پیش کیا گیا تھا دوسرے الفاظ میں میری فلم کو یہ اعزاز قاسمی صاحب ہی کی معرفت حاصل ہوا تھا۔ مزید براں دوران فلم سازی میں جن مشکل ترین مسائل کا شکار ہوا اگر قاسمی صاحب میری

حوصلہ افزائی نہ کرتے تو شاید میں ہمت ہار جاتا۔ قاسمی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ محبت کی انتہا تک اپنے رفیقوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ادب کی دنیا میں بھی ان کا طریق عمل وسیع النظری کی ایک اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ کتنے ہی نئے لکھنے والوں کی تربیت انہوں نے کی اور انہیں ایک چمکدار ستارہ بنادیا۔ وہ نہایت سنجیدہ' مخلص اور بردبار انسان ہیں یہی سبب ہے کہ ان کی شخصیت نہایت ہی پرکشش اور قابل احترام بن گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا کوئی شدید مخالف بھی جب ان کا نام لیتا ہوگا تو ادب ملحوظ رکھنے پر مجبور ہوجاتا ہوگا ویسے بھی لکھتے ہوئے قلم کا جھک جانا ادب ہی کا تو ثبوت ہے۔

کسی شخصیت کو یہ مقام اس وقت تک نہیں ملتا جب تک اس کی ذات و صفات ایک وحدت اختیار نہ کرلیں اور قاسمی صاحب تو اپنی ادبی تخلیقات کے حوالے سے بھی منفرد ہیں۔ شاعری میں ان کا مخصوص انداز ہے جو روایت اور جدت کا خوبصورت سنگم ہے۔ ان کا افسانہ بھی اپنے اسلوب کے اعتبار سے خاص پہچان رکھتا ہے۔ اور صحافت میں بالخصوص ان کے کالموں کی شگفتگی' بذلہ سنجی اور بے ساختگی اپنی مثال آپ ہیں۔

اس مختصر خط میں تفصیلی تجزیہ تو ممکن نہیں صرف اتنا ہی لکھ سکتا ہوں کہ وہ ہمارے عہد کے بہت بڑے آدمی ہیں عالمی پیمانے پر آپ حضرات ان کا جشن منا کر جو خراج عقیدت پیش کررہے ہیں وہ ہمارے لئے بھی ایک اعزاز کے مترادف ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

شفیق سلیمی' اقبال مہدی اور ڈاکٹر زبیر فاروق کو سلام اور میرے یار تاج کو بھی۔

آپ کا حمایت علی شاعر

صہبا لکھنوی کے نام

(مختلف ممالک سے چار خطوط)

(۱)

(گیبرون۔ بوٹس وانا افریقہ)

تقریباً دو ماہ سے افریقہ کے مختلف ممالک میں گھوم رہا ہوں اس دوران مختلف شہروں سے دو تین مختصر خطوط بھی آپ کو لکھے ممکن ہے مل گئے ہوں۔ جی تو چاہتا ہے کہ اپنے سفر کا احوال لکھوں مگر ابھی شاید ممکن نہیں' انشاء اللہ پاکستان پہنچ کر لکھوں گا فی الحال نوٹس لیتا جارہا ہوں۔

افریقہ کے بارے میں عام طور پر یہی مشہور ہے کہ یہ ایک تاریک براعظم ہے۔ مگر اب تو یہ روشن علاقہ ہے اندر سے بھی اور باہر سے بھی اور تیزی سے روشن تر ہوتا جارہا ہے دوسری اقوام سے قطع نظر یہاں کے مقامی باشندے بھی تیزی سے بیدار ہوتے جارہے ہیں جو سیاسی تحریکیں چل رہی ہیں وہ ایک خاص سمت میں اپنی قوم کی رہنمائی کررہی ہیں اور کوئی عجب نہیں کہ اگلی صدی تک پورے براعظم کا رنگ ہی بدل جائے۔ ظاہر ہے کہ اس جدوجہد کا اثر یہاں کے ادب پر بھی نمایاں

ہے۔ مقامی زبانوں کے جو تراجم نظر سے گزرے ہیں اور لوگوں کی گفتگو سے جو اندازہ ہوا ہے اس کی روشنی میں، میں تو خوش گماں ہوں۔ میں نے مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر بھی دیئے ہیں اردو ادب کے موضوعات پر کچھ لیکچروں کے وڈیو کیسٹ بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔

ایک افسوسناک صورت حال کی طرف بھی اشارہ کردوں، یہاں کی یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں پاکستان کی کتابیں بہت کم نظر آئیں۔ ہندوستان کی کتابیں البتہ خاصی تعداد میں دیکھیں، یہاں سے جب میں اوسلو (ناروے) گیا تو وہاں کی انٹرنیشنل لائبریری میں بھی یہی صورت حال تھی۔ اوسلو میں پاکستان سے جمیل الدین عالی، سید ضمیر جعفری، شریف کنجاہی، قتیل شفائی، احمد فراز، کشور ناہید، جون ایلیا اور پروین شاکر بھی شریک مشاعرہ تھے۔ ہندوستان سے کیفی اعظمی، خمار بارہ بنکوی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر آئے تھے۔

لندن سے عارف افتخار اور کینیڈا سے اشفاق حسین، ہاں کراچی سے محمد علی صدیقی نے بھی شرکت کی اور اردو ادب پر انگریزی میں مقالہ پڑھا تھا جو حضرات اپنی کتابیں ساتھ لائے تھے ممکن ہے انہوں نے لائبریریوں کو بھی نذر کی ہوں لیکن افریقی ممالک کی اکثر لائبریریوں میں شاید میری ہی کتابیں اولین پاکستانی کتابیں ہوں (بالخصوص ادبی کتب) اس مسئلے پر ہم لوگوں کو سوچنا چاہئے۔ ہاں ایک دو لائبریریوں اور چند حضرات کے مکانوں میں "افکار" دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کچھ حضرات تو افکار کے باضابطہ خریدار بھی ہیں ڈاکٹر یونس میر کا حوالہ میں اپنے پہلے خط میں دے چکا ہوں، میں نے افکار ادبی ٹرسٹ کے بارے میں بھی اکثر احباب سے ذکر کیا ہے وہ انشاء اللہ بہت جلد آپ سے تعاون کریں گے۔

اوسلو سے میں گیبرون (بوٹس وانا) افریقہ کے جنوب میں آچکا ہوں۔ یہاں سے دوسرے ملکوں میں جاؤں گا، مثلاً" زمبیا، زمبابوے، اور موری شس وغیرہ۔ افریقی ممالک میں سبھی مشاعرے کامیاب رہے۔ سبھی مشاعروں کے وڈیو کیسٹ میرے ساتھ ہوں گے کراچی کے دوست دیکھیں گے تو انہیں خوشی ہوگی اور انہیں اندازہ ہوگا کہ ان ممالک میں بھی اردو کے چاہنے والے کتنے ہیں۔ مقامی لوگوں نے بھی بے حد دلچسپی کا اظہار کیا میں تو سمجھتا ہوں کہ یورپ، امریکہ اور کینیڈا کی طرح اب ان ممالک میں بھی ہر سال مشاعرے ہوا کریں گے۔ ہمارے ٹی وی ڈرامے بھی یہاں بہت مقبول ہیں۔

احباب کو میرا سلام کہیں، خدا کرے آپ خیریت سے ہوں اور نکہت بھی۔ راغب صاحب بھی تو سلام کہہ رہے ہیں

خدا حافظ

(مطبوعہ۔ "افکار"۔ دسمبر ۸۷ء)

(۴)

ونڈسر (کینیڈا)

امریکہ آکر مجھے تقریباً تین ماہ ہورہے ہیں اس دوران ایسا مصروف رہا کہ پاکستان میں کسی کو خط نہ لکھ سکا۔ ٹیلی فون کی سہولتیں ایسی ہیں کہ ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی، میں جہاں بھی گیا کم وبیش ہر جگہ آپ کے جاننے والے ملے۔ "افکار" کا بھی ذکر آیا اور "افکار" کے مسائل کا بھی۔ پروگرام کے مطابق اب تک بوسٹن، واشنگٹن، شکاگو، نیویارک، فلاڈلفیا، میامی، ہیوسٹن، اٹلانٹا، لاس اینجلس، سان فرانسسکو اور لاس ویگاس جا چکا ہوں۔ کل ڈیٹرائٹ میں مشاعرہ ہے۔ آج ونڈسر (کینیڈا) میں ڈاکٹر عروج اختر زیدی کے اسٹڈی روم میں بیٹھا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نیویارک جانے والے ہیں انہیں

ایئرپورٹ چھوڑنے میں پھر ' ڈیٹرائٹ (امریکہ کا سرحدی شہر) جاؤں گا اور یہ خط وہیں سے پوسٹ ہوگا۔
ونڈسر۔ دریا پار کینیڈا کا سرحدی شہر ہے۔ صرف ایک پل درمیان میں پڑتا ہے۔ پھر میں کینیڈا آجاؤں گا اور پھر ممکن ہے کہ ٹورنٹو اور مانٹریال وغیرہ جاؤں ۲۴ دسمبر کو مجھے بھی نیویارک پہنچنا ہے۔ نیوجرسی کے مشاعرے کے سلسلے میں جن شہروں کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر مقامات پر آپ بھی جا چکے ہیں۔ اتفاق سے میں بھی انہیں گھروں میں ٹھہرا ہوا ہوں جہاں آپ نے قیام کیا چنانچہ آپ کا ذکر بھی رہا اور ساتھ ہی آپ کے رفقائے سفر یعنی شان الحق حقی اور کشور ناہید وغیرہ کا بھی۔ میں نے مختلف تصاویر بھی دیکھیں اور یقین آیا کہ آپ کا سفر بھی بڑا پُرلطف رہا ہوگا۔ خیر یہ سب باتیں زبانی ہوں گی۔
اس سفر میں اکثر مقامات پر "افکار فاؤنڈیشن" کے بارے میں گفتگو رہی۔ جن حضرات نے دلچسپی ظاہر کی میں نے ان کے نام اور پتے لے لئے ہیں۔ کراچی پہنچ کر آپ کو دے دوں گا ان حضرات کو تفصیلات بھیج دیں۔ افریقہ کے "پرستاران افکار" کے نام اور پتے بھی آپ کو نہ دے سکا جس کے لئے شرمندہ ہوں۔ افریقی ممالک سے واپسی کے بعد آپ کو معلوم ہے ہمارا شہر (کراچی) کتنا ڈسٹرب رہا۔ آئے دن کرفیو' آئے دن ہنگامے۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر میں زیادہ رہ بھی نہ سکا۔ انہیں دنوں ہندوستان' عرب امارات اور قطر وغیرہ جانا پڑا۔ ناروے اور موریشس کے دورے بھی انہیں دنوں میں ہوئے۔ ذرا فاصلوں اور سمتوں کا اندازہ کیجئے۔ میں تو سوچ کر ہی تھک جاتا اور پھر اب سفر ' میں ہوں ایک چکر ہے میرے پاؤں میں......
یہاں اکثر اہل قلم ملے جنہوں نے آپ کو سلام کہا ہے' ان کے نام یادداشت کے مطابق لکھ رہا ہوں کیفی اعظمی' بیگم ممتاز مرزا اور وسیم بریلوی (ہندستان سے) عاشور کاظمی (لندن سے آئے تھے) ڈاکٹر مظفر شکوہ' حنیف اخگر' ڈاکٹر صبیحہ خاتون صبا' عزیز الحسن' رشیدہ عیاں' یونس شرر' طلعت اشارت' حمیرا رحمان (نیویارک) اے کے ضیا (سڈبری سے آئے تھے) ڈاکٹر عبداللہ' سید اظہار کاظمی' ڈاکٹر سلمان اختر (جاں نثار اختر کے صاحبزادے۔ واشنگٹن) نیر جہاں' احمد جعفری (سید محمد جعفری کے صاحبزادے) ظفر عباس (فارغ بخاری کے بیٹے)' انور خواجہ اور خالد خواجہ (لاس انجلس) اعجاز نسرین' افتخار نسیم' ڈاکٹر عابد اللہ غازی اور ڈاکٹر فاروقی (شکاگو) محترمہ نسیم سید' جمال زبیری' عابد جعفری (کینیڈا) شوکت مرزا (میامی) ظفر تقوی' نسیم تقوی' اثر جلالی (ہوسٹن) جاوید سیر' جہانگیر ہمدانی (سان فرانسسکو) حسن کمال (اٹلانٹا) جاوید اختر اور ڈاکٹر منیب الرحمان (ڈیٹرائٹ) معراج کرمانی اور آصف فرخی (بوسٹن) خالد نیر (لاس ویگاس) یہ تمام حضرات مختلف مشاعروں میں ملے' کسی نے آپ کو سلام کہا۔ کسی نے "افکار" سے دلچسپی ظاہر کی۔ کچھ پہلے ہی س افکار سے وابستہ ہیں۔ اب میں وہاں آکر ان تمام لوگوں کے نام اور پتے بھی دے دوں گا جو آپ کے قریب آنا چاہتے ہیں۔ اچھا بھئی' خدا حافظ۔ نکہت بریلوی اور دوسرے دوستوں کو سلام۔

(مطبوعہ "افکار" مارچ ۸۹ء)

(۳۲)

(میامی امریکہ)

پاکستان سے آئے ہوئے مجھے تقریباً ایک مہینہ ہوچکا ہے نیویارک' واشنگٹن' کلیولینڈ وغیرہ سے ہوتا ہوا شکاگو پہنچا اور آج میامی جاتے ہوئے آپ کو خط لکھ رہا ہوں تین گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ میامی سے ہوسٹن جاؤں گا جہاں پچھلے سال "معاملات دل" نے فکرمند کردیا تھا۔ آخر ڈاکٹر عبد العلی نے جو ایک بڑے ماہر امراض قلب ہیں ازراہ محبت ہرمن اسپتال میں میری انجوگرافی کی اور مجھے اطمینان دلایا کہ ابھی یہ دل ساتھ نہیں چھوڑے گا جبکہ واشنگٹن کے چیک اپ میں کچھ اندیشے ظاہر کردیے گئے تھے۔ ہوسٹن پہنچ کر اب پھر اپنے دل کی "چھان پھٹک" کراؤں گا۔ ڈاکٹر عبد العلی کا تعلق حیدر آباد دکن سے

ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کے بڑے قدر داں ہیں اکثر دل کے ماروں نے ان سے فیض پایا ہے۔ ان کے گھر میں' میں نے افکار کے علاوہ کئی پاکستانی اور ہندوستانی رسائل دیکھے' اس بار "افکار فاؤنڈیشن" کا بھی ذکر کروں گا۔ حمید الدین شاہد کی بیگم بھی آج کل ہیوسٹن میں زیر علاج ہیں۔ وہ خود بھی ڈاکٹر ہیں۔ اللہ کرے انہیں جلد صحت نصیب ہو' کراچی میں شاہد بھائی بہت پریشان رہتے ہیں' ہیوسٹن سے میں ڈلس جاؤں گا۔ اور پھر ڈیٹرائٹ' وہاں سے کینیڈا (ٹورنٹو) ایڈمنٹن' آٹوا' کیلگری اور پھر مونٹریال وغیرہ وینکور کے دوست بھی بلا رہے ہیں۔ ۸۱ء میں وہاں گیا تھا خوب صورت ترین علاقہ ہے خاص طور پر ان کے صدر مقام وکٹوریہ (جزیرہ) کا بوچارٹ گارڈن جسے دیکھ کر یہ شعر سچا ہو جاتا ہے کہ

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

کشمیر کا علاقہ تو ہم نے دیکھا نہیں جس کے لئے یہ شعر کہا گیا تھا مگر ناروے' سوئیڈن اور وینکوور دیکھ کر میں اس کی صداقت پر ایمان لے آیا' ان ممالک کو دیکھ کر "قدرت" کے جمال کا احساس تو ہوتا ہی ہے مگر انسان کی عظمت کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے اقبال نے کہا تھا کہ "تو شب آفریدی' چراغ آفریدم' سفال آفریدی' ایاغ آفریدم" انسان کی تخلیقی فکر نے دنیا کو کیا سے کیا بنادیا' مغربی ممالک کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے ویسے ہمارا شکست خوردہ مشرقی ذہن (ہندوپاک) اپنے مخصوص و محدود زاویہ نگاہ سے مغرب میں صرف اندھیرا ہی دیکھتا ہے۔ وہ صدیوں سے کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہے مگر یہ نہیں سوچتا کہ پانی ٹھہرا ہوا ہو تو گہرائی کے باوجود اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ مغرب اور انتہائی مشرق (جاپان) اور شمال (چین و روس) میں آب حیات رواں دواں ہے خیر یہ ایک لمبی بحث ہے ہم اردو ادب والے تو محلے داری فیتے لیکر ایک دوسرے کا قد و قامت ناپتے پھرتے ہیں۔ عالمی ادبی معیارات میں ہمارا (موجود نسل) کا کیا شمار' پاک و ہند کا یہ مخصوص انداز فکر یہاں بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی انائیں یہاں بھی ٹکراتی رہتی ہیں اور اپنے اپنے گنبد میں اذانیں دیکر خوش ہولیتی ہیں۔ سمجھتی ہیں کہ سارے عبادت گزار ان کے سائے میں جمع ہو جائیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا' چھوٹی چھوٹی صفیں بنتی ہیں اور بکھر جاتی ہیں۔ یہی صورت حال لندن کی بھی ہے اور یورپ کے دوسرے شہروں کی بھی۔ پہلے لوگ بت بنا کر پوجا کرتے تھے۔ اب خود بت بنے ہوئے ہیں جبکہ نئی نسل بت شکن ہو چکی ہے۔ خدا ان خود پرستوں پر رحم کرے۔ حفیظ ہوشیارپوری نے کیا اچھا شعر کہا تھا۔

جہاں میں کوئی ہمارے سوا بھی ہو شاید
ہم اپنے آپ سے باہر نکل کر دیکھیں گے

خیر...... میں جنوری کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں آؤں گا' ابھی یورپ کے مختلف شہروں میں بھی جانا ہے۔ افکار فاؤنڈیشن کی بات وہاں بھی کرنی ہے نا۔

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

نکہت بریلوی اور دیگر احباب کو سلام کہئے' یہاں آپ کو سبھی پوچھتے ہیں اور سلام کہتے ہیں۔

(مطبوعہ۔ "افکار" کراچی۔ فروری ۹۰ء)

(۴)

(بازو۔ لندن)

نکہت سے فون پر آپ کی خیریت تو معلوم ہو گئی تھی۔ خدا کرے آپ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکے ہوں۔ میں نے نکہت کو بریڈ فورڈ سے فون کیا تھا اور مقصود الٰہی شیخ (راوی) اور حضرت شاہ کا سلام پہنچایا تھا۔ انگلینڈ میں جہاں بھی گیا' دوستوں نے آپ کا احوال پوچھا۔ ویسے "افکار" کی صورت انہیں خیریت کی اطلاع مل ہی جاتی ہے۔ مانچسٹر میں جرمنی سے آئی ہوئی شاعرہ رخسانہ شمیم سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بھی محمد علی صدیقی' جمیل الدین عالی اور آپ کو سلام کہا۔ وہ آج کل پاکستانی شاعری کا جرمنی میں ترجمہ کر رہی ہیں۔ اکتوبر میں' میں امریکہ جاتے ہوئے جرمنی بھی جاؤں گا اور انہیں کچھ پاکستانی تخلیقات بھی فراہم کروں گا۔ گلاسکو میں ڈاکٹر شفیع کوثر نے یونیورسٹی ہال میں مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ بہت ہی اچھا مشاعرہ ہوا۔ (ڈاکٹر صاحب اپنے ثاقب انجان کے داماد ہیں) برمنگھم میں سردار عتیق آئے ہوئے تھے۔ کشمیر کے تعلق سے اہم اجلاس ہوئے۔ لندن آکر میں عمران الارشد کے گھر ٹھہرا اور اب تک یہیں ہوں۔ بیچ میں ایک ہفتے کے لئے اوسلو (ناروے) چلا گیا تھا۔ جمشید مسرور نے وہاں بہت بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا تھا اور مشاعرہ بھی خوب ہوا۔ پاکستان کے تقریباً دس شعراء شریک تھے۔ ڈنمارک' کوپن ہیگن اور سویڈن سے بھی شعراء آئے تھے اور ہندوستان سے بھی۔ پاکستان کے مزاح نگار انور مسعود اور انعام الحق جاوید نے خوب رنگ جمایا۔

ہاں کراچی کے طارق مرزا بھی مختلف مشاعروں میں شریک رہے۔ بھئی طارق تو خوب کہتا ہے۔ اس کی کتاب "خواب" شاید افکار میں پہنچ گئی ہو۔

کل لندن یونیورسٹی میں حسن عابد اور میرے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا گیا تھا۔ معین الدین شاہ نے حسن عابد پر اور عمران نے مجھ پر مضمون پڑھے اور پھر "کلام شاعر بہ زبان شاعر" کا سلسلہ چلتا رہا تقریباً سبھی ادیب و شاعر جمع تھے۔ ساقی فاروقی بھی تھا۔ ساقی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری پر ایک طویل مضمون بھی لکھا ہے اور "اوراق" ہی میں اشاعت کے لئے بھیج دیا ہے۔ وہ مضمون (جیسا کہ اس نے بتایا) ایسا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کیا پورا "دبستان سرگودھا" دو دھاری تلوار بن جائے گا۔ دیکھیں "اوراق" میں شائع ہوتا ہے یا نہیں۔ ساقی نے کہا کہ اس مضمون کی ایک کاپی "فنون" کو بھی بھیجی گئی۔ قاسمی صاحب پھر مشکل میں پڑ جائیں گے۔ اللہ ان پر اپنا فضل کرے۔

یہاں بانو احمد (مولانا ارشد تھانوی کی صاحبزادی' عمران کی بہن) خوب لکھ رہی ہیں۔ ان کے افسانے بڑی توجہ سے پڑھے جاتے ہیں۔ جلد ہی اس کی کتاب بھی آنے والی ہے۔ افکار میں بھی لکھتی رہی ہیں "پانوں کی ڈبیہ" (افسانہ) میری نظر سے بھی گزر چکا ہے۔ "راوی" اور "اردو ادب" (معین الدین شاہ) میں اکثر اس کی کہانیاں اور مضامین چھپتے ہیں۔ آج کل مغربی مصوروں پر سلسلہ مضامین شروع کر رکھا ہے۔

میں انشاء اللہ ۸ اگست کو یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ (بشرطیکہ سیٹ مل جائے) عمران کو بھی لکھنے اور مسلسل لکھنے پر آمادہ کر رہا ہوں۔ فی الحال اپنے والد گرامی مولانا ارشد کے کلام اور ان کی مختلف تحریروں کو مرتب کرنے میں مصروف ہے۔

آج میں اپنے بیٹے اوج کمال کے تحقیقی مقالے کے لئے کچھ مواد حاصل کرنے برٹش لائبریری بھی گیا تھا۔ سلیم قریشی صاحب بڑی مدد کررہے ہیں۔ بہت سا مواد (فوٹو کاپی) فراہم کردیا ہے۔ عمران سے میں نے کہا ہے کہ مولانا ارشد تھانوی کی تحریریں بھی انڈیا آفس لائبریری میں جمع کروادے۔ آمادہ تو ہوگیا ہے۔ دیکھیں یہ ارادہ کب تکمیل کو پہنچتا ہے۔ آج کل خود کو تازہ دم کرنے میں مصروف ہے۔ خوب پڑھتا ہے۔ اس کا کتب خانہ قابل دید ہے۔

اس بار ساقی فاروقی بھی اس عالمی اردو کانفرنس میں شریک ہوگا جو شوکت زیدی (ایلیٹ کالج) کراچی میں منعقد کررہے ہیں۔ یہاں کے مختلف مشاعروں میں وہ بھی شریک تھے۔ ابھی ابھی ساقی کا فون آیا تھا۔ آج رات اپنا مضمون سنانے آئے گا۔ اس لئے باقی خط کل لکھوں گا۔

ارے بھئی یہ خط نما مضمون تو کمال کا ہے "شعر بہ شعر تنقید اور نہایت ذہانت کے ساتھ" کسی کی بے جا طرف داری نہیں کی۔ اور ایسے ایسے پہلو دریافت کئے ہیں کہ "پیشہ ور ناقدین" بھی حیران رہ جائیں۔ سچ ہے سچا شاعر ہی اچھا ناقد ہوتا ہے (کاش، وہ کبھی اپنا مطالعہ بھی اسی نگاہ سے کرے) یہ مضمون ہندوستان میں بھی پہنچ گیا ہے "ذہن جدید" شائع کررہا ہے۔ دیکھیں پاکستان میں کون شائع کرتا ہے۔ ایک "بلند و بالا" عمارت کے گرنے کا منظر دیکھنے کے قابل ہوگا۔ ویسے وزیر آغا کی تنقید کا اس نے بھی اعتراف کیا ہے۔ (اختلافات اپنی جگہ) بہت پرلطف دن گزر رہے ہیں۔ افتخار نسیم بھی شکاگو سے آیا ہوا ہے۔ بہت سی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔ سب دوستوں کو سلام کہئے۔ تازہ افکار ابھی ابھی آیا ہے۔ اب اسے پڑھوں گا۔ عمران سلام کہہ رہا ہے اور اس کی جرمن بیوی "یوبی" بھی۔

(مطبوعہ۔ "افکار" اکتوبر ۹۳ء)

ریاض صدیقی کے نام

(علامہ اقبال۔ مولانا مودودی۔ اسلامی سیاسی تحریکات)

بھائی ریاض صدیقی، سلام خلوص

آج آپ کی کتاب "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" (مطالعہ اقبال) ملی، سنا ہے کہ آپ خود میرے گھر آئے تھے اور ساتھ کچھ احباب بھی تھے، کاش میں گھر پر ہوتا، جب سے ملازمت سے سبک دوش ہوا ہوں، زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہا، ۱۳ر جولائی ۸۶ء کو سندھ یونیورسٹی سے نکلا تو زندگی اس شعر کے مصداق تھی۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو "اہل وطن" ہم تو سفر کرتے ہیں

"تعلیمی ادارہ" ہم لوگوں کا وطن ہی تو ہوتا ہے، خیر اس دوران کچھ وقت عرب علاقوں میں گزارا، دس بارہ دن بنگلہ دیش میں اور تقریباً ایک ماہ ہندوستان میں، بنگلہ دیش اور ہندوستان کا سفر یادگار تھا۔ ڈھاکہ میں ۳۱ جنوری ۸۷ء سے ایشین پوئٹری فیسٹیول تھا جو تین روز تک جاری رہا۔ بارہ ممالک کے تقریباً ۴۲ شعراء نے شرکت کی تھی جن میں روس، ترکی، ایران، جاپان، سری لنکا، ملائیشیا، نیپال، ہندوستان، شمالی کوریا، فلپائن، بھوٹان اور پاکستان کی شعراء شامل تھے۔ مختلف مسائل پر گفتگو رہی،

ہندوستان تو گزشتہ تین سال سے مسلسل جارہا ہوں وہاں ان برسوں میں چند بہت ہی شاندار تاریخی تقریبات منعقد ہوئیں' سراج اورنگ آبادی کا تین سو سال جشن اورنگ آباد میں بڑی دھوم دھام سے منایا گیا (مارچ ۸۶ء) یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اورنگ آباد میرا آبائی شہر ہے' حیدر آباد دکن میں "عالمی اقبال سیمینار" ۱۱ اپریل ۸۶ء بھی قابل رشک تھا روس کے علاوہ مصر اور ایران سے بھی اسکالرز آئے تھے۔ اسی سیمینار کے ایک اجلاس میں علی سردار جعفری کے ساتھ وہ ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آیا جس پر بحیثیت "حیدر آبادی مسلمان" ہم سب کی گردنیں شرم سے جھکی ہوئی ہیں

ان دنوں شہربانو طلاق کے مقدمے کا فیصلہ' کسی مولوی کا فتویٰ اور پھر اسکے رد عمل میں مسلم پرسنل لاء' کا مطالبہ ایک جذباتی شور تھا جس نے سارے ہندوستان میں ہنگاموں کی صورت اختیار کرلی تھی۔ لیکن بھائی' میں تو اس دن علی سردار جعفری کی جرات اور قوت برداشت کا قائل ہوگیا جب انہوں نے اپنے گلے سے جوتوں کا ہار اتار کر' نہایت اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اس گھٹیا حرکت کو معاف کردیا' مجھے تو بے اختیار فیض صاحب کا یہ شعر یاد آگیا۔

غم جہاں ہو' غم یار ہو کہ تیر ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

پھر اپنا بھی ایک شعر

یہ سنگ زنی میرے لئے بارش گل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ بدست دگراں اور

علی سردار جعفری نے کہا کہ جس شخصیت کی یاد ' ہم عالمی پیمانے پر یہاں منارہے ہیں اس کے ساتھ بھی دین کے نادان دوست ایسا برتاؤ کرتے رہے ہیں' میں اس قابل تو نہیں کہ اس کے برابر کھڑا ہوسکوں مگر آج مجھے اس اعزاز سے نواز دیا گیا۔ پھر سردار جعفری نے علامہ اقبال کے فکری اجتہاد کی روشنی میں ایسی بصیرت افروز تقریر کی کہ پورا ہال داد و تحسین سے گونج اٹھا۔ مصری اور ایرانی دانشوروں نے تو انہیں بے اختیار گلے سے لگالیا۔ ان کے ماتھے کو چوم چوم لیا اور اپنی تقاریر میں خراج عقیدت بھی پیش کیا۔

آج آپ کی کتاب پڑھتے ہوئے یہ باتیں شاید اس لئے بھی یاد آگئیں کہ جس نازک مسئلے پر آپ نے قلم اٹھایا ہے اس کا انجام اہل وطن کی طرف سے ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اکثر اہل دانش کے سخن ہائے گفتنی' خوف فساد خلق سے اسی لئے ناگفتہ رہ جاتے ہیں۔

علامہ اقبال کے پرستار ہم سب ہیں مگر ہم شخصیت کی پرستش اس اندھے اعتقاد کی سطح پر نہیں کرتے جسے ہمارے ملک میں عام کیا جارہا ہے یہ تو علامہ کی خوش نصیبی ہے کہ وہ ہماری صدی کے شاعر ہیں' اگر دو سو سال پہلے پیدا ہوئے تو خدا جانے ان کا حشر کیا ہوتا۔

ہم سب مانتے ہیں کہ وہ برصغیر کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہماری شاعری کو نہ صرف فلسفیانہ اور سائنسی افکار عطا کئے بلکہ نہایت جرات کے ساتھ ہمیں "روایتی مذہب پرستی" کے دلدل سے نکالا۔ انہوں نے اپنے شعور کے مطابق نظریات کی دنیا میں بھی انتقادی رویہ اختیار کیا اور جن نتائج پر پہنچے' ان کا برملا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ جب شعر کی زبان ان کے خیالات کی ترسیل

میں محدود اور غیر معقولی تاویلات کا شکار ہونے لگی تو نثر میں اپنا مطمحِ نظر واضح کیا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے انگریزی کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔ اس کا ایک سبب تو غالباً یہ تھا کہ اردو ان اصطلاحات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی جو مختلف فلسفوں کی معرفت اظہار کی طالب تھیں اور دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ صرف ان اہل علم سے مخاطب ہونا چاہتے تھے جو ان کے نقطہ نظر کو سمجھ سکیں۔ ایک عام مولوی جو مغربی علوم سے نابلد تھا اور فلسفیانہ نکات کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا، ان کی نظم "شکوہ" پر پہلے ہی چراغ پا ہو چکا تھا۔ مجبوراً انہیں "جواب شکوہ" لکھنا پڑا۔ "اسرار خودی" اور اس پر لکھے ہوئے دیباچے کا حشر وہ خود دیکھ چکے تھے اس سلسلہ میں بھی انہیں دوسرا مقدمہ لکھنا پڑا اور خواجہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی جیسے دوستوں اور بزرگوں سے معذرت چاہنی پڑی (ان معذرتوں کا حوالہ آپ نے بھی اپنی کتاب کے صفحہ ۶۸ پر دیا ہے) ایک ایسے معاشرے میں جہاں لوگ لکیر کے فقیر ہوں اور روایتی عقائد کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے ہوں اور جزوی باتوں پر کفر کا فتویٰ تک عطا کر دیتے ہوں وہاں شاعرانہ شوخی کی بھی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے۔

ایسی ہی مولویانہ ذہنیت پر جو صدیوں سے مسلم معاشرے پر مسلط ہے، کبھی میں نے بھی ایک شعر کہا تھا

وہ وقت بھی عذاب الٰہی سے کم نہیں
جب آدمی میں ہوتا ہے بیدار "مولوی"

ایک دور تھا کہ یہی الفاظ مولوی، مُلّا، قاضی، خلیفہ اور صوفی وغیرہ کتنے محترم تھے مگر "تاریخی اعمال" کے نتیجہ میں آج کن معنی میں استعمال ہونے لگے ہیں اور معاشرہ میں ان کی کیا اوقات رہ گئی ہے، غور کیا جائے تو ہماری تاریخ کا بڑا المیہ اسی میں پوشیدہ ہے علامہ اقبال کے یہ اشعار آخر کس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں۔

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں، یہ بے چارے دو رکعت کے امام

اور وہ دلچسپ نظم "ملا اور بہشت" (کچھ اشعار قند مکرر کے طور پر لکھ رہا ہوں۔)

میں بھی حاضر تھا وہاں، ضبط سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرت مُلّا کو ملا حکم بہشت
عرض کی میں نے، الٰہی میری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لب کشت
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

اردو اور فارسی کے شعراء نے معاشرے کے ان کرداروں کا جس جس انداز میں تجزیہ کیا ہے، اپنی جگہ خود ایک موضوع

ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ معاشرے پر ان شعراء کا بڑا احسان ہے کہ ان کا طلسم توڑ دیا اور ان کے "ماسک" لگاتے ہوئے چہروں کا اصلی روپ دکھادیا۔

پیران کلیسا ہوں کہ شیخان حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے، نے جدتِ کردار

علامہ اقبال کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ انہوں نے فکری طور پر ساری عمر جس طبقے کے خلاف جنگ کی، پاکستان میں وہ طبقہ ان پر مسلط ہوگیا اور ان کو اپنی صف میں لے آیا۔ سیاست کاروں نے علامہ کی شخصیت کو اپنی ڈھال کے طور پر تو استعمال کیا ہی ہے، مُلائیت نے بھی انہیں اپنا آلہ کار بنالیا۔

علامہ اقبال بلاشبہ ایک مخصوص نقطہ نظر رکھتے تھے وہ ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی کے تاریخی محرکات جاننے کے سبب اس اندیشے سے آگاہ تھے جو مستقبل قریب میں پیش آنے والا تھا۔ وہ اسلام کے ایک باشعور شیدائی ہونے کے ناطے خلوص دل سے چاہتے تھے کہ ان مثبت اقدار کو فروغ حاصل ہو، جو اسلام کی روح سے عبارت ہیں۔ اس غرض سے انہوں نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا اور وقت کے تقاضوں کے پیش نظر ایسے مسائل پر بھی سوچا جو پیچ در پیچ الجھنوں کے شکار تھے، ان کا شاعرانہ مزاج جس حد تک اس ماحول کو برداشت کرسکا اور ان کی شاعرانہ فکر جس حد تک ان پیچیدگیوں کی گرہ کشائی کرسکی۔ وہ اپنے تئیں ایک لائحہ عمل بھی مرتب کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ انہیں یہ احساس بھی ہوتا رہا کہ وہ سیاست کے مرد میدان نہیں ہیں (ڈاکٹر تھامسن کے نام خط)

طبقاتی معاشرے میں سیاست ہمیشہ کسی خاص طبقے کے مفادات کی ضامن ہوتی ہے اور سیاست کار جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے، فطرتاً" اسی کا محافظ ہوتا ہے، اس صورت میں مذہبی فرقہ واریت اور لسانی اور صوبائی تعصبات اس کے وہ ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ عوام کو اپنے قابو میں کرتا ہے۔ اس سلسلے میں جن عناصر کو وہ آلہ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے، انہیں "معاوضۂ حسنِ خدمت" بھی ادا کرتا ہے۔ برصغیر میں آزادی کی جدوجہد میں بھی یہی ہوا۔ انگریز تو چلا گیا مگر قوم دونوں ملکوں میں آج تک ان تمام عناصر کو بھگت رہی ہے، مزید براں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ جو مخلص رہنما اس جدوجہد میں پیش پیش رہے ہیں ان میں اس تاریخی اور تہذیبی شعور کا فقدان تھا جو برصغیر کی مختلف اکائیوں میں قدر مشترک کے طور پر پروان چڑھ رہا تھا، اگر چند ایک مثالیں موجود بھی ہیں تو انہیں تنگ نظر جذباتیت نے رد کردیا۔ ایک اور بات جو بالخصوص "مسلم دانشوری" سے تعلق رکھتی ہے جدوجہد آزادی میں ان کا مخصوص نقطہ نگاہ تھا...... جو محض "تصوراتی" تھا.......... علامہ اقبال بھی بنیادی طور پر شاعر تھے، ان کا یہ انداز فکر اسی شاعرانہ تصوریت کی مثال ہے

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بے شک اس فکر کے پیچھے فلسفہ توحید بھی کام کررہا ہے لیکن جغرافیائی، تاریخی اور تہذیبی حدود میں سانس لینے والی حقیقتیں اس کے برعکس ہیں۔ خیر یہ ایک طویل بحث ہے، برصغیر ہی کی حد تک ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے جتنی بھی سیاسی تحریکیں چلائیں، اپنے نتائج میں سبھی ناکام ہوئیں۔ تحریک مجاہدین ۱۸۳۵ء ہو کہ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء، تحریک ریشمی رومال، ہو کہ تحریک ہجرت اور تحریک خلافت ہو کہ بعد کی تحریکیں جن میں خاکسار اور احرار بھی شامل ہیں۔ سب میں کوئی نہ کوئی پہلو

ایسا ضرور تھا جسے غور طلب کہا جاسکتا ہے۔ دراصل ہمارا مجموعی طرزِ فکر ہی ایک دلچسپ "خوش گمانی" کا شکار رہا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے مسلمان ہونے کے ناطے کبھی شاہ ابدالی کو حملے کی دعوت دی اور کبھی "عالمی اسلامی برادری" (Pan-Islamism) کی خوش فہمی میں ترکی، عرب اور افغانستان کی متحدہ کمان کے خواب دیکھے، کبھی ہمارے مذہبی علما (مولانا عبد الباری فرنگی محلی) نے ہندوستان کو دار الحرب کہہ کر عام مسلمانوں کو ہجرت کی ترغیب دی اور ہزاروں لوگوں کو گھر سے بے گھر کردیا اور کبھی انتہائے سادگی میں (شریف مکہ کی معزولی کے بعد) ابن سعود کو "مسلمانانِ عالم کا خلیفہ" بن جانے کی پیشکش کردی، لیکن ہوا کیا؟

۱۸۳۱ء میں سید احمد بریلوی بالاکوٹ میں شہید کردیے گئے تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء "غدر" کہلائی اور بغاوت، "انگریز دوستی" میں بدل گئی، عبید اللہ سندھی کو پہلے ماسکو اور پھر ترکی میں پناہ لینی پڑی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی کو مالٹا میں قید کردیا گیا۔ رئیس المہاجرین جان محمد جونیجو، اجمیر شریف میں خاک کا پیوند ہوگئے اور مولانا محمد علی جوہر بیت المقدس میں۔ خلافتِ عثمانیہ کو خود ترکوں نے ختم کردیا۔ اور بعد ازاں ہم نے بھی مصطفیٰ کمال کو ان کے ہم وطنوں کی زبان میں "اتا ترک" کہنا شروع کردیا۔ سعودی عرب میں حسبِ معمول "ملوکیت" برقرار رہی اور ہندوستان میں خاکساروں نے اپنے بیلچے اپنے ہی گھروں کے آنگنوں میں دفن کردیے، احرار بھی خاموش ہوگئے اور "انجمنِ خدامِ کعبہ" بھی۔

میں مانتا ہوں کہ یہ تمام تحریکیں تاریخ میں ایک مثبت کردار بھی رکھتی ہیں بالخصوص ان مسلمانوں کے لئے جو سرسید تحریک کے زیرِ اثر سیاست سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ انہیں انگریز سامراج کے خلاف اکسانے میں ان تحریکوں نے بڑا حصہ لیا لیکن مسلمان جیسے جیسے تعلیم یافتہ ہوئے اور مغربی علوم سے آشنا ہوئے ان کا طرزِ فکر بدلتا گیا اور یہ تحریکیں جو مختلف مذہبی مکاتیب فکر کے زیرِ اثر آگے بڑھی تھیں اپنی ناکامی کے نتائج میں جدید علوم سے آگاہ ذہنوں کے لئے لمحہ فکریہ بن گئیں۔ پھر یوں ہوا کہ جدید اور قدیم ذہن یا دوسرے الفاظ میں سیکولر اور مذہبی ذہن متوازی خطوط پر چلتے ہوئے "تحریکِ پاکستان" میں گڈمڈ ہوگئے۔

قائد اعظم اور علامہ اقبال مختلف حالات کے پیشِ نظر جس انداز میں سوچ رہے تھے، مذہبی علماء اسے کچھ اور رنگ دیتے رہے، حتیٰ کہ قائد اعظم کے بعد وہ مذہبی جماعتیں جو پاکستان سے قبل ان کی مخالف تھیں اور سیاست سے خود کو الگ رکھے ہوئے تھیں...... پاکستان کے بعد، اسکی وارث بن بیٹھیں۔

آپ نے اپنے بڑے بھائی مظہر الدین صدیقی کے حوالے سے مولانا مودودی کی جس کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے نئے ایڈیشن میں قائد اعظم اور مسلم لیگ سے متعلق وہ بیانات نہیں ملتے جو اسکے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوچکے ہیں اور یہ کہ اس کتاب کے کچھ حصے "ترجمان القرآن" (مولانا مودودی کا رسالہ) میں بھی شائع ہوتے رہے۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے، اس کتاب کا نام ہے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل تھی۔ اس کا حصہ اول ۳۷ء میں، حصہ دوم ۳۸ء میں اور حصہ سوم ۴۰ء میں شائع ہوا تھا، پھر اسی دوران ایک اور کتاب بھی چھپی۔ "مسئلہ قومیت" ۳۹ء میں۔ ان کتابوں کے مضامین اور مباحث "ترجمان القرآن" میں ۳۶ء سے ۳۸ء تک مسلسل شائع ہوتے رہے۔ اور یہ سلسلہ ۴۶ء تک مختلف اداریوں اور شذرات کی صورت میں جاری رہا۔ (اہلِ تحقیق تقابلی مطالعہ کرکے دیکھ سکتے ہیں)

جہاں تک نئے ایڈیشن میں تبدیلی کا معاملہ ہے میں ایک مختصر سی مثال دیتا ہوں۔

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم ۴۰ء ایڈیشن میں لکھا تھا "مگر افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم کے لیکر چھوٹے

مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو.........."

اس کتاب کا جو ایڈیشن ۵۵ء میں لاہور سے چھپا' اسکے دیباچے میں اگرچہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ "اسے بغیر کسی ردو بدل کے جوں کا توں شائع کیا جارہا ہے مگر اس میں "قائداعظم" کی جگہ "بڑے لیڈروں" کردیا گیا ہے۔

اس وقت میرا موضوع "تحقیق" نہیں صرف یہ بتانا ہے کہ آپکی یادداشت غلط نہیں۔ مولانا مودودی کبھی مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے ہم نوا نہیں رہے۔ انہوں نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ......

"میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں مسلم کثیر تعداد میں ہیں' وہاں انکی حکومت قائم ہوجائے۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش) حصہ سوم صفحہ ۹۳)

اس کتاب سے کچھ اور حصے بھی قابل مطالعہ ہیں۔

"جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر "مسلم اکثریت والے علاقے" ہندو اکثریت سے آزاد ہوجائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہوجائے تو اس طرح "حکومت الٰہیہ" قائم ہوجائے گی انکا گمان غلط ہے دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" ہوگی۔" (صفحہ ۱۱۷)

"اس نام نہاد مسلم حکومت کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقاصد کے لئے نہ صرف غیر مفید ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی سد راہ ہوگی۔" (صفحہ ۱۳۸)

چنانچہ ۴۶ء میں جب پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے کا وقت آیا تو مولانا نے اس کی شدید مخالفت کی اور "ترجمان القرآن" فروری ۴۶ء کے شمارے میں لکھا۔

".........چونکہ منزل حق یہی ہے اس لئے ہم اسکی طرف دوڑتے ہوئے مرجانا بہتر سمجھتے ہیں بہ نسبت اس کہ جانتے بوجھتے غلط راہوں میں اپنی قوتیں صرف کردیں یا نادانی کے ساتھ "جنت الحمقاء" کے حصول میں اپنی قوت ضائع کریں۔"

مولانا مودودی نے الیکشن کی مخالفت ۴۵ء سے شروع کردی تھی انہی دنوں جماعت اسلامی کے ایک ممبر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے "ترجمان القرآن" ستمبر۔ اکتوبر ۴۵ء میں لکھا تھا "ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کرلیجئے' پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو' بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کریں جن پر ہم ایمان لائے' موجودہ کافرانہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور کے اصول پر قائم ہوا ہے...... بخلاف اس کے ہمارے عقیدہ توحید کا بنیادی تقاضہ ہے کہ حاکمیت' جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو...... اب خود ہی سوچ لیجئے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر ہم کس طرح انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔"

اب "مسئلہ قومیت" کا بھی ایک چھوٹا سا اقتباس دیکھ لیں۔

"پس جو مسلمان ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے اسے تمام تر قومیتوں کے احساس کو باطل اور سارے خاک و خون کے رشتوں کو قطع کرنا پڑے گا۔ جو ان رشتوں کو قائم رکھنا چاہتا ہے اس کے متعلق ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اسلام اس کے قلب و روح میں نہیں اترا۔" (صفحہ ۱۵)

لیکن جب مسلم لیگ کثیر اکثریت سے کامیاب ہوگئی اور پاکستان کے وجود میں آنے کا امکانات روشن ہوگئے اور ۴۷ء میں صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا سوال پیدا ہوا تو مولانا مودودی کا رویہ نرم پڑگیا ۵ جولائی ۴۷ء کے "کوثر" میں لکھتے ہیں۔

"یہ معاملہ نہ اصولی ہے نہ مقصدی۔ اس لئے ارکان جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو رائے چاہیں دیدیں' البتہ شخصی حیثیت سے میں کہتا ہوں کہ اگر میں خود صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔"

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ مذہبی جماعتیں بھی جب "سیاست" میں آجاتی ہیں تو "مصلحت کوشی" ان کا مقدر بنجاتی ہے پھر انہیں یاد نہیں رہتا کہ ان کا طرز عمل پہلے کیا تھا۔ مولانا مودودی پر جب اس حوالہ سے اعتراضات ہونے لگے تو انہوں نے بھی ایسے بیانات دیئے۔

"میں نے کبھی پاکستان کے مطالبے کی مخالفت نہیں کی' لیکن مسلم لیگ سے اختلاف کیا تھا' مسلم لیگ جس طرح تحریک چلا رہی تھی' اس پر اعتراض تھا۔" (جنگ کراچی ۷ فروری ۱۹۷۰ء)

ایک اور بیان..........

"مسلم لیگ کی ایک اور قرارداد کے متعلق میرا جو ایک فقرہ نکال کر پیش کیا جارہا ہے وہ نومبر ۳۹ء میں ایک مضمون میں لکھا گیا تھا اور اس کا کوئی تعلق ۴۰ء کی قرارداد پاکستان سے نہیں تھا۔ جماعت اسلامی ۴۱ء (۲۵ اگست) میں قائم ہوئی تھی اور کوئی شخص بھی یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ اپنے قیام کے وقت سے لے کے اگست ۴۷ء تک اس جماعت نے کبھی پاکستان کے خلاف کوئی قرارداد پاس کی ہو یا کوئی جلسہ یا مظاہرہ کیا ہو یا کسی شکل میں تحریک پاکستان کی مزاحمت کی ہو۔ (امروز ۱۰ جنوری ۷۰ء)

ناطقہ سر بہ گریباں' سے کیا کہیے

اب اسعد گیلانی صاحب کی کتاب "اقبال' مودودی اور دار السلام" کے بارے میں سوچتا ہوں کہ تو مجھے یہ بھی ایک "سیاسی ہنر" نظر آتا ہے' علامہ اقبال کے کسی اسکالر نے آج تک ان کی کوئی ایسی تحریر دریافت نہیں کی جس میں مولانا مودودی کا ذکر کسی حوالے سے آیا ہو۔ مذکورہ کتاب میں بھی چوہدری نیاز کے خطوط' مودودی صاحب کے نام ہیں اور بقول آپ کے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ادارے کی ترتیب و تنظیم اور نگہداشت کے لئے علامہ اقبال کی نظر مردم شناس نے مودودی صاحب کا انتخاب کیا جبکہ اس مجموعے میں کوئی ایسی سند شامل نہیں جو ان حقائق کو اعتبار فراہم کرتی ہو۔

دوسری کتاب "تشکیل پاکستان" ہے جس میں بقول آپ کے یہ بتایا گیا ہے کہ "پاکستان کی بنیاد اور جداگانہ مسلم قومیت کو منوانے کے لئے اصل جہاد مولانا مودودی نے کیا تھا۔"

دونوں کتابیں بغور پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا مودودی کو علامہ اقبال اور پاکستان سے وابستہ کرنے کی ایک "مصلحت اندیشانہ" کوشش کی گئی ہے' آپ نے اس کوشش کا مدلل تجزیہ کیا ہے اور تاریخی شواہد کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ پاکستان' مودودی اور اقبال میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہاں اگر کوئی قدر مشترک تھی تو مسلم لیگ کے تصور پاکستان کی مخالفت تھی لیکن جب علامہ اقبال "سرکاری طور" پر "مفکر پاکستان" بنادیئے گئے تو مولانا مودودی کہاں ان کے ہم خیال رہ سکتے تھے۔ لیکن بوجوہ جب مولانا نے یہ کہہ دیا کہ "میں نے کبھی پاکستان کے مطالبے کی مخالفت نہیں کی" اور علامہ اقبال کے وہ خطوط بھی سامنے آگئے جن سے وہ "تصور پاکستان سے بری الذمہ" قرار پاتے ہیں تو وہ قدر مشترک بھی باقی نہیں رہی جو اسعد گیلانی صاحب نے دریافت کرنے کی کوشش کی۔

مولانا راغب احسن اور ڈاکٹر تھامسن کے نام علامہ اقبال کے خطوط نے سب سے زیادہ جماعت اسلامی کو مشکل میں ڈال دیا ہے' اس نے بمشکل جو رشتہ جوڑا تھا وہ پھر ٹوٹ گیا۔

تاریخ کو مسخ کرنے سے یہی ہوتا ہے' خیر' اس کا خمیازہ تو اسے بھگتنا پڑے گا ہمیں تو علامہ اقبال ہی فکر ہے جنکے خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء کو بنیاد بنا کر سیاست دانوں نے انہیں "تحریک پاکستان کی سیاست" میں ملوث کردیا حالانکہ یہ خطبہ بھی اس قرارداد کی تائید میں تھا جو ۲۷ء میں سر آغا خان کے زیر صدارت آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے دہلی میں پاس کی تھی اور جس میں مسلمانان ہند کی "با اختیار ریاست" کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن جب مسلم لیگ نے اسے "اپنا رنگ" دینا شروع کیا تو علامہ اقبال اس کے مخالف ہوگئے۔

علامہ اقبال نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ "پاکستان اسکیم نے کیمبرج یونیورسٹی میں جنم لیا ہے" ان کا اشارہ چوہدری رحمت علی کی طرف تھا (ڈاکٹر تھامسن کے نام خط ۴ مارچ ۳۴ء)

سچائی کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ پاکستان کا سہرا چوہدری رحمت علی کے سر باندھا جائے لیکن اگر اس بڑے منصب کے لئے انکا قد چھوٹا محسوس ہو تو پیشوائی کے طور پر خیری برادران (ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری) کے نام اس اسکیم میں شامل کرلئے جاسکتے ہیں جنہوں نے اسٹاک ہوم کانفرنس ۱۹۱۷ء میں پہلی بار ہندوستان کو "ہندو مسلم کی بنیاد پر" تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد کے حوالے سے صاف الفاظ میں لکھ دیا تھا۔

"پاکستان میری اسکیم نہیں ہے' میں نے اپنے خطبہ میں جس مسلمان صوبے کا ذکر کیا تھا یعنی شمال مغرب کا وہ علاقہ جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے' میری اسکیم کے تحت یہ نیا صوبہ ہندوستانی وفاق ہی کا حصہ ہوگا۔" (ڈاکٹر تھامسن کے نام خط مورخہ ۴ مارچ ۳۴ء)

انہیں مستقبل میں پیدا ہونے والے مسائل کا اندازہ تھا بالخصوص ان صوبوں کے مسائل کا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے یہی سبب ہے کہ انہوں نے قائداعظم اور مسلم لیگ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی سرگرمیوں کا مرکز دہلی اور لکھنؤ کے بجائے پنجاب کو بنائیں اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی قوت کو استعمال کرتے ہوئے یہ خیال رکھیں کہ وہ "ہجرت" پر مائل نہ ہوں۔ (صفحہ ۴۴)

اس مشورہ سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شاید انہیں پنجاب کے مفادات زیادہ عزیز تھے۔ ایسا نہیں ہے۔ کسی بڑی شخصیت کے بارے میں ایسی بات سوچنا اپنی تنگ نظری کی دلیل ہے۔ علامہ اقبال کا دل بہت وسیع تھا۔ انہوں نے ساری عمر نہ صرف پورے برصغیر کے مسلمانوں بلکہ پورے عالم اسلام کے بارے میں سوچا اور لکھا ہے۔ اگر انہیں صرف پنجاب کا مفاد عزیز ہوتا تو کیمبرج یونیورسٹی میں پرورش پانے والے تصور پاکستان کی مخالفت نہ کرتے۔

آپ نے اچھا کیا خطبہ الہ آباد کا تفصیلی اقتباس دیدیا اور وہ خطوط بھی شامل کردیئے جو ان کے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ آپ نے ان خطوط کی روشنی میں جو بحث کی ہے اس سے یہ بات بہت صاف ہوگئی ہے کہ علامہ کیا سوچتے تھے اور ان کے مخصوص شارحین کس کس انداز میں ان کے خیالات کی تاویلات پیش کررہے ہیں کتاب کا نام بھی آپ نے بہت سوچ سمجھ کر رکھا ہے دوسرا مصرعہ خود ہی ذہن میں تازہ ہوجاتا ہے۔

"دیتے ہیں کہ دھوکہ یہ بازی گر کھلا"

خط خاصہ طویل ہو گیا ہے مگر کیا کروں، آپ نے کتاب ہی ایسی لکھی ہے۔ اس پر گفتگو جب بھی ہو گی تاریخ کے حوالے بھی آئیں گے، علامہ اقبال کا فکری پس منظر بھی اور برصغیر میں مسلمانوں کی سیاست بھی...... بہرحال، میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ (مطبوعہ ماہنامہ ''طلوع افکار'' کراچی فروری ۱۹۸۸ء)

ایڈیٹر ''ادب لطیف'' (صدیقہ بیگم) کے نام

(مختلف ممالک سے تین خط)

(۱)

محترمہ صدیقہ بیگم

آداب

بذریعہ ڈاک ''ادب لطیف'' کے چار شمارے جنوری، فروری، مارچ اپریل ۱۹۸۹ء ایک ساتھ ملے، میں پچھلے سال اکتوبر سے مارچ ۸۹ء تک مسلسل سفر میں رہا تھا کچھ مہینے امریکہ اور کینیڈا میں گزارے اور پھر ہندوستان اور مختلف عرب علاقوں میں، اس لئے واپسی کے بعد ہی مجھے پتا چلا کہ کون کون سے رسائل اور کتابیں پہنچیں اور کن رسائل سے محروم رہا۔ انہیں میں ''ادب لطیف'' کے شمارے بھی تھے، خدا جانے کیوں یہ شمارے اور سالنامہ مجھے نہ مل سکا تھا۔ سالنامہ افکار کے دفتر میں دیکھا تھا اور پھر آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی۔ آپ نے یہ شمارے بھیج دیئے، شکر گزار ہوں، انہیں میں فروری کے شمارے میں اپنا مضمون ''کمال احمد رضوی، تمثیل کی ایک اکائی'' بھی دیکھا۔ کاش انہیں شماروں کے ساتھ سالنامہ بھی مل جاتا۔ ہو سکے تو اسے بھی بھیج دیجئے اس کے بغیر میری لائبریری ادھوری رہے گی۔

یہ چاروں شمارے آپ نے ایک خاص ڈھب سے ترتیب دیئے ہیں، بعض مقالات بھی مطالعے میں آئے جنہیں حاصل مطالعہ کہا جا سکتا ہے۔ خاص طور سے ''نئے افسانے کا منظرنامہ'' (نسیم شاہد) ''ادب اور جمالیات کی جبلت'' (پروفیسر مسعود احمد ہاشمی) ''پاگھ۔ ایک مطالعہ'' (سید شبیر احمد) ان کے علاوہ پابلو نرودا کی خود نوشت (ترجمہ۔ انور زاہدی) بھی دلچسپ اور معلومات افزا ہے اس کی کچھ اقساط شاید ابھی اور آئیں گی شیر افضل جعفری پر رانا غلام شبیر کا مطالعہ بھی پسند آیا مگر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ شیر افضل جعفری ہمارے بزرگ شاعروں میں ایک خاص مزاج اور اسلوب کے شاعر تھے۔ انہوں نے اردو شاعری میں جو لسانی تجربے کئے ہیں وہ خاص توجہ چاہتے ہیں بلاشبہ انہوں نے ایک ادبی اجتہاد کیا ہے پاکستان میں اردو زبان جو وسعت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ وہ ایسے ہی شعراء کی مرہون منت ہے۔ پنجابی کے علاوہ ہماری دوسری زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں آتے رہیں تو ہماری تہذیب کی بھرپور نمائندگی ہو سکے گی اور اردو زبان پاکستان کی صحیح معنوں میں قومی زبان ہونے کا حق ادا کر سکے گی۔ ممکن ہو سکے تو شیر افضل جعفری کے لئے کوئی گوشہ مخصوص کیجئے۔ میں بھی ان پر لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں نظیر صدیقی کا مضمون ''آزاد'' نظم کے بارے میں چند خیالات ایک سرسری جائزہ ہے۔ کاش وہ اس صنف شاعری پر اپنا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے اور دوسری اصناف سخن (جن میں اب دوہا، ہائیکو اور ثلاثی بھی شامل ہیں) کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ نظیر ہماری نسل کے ایک مستند نقاد ہیں ان کی نظر مغربی ادبیات پر بھی ہے اور وہ مشرقی ادب بالخصوص اردو اور فارسی ادبیات کے بھی مزاج داں ہیں۔ نظیر صدیقی ایسے ناقدین سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ وسیع النظری کے ساتھ مختلف تخلیقات اور تجربات کا محاکمہ کر سکیں گے۔

ان شماروں میں افسانوی ادب ہی خاصا وقیع ہے۔ خاص طور سے مختلف زبانوں کے تراجم۔ شاعری کا حصہ قدرے کمزور محسوس ہوا۔ انتخاب میں آپ دریا دلی سے کام نہ لیا کریں تو اچھا ہو گا' نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ضرور ہونی چاہئے مگر کچھ حقوق مدیر کے بھی ہوتے ہیں

سری نواس لاہوٹی کی تحریر عرصہ دراز کے بعد نظر سے گزری' میرے بہت قریبی دوست اور پرانے ساتھی ہیں۔ حیدر آباد دکن سے تعلق ہے دو سال پہلے ہندوستان میں ملاقات ہوئی تھی بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔ آپ نے ان کے تراجم حاصل کرکے پاکستان کے کتنے ہی دوستوں پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ ہندوستانی رسائل کی طرح' ادیبوں اور شاعروں کے نام کے ساتھ ان کے پتے بھی شائع کردیا کریں تو معلوم ہوتا رہے گا کہ کون کہاں ہے؟ خط وکتابت بھی کی جاسکے گی۔

ان شماروں میں کتابوں کے تبصرے کا حصہ بھی سیر حاصل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ "ادب لطیف" اپنی دیرینہ روایت کے ساتھ 'خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے۔ آپ کی محنت قابل داد ہے' ہاں کتابت کی غلطیوں کی طرف تھوڑی سی مزید توجہ دی جائے تو مناسب ہو گا۔

دو چھوٹی چھوٹی نظمیں بھیج رہا ہوں اچھی ہیں نا؟

خدا کرے آپ بعافیت ہوں

مخلص

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ "ادب لطیف" لاہور' جولائی ۸۹ء)

۴

آپ نے نظم کی فرمائش بھی کی ہے بھیج رہا ہوں' دو حصوں پر مشتمل ہے ایک نظم' ایک غزل اور ایک ترجمہ نسیم سید صاحبہ کا بھی منسلک ہے' امید ہے آپکو پسند آئیں گے۔

سات ماہ سے مسلسل سفر میں ہوں' گزشتہ سال اکتوبر کے دوسرے ہفتے پاکستان سے نکلا تھا (امریکہ اور کینیڈا) تین ماہ مغرب کی دنیا میں رہ کر جنوری میں صرف ایک ہفتے کے لئے کراچی گیا اور ہندوستان چلا گیا۔ اورنگ آباد' بمبئی' دہلی اور لکھنؤ...... لکھنؤ میں فراق انٹرنیشنل سیمینار تھا اور ایک مشاعرہ بھی۔ روس' برطانیہ' امریکہ اور کینیڈا سے بھی اسکالرز اور شعراء آئے تھے۔ پاکستان سے قتیل شفائی اور آغا سہیل نے شرکت کی۔ (قتیل صاحب تو امریکہ اور کینیڈا میں بھی میرے ہم سفر رہے مگر بہت جلد واپس ہو گئے تھے) دہلی سے دوحہ (قطر) چلا گیا تھا وہاں پاکستان سے تابش دہلوی تشریف لائے تھے خیر لکھنؤ میں فراق انٹرنیشنل سیمینار کی رونق دیدنی تھی۔ مقالات کے اجلاس میں بھی بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ اچھی بحثیں ہوئیں' چند مقالے تو بہت ہی اچھے تھے۔ پرمغز اور فکر انگیز..... اور مشاعرہ تو ساری رات جاری رہا۔ اردو کو ہندوستان میں "اترپردیش" (یوپی) کی دوسری سرکاری زبان بنادیا گیا ہے نا...... اس لئے اس بار جوش و خروش ہی اور تھا۔ کراچی کے دوران قیام میں آپ کا خط ملا اپنے ساتھ ہی لے آیا ہوں اور مونٹریال سے جواب لکھ رہا ہوں۔ ۱۱۔ ۱۲ مئی کو یہاں "جشن غالب" منایا گیا۔ اس بار پاکستان سے میرے ہم سفر احمد فراز اور نکہت بریلوی تھے۔ ہندوستان سے گوپی چند نارنگ اور پروفیسر ملک زادہ منظور احمد آئے ہوئے ہیں۔ اب مشاعروں کا سلسلہ ہے جو امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں دو ماہ تک جاری رہے گا۔ واپسی میں ناروے اور سویڈن سے ہوتا ہوا انشاء اللہ جولائی کے پہلے ہفتے تک پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ سنا تھا کہ "جشن غالب" میں پاکستان سے ڈاکٹر وزیر آغا' انور سدید' حنیف فوق' خلیق ابراہیم اور پروین شاکر بھی مدعو ہیں۔ مگر کوئی نہ آسکا۔

یہاں لوگوں کو احمد ندیم قاسمی کا بھی بہت انتظار رہتا ہے۔ کئی بار مدعو کیا گیا مگر وہ آتے ہی نہیں' شاید اس سال نومبر میں ہونے والے یوم اقبال میں شریک ہوجائیں۔سنا ہے پکا وعدہ کیا ہے۔ قاسمی صاحب کو مغرب کی دنیا ضرور دیکھنا چاہیے۔ انسان کی عظمت کے جو مظاہر یہاں دیکھنے میں آتے ہیں ہمارے ملکوں میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں (کم از کم اس صدی میں) سائنسی آگہی نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچادیا اور دنیا کو کیا سے کیا بنادیا۔ اس کا حقیقی آئینہ مغرب میں دکھائی دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا

محو حیرت ہوں دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

سو وہی عالم حیرت یہاں قابل دید ہے۔ آپ نے اس دنیا کا سفر تو کیا ہوگا' اگر نہیں تو ادھر آنے کی سبیل ضرور پیدا کریں' میں چونکہ کئی بار آچکا ہوں اور تقریباً سارے ہی اہم شہروں کو دیکھ چکا ہوں۔ اس لئے میرے تعریفی جملوں کو آنکھوں کی خیرگی سے تعبیر نہ کیجئے۔ میں اس معاشرے کے منفی پہلوؤں سے بھی واقف ہوں۔ جہاں تک کہ مثبت رخ کا حوالہ ہے قابل دید وہ مناظر ہیں جو ذہن کو نیا زاویہ فکر عطا کرتے ہیں۔ مشرق میں جاپان کے سوا کوئی اس کا مدمقابل نہیں۔ چین البتہ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے مگر اس منزل تک پہنچنے میں ذرا دیر لگے گی۔

میں نے پہلے بھی وعدہ کیا تھا کہ اپنے سفر کا احوال لکھوں گا اور "ادب لطیف" کو بھیجتا رہوں گا۔ آپ کا رسالہ یہاں بھی تو کہیں آتا ہوگا۔ یہاں تو اب اردو والے بڑی تعداد میں' کتابوں اور رسالوں کے شوقین بھی ہیں۔ اکثر رسائل کے باضابطہ خریدار ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کی بھی کمی نہیں مثلاً کینیڈا میں پروفیسر ضیاء' اشفاق حسین' فاروق حسن' محترمہ نسیم سید' معین اشرف' عابد جعفری' شاہین' خالد سہیل' اطہر رضوی حفیظ الکبیر' رضا الجبار' جاوید دانش' جمال زبیری' جوش مندوزئی' عرفانہ عزیز' محترمہ نزہت صدیقی' عباس زیدی' عروج اختر زیدی' اختر آصف' تسلیم الٰہی زلفی' بیدار بخت' اقبال حیدر' محترمہ کشور غنی' سلیم قریشی' ذکی اور بھی کئی لوگ ہیں جن کے نام اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں۔ اس طرح امریکہ میں مظفر شکوہ' حنیف اخگر' سلمان اختر' حمیرہ رحمان' نیر جہاں' رشیدہ عیاں' ڈاکٹر حمید اللہ' مامون ایمن' سردار سوز' عزیز الحسن عزیز' اظہار کاظمی' یونس شرر' احمد جعفری' محترمہ نسیم نقوی' سلمان اثر' عظیم میاں' سلطان محمد خان' اعجاز نسرین' افتخار نسیم' عابد اللہ غازی' نسیم سرور' انور خواجہ' نیر زیدی' سید الیاس' سید ماجد علی' صبیحہ صبا' شیریں جمال' شوکت مرزا' طلعت اشارت' وکیل انصاری' فرحت زاہد' زاہد سعید' شاہب کاظمی' سعید وارثی' ڈاکٹر شفیق اور زرین وغیرہ یہ تمام اہل قلم امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ ادبی دنیا کے جانے پہچانے لوگ ہیں اگر آپ چاہیں تو میں ان سب کے پتے بھی آپ کو فراہم کروں۔ "ادب لطیف" سے ظاہر ہے کہ سبھی واقف ہیں اور آرزو مند ہیں کہ "ادب لطیف" سے رابطہ قائم ہوجائے۔ (کچھ اہل قلم کا رابطہ تو قائم بھی ہے) اگر آپ انہیں اپنے رسالے کی بابت "تجارتی معلومات" فراہم کردیں تو مالی تعاون بھی کریں گے۔ پاکستان' ہندوستان کے چند رسائل نے یہ تعلق بھی قائم کر رکھا ہے۔ اور میرا خیال ہے یہ کوئی نامناسب بات نہیں۔ ان حضرات کو بھی معلوم ہے کہ وہاں سے یہاں کوئی رسالہ یا کتاب بھیجنے میں کتنا روپیہ صرف ہوتا ہے۔ یہ مالی قباحتیں ہی تو ہیں جو ہمارے ادب کے دور دور پہنچنے میں حارج ہوتی ہیں۔ ویسے میں نے محسوس کیا ہے کہ وطن سے دور رہنے والے اپنی تہذیب' و ادب کے لئے کس قدر بے چین رہتے ہیں۔ آئے دن مشاعرے سیمینار' موسیقی کے پروگرام' مذہبی اور ادبی کتب و رسائل کی اشاعتیں یہ سب اس تشنگی اور محبت کی غماز ہیں۔ جو وطن سے دور رہنے والوں کے

دلوں میں موجزن رہتی ہے۔ اب تو یہاں کے شعراء اور ادیبوں کی کتابیں بھی یہاں شائع ہونے لگی ہیں اور سب سے بڑا کام پروفیسر ضیاء بیدار بخت، حفظ الکبیر اور شاہین کر رہے ہیں۔ ان حضرات نے اردو کے ادبی شہ پاروں کو انگریزی میں نہ صرف منتقل کیا ہے بلکہ اپنے انگریزی مقالات کے ذریعے اردو ادب کو ان لوگوں سے بھی روشناس کرا رہے ہیں جو اردو نہیں جانتے، یہ کام یہاں پیدا ہونے والی نئی نسل کے لئے بھی فال نیک ہے۔ آپ نے شاہین کا انگریزی رسالہ "اردو کینیڈا" دیکھا ہوگا اس رسالے کی بڑی خدمات ہیں۔ بیدار بخت نے فیض، میرا جی، راشد، سردار جعفری، مخدوم محی الدین اور اختر الایمان کی منتخب نظموں کے تراجم کیے ہیں۔ حفظ الکبیر نے اس صدی کے پرانے اور نئے سبھی اہل قلم کا شعری انتخاب انگریزی میں شائع کیا ہے۔ شاہین کے رسالے میں تراجم اور اردو ادب سے متعلق مضامین انگریزی میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا اب سے پہلے پروفیسر احمد علی نے ولی سے داغ و اقبال تک تمام اہم اساتذہ کی منتخب غزلوں کا ترجمہ کرکے "گولڈن ٹریژری" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اقبال حیدر نے مجھ پر انگریزی میں ایک کتاب شائع کی اور علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھا جاتا ہے۔ تفصیل میں جاؤں تو یہ خط ایک مضمون کی شکل اختیار کرلے گا۔ میں نے برسبیل تذکرہ چند کا ذکر کردیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اپنے وطن میں لوگوں کو علم رہے۔ کہ دور دراز ملکوں میں اردو زبان اور ادب کے سلسلے میں کیا کام ہورہا ہے۔ میں چونکہ دنیا کے مختلف ممالک میں گھوم چکا ہوں حتیٰ کہ افریقہ کے بیشتر ممالک بھی دیکھ ڈالے۔ اس لئے مجھے اندازہ ہے کہ اردو کا حلقہ روز بروز کتنا وسیع ہوتا جارہا ہے۔ دو برس پہلے جنوبی افریقہ، بوٹس وانا، نیروبی اور موریشس بھی گیا تھا۔ تین ماہ کے اس سفر میں ڈربن، پری ٹوریا، جوہانسبرگ، لی نیشیا، کیپ ٹاؤن اور دیگر کئی شہروں کی ادبی محفلوں میں شرکت کی۔ ڈربن یونیورسٹی ویسٹ وہائل میں یوم غالب کے سلسلے میں "اردو غزل، غالب سے فیض تک" کے عنوان سے میرا ایک لیکچر بھی پروگرام میں شامل تھا۔ اس لیکچر کا وڈیو کیسٹ پروفیسر حبیب الحق ندوی (صدر شعبہ عربی فارسی اور اردو ڈربن یونیورسٹی) نے اب پاکستان بھی بھیج دیا ہے اگر آپ سے کراچی میں ملاقات ہوسکی تو آپ کو دیکھنے کی زحمت دوں گا۔ اس لئے نہیں کہ میں نے کیا کیا۔ بلکہ اس لئے کہ آپ ڈربن میں لوگوں کی اردو ادب سے دلچسپی کا اندازہ کرسکیں۔ اسی طرح دوسرے مقامات پر جو اجلاس اور مشاعرے منعقد ہوتے ہیں ان سے بالخصوص مشاعرے کی روایت اور اس افادیت کا اندازہ ہوگا۔ ناروے میں اپنے وطن کے ایک نوجوان صحافی مجاہد علی ایک ماہنامہ "کارواں" شائع کرتے ہیں۔ ان کی سوسائٹی کے تحت جو ادبی اور تہذیبی اجلاس ہوتے ہیں ان میں ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے اہل قلم شریک ہوچکے ہیں۔ میرے علاوہ سردار جعفری، کیفی آعظمی، کنور مہندر سنگھ بیدی، خمار بارہ بنکوی، جمیل الدین عالی، شریف کنجاہی، احمد فراز، کشور ناہید، پروین شاکر، افتخار عارف، جون ایلیا، قتیل شفائی، ضمیر جعفری، اشفاق حسین اور دیگر کئی شعراء پچھلے برسوں میں اوسلو بلائے گئے۔ ایک سال فیض صاحب کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی کی زیر نگرانی پاکستانی مصوروں کی تصویری نمائش بھی ہوئی۔ کچھ موسیقی کے پروگرام ہوئے۔ مشاعروں کی نظامت وہاں بھی اکثر میں ہی کرتا ہوں اوسلو میں جب بھی کوئی ادبی تقریب ہوتی ہے ایک اجلاس انگریزی میں بھی ہوتا ہے جس میں اردو اور نارویجین ادب پر مقالے پڑھے جاتے ہیں اردو اور نارویجین شاعروں کے تراجم انگریزی اور نارویجین زبان میں سنائے جاتے ہیں (بعد ازاں دونوں زبانوں کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے ہیں) اب بھی میں ناروے اور سویڈن سے ہوتا ہوا پاکستان جاؤں گا اور کوشش کروں گا اس بار اپنا وعدہ ضرور پورا کردوں۔ یہاں اور رسالوں کے ساتھ اگر "ادب لطیف" نظر آیا کرے تو خوشی ہوگی۔ آپ کا رسالہ اردو کا قدیم ترین رسالہ ہے جسے آپ نے بڑے جتن سے اب تک زندہ رکھا ہے۔۔۔

کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

خدا کرے "ادبِ لطیف" ہمیشہ جاری رہے اور ساری دنیا میں پھیل جائے۔ خط بہت طویل ہو گیا ہے مونٹریال میں لکھنا شروع کیا تھا کنگسٹن میں مکمل ہوا۔ اس لئے خدا حافظ۔ مخلص حمایت علی شاعر

کنگسٹن (کینیڈا) ۳۰ مئی ۱۹۹۰ء (مطبوعہ "ادبِ لطیف" جولائی ۱۹۹۰ء)

۴۳

آج کل ہندوستان ہی میں ہوں' آپ کا خط کراچی پہنچا تھا' دو دن ہوئے گھر بات ہوئی' آپ کا خط پڑھ کر سنایا گیا آپ سے شرمندہ تو ہونا ہی تھا' اپنے آپ سے بھی ہوا۔ میں پچھلے ماہ "جشن جمشید" کے سلسلے میں جمشید پور (ٹاٹا نگر) آیا تھا' یہاں ایک بڑا عالمی مشاعرہ ہوا' اس کے بعد کلکتہ میں بھی یہی سلسلہ رہا۔ بعد ازاں حیدر آباد دکن آ گیا' وہاں بھی زبردست مشاعرہ..... ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ جمع ہوئے اور یہی ہر بار ہوتا ہے۔ اس بار میرے ساتھ احمد فراز' نجمہ خان' عزم بہزاد وغیرہ تھے۔ منیر نیازی بھی مدعو تھے مگر خدا جانے کیوں نہ آ سکے۔ کینیڈا سے نزہت صدیقی اور لندن سے طاہرہ تسنیم شریک مشاعرہ رہیں اور بھی کئی مقامی اور غیر مقامی شعراء تھے۔ بڑا لطف آیا۔ کچھ ادبی حلقوں میں "ادبِ لطیف" کا بھی ذکر رہا۔ حال ہی میں "انشاء" (کلکتہ) کا نمبر شائع کیا گیا ہے۔ "ادیبوں کے معاشقے نمبر" اندازہ کر لیں۔ کیسا کیسا مواد ہوگا۔ حال ہی میں "قمر رئیس نمبر" بھی شائع ہوا ہے اس کے ایڈیٹر ف۔ س اعجاز صاحب اچھے شاعر بھی ہیں۔ پاکستانی ادب کے بارے میں باخبر رہتے ہیں۔ انہی سے ادبِ لطیف کا بھی ذکر رہا۔ اکثر احباب کو شکایت ہے کہ یہاں بہت کم پاکستانی رسائل پہنچتے ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ جو مسئلہ آپ کا ہے وہی ہمارا ہے' ڈاک کا خرچ کتنا زیادہ ہو گیا ہے۔

صدیقہ بیگم تو بڑی حوصلہ مند خاتون ہیں۔ ان حالات میں بھی اپنے بزرگوں کی روایت کو نہ صرف نبھا رہی ہیں بلکہ آگے بڑھا رہی ہیں۔

حمایت علی شاعر ۳۰ مئی ۹۲ء بمبئی (مطبوعہ "ادبِ لطیف" ستمبر ۱۹۹۲ء)

ایڈیٹر "کتاب نما" (دہلی) شاہد علی خان کے نام

(جوش' فیض اور رشید حسن خان)

برادرم شاہد علی خان

بہت عرصے بعد مخاطب ہو رہا ہوں۔ شرمندہ ہوں کہ اس دوران "کتاب نما" کے لئے کچھ نہ بھیج سکا۔ رسالہ پابندی سے مل رہا ہے۔ شکریہ

آپ کے اداریوں میں اچھی بحثیں چھڑی رہتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ خود بھی کچھ مسائل پر بات کروں۔ جلد ہی کچھ لکھوں گا۔

"کتاب نما" میں شخصیتوں پر مطالعے کا مخصوص گوشہ' جو متعین کیا گیا ہے ایک اچھا سلسلہ ہے۔ اس بار رشید حسن خان سے متعلق چند مضامین ہیں۔ مگر سارے مضامین ایک ہی خیال کی بازگشت محسوس ہوتے ہیں کہ وہ ایک اچھے نقاد اور ماہر

لسانیات ہیں۔ مطالعہ کا یہ انداز' ایک ایسے شخص کے بارے میں جس نے مروجہ روش سے اختلاف ہی کی بناء پر یہ اچھائی کمائی ہے' کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ رشید حسن خان جس انداز میں سوچتے ہیں یا جو ان کی افتاد طبع ہے اور اس لحاظ سے وہ جن نتائج پر پہنچتے ہیں' ان پر بھی غور کیا جاسکتا ہے اور ممکن ہے ان کی رائے سے اتفاق نہ کیا جاسکے۔ اس گوشے میں ایسا کوئی شخص نہیں جس نے ان سے آنکھیں چار کی ہوں یا آنکھ ملا کر بات کی ہو۔

رشید حسن خان کے بیشتر خیالات سے اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ مگر جہاں کہیں وہ انتہا پسند نظر آتے ہیں یا کسی شاعر کو اپنے نقطہ نظر سے تولتے ہوئے' زبان کے معاملے میں کسی انحراف کے لئے کشادہ دل دکھائی نہیں دیتے' ہمارے لئے غور طلب بھی ہوجاتے ہیں۔

فیض صاحب پر ان کا تنقیدی مقالہ ہو کہ اب جوش صاحب پر' انہوں نے اکثر مقامات پر اسی زاویہ نگاہ سے کام لیا ہے۔ میری گزارش یہ ہے کہ "شاعری چیزے دیگر است" کے حوالے سے ناقد پر کچھ فرائض بھی عائد کرتی ہے۔ ایک طرف تو وہ شاعر کو کسی نظریہ کا پابند دیکھنا نہیں چاہتے۔ اس پر سیاست کا آلہ کار ہونے کا الزام عائد کردیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس کا تجزیہ کسی نہ کسی نظریہ یا عقیدے ہی کی روشنی میں کرتے ہیں۔ جوش صاحب کی جذباتی نظمیں (جسے انقلابی شاعری کا نام دیا گیا ہے) یا خدا سے متعلق وہ اشعار جو سراسر خوش گفتاری کے ذیل میں آتے ہیں اور جنہیں ان کے "الحاد" سے تعبیر کیا جاتا ہے' ویسے ہی ہیں جیسے غالب حتیٰ کہ اقبال کے کلام میں بھی جگہ جگہ موجود ہیں' لیکن غالب کے یہ اشعار

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

یا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

اور...

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت سے ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضاء اور سہی

یا

طاعت میں تا رہے نہ مے انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

انتہا یہ کہ......

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

یہ تو فیصلہ کن شعر ہے' مگر شاید غالب پر وہ اعتراض عائد نہیں ہوتا جو حضرت جوش پر کردیا گیا۔ جبکہ غالب نے بھی کہہ دیا تھا

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں، بندگی بوتراب میں

اس طرح اقبال، اقرار و انکار کی انتہاؤں پر کہیں کہیں اس کرّ و فر کے ساتھ نظر آتے ہیں کہ انہیں کے الفاظ میں

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

اور یہ "خود نگری" جو ابلیس کے لہجے میں، ان کی ذات میں پوشیدہ "قوت انکار" (جو روایت سے بغاوت کا بنیادی محرک ہے، اور تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کا استعارہ) اور جبرئیل کے لہجے میں ان کے اسلاف کی "بت پرستانہ ادائے بندگی" کا آئینہ دکھاتی ہے۔ کہیں انسانی عظمت کا ترانہ بن جاتی ہے اور کہیں ان کے بندہ مومن ہونے کا ثبوت فراہم کردیتی ہے۔ ان باتوں کی فلسفیانہ تعبیر سے قطع نظر اگر متعلقہ اشعار کو صرف انداز بیان تک محدود رکھا جائے تو وہی شوخی جو غالب کے کلام میں ہے، اقبال کے لہجے میں جھلکتی دکھائی دے گی، اور پھر "اپنے انداز میں" جوش کے اشعار میں بھی۔ افکار کی سطحیں ہر شاعر میں مختلف ہوتی ہیں۔ اگر جوش، اقبال کو اپنا حریف سمجھتے تھے تو سمجھا کریں۔ یہ مسئلہ ہر شاعر، ہر نقاد، ہر محقق کا ہے۔ اچھی شاعری، اچھی تنقید اور اچھی تحقیق اس کے بغیر وجود ہی میں نہیں آتی۔ جوش صاحب جس حد تک بھی اچھے یا برے شاعر ہیں، مثلاً خود رشید حسن خان کے الفاظ میں۔

"جس چیز کو قادر الکلامی کہتے ہیں۔ بلاشبہ وہ جوش کے حصے میں آئی ہے، تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت پر نگاہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ قوت تخیل کس قدر بے پناہ تھی اور لفظوں کی رنگا رنگ کثرت پر نظر ڈالئے تو یہ خیال آئے کہ زبان نے اپنے خزانے اس شخص کے حوالے کردیے ہیں" یہ خصوصیات کیا اس دور کے کسی اور شاعر کے کلام میں نظر آتی ہیں؟ ہم جوش، نظیر، انیس، دبیر، سودا، (قصاید) اور اس سلسلے کے دوسرے شعراء سے شاعری کے علاوہ بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ یہ شعراء شاعروں کے شاعر ہیں۔ اگر ان سب پر "افکار" کا اطلاق کیا جائے تو بشمول اقبال۔ طالب علم براہ راست ان فلسفیوں سے کیوں نہ استفادہ کرے جن سے اقبال ایسے شاعر نے اکتساب کیا ہے، محض اس بناء پر کہ فلاں نظم، کثرت الفاظ سے بوجھل ہوگئی ہے، نظم کی فنی کمزوری ضرور سمجھی جائے گی۔ مگر اظہار کی دوسری خوبیوں سے انکار پر کس طرح مائل کرسکتی ہے؟ "خیال کی تکرار" اگر اتنی ہی بری چیز ہے کہ شاعری کی اہمیت ختم کردے یا ساری شاعری کو دوسرے درجے کی بنا کر رکھ دے تو فارسی اور اردو کی تمام شاعری حتیٰ کہ الہامی کتابیں بھی "دوسرے درجے" کی ہو کر رہ جائیں گی۔ ہم "خیال کی تکرار" کے باوجود ان کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتے۔

جوش صاحب بھی ہماری اسی روایت کا ایک قابل قدر اثاثہ ہیں۔ نظم نگاری کی وہ خصوصیات، جو اقبال اور جوش کے بعد اردو شاعری کا حصہ بنیں اور فنی اعتبار سے مقدم ٹھہریں، مغربی شعری ادب کے مطالعے کے بعد ہمارے شعور تخلیق میں بیدار ہوئیں۔ یہ اور بات کہ اس کے مظاہر ابھی کم کم ہیں۔ پیشرو شعراء میں فیض اور راشد کے بعد کسی حد تک اختر الایمان، اس شعور سے فیض یاب ہیں۔ ہم عصر شعراء میں بھی چند اچھی مثالیں موجود ہیں۔

مگر جوش صاحب کو "جدید تر" نقطہ نظر سے دیکھ کر رد کرنا اپنی کلاسیکی روایت کے ساتھ سراسر زیادتی ہے جس طرح اقبال کو "شاعر اسلام" کہہ کر محدود کیا جاتا ہے اسی طرح جوش کو شاعر انقلاب یا شاعر الحاد کہہ کر رد کرنا' ناقدین ہی کی کوتاہ بینی کی دلیل ہے۔

جوش اپنے عہد کے "جذبۂ طرب" کے شاعر ہیں۔ وہ اردو کی "ہجر زدہ" شاعری کے برعکس وصال کی سرشاریوں میں گاتے' گونجتے اور گرجتے نظر آتے ہیں۔ ان کی مجموعی شاعری زندگی کے رقص والہانہ سے عبارت ہے۔ اس رقص میں کلاسیکی' آہنگ کے ساتھ ساتھ لوک ناچ کی از خود رفتگی بھی شامل ہے۔ المیہ اور طربیہ میں جو فرق ہوتا ہے' جوش کی شاعری' اس کا ایک "جوشیلا اظہار" ہے۔ فکر شاعر میں ٹھہراؤ پیدا کرتی ہے' جسے ایک تالاب یا جھیل سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ مگر پہاڑ سے اترتی ہوئی ندیوں اور دریاؤں کا تند و تیز بہاؤ ان کی موجوں کا جوش و خروش اور ان کی اٹکھیلیاں' جن سے زندگی کی ترنگ عبارت ہے' کیسے نظر انداز کی جاسکتی ہیں۔

شاعر کو "سمندر" دیکھنے کی آرزو بڑی اچھی آرزو ہے۔ مگر سمندر اتنا نہیں ہوتا جتنا دکھائی دیتا ہے۔ اس میں بھی متعدد پہاڑ اور جھاڑیاں ہوتی ہیں۔

رشید حسن خان نے جوش صاحب کے بعض اشعار میں زبان کی غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس پر غالب کا شعر یاد آگیا۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھو
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مولانا حسرت موہانی نے "غلطی ہا" پر جو اعتراض "نکات سخن" میں کیا ہے' ہم سب کی نظر میں ہے۔ اس کے باوجود غالب کی عظمت ان کی نظر میں کم نہیں۔ انہوں نے غالب کے بے شمار اشعار سے استفادہ بھی کیا ہے۔

رشید حسن خان شاید الفاظ کے لغوی معنی ذہن میں رکھ کر شعر سمجھتے ہیں اور لغات میں دیئے ہوئے بے رس معانی سے ان کا دماغ چونکہ خود بھی بوجھل ہوتا ہے' اس لئے جب بھی شاعر کے کلام میں الفاظ کی فراوانی دیکھتے ہیں تو غالبا پہلے ہی سے کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ اس عالم میں اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے ان پر جو گزرتی ہوگی اسی کا اظہار انہوں نے جوش کی عملی تنقید میں کیا ہے۔ جوش اتنے بُرے شاعر نہیں جتنے رشید حسن خان کا مضمون پڑھنے کے بعد نظر آنے لگے ہیں۔ وہ بہرحال اچھے اور اپنے عہد کے بڑے شاعر ہیں۔ رہی زبان کی چند غلطیاں' جو غالبا بے خیالی میں ان سے سرزد ہو گئیں مثلاً

اگلے جب بحر دل نے سو لعل و گہر (رشید حسن خان)

میں "گہر" کے ساتھ بحر سے "لعل" برآمد کرنا' وغیرہ تو ایسی فروگزاشتیں ہیں جو انیس و دبیر جیسے شعراء کے پاس بھی مل جائیں گی جنہیں اپنی زبان دانی پر ناز تھا۔ مثلاً" دبیر کا یہ شعر دیکھئے

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

اس شعر کو پڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ "چرخ کہن" تو اپنی بوسیدگی کے سبب کانپے گا ہی "کہن" جو ٹھہرا۔ اس کا شیر کی ہیبت

سے کیا تعلق؟ شیر کی ہیبت سے تو اسے پہلی ہی دہاڑ میں گر جانا چاہئے۔ ہے نا دلچسپ بات؟ اب یہ مصرع دیکھئے

رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے

یہ "زیر کفن" کیا ہوتا ہے۔ "اندرون کفن" ہونا چاہئے۔ کفن لپیٹا جاتا ہے نہ کہ اوڑھایا جاتا ہے۔ ایک بار میں نے جوش صاحب سے نہایت مودب انداز میں پوچھا تھا کہ آپ نے اپنے ایک شعر میں فارسی کے ایک محاورے کا اردو ترجمہ شاید قافیے کی مجبوری سے غلط کر دیا ہے۔ چونک پڑے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی ایک مشہور نظم کا نہایت خوبصورت شعر ہے اور اس نظم کا عنوان ہے "فتنہ خانقاہ"

آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا لو نکل رہی تھی دل خانقاہ سے

آپ نے "از راہ عقیدت" کا لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔ اردو محاورہ 'راہ پر چلنا' یا "راہ سے لگنا" ہے۔ "راہ سے چلنا" قدرے غور طلب ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہنے لگے "فصاحت کم ہو گئی ہے، مگر یہ غلط نہیں ہے۔ مفہوم واضح ہے۔ بعض اوقات اچھے شعر کی خاطر ایسے تصرفات سے کام لینا پڑتا ہے" پھر انہوں نے انیس کا مصرع سنایا۔

اٹھو فریضہ سحری کو ادا کرو

"اس مصرعہ میں "کو" ضرورت شعر کے تحت آیا ہے" پھر غالب کے دو تین شعر سنائے۔ غرض یہ ثابت کر دیا کہ شاعری کو لغت کی مدد سے نہیں پڑھنا چاہئے۔ لغت کا لفظ شاعری میں ایک اشاریئے کا کام انجام دیتا ہے۔

رشید حسن خان نے "غنچہ طبع" کو بھی لغت کی روشنی میں "غنچہ خاطر" کے ہم معنی قرار دے دیا ہے جبکہ غنچہ کی اور بھی خصوصیات ہیں۔ اس میں خوشبو بند ہوتی ہے اور "صبا خصائل" کے مقابل اس کے یہی معنی لئے جائیں گے نہ کہ منقبض یا تنگ دل کے اور پھر پہلے مصرعے میں "سنگ دل" کی ترکیب بھی اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ ہم غنچے کی تازگی اور کوملتا کو پیش نظر رکھیں۔ محاورے کے پیچھے نہ جائیں۔ ہاں اگر جوش صاحب "غنچہ خاطر" ہی لکھتے تو شاید کچھ سوچنا پڑتا کیونکہ یہ مروجہ ترکیب مروجہ معنی کے لئے ہے۔ رشید حسن خان کے تنقیدی رویہ سے مجھے اثر لکھنوی کا انداز تنقید یاد آ گیا "نگار" میں فیض صاحب کے ایک نظم پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے ایک مصرعے میں تبدیلی کر دی تھی۔ فیض صاحب کا شعر ہے

اس قدر پیار سے اے جان جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ

اثر صاحب نے دوسرا مصرع یوں کر دیا تھا

دل بے تاب پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ

زبان کے اعتبار سے مصرع یقیناً مضبوط ہو گیا مگر کیفیت کے اعتبار سے؟

ایک اہل زبان کہنے لگے کہ اگر "دل کا رخسار" ہو سکتا ہے تو دل کا گھٹنا اور دل کا انگوٹھا وغیرہ بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔

آپ ہی بتایئے ایسے اعتراضات کا کیا جواب ہے۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ جب انیس پاؤں کی رعایت سے "نگاہ میں چھالے" ڈال سکتے ہیں اور وہ بھی لاکھوں (پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں) تو "رخسار پر ہاتھ" کی کیفیت اگر فیض صاحب نے "دل میں" محسوس کرلی تو کون سا گناہ کردیا۔ ایسی تنقیدیں پڑھ کر خود جوش صاحب کی نظم "نقاد" یاد آجاتی ہے اور جوش صاحب کے الفاظ میں کہنا پڑتا ہے کہ

کوئی نوک خار سے چھوتا ہے نبض رنگ و بو

رشید حسن خاں صاحب زبان کے واقعی ماہر ہیں۔ میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے ان کی ہر تحریر میں بڑی توجہ اور طالب علمانہ لگن کے ساتھ پڑھتا ہوں' تحقیق میں بھی ان کے کارنامے بڑی اہمیت رکھتے ہیں مگر شاعری پر ان کی تنقید اپنی مخصوص افادیت کے باوجود کٹرپن کی شکار ہوجاتی ہے۔ جوش صاحب کے بارے میں ان کا لہجہ بھی کچھ زیادہ ہی کرخت ہوگیا ہے۔

جوش صاحب الفاظ کی "زیادتی" کے مارے ہوئے ضرور ہیں' مگر انہی الفاظ کے پردے میں ان کی بڑائی بھی پوشیدہ ہے' نظم نگاری کے فنی ضوابط سے قطع نظر الفاظ کی مخصوص "ہنرکاری" میں وہ اپنے عہد کے منفرد شاعر تھے۔ بیشتر شعراء نے انہی کی خوشہ چینی کی ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ عہد آفریں بھی کہے جاسکتے ہیں۔

خط' خیالات کی رو میں خاصا طویل ہوگیا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو شائع بھی کرسکتے ہیں' ممکن ہے کچھ گفتگو اسی بہانے سے آگے بڑھ جائے اور کچھ کام کی باتیں سامنے آجائیں۔ (مطبوعہ ماہنامہ "کتاب نما" دہلی' مورخہ جنوری ۱۹۹۱ء)

حمید الدین شاہد (ایڈیٹر سب رس) کے نام

(مشاہیر دکن کی وفات)

محترم شاہد بھائی

سلام مسنون

پچھلے برس کے یکے بعد دیگرے ایسے صدمے پہنچے کہ دل ٹوٹ کر رہ گیا۔ مئی ۹۲ء جب میں جمشید پور (ٹاٹا نگر) کے جشن اور کلکتہ کے مشاعرے کے بعد دہلی پہنچا تو علی صدیقی صاحب (عالمی اردو کانفرنس) کی ایک دعوت میں صلاح الدین اویسی صاحب (صدر اتحاد المسلمین حیدر آباد) سے ملاقات ہوگئی ان کی خواہش پر ہم سب شعراء (احمد فراز' نجمہ خان' اعجاز رحمانی' اور عزم بہزاد وغیرہ) حیدر آباد دکن چلے گئے۔ دارالسلام کے میدان میں بہت شاندار مشاعرہ ہوا۔ حیدر آباد دکن کے اہل قلم کے علاوہ آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ اور دیگر زعمائے شہر بھی شریک مشاعرہ ہوئے۔ مختصر ادبی نشستیں بھی ہوئیں۔ اور اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ سری نواس لاہوٹی سخت بیمار ہیں چنانچہ اولین فرصت میں اس کے گھر گیا۔ اس کے بھائی اور دیگر رشتہ داروں سے ملاقات ہوئی۔ لاہوٹی غنودگی کے عالم میں فریش تھا۔ میری آواز سن کر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحے کے لئے آنکھیں چمکیں۔ پھر نقاہت سے بند ہوگئیں۔ کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن ہونٹ ساتھ نہ دے سکے میں نے بھی یہ سوچ کر کہ اسے زحمت نہ ہو' اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے سلادیا۔ بھائی سے کہا کہ اسے آرام کرنے دو' اور ایک کاغذ پر اپنی آمد' اس سے ملنے کی آرزو' اور اس کی صحت کے حوالے سے دعائیہ کلمات لکھ دیئے اور تاکید کی کہ جب صحت یاب ہوجائے تو

لاہوتی کو دے دینا۔ پھر گھر والوں کو تسلی دی اور کچھ دیر گفتگو کرکے واپس آگیا۔ دوسرے ہی دن مجھے اورنگ آباد جانا تھا، اورنگ آباد پہنچ کر دو ہی دن گزرے ہوں گے کہ روزنامہ "سیاست" میں اس کے انتقال کی خبر شائع ہوئی۔

سوچئیے میرے دل پر کیا گزری ہوگی۔ سری نواس لاہوتی مجھ سے عمر میں کچھ بڑا ضرور تھا مگر ہم دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ ۵۰ء تک حیدر آباد میں اکثر ملاقاتیں رہتیں۔ میں، قمر ساحری، عزیز قیسی، سلیمان اریب، کنول پرشاد، وہاب حیدر، مغنی تبسم سرور ڈنڈا، لطیف ساجد، خیرات ندیم، س۔ الف عشرت، نصیر افسر اور سری نواس لاہوتی۔ عموماً ہر شام عابد روڈ پر ملتے۔ کسی کیفے میں گپ شپ ہوتی۔ ادبی مسائل سے لے کر سیاسی مسائل تک، سبھی زیر بحث آتے۔ ہماری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ کچھ بزرگ بھی اطراف ہوتے۔ جن میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حسینی شاہد، اختر حسن، تم میں اور ____، ڈاکٹر عالم خوندمیری، عابد علی خان، محبوب حسین جگر، مسلم ضیائی اور کتنے ہی ایسے اہل قلم تھے، جن سے ہم نے روشنی پائی، نئے لکھنے والوں میں شاذ تمکنت، اور راشد آذر وغیرہ کا بھی آغاز تھا، اور انور معظم اور وحید اختر بھی ابھر رہے تھے۔

اورنگ آباد میں لاہوتی کے انتقال کی خبر نے، سب کو افسردہ کردیا، بشر نواز، قاضی سلیم، اختر الزماں ناصر، اور نئے لکھنے والے سبھی دل شکستہ نظر آرہے تھے۔

انہیں دنوں یہ خبر بھی مل چکی تھی کہ بمبئی میں عزیز قیسی بیمار ہے، اور ڈاکٹروں نے کینسر کا گمان ظاہر کیا ہے۔

پاکستان آنے سے پہلے میں دو دن بطور خاص بمبئی میں رکا، میں عزیز قیسی ہی کے گھر ٹھہرا کرتا ہوں۔ اسے دیکھ کر دل دھڑک کے رہ گیا۔ ایسا مضبوط شخص...... جسے دیکھ کر مجتبیٰ حسین نے "پتھر کا آدمی" (خاکہ) لکھا تھا۔ پگھل کر رہ گیا تھا۔ وہ صرف اپنی قوت ارادی کے بل پر جی رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ویسے ہی جاندار قہقہے تھے مگر ان قہقہوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی موت صاف دکھائی دینے لگی تھی، اس کے بیٹے، دانش نے کئی بار میری توجہ ادھر مبذول کرائی، میں بھی محسوس کررہا تھا مگر یقین کرنا نہیں چاہتا تھا۔ عزیز کا چھوٹا بھائی اور اس کا ڈاکٹر بیٹا بھی حیدر آباد سے بمبئی آگئے تھے۔ ہم سب جان گئے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اگر کوئی بے خبر تھا تو شاید وہ خود، اور کچھ عجب نہیں کہ وہ خود بھی سمجھ گیا ہو اور اپنے ہونٹوں پہ قہقہے صرف اس لئے پھیلائے ہوئے تھا کہ اس کی بیوی اور بیٹی منزہ کو احساس نہ ہو۔ شاید، وہ بے خبر تھے یا اپنے آپ کو بہلائے رکھتے تھے۔ لیکن بھابھی کی خالی آنکھوں میں کبھی کبھی مجھے ایسی وحشت جھانکتی دکھائی دیتی کہ میں لرز کر رہ جاتا۔

پھر بھی۔ سبھی کسی معجزے کے آرزو مند تھے، میں بھی پاکستان آنے تک ایک ایسی ہی آس لئے ہوئے تھا، خدا کرے، وہ بچ جائے۔ کوئی ایسا کرشمہ ہوجائے کہ وہ صحت یاب ہوجائے، مگر ہم میں سے کسی کی دعا قبول نہیں ہوئی۔

آپ نے اس کے آخری زمانے کی غزلیں اور نظمیں پڑھیں تھیں۔ کچھ تو "سب رس" میں شائع ہوئیں۔ آپ نے خود اندازہ کرلیا ہوگا کہ وہ خود موت کو اپنے وجود سے کس قدر قریب محسوس کرنے لگا تھا۔

ابھی میں اس کا غم اپنے سینے میں دبائے اس کے بارے میں کچھ لکھ ہی رہا تھا، کچھ مواد جمع ہی کررہا تھا... کہ عابد صاحب کی خبر آگئی

عابد صاحب کا سانحہ زخم پر ایک ضرب کے مترادف ہوا، کیسے ہنس مکھ، مخلص، محنتی، شفیق، دوست دار، صاحب علم، کتنی صفات کے مالک تھے۔

۵۰ء میں جب میں نے حیدر آباد چھوڑا تو ۸۵ء تک نہ جاسکا، ہندوستان بارہا گیا مگر، حیدر آباد جانے کی کوئی سبیل پیدا نہ ہوسکی، اورنگ آباد (مہاراشٹر) تک کئی بار ہو آیا مگر... گویا حیدر آباد میرے لئے "شجر ممنوعہ" ہوکر رہ گیا تھا... کیوں؟

شاید آپ کو یاد ہو ' وہاں میں دکن ریڈیو سے متعلق تھا۔ اور پولیس ایکشن کے بعد تک ' یعنی ۵۰ء تک آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے متعلق رہا ' پھر مذہبی تعصبات کی آڑ میں تخفیف کا کلہاڑا چلا میری ملازمت ختم کردی گئی۔ میری بیگم کو بھی سروس سے ہٹادیا گیا۔ غصے میں آکر میں نے اخبارات بیچنے شروع کردیئے۔ ہر طرف احتجاج کیا گیا' رہنمائے دکن عوام' سیاست' بلٹز 'کراس ورڈز اور کئی اخبارات و رسائل میں احتجاجی کالم لکھے گئے۔ ہفتہ وار "پرواز" نے تمام تحریروں کو جمع کرکے ایک خاص شارہ مرتب کردیا جو ۹ نومبر ۱۹۵۰ء کو شائع ہوا۔ اس سلسلے میں محترم عابد علی خان صاحب نے جس تعاون اور رفاقت کا اظہار کیا میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

حالات سے مجبور ہو کر جب میں پاکستان چلا آیا اور یہاں ریڈیو پاکستان کراچی سے متعلق ہوگیا تو عابد صاحب ہی نے سب سے پہلے روزنامہ "سیاست" میں یہ خبر لگائی اور میرے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر نوٹ لکھا۔ ان دنوں ابراہیم جلیس کراچی میں روزنامہ "امروز" سے متعلق تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ دیکھو حیدر آباد کے لوگ اب بھی تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ میں بالخصوص عابد علی خاں صاحب کا بہت ممنون ہوں' انہوں نے بارہا مجھے دعوت نامے بھیجے "اردو ٹرسٹ" کے مشاعروں کے حوالے سے.... خدا جانے کیوں؟ مجھے حیدر آباد دکن کا ویزا ہی نہیں دیا جاتا تھا۔ آخر انہوں نے مرکزی حکومت سے رابطہ قائم کیا اور بطور خاص مجھے ویزا دلوایا۔ ۸۵ء میں پورے ۳۵ سال بعد حیدر آباد جاسکا اور صرف عابد علی صاحب کی کوششوں کے سبب' مجھے یاد ہے' جب میں حیدر آباد ایئرپورٹ پر اترا تو میرا کیا عالم تھا۔ مجھے لینے کے لئے عابد صاحب کے ساتھ محترم محبوب حسین جگر' محترم راج بہادر گوڑ' محترم حسینی شاہد' اور سری نواس لاہوٹی کے ساتھ کئی نئے اور پرانے لکھنے والے' ادیب اور صحافی تشریف لائے تھے میری آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے اور دل میں عابد بھائی کے لئے جذبات تشکر....

شاہد بھائی' آپ تو عابد صاحب سے بہت قریب رہے ہیں۔ کیسے پیارے انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اب جگر صاحب پر جو گزر رہی ہوگی ذرا اس کا اندازہ تو کیجئے۔ محبوب حسین جگر (ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی) اور عابد علی خاں' کیسے مثالی دوست رہے ہیں۔ یک جان دو قالب.... اللہ تعالیٰ ان پر بھی اپنا کرم فرمائے۔ انہیں اور سارے متعلقین کو صبر و جمیل عطا کرے۔

آج حیدر آباد سے "سب رس ۹۴ء" آیا تو ایک اور خبر نگاہ سے گزری۔ جناب فضل الرحمٰن صاحب بھی بچھڑ گئے۔ (۱۱ نومبر ۹۴ء کو) فضل الرحمٰن صاحب دکن ریڈیو کے ناظم تھے۔ ان سے بھی میرے نیازمندانہ تعلقات تھے۔ بڑے افسر ہونے کے باوجود نہایت منکسرالمزاج' بااخلاق' شفقت بھرا دل رکھنے والے۔ شاعر بھی اور ڈرامہ نگار بھی۔ ان کے مجموعہ کلام "دھوپ چھاؤں" "نگار حکمت" " لوائے فطرت" اور "بساط تو" آپ کی نگاہ سے گزرے ہوں گے۔ میں صرف "دھوپ چھاؤں" پڑھ سکا۔ ہاں' ڈراموں کے مجموعے یوں حاصل ہوئے کہ جن دنوں میں ڈرامے پر تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا۔ ہندوستان سے بھی اس موضوع پر کتابیں جمع کیں۔ چنانچہ فضل الرحمان صاحب کے طبع زاد اور ترجمہ شدہ ڈرامے بھی دستیاب ہوگئے۔ میرے پاس "ظاہر باطن" "سقراط" اور "سمندری لٹیرے" موجود ہیں۔ آخر الذکر غالباً ابسن کا ترجمہ ہے انہوں نے گوئٹے کے تراجم بھی کئے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بھی اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ شاہد بھائی آج آپ کو خط لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ عابد علی صاحب کے بارے میں "سب رس" کا نوٹ پڑھ کر آنکھیں بھر آئیں یاد آیا کہ ان کی ایک مختصری

خودنوشت سوانح ماہنامہ "آج کل" دہلی (بھارت) میں بھی مارچ ۸۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ تلاش کیا تو اپنی لائبریری میں مل گئی۔ جی چاہا کہ اس کی فوٹو کاپی آپ کو بھیج دوں' یہ خودنوشت ممکن ہے آپ کی نگاہ سے بھی گزری ہو۔ مگر یہاں شاید ہی کسی نے پڑھا ہو۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے "سب رس" کے کسی شمارے میں شائع فرمادیں۔ ایک یادگار' پاکستان میں بھی محفوظ رہ جائے گی۔ بس اسی حوالے سے لکھنا چاہتا تھا کہ بات سے بات نکل آئی۔ یادوں کا ایک سیلاب امڈ آیا... اور خط طویل ہوگیا۔

پچھلے شمارے میں پروفیسر شفقت رضوی کا اداریہ پڑھا اور احساس ہوا کہ ہم سے کیا کوتاہیاں سرزد ہورہی ہیں۔ ہم سب کا فرض ہے کہ "سب رس" کے لئے کچھ کریں۔ اس سلسلے میں میں آپ سے تفصیلی بات کروں گا اور اپنی کچھ تجاویز رکھوں گا۔ "افکار فاؤنڈیشن" کی طرح اگر "سب رس فاؤنڈیشن" کا بھی قیام عمل میں لایا جائے تو شاید کچھ بہتر نتائج برآمد ہوں۔ اس سلسلے میں ہم سب کو مل بیٹھنا چاہیئے اور کوئی ایسا پروگرام بنانا چاہیئے جو عرصہ دراز تک قابل عمل رہ سکے۔

امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے

آپ کا

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ ماہنامہ "سب رس" کراچی۔ مارچ ۹۳ء)

ایڈیٹر "منشور" (ذکی عباس) کے نام
(علامہ اقبال کی پیروڈی۔ امریکہ میں جشن کیفی اعظمی)

۱۸ جولائی ۱۹۹۵ء

بھائی شبّر نقوی صاحب! سلام محبت۔ ایک تازہ نظم بھیج رہا ہوں۔ بہت دنوں سے علامہ اقبال کا ایک مصرع ذہن میں گھوم رہا تھا۔

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اردو میں جس کا اظہار انہوں نے اس ترانے میں کیا تھا۔ "چین و عرب ہمارا' ہندوستاں ہمارا"۔ اس ترانے کی پیروڈی غالباً ۱۹۴۶ء میں میرے ایک بزرگ دوست اور استاد حضرت اختر الزماں ناصر نے خوب کی تھی۔ چند شعر یاد رہ گئے ہیں۔

چین و عرب ہمارا' ہندوستاں ہمارا
ہم گھاٹ کے نہ گھر کے' سارا جہاں ہمارا
فاقوں کی سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
ڈھانچہ ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں ڈوبی اذاں ہماری
تھکے سے رک رہا ہے' سیل رواں ہمارا
اقبال کا ترانہ بے وقت کی اذاں ہے
ٹوٹے بھی تو غلط ہے' خواب گراں ہمارا

پھر اس ترانے میں (پاکستان میں) خواجہ معین الدین کے ایک ڈرامے میں نظر حیدر آبادی نے ایک شعر بڑھایا تھا۔

امریکہ کی امانت پیٹوں میں ہے ہمارے
ہم اس کے رازداں ہیں' وہ رازداں ہمارا

(اس وقت پاکستان میں امریکی گندم آرہا تھا۔ یہ ڈرامہ کراچی میں اسٹیج ہوا تھا۔ غالباً دور ایوبی میں۔ پھر ہندوستان کی ایک فلم میں اس ترانے کی پیروڈی ساحر لدھیانوی نے لکھی جو بہت مشہور ہوئی تھی۔ اکثر لوگوں کو یاد ہوگی۔

رہنے کو گھر نہیں ہے' سارا جہاں ہمارا

سب سے مزیدار پیروڈی شوکت تھانوی کی ہے۔ اور وہ ہے اقبال کے مرد مومن کے بارے میں۔ تین شعر یاد رہ گئے ہیں۔

کمزور مقابل ہو تو فولاد ہے مومن
انگریز ہے سرکار تو اولاد ہے مومن
"قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت"
اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن
رضواں کو شکایت ہے' کم آمیز ہے مومن
حوروں کو ہے شکوہ کہ بہت تیز ہے مومن

ضمیر جعفری نے بھی اس سلسلے میں بہت اچھے شعر کہے ہیں۔ ایک شعر سنئے

بڑی مدت سے کوئی دیدہ ور پیدا نہیں ہوتا
جو ہوتا ہے — مسلمانوں کے گھر پیدا نہیں ہوتا

یہ حقیقت ہے۔ میری نظم "پین اسلامزم" پر روشنی ڈالتی ہے۔ مغربی ممالک تو بہرحال آپ کو اپنا لیتے ہیں۔ غیر قانونی اور قانونی دونوں طرح وہاں جاکر نہ صرف بس رہے ہیں بلکہ شہریت بھی حاصل کر رہے ہیں مگر عرب ممالک اور بالخصوص سعودی عرب میں "پاسبان حرم" آپ کو رہنا سہنا تو بڑی بات' ایک انچ زمین خریدنے یا چھوٹی سی آزادانہ تجارت کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ روپیہ اپنا لگایئے اور شیخوں کے نام سے تجارت کیجئے۔ ہم لاکھ کہیں کہ آل رسول ہیں یا صدیقی' فاروقی اور عثمانی ہیں۔ آپ کسی عنوان سے اپنا رشتہ نہیں جتا سکتے۔ اس صورت میں الارض للہ (ساری زمین خدا کی ہے) کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ آدم کی اولاد ہونا بھی باعث اعزاز نہیں۔ میں سوچتا ہوں' ہمارے علماء اور دانشور' کن خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ اپنی ایک "ثلاثی" یاد آگئی۔ یہ بھی سن لیجئے۔

عالم تھے' باکمال تھے' اہل کتاب تھے
آنکھیں کھلیں تو اپنی حقیقت بھی کھل گئی
الفاظ کے لحاف میں ہم محو خواب تھے

خط خاصہ طویل ہوگیا۔ بات کہاں سے نکلی اور کہاں آگئی۔ اچھا بھئی، خدا حافظ۔ برادر عزیز و محترم طفیل عباس کو سلام کہیں۔ ذکی، ریاض، قمر ساحری سب کو میرا سلام۔ ہاں بھئی یاد آیا۔ ایک نظم "احتجاج" پہلے بھی بھیجی تھی۔ کیا وہ چھپ گئی؟ کس شمارے میں؟ ہاں کبھی کبھی آپ کا رسالہ ڈاک سے غائب بھی ہو جاتا ہے اگر چھپ گئی ہو تو مجھے بھیج دیں۔ (شکریہ)

(مطبوعہ "منشور" ستمبر ۱۹۹۵ء)

الارض للہ

(حمایت علی شاعر)

(ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست)

ہر ملک، میرا ملک ہے، ہر شہر میرا شہر
میرے خدا کا ملک ہے، میرے خدا کا شہر

میں آدمی ہوں، کہتے ہیں آدم کی نسل ہوں
جنت کی گود میں جو پلی ہے وہ فصل ہوں

میری زمیں کی طرح، مرا آسماں بھی ہے
اور مجھ پہ جو خدا کی طرح مہرباں بھی ہے

ہے کون میری طرح حسیں کائنات میں
اللہ کا جمال ہے، میری صفات میں

میرے لئے ہیں سارے جہانوں کے خشک و تر
"بعد از خدا عظیم ہوں میں" قصہ مختصر

○

جب یہ سند ہے پاس، تو "ویزا" کی فکر کیا
اللہ کی زمین پہ "حدا" کی فکر کیا

رخصت سفر اٹھایئے، لے کر خدا کا نام
جس جا ملے گی چھاؤں، کریں گے وہیں قیام

امریکہ ہو کہ روس ہو، یورپ ہو یا عرب
پوچھے کوئی تو ساتھ ہے یہ "شجرہ ء نسب"

آدم کے جانشیں ہیں، شریک خدائی ہیں
دنیا میں جتنے لوگ ہیں سب بھائی بھائی ہیں

مذہب جدا جدا سہی، اللہ ایک ہے
منزل کی سمت جاتی ہے جو راہ، ایک ہے

لیکن یہ کیا! یہ کس نے کہا ہے جواب میں!!
"ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں"
(غالب)

(۴)

۱۲ اکتوبر ۹۵ء

بھائی ذکی عباس! سلام محبت

مجھے امریکہ سے آئے ہوئے دو ہفتے ہو چکے ہیں۔ ایک مشاعرہ نیو جرسی میں تھا، ایک بوسٹن میں (ایم آئی ٹی یونیورسٹی) اور دوسرا واشنگٹن میں ہو چکا ہے۔ ۲۸ اکتوبر کو نیویارک میں جشن کیفی منایا جا رہا ہے۔ میں دراصل اسی سلسلے میں آیا ہوں۔ کیفی اعظمی، شبانہ اعظمی اور جاوید اختر بھی آچکے ہیں۔ کل ہی پہنچے۔ یہ عالیشان جشن حلقہ فن و ادب شمالی امریکہ کے زیر اہتمام ایک جہاز میں منایا جا رہا ہے۔ جہاز "مجسمہ آزادی" کی طرف سے ہوتا ہوا سمندر میں رواں دواں رہے گا اور یہ تقریب اپنے مخصوص مہمانوں اور شرکائے محفل کے ساتھ جاری رہے گی یہ ایک تاریخی تقریب ہے جو پہلی بار امریکہ میں اس جدت کے

ساتھ منعقد کی گئی ہے۔ پاکستان سے میں اور قتیل شفائی مدعو ہیں ہندوستان سے ایک شاعرہ ڈاکٹر نسیم نکہت کو بھی دعوت دی گئی ہے مقامی شعراء میں سید حنیف اخگر ملیح آبادی' محترمہ رشیدہ عیاں' عزیز الحسن عزیز' محترمہ نسیم سید' محترمہ زرین یاسین' وکیل انصاری' صلاح الدین ناصر' عبد الماجد کے علاوہ اور بھی شعراء مدعو ہیں میں زیادہ تفصیل نہیں جانتا' کل ہی واشنگٹن سے آیا ہوں وہاں علی گڑھ الىنائی کے زیر اہتمام اکیسواں سالانہ مشاعرہ تھا بہت سے دوست ملے "منشور" کا بھی تذکرہ رہا' پچھلے شمارے میں علامہ اقبال کی پیروڈیوں کے سلسلے میں میرا خط پڑھ کر لوگوں نے خواہش کی کہ شوکت تھانوی کا اور بھی ایسا کلام منشور کو مہیا کروں' یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شوکت صاحب کی ایسی نظمیں ہندوستان میں ایک کتاب کی صورت میں چھپ چکی ہیں' اس کا نام بھی بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے علامہ اقبال کے کلام کی پیروڈی کی رعایت سے شوکت تھانوی نے اس مجموعہ کا نام "اقبال جرم" رکھا ہے۔ کاش پاکستان میں وہ کتاب چھپ جاتی...... ایسی کتابیں ہمارے معاشرے کو آئینہ دکھاتی ہیں اور ہنسی ہنسی میں اس تلخ حقیقت کا اظہار کردیتی ہیں جسے ہم سنجیدہ لہجے میں بیان کردیں تو "کفر" کا الزام عائد ہوجائے۔ خود علامہ اقبال کا یہ شعر

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

کس زمرے میں شامل ہوگا' ایک زمانے میں علامہ بھی فتوؤں کی زد میں تھے' تازہ مثال فیض صاحب کی نظم "سر وادی سینا" کی ہے۔ اس کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا گیا' مجبوراً فیض صاحب نے اپنے کلیات میں سے اس نظم کا آخری حصہ نکال دیا اور نظم ادھوری شامل کی حالانکہ کسی بھی زاویئے سے اس نظم پر کوئی حد عائد نہیں ہوتی۔ فیض صاحب اردو' فارسی اور انگریزی کے علاوہ عربی کا بھی علم رکھتے تھے۔ عربی میں ایم اے تھے۔ زبان کی معنوی تہوں اور وسعتوں کو سمجھتے تھے مگر ہمارا "لفظ پرست" معاشرہ برداشت نہ کرسکا۔ یہ لفظ پرستی بھی ایک طرح سے "بت پرستی" ہے (بقول زیڈ اے بخاری)

"مگر یہ بات کہے کون اس زمانے میں"

اس غزل میں بخاری صاحب کا ایک بہت اچھا شعر یاد آگیا

اڑوں کہاں کہ ہوا میں بھی جال پھیلے ہیں
میں پر سمیٹ کے بیٹھا ہوں آشیانے میں

کاش بخاری صاحب کا مجموعہ کلام بھی شائع ہوجاتا کسی نے توجہ ہی نہیں کی۔ سنا ہے کہ نصیر ترابی چھاپنے والے تھے' خدا جانے کیوں نہیں چھپا۔ کبھی نصیر سے پوچھنا چاہئے؟ آخر وہ مجموعہ ہے کہاں؟ کیا انجمن ترقی اردو یا اکادمی ادبیات ایسی کتابیں نہیں چھاپ سکتی؟ ارم لکھنوی' ذوالفقار علی بخاری' شعیب حزیں' علامہ رشید ترابی' علامہ رزی جے پوری' پروفیسر عبد القیوم خاں باقی' تحسین سروری' غریب سانکی' مسلم ضیائی اور کتنے ہی ایسے بزرگ اور بلند مرتبہ شاعر ہیں جن کا کلام بوجوہ شائع نہ ہوسکا۔ کیا یہ سرمایہ یوں ہی ضائع ہوجائے گا؟ اس کے بارے میں ہم سب کو سوچنا چاہئے اور "متعلقہ حضرات" کو احساس دلانا چاہئے۔

ارے بھائی خط پھر طویل ہوگیا۔ بات سے بات نکل جاتی ہے نا۔ ایک نظم سنیئے اور منہ کا مزا بدل لیں۔

(مطبوعہ "منشور" دسمبر ۱۹۹۵ء)

اظہر جاوید (ایڈیٹر "تخلیق") کے نام

(شیخ ایاز، علامہ اقبال، ڈاکٹر صبیحہ صبا)

بھائی اظہر جاوید! سلام محبت

"تخلیق" پابندی سے مل رہا ہے، شکر گزار ہوں۔ ماشاء اللہ اب اس کی عمر ۲۵ سال ہو گئی ہے۔۔

نظر نہ لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو

لیکن بھائی تمہارے "زخم جگر" کو دیکھنا پڑے گا۔

اس لئے کہ یہی ربع صدی کا حاصل ہے جسے بڑی محبت کے ساتھ سرمایہ حیات سمجھ کر تم نے اپنی ذات سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اس عشق میں جن مراحل سے گزرے، جتنی خاک چھانی، جن بلندیوں پر اڑے اور جو کچھ کمایا وہ تمہارا ہی ظرف اور حوصلہ ہے۔۔

کون ستارے چھو سکتا ہے
راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

پاکستان کی ادبی دنیا سے ایسی چند ہی مثالیں دی جا سکتی ہیں جو اپنے عزائم میں آج بھی ثابت قدم اور مسلسل رواں دواں ہیں۔

اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

فروری ۹۵ء میں ایک تصویر کے نیچے "صبیحہ صبا" لکھا دیکھا۔ پھر غزل بھی پڑھی۔ یہ کوئی نئی شاعرہ ہیں یا طباعت کی غلطی؟ آپ کو یقیناً" معلوم ہوگا کہ پاکستان کی ایک بہت ہی معروف شاعرہ "صبیحہ صبا" نیویارک میں بھی ہیں ان کا مجموعہ کلام "چشم ستارہ شمار" کے نام سے پچھلے سال ہی کراچی سے شائع ہوا۔ غزل کی بہت اچھی شاعرہ ہیں پاکستان کے اکثر رسائل میں ان کا کلام چھپتا رہتا ہے اگر یہ "توارد" ہے تو اس نئی شاعرہ کو ابھی سے سوچ لینا چاہئے کہ ہمارے ادب میں "ہم نام اہل قلم" کس کس مسئلے سے دوچار رہتے ہیں، سب کو معلوم ہے۔ اختر انصاری (دہلوی) اختر انصاری اکبر آبادی۔ مجتبیٰ حسین (نقاد) مجتبیٰ حسین (طنز و مزاح نگار) ناصر زیدی (کراچی) ناصر زیدی (معروف شاعر) شمیم احمد (انڈیا) شمیم احمد (کراچی) شیخ سلیم احمد اور سلیم احمد وغیرہ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی نیکیاں ان کے کھاتے میں اور ان کی برائیاں ان کے اعمال میں شامل ہوتی جاتی ہیں۔

اس طرح ہم تخلص ہونے کی سزا بھی شاعروں کو ملتی ہے۔ تاریخ ادب میں اس کی بڑی مثالیں ہیں (ویسے بھی یہ ایک قابل تحقیق موضوع ہے) اپنے دور کی ایک دلچسپ مثال پیش کروں مشہور نقاد ڈاکٹر یوسف حسین ("روح اقبالؒ" کے مصنف) جن کی تصنیف "اردو غزل" بھی بہت اہم کتاب ہے۔ اس کا جب بھی نیا ایڈیشن چھپتا۔ کچھ نئے شعراء کا اضافہ ہو جاتا۔ غالباً تیسرے یا چوتھے ایڈیشن (مطبوعہ دہلوی) میں ایک دلچسپ غلطی سرزد ہو گئی۔ شعراء کی فہرست میں ایک نیا نام آیا "حمایت علی شاعر لکھنوی"

ڈاکٹر یوسف حسین جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) میں ادبیات کے پروفیسر ضرور تھے مگر ذاتی طور پر مجھ سے واقف تھے نہ حضرت شاعر لکھنوی سے (اس ایڈیشن میں دونوں کا کلام شامل ہے) ڈاکٹر صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ حضرت شاعر لکھنوی کا نام حسن پاشا تھا۔

شیفتہ کے اس مشہور شعر کا قضیہ تو آپ کو معلوم ہو گا

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا جو دیوان (مطبوعہ ۱۹۵۴ء) مولانا صلاح الدین احمد نے مرتب کیا' وہ اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ "یہ غزل کسی دیوان کے کسی ایڈیشن میں شائع نہیں ہے' میں نے اس بارے میں نواب خلیل خاں صاحب سے بھی (جو شیفتہ پوتے ہیں) رجوع کیا۔ لیکن انہوں نے بھی اس غزل کے وجود سے لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ دیوان کے پہلے ایڈیشنوں میں سوائے "حسرت" کے ایڈیشن کے یہ شعر ـــــــ فردیات کے زمرے میں درج ہے۔ حسرت نے اس شعر کا اپنے دیباچے میں ذکر کیا ہے لیکن "فردیات" میں درج نہیں کیا اور خود غزل کا سراغ نہیں ملا۔ (صفحہ ۲۶)

غور طلب بات یہ ہے کہ "کلیات شیفتہ" (مرتبہ کلب علی خان فائق' شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول ۱۹۶۵ء) میں یہ مقطع "فردیات" میں بھی شامل نہیں ہے۔ فائق صاحب نے اپنے مقدمے میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا اور عدم شمولیت کا کوئی جواز بھی پیش نہیں کیا۔ مزید غور طلب بات یہ ہے کہ "گلشن بے خار" میں بھی شیفتہ نے اسے منتخب نہیں کیا' چنانچہ گمان غالب ہے کہ یہ کسی "غیر معروف شیفتہ" کا مقطع ہے جو "معروف شیفتہ" کے نام سے منسوب ہو گیا ہے۔ واللہ اعلم

ہاں بھئی' آپ نے اپنے اداریئے (دسمبر ۹۴ء) میں ایک "نہایت" شائستہ کردار شگفتہ مزاج اور بہت بڑے نوجوان "سرکاری افسر" (جو اتفاق سے سندھی ادب کا ادیب بھی ہے) کے شیخ ایاز کے بارے میں "غصے میں لال اور تھرتھراتے ہوئے خشمگیں لہجے میں "ادا کئے ہوئے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ "اس شخص نے" ہمیں مروادیا........ جب ہم طالب علم تھے تو شیخ ایاز ہمیں انقلاب انسانیت' سیکولرازم اور یہاں تک کہ دہریت کا درس دیتے تھے خدا شاہد ہے کہ ان کی گفتگو سے متاثر ہو ان گنت نوجوانوں نے اپنی زندگیاں ہار دیں۔ اپنا کیریئر تباہ کر دیا آج وہی شیخ ایاز ہیں کہ تسبیح اور لوٹا مصلا ہے۔

مجھے اس "شائستہ کردار" افسر کے یہ جملے پڑھ کر اس کی سادہ دلی پر بہت ترس آیا' ایسے "معصوم و سادہ" لوگوں کو سوچنے والے دماغوں کے پیچھے نہیں چلنا چاہئے۔ سوچنے والے ذہن تو عموماً تضادات کا شکار ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال ہو کہ مولانا مودودی' جی ایم سید ہوں کہ ذوالفقار علی بھٹو' انہوں نے شاید مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے کے بارے میں نہیں سنا وہ نوجوانی میں سخت دہریئے تھے۔ پھر ایسے مسلمان ہوئے کہ قرآن کریم کی تفسیر لکھ ڈالی۔ کارلائل نے آنحضرت کی سیرت پر ایک کتاب لکھ دی مگر مسلمان نہیں ہوا۔ دلورام کوثری خود کو "ہندوستانی حسان بن ثابت" کہا کرتے تھے انہوں نے ایک غیر منقوط دیوان نعت لکھ دیا اور نقطوں کے سبب کوثری کے بجائے دلورام تخلص استعمال کیا

ایک بات اور...... علامہ اقبال جتنے بڑے شاعر تھے اتنے بڑے قانون داں بھی تھے۔ وہ بات کہنے کے آداب جانتے تھے۔ دور غلامی میں انہوں نے کہا کہ تھا..... "اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔ کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو۔" مگر انگریز خاموش رہے اس لئے کہ ان کی نظم کا عنوان تھا "خدا کا فرمان۔ فرشتوں کے نام" اگر وہ حبیب جالب کی طرح "لاڑکانہ چلو

ورنہ تھانے چلو" کا انداز اختیار کرتے تو "تھانے" میں بند کردیئے جاتے۔ ذرا سوچئے تو جو قوم "شکوہ" برداشت نہ کرسکی اور انہیں "جواب شکوہ" لکھنے پر مجبور کردیا وہ ان کی زبان سے لینن کے خیالات کی حمایت کیسے برداشت کرتی۔ اسی لئے انہوں نے "آنجہانی" لینن کو پہلے خدا کے حضور سجدہ ریز کیا اور پھر اس کی ہم نوائی کی کارل مارکس کے بارے میں اقبال ہی نے تو کہا تھا کہ

آں کلیم بے تجلی، آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

اور پھر خدا کے حوالے سے یہ بھی کہہ دیا کہ

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

وہی اقبال نطشے کے بارے میں کہتے ہیں

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا کہ مقام کبریا کیا ہے

تو بھائی۔ یہ سوچنے والوں کی باتیں ہیں، شیخ ایاز بھی اسی سلسلے کا ایک سوچنے والا شاعر ہے۔ وہ کم و بیش پچاس کتابوں کا مصنف ہے۔ اسے اپنے مصلے پر بیٹھا رہنے دیں، آپ افسری کریں اور اپنا کیریئر بنائیں۔
حیرت ہے کہ بھائی اظہار جاوید بھی اس شائستہ کردار نوجوان سندھی افسر کی ہم نوائی میں اپنے اہل قلم دوستوں سے شاکی ہوگئے اور دائیں بائیں دیکھنے لگے...... میرے بھائی اگر بائیں جانب کچھ موقع پرست ہیں تو دائیں جانب کون سے "کردار کے غازی" ہیں پاکستان میں برسراقتدار تو "دائیں بازو کے لوگ ہی رہے ہیں۔ نتیجہ سامنے ہے ایسا محسوس ہوتا ہے

شاید بنا رکھی ہے ہماری ہواؤں پر
اب تک گزر رہی ہے بڑا کی دعاؤں پر

روس میں اشتراکیت کو مارکسزم کی ناکامی سمجھنے والوں کو اپنی تاریخ کا بھی جائزہ لینا چاہیئے؟ عمل معتبر نہ رہے تو نظریہ کے کیا قصور؟

حمایت علی شاعر۔ (کراچی)

(۱۹۹۶ء)

ناقدری فن کا، مرے فنکار، گلہ کیا
آئینے کی قسمت میں ہے پتھر کے سوا کیا

جینا بھی اک الزام ہے، مرنا بھی اک الزام
اے کاش ہم اس ملک کے فن کار نہ ہوتے

ایڈیٹر "تجدید نو" (عذرا اصغر اور شبہ طراز) کے نام

(تقلیدی ذہن)

(نثری نظم، ہائیکو، دوہے اور ماہیا وغیرہ کے بارے میں)

"تجدید نو" کا ایک دفتر، لاہور میں بھی ہے، میں اب تک اسلام آباد ہی خط لکھتا رہا ہوں۔ خیال آیا کہ "لاہور" والوں کا بھی شکریہ ادا کردوں بالخصوص "ہائیکو نمبر" کے سلسلے میں۔ کاش، پہلے سے میں اس رسالے سے مستفید ہوتا، خیر دیر آید درست آید..... آئندہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو لکھیں۔

سعادت حسن منٹو نے بہت پہلے یعنی ۱۹۴۰ء میں "نثری نظم" کے سلسلے میں ایک بڑی اہم بات لکھی تھی۔ چونکہ ہمارا مزاج "تقلیدی" ہے اس لئے ہم باہر کی چیزیں فوری قبول کرلیتے ہیں زندگی کے کسی شعبے پر نظر ڈالیں، آپ کو یہی عمل نظر آئے گا۔ "دیسی چیزیں" کم ہی نظر میں جنچتی ہیں..... ہماری زبان ہندوستان (برصغیر) میں پلی بڑھی، مگر اس کا نام "ترکی" اور لباس (رسم الخط) ایرانی (فارسی) منتخب ہوا، اصناف سخن ساری فارسی اور عربی سے مستعار ہیں اگر ہمارا کوئی لوک ورثہ (پوربی، ڈوگی) ہے تو ہم نے اسے بھی ترک کردیا۔ اگر اپنی "رشتہ دار" زبانوں سے کچھ لیا بھی تو "برہمنی ذہن" کے انداز میں یعنی اضافتوں میں، فارسی عربی قرینے اختیار کئے۔ رنگ و روپ، غلط موسم برسات، نہایت غلط، حتیٰ کہ اختر الایمان اور خورشید الاسلام بھی حرف غلط۔ ہندی، فارسی کا ملاپ نہیں ہو سکتا۔ "فارسی" اور "عربی" میں بھی فاصلے قائم ہیں۔ خیر عرب و عجم کے تو جھگڑے پرانے ہیں۔ وقت کے جبر نے بہت سے الفاظ کو ایک دوسرے کا "سرمایہ" بنادیا مگر ان کے برتنے میں وہاں بھی غیریت اور ذات پات کا رجحان کار فرما نظر آتا ہے۔ ہم نے اپنی علاقائی اصناف سخن سے بھی علم کی بنیاد پر کچھ نہ حاصل کیا۔ "دوہے" بھی لکھے تو لاعلمی کی بنیاد پر اور "ماہیا" کی طرف راغب ہوئے تو ماشاء اللہ مثالیں سامنے ہیں۔ کتابوں پر کتابیں آرہی ہیں مگر "تکنیک" سے بے خبر، حتیٰ کہ "پنجاب" کے اردو شعراء بھی اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں۔ ٹپہ، وائی، کافی، سورٹھا، ہیر، دوہیڑے اور اس برصغیر کی جتنی بھی اصناف سخن ہیں انکو اردو میں کبھی برتنے یا اپنانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ہاں، سانٹ، فری ورس، بلینک ورس، پروزپوئم، ترائیلے، لرک اور ہائیکو وغیرہ کا ایک طوفان امڈ آیا۔ ان سب میں صرف فری ورس (آزاد نظم) اردو شاعری کا حصہ بن سکی۔ اس کے علاوہ سب "مشق سخن" کی منزلوں میں ہیں، ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہم اپنی مقامی زبانوں کی مختلف اصناف سخن کو پہلے اپناتے۔ ان کے آہنگ اور ان کے رنگ و خوشبو سے اپنی شاعری کو سنوارتے۔ پھر دوسری طرف توجہ دیتے۔ مگر جیسا کہ منٹو صاحب نے لکھا ہے، ہمارا مزاج تقلیدی ہے تخلیقی نہیں، ہمارا خمیر اپنی مٹی سے مرتب نہیں ہم نے اپنی کوئی انفرادی شناخت قائم ہی نہیں کی۔ زمین سے رشتہ استوار ہی نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم پر دوسری زبانیں حکمران ہو گئیں۔ پہلے فارسی لادی گئی اور اب "انگریزی" دونوں "حکمرانوں کی زبانیں" تھیں۔ انکی گرامر (قواعد) مختلف، ان کے محاورے مختلف، ان کی روایات مختلف، محبت کے قرینے مختلف، عشق کے آداب مختلف، ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، عمر ماروی، مومل رانو اور سسی پنہوں کے مقابلے میں لیلا مجنوں، شیریں فرہاد، انطونی قلوپطرہ اور رومیو جیولٹ کی داستان محبت کو رکھ کر دیکھئے۔ کس میں گہرائی اور گیرائی زیادہ محسوس ہوتی ہے؟ یہاں "عشق مجازی"۔ "عشق حقیقی" تک پہنچ جاتا ہے اور وہاں.....؟؟

یہی ذہن زبان اور تہذیب کا فرق ہے۔ شعر و ادب کی جڑیں انہیں بنیادوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ خیر یہ ایک لمبی بحث ہے' ایک لمبا الیہ بھی...... بات چھڑی تھی منٹو صاحب کے ایک جملے سے "نثری نظم" انھوں نے آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے بڑا دلچسپ مضمون لکھا تھا۔ میں نے وہ مضمون (حوالے کے طور پر) اپنی کتاب "شخص و عکس" (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) میں دیا ہے۔ اس کا ایک اقتباس دلچسپی کی خاطر نقل کرتا ہوں۔ آپ بھی لطف لیں اور اپنے قارئین کے منہ کا مزہ بھی تھوڑی دیر کے لئے بدل دیں۔

(۱)

بلوری چوڑیوں نے کھنکھناہٹ سے پوچھا
"میں خوبصورت ہوں کہ تو....؟؟"
عود کا دھواں آگ کے بستر سے پریشان ہو کر اٹھا
ہوا میں سانپ کی طرح اس نے بل کھا کر کہا
"تو میرے سینے کا راز ہے یا میں؟"
فرشتے آسمان کی ہلکی پھلکی فضاؤں میں پر تول کر رہ گئے
ابر بہار نے خزاں کی مٹھی کھولی اور بلند درختوں سے سرگوشیاں شروع کر دیں
طلوع آفتاب کی آڑی ترچھی کرنوں کے شور سے اندھیرا گھبرا کر اٹھا
اور بھاگ گیا۔

(۲)

گاگر نے چھلکتے ہوئے پانی سے کہا
"تو اتنا بے صبر کیوں ہے؟"
گھونگھٹ کے نیچے ایک کنوارے چہرے پر نہ معلوم کتنے رنگ آئے اور چلے گئے
سوسن کے پھولوں میں شہد کی بھوری مکھیاں پڑی اونگتی رہیں
آس۔ شبنم کی بوندوں کی مانند اس کے دل پر ٹپک رہی تھی
دروازے نے ہولے سے آہ بھری اور دہلیز کے ساتھ بغل گیر ہو گیا
تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پر ایک کپکپی منجمد ہوتے ہوتے رہ گئی
(یہ دونوں نظمیں سعادت حسن منٹو کی ہیں' اور اب ان پر منٹو کا تبصرہ یا تجزیہ پڑھیں)

"یہ نثری شاعری کا ایک نہایت ہی لطیف نمونہ ہے' چند سطروں میں زندگی کا تمام رس نچوڑ کر بھر دیا گیا ہے پہلی سطور میں تصوف کا رنگ ہے۔ بلوری چوڑیوں کا اپنی کھنکھناہٹ سے پوچھنا...... میں خوبصورت ہوں کہ تو؟........ کتنا اچھوتا خیال ہے اور تصور کے چہرے پر سے یہ نقاب کو کس دلکش انداز سے اٹھاتا ہے۔ شاعر کا سینہ قدرت کی رنگینیوں سے معمور ہے' وہ

فرشتوں تک پہنچتا ہے' مگر فوراً ہی زمین پر ابر بہار اور بلند درختوں کی سرگوشیاں سننے کے لئے دوڑتا ہے۔ نیچرپت کا ایسا نمونہ ہندوستانی شاعری میں ملنا محال ہے۔ اور ان کی قید سے آزاد یہ "نثری نظم" دیہاتوں میں چلنے والی ہوا کے مانند ہلکی پھلکی اور معطر ہے۔ اس میں زندگی ہے اور اس زندگی کے اندر حرکت ہے' ایک لطیف حرکت' ایک پیارا ارتعاش' ایسا ارتعاش جو کنواری لڑکیوں کے جسم پر طاری ہوا کرتا ہے۔"

" الفاظ کی نشست برخاست بہت اچھی ہے۔ موزونیت بھی بہت عمدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوا ہے کہ اس "نثری نظم" کے خالق نے دلہن کی ساڑھی میں تارے بڑی احتیاط سے ٹانکے ہیں۔ ہر ایک لفظ چمکتا ہوا لیکن یہ چمک خیرہ کن نہیں۔ آنکھوں کو کھلتی نہیں۔ بہت پیاری معلوم ہوتی ہے اس نظم پر اس طرح اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ہر ایک لفظ کے کئی کئی معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ "نثری نظم" محض "دماغی عیاشی" ہے لکھتے وقت اس کے مصنف کے پیش نظر صرف یہ بات تھی کہ لفظ خوبصورت ہوں' اور ان کی ترتیب بھی سندر ہو' مطلب کچھ نہ ہو۔ چنانچہ یہ نظم پڑھنے کے بعد مزا تو آجائے گا مگر مطلب ہرگز سمجھ میں نہیں آئے گا کیونکہ یہ اس غرض سے لکھی ہی نہیں گئی۔ یہ "نظم" میں نے لکھی ہے اور اس پر میں نے صرف ریمارک صرف کئے ہیں۔" (یعنی سعادت حسن منٹو نے)

" ہندوستان میں ایسی نظموں کا فیشن عام ہوگیا ہے۔ یورپ کا لٹریچر چونکہ بہت وزنی ہو چکا ہے اس لئے لوگوں نے اس قسم کی ہلکی پھلکی نثری شاعری کی طرف توجہ دی اور یورپ کا قاری جو کہ بوجھل افکار سے تنگ آچکا تھا ایسی نظموں کا دلدادہ ہوگیا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی لٹریچر میں یہ "ادب لطیف" داخل ہوگیا۔"

" ہندوستان چونکہ تقلید کا شروع سے عادی ہے اس لئے اس کے ادب نے اس نئی قسم کی شاعری کو قبول کرلیا۔"

(ماخوذ۔ منٹو کے مضامین مطبوعہ ۴۲ء)

آج کل جو "نثری نظم" لکھی جاتی ہے اس پر توفانی کا یہ شعر صادق آتا ہے (تصرف کے ساتھ)

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
"شاعری" کاہے کو ہے خواب دیوانے کا

دیکھئے' یہ خواب..... ہمارے ادب میں کب معتبر ہوتا ہے یا تعبیر دکھاتا ہے۔ "ہائیکو" کے سلسلے میں بھی متضاد رائیں ہیں ابھی تک اس کی ہیئت پر ہی لوگ متفق نہیں ہوئے ہیں۔ یہاں جاپان کونسلیٹ میں جو مشاعرے ہوتے ہیں اور شعراء کو "نذرانے" پیش کئے جاتے ہیں تو اس شرط کے ساتھ کہ 5-7-5 (سلے بلز) پر لکھ کر لائیں ورنہ زحمت نہ فرمائیں۔ مگر ہمارے ادبی رسائل میں جو ہائیکو شائع ہو رہے ہے اور جو کتابیں آئے دن چھپ رہی ہیں وہ اس فارم کی بالکل پابند نہیں۔

ہم تو ہر طرح کے چھوٹے بڑے یا مساوی مصرعے لکھ رہے ہیں اور ان کو ہائیکو کا نام دے رہے ہیں۔ اگر کوئی "رباعی" کے ساتھ یہ حرکت کرے یا سانیٹ میں ۱۴ کے بجائے کم یا زیادہ مصرعے لکھ دے اور ان کی ترتیب بھی بدل دے.....یا تین مصرعوں کے ترائیلے لکھ دے جیسا کہ ہندوستان میں کسی ناواقف شاعر نے لکھے اور جنہیں پڑھ کر ڈاکٹر انور سدید نے انہیں ترائیلے' سمجھ لیا (بحوالہ مختصر تاریخ اردو ادب صفحہ ۵۳۹)

اطلاعاً عرض ہے کہ ترائیلے فرانسیسی صنف سخن ہے اور اس میں ۸ لائنیں (مصرعے) ہوتی ہیں جن میں پہلا مصرعہ ہر دو

مصرعوں کے بعد دہرایا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر تین بار۔ اس طرح دوسرا مصرعہ دو بار دہرایا جاتا ہے اس کے علاوہ مفرد مصرعے ہوتے ہیں۔ یہ ایک مشکل صنف ہے اور مخصوص تکنیک کی پابند (سانیٹ کی طرح)

سمجھ میں نہیں آتا ہم اپنی لا علمی کو کب تک "جدت" کا نام دیتے رہیں گے۔ اور اس کی بنیاد پر "نام نہاد" تخلیقی تجربے کرتے رہیں گے۔ ہمارے کتنے شاعر باضابطہ فرانسیسی، جاپانی اور جرمن زبانیں جانتے ہیں "ان کی موسیقی اور شاعری کے آہنگ کو سمجھتے ہیں" ہماری شاعری میں تو "رباعیاں" تک غلط لکھی جاتی ہیں اس لئے کہ اس کی مخصوص بحروں سے ہمیں واقفیت نہیں ہے، ہندی حتیٰ کہ پنجابی تک ہم نہیں جانتے۔ ہندی اور پنجابی شاعری کے ماہروں نے ہمارے دوہوں کو قبول کیا نہ ماہیوں کو.... کیا جاپان والے ہمارے "اوٹ پٹانگ ہائیکو" قبول کرلیں گے؟ فنون کے مئی تا اکتوبر ۹۴ء کے شمارے میں مرزا حامد بیگ کا مضمون "ہائیکو" کے بارے میں آپ کی نظر سے گزرا ہوگا وہ صاحب علم آدمی ہیں۔ اچھا تجزیہ کیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم پہلے دوسروں کے ادب کو جانیں اور پھر اپنائیں ورنہ خیالات پر ہی اکتفا کریں اور ہوسکے تو انہیں بھی اقبال، فراق اور فیض کی طرح اپنی شاعری میں اپنے "آداب اظہار" کے ساتھ برتیں ورنہ وقت انہیں بھی رد کردے گا۔ (دوسروں کی اصناف ہمارے پاس امانت کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں تصرف "خیانت" کے مترادف ہے) ۔ "ہائیکو" نگاری کی اولین شرط 5-7-5 (سلے بلز) ہیں۔ ارکان نہیں۔ سلے بلز صرف دو حرفوں یا دو صوتی اکائی کا نام ہے۔ جاننے والے کہتے ہیں کہ (فعلن فعلن فع) قریب تر بحر ہے اور اس میں بھی فع کو فعل (سہ حرفی) نہیں باندھا جاسکتا۔ ہندوستانی شعراء نے اردو (عربی) کی مختلف بحروں کے "ارکان" پر ہائیکو لکھنے کی کوشش کی جو غلط ہے۔ (ترائیلے) کی طرح.... ترائلے بھی تین مصرعوں کی صنف نہیں۔ اس صنف کے "صوتی تلفظ" سے کچھ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے۔ اس میں چونکہ ایک مصرعہ تین بار دہرایا جاتا ہے اس لئے بھی دھوکا ہوا۔ تقلیدی مزاج تحقیقی بھی نہیں ہوتا، بس مکھی پر مکھی مارنے پر لگا رہتا ہے۔ رد و قبول میں تحقیق بھی ضروری ہوتی ہے۔ آپ نے "ہائیکو نمبر" میں دو ایک مضامین ایسے بھی چھاپے ہیں جنہیں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ "ہائیکو نمبر" بھیجنے کا ایک بار پھر شکریہ۔ امید ہے کہ بخیر ہوں گی۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ خط چھاپ دیں شاید یہ بات آگے چلے اور میری بھی رہنمائی ہوجائے۔

مخلص، حمایت علی شاعر

(مطبوعہ "تجدید نو" افسانہ نمبر۔ نومبر ۹۵ء)

گنبد کی طرح دوش پہ رکھے ہوئے ہیں سر
جسموں کی مقبروں میں دریچے نہ جالیاں

بیٹھے ہوئے زمیں پہ جنگل میں ہیں مگن
وہ جانور جو چڑھ نہیں سکتے درخت پر

(ریڈیو' ٹیلیویژن اور فلم)

(صدا کاری' اداکاری' شاعری' ڈرامہ نگاری' فلمی نغمہ نگاری' منظرنامہ نگاری' مکالمہ نویسی' فلم سازی ہدایت کاری)

اور

تنقید' تحقیق' تدریس

حمایت علی شاعر نے ریڈیو پر ایک طویل عرصہ خدمات انجام دی ہیں۔ (۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۲ء) اس دوران انہوں نے بے شمار چیزیں لکھیں جن میں سے بیشتر ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ریڈیو کی تحریریں عام طور پر "وقتی ضرورت" کے تحت لکھی جاتی ہیں اس لئے محفوظ بھی نہیں رکھی جاتیں۔ مگر وہ تخلیقات جو ادبی تقاضوں کے اعتبار سے "مستقل اقدار" کی حامل ہوتی ہیں وہ کسی بھی اہل قلم ایک "کارنامہ" سمجھی جاسکتی ہیں۔ ہمارے ادب میں ایسی کئی مثالیں شامل ہیں۔

حمایت علی شاعر نے نغموں اور گیتوں کی علاوہ عنائیے' منظوم و منثور' (طبع زاد) ڈرامے' لوک کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل اور اسٹیج ڈرامے بھی لکھے۔ مگر وہ صرف نشر ہوکر یا اسٹیج ہو کر رہ گئے۔ (کاش چھپ بھی جاتے۔) ان میں صرف ایک منظوم ڈرامہ "شکست کی آواز" شائع ہو گا۔ (فنون۔ لاہور) نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ تحریریں ضائع ہوگئیں اور کچھ ان کے دوست قاصد عزیز اور فرزند اوج کمال کی کوششوں سے ریڈیو کی لائبریری اور بعض صداکاروں اور فن کاروں سے دستیاب ہوگئیں اور اب حمایت صاحب کی لائبریری میں محفوظ ہیں مثلاً"

سندھ کی لوک کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل (۱) سسی پنھوں (۲) نوری جام تماچی (۳) سورٹھ رائے ڈیاچ (۴) لیلاں چینسر (۵) عمر ماروی (منظوم) (۶) مومل رانو (منظوم)

منظوم ڈرامے۔ (۱) شکست کی آواز (۲) دستک (۳) بازی گر' عنائیے (۱) کلفٹن کی ایک شام (۲) نوید انقلاب

نثری ڈرامے (۱) برزخ (۲) بگولا (۳) فاصلے (۴) دشمن آسمان اپنا (۵) پتھر کی لکیر (۶) مٹھی بھر مٹی (۷) موت کا ایک دن معین ہے (۸) آخری چٹان (نسیم حجازی کے ناول کی ڈرامائی تشکیل)

اسٹیج ڈرامہ۔ اندھیرے اجالے (کہانی۔ ارشاد علی۔ مکالمے۔ حمایت علی شاعر)

حمایت علی شاعر نے ریڈیو کے کئی ڈراموں میں صداکاری بھی کی ہے جن میں "انار کلی" (امتیاز علی تاج) کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اس ڈرامے میں اکبر اعظم کا کردار زیڈ اے بخاری نے ادا کیا تھا۔ اور باقی کرداروں میں (شہزادہ سلیم) حمایت علی شاعر (انار کلی) مشہور شاعرہ سحاب قزلباش (دلا رام) فاطمہ خام (ثریا) نیر جہاں (امریکہ) اور آغا حشر کاشمری کے اسٹیج آرٹسٹ عبدالرحمان کابلی اور مغل بشر نے بھی دو اہم کردار ادا کئے تھے۔ یہ ڈرامہ ۱۹۵۳ یا ۱۹۵۴ء میں ریڈیو پاکستان کراچی سے دو اقساط میں نشر ہوا تھا۔ اس کے پروڈیوسر شمس الدین بٹ اور ہدایت کار احمد عبدالقیوم (عارف) تھے۔

اسٹیج ڈرامہ "اندھیرے اجالے" میں بھی ایک باغی نوجوان "شریف" کا کردار حمایت علی شاعر نے ادا کیا تھا۔ دوسرے اداکاروں میں محمد علی (فلم اسٹار) مصطفیٰ قریشی (فلم اسٹار) عثمان عرفانی (صحافی اور افسانہ نگار) طاہر رضوی (شاعر اور ٹی وی پروڈیوسر) قاصد عزیز (شاعر) ارشاد علی (افسانہ نگار) پروفیسر مختار سحر (شاعر) اور محسن بھوپالی (شاعر) وغیرہ شامل تھے۔ یہ ڈرامہ حیدرآباد کی ثقافتی انجمن "ارژنگ" کے زیر اہتمام ۲۱ دسمبر ۵۹ء کو اسٹیج کیا گیا تھا' جس کے صدر پنجابی زبان کے مشہور ادیب اور ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے ڈائریکٹر سجاد حیدر اور جنرل سیکرٹری نایاب حسین تھے (یہ ڈرامہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے بھی نشر کیا گیا)

ٹی وی پلے (پھول۔ چہرہ اور آنکھیں) میں بھی حمایت علی شاعر نے مرکزی کردار (ایک فوجی افسر جس کا چہرہ جھلس گیا تھا) ادا کیا تھا۔ یہ ڈرامہ جنگ کے پس منظر میں ڈاکٹر انور سجاد نے لکھا تھا۔ اس ڈرامے میں پنجاب کی مشہور سیاسی رہنما مہ ناز رفیع کے علاوہ ڈاکٹر خالد سعید بٹ اور کچھ فلم آرٹسٹوں نے بھی کام کیا تھا اس کے پروڈیوسر اور ہدایت کار آغا ناصر تھے۔

عالمی جنگ اور امن کے موضوع پر حمایت علی شاعر کی مشہور طویل افسانوی نظم "بنگال سے کوریا تک" بھی "ارژنگ" کے زیر اہتمام ۱۳ نومبر ۱۹۵۹ء کو سندھ یونیورسٹی کے اسٹیج پر "ٹیبلو یا مونولاگ" کی صورت میں پیش کی گئی تھی جس میں مرکزی کردار حمایت صاحب نے ادا کیا تھا۔ (یہ نظم دوسری بار طاہر رضوی نے پیش کی تھی جس میں مرکزی کردار انہوں نے خود ادا کیا تھا)

ریڈیو' ٹیلی وژن اور فلم کے علاوہ سندھ یونیورسٹی میں ان کی تدریسی خدمات کا مختصر احوال مرزا سلیم بیگ کے مضمون "احوال واقعی" (جو حیدرآباد سندھ میں کچھ لکھنے والوں کی "ادبی سیاست" کے بارے میں ایک مستند تاریخی دستاویز "احوال واقعی" مطبوعہ مکتبہ "نئی قدریں" حیدرآباد ۱۹۹۴ء سے ماخوذ ہے) اور "رو میں ہے رخش عمر......" (Bio-Data) میں بھی دے دیا گیا ہے۔

ٹیلی وژن

عقیدت کا سفر

(اردو میں نعتیہ شاعری کے سات سو سال)

حمایت علی شاعر

تاریخ ہمیشہ تحقیق طلب ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پیش منظر میں جو کچھ ہوتا ہے' پس منظر میں اکثر نہیں ہوتا' پیش و پس کا یہ تضاد' حقیقت کی جستجو کرنے والوں کو عموماً " پس و پیش میں مبتلا رکھتا ہے۔ وہ کبھی اپنی آنکھوں کی گرد صاف کرتے ہیں اور کبھی وقت کی.... لیکن وقت کی گرد ایسی نہیں ہوتی کہ پلکوں سے صاف ہو جائے۔

اس لئے تاریخ کا مطالعہ بین السطور میں کیا جاتا ہے۔ لفظ کا پردہ اٹھا کر معنی کے خط و خال دیکھے اور پرکھے جاتے ہیں۔

اس آئینے میں جب ہم عہد بہ عہد اپنے ماضی کے خطوط دیکھتے ہیں تو ہر خط اپنے مخصوص دور کی کوئی نہ کوئی شکل بناتا نظر آتا ہے۔ یہ شکلیں نقطوں اور زاویوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہیں اور انہیں سے اس عہد کا گراف بنتا ہے۔

نعتیہ شاعری بھی اپنے اپنے عہد کے مذہبی گراف کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس گراف کے محرکات میں جہاں کسی قوم اور کسی ملک کی جغرافیائی خصوصیات شامل ہوتی ہیں وہیں تاریخ کی گود میں پرورش پانے والی تہذیبی اقدار بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہیں اس کے علاوہ اس مخصوص دور کی وہ سیاسی حکمت عملی بھی جو "رموز مملکت خویش خسرواں دانند" کے پردے میں کارفرما ہوتی ہے۔

ہمارے عمومی عقائد میں عجمی طرز فکر کا نفوذ ہو یا ہندوستانی صنمیت کے اثرات...... بنیادی رمز یہی ہے کہ ہمارا معاشرہ تاریخ کے بہاؤ میں اپنی بدلتی ہوئی اقدار کو مقامی روایات سے بالکلیہ جدا نہیں کرسکا (اور شاید یہ ممکن بھی نہیں) ظاہر ہے کہ شاعری جو معاشرے کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ کس طرح اس خون سے بے رشتہ ہو سکتی ہے جو صدیوں سے اس کی رگوں میں گردش کر رہا ہے۔

شاعری تو حسن تخیل کا وہ طلسم ہے جو اکثر اپنے عہد کے تنقیدی شعور کو بھی کچھ دیر کے لئے مبہوت کر دیتی ہے اور حواس کی بیداری کے باوجود روح میں در آتی ہے اور جب صورت حال یہ ہو کہ دینی مکتبہ ہائے فکر بھی اپنے ذیلی تضادات میں الجھے ہوئے ہوں......... شاعری میں ان کا جگہ نہ پانا' ایک غیر فطری عمل ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر نعت گو شعراء اپنے عقیدے کے بنیادی مثلث (Triangle) پر ایمان رکھنے کے باوجود ارتفاع اور عمق کی تلاش میں کہیں زاویہ' قائم کو حادہ اور کہیں حادہ کو منفرجہ بنا دینے کے مرتکب نظر آتے ہیں۔ یہ ارتکاب لاکھ جذباتی سہی مگر توجہ طلب ضرور ہے۔

توجہ طلب یوں کہ اسلام میں خدا' قرآن اور رسول کا مثلث جن حدود کا تعین کرتا ہے وہ اصول فطرت کے عین مطابق ہے۔ فطرت' اسی معنی میں مسلمان ہے کہ ہمیشہ اپنی حد میں رہتی ہے اور اپنے حدود میں رہ کر لامحدود کے امکانات کا سراغ دیتی ہے۔

میں نے اردو کی سات سو سالہ نعتیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی ہے کہ تخیل کی بلند پروازی اکثر مقامات پر حد سے متجاوز ہو گئی ہے۔ مجھ پر چونکہ اس کے محرکات بھی روشن تھے اس لئے حیرت تو نہیں ہوئی البتہ عرفی کا یہ شعر بہت یاد آتا رہا۔

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحراست
آہستہ بنہ بر دم تیغ است قدم را

اس گفتگو سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ جو سوالات میرے ذہن میں ابھرتے ہیں ان سے آپ بھی اتفاق کریں۔ ہر شخص کا اپنا زاویہ نگاہ ہوتا ہے جو اپنے عہد کی آگہی کے آئینے میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔
میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ہر عمارت ایک بنیاد پر اٹھائی جاتی ہے اس لئے بنیاد سے ہٹ کر جو بھی تعمیر ہوگی وہ دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرے گی۔ بنیاد، روح کو یقین عطا کرتی ہے اور یقین، ایمان کا حرف اول ہے۔
میرے پیش نظر یہ حدیث بھی ہے کہ
(جس نے میرے متعلق قصداً جھوٹ بات کہی تو وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے)
اس کے علاوہ سب سے اہم نکتہ جو قرآن حکیم کے مطالعے سے نمایاں ہوتا ہے وہ شخصیت کی عظمت میں "عبدیت" کا تعین اور اسکی اہمیت پر اصرار ہے
(وہ پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے "بندے" کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کو گھیر رکھا ہماری برکت نے تاکہ دکھلائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے)
یہ "عبدیت" کا نقطہ عروج ہے جو "معراج" کی معرفت "انسان" کو خدا کے قرب کی عظمت نصیب کرتا ہے۔
یہی عظمت ہمیں "بشریت" پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے علامہ اقبال نے اس نکتے پر مروجہ مذہبی عقائد کے بجائے سائنسی انداز میں سوچا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور اس مقام ارتقاء کا ادراک حاصل کرکے یہ فیصلہ دیا کہ

متاع بے بہا ہے، درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

ان کے نزدیک "عبدیت" بشریت کی اکملیت کا استعارہ ہے۔ وہ مقام بندگی میں بھی وہی عظمت محسوس کرتے ہیں جو شان خداوندی میں ہے۔ اس طرح وہ دونوں کی فردیت کو متعین کرتے ہوئے اپنے اپنے مقام پر محفوظ رکھتے ہیں اور کسی اکائی کو دوسری اکائی میں ضم نہیں ہونے دیتے۔
اکائیوں کے انضمام کا تصور بنیادی طور پر اسلامی نہیں ہے، یہ نوفلاطونیت کے زیر اثر وحدت الوجود کے واسطے سے اسلامی

فکر کا حصہ بنا اور ہندوستان میں ویدانت سے مصالحت کی راہ ہموار کی۔ بہرحال اسلامی فکر کی نئی تشکیل میں عہد بہ عہد جو بھی عوامل کار فرما رہے ہوں، حاصل کلام یہ ہے کہ ہندوستانی مسلم معاشرے میں ذیلی اور روایتی عقائد کا پھیلاؤ ہوتا گیا اور "وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا" کے مصداق نعتیہ شاعری میں بھی انہیں خیالات کا ظہور ہوا اور شاعری کے بادشاہی کے زیر اثر پروان چڑھنے کے سبب نعتیہ انداز سخن میں بھی قصیدہ نگاری کی بدعتیں پیدا ہوگئیں اور رفتہ رفتہ اسلامی فکر کا وہ مجتہدانہ عنصر ہیں پس منظر میں چلا گیا جسے پیش منظر میں قدر اول کی حیثیت حاصل تھی۔

علامہ اقبال نے اسی حقیقت کے پیش نظر اکائیوں کے انضمام سے گریز کیا اور فردیت کی بقا کے لئے "خودی" کی بنیاد فراہم کی لیکن ان کے ہاں خودی کا تصور جامد نہیں بلکہ متحرک اور ارتقا پذیر ہے۔ اس میں یہ ارتقائی عمل دوسری اکائی میں ضم ہونے کے لئے نہیں بلکہ اپنی تکمیل کے لئے جاری رہتا ہے۔ اس طرح قرآن حکیم نے "تسخیر کائنات" کا جو فرض انسان کو سونپا ہے اس کی بجا آوری کے لئے وہ مسلسل آگے بڑھتا ہے اور "عبدیت" کے منصب پر فائز رہ کر حیات و کائنات کے اسرار دریافت کرتا رہتا ہے۔ خدا سے قریب تر ہونے کی کوشش اسے نگاہ قدرت میں باوقار اور محبت کے قابل بناتی ہے اور وہ خدا کا "محبوب بندہ" ہوجاتا ہے یہاں تک کہ۔

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

عالم انسانیت میں یہ افضل و برتر مقام صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو حاصل ہے اور ہمارے لئے رہنمائی کے چراغ انہیں کے نقش کف پا ہیں۔

وہ علم اول جو حضرت آدم کی معرفت خدا نے انسان اور صرف انسان کو عطا کیا ہے۔ غور کیا جائے تو "امی تا اقراء" اسی علم اول کے استعارے کی بازگشت ہے اور آنحضرت کا سینہ اقدس (جس میں قرآن اتارا گیا) اسی علم کا شہر ہے جو دونوں عالم کے لئے رحمت بنا کر ہمارے درمیان آباد کیا گیا تاکہ ہمارے دل و دماغ پر آگہی کے دروازے کھول دیئے جائیں اور ہم عہد بہ عہد اپنی مجتہدانہ فکر اور مجتہدانہ عمل سے (جسے میں سائنسی علوم سے تعبیر کرتا ہوں) بشریت کے اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کریں جو "عبدیت" کا منتہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فکر و عمل سے یہ نکتہ ہم اسی وقت اخذ کرسکتے ہیں جب ہمیں ان کی شخصیت کی عظمت کا معنوی ادراک حاصل ہو۔

ہمارے بیشتر نعت گو شعراء میں اسی ادراک کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے اپنی تمام تر محبت اور عقیدت کے باوجود عموماً رسمی اور سطحی سا ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ خود غرضانہ اور جامد فردیت یعنی نفسی نفسی کا شکار ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

ہمارے عہد کی خوش نصیبی ہے کہ اقبال جیسا شاعر ہمیں نصیب ہوا جس نے مذہبی عقائد پر بھی ہمیں سائنسی انداز میں سوچنے کا حوصلہ دیا اور ایسی نعتیہ فکر عطا کی جو شخصیت کے معنوی ادراک کا دربار کرتی ہے اور ہمارے شعور پر رسول اکرم کی عظمت کے نئے افق روشن کرتی ہے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

میرا موضوع چونکہ نعتیہ شاعری کا عہد بہ عہد محاکمہ نہیں تھا اس لئے میں نے صرف نعتوں کا انتخاب کردیا ہے۔ اور ایک لحاظ سے محدود اور محتاط۔ صرف مرحوم شعراء کو منتخب کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ۱۹۷۸ء تک نمائندگی ہوجائے۔ شعراء کی ترتیب بھی بہ اعتبار وفات قائم کی ہے۔

(مطبوعہ "صریر خامہ" نعت نمبر۔ شعبہ اردو۔ سندھ یونیورسٹی۔ جام شورو' مرتبہ حمایت علی شاعر ۱۹۷۸ء)

ٹی وی پر یہ پروگرام اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء میں پیش کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے اور بعد ریڈیو پاکستان کراچی سے بھی نشر ہوتا رہا

○

شمیم حسین قادری

سابق (چیف جسٹس)' لاہور

۱۶-۱-۸۹ء

جناب محترم حمایت علی شاعر اسلام علیکم

دسمبر کے ماہ میں "عقیدت کے سفر" میں آپ کے پروگرام جو اسلام آباد سے ہوتا ہے محمد فاضل دین۔ غلام قادر۔ سید حسن شاہ "بٹالہ" ضلع گورداس پور۔ مشرقی پنجاب کے بارے میں آپ کی تحقیق سے ان کے ملفوظات اور مکتوبات کی آپ نے تعداد اور ان کے نام بھی کچھ پیش کئے اور ان کے کلام کے حصے بھی سنائے۔ میں اس سلسلہ قادریہ جس کے بانی بٹالہ میں' جو اس وقت تعلیم اور تدریس کا ایک اعلیٰ مقام تھا' سے وابسطہ ہوں اور اس سلسلہ کے حضرات کے متعلق ایک کتاب لکھنے میں مصروف ہوں۔ بہت مشکل سے آپ کا ٹیلی فون اسلام آباد سے حاصل کیا اور پھر گزشتہ ماہ آپ کو ٹیلی فون کراچی کیا۔ معلوم ہوا کہ آپ امریکہ تشریف لے گئے ہیں آپ کے پسر نے یہ بات بتلائی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا اور ان سے بھی فرمائش کی کہ اپنی اس تحقیق سے مجھے بھی سرفراز فرمایئے تاکہ زیر تالیف کتاب میں اسے آپ کی نسبت سے طبع کرادوں۔ دو کتب پہلے میری چھپ چکی ہیں Creation of Pakistan اور "اسلامی ریاست' قرآن و سنت کی روشنی میں" اول واجد علی والحسین لاہور نے چھاپی ہے اور ۱۹۸۲ء میں طبع ہوئی۔ ملک کی لائبریریوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم طلبا اسے Text-Book کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دوسری کتاب علماء اکیڈمی محکمہ اوقاف کی جانب سے ۱۹۸۴ء میں طبع کرائی ہے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ آپ اس نیک کام میں میری راہ نمائی فرمائیں گے۔ شکر گزار مخلص سید شمیم حسین قادری

(ریڈیو' ٹیلی وژن اور فلم کے

اس طرح علم و فن کے درمیان "مصنوعی درجات" قائم کرنے کی وہ "روایت" جو ہندوستان کی "برہمنی ذہنیت" کے زیر اثر اردو تہذیب و ادب میں در آئی ہے اور ہم "اردو اہل قلم" کو برتری اور کمتری کے مصنوعی معیارات میں مبتلا کئے ہوئے ہیں...... ٹوٹ جاتی ہے اور اہل علم و فن و ادب کا سلسلہ اردو شاعری کے "جد اعلیٰ" حضرت امیر خسروؒ سے ملادیتی ہے جو بیک وقت بڑے دانشور' صوفی' شاعر اور موسیقار ہی نہیں بلکہ مختلف راگوں (ایمن کلیان وغیرہ) اور مختلف سازوں (ستار اور طبلہ) کے موجد تھے۔

ہندوستان اور پاکستان کے چند باشعور اہل قلم نے امیر خسرو کی اس روایت کا پاس بھی کیا ہے ان کے نزدیک تمام "فنون لطیفہ" قابل احترام رہے۔ شاہد احمد دہلوی (موسیقار) سعادت حسن منٹو' اپندر ناتھ اشک' راجہ مہدی علی خان (اداکار فلم۔ آٹھ دن) مخدوم محی الدین' مرزا ظفر الحسن' شوکت تھانوی' ڈاکٹر انور سجاد اور بے شمار ادیبوں اور شاعروں نے اسٹیج' ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں صداکاری اور اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ہماری علاقائی زبانوں کے سبھی شعراء موسیقی آشنا تھے۔ انہوں نے اپنے کلام کی دھنیں خود مرتب کی تھیں۔ صرف اردو شعراء میں حسرت و آرزو کے باوجود دوسرے فنون سے گریز کی روش عام ہے اور اس کو وہ "شان امتیاز" سمجھتے ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنا "لوک ورثہ" (پوربی بھاشا اور دکنی) کو کمتر سمجھ کر ترک کردیا (مرتب)

خوشبو کا سفر

(ٹیلی وژن (کراچی) کا سلسلہ وار پروگرام (۱۹۸۸ء) جس میں پاکستان کے ان شعراء کا اردو کلام پیش کیا گیا جن کی مادری زبان اردو نہیں اور جو گزشتہ پانچ سو برس سے اردو میں لکھ رہے ہیں)

(پیش لفظ)

پاکستان نہ صرف ایک ملک اور ایک قوم کی جغرافیائی وحدت کا اسم خاص ہے بلکہ اپنی تاریخ کے پس منظر میں اس تہذیبی اور ثقافتی ہم آہنگی کا بھی استعارہ ہے جو مختلف اللسان ہونے کے باوجود ایک اکائی بھی رکھتا ہے اور اس اکائی کا نام ہے...... اردو

تازہ تر لسانی تحقیقات سے بھی ثابت ہے کہ اردو زبان کا مبداء پاکستان ہے اور اس کی جڑیں پاکستان کی علاقائی زبانوں میں رگ جاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ ادب و شعر کے مختلف روپ، خواہ وہ کسی لسانی خدوخال کے ساتھ قلم پذیر ہوئے ہوں اس تاریخی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔ ان میں رسم الخط اور حرف و صوت کی یگانگت نہ صرف ایک شجرۂ تہذیب کا اشاریہ ہے بلکہ (فنون لطیفہ کے تخلیقی عمل میں) جذبہ و احساس اور فکر و وجداں کی ہم آہنگی رویے کی ایک مکمل وحدت کا کنایہ بھی۔ مختلف زاویوں سے سفر کرکے جب ہم ان خطوط کے نقطۂ اتصال پر پہنچتے ہیں تو ہمیں...... اردو۔ چوراہے پر ایستادہ ایک ایسا "سنگ میل" نظر آتی ہے جو مختلف سمتوں میں نہ صرف ہماری رہنمائی کرتا ہے بلکہ مختلف راستوں سے مل کر ایک چوپال کی صورت بھی اختیار کرجاتا ہے۔ اسی چوپال میں ہماری پنچایت جمی ہوئی ہے اور اس کا دوسرا نام...... پاکستان ہے۔

ہماری یہ دوربینی کہ اردو کی آبیاری کے تجسس میں ہم نے اب تک گنگا و جمنا سے لے کر گوداوری تک کے پانیوں کی خاک چھانی اور بلاشبہ بڑے آبدار موتی دریافت کئے۔ لیکن اس بے نیازی کو کیا کہئے کہ ہماری زبان آج تک اس آب رواں کی لذت سے ناآشنا یا کم آشنا ہے جو راوی و مہران کی صورت گزشتہ سات سو برس سے ہماری رگوں میں موجزن ہے۔

کیا اچھا ہوتا اگر قیام پاکستان کے بعد ہم اپنی وطنی اور قومی وحدت کا تاریخ کے پس منظر میں مطالعہ کرتے اور اپنی تمام تر علی وسعتوں کے ساتھ اپنے قومی تشخص کا بھی تعین کرتے اور اسی ضمن میں پاکستانی قوم کے اس لسانی سفر کا بھی جائزہ لیتے جو اردو کی ہمرکابی میں صدیوں طے ہوا ہے۔ ایسی صورت میں شاید وہ خلاء آج ہمیں محسوس نہ ہوتا جو اردو کی زادبوم کے تعلق سے اکثر موضوع بحث رہتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اردو کی وسعتوں میں ہم اپنے اس ماضی کو نظرانداز کردیں جو پاکستان کی جغرافیائی حدود سے باہر کہیں تاریخ میں پھیلا ہوا ہے۔ بلاشبہ وہ بھی ہمارا عظیم ورثہ ہے۔ لیکن اردو کا یہ ورثہ جو ہمارے گھر میں "آنکھ اوجھل" ہے ہماری کم نگاہی کا المیہ نہ بن جائے۔ اس کی اہمیت یوں بھی زیادہ ہے کہ یہ ہمارے ان بزرگوں کی تخلیق ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی اور انہوں نے نہ صرف فارسی اور عربی کی مستعار اصناف سخن میں اردو شاعری کی بلکہ اپنی زبانوں کی مخصوص اصناف سے بھی اردو کو نوازا اور اس طرح اردو کے شعری سرمائے میں قابل قدر صنفی اضافہ کیا۔ انہوں نے اردو میں کافیاں، چاربیتے، حرفی، دوہڑے اور روائیاں وغیرہ کہہ کر اردو کے دامن کو وسیع کیا اور اردو شاعری کو اپنی زمین کی خوشبو سے مہکا دیا۔

قیام پاکستان سے قبل اردو کی جتنی تاریخیں مرتب کی گئیں اور جتنے تذکرے لکھے گئے ان میں زیادہ تر انہیں شعراء کا ذکر ہے جو

اودھ' وسط ہند' یا دکن سے متعلق تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد ہوں کہ رام بابو سکسینہ' پروفیسر حامد حسن قادری ہوں کہ ڈاکٹر اعجاز حسین سبھی نے زیادہ تر انہی علاقوں کے معروف اور غیر معروف شعراء کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقادر سروری' ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور نصیرالدین ہاشمی نے تو خیر دکنی شعراء تک ہی اپنی تحقیق محدود رکھی۔ قیام پاکستان سے قبل اور بعد' مولوی عبدالحق نے بھی ان علاقوں کی طرف نمایاں توجہ نہیں دی جہاں کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ بعد ازاں نظیر لدھیانوی اور سلیم اختر نے بھی اپنی تواریخ میں پاکستان کے قدیم اردو شعراء کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

پاکستان سے قبل البتہ پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" لکھ کر اس کمی کا قدرے ازالہ کیا تھا۔ اور پاکستان بننے کے بعد ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' فارغ بخاری' حبیب کیفی اور ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اپنے اپنے علاقائی حدود میں چند اردو شعراء کا کلام یکجا کیا ہے۔ لیکن یہ کلام بھی بڑی حد تک منتشر اور چیدہ چیدہ ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری' ڈاکٹر حبیب اللہ غضنفر' ڈاکٹر سہیل بخاری' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' ڈاکٹر سید عبداللہ' ڈاکٹر فرمان فتح پوری' ڈاکٹر جمیل جالبی اور دوسرے محققین نے لسانی مسائل پر یقیناً بہت اہم اور فکر انگیز تاریخی کتابیں لکھی ہیں جن سے برصغیر پاک و ہند کی لسانی ہم رشتگی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور خاص طور پر اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء کے بارے میں ان کے نظریات (متنوع اور متضاد ہونے کے باوجود) درک و بصیرت کے نئے امکانات کا سراغ دیتے ہیں۔ لیکن ان کا موضوع بھی بالخصوص پاکستان نہیں۔ اس لئے یہ تمام کتابیں پاکستان کی موجود قومی وحدت کی نئی تشکیل میں ہماری خاطر خواہ رہنمائی نہیں کرتیں اور ان کے مطالعے سے کوئی ایسا نقطہ نظر متعین نہیں ہوتا جس سے اردو کے واسطے سے پاکستان قوم کا بین الصوبائی لسانی تشخص ممکن ہو سکے۔

خدا جانے ہمارے محققین کو یہ خیال کیوں نہ آیا کہ صرف پاکستان کے اردو شعراء کا تذکرہ و تاریخ مرتب کی جائے تاکہ دنیائے ادب' پاکستان کے اردو ادب کو' پاکستان کی تاریخ کی روشنی میں پڑھ سکے۔

یہ حقیقت بہرحال قابل اظہار ہے کہ چھٹی صدی ہجری سے قیام پاکستان یعنی تیرھویں صدی ہجری تک پاکستان میں بے شمار ایسے شاعر گزرے ہیں جو نہ صرف صاحب دیوان ہیں بلکہ جن کی شہرت دکن اور شمالی ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ مثال کے طور پر گیارھویں صدی ہجری کے سندھی شاعر "میر محمود صابر" جو ولی دکنی کے ہم عصر تھے۔ اپنے ایک مقطع میں کہتے ہیں۔

صابر سناہوں قافیہ سنجان ہندسوں
تجھ ریختہ کی دھوم پڑی ہے دکن میں جا

اس کے علاوہ جہاں وہ اپنے ہم عصر شاعروں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں کہ

سن ریختہ ولی کا' دل خوش ہوا ہے صابر کا
حقا ذِکر روشنی ہے انوری کے مانند

وہاں اپنے شعری مرتبے سے بھی بے خبر نہیں ہیں' کہتے ہیں۔

گر ریختہ ولی کا لبریز ہے شکرسوں
مضمون شعر صابر قند و شکر تری ہے

شیخ فرید شکر گنج سے کون واقف نہیں۔ چھٹی صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ ملتان کے قصبہ کھوتوال میں پیدا ہوئے۔ تعلیم بھی ملتان میں پائی اور پاک پٹن میں مدفون ہیں ان سے منسوب جو اردو کلام ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو مفرس ہونے کے باوجود اپنے خدوخال نمایاں کرتی جارہی تھی۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے

پھر یہی خدوخال امیر خسرو کے ہاں اپنے مقامی رنگ روپ کے ساتھ چمکنے لگتے ہیں چونکہ وہ بھی پانچ سال ملتان میں رہے اور اپنی ایک فارسی مثنوی میں بہت سی مقامی خصوصیات، پھل پھول، آب و ہوا، اور دیگر اشیاء کا بڑی محبت اور اپنائیت کے ساتھ ذکر کیا ہے اس لئے ہم انہیں بھی پاکستانی شعراء کی فہرست میں شامل کریں گے۔ اسی طرح حسن سجزی کو بھی جو خسرو کے ہم عصر تھے اور ملتان میں ہم قیام رہے لیکن ان کا اردو کلام چونکہ صرف چند متفرق ابیات تک منسوب ہے اس لئے ان کا تفصیلی ذکر مناسب نہ ہوگا۔

عارضی اقامت گزیں شعراء کے علاوہ مستقل مقامیت رکھنے والے شعراء میں پٹھانوں کی فہرست خاصی طویل ہے ان میں سرفہرست خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے نام ہیں جو اورنگ زیب کے ہم عصر تھے جن میں بالخصوص رحمان بابا کا اردو کلام سرحد میں اردو کی مقبولیت کی زندہ مثال ہے۔

بوصلے تو مارا کجا بات ہے
کہ وصلے تو خیلے بڑی بات ہے

بعد ازاں معزاللہ مہمند "افغان" اور قاسم علی آفریدی ہیں جو ولی کے ہم عصر تھے۔ ان میں "افغان" ولی کے لہجے سے متاثر نظر آتے ہیں۔

جس نے دیکھا روئے تو دیوانہ ہورہا
آئینہ خانہ تجھ سوں پری خانہ ہورہا

لیکن آفریدی کی زبان ولی سے زیادہ شستہ ہے شاید یہ بھی ولی کی طرح شمالی ہند کی شاعری سے متاثر ہوئے اور زبان کا یہ رنگ اختیار کیا۔

ازل سے تا ابد یہ آفریدی ساتھ ہے اس کے
میاں دوستی صاحب سلامت ہو تو ایسی ہو

اسی طرح جب ہم پنجاب اور بلوچستان کے علاقوں میں سفر کرتے ہیں تو ہمیں قدیم اردو شاعری کی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

منم مشتاق دیدارت، اری تک دور کن گھونگھٹ
بجان و دل خریدارت، اری تک دور کن گھونگھٹ
(پنجاب)

عاشق دیوانہ ام' آؤ پیارے حبیب
از ہمہ بیگانہ ام' آؤ پیارے حبیب
(پنجاب)

جن کے حسن کا قرآں پڑھیا ہے میں نظر کر کر
نہیں پائی غلط اس میں' دیکھیا زیر و زبر کر کر
(پنجاب)

آخرالذکر شعر ناصر علی سرہندی کا ہے۔ جو ولی کے ہم عصر تھے لیکن ان میں شاعرانہ نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اس کا ایک حوالہ دیا ہے۔

اچھل کر جا پڑے جوں مصرعہ برق
اگر مصرعہ لکھوں ناصر علی کوں
(ولی)

یہ اعجاز سخن گر اڑ چلے وہ
ولی ہر گز نہ پہنچے گا علی کوں
(ناصر علی سرہندی)

اس میں رعائت لفظی قابل داد ہے اور اس فنکارانہ بندش لفظ اور سادگی بیاں سے پاکستانی شعراء کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔

بلوچستان کی قدیم اردو شاعری میں بھی ہمیں یہ لطف زباں اور خیالی آفرینی جگہ جگہ ملتی ہے مثلاً ملا محمد براہوی کے اردو دیوان کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

خالِ لب تیرا رہزنِ آدم آب بقا کو پنہاں کیا یار نے لبوں میں
دانۂ شاہوار تجھ لب کا ظلمات کی طرف سیں تا حق گیا سکندر

مجلس خوباں میں جب وہ ماہرو نے مئے پیا
لذت اس لعلِ لبِ ساغر سیں پوچھا چاہیئے

یہ وہ زمانہ ہے جب اردو کے اثرات ہمہ گیر ہو چکے تھے اور اردو سے محبت عام ہو چکی تھی لیکن وہ زمانہ جب اردو کے سوتے پاکستان کی علاقائی زبانوں سے پھوٹ رہے تھے۔ اس کے بے شمار امکانات پشتو' پنجابی' سندھی اور بلوچی کے علاوہ ہندکو' پوٹھواری' سرائیکی' براہوی اور گجراتی بلکہ کشمیر شاعری میں بھی اپنا جلوہ دکھا رہے تھے۔ چنانچہ ہر علاقے کا ادبی مورخ اردو کے دل کے دھڑکن اپنے سینے میں محسوس کرتا نظر آتا ہے۔ اور پٹھان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ

"اردو نے پشتو کی کوکھ سے سرحد میں جنم لیا۔ لیکن دکنی' لکھنوی اور دہلوی اناؤں کی آغوش میں پل کر اپنی موروثی خصوصیات کھو بیٹھی۔"

پروفیسر محمود شیرانی اردو کا مولد پنجاب کو قرار دیتے ہیں اور ڈاکٹر سہیل بخاری سرائیکی اور سندھی کی گود میں اس کے بچپن کو نہ صرف ہمکتا ہوا دیکھتے ہیں بلکہ اس کے لبوں پر ان ماؤں کے دودھ کی خوشبو بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے علاقائی شعراء نے "سرکاری زبان نہ ہونے کے باوجود" اردو کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھا اور اردو میں اس اپنائیت اور فخر کے ساتھ شعر کہے گویا اردو انہیں کی زباں ہے

حقیقت میں اردو ہماری زباں ہے (سرحد)

جعفری ہم سے کوئی سیکھے زبان اردو (سرحد)

اور ایک روہیلہ شاعر تو یہاں تک کہتا ہے

شاعر کوئی مجھ ایسا ہوا پورب نہ پچھم میں
دلی میں بھی دیوان مرا چوری گیا ہے

افسوس ہے کہ پاکستان کے بیشتر قدیم اردو شعراء کے دیوان ابھی تک مخطوطات کی شکل میں ہیں اور مختلف افراد اور مختلف کتب خانوں میں خاموش پڑے ہوئے ہیں ان کا باضابطہ مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی بلاشبہ اردو کے بڑے شاعر تھے۔ اور ان کا نام بھی اودھ اور دکن کے بڑے شعراء کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ مزید افسوس کہ پاکستان کے قیام کو ۳۰ سال گزر جانے کے بعد بھی ہمارے طلبا کو نصاب میں پرانی (قیام پاکستان کے قبل کی) ہی تواریخ ادب پڑھائی جاتی ہیں اور پاکستانی قوم آج بھی اپنے مقامی بزرگوں کے ادبی کارناموں سے ناواقف ہے۔

میں نے یہ تذکرہ بڑی تحقیق کے بعد تاریخ وار مرتب کیا ہے۔ اور قدیم پاکستانی شعراء کے اردو کلام کو پیش کرتے ہوئے اودھ اور دکن کے ہم عصر "اردو شعراء" کی مثالیں بھی دی ہیں۔ تاکہ ادب کے طالب علم، تمام شعراء کے تقابلی مطالعے کے ساتھ ساتھ اس خصوصیت سے بھی واقف ہوجائیں کہ پاکستان کی علاقائی نسبتوں کے اثرات سے اردو کے شعری سرمائے میں کس قدر صنفی اور لفظی اضافہ ہوا ہے۔

ان شعراء کے اشعار میں مقامی زبانوں کے وہ الفاظ جو بڑی حد تک اردو کے ہم مزاج ہیں۔ عجیب لطیف پیدا کرتے ہیں اور شعر کی معنوی تعدیلی فضا کو اپنے مخصوص تہذیبی رنگ میں ایک نئی آب دیتے ہیں۔

پاکستان ٹیلی وژن کارپوریشن اس پاکستانی شاعری کا ایک غنائی مطالعہ اپنے اپنے علاقائی سازوں اور دھنوں کی آمیزش کے ساتھ ساتھ پیش کرے تو نہ صرف پاکستانی ادب کی خدمت ہوگی بلکہ ہماری رنگا رنگ قومی وحدت کے انعکاس میں ایک قابل رشک نیا اقدام ہوگا۔

سات سو برس کی تاریخ میں پاکستانی شعراء کی تعداد یوں تو کئی سو ہے لیکن لسانی ارتقا کی منزلیں متعین کرتے ہوئے، میں نے ٹیلی وژن کے اس مخصوص پروگرام کی خاطر (۲۵) شعراء کا کلام مختلف اصناف سخن سے منتخب کیا ہے تاکہ پروگرام کا غنائی تنوع بھی برقرار رہے۔ اور چھٹی صدی ہجری سے قیام پاکستان (تیرھویں صدی ہجری) تک عہد بہ عہد تاریخ کا جائزہ بھی مرتب ہوجائے۔

حمایت علی شاعر

ایک خط

مقبول الٰہی ۵ جولائی ۱۹۸۸ء

سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی باسمہ سبحانہ

جناب شاعر! تسلیمات

میں کئی دنوں سے اس سوچ میں تھا کہ آپ کی خدمت میں آپ کے ۵ جون کے پروگرام "خوشبو کا سفر" سے متاثر ہو کر لکھی ہوئی اپنی نظم بھیجوں یا نہ بھیجوں

آج صبح جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب سے کسی سلسلے میں بات کرنے کا موقع ملا تو اس سلسلے میں بھی ان سے مشورہ لینے کی سوجھی۔ انہوں نے بلا تامل کہا کہ فن کار کی صلاحیتوں کی داد اسے ملنی چاہیئے۔ آپ اپنی نظم (جو ابھی تک میں نے کسی کو دکھائی ہے نہ سنائی) جناب شاعر کو ضرور بھیجیں۔ دوسرا مسئلہ آپ سے قطعی عدم شناسائی کا تھا جس کو ڈاکٹر صاحب نے اہمیت نہ دی۔ اگلی مشکل آپ کے ڈاک کے پتے کی تھی جو انہوں نے با آسانی حل کر دی۔

چنانچہ نظم بے عنوان پیش خدمت ہے۔ اس کا عنوان آپ مرحمت فرمائیں اور اگر وقت مل جائے تو اس کے سقم رفع فرمادیں۔

اس نظم میں جناب مختار صدیقی مرحوم کی بے مثل نظم "راگ درباری بلمپت" کے اقتباسات کی مناسبتوں سے از خود در آئے ہیں۔ اس میں میرے ارادے اور کوشش کو قطعاً دخل نہیں اور نہ ہی ان کی نظم میرے پاس کسی طور پر موجود ہے یہ آپ کی نظر سے ضرور گزری ہوگی۔

"دور زیارت" میرے لئے "دور درشن" کے مترادف ہے۔ "دور درشن" بھی تو فارسی اور ہندی کا مرکب اور اس طرح خالص اردو کا لفظ ہے لیکن یہ ہندوستان میں مروج ہو گیا تو اب اپنے ہاں "دور زیارت" کی ترویج کی گنجائش نہیں رہی۔ ویسے یہ لفظ میرے ذہن میں ہندوستان میں ٹیلی ویژن آنے سے پہلا کا ہے لیکن میں ہوں ہی ایسا۔

پروگرام میں آپ کے تعارفی کلمات ' ان کی ترتیب اور ادائیگی اور گانے والوں کا انتخاب نہایت احسن تھا۔ آپ کا وقت لینے اور نظم میں جو لائینوں کے لئے معذرت خواہ۔

احقر مقبل الٰہی

زیر و بم طبلے کا گونجا\
تو\
نظر چونک اٹھی\
آمد آمد ہے یہ کس شوخ کی\
دیکھیں تو سہی!\
سینکڑوں پردے پہ ہل چل کیسی؟\
کون اس منظر فردوس نما پر ہوگا

جلوہ افگن کہ بقول مختار\
"روشنی تیز ہوئی شمع کی' فانوسوں کی"\
نغمہ خوان' شعلہ بلب' تہمت "اکبر' آیو......"\
مشتری مرمر و نقرہ میں ڈھلی\
پلّو زر تار لبادے کا سنبھالے\
وہ' سبک گام اتری!\
کیسا خوش بخت تھا وہ

پچھلی صدی کا شاعر
"پی کے لے آنے" پہ جس نے تھا کبھی گیت لکھا
جس کے جذبے کی تڑپ
لفظوں میں تحلیل ہوئی
لفظ لے بن کے لپکنے لگے کوندے کی طرح
اور لپک؟
یہ معنی کے نفس میں نئی پیغام صبا
اس کے سینے میں تموج اٹھا
سینے سے آئی گلو میں تو ہوئی شعلہ نوا
گزری ہونٹوں سے، انھیں لعل شفق رنگ کیا
نہ سمٹ پائی نوا میں تو ادائے لرزش
ہوئی بازو میں نہاں اور عیاں ہاتھوں میں
اور لہرائی حنا کی لو میں
زیر کے سنگ وہ مرمر سمٹا
بم کے آہنگ پہ نقرہ ابھرا

حرف پیوست ہوئے لب سے
شفق پھیل گئی
شربتی آنکھوں نے ڈورے ڈالے
کیا قیامت ہے کہ یہ "دور زیارت" کے نقیب
حسن کی نوک پلک کر کے درست
دور لے جاتے ہیں اتنا کہ فقط
ایک نقطہ سا بنا دیتے ہیں
اور رخ رخ جو کبھی کرتے بھی ہیں عکس فشاں
ذوق کی تشنگی کچھ اور بڑھا دیتے ہیں
یہ جو بڑھتی ہے تو
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
گیت کے بول، بلھپت کی طرح
جذبہ ذوق تپاں، لفظوں کا آہنگ و جمال
جیسے آمیز ہوئے سیکری میں زہد و جلال
سنگ سرخ ایسے ہوا موم کہ اس نے پائی
حسن ترتیب رخام،
جس سے اب تک گلے ملتے ہیں فلک سے آکر
روز و شب، صبح و شام
وہ بھی بنام ایام
کانکہ" گیت دتی اور کلا کی چھایا
"جس کا دم بھرتا ہے انسان، ملک، چوپایہ
"روشنی تیز ہوئی"
بجھتی ہوئی آنکھوں کی!
کن تڑپتے ہوئے اجالوں میں مجھے چھوڑ گیا
اے "حمایت" گر فن
تیری "خوشبو کا سفر"
اے "شاعر"

(مقبول الٰہی ۵، ۷، ۱۸ جون ۱۹۸۸ء)

○

دل سے جو ترے غم کے پرستار نہ ہوتے
اس شان سے رسوا سر بازار نہ ہوتے

چلتے نہ اگر ہٹ کے زمانے کی روش سے
ارباب جہاں در پے آزار نہ ہوتے

ہر بت کو خدا کہتے اگر ہم بھی تو یارو
کچھ ہوتے مگر شاعر نادار نہ ہوتے

غزل اس نے چھیڑی

حمایت علی شاعر

(اردو غزل کی سات سو سالہ تاریخ پر پاکستان ٹیلی وژن لاہور کا ایک سلسلہ وار پروگرام...... ۱۹۷۴ء میں نشر کیا گیا)

"جواب آں غزل"

ٹی وی پروگرام "غزل اس نے چھیڑی" کے حوالے سے سجاد رضوی صاحب کا ایک مکتوب اس کالم میں شائع ہوا تھا۔ حمایت علی شاعر صاحب اس پر بہت برہم ہوئے ہیں۔ ہم ذر کے مارے بغیر کوئی تبصرہ کئے ان کا مکتوب ذیل میں درج کرتے ہیں (انتظار حسین)

ٹی وی پروگرام "غزل اس نے چھیڑی" کے بارے میں آپ کے دوست (سجاد رضوی) نے جو اعتراضات کئے ہیں وہ نہ صرف غلط ہیں بلکہ من گھڑت بھی ہیں اب اسے ثقل ساعت کہا جائے یا سہو ساعت' حقیقت یہ ہے کہ.......

۱۔ قائم چاند پوری کے ضمن میں 'مولوی عبد الحق کے واسطے سے میں نے "مخزن نکات" کا حوالہ دیا تھا۔ نہ کہ "نکات سخن" کا۔ کاش موصوف دونوں کتابوں کا فرق جانتے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری مجھ ایسے "لاعلم" کو دینے کے بجائے خود حاصل کرلیتے۔

۲۔ میں نے یہ قطعی نہیں کہا کہ میر تقی میر دربار سے متعلق نہیں تھے۔ میرے الفاظ.... "وہ دربار سے وابستہ ہوئے مگر اس انداز میں نہیں جو دوسرے شعراء کا وطیرہ تھا۔ اور جس پر اردو ادب آج تک شرمندہ ہے وہ بہت خوددار انسان تھے' ذرا سی بات پر دربار سے علیحدہ ہوگئے اور ساری عمر اپنی ذات کی پرستش میں گزاردی۔ اس سلسلہ میں 'میں نے میر صاحب کا ایک شعر بھی سنایا تھا۔

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں
میں ہوں نسیم بادہ فروش چمن نہیں

۳۔ میر صاحب کے مزاج کی دیگر خصوصیات کے ساتھ میں نے انہیں "خوش طبع" بھی کہا اور میں نے یہ ترکیب کس معنی میں استعمال کی کاش موصوف یا کم از کم آپ ہی سمجھ جاتے۔ کیا آپ کو اس حقیقت سے انکار ہے کہ میر نے اپنے مخصوص لہجے کے علاوہ' ہر لہجے میں شاعری کی ہے؟ اور اردو کے تقریباً ہر صاحب طرز شاعر نے اپنی افتاد طبع کے مطابق میر سے استفادہ کیا ہے؟ انشاء کی "ظرافت" سے لیکر غالب اور اقبال تک اپنے انداز اور اپنے حدود میں ان سے کسی نہ کسی طرح متاثر نظر آتے ہیں حالانکہ یہ کتنے مختلف لہجوں کے شاعر ہیں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ اس لئے بات کو صرف میر کی خوش طبعی تک محدود رکھتا ہوں آپ بتائیں اور اپنے دوست کو سمجھائیں کہ میر کے یہ اشعار ان کی طبیعت کے کس رخ کی غمازی کرتے ہیں۔

سب آبروئے حضرت علامہ لے گیا
اک مشبچہ اتار کے عمامہ لے گیا
ہزار شانہ و مسواک و غسل' شیخ کرے
ہمارے عندیہ میں تو ہے وہ پلیت و خبیث

میر کیا سادہ ہیں' بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں
کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت ہیں
اس نسخے کی کوئی نہ رہی ہم کو دوا یاد

یہ تو وہ اشعار ہیں جو زبان زدعام و خاص ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ایسے شعر سیکڑوں ہیں جنہیں نقل کرنا آداب اخلاق کے منافی ہے اور جن پر بزرگوں نے "غاثت پسند" کا حرف عائد کیا ہے کیا میں بھی انہیں الفاظ کو دہراتے ہوئے میر صاحب کی شان میں کوئی ناشائستہ بات کہہ دیتا؟ یا ان کے اشعار کے جو تیور اور اپنے حریفوں سے نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ کی جو فضا ملتی ہے اسے میر صاحب کی "خوش طبعی" سے تعبیر کرتا۔

۴۔ مرثیہ سے متعلق جو بات کہی گئی ہے میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ میر صاحب نے مرثیہ نہ کہنے کے برابر کہا ہے اور جو کچھ "مرثیہ" کے انداز میں کہا ہے وہ ایک طرح کی منقبت ہے میر صاحب نے جو "عقیدہ" شعوری طور پر اپنایا تھا' اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ بھرپور مرثیہ کہتے۔ ان کی روح میں "غم" کا وہ عنصر موجود تھا جو لفظ کو آنسو بنا دیتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میر صاحب کی غزل تو آنسوؤں میں بھیگی ہوئی ہے لیکن "مرثیہ؟" اگر ان بے اشک الفاظ کے مجموعے کو آپ یا آپ کے "ٹیکسٹ بک بورڈ" کے ملازم دوست' اصناف ادب کے "نصابی اندراجات" کی روشنی میں "مرثیہ" کہنے پر مصر ہیں تو آپ کی خوش عقیدگی۔ میرے نزدیک تو مرثیہ کچھ اور ہی کیفیات کا نام ہے۔ (صنفی اعتبار سے بھی اس پر ایک طویل گفتگو ہو سکتی ہے) میرے خیال میں میر صاحب کا "غم" اپنے "مخصوص عقیدے" کا حق ادا نہ کر سکا اور "عشق بتاں" کی معرفت غزل میں پھیل گیا۔ اب چونکہ عشق بتاں میرے خیال میں مجرد عشق نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس منظر میں بہت سی تاریخی اور تہذیبی محرکات ہوتے ہیں اس لیے میں نے میر صاحب کے عہد اور انکے شعور عہد کی وساطت سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا تھا۔ آپ کو اور آپ کے دوست کو اس نقطہ نظر سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔

۵۔ جہاں تک شعراء کے کلام کے.... انتخاب کا تعلق ہے اطلاعاً" عرض ہے کہ یہ میرا نہیں شان الحق حقی صاحب کا کام ہے اور اس کی عہد بہ عہد ترتیب کے ذمہ دار بھی وہی ہیں۔ استاد شاگرد کے تسلسل میں دو ایک جگہ میں خود ٹھٹکا ہوں اور میں نے ذاتی طور پر حقی صاحب اور اس پروگرام سے متعلق دیگر حضرات سے گفتگو بھی کی۔ یہی نہیں بلکہ پروگرام کے دوران تقدیم و تاخیر کا جواز بھی پیش کر دیا لیکن..... بہ وجود میری بات تدوین کی نذر ہو گئی۔

انتخاب کلام کے "نصابی معیار" کا طعنہ دینے سے پہلے آپ کم از کم ٹی وی والوں سے پوچھ ہی لیتے کہ اس میں میرا کیا دخل ہے۔ ایک صحافی کو کم از کم اتنا باخبر تو ہونا چاہیے۔

ممکن ہے اسی طرح آپ کا "دوستی کا حق" ادا کرنے کے قابل نہ رہتے لیکن انتظار حسین صاحب' میں بھی تو آپ کا "دوست" ہی ہوں

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

(مطبوعہ روزنامہ "مشرق" لاہور' ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء)

(۲)

حضرات آپ کو معلوم ہے کہ ان دنوں حمایت علی شاعر اور سجاد رضوی میں میر کے مسئلہ پر ٹھنی ہوئی ہے بعض خطوط ایسے موصول ہوئے ہیں جس میں سجاد رضوی کو سجاد باقر رضوی گردانا گیا ہے۔ واضح ہو کہ سجاد باقر رضوی اب اورینٹل کالج سے باہر کسی سے نہیں لڑتے۔ یہ سجاد رضوی ہیں جن کے خط کے جواب میں حمایت علی شاعر نے ایک خط باندھا ہے جو درج ذیل ہے (انتظار حسین)

انتظار صاحب...... یہ سجاد صاحب تو واقعی عجیب چیز معلوم ہوتے ہیں۔ میر کے شعر کا جو مطلب انہوں نے نکالا ہے یہ آواز بلند "عش عش" کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔

کیا لکھا ہے کیا پڑھایا ہے
"انتظار حسین" کیا کہنا

آپ اتنا تو انہیں بتادیتے کہ میر صاحب کا اشارہ کیا تھا' اور میں نے آپ سے کس "بیگانگی" کی شکایت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم میں کوئی ایسا "مکانی تعلق" نہیں کہ میں آپ سے "دوستی یا ہمدردی کی بھیک مانگوں" آپ (غالباً) میرٹھ کے ہیں' میں اورنگ آباد کا۔ دونوں شہر اپنی اپنی خصوصیات میں مشہور۔ دونوں میں شمال جنوب کا فرق' نظریاتی طور پر بھی ہم آپ قدرے مختلف ہیں ہاں تعلق ہے تو صرف ادب کا اور خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی ٹیکسٹ بک بورڈ کی حد تک نہیں۔

کاتب نے "مخزن نکات" کو "نکات سخن" لکھ دیا۔ مجھے تو اس میں اخبار کے کاتب کی کم اور "کاتب تقدیر" کی غلطی زیادہ نظر آتی ہے۔ کیونکہ اخبار کا کاتب "مخزن" کو زیادہ سے زیادہ غلط لکھ دیتا تو "مخزون" لکھ جاتا۔ یہ "سخن" کا اضافہ تو کچھ "سخن ورانہ" ہی معلوم ہوتا ہے خیر.... انہوں نے اپنی ایک غلطی تو مانی

اور "کھل" جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

بقول آپ کے "وہ بند ہونے والی شے نہیں ہیں۔"

رہا قائم چاند پوری کے تذکرے "مخزن نکات" سے مولوی عبدالحق کا تعلق' تو یہ تعلق بھی کھلے لفظوں میں ظاہر کردوں کہ "مخزن نکات" انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئی تھی اور میرے خیال میں اس کی تلاش و اشاعت کا سہرا انہیں کے سر ہے اور قائم چاند پوری سے باضابطہ واقفیت انہیں کی معرفت حاصل ہوئی ہے۔ اس کتاب کو مولوی عبدالحق کی تصنیف تو ایک "نصابی طالب علم" بھی نہیں کہہ سکتا۔ میرے بھائی۔ اب تو اپنی "سہو ساعت" مان لیجئے ورنہ میں ٹی وی والوں سے گزارش کروں گا کہ وہ ایک عدد ٹی وی سیٹ' ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ "برائے تنقید" تحفتاً" آپکو پیش کردیں تاکہ ہمیں ایک ایک لفظ کی وضاحت نہ کرنی پڑے۔

اب آیئے میر صاحب کی طرف۔ بہتر ہوگا کہ میں اپنی بات کہنے کے بجائے مولانا محمد حسین آزاد کی رائے نقل کردوں شاید سجاد صاحب کے نزدیک زیادہ معتبر ٹھہرے۔

(آب حیات سے اقتباسات......)

ا۔ (نواب کا مچھلیوں سے کھیلنے کا واقعہ) میر صاحب کو یہ بات ناگوار گزری۔ غزل جیب میں ڈال کر گھر چلے آئے اور پھر جانا

چھوڑ دیا۔ بدستور اپنے گھر بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گزارتے رہے۔

۲۔ امرا کی تعریف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل اور قناعت انہیں بندے کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے۔

۳۔ قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کی برداشت نہ رکھتے تھے۔

۴۔ اپنی بے نیازی اور بے پرواہی کے ساتھ دنیا کی مصیبتیں جھیلیں اور جو اپنی آن بان تھی اسے لئے دنیا سے چلے گئے جس گردن کو خدا نے بلند کیا تھا۔ سیدھا خدا کے ہاں لے گئے۔ چند روز عیش کے لالچ سے یا مفلس کے دکھ سے اسے دنیا کے نااہلوں کے سامنے ہرگز نہ جھکایا۔

(انشاء اللہ خان انشاء کی زبانی)

۵۔ یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی فاقے سے ہوگا (اور نواب نے جب خلعت اور ایک ہزار روپیہ بھیجا تو میر صاحب نے جواب دیا) مسجد میں بھجوا دیجئے یہ گنہ گار اتنا محتاج نہیں۔

اب شاید سجاد صاحب کو یقین آجائے کہ میر صاحب کی طبیعت دوسرے شعراء سے کتنی مختلف تھی۔ انہیں مزید یقین دلانے کے لئے میں میر صاحب کا وہ شعر دوبارہ نقل کرتا ہوں شاید ان کے منہ کا مزہ بھی بدل جائے۔

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمین نہیں
میں جوں نسیم بادہ فروش چمن نہیں

اگر اس تاریخ نزول کی انہیں تلاش ہے تو وہیں ہمارے محترم ڈاکٹر سید عبد اللہ موجود ہیں ان سے پوچھ لیں، میری بھی رہنمائی ہو جائے گی۔

مرثیے کے بارے میں، میں اپنا نقطہ نظر وضاحت سے لکھ چکا ہوں۔ مزید لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ سجاد صاحب کلیات کے صفحات اور اشعار کی تعداد گنتے رہیں۔ اچھا شغل ہے۔ میں اشعار کو دوسرے زاویئے سے دیکھتا ہوں ہاں ان کی دلجوئی کے لئے مختصراً" اتنا لکھ دوں کہ مرزا سودا بھی جو نسبتاً" "صاحب عقیدہ" تھے اور اس صنف سخن میں خاص وصف رکھتے تھے اعتراضات سے نہیں بچے (اقتباس)

"لطف یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگ سودا کے مرثیوں کو کہتے تھے کہ ان میں مرثیت نہیں شاعری ہے۔ ضمناً" ایک سوال اور بھی۔ جوش صاحب نے جو مرثیے لکھے اور مجلسوں میں پڑھے کیا وہ "مرثیے" تھے؟ تو میر صاحب کے مرثیوں کو اگر "مرثیہ" نہیں کہا گیا تو اس قدر چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے کہ اس "شاعر" کو غریب ٹیکسٹ بک بورڈ کی کرسی ملازمت کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری اور اورینٹل کالج کے شعبہ اردو کی صدارت عطا کردی جائے اور پھر اپنی دانست کے مطابق میر کا شعر "سمجھ کر" انتظار صاحب سے دوستی یا ہمدردی کی "بھیک" دلوادی جائے۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہیں رکاب میں

انتظار صاحب، اپنے دوست کو سنبھالئے کہیں وہ گر نہ پڑیں سنا ہے کہ ان کا "ادب" سے بھی کوئی تعلق ہے۔

(باقی صفحہ ۴۷۶ پر)

فلم

حمایت علی شاعر کی فلمی شاعری

زخمی کانپوری

اصل نام میر حمایت علی اور تخلص شاعر ہے۔ آپ ۱۴ جولائی ۱۹۲۶ء کو اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۴ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کئے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے دکن ریڈیو اورنگ آباد سے وابستہ ہوگئے تھے پھر دکن ریڈیو حیدر آباد (دکن) میں آگئے اور یہ ملازمت ۱۹۵۰ء تک چلی۔ حیدر آباد (دکن) شروع ہی سے شعر و ادب کا بہت بڑا گہوارہ تھا جہاں پورے برصغیر کے اہل علم رہائش پذیر تھے۔ شعر و شاعری کے ذوق کی وجہ سے آپ نے اوائل عمری ہی سے ادبی حلقوں میں بیٹھنا شروع کردیا تھا جہاں آپ کے خیالات کو جلا ملی۔ آپ اس دور کے کئی بڑے شعراء سے متاثر تھے جن میں خاص طور پر مخدوم محی الدین مرحوم سرفہرست تھے' اس دور میں ترقی پسند تحریک بڑے عروج پر تھے جس کے روح رواں بھی مخدوم محی الدین مرحوم ہی تھے۔ آپ بھی اس تحریک میں شامل ہوگئے۔ حمایت صاحب ۱۹۵۱ء میں پاکستان آگئے اور سابقہ تجربے کی بنیاد پر ریڈیو پاکستان کراچی میں بحیثیت "اسٹاف آرٹسٹ" ملازمت کرلی۔

کراچی میں ان دنوں ادبی سرگرمیاں پورے عروج پر تھیں پورے ہندوستان سے اہل علم اور بڑے بڑے شعراء کراچی میں قیام پذیر تھے۔ انہوں نے بھی یہاں ان سرگرمیوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لینا شروع کردیا۔ ۱۹۵۵ء میں جب حیدر آباد (سندھ) میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو انہوں نے اپنا تبادلہ حیدر آباد (سندھ) کرالیا۔ اب انہوں نے حیدر آباد کو بھی ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے حیدر آباد (سندھ) میں اچھا خاصا ادبی سرکل قائم کرلیا ان دنوں حیدر آباد (سندھ) میں ان کے ساتھ محسن بھوپالی' قابل اجمیری مرحوم اور اختر انصاری اکبر آبادی مرحوم جیسے شعراء موجود تھے۔ آپ سات سال تک حیدر آباد (سندھ) ریڈیو اسٹیشن پر رہے اور یہیں آپ نے اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا اور ایم اے اردو سندھ یونیورسٹی سے کیا۔ ۱۹۶۳ء میں آپ نے ریڈیو کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور سچل کالج حیدر آباد (سندھ) میں بطور لیکچرار ملازم ہوگئے اور یہ سلسلہ کچھ عرصے تک چلا۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے حیدر آباد (سندھ) سے "شعور" نامی رسالہ جاری کیا جو دو سال کے بعد بند ہوگیا۔ حیدر آباد (سندھ) میں قیام کے دوران ہی آپ نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر "ارژنگ" کے نام سے ایک ثقافتی ادارہ قائم کیا جس کے تحت کلچرل پروگرام اور ڈرامے وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ ارژنگ کے تحت ہونے والے ڈراموں میں اداکار محمد علی اور مصطفیٰ قریشی نے پہلی بار اداکاری کی تھی۔ حیدر آباد (سندھ) میں قیام ہی کے دوران انہوں نے لاہور میں بننے والی فلموں میں گیت لکھنے شروع کردیئے تھے اور پھر کچھ عرصہ بعد وہیں منتقل ہوگئے۔

موسیقار خلیل احمد جو کراچی ریڈیو اسٹیشن پر ان کے ساتھ تھے ان کو جب پہلی بار فلم "آنچل" میں موسیقی دینے کا چانس ملا تو انہوں نے اپنی اس فلم میں حمایت علی شاعر کی ایک مشہور نظم "ان کہی" کے چند بند گلوکارہ ناہید نیازی اور سلیم رضا کی آواز میں ریکارڈ کئے اور پھر موسیقار خلیل احمد کے اصرار پر انہوں نے اس فلم کے تمام گیت تحریر کئے' اس طرح آپ فلمی

دنیا میں بطور نغمہ نگار داخل ہوگئے۔ اس نظم کا ٹیپ کا مصرع یہ تھا۔

تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم

ان کی یہ پہلی فلم کیریئر میں ایک سنگ میل ثابت ہوئی' اس فلم کے اکثر گیت بے حد مقبول ہوئے سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کو اس فلم میں بہترین نغمہ نگاری پر پہلا "نگار ایوارڈ" برائے ۱۹۶۲ء ملا۔ وہ گیت احمد رشدی مرحوم کی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا جس کے بول یہ تھے۔

کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو

۱۹۶۳ء میں انہوں نے فلم "جب سے دیکھا ہے تمہیں" "دل نے تجھے مان لیا" "دامن" اور اک تیرا سہارا" میں گیت تحریر کئے۔ ان میں سے پہلی دو فلمیں کراچی میں بنی تھیں جبکہ آخری دونوں فلمیں لاہور میں تیار ہوئی تھیں۔ بطور فلمساز و اداکار وحید مراد مرحوم کی دوسری فلم "جب سے دیکھا ہے تمہیں" میں انہوں نے یہ خوبصورت نظم تحریر کی تھی۔

جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے

یہ نظم موسیقار سہیل رعنا کی موسیقی میں سلیم رضا نے گائی تھی جو سننے والوں میں بے حد پسند کی گئی' یہ نظم بحیثیت موسیقار سہیل رعنا کی پہلی فلم تھی۔ ہدایت کار جاوید ہاشمی کی پہلی فلم "دل نے تجھے مان لیا" بھی کراچی میں بننے والی فلموں میں ایک کامیاب فلم شمار ہوئی ہے جس میں ناہید نیازی اور ساتھیوں کی آواز میں اس فلم کا ایک کورس بے حد مقبول ہوا جس کی دھن موسیقار مصلح الدین نے بنائی تھی۔ دراصل اس نظم کا مکھڑا عربی شاعر خلیل جبران کی ایک مشہور نظم سے مستعار لیا گیا تھا' جبکہ انترے اردو میں حمایت علی شاعر نے لکھے تھے۔ فلم "اک تیرا سہارا" میں انہوں نے صرف ایک قومی گیت تحریر کیا تھا جبکہ بقیہ گیت قتیل شفائی صاحب کے تحریر کردہ تھے۔ اس فلم کی موسیقی ماسٹر عنایت حسین نے دی تھی۔ اس فلم کے قومی گیت کو مالا نے گایا تھا اس کے بول تھے۔

اپنے پرچم تلے ہر سپاہی چلے

اس گیت کی بازگشت آج بھی قومی تہواروں کے موقعوں پر ریڈیو پر سنائی جاتی ہے۔ اس سال ان کی معرکۃ الآراء فلم "دامن" بھی آئی۔ اس فلم کے تمام گیت اپنی انفرادیت کی وجہ سے ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں بلکہ حمایت علی شاعر کے تحریر کردہ گیتوں کی بدولت اس فلم کو زبردست مقبولیت ملی تھی۔' اس کے موسیقار بھی خلیل احمد تھے۔ اس فلم میں نورجہاں کا گایا ہوا یہ گیت بہت پسند کیا گیا۔

نہ چھڑا سکو گے دامن نہ نظر بچا سکو گے
جو میں دل کی بات کہہ دوں تو کہیں نہ جا سکو گے

اس گیت پر انہیں ایک بار پھر بہترین نغمہ نگاری کا "نگار ایوارڈ" برائے ۱۹۶۳ء ملا۔ اسی فلم میں احمد رشدی مرحوم کی آواز میں ریکارڈ ہونے والا یہ طربیہ گیت بھی بے حد مقبول ہوا تھا۔

واللہ سر سے پاؤں تلک موج نور ہو
قدرت کا شاہکار ہو تم، رشک حور ہو

اس فلم میں نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ ہونے والی ایک نعت بھی لوگوں نے بڑی پسند کی تھی۔

اے حبیبؐ کبریا اے رحمت العالمینؐ
آپ کے در کے سوا میرے یہاں کوئی نہیں

فلم دامن کے گیتوں کی مقبولیت کی وجہ سے ان پر فلمی دنیا کے دروازے کھل گئے اور ان کی مصروفیت میں بے حد اضافہ ہوگیا اور یہ فلمی دنیا کے مصروف ترین نغمہ نگار بن گئے۔ ۱۹۶۴ء میں ہدایت کار جمیل اختر کی شاہکار فلم "خاموش رہو" ریلیز ہوئی اس کے نغمات بھی انہوں نے ہی تحریر کئے تھے جبکہ موسیقار خلیل احمد تھے۔ اس فلم کی کہانی ریاض شاہد مرحوم نے تحریر کی تھی اس میں دو نظمیں حبیب جالب مرحوم کی بھی شامل کی گئی تھیں، مگر اس فلم کا سب سے مقبول گیت حمایت صاحب کا تحریر کردہ تھا جو مالا نے گایا تھا، اس کے بول یہ تھے۔

میں نے تو پریت نبھائی سانوریا رے
نکلا تو ہرجائی

۱۹۶۵ء میں انہوں نے فلم "کنیز" "مجاہد" اور "نائلہ" کے گیت تحریر کئے ان گیتوں نے بھی زبردست مقبولیت پائی۔ "نائلہ" کے ایک گیت کے علاوہ باقی تمام گیت قتیل شفائی صاحب کے تحریر کردہ تھے حمایت صاحب کا یہ گیت بہت مقبول ہوا تھا۔ یہ گیت مسعود رانا اور مالا نے گایا تھا جبکہ اس کی دھن موسیقار ماسٹر عنایت حسین مرحوم نے بنائی تھی۔ اس کے بول یہ ہیں۔

دور ویرانے میں اک شمع ہے روشن کب سے
کوئی پروانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے

فلم مجاہد میں بھی ان کا صرف ایک گیت تھا، جبکہ بقیہ تمام گیت کسی اور شاعر نے تحریر کئے تھے۔ اس کے موسیقار بھی خلیل احمد تھے۔ ان کا گیت ایک قومی ترانہ تھا، اس کے بول تھے۔

ساتھیو مجاہدو، جاگ اٹھا ہے سارا وطن

یہ ترانہ مسعود رانا نے اپنی گرجدار آواز میں گاکر جوش ایمانی کو گرما دیا تھا، حمایت علی شاعر کے الفاظ اور خلیل احمد کی دھن نے اس ترانے میں ایسا رنگ جمایا کہ جس کی تعریف کے لئے لفظ ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ اتفاق سے ۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو فلم مجاہد ریلیز ہوئی اور ۶ ستمبر کو جنگ کا آغاز ہوگیا۔ چنانچہ جنگ کے دوران یہ ترانہ ریڈیو پر پہلی بار بطور جنگی نغمے کے بجا اور بعد میں اس کے ساتھ ساتھ جوش ملیح آبادی مرحوم کا تحریر کردہ فلم "آگ کا دریا" کا ترانہ بھی ان دنوں ریڈیو پر بہت بہت بجا تھا۔ یہ بھی مسعود رانا کی آواز میں تھا۔ اس کی دھن غلام نبی عبداللطیف مرحوم نے بنائی تھی اس کے بول تھے۔

اے وطن ہم ہیں تری شمع کے پروانوں میں
زندگی جوش میں ہے ہوش ہے دیوانوں میں

۱۹۶۶ء میں ان کی ایک اور معرکتہ الآرا فلم "میرے محبوب" ریلیز ہوئی۔ یہ فلم اپنے مقبول گیتوں کی وجہ سے لوگوں کو آج بھی یاد ہے۔

۱۔ ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ (نور جہاں)
۲۔ کلی مسکرائی جو گھونگھٹ اٹھا کے، خدا کی قسم تم بہت یاد آئے (نور جہاں)
۳۔ ماہ لقا، محبوبہ (احمد رشدی مرحوم)
۴۔ سامنے رشک قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں (مسعود رانا)

اسی سال سنتوش کمار کی ذاتی فلم "تصویر" اور فلمساز و ہدایت کار اقبال شہزاد کی فلم "بدنام" بھی ریلیز ہوئیں۔ "تصویر" کی کہانی مشہور ادیب حکیم احمد شجاع مرحوم کی تحریر کردہ تھی جبکہ مکالمے اور اسکرین پلے حمایت علی شاعر کا تحریر کردہ تھا۔

اس دور میں ان کا یہ گیت "ہم بھی مسافر تم بھی مسافر کون کسے کا ہووے" فلم "بدنام" کا مقبول ترین گیت تھا دراصل یہ گیت فلمساز و ہدایت کار اقبال شہزاد مرحوم نے اپنی کسی اور فلم کے لئے لکھوایا تھا جس کی دھن موسیقار دیبو نے بنائی تھی مگر بدقسمتی سے وہ فلم نہ بن سکی اور بعد میں اقبال شہزاد نے اپنی فلم "بدنام" میں استعمال کیا۔

۱۹۶۷ء میں فلمساز راشد مختار کی فلم "میں وہ نہیں" آئی جس کے گیت حمایت صاحب کے لکھے ہوئے تھے۔ جبکہ موسیقار اے حمید مرحوم تھے، اس میں مرکزی کردار کمال اور رخسانہ نے ادا کیے تھے۔ اس میں ان کا یہ طربیہ گیت جو مہدی حسن نے گایا تھا لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا۔

نوازش کرم شکریہ مہربانی
مجھے بخش دی آپ نے زندگانی

انہوں نے اپنی ذاتی فلموں "لوری" اور "گڑیا" میں بھی بڑے معرکے کے گیت تحریر کیے تھے ان گیتوں کی دھنیں بالترتیب موسیقار خلیل احمد اور موسیقار سہیل رعنا نے بنائیں تھیں۔

حمایت علی شاعر نے متعدد فلموں میں گیت تحریر کیے تھے ان میں فلم آنچل، جب سے دیکھا ہے تمہیں، دل نے تجھے مان لیا، دامن، اک تیرا سہارا، خاموش رہو، کنیز، نائلہ، مجاہد، تصویر، میرے محبوب، بدنام، میں وہ نہیں، کھلونا، لوری اور گڑیا شامل ہیں۔ انہوں نے اپنی ذاتی ایک نامکمل فلم "منزل ہے کہاں تیری" میں بھی گیت لکھے تھے یہ فلم پچاس فیصد بن چکی تھی مگر کاروباری تنازعے کے سبب مکمل نہ ہو سکی۔ "گڑیا" اور "منزل ہے کہاں تیری" کی ڈائریکشن بھی انہوں نے خود دی تھی۔

حمایت علی شاعر اردو زبان کے ایک صاحب طرز شاعر ہیں ان کا شمار صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے سارے ہی اصناف سخن پر قلم اٹھایا ہے۔ نیز انہوں نے ایک نئی صنف سخن "ثلاثی" کے نام سے ایجاد کی تھی جو تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے، اوائل عمر ہی ــــ سے ان کا کلام برصغیر کے ممتاز رسائل میں پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ آپ

(باقی صفحہ نمبر ۴۷۲ پر)

حمایت علی شاعر کے مقبول فلمی نغمے

۱۔ اے حبیب کبریا اے رحمت اللعالمین (نور جہاں)
۲۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ (نور جہاں)
۳۔ نہ چھڑا سکو گے دامن (نور جہاں)
۴۔ کلی مسکرائی جو گھونگھٹ اٹھا کے (نور جہاں)
۵۔ زندگی کی ہر مسرت آپ کے پہلو میں ہے (نور جہاں)
۶۔ سو جا میری گڑیا (نور جہاں)
۷۔ چندا کے ہنڈولے میں (نور جہاں)
۸۔ خداوندیہ کسی آگ سی جلتی ہے سینے میں (مہدی حسن)
۹۔ نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی (مہدی حسن)
۱۰۔ زیست مشکل ہے اسے اور بھی مشکل نہ بنا (مہدی حسن)
۱۱۔ اے جان وفا، دل میں تری یاد رہے گی (مہدی حسن)
۱۲۔ تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو کیا معلوم (سلیم رضا)
۱۳۔ جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے (سلیم رضا)
۱۴۔ کسی چمن میں رہو تم، بہار بن کے رہو (احمد رشدی)
۱۵۔ واللہ سر سے پاؤں تلک موج نور ہو (احمد رشدی)
۱۶۔ گل کہوں، خوشبو کہوں، ساغر کہوں، مینا کہوں (احمد رشدی)
۱۷۔ تو حسیں، تیرا جہاں حسیں (احمد رشدی)
۱۸۔ تم سا حسیں کوئی نہیں کائنات میں (احمد رشدی)
۱۹۔ مانا کہ حضور آپ ہزاروں میں حسیں ہیں (احمد رشدی)
۲۰۔ پیار میں ہم اے جان تمنا، جان سے جائیں تو مانو گے (رشدی)
۲۱۔ دونوں طرف ہے آج برابر ٹھنی ہوئی (احمد رشدی)
۲۲۔ یہ خوشی عجب خوشی ہے، اسے جانے کیا زمانہ (رشدی)
۲۳۔ ماہ لقا۔ محبوبہ (احمد رشدی)
۲۴۔ ہمت سے ہر قدم بڑھانا تو ہے پاکستانی (احمد رشدی)
۲۵۔ ہوا نے چپکے سے کہہ دیا کیا کہ پھول لہرا کے ہنس پڑے ہیں (مالا)
۲۶۔ میں نے تو پریت نبھائی سانوریا رے نکلا تو ہرجائی (مالا)
۲۷۔ اے خدا تو ہی بتا، جرم کیا میں نے کیا (مالا)
۲۸۔ سامنے رشک قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں (مسعود رانا)
۲۹۔ جاگ اٹھا ہے سارا وطن ساتھیو۔ مجاہدو (مسعود رانا۔ کورس)
۳۰۔ ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر (مسعود رانا)
۳۱۔ میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں، میرا دل بھی گا رہا ہے (مجیب عالم)
۳۲۔ چندا کے ہنڈولے میں (ثریا حیدر آبادی)
۳۳۔ جب رات ڈھلی، تم یاد آئے (مالا + احمد رشدی)
۳۴۔ کوئی پروانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے (مالا + احمد رشدی)
۳۵۔ بھولی دنیا کا جیا لہرائے (آئرین پروین۔ کورس)
۳۶۔ تالی بجے بھئی تالی بجے (احمد رشدی۔ کورس)
۳۷۔ ایک تارا گگو تارا (احمد رشدی۔ کورس)
۳۸۔ اپنے پرچم تلے، ہر سپاہی چلے (مالا۔ کورس)
۳۹۔ ہم نے تو محبت میں تم کو بھی خدا جانا (ناہید نیازی)
۴۰۔ رایت الصبیحا دعلی قصرا (ناہید نیازی۔ کورس)
۴۱۔ کھٹی کڑی میں لکھی پڑی (احمد رشدی + آئرین پروین)
۴۲۔ جو پیسہ ہم بچاتے ہیں وطن کے کام آتا ہے (اخلاق احمد)

مشاعروں کے بھی بڑے کامیاب شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کا مخصوص ترنم اور پڑھنے کا انداز دونوں ہی دل پر اثر کرتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۰ء ان کی سخت جدوجہد کے عشرے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حمایت علی شاعر چو مکھی لڑ رہے تھے یعنی ایک طرف وہ ریڈیو پر اپنی ذہانت دکھلا رہے تھے تو دوسری طرف ادب میں اپنا مقام بنا رہے تھے، تیسری طرف وہ اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے چوتھی طرف وہ قلم کے میدان کے شہسواروں میں شامل تھے یعنی بیک وقت آپ نے چاروں محاذوں پر جنگ لڑی اور مکمل فتح پائی اور اس تگ و دو کے نتیجے میں انہوں نے اپنی زندگی میں وہ سب کچھ پالیا جس کی ہر شخص تمنا کرتا ہے۔

(مطبوعہ "اخبار جہاں" کراچی۔ ۲۵ تا ۳۱ جولائی ۱۹۹۴ء)

اور بھی غم ہیں

(صدارتی ایوارڈیافتہ فلم "اور بھی غم ہیں" کا ایک نغمہ - تھیم سانگ)

حمایت علی شاعر

محفلیں اور بھی ہیں حسن کی محفل کے سوا
منزلیں اور بھی ہیں عشق کی منزل کے سوا
"اور بھی غم ہیں زمانے میں غم دل کے سوا"

آنکھ رکھتے ہو تو آؤ یہ تماشا دیکھو
آدمیت کا سسکتا ہوا لاشہ دیکھو

نیلے آکاش تلے خاک میں پلتے ہوئے لوگ
اونچے محلوں کی گھنی چھاؤں میں جلتے ہوئے لوگ
بھوک کی آگ میں چپ چاپ پگھلتے ہوئے لوگ

سوچتے چہروں پہ جمتی ہوئی حالات کی دھول
جسم سوکھے ہوئے جیسے کوئی ویران ببول
میلے دامن میں سمیٹے ہوئے مسلے ہوئے پھول

بھوک کی گود میں افلاس کے گہوارے میں
روشنی ڈھونڈتے ہیں جہل کے اندھیارے میں

موت کے ہاتھ سے جینے کا صلہ پاتے ہیں
ناکردہ گناہوں کی سزا پاتے ہیں

یہ وہ راہی ہیں کہ جن کی نہیں منزل کوئی
یہ وہ موجیں ہیں کہ جن کا نہیں ساحل کوئی
یہ وہ لاشیں ہیں کہ جن کا نہیں قاتل کوئی

علم کے نور سے جو دل ہیں ازل سے محروم
جہل کی گود میں پروان چڑھتے ہیں معصوم
زندگی کیا ہے، خدا کیا ہے، انہیں کیا معلوم

کتنے نادان ہیں مر مر کے جیے جاتے ہیں
زہر کو شہد سمجھتے ہیں پیے جاتے ہیں

ان کے سینوں کی بجھی آگ جو روشن ہو جائے
یہ جہاں ایک مہکتا ہوا گلشن ہو جائے

فلم "اور بھی غم ہیں" کی کہانی، اسکرین پلے اور مکالمے مشہور ادیب اور فلساز دانش دیروی کے تحریر کردہ تھے اور اس کا تھیم سانگ حمایت علی شاعر نے لکھا تھا۔ مرکزی کردار (ایک انقلابی شاعر) مشہور صحافی اسد جعفری نے ادا کیا تھا۔ ہدایت کاری کے فرائض اے ایچ صدیقی نے انجام دیئے تھے۔ یہ فلم ایسٹرن اسٹوڈیو۔ کراچی میں بنائی گئی تھی اور ۵ اگست ۱۹۶۰ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ "اور بھی غم ہیں" پاکستان کی پہلی فلم تھی جسے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ (مرتب)

(مطبوعہ - "نئی قدریں" (سالنامہ) فروری ۱۹۶۳ء)

۱۹۶۴ء کا بہترین گیت

(کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو)

حمایت علی شاعر سے ایک گفتگو

بشیر نیاز..... شاعر صاحب' آیئے آپ سے ۱۹۶۴ء کے بہترین گیت کے سلسلے میں کچھ باتیں کریں۔ میرے خیال میں اس گیت کی جو بات پہلی نظر میں متوجہ کرتی ہے اس گیت کا بنیادی خیال ہے۔ سب سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ اس گیت کے محرکات کیا تھے؟

شاعر..... فلم آنچل میں اگر میری نظم "ان کہی" کا کچھ حصہ نہ لیا جاتا تو میں یہ گیت نہ لکھتا۔ اس فلم کا مرکزی کردار شروع میں میری نظم "ان کہی" پڑھتا ہے بعد میں اس کی محبوبہ چلی جاتی ہے۔ اس سچویشن کے لئے گیت لکھنا تھا ایسے حالات میں جیسا کہ فلم کا دستور ہے اور رسم ہے' کچھ زمانہ کا گلہ ہوتا ہے' کچھ قسمت کا شکوہ اور کچھ محبوبہ کی بے وفائی کا ذکر..... میں نے فلم ساز سے کہا کہ میں ہیرو سے اس کی محبوبہ کو کوسنے نہیں دلواؤں گا اور نہ ابلے ہوئے جذبات کا اظہار کروں گا۔ اگر میں ہوتا تو چپ ہیرو نہ بنتا اسے دعا دے کر رخصت کرتا۔ ہیرو کو شاعر بنایا گیا ہے تو اس کا وہ مقام ہونا چاہئے جو اس کے ظرف کے مطابق ہو۔ یہ بنیادی جذبہ تھا جس کے تحت یہ گیت لکھا گیا۔ سطحی جذبات کا اظہار کیا جا سکتا تھا مگر یہ تو آرٹسٹ کے ظرف کی توہین ہوتی۔ ایک آرٹسٹ یہی چاہے گا کہ اس کی محبوبہ خوش ہے تو وہ بھی خوش ہے۔ اسے اپنا غم دفن کر دینا چاہیئے۔ اس نظم کا ایک شعر جو دوہے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے (حالانکہ تکنیک کے اعتبار سے دوہا نہیں) اور ریکارڈ میں شامل نہیں ہے اس سے اس نظم کا بنیادی خیال اور واضح ہو جاتا ہے۔

ہمیں تمہاری محبت نہ مل سکی لیکن
خوشی یہ ہے کہ تمہیں' تم سا مل گیا کوئی

بشیر نیاز..... شاعر صاحب' "تمہیں تم سا مل گیا کوئی" سے رقابت کے جذبے کی نفی ہوتی ہے' کیا آپ رقابت پر یقین نہیں رکھتے اور محبت میں شراکت کے قائل ہیں؟

شاعر..... میں رقابت کو ایک اتھلا جذبہ سمجھتا ہوں' رقابت انسان کے سطحی جذبات سے تعلق رکھتی ہے' فیض کی وہ نظم

آ' کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا ہے

جس میں اس نے رقیب کو گلے سے لگایا ہے' محبت کے حقیقی آداب کی آئینہ دار ہے اور ہمیں دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔ رقیب کو بھی محبت کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے' جتنا ہمیں ہے۔ نظم "رقیب سے" فیض کی شاعری کا بہت

بڑا موثر ہے اور فیض صاحب نے یہ روشنی غلام بھیک نیرنگ کے اس خیال سے لی ہے۔

تحسین حسن یار میں' میرا ہے ہم خیال
نیرنگ کیوں نہ ہو مجھے الفت رقیب سے

مگر اسے اپنے شاعرانہ رچاؤ اور اپنے مزاج اور ڈکشن کے تحت ادا کیا ہے' میں نے ایسی ہی بات کہی ہے اور اپنے لئے سب سے بڑا سرمایہ یہ منتخب کیا ہے کہ

تمہارا غم ہے سلامت تو پھر ہمیں کیا غم

بشیر نیاز..... حمایت صاحب کیا اپنی متاع عزیز دوستوں کے سپرد کر کے تمہارا غم ہے سلامت" پہ بسر اوقات کرنا شاعر کی کمزور مردانہ شخصیت کا اظہار نہیں؟

شاعر..... محبت جسمانی حدود کی پابند نہیں۔ محبت اگر جسمانی حدود میں حاصل نہیں ہوتی تو ہمیں اس کا غم نہیں کرنا چاہئے

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اور یہ راحت "غم کی راحت" ہے اور یہ تہذیب ہمیں ورثے میں ملی ہے۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

یہ بات ایک اور انداز سے موجودہ نسل کے شاعر ناصر کاظمی نے کہی ہے۔

اے بے کسی! گواہ رہنا
میں ہاتھ نہیں اسے لگایا

ادب سے فلم کی طرف جب فنکار آئیں گے تو عشق و خرد کی وہ ساری بصیرت ساتھ لائیں گے جو انہیں بڑے فنکاروں نے دی۔

بشیر نیاز..... شاعر صاحب اس مضمون کے تعلق سے مجھے حسرت موہانی کا ایک شاعر یاد آتا ہے۔

دیکھنا اور انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوہ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

اگر "دور بیٹھنے" "ہاتھ نہ لگانے" اور "دور سے دیکھنے" کو بڑے فنکار کی شان یا اس کی شخصیت کا حصہ سمجھ لیں تو کیا ہر بڑے فنکار کے کردار میں مجہولیت ہوتی ہے۔

شاعر..... یہ مجہولیت نہیں' قوت برداشت اور ضبط کی بات ہے اور ادب اور فن کا مسئلہ ضبط کا ہے۔ ترقی پسند شاعری اور وہ شاعری جو سستی جذبات کا شکار ہوئی اور ختم ہو گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ شاعری کرنے والوں نے اپنے عہد کے غم کو سینے میں

اتار کر دل کی دھڑکن نہیں بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شاعری وقت کے ساتھ قدر کھو بیٹھی۔ اس کے برعکس جن فنکاروں نے اس کا لحاظ کیا' ان کا شعر موضوعاتی اور مسائلی ہونے کے باوجود آج بھی زندہ اور موثر ہے۔

بشیر نیاز ..... لیکن عوام نے میرا یا حسرت موہانی کا تہذیبی اور ثقافتی مزاج ورثے میں نہیں ملا۔ وہ لوگ جو محبت کرتے ہیں اور محبت میں ناکامی پر محبوبہ کو قتل کر دیتے ہیں یا خود کو قتل کر بیٹھتے ہیں۔ انہوں نے آپ کی نظم کے جذبات کو پسند کیا تو اس کی نفسیاتی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

شاعر..... ہر تہذیب کچھ سطحیں ہوتی ہیں اگر ہم نچلی سطح کی بات کریں تو ہمیں ایسی مثالیں مل جائیں گی۔ جہاں کوئی عاشق اپنی محبوبہ کو قتل کر دیتا ہے لیکن وہ سطح بھی ہے کہ عاشق کو جہاں محبوبہ کی "خاطر" عزیز ہوتی ہے وہاں اس کی مجبوریاں بھی۔ اس سطح تک آکر وہ ہر غم حتیٰ کہ موت کو اپنے لئے قبول کر لیتا ہے اور زندگی دوسرے کے لئے۔

اگر عاشق یا محبت کرنے والے کی عزت نفس پر حملہ نہ کیا گیا تو وہ اسے بہرحال ہر غم کو برداشت کر لینا چاہئے اس نظم میں چونکہ ایک طرح سے ایثار اور تہذیب کی بلند سطح کی نمائندگی کی گئی ہے اور عاشق ایثار کی ایک منزل سے گزرا ہے اس لئے عوام نے اسے قبول کر لیا اور ایثار اور عوام میرے نزدیک ایک ہی معنے کے دو لفظ ہیں اور پوری تاریخ شاہد ہے کہ عوام ایثار کرتے آئے ہیں۔

(فلم۔ آنچل (کہانی) ابراہیم جلیس (ہدایات) الحامد (گلوکار) احمد رشدی (موسیقار) خلیل احمد)

(مطبوعہ ہفت روزہ "نگار" ۱۱ اگست ۱۹۶۲ء)

(بقیہ "غزل اس نے چھیڑی")

آخر میں موصوف نے لکھا ہے کہ "برا انتخاب برا ہی ہے چاہے کوئی بڑا آدمی ہی اس سے متعلق کیوں نہ ہو۔" اس سلسلے میں عرض ہے کہ انتخاب کبھی کسی کو مطمئن نہیں کرتا اور پھر اگر یہ انتخاب ان کی نظر میں برا ہے تو اس کی سزا مجھے کیوں ملے۔

لہو کسی نے بہایا سزا کسی کو ملی

ایک اور بات کہ ٹی وی پروگرام "ادب کے استادوں" کے لئے نہیں بلکہ اسی طرح ادب کے طالب علموں کے لئے ہے جس طرح ٹیکسٹ بک بورڈ کی "نصابی کتابیں" مرتب ہوتی ہیں کہ برسوں سے وہی غزلیں وہی نظمیں۔ ٹی وی والوں نے غالباً" شعوری طور پر یہ مانوس غزلیں منتخب کی ہیں اور موسیقی کی چاشنی کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ پڑھنے والوں کا لطف دوبالا ہو جائے۔ اس میں تحقیق کا بھی کوئی مسئلہ نہیں کہ دو منٹ کی گفتگو میں بہ یک وقت چار شاعروں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے اسے تو ایک سرسری مطالعہ سمجھ لیجئے اور خدا کا شکر کریں کہ ٹی وی والوں نے جس طرف دیکھا نہیں تھا اس طرف دیکھا تو ہے۔

(مطبوعہ۔ روزنامہ "مشرق" لاہور' ۲۹ دسمبر ۱۹۷۳ء)

حمایت علی شاعر
بشیر نیاز

فلمی شاعری اور میں

(ایک گفتگو)

سوال :۔ شاعر صاحب! ہر تخلیقی فنکار کے فن میں اس سرزمین کا عکس بھی آتا ہے جس سرزمین پر وہ پلتا پروان چڑھتا ہے آپ کی شاعری میں سرزمین کا عکس کس طرح آتا ہے۔

حمایت :۔ میرا آبائی وطن اورنگ آباد ہے جو ایلورا اور اجنتا کی سرزمین ہے۔ یہ دونوں مقامات فن کی اعلیٰ قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آج سے بارہ تیرہ برس قبل جب کشور ساہو اپنی فلم "کالی گھٹا" فلمانے ایلور آئے تو میری ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے گفتگو کے بعد ایک نظم لکھی جو ۱۹۵۱ء کی بہترین نظموں کے مجموعے (مرتبہ مرزا ادیب) میں شامل ہے۔ اس کا عنوان "زندگی اور پتھر ہے"

اس نظم کا آخری بند یہ تھا

اجنتا کا نظارہ کرنے والو
اجنتا کے بتوں میں کیا رکھا ہے
اجنتا پتھروں کی زندگانی ہے
یہ بستی زندگی کا بت کدہ ہے

اور اس کے بعد جب میں پاکستان آیا اور سندھ میں رہائش اختیار کی تو اس سرزمین سے متعلق ایک شعر کہا

اے رہگزار سندھ ترا چاند بجھ نہ جائے
آئے ہیں اس کی چاہ میں ارض دکن سے ہم

زمین کا عکس میری شاعری میں زندگی کے واسطے سے آتا ہے جسے میں فن کا منبع سمجھتا ہوں

سوال :۔ اپنے عہد کی فلمی شاعری کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

حمایت :۔ میں اپنے عہد کی فلمی شاعری کو بہت زیادہ اعلیٰ معیار کی شاعری تو نہیں کہہ سکتا۔ اعلیٰ شاعری کا تعلق جذبے کے علاوہ فکر سے بھی ہے اور فکری شاعری کی بنیاد آرزو لکھنوی بہت پہلے ڈال چکے ہیں مگر وہ فلسفیانہ زیادہ تھی۔ آج کی شاعری سماجی، سیاسی اور حسن و عشق کی دوسری اقدار سے زیادہ وابستہ ہے۔ اس اعتبار سے آج کی شاعری کو ایک حقیقت پسندانہ حیثیت ضرور دی جاسکتی ہے لیکن بہرحال آج بھی اپنی ادبی سطح کے باوجود یہ آرزو لکھنوی کی فلمی شاعری کی سطح تک نہیں پہنچ پائی۔

سوال :۔ حمایت علی شاعر صاحب فن تجارتی قدروں کا حامل ہو یا اس میں اعلیٰ مثالی قدروں کا اظہار کیا گیا ہو۔ اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے والا ذوق ہر دور میں مختلف رہا ہے۔ یہ بتائیے آج کل جو ذوق پرورش پا رہا ہے وہ اپنی غذا کہاں سے حاصل کرتا ہے۔

حمایت :۔ ذوق ہر دور میں بدلتا ہے۔ آج کا انسان سامنے کی چیزوں پر زیادہ توجہ دیتا ہے' آج سے پہلے کا انسان نسبتاً" دور کی سوچتا تھا اور فکر کی نئی راہیں نکلتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ بیچ میں ایک دور آیا تھا جو ممکن ہے اس کے ردعمل کے طور پر آیا ہو کہ فلمی شاعری کی سطح گر گئی تھی۔ موجودہ شاعروں نے اسے سنبھالا دیا ہے اور اس کوشش میں ہیں کہ فلم کی شاعری ایک بار پھر اپنے اعلیٰ مقام کو حاصل کر لے۔

سوال :۔ آپ کے خیال میں پاکستان اور ہندوستان میں فلم کا کوئی شاعر ایسا ہے جس سے رہنمائی حاصل کی جاسکے

حمایت :۔ رہنمائی کا مقام کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ اس وقت فلم میں جتنے بھی شاعر ہیں' وہ یا تو ابھی تک بعض شعراء سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یا ان کی جو اپنی ادبی حیثیت ہے' کم و بیش اسی کا فلم میں بھی اظہار کرتے ہیں۔ اس لئے یوں تو کہا جاسکتا ہے کہ "ہر شخص اپنے اپنے شعور کے مطابق اپنی اپنی راہنمائی کرسکتا ہے" لیکن ابھی تک کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جس کی رہنمائی قبول کی جاسکے۔

مثال کے طور پر ساحر کا نام نمایاں طور پر لیا جاتا ہے کہ انہوں نے فلم میں اچھی شاعری کی لیکن ان کی ادبی حیثیت بھی فیض کے "نقش فریادی" سے آگے نہیں بڑھ سکی جو ان کا پہلا مجموعہ کلام تھا۔

سوال :۔ جب آپ فلم میں داخل ہوئے تو آپ کو یہاں کا ادبی ماحول کیسا لگا اور اب آپ تبدیلی کا کیا احساس پاتے ہیں

حمایت :۔ جب پہلے پہل آیا تو دو ایک نام تھے جو اتفاق سے ادبی حیثیت زیادہ رکھتے تھے۔ جگنو کی چمک کی طرح کبھی کبھی فضا کو روشن کر دیتے تھے لیکن وہ چمک شعلہ بن کر ساری فضا کو منور کرنے سے قاصر تھی۔ میں نے سوچا کہ میں بھی ایک چنگاری کی طرح اپنا حصہ اس میں ادا کردوں تاکہ اس شعلہ تابانی نصیب ہوسکے لیکن میں بھی کچھ زیادہ نہ کرسکا اس کی وجہ ظاہر ہے کہ شاعر مجبور ہے وہ بعض ایسے فلم سازوں کے لئے کام کرتا ہے جو اسے اپنے دماغ سے کم سوچنے دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ بھی وہی بات کہنے لگے جو وہ خود سوچتے ہیں لیکن اب رفتہ رفتہ ایسے امکانات روشن ہونے لگے ہیں کہ شاعر کو زیادہ سے زیادہ سوچنے کا موقع ملے اور وہ بہتر شاعری کرسکے۔

سوال :۔ آپ اپنے ایوارڈ یافتہ گیت کے بارے میں کچھ بتایئے۔ آپ نے کس طرح لکھا

حمایت :۔ گیت خود اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس میں مجھے کس قدر مشکلات پیش آئی ہوں گی کہ یہ گیت وقت واحد میں دو مختلف صورت احوال کی ضروریات پوری کرتا ہے اور کہانی میں ایک غنائی اضافے کا کردار ہی ادا نہیں کرتا بلکہ کہانی کے بنیادی جزو کی حیثیت سے شامل ہے' اگر میں اس گیت کی سچوایشن کو نہ سمجھ پاتا اور میرا میوزک ڈائریکٹر اس کی روح کو نہ سمجھ سکتا تو نہ صرف یہ گانا ہوٹ ہوجاتا بلکہ ممکن ہے کہ پوری فلم کو لے بیٹھتا' خوش نصیبی کہئے کہ سنتوش کمار اس کے فلم ساز تھے اور انہوں نے اس گانے کی تخلیق کے لئے ایسا ماحول فراہم کیا جہاں میں پوری دلجمعی کے ساتھ گیت لکھ سکوں ان کے ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں ہم رات کو سات بجے بیٹھتے۔ وہ بار بار مجھے سچویشن سمجھاتے' مجھے مختلف شعرا کا کلام سناتے' وہ چونکہ خود شاعرانہ مزاج رکھتے ہیں اور ایک وقت خود بھی شاعر رہ چکے ہیں اسی لئے وہ میری تخلیقی نبض کو اکساتے رہتے اور جب دل نہ لگتا تو کوئی خوبصورت آکسٹرا شروع ہوجاتا۔ یوں اس گیت کی تخلیق ہوئی۔

سوال :۔ شہرت سے پہلے کا کرب آپ کے سامنے کس کس روپ میں آیا ہے

حمایت :۔ مجھے تنہائی کا احساس شدید رہا ہے۔ تنہائی خود کشی بن کر میرے سامنے آئی ہے اور میں نے اپنے آپ کو ختم کرنے کا سوچا۔ اختر الایمان کی ایک نظم ہے جس میں یہ مصرع آتا ہے

نقرئی گھنٹیاں سی بجتی ہیں

یہ گھنٹیاں میرے کانوں میں بجیں اور میں زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ آرٹسٹ اپنے اندر ایک تشنگی سی محسوس کرتا ہے وہ تشنگی ایسی تنہائی کی طلب گار ہوتی ہے جو اس کے آئیڈیل سے دور ہونے یا اسے نہ پانے کی وجہ سے ہوتی ہے اور آئیڈیل تو کبھی نہیں ملتا

سوال:۔ اس وقت جبکہ آپ شہرت کی روشنی میں کھڑے ہیں اور لوگوں نے آپ کو اور آپ کے شعر دونوں کو پہچان لیا ہے' کیا آپ کے اندر کسی نایافتہ شے کا دکھ باقی ہے؟ء

حمایت:۔ میرے اندر محرومیاں ہی محرومیاں ہیں۔ پہلی تو اسی آئیڈیل کی محرومی جو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا پھر اس شاعر کی محرومی جو ابھی وہ شعر کہہ نہیں سکا جو مجھے زندہ رکھے اور جس کی تلاش میں' میں یہ سارا سفر کاٹ رہا ہوں۔ ابھی تک محسوس ہوتا ہے کہ منزل مجھ سے دور ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے' میں شاید اب تک جس کرب سے گزر چکا ہوں اب اس سے بھی زیادہ کرب ناک لمحوں سے گزرنا پڑے۔ میں اپنی شہرت سے آج بھی مطمئن نہیں اور اپنے اندر کسی کمی کا مستقل احساس پاتا ہوں۔ جب بھی کوئی شعر کہتا ہوں تو کچھ دنوں بعد وہ میری نظر سے اتر جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے پھر از سر نو سفر شروع کرنا ہے

سوال:۔ آپ لکھنے کے لئے انسپائریشن کہاں سے لیتے ہیں

حمایت:۔ زندگی میرے لئے انسپائریشن کا بنیادی منبع ہے۔ اسی زندگی کے مختلف مظاہر سے میں مواد حاصل کرتا ہوں۔

سوال:۔ ان مظاہر حیات کی کچھ وضاحت کیجئے گا

حمایت:۔ رنگ' حسن' خوشبو' زندگی کی تلخ و ترش حقیقتیں اور ان دیکھے خواب جن کی لئے آنکھیں بیدار رہتی ہیں

سوال:۔ آپ نے اپنے فن میں غیر ملکی شعراء کا اثر لیا ہے اگر لیا ہے تو وہ کون کون ہیں؟

حمایت:۔ میرا ہمیشہ ہی یہ مطمح نظر رہا ہے کہ ہمارے شعراء میں ایسے فنکاروں کی کمی نہیں جنہیں باہر کے بڑے سے بڑے فنکاروں کے مقابلے میں نہ رکھا جاسکے لیکن باہر کے فنکاروں نے ہیئت میں اور اسلوب میں' نت نئے تجربے کئے ہیں۔ ان سے ہمارا کلاسیکی ادب کسی حد تک ہم آہنگ ہو سکتا ہے اور ہم دونوں کے اشتراک سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مثلاً" میں ایلیٹ یا "یٹس" دونوں کو پڑھتا ہوں تو ساتھ ساتھ' غالب' میر کو بھی نظر میں رکھتا ہوں۔ مجھے "یٹس" "ایلیٹ" اور براؤننگ بنیادی طور پر پسند ہیں اور اس اعتبار سے میر' غالب' اقبال اور جوش اور ان کے مطالعے سے آپ کو مستقل سنوارنے کی کوشش کرتا ہوں۔

(مطبوعہ "نگار" اپریل ۱۹۶۳ء)

(۲)

سوال:۔ آپ جذبہ تخلیق کی وضاحت کریں گے؟ آدمی لکھنے پر کیوں مجبور ہوتا ہے؟ کیا مقصد اپنی ذاتی کی نمود؟

شاعر:۔ آپ کیوں لکھتے ہیں؟ یہ ایک ایسا ہی سوال ہے' آپ کھانا کیوں کھاتے ہیں؟

محبت کیوں کرتے ہیں؟
محبت کرتے ہیں تو اس کی روحانی اور جسمانی تکمیل کیوں چاہتے ہیں؟
کھانے اور محبت کرنے کی طرح لکھنا بھی انسان کی بنیادی احتیاج ہے۔ اس احتیاج کے تحت ادیب لکھتا، شاعر شعر کہتا، مصور تصویر بناتا اور موسیقار گاتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آرٹسٹ کو اپنی صلاحیت کا سراغ مل جائے اور وہ اس کا صحیح مصرف جان لے، بادی النظر میں یہ ایک خلش ہے جس کی تسکین اس طرح ہو سکتی ہے کہ شاعر اس خلش کا کسی عنوان اظہار کردے، خلش کی تسکین اظہار سے ہو جاتی ہے۔ دوسروں تک پہنچنے کا تعلق ایک دوسرے جذبے شہرت کی خواہش سے ہے اور یہ جذبہ ہر تخلیقی فنکار میں ہوتا ہے۔
سوال:۔ فلم میں گیت لکھنے کے ناطے سے آپ کا کیا خیال ہے کیا فلمی شاعری شاعری کی ارتقا یافتہ شکل ہے یا اس سے کمتر؟
شاعر:۔ شاعری کی حدود وسیع ہیں۔ اس میں نہ صرف جذبے بلکہ فکر کی شاعری بھی شامل ہے۔ فلمی شاعری ابھی تک محسوساتی یا جذباتی شاعری تک آئی ہے۔ میری شاعر کا جو معیار ہے اس کے پیش نظر میں جب بھی اپنی شاعری اور فلمی شاعری کا موازنہ کرتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کچھ سیڑھیاں نیچے اترنا پڑتا ہے مثال کے طور پر جب میں اپنے لئے شعر کہتا ہوں تو ایسے موضوعات بھی سمت آتے ہیں جنہیں فلمی حدود شاید برداشت نہ کرسکیں مثلاً" میری یہ مختصر نظم ہے اس کا عنوان ہے۔ "تکمیل"

وقت آوارہ ہوا کے مانند
شعلہ زیست ہے شبنم کی طرح
آ مٹا دیں یہ تفاوت یہ جمود
آ کہ ہو پھر کسی عیسیٰ کا ورود
تو بھی مظلوم ہے مریم کی طرح
میں بھی تنہا ہوں خدا کے مانند

بعض شعراء جن کی ادبی سطح فلم کی سطح سے بلند ہوتی ہے انہیں نیچے اترنا پڑتا ہے۔ جن کی سطح فلم کی سطح تک تھی انہوں نے کوشش کی کہ فلم میں وہ گیت یا نظمیں لے آئیں جن سے ان کی ادبی شخصیت معروف ہے، ان میں ساحر کا نام سرفہرست ہے ۔ مجروح نے بھی اپنی ادبی شاعری میں سے فلم کو ایک ہی غزل دی ہے

ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہ غزلیں جن سے مجروح کی شخصیت پہچانی جاتی ہے وہ فلم میں نہیں آسکتیں کیونکہ ان کی سطح فلم کی سطح سے بلند ہے مثلاً" مجروح کی ایک غزل کا شعر ہے

پکاریئے کف قاتل کو اب معالج دل
بڑھے جو ناخن خنجر گرہ کشا کیئے

اسی طرح فیض کی نامور نظمیں

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں

فلم میں نہیں آسکتیں۔

سوال :۔ اور اگر بات فلم کی شاعری ہی سے آغاز ہو تو کیا آج فلم کی شاعری کچھ آگے بڑھی ہے یا سابقہ معیار سے نیچے اتری ہے۔

شاعر:۔ فلم کی شاعری کا معیار بلاشبہ بڑھا ہے۔ ابتداء میں شاعری کا معیار نہ بڑھنے کی وجہ ایک یہ تھی کہ شاعری کو دوسرے فنون کی نسبت کمتر سمجھا گیا۔ نتیجتاً لوگ شعراء سے مختلف دھنوں پر گیت لکھواتے رہے شاعر جو علم کے راستے فلم تک پہنچا، بعض ایسے میوزک ڈائریکٹروں کے ساتھ کام کرنے پر مجبور ہو جاتا جنہیں علم کی دنیا سے واقفیت نہ تھی۔ جب یہ احساس بیدار ہوا کہ شعر کی اپنی بھی ارفع اعلیٰ حیثیت ہے تو بے شمار اشعار ایسے بھی آئے جو فلمی دھنوں کا سہارا لئے بغیر زبان زد خاص و عام ہوئے۔ پھر ایسے شاعروں کی بھی تلاش ہوئی جو صحیح معنوں میں شاعر تھے۔ اس رو میں اہم نام آرزو لکھنوی کا ہے جنہوں نے پہلی بار فلمی شاعری کے بارے میں ادبی انداز سے سوچا اور صرف جذباتی شاعری نہیں کی بلکہ اس میں فکر کا عنصر بھی شامل کیا۔

سوال :۔ میرا خیال ہے فلم کی شاعری ان دنوں ایک لڑکی کے حسن و جمال کی تعریف پر آکر رک گئی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

شاعر:۔ حسن کا موضوع بڑا متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ عورت کا وجود ازل سے ہے۔ مرد کی نگاہیں اسے دیکھنے سے تھکی نہیں خدوخال کے مخصوص اور متعین ہونے کے باوجود ان میں ہر لحہ ایک نیا پن محسوس ہوتا ہے، اس حسن کا سراپا فلمی شاعری کا موضوع ہے اور اپنے اندر نت نئی چاشنی اور نت نئے پہلو رکھتا ہے۔ دیکھنے سننے والی نگاہیں ان سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتیں لیکن ممکن ہو سکے تو فلمی شاعری میں زندگی کے رنگا رنگ موضوعات اور نت نئے پہلو آجائیں اس طرح اس کے سرمائے میں اضافہ ہو جائے گا عورت حسن اور محبت ایک ہی چیز کے تین نام ہیں اور یہ نام لازوال ہیں۔

سوال :۔ آپ نے اپنی فلمی شاعری میں شعوری اور لاشعوری طور پر کیا کیا تجربے کئے ہیں؟

شاعر:۔ میری فلمی شاعری کی عمر تھوڑی ہے اور تجربات محدود ہیں لیکن جہاں کہیں مجھے موقع ملا میں نے اس بات کی کوشش کی کہ عام آدمی کی ذہنی سطح کا خیال رکھتے ہوئے اپنے گانوں میں ادبی حسن اور ایک معیار پیدا کروں۔ شاعر اپنے فلمی کے کردار سے اپنی کوئی نظم یا ایسی غزل نہیں گوا سکتا جو اس کی ذہنی سطح سے بلند ہو، اسے اس کردار کی سطح پر آکر لکھنا پڑتا ہے، ان مجبوریوں کا شکار فلم کا ہر شاعر ہوا ہے۔ ساحر، مجروح اور قتیل نے بھی فلمی ضروریات کے تحت ایسے گیت بڑی تعداد میں لکھے ہیں مثلاً "ساحر تانگہ لاہوری میرا گھوڑا پشوری میرا

مجروح ڈم ڈم ڈیگا ڈیگا ، موسم بھیگا بھیگا

سوال :۔ اپنے آنے والے چند گیتوں کا تذکرہ کریں جن سے آپ کی فلم کی شاعری کے معیار کا اندازہ کیا جا سکے؟

شاعر:۔ میں نے اب تک جو قابل ذکر گیت لکھے ہیں۔ میرا خیال ہے ان کا معیار وہی ہو گا جو میں نے آنچل، دامن اور جب سے دیکھا ہے تمہیں میں پیش کیا ہے اور انشاء اللہ ان سے بہتر ہی گیت میں نے میرے محبوب، سہرا، نائیلہ اور تصویر میں لکھے ہیں ان گیتوں میں ادبی حسن بھی ہے اور وہ سنجیدگی بھی جس سے فلم کی اچھی شاعری عبارت ہے۔

ان گیتوں کے ٹکڑے ملاحظہ کریں جن سے آپ ان کے معیار کا اندازہ لگا سکیں گے

"میرے محبوب میں" دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

سامنے رشک قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

تم سا حسیں کوئی نہیں کائنات میں
ناز و ادا' شرم و حیات بات بات میں

کلی مسکرائی جو گھونگھٹ اٹھا کے

"سہرا" میں

شعلہ کہوں کہ پھول کہوں کیا کہوں تمہیں — دور ویرانے میں اک شمع ہے روشن کب سے
تم ہی کہو' حسین سا کیا نام دوں تمہیں — کوئی پروانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے

"نائلہ" میں

مل کے جھک جائے نظر تو اسے کیا کہتے ہیں — اے جان وفا دل میں تری یاد رہے گی
لوگ تو اس کو محبت کی ادا کہتے ہیں — دنیائے محبت تری آباد رہے گی

"تصویر" میں

(مطبوعہ - ہفتہ وار "نگار" ۱۰ مئی ۱۹۶۴ء)

(۳)

ایک ادبی نظم کی غنائی تشکیل

(تجھ کو معلوم نہیں' تجھ کو بھلا کیا معلوم)

سوال۔ شاعر صاحب ہر شاعر جب کوئی چیز لکھتا ہے اس کے ذہن میں الفاظ کے پس پردہ ایک موسیقی کا تصور بھی ہوتا ہے۔ اب جبکہ آپ کی نظم کی ایک دھن بھی بن چکی ہے کیا اس سے آپ کے اس تصور کی تکمیل ہوتی ہے؟

آپ نے بڑا اہم سوال کیا ہے کہ میری غیر فلمی شعری تخلیقات میں کس نظم' غزل' یا گیت کو ایسے غنائی رچاؤ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو اس کی شعری فضا سے ہم آہنگ ہے۔

برادرم! میری اب تک دو غیر فلمی نظمیں فلموں میں آئی ہیں "ایک بھائی بہن" میں "آنسوؤ آج ساتھ دو میرا" یہ نظم میری کتاب "آگ میں پھول" میں "غم رائیگاں" کے عنوان سے شامل ہے اور دوسری نظم "ان کی" ہے جس کا کچھ حصہ فلم "آنچل" میں استعمال ہوا ہے۔ اول الذکر فلم چونکہ ابھی تک زیر تکمیل ہے اس لئے اس پر خیال آرائی قبل از وقت ہوگی۔ دوسری نظم کے بارے میں البتہ میں ضرور اپنے تاثرات پیش کروں گا۔ آپ کو شاید یاد ہو اس نظم کا پہلا مصرعہ تھا

تجھ کو معلوم نہیں' تجھ کو بھلا کیا معلوم

اس نظم کو نغمے کی صورت ہمارے ملک کے ایک نوجوان اور پڑھے لکھے موسیقار خلیل احمد نے دی ہے۔ خلیل چونکہ خود بھی بڑا اچھا شعری ذوق بلکہ ادبی شعور رکھتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس نظم کی دھن بنانے میں ہر اس بات کا خیال رکھا ہے جو میرے اشعار کا تقاضا تھا حالانکہ فلم "آنچل" خلیل کی پہلی فلم تھی اور آپ جانتے ہیں کہ کوئی موسیقار خواہ وہ کتنا ہی جانکار کیوں نہ ہو' ابتداء میں اپنے مزاج اور اپنی مرضی سے کم ہی کام کرپاتا ہے۔ اس لئے خلیل کو بھی اس نظم کی غنائی آرائش میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑا لیکن مجھے خوشی ہے کہ ہر تعین کے باوجود خلیل نے اپنی حد تک پوری کوشش کی

کہ اشعار کی روح فنا نہ ہونے پائے اور اس شعلے کی حدت باقی رہے جو میرے سینے میں پھول بن کر کھلا تھا اور جس کی خوشبو میرے حجلہ تخیل کے گوشے گوشے میں بسی ہوئی تھی۔

آپ اس نظم کو (جو اشعار فلم میں آئے ہیں) ایک بار پڑھ لیں اور تاثر کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھیں۔ شاید آپ نے محسوس کیا ہو کہ ان اشعار کے پیچھے ایک ایسے نوجوان کا دل دھڑک رہا ہے جس میں پہلی بار ایک لطیف سی حسرت بیدار ہوئی ہے اور یہ حسرت اس میں اس حسن نے پیدا کی ہے جو اچھوتا ہے' سادہ و معصوم ہے۔ جس کے پرتو نے اس کے خیالات میں رنگ بھر دیئے ہیں اور اس کے خوابوں کو صنم زار بنا دیا ہے۔ وہ اپنے اچھوتے محبوب کے تصور میں کھویا ہوا اس حقیقت کی جستجو کر رہا ہے جس کا ابھی کوئی نام نہیں ہے اور وہ اس حقیقت کو کوئی نام اس لئے نہیں دے پایا ہے کہ اس کے احساسات میں ابھی تک تذبذب۔ ایک ہلکا سا اندیشہ بھی شامل ہے

جانے تو کون ہے' میں نے تجھے سمجھا کیا ہے
جانے تجھ کو بھی مرے دل کی خبر ہے کہ نہیں

خلیل نے اس نغمے کی ترتیب میں جو ساز استعمال کئے ہیں' وہی اس کی شعوری کاوش کا پتہ دیتے ہیں۔ اس نے مختلف وائلنوں کی آواز کو ایک خاص سر میں ہموار کر کے اس نغمے کی فضا تیار کی ہے۔ یہ فضا اسی لطیف مسرت کی آئینہ دار ہے جس میں انبساط کے ساتھ ساتھ غم کی ایک لہر بھی کروٹیں لے رہی ہے لیکن خوشی کا جذبہ چونکہ غالب ہے اس لئے خلیل نے نغمے کا آغاز سر منڈل اور پیانو کی ایک ایسی جھنکار سے کیا کہ محسوس ہوتا ہے' دل کے تار بج اٹھے ہوں اور اس کے ساتھ ہی گلوکار کی آواز ابھر آتی ہے۔ اس گانے کے لئے سلیم رضا کا انتخاب بھی خلیل کی نکتہ رسی کی دلیل ہے۔ سلیم رضا کی آواز میں قدرتاً" ایک سوز شامل ہے خلیل نے اس سوز کو اپنے خوش آہنگ سازوں میں رچانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لئے اس نے اکارڈین (ACCORDIAN) سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے جیسے ہی مکھڑا ختم ہوتا ہے اکارڈین کی آواز وائلن کی آوازوں میں تحلیل ہو جاتی ہے اور وہ دبا دبا دکھ ابھر آتا ہے جو اس نظم کی روح میں بیدار ہے۔ اس کے بعد جب پہلا انترہ (نظم کا پہلا بند) آپ سنتے ہیں جس میں قامت کے لچکتے ہوئے مغرور تناؤ کا ذکر ہے تو وائلن اور ویولا (VIOLA) کے لمبے لمبے اور لکچدار نوٹس بھی سنائی دیتے ہیں اور اس کے بعد جیسے ہی گلوکار

وہ چھلکتے ہوئے ساغر سی جوانی

کہتا ہے تو یکایک سر منڈل کی ایک ایسی جھنکار ابھر آتی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ

ساغر ساز سے نغمات کی مے چھلکی ہو

اور اس کے بعد ہی اکارڈین کا ایک فلیش (FLASH) اس انداز میں آتا ہے کہ اس مصرع کی پوری پوری ترجمانی ہو جاتی ہے۔

جیسے شعلہ سا نگاہوں میں لپک کر رہ جائے

اس نظم کے دوسرے بند کی فضا رومان میں ڈوبی ہوئی ہے۔ شاعر اپنے محبوب کی ہر بات' ہر انداز' اس کے ترشے ہوئے پیکر کے ہر خط سے ایک خاص تاثر لیتا ہے اور اس کا رد عمل اپنی زندگی میں محسوس کرتا ہے۔ خلیل نے اس کیفیت کا اظہار وائلن اور ستار کے ملے جلے نوٹس سے کیا ہے۔ یہ نوٹس اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہیں کہ یک جان دو قالب کا گمان ہوتا ہے

اور جب اشعار میں خوابوں کے صنم خانوں کو سجایا جاتا ہے تو خلیل نے وائبروفون (VIBROPHONE) کے نوٹس ابھار کر نغمے پر ایک خواب کا عالم طاری کردیا ہے۔ نظم کا تیسرا بند ایک تذبذب ایک ہلکے اندیشے کی غمازی کرتا ہے لیکن چونکہ نظم کا دوسرا بند خواب گوں کیفیت کا حامل تھا اور تیسرے بند کا پہلا مصرعہ یہ تھا کہ

جانے اس حسن تصور کی حقیقت کیا ہے

تو اس کھوئی کھوئی افسانوی فضاء سے' یعنی تصور سے حقیقت تک پہنچنے میں شاعر نے جو مسافت طے کی ہے۔ اس کو خلیل نے الیکٹرک گٹار کے PLUCKING NOTES اور اکارڈین کے FLASHES سے ظاہر کیا ہے۔ جہاں الیکٹرک گٹار کا استعمال خلیل کے اس ادارک کا احساس ولاتا ہے کہ اس ساز کی آواز جو گھنٹی کی کھنک سے مشابہ ہے' پاکیزگی' معصومیت اور تقدس کی علامت ہے۔ (مندروں میں گھنٹیوں کے بجنے کا جواز بھی یہی ہے) خلیل نے جذبے کی اصلیت کو سمجھنے کی بلاشبہ ایک شعوری کوشش کی ہے۔ اس نے محبت کو عبادت کے متوازی سمجھا ہے اور یہی میرا مطمح نظر ہے۔ خیر تو نظم کے تیسرے بند میں جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں ایک تذبذب اور اندیشے کا احساس بھی شامل ہے یعنی اضطراب اور سکوں کی ایک داخلی کش مکش ہے' خلیل نے اس تاثر کے اظہار کے لئے وائلن کے کاؤنٹر بنائے ہیں اور سر منڈل کے ACENDING FLASH سے دل کی اس دھڑکن کا سراغ دیا ہے جو اس مصرع کا غماز ہے

جانے تو کون ہے' میں نے تجھے سمجھا کیا ہے

اور پھر وائلن کے وہ سرجن سے اس نغمے کی زمین ہموار کی گئی ہے' ابھر آتے ہیں اور گلوکار کہتا ہے

تجھ کو معلوم نہیں' تجھ کو بھلا کیا معلوم

آخر میں خلیل نے ایک نہایت ہی لطیف' خوش گوار اور زیر لب گنگناہٹ (HUMMING) کے ساتھ بتدریج اس نغمے کو ختم کیا ہے جس سے ایک حسین اور کھوئی ہوئی سوچ کی فضا بن گئی ہے۔

ایک بات اور جو اس نظم کی غنائی تشکیل کے بارے میں کہنی ہے۔ یہ ہے کہ خلیل نے ویسے تو کئی راگوں سے تھوڑا تھوڑا استفادہ کیا ہے لیکن کہیں کہیں درباری اور باگیشری کے سروں کو نمایاں کرکے جو فائدہ اٹھایا ہے وہ قابل قدر و ستائش ہے۔

کاش اس نغمے کی لے ذرا دھیمی ہوتی اور سلیم رضا الفاظ کی نشست کو سمجھتے ہوئے ذرا سی توجہ سے گاتے تو اس نظم کا تاثر ہی کچھ اور ہوتا۔ انہوں نے بعض مقامات پر غیر ضروری مرکیاں بھی لی ہیں جن سے لفظوں کا صوتی حسن کسی قدر متاثر ہوگیا ہے۔ ہمارے گلوکاروں کو چاہئے کہ وہ لفظوں کی ادائیگی کی طرف خاص توجہ دیا کریں۔ لفظ بڑے نازک ہوتے ہیں' ان کے مزاج کو سمجھنا اور اشعار میں ان کے انداز نشست کو پرکھنا بھی بڑے ہنر کا کام ہے۔ انہیں یہ سوچ کر ہر لفظ کو ادا کرنا چاہئے کہ ان الفاظ کی آغوش میں محسوسات اور جذبات کی ایک دنیا آباد ہے اور شاعر نے اس دنیا کی تعمیر میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے

(مطبوعہ "نگار" مئی ۱۹۶۳ء)

بونوں میں کیا کرے کوئی خوش قامتی پہ ناز
کیا جانے وہ ہنر کوئی' جو میرے فن میں تھا

واویلا

حمایت علی شاعر

(۱۹۶۵ء کی ایک نظم اپنے محسنوں کے نام)

اٹھا ساقیا ساغر واژگوں
کہ کچھ سر پھروں کو کریں سرنگوں
کچھ اتنی پلا دے کہ اڑجائیں ہوش
وگرنہ یہ ہوں گے نہیں یوں خموش
ہر اک اپنے نشے میں مخمور ہے
جو ہے، سر کشیدہ ہے مغرور ہے
کسی کو ہے ناز اپنے اشعار پر
کسی کو ہے فخر اپنے افکار پر
کوئی ہے گلوکار، خود ساختہ
اڑائے دھنوں میں کوئی فاختہ
کوئی بن گیا ہے کہانی نویس
سمجھتا ہے خود کو قلم کا رئیس
سنا ہے کہ رکھتے ہیں سب ڈگریاں
ابوجہل کی ہیں یہ پرچھائیاں
کیئے کاغذی پیرہن زیب تن
بنے پھر رہے ہیں یہ سب اہل فن
یہ شاعر کہیں ایک جاہل جسے
علی کی حمایت ہے حاصل جسے
بھلا یوں کوئی مانتا ہے کہیں
تخلص سے شاعر تو ہوتا نہیں
یہ فلموں میں نغمہ نگاری کرے
کسی طرح سے پیٹ اپنا بھرے

اسے کون کہتا ہے نغمہ نگار
یہ جو کچھ ہے صورت سے ہے آشکار
وہ "آنچل" کہ تھی اس کی پہلی ہی فلم
ایوارڈ اس کو دے بیٹھے ارباب علم
وہ "آنچل" بھلا کوئی تصویر تھی
سنا ہے کہ شاعر کی تقدیر تھی
کوئی ڈھنگ کا اس میں نغمہ نہ تھا
اگر تھا تو وہ اس کا اپنا نہ تھا
ایوارڈ اس کو دے بیٹھے "اہل نگار"
بنام عوام حقیقت شعار
بڑھا دی یونہی مفت میں آبرو
"تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو"
کوئی بھول سکتا ہے وہ سانحہ
پڑھی تھی جب اس پر بہت فاتحہ
ہر اخبار میں ایک مضمون تھا
کہ شاعر کا اشعار کا خون تھا
بہت اس کا دامن کیا داغدار
سرعام اس کو کیا سنگسار
مگر اس میں تھی اتنی غیرت کہاں
وہ کرتا رہا یوں ہی تک بندیاں
کہ اک سال پر دوسرا سال آگیا
وہ "دامن" پہ ایوارڈ پھر پاگیا

یہ سب کیا ہے، بس مکروفن ہی تو ہے
سیاست کا طرفہ چلن ہی تو ہے
فقط دوست داری کا انداز ہے
ہمیں ہے خبر اس میں کیا راز ہے
جو اس کی کتاب "آگ میں پھول" ہے
گدھے پر وہ اطلس کی اک جھول ہے
خدا جانے کیا صدر کا ہے یہ راز
کیا اس کو انعام سے سرفراز
نہ انشاء درست اور نہ املا درست
بتائے کوئی اس میں ہے کیا درست
فقط چند لفظوں کا ایک ڈھیر ہے
یہاں دن دھاڑے یہ اندھیر ہے
اندھیرے میں چکر چلاتا ہے وہ
اور اپنی دکاں چمکاتا ہے وہ

سنا ہے کہ اچھا گلے باز ہے
خدا کے کرم سے خوش آواز ہے
یہ شاعر بھی ہے اور اداکار بھی
کوئی ہوگا ایسا ریاکار بھی
کہیں نان پاٹے، کہیں گھن گرج
عجب اس کی سج اور عجب اس کی دھج
غرض اچھا خاصا مداری ہے وہ
جو سوچو تو ہر شے سے عاری ہے وہ
بنانے لگا ہے یہ اک فلم بھی
اسے فلسازی کا ہے علم بھی؟
ہیں ساتھ اس کے دو ایک منکر نکیر
کہ ہیں مکر و فن میں یہ سب بے نظیر
یہ کل کیا تھا اور آج کیا بن گیا
یہ مٹی کا مادھو "خدا" بن گیا

۱۔ احمد رشدی ۲۔ خلیل احمد ۳۔ ذاکر حسین ۴۔ حمایت علی شاعر ۵۔ نگار ایوارڈ (۱۹۶۲ء)
۶۔ نگار ایوارڈ (۱۹۶۳ء) ۷۔ صدارتی ایوارڈ (۱۹۵۹ء) ۸۔ لوری

(اشاعت مکرر۔ روزنامہ "کلیم" ۱۱ نومبر ۸۳ء)

(نوا را تلخ ترمی زن.....)

اس وشت سخن میں کوئی کیا پھول کھلائے
چمکی جو ذرا دھوپ تو جلنے لگے سائے
سورج کے اجالے میں چراغاں نہیں ممکن
سورج کو بجھادو کہ زمیں جشن منائے

مہتاب کا پرتو بھی ستاروں پہ گراں ہے
بیٹھے ہیں شب تار سے امید لگائے
ہر موج ہوا، شمع کے درپے ہے ازل سے
دل سے کہو، لو اپنی ذرا اور بڑھائے

کس کوچہ طفلاں میں چلے آئے ہو شاعر
آوازہ کسے ہے تو کوئی سنگ اٹھائے

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

حمایت علی شاعر

کچھ ہفتوں کی بات ہے جب ہم نے حمایت علی شاعر سے ان کے ایوارڈ یافتہ گیت پر انٹرویو شائع کیا تھا اسی انٹرویو کے حوالے سے ہمیں ایک خط، ملا تھا۔ جسے چھاپ کر ہم نے عنوان باندھا تھا "کیا روشنی پانا عیب ہے؟" اس عنوان کے تحت بہت سے اہل فکر نے اظہار خیال کیا۔ اور بڑی قابل قدر باتیں ہاتھ آئیں جو ہم نے جوں کی توں نذر قارئین کردی ہیں۔ اب اسی سلسلے میں حمایت علی شاعر نے ایک طویل شعری مطالعہ بھیجا ہے جو اس وقت آپ کے سامنے ہے یہ باتیں خالص ادب کی ہیں۔ فلم کے پرچے میں ان کے شائع ہونے سے وہ دیوار گر جاتی ہے جو فلم اور ادب کے مابین ہے۔ اسی ضمن میں ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ شاید فلم کا یہ پہلا گیت ہے جس پر اس طرح بحث چھڑی ان سطور کے ذریعے ہم پاکستان اور ہندوستان کے اور شعراء کو بھی بحث کی دعوت دیتے ہیں تاکہ ایک مسئلہ پر اور نئی باتیں جمع ہو جائیں
(ادارہ "نگار")

اس بحث نے تو طوفان بپا دیا ہے لاہور میں فلمی حلقوں سے لیکر ادبی حلقوں تک یہی بحث تقریباً" ہر ٹیبل ٹاک کا موضوع ہے۔ ابھی ابھی ڈھاکہ سے بھی ایک دوست کا خط آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ وہاں بھی کچھ لوگ قلم تولے بیٹھے ہیں بہرحال مجھے خوشی ہے کہ ابھی تک یہ بحث ذاتیات سے پاک ہے اور ادبی سنجیدگی کی بھی حامل ہے۔ فلمی رسائل میں ادبی موضوعات پر چونکہ بہت کم لکھا جاتا ہے اس لئے اس بحث کو میں فال نیک سمجھتا ہوں کم از کم اسی بہانے کچھ کام کی باتیں عام لوگوں تک بھی پہنچ جائیں گی اور "نگار" یہ خدمت انجام دے کر ایک طرح سے دیگر فلمی رسائل کی بھی رہنمائی کررہا ہے۔

میری فلمی نظم "کسی چمن میں رہو" پر بحث چونکہ خالص ادبی رنگ اختیار کرچکی ہے اس لئے اس خط میں ایک دلچسپ ادبی مطالعہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس بحث میں اتفاق سے دو مقتدر ادبی شخصیتوں کے نام آگئے ہیں۔ حسرت، جو ہماری شعری روایات کے ایک اہم نمائندے ہیں اور فیض احمد فیض جن کا نام روایت اور جدیدیت کے حسین امتزاج کا ضامن ہے۔ اب ذرا یہ دیکھئے کہ ان عظیم فنکاروں کے کلام میں اپنے پیشروؤں کا مطالعہ کس طرح نمایاں ہوا ہے اور یہ سلسلہ درجہ بدرجہ کہاں پہنچا ہے۔

مولانا حسرت موہانی نے جن اساتذہ سے شعوری طور پر استفادہ کیا ہے ان کے بے شمار مقطعوں سے ظاہر ہے۔ میں نقل کرتا ہوں۔

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں
مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

شیرینی نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطف سخن تمام

شعر میرے بھی ہیں پردرد و لیکن حسرت
میر کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں

طرفہ حسرت یہ شوخی انشاء
رنگ جرات میرے بیان میں ہے

مولانا حسرت موہانی نے ان استفادوں کا اظہار جس فخر کے ساتھ کیا ہے وہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے بزرگ اسے عیب نہیں سمجھتے تھے۔

لیکن شاعر پر اپنے مطالعے کے بعض لاشعوری اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اس کی مثال مولانا حسرت کے کلام میں یوں نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنے تمام دیوان میں (استفادے کے سلسلہ میں) غالب کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ اگر غالب کا کہیں ذکر آیا بھی ہے تو یوں کہ

ہو کے بے خود کلام حسرت سے
"آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

اب ذرا حسرت کے ہاں غالب کی جھلکیاں ملاحظہ کیجئے	غالب
ہزاروں بار نکلے اشک لیکن پھر بھی کم نکلے	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
الٰہی اور کیسے آرزوئے چشم نم نکلے	بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں	ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
مری سادگی دیکھ' کیا چاہتا ہوں	جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
آئے گئے نہ پا کے غبار' حسرت انہیں بھی ہم سے عار	لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
جن پہ کہ ہم نے سب نثار' مال و منال کردیا	یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
مل گیا اچھا سہارا عذر مستی کا ہمیں	
لے لیا آغوش میں اس گل کو بے باکانہ آج	
مرے بعد گزرے وہ مشق ستم سے	کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ندامت کے پہلو نمایاں ہیں غم سے	ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
شاہ جنوں نے خلعت آزادگی دیا	احباب چارہ سازی وحشت نہ کرسکے
زنداں میں ہیں خیال کے صحرا بنے ہوئے	زنداں میں بھی خیال' بیاباں نورد تھا
پھر لے چلا ہے دل ہمیں تا کوئے ملامت	دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
خطرہ نظر آیا نہ اسے پیش پس کا	پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
چھیڑ ناحق نہ اے نسیم بہار	فراق یار میں تکلیف سیر باغ نہ دو
سیر گل کا یہاں کسے ہے دماغ	ہمیں دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا
تعجب کیا اگر نیکی کے بدلے ہو بدی حاصل	کہوں کیا خوبیٔ اوضاع ابنائے زماں غالب
نرالے ہیں یہاں کے قاعدے اے دل یہ دنیا ہے	بدی کی اس نے' جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی
شرح بیدردیٔ احباب کروں کیا حسرت	کرتے کس منہ ہو غربت کی شکایت غالب
رنج اپنا دل مایوس کو کم پہنچا تھا "	تم کو بے مہریٔ یاراں وطن یاد نہیں

مصرعے ملاحظہ ہوں!

ہے یہ وہ درد جو شرمندۂ درماں نہ ہوا (حسرت)   رنگ لائے گی کسی یہ گدائی دن آپ کی (حسرت)
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا (غالب)   رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن (غالب)

کافی تھی مجھے درد تہ جام بھی حسرت (حسرت)   کیا کہوں تم سے مدعا کیا ہے (حسرت)
یوں ہے کہ مجھے درد تہ جام بہت ہے (غالب)   کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے (غالب)

کیا پھر جذبہ بے اختیار شوق نے واپس (حسرت)   شکر الطاف نہیں، شکوہ بیداد نہیں (حسرت)
جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے (غالب)   ہے تقاضائے جفا، شکوہ بیدار نہیں (غالب)

اب وہ ہجوم شوق کی سرمستیاں کہاں (حسرت)   یہ بھی اچھا ہوا کہ برا نہ ہوا (حسرت)
وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں (غالب)   میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا (غالب)

مثالیں ان گنت ہیں لیکن طوالت کے خیال سے انہیں پر اکتفا کروں گا اب دوسرے مشاہیر اور ان کے ہم عصروں کی ایک ایک جھلک دیکھ لیں۔

فکر امروز ہی رکھیں، غم فردا نہ کریں (حسرت)   چھیڑ ناحق نہ اے نسیم بہار
فکر فردا نہ کروں، محو غم دوش رہوں (اقبال)   سیر گل کا یہاں کسے ہے دماغ   حسرت

دیکھنا وہ نگہ ناز کہاں ٹھہری ہے (حسرت)   میں اور سیر لالہ و گل ہجر یار میں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہاں (حالی)   کیسی بہار، آگ لگادو بہار میں   شاد

کچھ ہمیں تیری تمنا کے سوا یاد نہیں (حسرت)   نہ چھیڑ اے نکہت، باد بہاری راہ لگ اپنی
اب کچھ بھی نہیں مجھ کو محبت کے سوا یاد (جگر)   تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں   انشاء

اب کچھ بھی نہیں سوز غم دل کے سوا کے یاد (جگن ناتھ آزاد)

آیئے اب ذرا غالب کا مطالعہ کریں۔ غالب اپنے پیشروؤں سے استفادے کا اعتراف اس انداز میں کیا ہے۔

ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالب   غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا   آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

لیکن غالب نے کہیں بھی ناسخ سے استفادے کا ذکر نہیں کیا۔ (نگار کے پچھلے شمارے میں انور کمال مسرت صاحب نے اس سلسلے میں کافی مثالیں دی ہیں۔ اس میں ان اشعار کے علاوہ کچھ اور شعر نقل کروں گا) یہ مثالیں بھی لاشعوری ردعمل کے ذیل میں آتی ہیں۔

غالب	ناسخ
لاغر ایسا ہوں کہ گر تو بزم میں جاوے مجھے میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلاوے مجھے	لاغر ایسا ہوں کسی کو میں نظر آتا نہیں چاہیے مانی ورق سادہ مری تصویر کا
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ کہ ہوگئے مرے دیوار و در، در و دیوار	کون منت کرے دربانِ درِ جاناں کی ایک دم روؤں تو دیوار بھی در ہوجائے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر تو اس قدِ دلجو سے جو گلزار میں آئے	وہ سرو جو ہوتا ہے خراماں روشوں پر سایہ کی طرح پھرتے ہیں گلشن میں شجر ساتھ
ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا	اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں خشک ہوجائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا	مل گیا خاک میں پس پس کے، حسینوں پہ میں قبر پر بوئیں کوئی چیز، حنا پیدا ہو
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا دکھلاتا ہوں ہر روز میں اک داغِ نہاں اور	سرکا شبِ تاریک میں داغوں سے جو چھایا اک خلق مرے سامنے کھاتی ہے کھڑی دھوپ
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں	رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے کوئی
گیرم کہ بہ افشاندن الماس میر زم مشتے نمک سودہ بہ زخمِ جگرم ریز	گر سودہ الماس نہ تھا، لون چھڑکتا مہر دہن زخم کو قاتل سے گلہ ہے
تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا	وہ بادل ہیں جو لیں قرض، آبِ دریا مروں پیاسا، نہ لوں آبِ بقا قرض

اب ذرا ناسخ کو پڑھیں۔ ناسخ نے کھلے الفاظ میں اپنے استفادوں کا ذکر کیا ہے لیکن وہ اپنی شاعری کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، اس مقطع سے ظاہر ہے۔

چونک اٹھے خوابِ لحد سے، سن کے سودا یہ غزل
شاعری ہرگز نہیں، ناسخ فقط اعجاز ہے

اب دیکھیے کہ اس اعجاز میں کس کس کا فیض شامل ہے۔

مست ناسخ تجھے رکھتا ہے کلام حافظ
میرے ساغر میں بجز بادۂ شیراز نہیں

ناسخ یہ فصاحت و بلاغت
گویا سلمان ساوجی ہے

ناسخ کی غزل سن کر کہا کرتے ہیں شاباش
آتی ہے مجھے حافظ شیراز کی آواز

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا

ہے ریاض فکر ناسخ کی جو شادابی یہی
لکھنؤ میں آئے گی روح غنی کشمیر سے

ناسخ ہے میر سلمہ اللہ کی زمین
اک معنی شگفتہ کو باندھا ہزار رنگ

کون سی طرز سخن ہے جو اسے آتی نہیں
کیوں نہ ہو شاگرد ہے ناسخ ہر اک استاد کا

مضمون طویل ہو جائے گا ورنہ..... میں ناسخ کے استفادوں کی مثالیں بھی پیش کرتا۔ اب آیئے ذرا فیض صاحب کا مطالعہ کریں، فیض صاحب نے سودا، درد اور غالب کی زمینوں میں نہ صرف غزلیں کہیں، بلکہ پورے پورے شعر اور مصرعے بھی "احتراما" اپنی غزلوں میں شامل کرلئے ہیں تاکہ لوگ ان اشعار کے رنگ سے فیض صاحب کی غزل کا لطف اٹھاسکیں، تازہ مثال خواجہ میر درد کا یہ شعر ہے۔

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

فیض صاحب نے غلطی سے اسے ذوق کا سمجھا اور "نذر ذوق" ہی کے عنوان سے روزنامہ جنگ میں یہ غزل شائع ہوئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے بعد نقوش (لاہور) افکار (کراچی) اور صبا (حیدر آباد دکن) میں بھی یہ غزل نقل ہوئی اور ذوق ہی کے حوالے سے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ان اساتذہ کے علاوہ فیض صاحب نے جن مغربی شعراء سے فیض اٹھایا ہے ان میں صرف براؤننگ کا حوالہ انہوں نے دیا ہے اس کے علاوہ بھی بعض مغربی شعراء کے اثرات فیض صاحب کے کلام میں ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اثرات بھی ان کے مطالعے کے لاشعوری ردعمل کا نتیجہ ہیں لیکن اس سے پہلے کہ میں کسی مغربی شاعر کی مثال دوں اپنے ادب سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

مئے بے اندازہ خمار نہیں ہے غالب
نشہ بے اندازہ خمار نہیں فیض

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا امجد حیدر آبادی
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا فیض

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں فیض
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں داغ

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا فیض

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا
مولانا ظفر علی خان

اس طرح "چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز" میں اختر شیرانی کی نظم "نوید" کے اثرات نمایاں ہیں اور "اب وہی حرف جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے" میں حسرت موہانی کی اسی زمین میں کہی ہوئی غزل کے کچھ اثرات نظر آتے ہیں۔

مضمون خاصا طویل ہوتا جارہا ہے ورنہ میں مماثلت خیال و الفاظ کی اور بھی مثالیں پیش کرتا۔ اب ایک نظر ان اشعار پر بھی ڈالتے چلئے۔ دیکھئے کہ فیض صاحب نے حافظ سے کتنا اثر قبول کیا ہے۔

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں فیض

اے دل صبور باش، مخور غم، کہ عاقبت
از شام صبح گردد و از شب سحر شود حافظ

گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں فیض

من ارچہ در نظر یار خاکسار شدم
رقیب نیز چنیں محترم نہ خواہد ماند
حافظ

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہوجائے

سلامت ہمہ آفاق در سلامت تست
بہ ہیچ عارضہ شخص تو درد مند مباد
دریں چمن چو درآید خزاں بہ یغمائی
رہش بہ سروسہی قامت بلند مباد حافظ

ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارہ
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے فیض

تو عمر خواہ و صبوری کہ چرخ شعبدہ باز
ہزار بازی ازیں طرفہ تر بر انگیزد
حافظ

امید کہ لو جاگا غم دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہوگئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر فیض

روز ہجراں و شب فرقت یار آخر شد
زدم ایں فال و گذشت اختر و کار آخر شد
آں پریشانی شب ہائے دراز و غم دل
ہمہ در سایہ گیسوئے نگار آخر شد حافظ

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے
ان کو تشویش روزگار کہاں
درد بیچیں گے گیت گائیں گے
ایسا خوش وقت کاروبار کہاں فیض

گدائے کوئے تو از ہشت خلد مستغنی است،
اسیر بند تو از ہر دو عالم آزاد است
حافظ

مغربی شعراء میں براؤننگ اور شیلی کے علاوہ ڈبلیو' بی ایٹس (Yeats) کا عکس تو فیض کے کلام میں اتنا واضح ہے کہ بادی النظر میں ان کے بعض اشعار (Yeats) کا ترجمہ محسوس ہوتے ہیں۔ ایک مثال یہ بھی دیکھئے۔

This night beaten morn
This spoted light.

یہ داغ داغ اجالا' یہ شب گزیدہ سحر

مولانا حسرت موہانی اور فیض احمد فیض کے سلسلہ بہ سلسلہ مطالعے کی روشنی میں یہ بات حافظ شیرازی تک جا پہنچی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر کسی شاعر کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ جن جن شعراء کے نام اس مضمون میں آئے ہیں ان سب کی ادبی حیثیت مسلم ہے اور بزرگوں سے جو روشنی انہیں ملی ہے اس کا دوسرا نام "علم" قرار دیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ علم کے بغیر اچھی اور بڑی شاعری ممکن نہیں ہے علم کی یہ روشنی ذہن بہ ذہن اور سینہ بہ سینہ (شعوری اور لاشعوری طور پر) صدیوں سے پھیلتی اور نسل در نسل اترتی آرہی ہے۔ خود حافظ اپنے بارے میں کہتا ہے کہ اس نے روشنی کہاں سے حاصل کی ہے۔

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما
دارد سخن حافظ طرز سخن رخواجو

لیکن حافظ کے کلام میں کچھ مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں ایک شعر ملاحظہ کیجئے۔ سعدی شیرازی کا شعر ہے

اگر دشنام فرمائی وگر نفریں دعا گویم
لب لعل شکر خارا' جواب تلخ می زیبد

اور حافظ شیرازی کا شعر ہے

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد' لب لعل شکر خارا

ایک مثال اور

عشق حق ہے کہیں' نبی ہے کہیں
ہے محمد کہیں' علی ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے (میر)

عشق دم جبرئیل' عشق دل مصطفےٰ
عشق خدا رسول' عشق خدا کا کلام (اقبال)

(مطبوعہ ہفتہ وار "نگار" کراچی' یکم ستمبر ۱۹۶۳ء)

ایڈیٹر ''نگار'' (الیاس رشیدی) کے نام

(بمبئی سے حمایت علی شاعر کا خط)

حمایت علی شاعر پچھلے دنوں دہلی کے مشاعرے میں شرکت کے لئے دہلی گئے جہاں سے وہ بمبئی بھی گئے۔ حمایت نے یہ خط بمبئی ہی سے ارسال کیا ہے۔ حمایت علی شاعر کا خط چند شہرت یافتہ ناموں کی فہرست اور چند پر تپاک دعوتوں کے تذکرے کا مظہر نہیں۔ یہ خط ان جذبات کی ایک تصویر ہے جو کوسوں کے فاصلے پر دلوں میں پلتے ہیں۔ اس وقت فلم اور ادب ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے بڑے یار باشانہ انداز سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس خط میں فلم اور ادب کی مقتدر شخصیتیں ایک دوسرے کے پاس پاس کھڑی ہوئی ملتی ہیں اور شاعران کو جذباتی انداز میں دیکھتے ہیں۔ وہ جب دلیپ کمار کو فراق سے آٹو گراف لیتے دیکھتے ہیں کہ تو اس توقع کا ذکر ہمارے لئے بھی ایک اثر انگیز کیفیت پیدا کرتا ہے یہ خط ہم اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ یہ ایک اچھی تصویر ہے۔ اور اس کے خطوط کچھ ہم سے بھی کہتے ہیں

(ادارہ)

الیاس بھائی۔ تسلیمات عرض ہے

دہلی کے مشاعرے میں شرکت کے بعد میں اپنے آبائی وطن اورنگ آباد چلا گیا تھا۔ آج کل بمبئی میں ہوں۔ ۱۴ اپریل کو یہاں ایک بہت ہی بڑا مشاعرہ ہوا جس میں پاکستان سے جوش صاحب' میں اور کلیم عثمانی نے شرکت کی۔ ہندوستان کا تقریبا ہر اہم شاعر موجود تھا۔ ساحر' مجروح' علی سردار جعفری' مخدوم محی الدین' شکیل بدایونی وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ میں مجروح کے ہاں مقیم ہوں۔ کل یعنی ۱۵ کو مینا کماری کی صدارت میں مشاعرہ ہے۔ اس میں سبھی شعراء (بشمول حضرت جوش) شرکت کر رہے ہیں۔ مینا کماری اور مشاعرے کی صدارت کے تعلق سے آپ چونکے ضرور ہوں گے۔ ارے بھائی وہ بہت اچھی شاعرہ ہے۔ ناز تخلص کرتی ہیں۔ پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ اب سے تین سال پہلے بھی دہلی کے ایک مشاعرے کی صدارت کر چکی ہیں۔ اس بات کا ذکر میں اس لئے بھی کر رہا ہوں کہ ہمارے ملک کے اداکار اور اداکارائیں علم و فن کے مسئلہ پر ایک لمحے کے لئے سوچیں' اس مثال سے یہاں کی انڈسٹری کے ماحول کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے فلم انڈسٹری بدنام ہو سکتی ہے لیکن چونکہ زیادہ تعداد پڑھے لکھوں کی ہے۔ اس لئے فن کا معیار صرف اداکاری ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت علم اور تہذیب تک پہنچ گئی۔ ظاہر ہے کہ جب فنکار کی ذہنی سطح اتنی بلند ہو جائے گی تو ماحول کچھ اور ہی ہو جائے گا ایسے ماحول میں کوئی شخص اداکاری کو اس نظر سے نہیں دیکھے گا جس کی بناء پر شریف گھرانوں کی لڑکیاں فلموں میں کام کرنے سے کتراتی ہیں۔ یہ فن بھی دیگر فنون کی طرح قابل احترام ہے' پاکیزہ' مقدس ہے۔ کاش ہماری انڈسٹری بھی اسی معیار کی حامل ہوتی' خیر وقت آئے گا ہم اور ہمارے ملک کے لوگ اپنی انڈسٹری کے بارے میں بھی اپنا انداز نظر بدلیں گے۔

ایک اور اچھائی جو ہمیں ان لوگوں سے سیکھنی ہے یہ ہے کہ یہاں ادیبوں اور شاعروں کی بڑی قدر ہے۔ میری دو تین پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں سے اس سلسلے میں بات ہوئی۔ میرے سوال پر انہوں نے جواب دیا کہ

''ادیب اور شاعر ہی کسی فلم کی بنیاد ہوتے ہیں اور شاعر کی اہمیت تو بہت ہی زیادہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعر ہی سب سے

پہلے فلم کو عوام سے روشناس کراتا ہے۔ فلم کے گانے پہلے ریلیز ہوجاتے ہیں اور انھیں گانوں کی پسندیدگی کی بناء پر لوگ فلم دیکھتے ہیں۔ بہت سی فلمیں اچھی کاسٹ ہونے کے باوجود ناکام ہوجاتی ہیں کیونکہ گانے اچھے نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر فن کار کے دل میں اس کے نام کا لحاظ ہوتا ہے اگر اس کے نام کو' پروڈیوسر یا ڈائریکٹر اہمیت نہ دے تو وہ بد دل ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی ضروریات کی خاطر کام تو کرہی لیتا ہے لیکن اس میں اس کے دل کی لگن کم ہی شامل ہوتی ہے اور شاعر اور ادیب تو اس سلسلے میں بہت ہی حساس ہوتے ہیں اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے نام کا احترام کریں۔ اور ان کی خدمات کا پورا پورا حق ادا کردیں" کاش ہمارے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی اس اہمیت اور نزاکت کو سمجھ سکتے۔ ہمارے ہاں صرف تین ناموں کو اہمیت حاصل ہے ا۔ پروڈیوسر' ۲۔ ڈائریکٹر' ۳۔ میوزک ڈائریکٹر' یا پھر کاسٹ' ان تمام افراد کی اہمیت اپنی جگہ درست ہے لیکن شاعر اور ادیب بھی تو آخر فن کار ہیں۔ اپنے ہاں تو عالم یہ ہے کہ مثال کے طور پر' پچھلے دنوں دہلی میں اپنے ہائی کمشنر کی کوٹھی میں "ڈان" دیکھنے کا اتفاق ہوا "جب سے دیکھا ہے تمہیں" کا اشتہار نظر سے گزرا' لکھا تھا۔ نغمات ہمت علی (HIMAT ALI) یعنی ہمارے محترم پروڈیوسر نے اپنے نغمہ نگار کا صحیح اور پورا نام جاننے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ حالانکہ خدا کے فضل سے اس فلم کے تین چار گانے پہلے ہی ہٹ ہوچکے ہیں اور فلم کا نام بھی میرے ہی ایک مصرعہ پر رکھا گیا ہے۔ اب آپ بتائیں ایسے عالم میں کوئی کیا کیجے۔ اس فلم کے تمام اشتہارات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ پروڈیوسر صاحب نے اپنے آپ کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے (محض اس لئے کہ انہوں نے روپیہ صرف کیا ہے) حالانکہ اس فلم کے کارکنوں میں بعض لوگ پاکستان و ہندوستان گیر شہرت رکھتے ہیں۔ اگر پروڈیوسر صاحب ان ناموں کی اہمیت کو سمجھتے تو خود پرستی کی ایسی مثال قائم نہ کرتے۔ تجارتی اعتبار سے بھی یہ روش نقصان رساں ہے انہوں نے ایک خاص طبقے کو اس فلم کے دیکھنے سے محروم کردیا۔

خط لکھتے لکھتے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ بھارت بھوشن نے پاکستانی شعراء کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا تھا۔ میں وہاں چلا گیا۔ بھارت بھوشن کے گھر کئی فنکاروں سے ملاقات ہوئی۔ دلیپ کمار بھی موجود تھے۔ کیسی عظیم شخصیت اور کتنا سادہ مزاج' سبحان اللہ' میں دلیپ کمار سے پہلے بھی ایک دو بار مل چکا ہوں لیکن سرسری طور پر' بھارت بھوشن کے ہاں تو بڑی دیر تک گفتگو کرنے کا موقع ملا صاحب' وہ تو بہت اچھا ادبی مذاق رکھتا ہے۔ انداز گفتگو اتنا شائستہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کسی شاعر یا ادیب سے باتیں ہورہی ہیں۔ تمام وقت ادبی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔

انہوں نے پاکستان کے فلمی ادب پر بھی باتیں کیں۔ اتفاق سے میرے بھی کچھ گانے سن رکھے تھے۔ بہرحال انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ پاکستانی فلم انڈسٹری ترقی کررہی ہے اور وہاں کے فلم ساز حقیقی ادیبوں اور شاعروں کی طرف متوجہ ہورہے ہیں۔ دلیپ' فیض اور ندیم قاسمی کے بڑے مداح ہیں اور بڑے احترام سے ان شخصیتوں کا نام لیتے ہیں۔ بھارت بھوشن بھی بہت اچھا انسان ہے اور بڑا ستھرا ادبی ذوق رکھتا ہے۔

خط پھر ادھورا چھوڑ رہا ہوں' رات بہت دیر تک جاگے اس لئے نیند آرہی ہے اور آج رات پھر مشاعرے میں شرکت کرنی ہے۔ اسی مشاعرے میں جس کی صدارت مینا کماری کریں گی۔

مشاعرے میں جانے سے پہلے یہاں کے ایک بہت بڑے رئیس لالہ یودھراج کی کوٹھی پر جانا پڑا۔ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ اور رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے مشاعرہ گاہ پہنچے۔ ہاں' لالہ یودھراج کا تعارف آپ سے کراؤں' یہ وہی لالہ جی

ہیں جنھوں نے دیوان غالب اور انتخاب کلیات میر (مرتبہ علی سردار جعفری) اس انداز میں شائع کیا ہے کہ صدیوں یاد رہے گا۔ آپ نے غالباً نسخے دیکھے ہوں۔ ہندی اور اردو میں ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ اس طرح کہ ایک صفحہ اردو میں اور دوسرے صفحہ پر وہی غزل ہندی (دیوناگری) رسم الخط میں۔ میرے خیال میں ان سے خوبصورت شاید ہی کوئی نسخہ چھپا ہو۔ تعریف کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ لالہ جی نے مجھے بطور تحفہ دونوں کتابیں دی ہیں۔ اگر کراچی سے حیدر آباد جانا ہوا تو آپ کو ضرور دکھاؤں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ انہیں دیکھتے ہی آپ چوم لیں گے۔ آنکھوں سے لگائیں گے۔ لالہ یودھراج کا اردو ادب پر واقعی ایک احسان ہے کہ وہ اردو کے تمام کلاسیکی فن پاروں کو دیوناگری رسم الخط میں بھی منتقل کرتے جارہے ہیں تاکہ اگر اردو رسم الخط ہندوستان سے ختم ہوجائے تو ہمارے شعراء کا کلام باقی رہ جائے۔ اور آئندہ نسلیں ان سے فیض حاصل کرتی رہیں۔ ہر دیوان کے ساتھ وہ مشکل الفاظ اور محاوروں کی ایک شرح بھی شائع کرتے ہیں۔ آج کل سردار جعفری (انہیں کی ایماء پر) ایک ایسی لغت بھی تیار کررہے ہیں جسے شعری لغت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس میں ایسے الفاظ پر تحقیق کی جارہی ہے جو عموماً اشعار میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور روزنامے کے ساتھ ساتھ ان کے معنی اور مفہوم بدلتے جارہے ہیں یہ بڑا اہم کام ہے اور اس کی قدر آئندہ سو سال بعد معلوم ہوگی جب لوگ بھول چکے ہوں گے۔ کہ اس لفظ کی اصل کیا ہے اور شعراء نے مختلف ادوار میں اسے کن کن معنی میں استعمال کیا ہے۔ لالہ یودھراج نہ صرف اس قسم کی کتابوں پر اپنا روپیہ صرف کررہے ہیں بلکہ جدید شعراء کے سلسلے میں انہوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ مواد جمع کروں۔ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ خدا کرے مجھ سے بہ حسن و خوبی انجام پاجائے۔ یہ انتخاب بھی سردار جعفری کی نگرانی میں ہوگا۔ سردار جعفری کی ذات قابل رشک و ستائش ہے کہ اپنی فلمی مصروفیات کے باوجود وہ ادب سے وابستہ ہیں اور ایسے اہم کام کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ کام کس قدر مشکل اور محنت طلب ہے اس کا اندازہ انتخاب کلیات میر سے ہوسکتا ہے۔

بہرحال مجھے لالہ یودھراج سے مل کر دلی مسرت ہوئی ان کی یہ خدمات تاریخ اردو دب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

لالہ جی کے ہاں سے ہم مشاعرہ گاہ میں چلے گئے۔ مینا کماری کو دیکھنے کے لئے لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ اور اس عالم میں ہم پر ایک حقیقت کھلی کہ ایک ہم بھی فنکار ہیں۔ یہ تو خیر ایک ہیروئن اور شاعرہ ہیروئن کا معاملہ تھا۔ تین سال پہلے دہلی کے چیمسفورڈ کلب کے مشاعرے میں حضرت دلیپ کمار تشریف لائے تھے یونہی مشاعرہ سننے یا شاید منتظمین نے انہیں اس لئے بلا لیا تھا کہ ٹکٹ زیادہ سے زیادہ بکیں۔ یقین مانیئے اس مشاعرے میں فراق صاحب کی موجودگی کے باوجود لوگ دلیپ کمار سے آٹوگراف لئے جارہے تھے اور شاعروں کا جو حال تھا آپ سمجھ سکتے ہیں آخر دلیپ کمار نے بھانپ لیا اور دوڑ کر فراق کے پاس آگئے اور اپنی نوٹ بک فراق صاحب کے آگے کردی کہ مجھے آٹوگراف دیجئے اور لوگوں سے کہا کہ آٹوگراف ان حضرات سے لیجئے جنھوں نے ہمیں بولنا سکھایا ہے۔ بہرحال یہ اس کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اتنا بڑا فنکار ہونے کے باوجود اس نے ہر شاعر کی عزت رکھ لی ورنہ کوئی اور ایکٹر ہوتا تو فراق صاحب کیا علامہ اقبال بھی موجود ہوتے تو نظر انداز کرجاتا۔ عام آدمی کو کیا معلوم کہ فراق صاحب کتنی بڑی شخصیت ہیں۔

مینا کماری نے بھی رات اسی تہذیب کا مظاہرہ کیا اور صدر ہونے کے باوجود اس لئے اپنی غزل نہیں پڑھی کہ ان سے پہلے جوش صاحب پڑھ چکے تھے۔ وہ تو صدارت کے لئے بھی تیار نہیں تھیں۔ لیکن مجبوراً یہ منصب قبول کیا۔ اس لئے کہ ٹکٹ ان ہی کے نام سے بک سکتے تھے اور ان ٹکٹوں کی آمدنی مزدور بچوں کی تعلیم کے لئے وقف تھی۔

(باقی صفحہ ۵۰۳ پر)

منتخب فلمی نغمات

حمایت علی شاعر

کسی چمن میں رہو تم، بہار بن کے رہو
خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو

ہم اپنے پیار کو دل سے لگا کے جی لیں گے
یہ زہر تم نے دیا ہے تو ہنس کے پی لیں گے
زمانہ دے نہ تمہیں، بے وفائی کا الزام
زمانے بھر میں وفا کا وقار بن کے رہو
خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو

کسی کے ساتھ رہو تم، تمہارے ساتھ ہیں ہم
تمہارا غم ہے سلامت، تو پھر ہمیں کیا غم
تمہاری رات چمکتی رہے ستاروں سے
دیار حسن میں، حسن دیار بن کے رہو
خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو
کسی چمن میں رہو تم، بہار بن کے رہو

احمد رشدی (آنچل)

تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیا معلوم
تیری زلفیں، تری آنکھیں، تیرے عارض، تیرے ہونٹ
کیسی انجانی سی معصوم خطا کرتے ہیں
تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیا معلوم

تیرے قامت کا لچکتا ہوا مغرور تناؤ
جیسے پھولوں سے لدی شاخ ہوا میں لہرائے
یہ چھلکتے ہوئے ساغر سی جوانی، یہ بدن
جیسے شعلہ سا نگاہوں میں لپک کر رہ جائے

اتنا مانوس ہے تیرا ہر اک انداز کہ دل
تیری ہر بات کا افسانہ بنا لیتا ہے
تیرے ترشے ہوئے پیکر سے چرا کر کچھ رنگ
اپنے خوابوں کا صنم خانہ سجا لیتا ہے

جانے اس حسن تصور کی حقیقت کیا ہے
جانے ان خوابوں کی قسمت میں سحر ہے کہ نہیں
جانے تو کون ہے، میں نے تجھے سمجھا کیا ہے
جانے تجھ کو بھی، مرے دل کی خبر ہے کہ نہیں

تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیا معلوم

سلیم رضا (آنچل)

نہ چھڑا سکو گے دامن، نہ نظر بچا سکو گے
جو میں دل کی بات کہہ دوں تو کہیں نہ جا سکو گے

وہ حسین سا تصور جسے تم نے زندگی
اسے بھول کر بھی شاید نہ کبھی بھلا سکو گے

یہ نظر جھکی جھکی سی یہ قدم رکے رکے سے
مرا دل یہ کہہ رہا ہے، کہیں تم نہ جا سکو گے

مرے ہم نشیں تمہیں ہو، مرے ہم سفر تمہیں ہو
میری کون سی ہے منزل، یہ تمہیں بتا سکو گے

نور جہاں (دامن)

واللہ سر سے پاؤں تلک، موج نور ہو
قدرت کا شاہکار ہو تم، رشک حور ہو

یہ روپ، یہ نکھار، یہ شوخی، حیا کے ساتھ
یہ شرم سے جھکی ہوئی پلکیں، ادا کے ساتھ
کیوں کر نہ اپنی حسن پہ تم کو غرور ہو

زلفیں اڑیں تو چاند پہ بدلی بکھر گئی
نظریں اٹھیں تو دل پہ قیامت گزر گئی
دل کی خطا ہو تم کہ نظر کا قصور ہو

سوچو دبی زبان سے کیا کہہ رہی ہے رات
آؤ کہ آج دل میں نہ رہ جائے دل کی بات
نزدیک آچکی ہو تو کیوں دور دور ہو

(احمد رشدی) دامن

اس کے غم کو غم ہستی تو مرے دل نہ بنا
زیست مشکل ہے اسے اور بھی مشکل نہ بنا

تو بھی محدود نہ ہو، مجھ کو بھی محدود نہ کر
اپنے نقش کف پا کو مری منزل نہ بنا

اور بڑھ جائے گی ویرانی دل جان جہاں
میری خلوت گہ خاموش کو محفل نہ بنا

دل کے ہر کھیل میں ہوتا ہے بہت جاں کا زیاں
عشق کو عشق سمجھ، مشغلہ دل نہ بنا

پھر مری آس بندھا کر مجھے مایوس نہ کر
حاصل غم کو خدارا، غم حاصل نہ بنا

مہدی حسن (گڑیا)

سوجا میری گڑیا
تو کیوں تک تک جاگے
اپنا دکھڑا کیسے روئے
ممتا تیرے آگے
تو کیا جانے، اس جگ میں ہیں کیسے کیسے لوگ
پیار جتا کے دے جاتے ہیں جیون بھر کا روگ
تیرا میرا دل ہے ایک کھلونا جن کے آگے
سوجا میری گڑیا
تو کیوں تک تک جاگے

کوئی نہ جانے دل کیوں روئے، نین کریں کیوں بین
نیند کے بدلے کیوں آنکھوں میں آنسو ہیں بے چین
جس نے دیا ہے یہ دکھ ہم کو اس کو نہ یہ دکھ لاگے
سوجا میری گڑیا

نور جہاں (گڑیا)

خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں
تمنا جو نہ پوری ہو، وہ کیوں پلتی ہے سینے میں

نہ جانے یہ شب غم، صبح تک کیا رنگ لائے گی
نفس کے ساتھ اک تلوار سی چلتی ہے سینے میں

کسے معلوم تھا یارب کہ ہوگی دشمن جاں بھی
وہ حسرت خون دل پی پی کے جو پلتی ہے سینے میں

مہدی حسن (لوری)

میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں، مرا دل بھی گا رہا ہے
یہ فضا حسیں ہے اتنی کہ نشہ سا چھا رہا ہے

مرے ہم نشیں مبارک تجھے پیار کی یہ منزل
تجھے مل گئی وہ دولت، جو ہے زندگی کا حاصل
وہ گماں تھا اک حقیقت، یہ یقین آ رہا ہے
میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں، مرا دل بھی گا رہا ہے

یہ خوشی بھی کیا خوشی ہے کہ نکل پڑے ہیں آنسو
کہیں دل نہ بیٹھ جائے کہ نہیں ہے دل پہ قابو
تجھے نذر دوں تو کیا دوں، مرے پاس کیا رہا ہے
میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں، مرا دل بھی گا رہا ہے
مجیب عالم (لوری)

چھن چھن چھنانا چھن
چندا کے ہنڈولے میں
اڑن کھٹولے میں
امی کا دلارا، ابو جی کا پیارا سوئے
نندیا جھلائے تجھے جھولنا

دھیرے دھیرے نندیا تو آنکھوں میں آنا
میٹھے میٹھے پیارے پیارے سپنے دکھانا
پریوں کی نگری کی سیر کرانا
چندا کے ہنڈولے میں

جب تک میرا منا جاگے، تارو تم نہ سونا
مہکے ہمیشہ یونہی پھولوں کا بچھونا
کھیلے کودے جگ جگ میرا سلونا
چندا کے ہنڈولے میں
اڑن کھٹولے میں
امی کا دلارا ۔۔ ابو جی کا پیارا سوئے
نندیا جھلائے تجھے جھولنا
چھن چھن چھنانا چھن
چندا کے ہنڈولے میں

ثریا حیدر آبادی (لوری)

کلی مسکرائی جو گھونگھٹ اٹھا کے
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے
ہوا لے گئی جب بھی آنچل اڑا کے
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے

کھلا کوئی غنچہ تو گھنگرو سا چھنکا
لگا ناچنے بوٹا بوٹا چمن کا
کوئی شاخ جھومی جو مستی میں آکے
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے

کسی پھول پر کوئی بھنورا جو آیا
مرے ہونٹ کانپے، بدن تھرتھرایا
نگاہیں جھکالیں جو میں نے لجا کے
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے

کبھی چاند کے پاس دیکھا جو تارا
مچل کے مرے دل نے تم کو پکارا
چھپے جب وہ بدلی کی چلمن گرا کے
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے

نور جہاں (میرے محبوب)

سامنے رشک قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
کوئی محبوب نظر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
چاند کی طرح ستاروں میں جوانی گزرے
کہکشاں راہگذر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
عارض ولب کے چمن زار ہوں پہلو میں کھلے
ایسی ہر شب کی سحر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
گل کی آغوش میں سوئی ہوئی خوشبو کی طرح
زندگی اپنی بسر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

مسعود رانا (میرے محبوب)

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ
کس لئے کیجئے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ
شمع کے مانند اہل انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ
شاعر ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

نور جہاں (میرے محبوب)

محبت تیری بک جائے گی دولت مند کے ہاتھوں
سیاہی --- لوٹ کر آجا
میں نے تو پریت نبھائی --- سانوریا رے
نکلا تو ہرجائی
آگ لگائی، کیسی غم نے
مشکل ہوگئے آنسو تھمنے
تیری قسم تیری یاد میں ہم نے
راتوں کی نیند گنوائی --- سانوریا رے
نکلا تو ہرجائی

میرے وعدے، تیری قسمیں
چھین رہی ہیں جگ کی رسمیں
پیار چلا ہے غیر کے بس میں
ہونے کو ہوں میں پرائی --- سانوریا رے
نکلا تو ہرجائی

بیری ہوگئے اپنے ہی سائے
آنے کو ہیں لوگ پرائے
آجا کہ دنیا اجڑ نہ جائے
دیتی ہوں تیری دہائی، سانوریا رے
نکلا تو ہرجائی

میں نے تو پریت نبھائی --- سانوریا رے
نکلا تو ہرجائی

مالا (خاموش رہو)

یہ دنیا --- راہگزر ہے
ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر، کون کسی کا ہووے
کاہے چپ چپ رووے
کوئی ساتھ دے کہ نہ ساتھ دے
یہ سفر، اکیلے ہی کاٹ لے --- کہ
ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر..............

جس نے بھی یاں پیار کیا ہے
اس نے سب کچھ کھویا
پہلے کیا کیا سپنے دیکھے
آخر میں کیا رویا
پیار کا حاصل آنسو ہیں تو چھوڑو یہ پیار کی بات
کوئی ساتھ دے کہ نہ ساتھ دے
یہ سفر اکیلے ہی کاٹ لے --- کہ
ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر..............

اس دنیا میں سب ہیں اکیلے
تن سے جدا ہیں سائے
کوئی کسی کو پاکر کھوئے
کوئی کھو کر پائے
پلک جھپکتے چھٹ جاتا ہے برس برس کا ساتھ
کوئی ساتھ دے کہ نہ ساتھ دے
یہ سفر اکیلے ہی کاٹ لے --- کہ
ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر..............

مسعود رانا (بدنام)

۱۔ جب رات ڈھلی، تم یاد آئے
ہم دور نکل آئے، اس یاد کے سائے سائے

۲۔ جو بات چلی ، تم یاد آئے
اور پاس چلے آئے، اس یاد کے سائے سائے

۱۔ اپنوں نے دیا جو غم، اس غم کی شکایت کیا
کیا جانے یہاں کوئی، اس غم میں ہے راحت کیا

۲۔ ڈر ہے کہ یہ غم دل کا ناسور نہ بن جائے
جب رات ڈھلی، تم یاد آئے
ہم دور نکل آئے، اس یاد کے سائے سائے

۲۔ تم چاہو تو یہ آنسو، بن جائیں شرارے بھی
تم چاہو تو مل جائیں، طوفاں میں کنارے بھی

۱۔ ڈر ہے یہ کنارہ بھی ' طوفاں ہی نہ بن جائے
جب رات ڈھلی' تم یاد آئے
ہم دور نکل آئے' اس یاد کے سائے سائے
۲۔ جو بات چلی' تم یاد آئے
اور پاس چلے آئے' اس یاد کے سائے سائے
مالا۔۔احمد رشدی(کنیز)

دور ویرانے میں اک شمع ہے روشن کب سے
کوئی پروانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے

میں ترے پاس تو آجاؤں مگر تو ہی بتا
تیرا انداز ملاقات عجب ہے کہ نہیں
دیکھتے ہی مجھے کترا کے گزرنا تیرا
مجھ کو بیگانہ سمجھنے کا سبب ہے کہ نہیں
دل کی الجھن یہ سلجھ جائے تو کچھ بات بنے

یہ حسیں رات' یہ شبنم میں نہائی ہوئی رات
آکہ اس رات کی آغوش میں کھو کر رہ جائیں
وہ فسانہ جسے اب تک کوئی عنواں نہ ملا
لب نہ کہہ پائیں تو آنکھوں کی زبانی کہہ جائیں
اب یہ حسرت بھی نکل جائے تو کچھ بات بنے

دل میں ارمان ہیں کیا کیا ' کوئی دل سے پوچھے
عمر بھر کاش نہ یہ چاند نہ یہ رات ڈھلے
چاند کے پاس ستارا ہے' مرے پاس ہے تو
کاش ایسے میں ہوا بھی ذرا اِترا کے چلے
زلف شانوں پہ بکھر جائے تو کچھ بات بنے
کوئی پروانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے
مالا اور احمد رشدی(نائلہ)

ساتھی میرے' شام سویرے ۔ محنت اپنا کام
کام تو پورا' دام ادھورا ۔ پھر بھی ہم بدنام
ساتھی میرے........

جلتا سورج' تپتی دھرتی' گود میں ہم کو پالے
خون پسینہ ایک کریں تو پائیں ہاتھ' چھالے
ہونٹوں پہ مسکان ہے لیکن سینے میں کہرام

بہے پسینہ بن کے جوانی' جلتا جائے خون
تپتے تپتے انگاروں میں ڈھلتا جائے خون
خون کا شعلہ بھڑک اٹھے تو دنیا دے الزام

دولت کی شطرنج کے مہرے بن کے جئیں ہم لوگ
امرت جان کے ہنستے گاتے زہر پئیں ہم لوگ
جیتے جی اس موت کو سمجھیں قسمت کا انعام

دھرتی گھومے' موسم بدلے' بدلیں نہ اپنے بھاگ
اپنے تن پہ دھول جمی ہے' پیٹ میں بھڑکے آگ
مٹی سے آغاز ہوا ہے' مٹی ہے انجام

سمجھے کیسے پتھر دنیا' ہم بھی ہیں انسان
ہم بھی ہیں آدم کے بیٹے' ہم کو بھی پہچان
کرنا ہوگا اور ہی کچھ اب لے کے خدا کا نام

(فلم شہر اور سائے)
زندگی کی ہر مسرت آپ کے پہلو میں ہے
کیا بتاؤں کیسی راحت آپ کے پہلو میں ہے

آپ ہیں تو یہ زمیں ہے آسماں میرے لئے
آپ کے نقش قدم ہیں کہکشاں میرے لئے
سچ تو یہ ہے' میری جنت آپ کے پہلو میں ہے
کیا بتاؤں کیسی راحت آپ کے پہلو میں ہے

آپ نے اپنا لیا' سارا زمانہ مل گیا
جس کو پا کر کھو دیا تھا ' وہ خزانہ مل گیا

چاہتا تھا جو دل دولت، آپ کے پہلو میں ہے
کیا بتاؤں کیسی راحت آپ کے پہلو میں ہے
زندگی کی ہر مسرت آپ کے پہلو میں ہے

نورجہاں (تصویر)

نوازش کرم، شکریہ، مہربانی
مجھے بخش دی آپ نے زندگانی

جوانی کی جلتی ہوئی دوپہر میں
یہ زلفوں کے سائے گھنیرے گھنیرے
عجب دھوپ چھاؤں کا عالم ہے طاری
مہکتا اجالا، چمکتے اندھیرے
زمین کی فضا ہوگئی آسمانی
نوازش کرم، شکریہ، مہربانی

لبوں کی یہ کلیاں، کھلی ادھ کھلی سی
یہ مخمور آنکھیں گلابی، گلابی
بدن کا یہ کندن، سنہرا سنہرا
یہ قد ہے کہ چھوٹی ہوئی ماہتابی
ہمیشہ سلامت رہے یہ جوانی
نوازش کرم، شکریہ، مہربانی

مہدی حسن (فلم) میں وہ نہیں

اے جان وفا، دل میں تری یاد رہے گی
دنیائے محبت مری آباد رہے گی

ہر دم ترا تصویر نگاہوں میں ہے روشن
ہاتھوں سے نہ چھوٹے گا ترے پیار کا دامن
آنکھوں میں تیرے ہجر کی روداد رہے گی

تنہا سہی، ویراں سہی، میں سب کی نظر میں
آباد رہے تو اب بھی اس اجڑے ہوئے گھر میں
اس دل میں ہمیشہ تو ہی آباد رہے گی

ہر لمحہ مرے دل میں، دھڑکتا ہے ترا دل
تو ہی مری تقدیر ہے، تو ہی مرا حاصل
تیرے لئے دنیا مری برباد رہے گی

تصویر کی صورت تری محفل میں ہیں ہم بھی
لیکن نہ پڑی ہم پہ تری چشم کرم بھی
کب تک یہ جفا اے دل ناشاد رہے گی
اے جان وفا، دل میں تری یاد رہے گی

مہدی حسن (فلم) تصویر

جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے
جانے ان نظروں میں کیا ہے کہ نظر ملتے ہی
دل کے تاروں پہ کوئی گیت سا لہرانے لگا
ایک انجانی مسرت سے فضا جھوم اٹھی
اپنے اطراف کی ہر چیز پہ پیار آنے لگا
جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے
اتنا دلکش ہے تمہارا ہر اک انداز کہ دل
اجنبی ہوکے بھی اپنی سی نظر آتی ہو
دور رہ کر بھی ہو کچھ اتنی مرے دل کے قریب
مجھ کو ہر سمت فقط تم ہی نظر آتی ہو
جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے
تم سے پہلے بھی مرے سینے میں دل تھا لیکن
آج تک دل کبھی اس طرح سے دھڑکا ہی نہ تھا
آج جس آگ میں جلتا ہوں میں چپکے چپکے
ایسا شعلہ تو مری روح میں بھڑکا ہی نہیں تھا
جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے
سلیم رضا (جب سے دیکھا ہے تمہیں)

ساتھیو، مجاہدو

جاگ اٹھا ہے سارا وطن ۔۔۔۔ ساتھیو

جو بھی رستے میں آئے گا کٹ جائے گا
رن کا میدان لاشوں سے پٹ جائے گا
آج دشمن کا تختہ الٹ جائے گا
ساتھ ہیں مرد و زن، سر سے باندھے
کفن۔۔۔۔۔۔۔ساتھیو

آج مظلوم، ظالم سے ٹکرائیں گے
اپنی طاقت زمانے سے منوائیں گے
سامراجی خداؤں پہ چھا جائیں گے
ہر جری صف شکن، ہر جواں تیغ زن۔۔۔۔۔۔۔۔ساتھیو

دل میں قرآن، ہونٹوں پہ تکبیر ہے
جوش عباس ہے، عزم شبیر ہے
ہر مسلمان حیدر کی شمشیر ہے
سر پہ سایہ فگن، دست خیبر شکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔ساتھیو

(فلم۔ مجاہد)

اپنے پرچم تلے ۔ ہر سپاہی چلے
ہاں سپاہی ہیں ہم
یوں بڑھائیں قدم
جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چندا چلے

پھول سے ہیں مگر ہم شرارے بھی ہیں
نرم لہریں بھی طوفاں کے دھارے بھی ہیں
وقت آئے تو بن جائیں گے تیر ہم
اپنے ہر خواب کی خود ہیں تعبیر ہم
حق کی خاطر کٹا دیں گے اپنے گلے

پاک ہے یہ زمیں، پاک ہے آسماں
کوئی غدار رہنے نہ پائے یہاں
دل میں ایمان، ہاتھوں میں قرآن ہے
ہم میں ہر ایک سچا مسلمان ہے
ہم پہ بُروں سے بُرے ہیں، بھلوں سے بھلے

اپنے پیارے وطن کو سجائیں گے ہم
ذرے ذرے کو سورج بنائیں گے ہم
کوئی دشمن جو روکے ہمارے قدم
بڑھ کے اس کا ہی تختہ الٹ دیں گے ہم
کون ٹوکے ہمیں آسماں کے تلے

(فلم۔ اک تیرا سہارا)

اے دشمن دیں تو نے کس قوم کو للکارا
لے ہم بھی ہیں صف آراء
آ دیکھ کہ یہ بازو، بازو ہیں کہ تلواریں
سینے ہیں مجاہد کے یا آہنی دیوار ہیں
گر جاتی ہیں قدموں میں کس طرح سے دستاریں
ہم تجھ کو دکھا دیں گے سو بار یہ نظارہ

جس راہ سے آئے گا، تو اس راہ پہ ماریں گے
پانی بھی نہ مانگے گا، یوں نشہ اتاریں گے
ہم موت کی وادی سے یوں تجھ کو گزاریں گے
اس قوم سے لڑنے کی ہمت نہ ہو دوبارہ

معلوم نہیں تجھ کو، یہ قوم ہے فولادی
ہر ایک مسلماں ہے، دیوانہ آزادی
اک شعلہ ہے ہر قریہ، اک نعرہ ہے ہر وادی
ہر نقش کف پا ہے دہکا ہوا انگارہ

اس قوم کا ہر بچہ' اللہ کا سپاہی ہے
اس خاک کا ہر ذرہ تصویر الٰہی ہے
اس ملک کا ہر گوشہ اک زندہ گواہی ہے
ہر ایک دھڑکتا دل' ایماں کا ہے گہوارہ

(فلم۔ جہاد)

ہمت سے ہر قدم اٹھانا' تو ہے پاکستانی
تجھ سے ہی یہ ملک بننے کا دنیا میں لاثانی
چندا کی گودی میں تارا' میری گود میں تو'
اپنا دیس ہے اک پھلواری' تو اس کی خوشبو
اس خوشبو سے مہکے دنیا
تجھ سے جینا سیکھے دنیا
تیرا رکھوالا ہے اللہ...... بولو بیٹا' اللہ اللہ
دھن والوں کے ہاتھوں میں ہے' یہ دنیا اک کھیل
اس دنیا میں جینا ہے تو ہنستے ہوئے دکھ جھیل

دن میں سورج بنکر جلنا
رات کو چندا بن کر چلنا
تیرا رکھوالا ہے اللہ ..... بولو بیٹا..... اللہ اللہ
دنیا کے ہاتھوں میں بم ہیں' تیرے ہاتھ میں پھول
پھول سے مہکے گلشن گلشن' بم سے پھیلے دھول
پھولوں سے ہر دامن بھرنا
ویرانوں کو گلشن کرنا
تیرا رکھوالا ہے اللہ......بولو بیٹا.... اللہ اللہ
(فلم۔ جب سے دیکھا ہے تمہیں) رشدی

قومی نغمے

(نیشنل سیونگس کے لئے)

(حالی)

جو پیسہ ہم بچاتے ہیں' وطن کے کام آتا ہے
ہمارا خون دل جیسے بدن کے کام آتا ہے

یہ پیسہ ہی تو ہے جو دانے دانے میں نمایاں ہے
سفیر زندگی بن کر رگ و پے میں خراماں ہے
اسی کے نور سے روشن چراغ علم عرفاں ہے
چراغوں کا اجالا ' انجمن کے کام آتا ہے
جو پیسہ ہم بچاتے ہیں' وطن کے کام آتا ہے

یہ پیسہ جمع ہو تو خواب فردا کا خزانہ ہے
کہیں گھر ہے' کہیں مکتب' کہیں یہ کارخانہ ہے
کبھی روشن حقیقت ہے' کبھی رنگیں فسانہ ہے
یہ وہ تیشہ ہے جو ہر کوہکن کے کام آتا ہے
جو پیسہ ہم بچاتے ہیں' وطن کے کام آتا ہے

یہ پیسہ اپنے ہاتھوں میں خدا کی اک امانت ہے
کہ صرف بے ضرورت ہی امانت میں خیانت ہے
یہ پیسہ ملک و ملت کے تحفظ کی ضمانت ہے
زر گل جس طرح سارے چمن کے کام آتا ہے
جو پیسہ ہم بچاتے ہیں' وطن کے کام آتا ہے

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مجھ پر ہے مہرباں
دیوار کی یہ چھاؤں تو سورج کے ساتھ تھی

ماہ و نجوم چرخ بریں کے چراغ ہیں
میرے وطن کے لوگ زمیں کے چراغ ہیں

ماتھے پہ یہ پسینے کے موتی جڑے ہوئے
پیروں میں جلتی دھوپ سے چھالے پڑے ہوئے
کہسار کی طرح سے ہیں پھر بھی کھڑے ہوئے
سورج کے لال، ماہ جبیں کے چراغ ہیں
..........میرے وطن کے لوگ

یہ سخت پتھروں سے تراشے ہوئے بدن
آنکھوں میں بے قرار جوانی کا بانکپن
رگ رگ میں دوڑتا ہوا خون غم وطن
ماؤں کی پروقار جبیں کے چراغ ہیں
..........میرے وطن کے لوگ

آئیں جو زندگی میں کہیں سخت مرحلے
ممکن نہیں کہ عزم کا سورج کبھی ڈھلے
یہ شعلہ اور بھڑکے جو کوئی ہوا چلے
سینہ بہ سینہ سوز یقیں کے چراغ ہیں
..........میرے وطن کے لوگ

○

آؤ دعا کو ہاتھ اٹھائیں تمام لوگ
اپنے وطن میں راج کریں صبح و شام لوگ

گذری میں جس نے پالا ہمیں لعل کی طرح
آکاش اس کے سر پہ رہے شال کی طرح
ماں کی طرح سے کرتے رہیں احترام لوگ
آؤ......................

ہر شاخ گل کے ہاتھ پہ مہندی رچی رہے
دست خزاں سے دولت گلشن بچی رہے
اب کے چمن میں ایسا کریں انتظام لوگ
آؤ......................

سورج سے جیسے چاند کو ملتی ہے چاندنی
دھرتی پہ جتنے پیار سے کھلتی ہے چاندنی
یوں بزم خاص میں بھی نظر آئیں عام لوگ

○

آؤ کہ پھر یہ عہد کریں ہم اٹھا کے ہاتھ
تعمیر ارض پاک کریں گے ملا کے ہاتھ

یہ ہاتھ سرزمین وطن کے امین ہیں
یہ ظلمت گماں میں چراغ یقین ہیں
یہ ہاتھ کھردرے سہی لیکن حسین ہیں
جس طرح صحن گل میں ہوں موج صبا کے ساتھ

یہ ہاتھ جن پہ لکھی ہے تقدیر قوم کی
یہ ہاتھ جو بناتے ہیں تصویر قوم کی
یہ ہاتھ کررہے ہیں جو تعمیر قوم کی
یہ ہاتھ اہل دل کے ہیں، اہل وفا کے ساتھ

یہ ہاتھ لوح زیست بھی، حرف عمل بھی ہیں
یہ ہاتھ کارخانے ہیں، کھیتوں میں ہل بھی ہیں
دشمن مگر ہو کوئی تو دست اجل بھی ہیں
یہ ہاتھ اس سفینے میں ہیں ناخدا کے ساتھ

یہ ہاتھ سوچیے تو نہایت عظیم ہیں
صبح چمن کے واسطے موج نسیم ہیں
فرعون ہو کوئی تو عصائے کلیم ہیں
ہیں یوں تو آدمی کے، مگر ہیں خدا کے ہاتھ

آئی ڈی بی پی بیش بہا منافع سرٹیفکیٹ

آج کی تھوڑی سی بچت ۔ کل کی مالی تفکرات سے آزادی
22 گنا تک حیرت انگیز آمدنی (یعنی ایک لاکھ کے عوض بائیس لاکھ)

1,00,000 روپے ڈپازٹ پر رقم مع منافع ادائیگی کا شیڈول				
مدت	ماہانہ منافع	مدت تکمیل سے قبل رقم واپس لینے کی صورت میں کل متوقع آمدنی		
		ماہانہ بنیاد پر	یکمشت ادائیگی	کل متوقع آمدنی
10 سال بعد سے 5 سال تک	2,000	120,000	7,45,400	8,65,400
15 سال بعد سے	6,000	360,000		
5 سال تک		480,000	10,14,200	14,94,200
20 سال بعد سے	12,250	7,35,000		
مدت تکمیل تک		12,15,000	10,00,000	22,15,000

ایک لاکھ روپے کی سرمایہ کاری پر ماہانہ بنیاد پر منافع وصول نہ کرنے کی صورت میں مدت تکمیل پر یکمشت ۳۱ لاکھ سے بھی زائد کی ادائیگی متوقع ہے۔

اضافی فوائد:

- چھ ماہ بعد کسی بھی وقت منافع سمیت رقم واپسی کی سہولت
- جمع شدہ رقم کے مساوی مفت حادثاتی بیمہ۔
- جمع شدہ سرمائے کے عوض قرضے کی سہولت۔
- اسکیم کی تکمیل پر یکمشت ادائیگی کے علاوہ ماہانہ بنیاد پر مخصوص مدت کے بعد منافع کی ادائیگی۔
- سرمایہ کاری کی کم از کم حد 5,000 روپے زیادہ کی کوئی حد نہیں

تھوڑی سی بچت ۔ بیش بہا منافع

تفصیلات کیلئے آج ہی آئی ڈی بی پی کی قریبی شاخ سے رجوع کیجئے

صنعتی ترقیاتی بینک ۔ پاکستان

ہیڈ آفس: اسٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر 2 وحید روڈ آف آئی آئی چندریگر روڈ، پوسٹ بکس نمبر 5082 کراچی۔ 2419160-68, 2419171, 2412190 گرام: INDEBA کراچی۔
ٹیلیکس 20722 آئی ڈی بی پی ۔ پاکستان فیکس 2411990

علاقائی دفاتر:
- کراچی: 2419161-68, 2419171, 2412190 ● لاہور: 6303155-58 ● اسلام آباد: 210112 -210117, 210109
- پشاور: 271846 - 47 272558, 271548, 279449 ● کوئٹہ/کینٹ: 820722 - 823611 ● سکھر 25974- 26847 - 26936

شاخیں:
- صدر، کراچی 521662 - 519146 - 526539 - 515176 ● حیدرآباد: 782145 - 782936 ● لاڑکانہ: 44461
- اسلام آباد: 210651 ● راولپنڈی: 562015, 564655 ● گوجرانوالہ: 82581 ● فیصل آباد: 610231 ● ملتان: 5/2102,43931
- ایبٹ آباد: 5371 ● ڈیرہ اسماعیل خان: 4591 - 4978 - 710697 ● گلگت: 3710, 3419 ● میرپور (آزاد کشمیر): 3379
- مظفرآباد (آزاد کشمیر) 4551

آئی ڈی بی پی
(قائم کردہ حکومت پاکستان)

MASS

IDBP/BBMC/01/95-R-2

ابتدائی تحریریں

فلسفہ اور حقیقت

حمایت تراب

متعلم دہم۔ عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج۔ اورنگ آباد

حمایت علی شاعر کی پہلی مطبوعہ تحریر

(مطبوعہ "نورس" آذر تا اسفندیار ۱۳۵۵ء مطابق ستمبر تا دسمبر ۱۹۴۵ء عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن)

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا صاحب جنوں کر (اقبال)

زندگی نے کروٹ لی' کلیاں پھول ہوگئیں' پھول مرجھا بھی گئے' جو معصوم آنکھیں کبھی چاند کو اپنے پاس بلانے کی ناکام کوشش کرتی تھیں اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں مستقبل کی رنگینیاں دیکھ رہی تھیں۔ مقبرہ رابعہ دورانی کا سا دلکش مقام۔ درخت دودھ سی چاندنی میں کھڑے نہا رہے تھے۔ بہار میں رنگی ہوئی کلیاں حوض کے شفاف پانی میں جھک جھک کر اپنے حسن خداداد کا مظاہرہ کررہی تھیں' رات کا ایک پہر گزر چکا تھا منظر پر کافی سکوت طاری تھا۔

پرویز اور غزالہ حوض کے کونے پر بیٹھے مستقبل کے تخیلات میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایک مدت کے بعد آج دونوں کو یکجا ہونے کا موقع ملا تھا۔

پرویز نے مہر خموشی کو توڑتے ہوئے کہا "غزالہ......چاند آج کتنا خوبصورت اور جوان دکھائی دے رہا ہے' پانی نے چاند کو اپنے دل میں جگہ دی ہے۔"

"لیکن تم نے دیکھا پرویز؟ چاند کانپ بھی تو رہا ہے' شاید اسے بھی کسی ایسی ہستی کا ڈر ہو جو انکی محبت کو ختم کرڈالے۔" غزالہ نے پانی میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم جانتی ہو غزالہ؟ کائنات ایک دن فنا ہوجائے گی' لیکن محبت! محبت لافانی ہے۔"

پرویز اب فلسفیانہ لہجہ اختیار کرچکا تھا' اس نے پیشانی پر بل ڈال کر اپنی گردن ایک خاص انداز سے موڑی۔

اس کے ہاتھ کچھ عجیب سے حرکتیں کررہے تھے گویا اسکے خیالات کی ترجمانی کررہے ہوں۔

"وہ محبت ہی کیا جو مادی زندگی کے بعد ختم ہوجائے۔" اس کی آواز درد و کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"غزالہ' میں مانتا ہوں کہ تم تعلیم یافتہ ہو' محبت کے معنی خوب جانتی ہوں' لیکن کیا تم نے کبھی یہ سوچا کہ محبت اور ہوس میں بڑا فرق ہے؟ محبت نام ہے دو دلوں کے ایک ہوجانے کا' اگر دو محبت بھرے دل ایک دوسرے کے قریب نہ ہوسکیں تو یہ محبت کی ناکامی نہیں۔ کامیابی ہے' غزالہ' فرقت میں جو لذت ہے...... ملاپ میں نہیں۔"

پرویز اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا' وہ کچھ محسوس نہ کر سکا کہ اس کی یہ باتیں غزالہ کے نازک اور معصوم دل پر نشتر کا کام کر رہی ہیں۔ صبر کا پیانہ لبریز ہو چکا تھا اور اس کا لہجہ طنزاختیار کر چکا تھا وہ اب پرویز سے مخاطب تھی۔

"یہ کیوں نہ کہہ دیجئے کہ آپ نے "دل لگایا تھا دل لگی کے لئے"

اب وہ مدعا کہنا چاہتی تھی لیکن کچھ کہہ نہیں سکتی تھی کہ وہ جا رہی ہے' کسی اور گھرانے میں دو آنسو رخسار پر ڈھلک کر رہ گئے اور وہ پھر کر بولی۔

"جانتے ہو پرویز؟ چند روز کے بعد میں بیاہی جا رہی ہوں' لیکن ایک دوسرے گھرانے میں' ایک دوسرے ماحول میں' اتنی رات گئے چوری چوری تم سے ملاقات کا مقصد یہی تھا کہ اپنے مستقبل کی بھیانک زندگی کا نقشہ تمہارے سامنے پیش کر دوں' تم سے مدد چاہوں یا الوداع کی گزارش' لیکن جب میں نے تمہاری فلسفہ طرازی دیکھی تو نہ پوچھو کہ میرے دل پر کتنی بجلیاں گر گئیں۔

"غزالہ..........." پرویز نے فلسفیانہ نیند سے چونک کر کہا "تم یہ کیا کہہ رہی ہو غزالہ؟" میں اس جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا' میری دنیا کو تاریک نہ بناؤ' مجھے تم سے محبت ہے' سچی محبت' میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔" پرویز نے غزالہ کا دامن تھام لیا۔

فلسفے کی ضخیم کتابوں میں کھویا ہوا یہ فلسفی آج جدائی کے ہیبت ناک تصور سے مغلوب ہو چکا تھا' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"مجھے جانے دیجئے ورنہ میں کہیں کی نہ رہوں گی' ماں باپ کے پرانے خیالات نے مجھے کہیں کا نہ رکھا' مجھے جانے دو پرویز.........." غزالہ نے جذبات کو ضبط کے گھونٹ پلاتے ہوئے کہا۔

"غزالہ.........ہم کہیں اور جا بسیں گے۔ تم تعلیم یافتہ ہو' آزاد خیال ہو' کیا میرے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتیں؟" پرویز کی آنکھیں مایوسی سے بے نور ہو گئیں تھیں۔

"والدین کی عزت کا خیال۔ میں مجبور ہوں پرویز بات طے پا چکی ہے۔"

مشرق کی جانب سے کالے کالے مہیب بادل سر اٹھائے آ رہے تھے ایک لمحہ بعد چاند ان مہیب بادلوں میں روپوش ہو گیا' ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔

غزالہ جا چکی تھی..... پرویز کہہ رہا تھا۔

"والدین کی عزت کا خیال...... میں مجبور ہوں........ بات طے ہو چکی ہے... اف...... تاریکی"

"ہا......ہا...ہا...ہا" اس نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔

○

پرویز کی آنکھیں کھل چکی تھیں اس کے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں پھٹی ہوئی' اس نے متحیر نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

"ہا...ہا...ہا..ہا" اس نے پھر ایک قہقہہ لگایا' اب اس کے قہقہے میں طنزیہ رنگ تھا' ایک انگڑائی لی اور گھر کا راستہ لیا۔

دوسرے دن اسے یہ خط ملا۔

"پرویز....!"

(باقی صفحہ ۵۲۰ پر)

افسانہ

تاج کے زیر سایہ

(کامریڈ........ کے نام جو، نظربند کرلیا گیا ہے)

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ ہفتہ وار ''نظام'' بمبئی، ۷ا نومبر ۱۹۴۶ء)

البتہ مجیب اور چودہری کے متعلق پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا۔ ان کے نام وارنٹ جاری ہوگیا ہے مگر انتصار! پہلے تو میں یہی سمجھا کہ عباس نے گپ اڑائی ہے۔ مگر ایسے سنگین معاملہ میں عباس اور گپ، میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر بات کیا ہے؟

ڈیڑھ بجے کی خبریں سن کر رسٹوران سے باہر نکلا۔ طبیعت غیر معمولی طور پر نڈھال سی ہوگئی تھی۔ کچھ کسمساہٹ بھی میں اپنے اندر محسوس کررہا تھا۔ دماغ ابھی تک انتصار کی نظربندی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آخر یکا یک یہ ہو کیا گیا؟

یوں تو انتصار کے جاننے والے شہر میں اور بھی لوگ ہیں مگر سوائے چند کے میں نے کسی اور سے اس بارے میں چہ میگو ئیاں ہوتی نہیں سنا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے بہت ہی آہستہ جیسے کوئی بڑی ہی راز کی بات ہو۔ میں بھی ان کے قریب بیٹھا تھا اور جوں ہی ان کے منہ سے لفظ انتصار نکلا تھا۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا تھا

''وہ کمیونسٹ ہے۔ سرکار کمیونسٹ کو اسی طرح گرفتار کررہی ہے'' اور انہوں نے مجھے متوجہ پالیا تھا۔

''بھئی یہ کمیونزم اپنی سمجھ میں اب تک نہیں آئی سنا ہے''

''تعجب ہے'' میں نے دل ہی دل میں کہا تھا ''یہ لوگ کیسی سمجھ کے ہیں آخر؟''

''سرکار کمیونسٹوں'' کو ''اسی طرح'' گرفتار کررہی ہے اور لفظ ''اسی طرح'' میرے دماغ میں گھومنا شروع ہوا تھا۔

''کیا بات ہے آخر؟......... کیوں؟؟؟'' ''یہ ''اسی طرح'' میں کیا راز ہے پوشیدہ؟''

اتفاق سے مجھے انتصار کا دیوانہ بھائی راہ سے گزرتا دکھائی دیا۔ صورت بنائے ہوئے گردن کو جھکائے ہوئے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا وہ شاید بازار جارہا تھا۔

''اسلام علیکم جناب'' وہ خود ہی مجھ سے مخاطب ہوگیا۔ اور اپنے خاص انداز میں جھک جھک کر سلام کرنے لگا قریب جانے پر بہرحال مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا۔ عباس نے صحیح کہا تھا وہ لوگ صحیح کہہ رہے تھے۔

''اب تم کہاں جارہے ہو؟''

انتصار کے بھائی کو جیسے ہوش آگیا ہو۔

''بھائی ہمیں دیوانہ کہتے تھے۔ دیوانے قبلہ آپ خود ہیں۔ سرکار کے مہمان ہیں اب۔ مگر ہمیں جو تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ بازار جائیں سودا لائیں۔ امی مکان میں رو رہی ہیں۔ ابا گاؤں چلے گئے ہیں۔ بہن کی حالت.....؟ بس پوچھئے مت صاحب ۔ اچھا چلئے۔ اب آپ چائے پلائیں گے ہمیں؟''

انتصار سے معلوم ہوا تھا۔ اس کے بھائی کی یہ ایک بہت پرانی بیماری ہے۔ لاکھ علاج کروائے۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا

مگر......   وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

انتصار کے بھائی کو اپنے مقررہ دنوں میں دورے پڑتے ہیں اور ان دوروں میں اس کی حالت بہت ہی غیر ہو جاتی ہے۔ زبان سے جملے تک ادا نہیں ہو سکتے۔ جی گھبراتا ہے اور بخار......

قدرت بھی کتنی ستم ظریف ہے؟

باپ بوڑھا ہو گیا ہے۔ دو لڑکے ہیں تو ایک اس میں دیوانہ اور دوسرا کامریڈ۔

خیر پھر بھی شکر ادا کرنا ہی چاہئے۔ یہ قبلہ جو ابھی ابھی مجھ سے ملے تھے اور دنوں میں تو اچھے رہتے ہیں۔ صرف بعض ہی اوقات بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔

انتصار کا تو چھوڑیئے' وہ کامریڈ ہے۔ کامریڈ ہی رہے گا۔ پرسوں ہی کی تو بات ہے گھر کے واقعات نے کچھ اس طرح کروٹ بدلی تھی کہ بے چارے کو مجبوراً ایک مدرسہ میں ملازمت کرنی پڑی تھی...... کرتا رہا' مگر کب تک؟

خیالات زندگی کے لئے ایک راہ نکال لیتے ہیں۔ پگڈنڈی ہی کیوں نہ ہو؟ کانٹوں سے بھری ہی کیوں نہ ہو۔ بہرحال زندگی کو اسی پر لا ڈالنا پڑتا ہے۔ خواہ تھک کر چور کیوں نہ ہو جائے۔ لہولہان کیوں نہ ہو جائے۔

یہی حال انتصار کا تھا۔ واقعات نے بارہا اس کے قدم ڈگمگائے حتیٰ کہ گرا گرا دیا۔ مگر خیالات نے اسے پھر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اچلنے پر مجبور کر دیا اور وہ بھی قدم تول آگے بڑھتا ہی گیا۔

مجھے انتصار کی مستقل مزاجی پر رشک آتا ہے۔ چھریرے بدن کالا بنا سایہ نوجوان' جس کے لانبے قد نے اسے اور بھی دبلا بنا رکھا ہے۔ کس طرح اپنی پر خطر راہوں پر ڈٹا کھڑا ہے۔

آج مراد آباد میں زندگی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ اسی مراد آباد میں جہاں علم و ادب کے مدفن اور ان پر کی چھائی ہوئی خاموش اور کند فضا ایک مدت سے مراد آبادیوں کی زبوں حالی پر رونا راگ الاپ رہی تھی اب خاموش ترانے گنگنا رہی ہے۔ وقت کی بدلتی ہوئی کروٹوں پر کس نے غور کیا ہے؟ کس نے سوچا ہے؟

ایک وقت آئے گا اور بہت جلد آئے گا۔ یہی خاموش ترانے گنگنانے والے جنہوں نے مراد آباد کو بام عروج پر بھی دیکھا ہے۔ زور زور سے بغیر کسی سے ڈرے' بغیر کسی سے جھجکے ترانے گانے لگیں گے۔

انتصار کامریڈ ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ غلط راہ پر گامزن ہے۔ ہو سکتا ہے۔ مگر ان ہی کامریڈس ہی نے تو موت کا نوالہ ہوتی ہوئی زندگی کو حیات ثانی بخشی۔

وہ نظر بند کر لیا گیا ہے۔

وہ کل کہہ رہا تھا۔ ظلم کے پاؤں نہیں ہوتے۔

وہ کہے گا' کہتا رہے گا مگر اس کے چلے جانے کے بعد اسکے گھر کا کیا حال ہو گا۔ یہ خیال ذرا پریشان کن تھا اور مجھے پریشان کرنے لگا۔

ابھی ایک ہی تو ہفتہ ہوا۔ اس کی والدہ لکھنؤ سے اس سے ملنے کے لئے آئی ہیں۔ بوڑھی والدہ بڑھاپے کی آنکھ کا نور دیکھنے آئی تھی۔ نور اس سے کوسوں دور تھا۔ مگر وہ آئی تھی۔ ماں کو اپنے بچے سے کتنی محبت ہوتی ہے۔

قدرت نے محبت کو ماں کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ماں مجسم محبت ہے اور پھر ایک ہندوستانی ماں۔ میں نہیں سمجھتا

کہ دنیا کے کسی اور خطے میں بھی اس طرح کی مائیں ہوں۔

غیرؔ ہندوستان کو جنت نشاں پہلے کہتے تھے۔ مگر اب نہیں۔ اس لئے کہ اس وسیع اور عریض خطہ میں سب کنگال ہیں۔ سب بھوکے ہیں۔ سب کے جسموں پر چھیتھڑے لگ چکے ہیں۔ ہندوستانیوں کے جسموں پر اب گوشت نہیں ہڈیاں نظر آتی ہیں اور ہڈیاں بھی وہ جن کی فاسفورس بھی کھینچ لی گئی ہو۔

مگر ظاہربیں نگاہوں نے ابھی ان ہڈیوں کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ ان دریچوں میں ہاتھ ڈال کر ٹٹول کر نہیں دیکھا جن پر اب پوست کا پتلا اور گندہ پردہ پڑا ہوا ہے۔ جس کی بو سے غیرؔ کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ جس کے میلے اور گندے پن کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ان میں ایک چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا دھڑک رہا ہے۔ اس میں محبت کا ایک بحر بے کراں موجزن ہے۔ پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ یہ ہندوستانیوں کا دل ہے۔ ہندوستانی جن پر غیروں نے غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے۔

مگر ہندوستان‘ ہندوستان اب بھی جنت نشاں ہے۔ ہندوستانیوں کے دل محبت سے شاداب ہیں۔ محبت سے لالہ زار بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کو سرسبز کھیتوں نے قدرتی نظر کش مناظر نے جنت نشان نہیں بنایا۔ ہندوستان کو بہار محبت نے جنت نشاں بنایا ہے۔ ایسی بہار محبت نے جس پر خزاں کبھی تصرف پا ہی نہیں سکتی ہندوستان جنت نشاں ہے جنت نشاں رہے گا۔

سینکڑوں اور ہزاروں میل سے محبت اُمڈی ہوئی آئی تھی۔ صرف اسی لئے کہ اسے نچھاور کرو ے۔ اپنے لخت جگر پر۔ اور لخت جگر کو کسی نے زبردستی چھین لیا تھا۔ جگر بے چین ہوگیا۔ بے چین ہے اور نہ معلوم کب تک بے چین رہے۔

خون کے آنسو ہیں کہ بہے جا رہے ہیں۔ اور کوئی نہیں پوچھتا کہ ان میں سرخی کیسی؟

بوڑھا باپ ایک دور دراز گاؤں میں نہ معلوم کیا کر رہا ہو۔ خون پسینہ ایک کر رہا ہوگا۔ وہ پیدا ہی اسی لئے ہوا ہے۔ ہر ہندوستانی اسی لئے پیدا ہوا ہے ہر ہندوستانی کی یہی زندگی ہے۔ پیٹ کی آگ جب دہک اٹھتی ہے تو اسے خون سے ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے۔ باپ دادوں سے چلی آرہی ہے یہ ریت‘ انتصار اس دہکتی ہوئی آگ کو بجھا دینا چاہتا تھا۔ یہی اس کا جرم تھا۔ یہی اس کی خطا تھی۔ پیٹ کی آگ دہکتی ہے۔ دہکنے دو اسے۔ اگر وہ شعلوں میں بدل جاتی ہے۔ بدل جانے دو اسے‘ جل کر بھسم ہو جاؤ۔ راکھ ہو جاؤ‘ راکھ غیروں کی مشین صاف کرنے کے کام آجائے گی۔ سائنس کا یہ بھی ایک کرشمہ ہوگا۔ انسانی جسم کی راکھ لوہے اور تانبے کی مشینوں کے کام آئے۔ سنا ہے اوزار مانجھے جانے پر اجلے ہوجاتے ہیں۔ ان ہی کی تابندگی سے ایک دن دنیا کا اندھیرا دور ہوجائے گا۔

○

آج صبح سے شہر میں لاشیں گھوم رہی ہیں۔ زندہ لاشیں پھٹے پرانے کفن اوڑھی ہوئی تھیں۔ وہ شام تک گھومتی رہیں دوپہر کی چلچلاتی دھوپ کی بھی انہوں نے پرواہ نہیں کی۔ نکیرین ملوں کی قبروں میں ان سے کیا کیا سوال کریں گے؟ انہوں نے اس پر سوچا تک نہیں۔ سوالات کے جوابات نہ دینے پر ان پر کتنے کوڑے برسائے جائیں گے انہوں نے اس کا بھی خیال نہیں کیا۔

آج لاشوں نے بغاوت کردی تھی۔ ملوں کی قبروں کے نکیرین سے‘ حکومت کے خداوندوں سے‘ وہ نعرے لگا رہی تھیں‘ چیخ چیخ کر نعرے لگا رہی تھیں۔ ~~گڑگڑا گڑگڑا کر نعرے لگا رہی تھیں~~۔

کامریڈ انتصار کو چھوڑ دو

کامریڈ خادم کو چھوڑ دو۔

مگر دنیاوی خداوند تو کیا۔ آسمانوں نے بھی ان کی ایک نہ سنی۔ کسی کے کان جوں تک نہ رینگی۔ سنتے ہیں اکثریت ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ خواہ ان کے مطالبات غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر یہاں غلبہ تو کیا ان کا دباؤ تک کسی پر نہیں پڑا۔ مگر یہ بھی کیا کم ہے۔

خدا نے انہیں اتنا بڑا مکان جو دے دیا ہے۔ کتنا بڑا مکان ہے اور پھر مکان ہی نہیں۔ چراغ، قندیلیں، قمقمے۔ سب ہی کچھ عطاء کئے ہیں۔ ہر طرف روشنی ہے۔ نور ہی نور ہے۔ اندھیرے کا پتہ تک نہیں...... اور پھر..... آنکھیں دیں، کان دیئے، ہاتھ پاؤں کی نعمت بخشی۔ دن کام اور رات آرام کو............

اب اور کیا چاہیئے؟

خادم کو نہیں چھوڑا جاتا۔ نہ چھوڑا جائے۔ انقسار نہیں چھوٹتا۔ نہ چھوٹے......

لاکھ چیخو، چلاؤ، طاقت کے کان بہرے ہیں مگر طاقتوروں سے کہہ دو کہ یہی بندہ مزدور سکندر بنے گا۔ ان ہی پیٹ کی آگ میں جھلسے ہوئے جسموں کے سروں پر تاج رکھا جائے گا اور تاج بھی وہ نہیں جو "کشکول گدائی" ہے بلکہ انسانیت کا تاج۔ آدمیت کا تاج۔

(نوٹ... اس افسانے میں فرضی نام رکھے گئے تھے۔ مجیب (حبیب) انقسار (افتخار) مراد آباد = اورنگ آباد (مرتب)

حمایت علی شاعر

تقدیر

(مطبوعہ۔ سویرا۔ شمارہ نمبر (۹۔۱۰) ۱۹۴۷ء حیدر آباد دکن)

ایک بت جہل زرداری کا پروردہ خیال
عرش و کرسی کے پس پردہ، ملوکیت کی چال

"ملکیت" کی گود میں پھولی پھلی، پایا شباب
ذہن پر انسان کے ڈالے ہوئے رنگیں نقاب

نوچ ڈالے جس نے شاہین خرد کے بال و پر
تنگ تر کردی تھی جس نے وسعت قلب و نظر

آدمی مفلوج، یخ بستہ حیات گرم کار
شاہراہ زندگی محدود تر، تیرہ و تار

جادۂ تخیل پر پہرے، حصار اندر حصار
عزم کے لاشے درون دل، قطار اندر قطار

عظمت انسان خاک آلود، انساں پست تر
جیسے "جاپانی" کھلونا" جیسے شبنم کا گہر

زندگانی وقت کی ہمدوش چلتی ہی رہی
فکر انساں، وقت کے سانچے میں ڈھلتی ہی رہی

آفتاب علم ابھرا، تیرگی چھٹتی گئی
پا بجولاں زیست کی اک اک کڑی کٹتی گئی

آہ لیکن فکر آدم نے نہ الٹا یہ نقاب
"ملکیت" کے ہوگئے شرمندۂ تعبیر، خواب

(افسانہ)

بدلتے زاویئے

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ ہفتہ وار ''شاہد'' بمبئی - عید نمبر ۱۹۴۸ء)

اور جب ننھے رفعت نے اپنی کتابیں اور کاپیاں اٹھائیں تو ایک بار پھر اس کا خیال اپنے چچا کی طرف گیا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ننھا سا ہاتھ اپنے داہنے گال پر آ گیا اور اس نے محسوس کیا جیسے چچا کی سخت اور موٹی موٹی انگلیاں اس کے گال پر چپک کر رہ گئی ہوں۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور اس اندھیرے میں اس نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ جیسے وہی ہاتھ زناٹے سے اس کے دوسرے گال پر پڑ گیا ہو اور رفعت کا ہاتھ اپنے داہنے گال سے ہٹ کر بائیں گال پر آ گیا اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں جو سامنے دیوار پر کہیں جمی ہوئی تھیں اپنے مرکز سے ہٹ گئیں۔

رفعت کچھ سوچ رہا تھا' کچھ وہ جو اس کی سمجھ سے باہر تھا اس کی پرواز فکر کی حد سے کہیں دور۔ وہ اپنے دماغ میں بس یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے ایک دوسرے سے قریب قریب کئی لٹو سے گھوم رہے ہوں اور کچھ ہی لمحوں بعد اس نے اپنے دماغ کو بھی گھومتا ہوا محسوس کیا۔ بری طرح' اور اسے یوں دکھائی دینے لگا جیسے دیوار بھی گھوم رہے ہیں وہ خود بھی گھوم رہا ہے کمرے کی ہر ایک شے گھوم رہی ہے۔

''ٹن' ٹن' ٹن''

تو بج گئے اور گھومتے ہوئے در و دیوار' چکراتے ہوئے خیالات ایک دم ٹھہر گئے۔ ہر چیز ساکت' خاموش ہلتے ہوئے پنڈولم کا منہ تکنے لگی۔

رفعت کی نگاہیں بھی پنڈولم پر جمی ہوئی تھیں۔ پنڈولم خاموش اس طرح ہل رہا تھا جیسے کہہ رہا ہوں۔

''صبر کرو' صبر کرو' میں بہت جلد ان روز و شب کو تمہاری زندگی میں داخل کروں گا' جن کے تم متلاشی ہو۔ میں خود ''آج'' سے بے زار آ چکا ہوں۔ میں خود اس ''کل'' کا پرستار ہوں جس کی امید پر دنیا کے تمام باشی جی رہے ہیں۔ میں نے سورج کی ہر پہلی اور آخری کرن میں ان روز و شب کا عکس دیکھا ہے۔ اس عکس نے میری بھی آس بندھائی ہے اور میں بھی اسی امید پر اس طرف بڑھ رہا ہوں دم بھر کو دم نہیں لیتا مجھے اپنے فرض کا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ میری تسکین اور دلاسے پر جی رہا ہے۔ ان کی تمام امیدیں مجھ سے وابستہ ہیں اور وہ بھی میرے ساتھ اسی لئے اس سمت بڑھے جا رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ نہ انہیں ناکامی ہو گی اور مجھے شرمندگی۔ منزل قریب تر ہے' بس ایک جست کی ضرورت ہے۔'' اور پنڈولم ہلتا رہا۔

اور رفعت غور کرتا رہا تھا

آخر یہ ہمیشہ ہلتا ہی کیوں رہتا ہے؟

ٹھہرتا کیوں نہیں؟

کیوں آخر؟؟؟

پنڈولم کا خاموش درس رفعت کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ وہ بس یوں ہی تک رہا تھا اسے، اسے اب یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ ابھی ابھی وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس کا دماغ کیوں گھومنے لگا تھا۔ کیا بات تھی آخر وہ؟

اب نہ اس کے چہرے پر وہ ہلکی ہلکی سرخی ہی تھی اور نہ ابروؤں کے بیچ شکنیں ہی، البتہ اس کے داہنے گال پر موٹی موٹی انگلیوں کے ابھرے ہوئے سرخ نشان ابھی تک موجود تھے اور بائیں گال پر ننھا سا ہاتھ، جو غیر محسوس طور پر آہستہ آہستہ انگلیوں کے نشان ڈھونڈ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

کیوں ہلتا رہتا ہے یہ؟

ٹھہرتا کیوں نہیں؟؟

"رفعت"

جیسے بادل گرج گیا ہو۔ رفعت ایک دم چونک پڑا۔ اس کا جسم اس طرح کانپ کر رہ گیا جیسے بجلی سرایت کر کے نکل گئی ہو۔ کمرے کی ہر ایک شے دم بخود جیسے اپنی جگہ جم کر رہ گئی ہو؟

پنڈولم اب بھی اسی طرح ہل رہا تھا، اس پر اس گرج کا اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ رفعت نے سہمی سہمی نگاہیں اپنے چچا پر ڈالیں اور نیچی کر لیں، آج اسے اپنے چچا کا چہرہ انتہائی خوفناک اور ڈراؤنا دکھائی دے رہا تھا۔

"اب دیکھتا کیا ہے؟ چل جا مدرسہ"

"ٹن"

اور اس سے پہلے کہ آواز کی گرج گونج بن جاتی، پنڈولم نے آواز پر جیسے ایک ضرب لگا دی اور کمرے کی محیط اور ساکت فضاء ایک لمحہ کے لئے متحرک ہوگئی۔ اور پنڈولم بدستور ہلتا رہا۔ اور بدستور اپنی خاموش زبان سے کہتا رہا۔

"اب ان آوازوں کی گرج پر اسی طرح ضربیں پڑتی جائیں گی اور ایک دن وہ بھی آئے گا کہ اس قسم کی آوازیں اور منع آواز۔ میری آواز کے تلے دب کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔" اور پنڈولم ہلتا رہا۔ اسی بدلے ہوئے انداز میں، اسی کرخت لہجہ میں۔ لیکن اس کی للکار نہ رفعت ہی سمجھ سکا اور نہ اس کا چچا ہی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ تک نہ دی۔

چچا کے چلے جانے کے بعد رفعت نے آہستہ آہستہ اپنی کتابیں اور کاپیاں تھیلی میں ڈالنا شروع کیں۔ لیکن اب پھر وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے دماغ میں کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس سے پہلے کہ رفعت اس پر کچھ غور کرتا اس نے اپنے پر تولنا شروع کر دیئے اور اپنے ساتھ ساتھ رفعت کو بھی لے اڑی۔ رفعت اپنے گرد و پیش سے بے خبر اپنے خوالات میں الجھ کر رہ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اردو کی کتاب کھلی پڑی تھی جو شاید تھیلی میں ڈالتے وقت اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ گو کتاب کے جو صفحات اس کے پیش نظر تھے وہ کسی اور سبق سے متعلق تھے لیکن تصور ہی میں وہ اس نظم کو پڑھ رہا تھا جو اس کتاب کی پہلی نظم تھی۔ (خیالات)

اے زمین آسمان کے مالک ساری دنیا جہان کے مالک
تیرے قبضہ میں سب خدائی ہے تیرے ہی واسطے بڑائی ہے
تو ہی ہے سب کا پالنے والا کام سب کے نکالنے والا!

اور رفعت کے دماغ میں اس نظم کے مصرعے جیسے اپنے نقوش چھوڑنے لگے۔ اس کے خیالات ان نقوش کے اطراف دائرے سے بنانے لگے' جیسے ان سے جواب چاہتے ہوں۔

"کیوں؟"

"کیسے؟"

"کیا ان نقوش کی اصلیت کچھ بھی نہیں؟"

اور جواب نہ ملنے پر دائرے ایک دوسرے میں الجھ کر رہ گئے اور اس سے پہلے کہ یہ الجھاؤ اور بڑھ جاتا' رفعت کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک، تیر کر نکل گئی۔ وہ حال سے ماضی میں پہنچ گیا۔

مدرسہ میں شریک ہونے سے پہلے ایک مولوی صاحب اسے کلام مجید پڑھایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا چہرہ آج تک رفعت کی نگاہوں میں جوں کا توں موجود تھا۔ وہی ان کی سفید' روئی کے گالے جیسی داڑھی' دونوں کانوں کو چھپایا ہوا بے تکا سا عمامہ' اور وہ ان کی ہلتی ہوئی گردن' ناک کی ہڈی پر تاگوں کی سے مدد سے اٹکا ہوا چشمہ' جس کے شیشوں میں ان کی جھانکتی ہوئی آنکھیں' رفعت کو یہ موٹی دکھائی دیتی تھیں۔ اور رفعت کی آنکھوں میں یہ منظر تیرنے لگا۔

مولوی صاحب کی داڑھی کو چھونے کی اسے بڑی آرزو تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک بار اسے اپنی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیوں اس طرح ملے جس طرح وہ روئی کے گالے کو مسلا کرتا تھا۔ رفعت کو روئی کے گالے کے مسلنے میں بڑا ہی مزا آتا تھا۔ ایک بار تو اس نے اپنے تکیئے میں صرف اس لئے سوراخ کردیا تھا کہ جب اس کا جی چاہے اس میں سے تھوڑی روئی نکالا کرے اور مسلا کرے۔ لیکن جب اس کی چچی کو اس کی اس حرکت کا پتہ چلا تھا۔ رفعت کانپ کر رہ گیا۔ سر سے پاؤں تک اس کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی' وہ ماضی سے پھر حال میں آگیا اور نیچے پڑھی ہوئی اپنی اردو کی کتاب تھیلی میں ڈالنے لگا۔ (مسلنے)

(حسنے) اب اس کی پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اس کا پھول سا چہرہ آہستہ آہستہ کھلتا جارہا تھا جیسے ماضی کا تصور' تصور نہیں تھا' بہار تھی جو اس کی زندگی کے مرجھائے ہوئے چمن میں کچھ لمحوں کے لئے آکر چلی گئی تھی۔ وہ ابھی کے اسی سبب کچھ بھول بیٹھا تھا جس نے اس کے پھول سے چہرے کو کھلا دیا تھا۔ اسے آزردہ کردیا تھا۔ اسے اب یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اس کے داہنے گال پر چچا کی موٹی موٹی سخت انگلیاں ابھی تک چپکی ہوئی ہیں۔ ماضی کے تصور نے اس کے پردہ دماغ کے ابھرے ہوئے تمام نقوش پر جیسے ایک اور پردہ ڈال دیا تھا۔ اور اس پردے پر اب صرف مولوی صاحب کا عکس تھا جو غیر محسوس طور پر آہستہ آہستہ اس کی توجہ کا مرکز بنتا جارہا تھا۔

وہ ان کی ہلتی ہوئی گردن' ناک کی ہڈی پر تاگوں کی مدد سے اٹکا ہوا چشمہ' بے تکا سا مضحکہ خیز انداز میں بندھا ہوا عمامہ اور وہ ان کے روئی کے گالے جیسی "سفید داڑھی" معلوم نہیں رفعت کو مولوی صاحب کی داڑھی روئی کے گالے جیسی کیوں معلوم دیتی تھی۔ حالانکہ باوجود آرزوئے دیرینہ کے وہ آج تک اسے چھونے میں ناکام ہی رہا تھا اور وہ ان کی عینک کے شیشوں میں سے جھانکتی ہوئی موٹی موٹی آنکھیں! اکثر تو رفعت انہیں دیکھ کر ڈر بھی جاتا تھا اور اپنی سہمی سہمی آنکھوں سے عینک کے بازوؤں سے جھانک کر ان آنکھوں کو دیکھ بھی لیتا تھا ایک بار' دو بار' دو تین بار' اور رفتہ رفتہ جب اس کا ڈر دور ہوجاتا تو اس کے دل میں ایک عجیب سا خیال پیدا ہوتا۔

"عینک بھی بڑے کام کی چیز ہے۔ لوگوں کو ڈرانے کے لئے مولوی صاحب نے بھی شاید اسی لئے عینک لگاتے ہیں" مگر

مولوی صاحب مجھے عینک دینے کیوں لگے۔

مولوی صاحب رفعت کو کلام مجید باترجمہ پڑھایا کرتے تھے اور جب وہ قرات سے پڑھتے تو رفعت اپنے دل میں کچھ عجیب سرور سا محسوس کرتا۔ معلوم نہیں یہ مولوی صاحب کی آواز کا اثر تھا یا قرآنی آیات کا' بہرحال جب کبھی وہ اس طرح پڑھتے' رفعت بڑے ہی غور سے ان کے منہ کو دیکھنے لگتا اور اس کوشش میں کہ وہ خود بھی ان کی طرح پڑھ سکے اکثر ان کی نقل کر بیٹھتا۔

رفعت ذہین تھا اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ایک عادت جو اسے عام بچوں سے بلند کئے ہوئے تھی اور ایک حد تک اس کے درخشاں مستقبل کی نشان دہی کر رہی تھی۔ یہ کہ وہ کچھ تحقیق پسند واقع ہوا تھا۔ دوران گفتگو میں جب کبھی وہ کوئی ایسی بات سن پاتا جس کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہ ہو؟ جھٹ سوال کر بیٹھتا۔

"کیوں؟"

"کیسے؟"

"اور جب تک اسے تسلی نہ ہو جاتی خاموش نہ بیٹھتا۔"

اس کا چچا تو اس کی اس کیا اور کیوں سے اس قدر تنگ آچکا تھا کہ اکثر مار بھی دیتا تھا۔ لیکن رفعت تھا کہ کیوں؟ اور کیسے؟

ایک دن تو بڑی عجیب سی بات کہہ دی رفعت نے۔

یوں تو اس نے ہوائی جہاز کو فضا میں کئی بار اڑتے ہوئے دیکھا تھا لیکن ایک دن ہوئی جہاز کو دیکھ کر وہ یکایک خاموش ہو گیا تھا۔ حالانکہ بچے ایسی چیزوں کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتے' ناچنے کودنے لگتے ہیں۔ خود رفعت بھی اس سے پہلے ہوائی جہاز کو دیکھ کر اتنا خوش ہوتا تھا کہ خوشی میں گانے لگتا تھا۔ اور جب ہوائی جہاز اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکتا تو وہ اسے بادلوں میں دیر تک ڈھونڈتا رہتا تھا لیکن اس روز

آسمان پر ہلکی ہلکی سفید بدلیاں چھائی ہوئی تھی کہیں کہیں سے نیلا آسمان بھی جھانک رہا تھا رفعت آنگن میں بیٹھا روئی کے گالے کو مسل رہا تھا۔ کبھی وہ اس کے تار تار الگ کر دیتا اور اسے گولے کی طرح بنا کر ہوا میں پھونک دیتا اور پھر اچھل کر اسے اپنی ننھی ننھی انگلیوں میں دبوچ لیتا' مسلنا شروع کر دیتا۔

رفعت اس کھیل میں اتنا مشغول تھا کہ اسے یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ اس کی چچی دالان میں بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہے' اگر وہ اس روئی کے گالے کو دیکھ پائے اور پوچھ بیٹھے کہ کہاں سے لے آیا ہے وہ؟

یکایک اس کے کانوں میں گرر گرر سی آواز سرسرائی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ درختوں میں' ہوا میں' بادلوں میں' اور بالا آخر اس کی نگاہوں نے ہوائی جہاز کو پالیا۔ ہوائی جہاز اوپر ہی اوپر بادلوں میں اڑا جا رہا تھا۔ ہوائی جہاز ہوا سے کبھی بادلوں میں چھپ جاتا اور بادلوں ہی سے گر گھرر سی آواز سنائی دیتی اور پھر رفعت اسے دیکھ پاتا۔ لیکن آج وہ اسے دیکھنے میں کچھ اس قدر محو تھا کہ اسے اپنے روئی کے گالے کا خیال ہی نہ رہا تھا وہ بس خاموش تھا۔ بالکل ہی خاموش یکایک اس کی نگاہ سامنے دروازے پر پڑی۔ اس کا چچا اس کی طرف آرہا تھا۔

"چچا جان' چچا جان' ہوائی جہاز" اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اور جب اس کا چچا آنگن سے ہو کر دالان میں آیا تو رفعت بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا' خاموش! لیکن جب اس کے چچا نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے ایک جملہ کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ بڑے ہی غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہو۔

"چچا جان، معلوم ہوتا ہے اللہ میاں ہوائی جہاز کو تاگا باندھ کر ہوا میں اڑاتے ہیں۔"

اس وقت اس کی عمر چار برس کی تھی اور چار برس کا بچہ عموماً تتلا کر بات کرتا ہے اور جب رفعت نے اپنی تتلی زبان سے یہ جملہ کہا تو اس کے منہ سے یہ بات اتنی بھلی معلوم دی کہ اس کا چچا کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اس کی ذہانت پر اس کی پیٹھ ٹھونکی اور محبت سے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ لیکن رفعت کو اس ہنسی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی تھی وہ متعجب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے چچا کی صورت کو تکتا رہا۔

گو اس واقعہ کو اب دو تین سال گزر چکے تھے لیکن رفعت کی یہ عادت ابھی نہیں بدلی تھی۔ بلکہ اب تو یہ جذبہ اس میں بھی شدید ہو گیا تھا۔

صبح جب وہ اپنے چچا کے ساتھ بازار گیا ہوا تھا تو اس نے چچا سے وہ بات پوچھ ہی لی جو چار دن سے اس کے دل میں کھٹک رہی تھی اور سوچ بچار کے وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ شہر میں آرائش بلدہ کے سلسلہ میں دوکانوں اور مکانوں کی توڑ پھوڑ جاری تھی۔ سڑکوں کی کشادگی اور تعمیر کے بارے میں دو ہفتہ قبل ہی اخبارات میں ایک "حکم" شائع ہو چکا تھا۔

وہ دکانیں اور مکانات جو سڑکوں کی دو رویہ نالیوں پر آگئے ہیں پندرہ دن کے اندر نالیوں سے ہٹا دیئے جائیں ورنہ گورنمنٹ خود انہیں تڑوا کر نیلام کر ڈالے گی۔ اور شہر میں حکم حاکم کی پابجائی کی جا رہی تھی۔

اور رفعت کے دماغ میں باوجود غور و فکر کے کوئی بات نہ آئی تھی اس نے اخبار وغیرہ تو پڑھے نہیں تھے۔ صرف اتنا سنا تھا کہ یہ بادشاہ سلامت کا حکم ہے۔

"کیوں؟"

"کس لئے؟"

بس یہی سوالات تھے جو اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے راستے میں گو اس نے اپنے چچا سے یہ بات پوچھ لی تھی لیکن تسلی بخش جواب نہ ملنے پر گھر آکر بھی اس نے وہی دہرا دیا تھا۔

"چچا جان، یہ دکانیں کیوں توڑی جا رہی ہیں؟"

"بیٹا یہ بادشاہ سلامت کا حکم ہے۔"

"بادشاہ سلامت کا حکم" بادشاہ سلامت دکانیں کیوں تڑوا رہے ہیں؟ ان کو غریبوں پر رحم نہیں آتا؟ کل مدن کہہ رہا تھا۔ میرے باپو کی دوکان بھی توڑ ڈالی گئی ہے۔ اب ہمیں دوکان کہیں نہیں مل رہی۔ میرا باپ کہتا ہے، پان کا ٹوکرا لے کر گلی گلی بیچا کر، چچا جان، بادشاہ سلامت کا حکم ماننا کیوں پڑتا ہے؟"

"بیٹا وہ ہمارے مالک ہیں اور مالک کا حکم ٹالا نہیں جاتا۔ اچھا، اب تمہارے مدرسے کا وقت ہو چکا ہے، بچے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔"

"مگر چچا جان، بادشاہ سلامت، ہمارے مالک کیسے........؟"

اور ابھی وہ اپنا جملہ پوری طرح کہنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک تھپڑ اس کے داہنے گال پر پڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چچا کی گرجدار آواز

"خبردار، جو کبھی ایسی باتیں اپنی زبان سے نکالیں۔ گھٹنے برابر لونڈا ہو کر، ابھی سے ایسی باتیں، چل دور ہو یہاں سے، جا مدرسہ، بادشاہ سلامت مالک کیسے، ابھی تجھے معلوم کیا، بادشاہ سلامت کہتے ہیں کسے، نمک حرام کہیں کا۔"

رفعت سوچ رہا تھا۔ آج اگر اس کے ابا ہوتے' اس کی امی زندہ ہوتیں تو آج ہی وہ اس گھر سے چلا گیا ہوتا۔ آخر اس نے ایسی کون سی بری بات پوچھی تھی؟

اے زمیں آسمان کے مالک ساری دنیا جہان کے مالک

ساری زمین۔ سارا آسمان' ساری دنیا تو خدا کی ہے اور خدا کے بندے سب ہیں اور سب بندوں کا مالک خدا ہے۔ پھر یہ بادشاہ؟

بادشاہ' بھی تو خدا کا بندہ ہے۔ اور بندے پر بندے کا حکم! بندے کا بندہ مالک!!

آخر اس نے ایسی غلط کیا بات کہہ دی تھی؟ چچا جان نے اسے اس بات پر اس زور سے مار کیوں دیا!

مولوی صاحب جب اسے کلام مجید پڑھایا کرتے تھے تو اس وقت بھی تو اس نے یہی بات پوچھی تھی۔

"الارض اللہ۔ ساری زمین اللہ کی ہے"

اور جو انہوں نے سمجھایا تھا' وہ سب کچھ یہی تو تھا۔

اے زمین آسمان کے مالک ساری دنیا جہان کے مالک

تیرے قبضہ میں سب خدائی ہے تیرے ہی واسطے بڑائی ہے

آخر چچا جان نے اس بات پر مار کیوں دیا؟

کیوں آخر؟

بادشاہ سلامت کو ایسا کہنا گناہ تو نہیں!

کل مدن کہہ رہا تھا اور مدن کے کہنے پر ہی تو اس نے یہ سب کچھ چچا جان سے کہا تھا۔

مدن آخر اس کا دوست ہے اور اس کا دوست اب پڑھائی چھوڑ دے گا۔

مگر چچا جان نے یہ کیا کہہ دیا؟

"بادشاہ ہمارے مالک ہیں"

اور رفعت کے دماغ میں یہ شعر گھومنا شروع ہوا۔

اے زمیں آسمان کے مالک
ساری دنیا جہان کے مالک

اور رفعت کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک طرف خدا تھا اور دوسری طرف بادشاہ۔ جھلا کر اس نے اپنی کتابیں تھیلی میں بھر لیں اور مدرسہ چلا گیا۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد میں پڑھا گیا)

جب سانپ ہی ڈسوانے کی عادت ہے تو یارو
جو زہر زباں پر ہے وہ دل میں بھی اتر جائے

(اربابِ دانش)

اختر حسن

(مطبوعہ ' ہفتہ وار "پرواز" ۱۹ دسمبر' ۱۹۵۰ء)

اختر حسن کے بارے میں جب کبھی سوچتا ہوں تو ایک ایسی شخصیت میری نگاہوں کے سامنے ابھر آتی ہے جو بیک وقت آہنی بھی ہے اور موم کی طرح نرم بھی۔ آہنی اس اعتبار سے کہ وہ اپنے نظریات کی دنیا میں ناقابل شکست اختیار کا مالک ہے اور نرم اس حیثیت سے کہ اس کے خدو خال اور جسمانی وضع قطع کو دیکھ کر قطعی یقین نہیں ہوتا کہ اس جسد میں ایک ایسا انسان بھی زندہ ہے جس کے عزائم فولاد کی طرح اٹوٹ' جس کی نظر عالم گیر اور جس کا احساس آہوں اور آنسوؤں کی آگ میں تپ تپ کر انقلاب کی راہ میں مشعل بن چکا ہے۔

اختر حسن سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جبکہ میں اورنگ آباد کے شرفاء کی نظر میں ایک آوارہ گرد طالب علم کے سوا کچھ نہیں تھا ان دنوں ہم سب آوارہ گردوں نے ایک انجمن بنا رکھی تھی۔ "انجمن نوجوانان اورنگ آباد" یہی انجمن بعد میں "انجمن ترقی پسند مصنفین اورنگ آباد" میں ڈھل گئی ہم بڑے زور و شور سے جلسے وغیرہ کرتے تھے۔ انہیں دنوں ہم نے ایسے جلسے بھی ترتیب دیے جن میں حیدر آباد کے علاوہ بمبئی کے شاعروں' ادیبوں اور دانشوروں کو بھی مدعو کیا گیا اور انہیں ساتھیوں کے ساتھ ایک بار اختر حسن بھی تشریف لائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جلسے کے بعد جب ہم نے اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ تصویر لینی چاہی تو اختر حسن کے مشورے کے مطابق طے ہوا تھا کہ ہم سب کرسیوں پر بیٹھیں اور یہ سب شاعر ادیب اور صحافی ان کرسیوں کے پیچھے کھڑے ہوں۔ چنانچہ یہی ہوا' کیفی اعظمی' سردار جعفری' مجروح' اختر حسن اور مسلم ضیائی وغیرہ پیچھے کھڑے ہوگئے اور مستقبل کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں تھمادی گئی۔

یہ پہلا احساس تھا کہ جس نے ہماری شعور کو نئی آگاہی بخشی اور ہم اپنے ارادوں کی مشعل جلائے زندگی کے راستوں پر رواں دواں ہوگئے۔

آج مجھے حیدر آباد آئے تین برس ہوچکے ہیں اور ان تین برسوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو کہ میں "پیام" نہ پڑھ سکا۔ میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک صحت مند شعور کی بیداری میں اور کتابوں اور رسالوں کے ساتھ ساتھ "پیام" بھی ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔ "پیام" سے میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اگر نہ حاصل کرتا تو شاید سیاسی اعتبار سے اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتا جو آج میں اپنے آپ میں پارہا ہوں

اختر حسن ہندوستان کے ترقی پسند صحافیوں میں بلند تر مقام رکھتا ہے۔ صحافت کی تاریخ میں اس کے قلم کا ہر نقش انمٹ ہے۔ مستقبل کا مورخ اس کے کارناموں کو صف اول میں جگہ دینے کے لئے مجبور ہے جاگیرداری کی عفونت پناہ آغوش میں پرورش پانے والے حیدر آباد کے تنگ و تاریک ماحول میں اختر حسن نے جس مقدس شمع کی لو بڑھائی ہے وہ آج خورشید مقام ہو چکی ہے۔ کوئی زندہ ضمیر انسان اس کی صحافتی عظمت اور اس کے مستحکم کردار سے انکار نہیں کرسکتا۔ وہ ہر دور میں ترقی پسند رہا ہے۔ ہر دور میں رجعت پسند اور انقلاب دشمن طاقتوں سے برسرپیکار رہا ہے۔ زندگی کی کٹھن سے کٹھن راہوں پر انتہائی حوصلہ شکن مراحل سے گزرنے کے بعد بھی اس کے قدم مضبوطی سے جمے رہے اور کوئی بدنیت حریف اس کے عظیم

کردار کا دامن آلودہ نہ کرسکا۔ اسی نیکی کے جرم میں وہ ایک بار جیل بھی ہو آیا ہے۔ وہ احساس کی اس منزل سے بھی گزر چکا ہے جہاں تلخی ناقابلِ برداشت ہو کر دلولوں کو سپر ڈالنے پر مجبور کردیتی ہے۔ تھکن رفتار کے قدم تھام لیتی ہے اور پسینے کا بہاؤ دہکتے ہوئے جذبات کی آگ پر برف ڈال دیتا ہے۔ ایسے صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد بھی اختر حسن محوِ سفر ہے..... مصروف صف آرائی ہے۔ آج ایک میں ہی نہیں حیدر آباد کا ہر وہ انسان جو انسانیت پسند ہے' ارتقاء دوست ہے اختر حسن کی قیادت کا معترف ہے' صحت مند شعور کے ارتقاء میں اختر حسن کی شخصیت ہر دور میں ایک رہنما کی سی رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی اس کا یہی مقام رہے گا۔

"پیام" امر ہے کہ کیونکہ "پیام" عوام کا اخبار ہے اور عوام اس سے محبت کرتے ہیں اور عوام جن سے محبت کرتے ہیں اس سے زندگی محبت کرتی ہے۔ مستقبل محبت کرتا ہے۔ عوام کا اخبار کبھی نہیں مرسکتا..... عوام کے الفاظ عوام کی طرح ناقابلِ تسخیر ہوتے ہیں۔

(باقی حقیقت اور افسانہ)

میرا بیاہ طے پاچکا ہے کسی اور کے ساتھ..... والدین کی عزت کے خیال نے مجھے اپنے ارادوں سے باز رکھا' میں مجبور تھی' تم سے ملاقات نہ کرسکی۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ میری زندگی...... خیر اسے جانے دو میرے فلسفی۔ فرقت میں جو لذت ہے...... ملاپ میں نہیں۔ اپنے خیالات پر کاربند رہو' جو ہونا تھا ہوچکا........ مخلص' غزالہ"

پرویز کانپ گیا' لفافہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا' وہ زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا۔

"خواب......... حقیقت؟....... محبت...... اف میری زندگی"

اس کی آنکھیں اور پھٹ گئیں....... "ہا....ہا....ہا" اس نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ در و دیوار اسے منہ چڑا رہے تھے اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ خواب و خیال اور زندگی کے حقائق میں بڑا فرق ہے۔

(بقیہ الیاس رشیدی کے نام)

خدا کرے کہ ہمارے فلمی فن کار بھی اپنی مقبولیت کے سماجی مصرف کو سمجھیں اور ایسی خدمات انجام دیا کریں۔

ہاں تو الیاس بھائی مشاعرہ ہوا اور خوب ہوا۔ سامعین میں موتی لال اور مراد بھی موجود تھے۔ کمال امروہوی بھی اور عصمت چغتائی بھی۔ اور شعراء میں ہندوستان کے سبھی نامور شعراء

اج صبح ریڈیو سیلون والے آگئے۔ انہوں نے میری کچھ نظمیں اور غزلیں ریکارڈ کیں۔ ادب اور فلمی ادب سے متعلق کچھ سوالات کئے اور ابھی ابھی واپس گئے ہیں۔ ان کے جاتے ہی میں اپنا ادھورا خط مکمل کرنے بیٹھ گیا اور میرا خیال ہے کہ اب اسے تہہ کردینا چاہئے کہ کافی طویل ہوگیا ہے۔

ہاں ایک بات کہنی بھول گیا ہوں۔ یہاں بیشتر لوگوں کو شکایت ہے کہ انہیں "نگار" پابندی سے نہیں ملتا۔ کچھ لوگوں کے پاس پہنچ جاتا ہے اور کچھ محروم رہ جاتے ہیں غالباً یہ ڈاک کی بد انتظامی کی وجہ سے ہوگا۔ ذرا آپ توجہ فرمائیں۔

آپ کا نگار یہاں فلمی حلقوں میں خاصا مقبول ہے۔ یہاں پاکستان کے صرف دو فلمی جریدے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ اردو میں "نگار" اور انگریزی میں "ایسٹرن فلمز" دوسرے رسالوں کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ پہنچتے بھی ہیں یا نہیں۔ لیکن نگار کے بارے میں لوگوں کی رائے بڑی اچھی ہے۔ وہ اسے ایک سنجیدہ پرچہ سمجھتے ہیں۔ مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا کہ اس میں کون کون کام کرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ابراہیم جلیس اب بھی سے وابستہ ہیں۔ لیکن میں نے غلط فہمی دور کردی۔ دانش دیروی اور بشیر نیاز کا غائبانہ تعارف کرایا۔ اور جتنا میں انہیں جانتا ہوں ان کی ذات سے لے کر ادب تک اپنے سچے تاثرات پیش کئے۔ وہ تاثرات کیا ہیں پھر کبھی بتاؤں گا دونوں کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ مع بخیر ہوں گے

(مطبوعہ ہفت روزہ "نگار" کراچی ۲۸ فروری تا ۶ مارچ ۱۹۶۲ء)

(بقیہ۔ حمایت علی شاعر سے ایک ملاقات)

کیا اور اسے رباعی کی طرح مخصوص بحروں کا پابند نہیں رکھا تاکہ آزادانہ اظہار خیال ہوسکے اور بس..... جاپانی اور پنجابی سے میں بھی سیکڑوں اردو شعراء کی طرح ناواقف ہوں۔

انور جبیں :۔ چلیئے 'ثلاثی کے سبب کچھ لوگوں کو اپنی پنجابی صنف اور ہائیکو لکھنے کا خیال تو آیا۔ رفتہ رفتہ تکنیک اور زبان سے بھی واقف ہوجائیں گے۔ کاش ہم دوسرے میدانوں میں بھی جاپان سے کچھ سیکھ سکتے۔

حمایت علی شاعر :۔ انور صاحب' طویل نظمیں لکھنا ایک طرح سے "یوگا" کا عمل ہے۔ دماغ و دل کو متوازی یا ایک نقطے پر لا کر مسلسل...... ایک سانس میں لکھنا قوت تخلیق کے استقلال کی دلیل ہے۔ اور "ثلاثی" بقول علامہ اقبال "دریا بہ حباب اندر" کی مثال ہے۔ میں اس میں کامیاب ہوں یا ناکام..... وقت فیصلہ کرے گا نہ میں نازاں ہوں نہ خوف زدہ۔ مجھے چونکہ ایک ہی کام آتا ہے' لکھنا.... تو لکھتا رہتا ہوں۔

شاعر ہیں شعر بھی نہ کہوں اب تو کیا کروں
دل تھا جو بے سکون تو ہے بے سکوں ہنوز

انور جبیں :۔ حمایت صاحب' آپ کو تو مطمئن ہونا چاہئے بقول آپ کے' شریک حیات سے اولاد تک سبھی آپ کی آرزوؤں پر پورے اترے' ماشاء اللہ سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ باعزت ذریعہ معاش رکھتے ہیں' سعادت مند اور مہذب ہیں۔ یہ تو خوش قسمتی کی مثالیں ہیں۔ پھر آپ نے شعر و ادب کی معرفت ساری دنیا دیکھ ڈالی' ایسے ملکوں میں بھی گئے جہاں بہت کم اہل قلم جاسکے۔ ہر جگہ آپ کے چاہنے والے ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کو بھی بہت سراہا گیا۔ آپ کی لائبریری میں ایوارڈز ہی ایوارڈز نظر آرہے ہیں۔ ہاں' آپ کے ان ایوارڈز کا اخبارات میں بہت کم ذکر رہا۔

حمایت علی شاعر :۔ میں نے خود گریز کیا۔ جن اداروں نے مجھے نوازا' وہی اخبارات کو اطلاع بھیج دیتے ہیں۔ میں نے اپنے طور پر نہ کوئی تقریب کی' نہ تشہیر...... میں نے تو (ایک کتاب "مٹی کا قرض" ۱۹۷۴ء کے سوا) اپنی کتابوں کی تقریب رونمائی تک منعقد نہیں کی۔ مجھے تو یہی حیرت ہے کہ اتنے ایوارڈز مجھے کیوں عطا کردیئے گئے۔

انور جبیں :۔ کہتے ہیں کہ آپ کی بڑی لابی ہے۔ یہاں سے امریکہ تک بلکہ ہندوستان اور جنوبی افریقہ میں بھی آپ کے "فرستادہ" ہیں۔ پچھلے دنوں لاہور کے ایک اخبار میں یہاں تک لکھ دیا گیا تھا کہ امریکہ' کینیڈا اور یورپ میں مشاعرہ کرنے والے سب "پاکستان کے دشمن" ہیں اور انہیں خوش کرنے کے لئے آپ ایسا کلام سناتے ہیں' جو "پاکستان سے دشمنی" کے مترادف ہیں۔

حمایت علی شاعر :۔ مجھے بھی ان اخبارات کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خیر' جماعت اسلامی کے اخبار۔ "جسارت" کی مجھے پروا نہیں۔ وہ لاعلم لوگ ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں جب میں سندھ یونیورسٹی میں پڑھانے لگا تو "جسارت" میں ایسے مراسلے بھی چھپے جن میں واشگاف الفاظ میں لکھا گیا کہ حمایت علی شاعر کے پاس کوئی اعلیٰ ڈگری نہیں ہے۔ وہ کیا پڑھائیں گے...... جبکہ میں اسی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا اور برسوں پہلے اعلیٰ ڈگریاں لے چکا تھا۔ اس کے علاوہ اسی اخبار کے ادبی صفحات میں میرے لئے "گالیاں" بھی لکھ کر بھیجی گئیں جو "قلم بگوش" (مشفق خواجہ) نے بہ وجوہ حذف کردیں اور نظیر اکبر آبادی کے اشعار کی طرح "نقطے" لگادیئے اور اسے اپنی "نکتہ سنجی" سے تعبیر کیا۔ اب لاہور کے اخبار "پاکستان" اور کراچی کا "جسارت" پاکستان

دشمنی کا الزام لگا رہے ہیں۔ اس سفید جھوٹ کا کیا علاج' میری عمر کے تقریباً ۴۵ سال پاکستان میں گزرے ہیں۔ میری تمام کتابیں' ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والی تمام تحریریں' میرے قومی نغمات' سبھی میری حب الوطنی کے گواہ ہیں۔ شاید ان اخبارات کے کالم نگاروں کو نہیں معلوم کہ ملک سے باہر لوگوں کے دلوں میں پاکستان کی محبت کتنی شدید ہے۔ ان لاکھوں محب وطن پاکستانیوں کو پاکستان دشمن کہنا خود "وطن دشمنی" کے مترادف ہے۔ دراصل یہ ایک "مخصوص حلقہ" ہے جو چند مخصوص شعراء کو بدنام کرکے اپنی محرومیوں کو تسکین دینا چاہتے ہیں۔ قتیل شفائی کے لئے بھی ان اخبارات میں ایسی سرخیاں لگائی گئی تھیں۔ (انڈیا میں فلمی گیت نگاری پر)' اس سلسلے میں میرے جس شعر کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا وہ یہ تھا۔

بنیاد پر نظر ہو تو شاید سمجھ سکو
کیوں ٹوٹنے لگا ہے مرا گھر بنا ہوا

اس شعر کے محرکات پر غور کیجئے' اور پھر احمد ندیم قاسمی کے اس شعر پر نظر ڈالئے جو انہوں نے قیام پاکستان کے وقت کہا تھا۔

پھر بھیانک تیرگی میں آگئے
ہم گجر بجنے سے دھوکہ کھا گئے

میں جان کر فیض صاحب کے اشعار نہیں لکھ رہا ہوں۔ ان پر تو بڑے بڑے الزامات ہیں۔ خود دیوبندی علمائے کرام سے لے کر جماعت اسلامی کے امیر تک' کئی تحریریں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں جو پاکستان کی مخالفت میں لکھی گئیں۔ یہ اور بات کہ بعد میں سبھی نے پاکستان کو قبول کرلیا۔ لیکن وہ شعراء جو پاکستان میں پیدا ہوئے اور ایسے شعر لکھیں کہ

کوئی دریچہ ہوا کے رخ پر نہیں بنایا
مرے بزرگوں نے سوچ کے گھر نہیں بنایا

تو ان کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی۔ یہ پشاور کے ایک نوجوان شاعر کا شعر ہے۔ کاش ہمارے اخبارات کے ادبی کالم نگار تھوڑے سے "سخن فہم بھی ہوتے۔

انور صاحب' بات طویل ہوگئی مگر سن ہی لیجئے پہلے ایک شعر حسب حال

یہ الگ بات کہ میں یوسف نہیں یوسف ورنہ
بکنا چاہوں تو یہاں مصر کا بازار بھی ہے

شاعر

مجھ پر "لابی" کا بھی الزام رکھا گیا ہے۔ آپ جانتے ہی کہ میں کوئی سرکاری افسر ہوں نہ کسی ادارہ کا سربراہ' میں ریڈیو ٹیلیویژن کا پروڈیوسر یا ڈائریکٹر بھی نہیں اور نہ کسی اخبار کے ادبی صفحے کا انچارج...... میں کسی کے کیا کام آسکتا ہوں؟ کوئی لابی میرے لئے کام کرے گی تو کس بنیاد پر......؟؟ آپ ہی سوچیئے۔ میری تو خبریں بھی اخبارات میں بہت کم چھپتی ہیں۔ آج کے دور میں "لابی" Give and Take کے بغیر نہیں چلتی۔ میرا تو کوئی بچہ بھی امریکہ یا کینیڈا میں نہیں ہے' سب سے

چھوٹا بیٹا ڈاکٹر ہے وہ اسپیشلائزیشن کے لئے جانا چاہتا ہے تو اس کے راستے میں بھی اس قسم کے کالموں سے رکاوٹیں کھڑی کی جارہی ہیں۔ حالانکہ وہ پاکستان میں امریکی میڈیکل امتحان (E.C.F.M.G) بھی پاس کرچکا ہے۔

انور جبیں :۔ اچھا ہمارے ادیبوں میں "رقابت" کی ایسی مثالیں بھی ہیں!! یہ بہت گھٹیا اور افسوس ناک بات ہے۔ آپ ایسی باتوں کا اثر نہ لیں۔ جہاں تک حب الوطنی کا مسئلہ ہے ہمارے ملک میں ابھی کئی صاحب علم اور باضمیر اہل ادب موجود ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ آپ کون کیا خدمات ہیں۔ آپ کی نظم "لہو" آج بھی لوگوں کو یاد ہے ویسے آپ کی مخالفت تو چند مخصوص لوگوں کا مشغلہ بن گئی ہے۔ "احوال واقعی" سے پتہ چلا کہ ۱۹۶۱ء سے یہ سلسلہ جاری ہے سچ پوچھیے تو آپ بھی بہت سخت جان ہیں۔ برابر مقابلہ کئے جارہے ہیں۔ ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن، شاعری، تدریس...... کس شعبے میں آپ کی مخالفت نہیں کی گئی۔ جب کوئی بات نہ بن سکی تو قابل اجمیری کے انتقال کے (۳۰) سال بعد کسی صاحب سے "چشم دید حالات" پر مبنی ایسی "ناول نما سوانح حیات" لکھوائی گئی جنہوں نے قابل کو دیکھا تک نہیں تھا کبھی حیدرآباد سندھ بھی نہیں رہے۔ قابل صاحب کی زندگی میں جن کی عمر صرف ۱۲ یا ۱۳ سال کی تھی۔ اور انہوں نے آپ اور آپ کے سارے دوستوں کو "قابل دشمن" ٹھہرا دیا اور جس شاعر نے یہ کل کھلائے اسے قابل صاحب کا ایسا واحد دوست ثابت کیا گیا کہ پورا "ناول" ان کا "قصیدہ" بن گیا

حمایت علی شاعر :۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ وقت سب کا فیصلہ کردیتا ہے۔ آپ کی نظر سے شاید میری کتاب "شخص و عکس" (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) نہیں گزری۔ اس میں میرے تمام جوابی مضامین یکجا ہیں۔ جب ان مضامین کے بارے میں "میرے کرم فرما" یہ لکھنے لگے کہ یہ من مانی تاویلات ہیں، اصل مضامین کے اقتباسات کو اپنے سیاق و سباق سے الگ کرکے، جوابات تحریر کئے گئے ہیں۔ تو سندھ یونیورسٹی کے ایک لیکچرار مرزا سلیم بیگ (جو اسی یونیورسٹی میں کبھی میرے شاگرد بھی رہے ہیں)، نے "اصل مضامین" اور میرے "جوابی مضامین" کو یکجا کرکے "احوال واقعی" میں تاریخی حوالوں کے ساتھ شائع کردیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے محترم دوست مشفق خواجہ (خامہ بگوش) نے رسالہ "تکبیر" میں شاگرد۔۔ آپ کی مثال دیتے ہوئے اسے "میری تصنیف" باور کرانے کی کوشش کی

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

انہوں نے قابل صاحب کی موت کو "وسیلہ شہرت" بنانے دو ایک معمولی باتوں کو بنیاد بناکر ایک (اختلاقی) افسانہ گھڑنے اور دوسروں کی کردار کشی کی مذموم کوشش کی مذمت کرنے کے بجائے اس مجرمانہ ذہنیت کی پشت پناہی کی اور "احوال واقعی" کو متعلقہ حضرات کو بدنام کرنے کی کوشش سے تعبیر کیا۔ کاش مشفق خواجہ صاحب ایک "محقق" کی نگاہ سے اس ناول نما سوانح حیات کا مطالعہ کرتے اور غیر جانبدارانہ رائے قائم کرتے۔

انور جبیں :۔ اب، سنا ہے کہ کراچی کی ادبی سیاست کے بارے میں بھی ایک کتاب آرہی ہے "چراغ بکف"

حمایت علی شاعر :۔ جی ہاں، نئی نسل میں کچھ ایسے لکھنے والے بھی ہیں، جو سیاہ و سفید کو الگ کرکے دیکھنا چاہتے ہیں، تاکہ تاریخ ریکارڈ پر رہے۔ ان نوجوانوں نے صرف یہ کیا ہے کہ بکھرا ہوا مواد مطبوعہ تاریخی حوالوں کے ساتھ یکجا کردیا ہے تاکہ علامہ اقبال کے الفاظ میں ہم بھی اپنے عہد سے کہہ سکیں۔

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

انور جبیں :- ریڈیو اور ٹی وی کے لئے آپ نے جو کچھ لکھا...... وہ بہت کم شائع ہوسکا اس کا سبب؟
حمایت علی شاعر :- بھائی' کراچی میں پبلشر کہاں ہیں اس سلسلے میں لاہور کے اہل قلم خوش نصیب ہیں۔ یہاں تو ہر ادیب اپنی کتاب خود چھاپتا ہے۔ اور احباب میں تقسیم کرکے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی کتاب' کراچی کے باہر کسی شہر میں نہیں ملے گی' یہ بھی غالباً" کوئی ادبی یا تجارتی راز ہے۔
انور جبیں :- آپ نے فلم انڈسٹری چھوڑی اور ایسے وقت میں جب آپ کا نام تجارتی حلقوں میں کامیابی کی ضمانت بن چکا تھا کیوں؟
حمایت علی شاعر :- جب آدمی صاحب اولاد ہوتا ہے تو تھوڑا بزدل بھی ہوجاتا ہے۔ میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتا تھا جب میرے بچے کالج جانے لگے تو میرے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ وہ کالج کا راستہ چھوڑ کر اسٹوڈیوز کی راہ پر نہ چلنے لگیں۔ یوں ان کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی' اور میرے خواب چکنا چور ہوجائیں گے۔ سو میں نے اسٹوڈیو چھوڑ' یونیورسٹی کی راہ لی' خود پڑھانے لگا تاکہ بچوں کے دل میں علم کی وقعت بڑھ جائے۔ میں اپنے بچوں کا شکر گزار اور احسان مند ہوں کہ انہوں نے میری آرزو پوری کردی۔ خدا انہیں سلامت رکھے اب میری آرزو یہ ہے کہ ان سے میں پہچانا جاؤں۔ وہ مجھ سے آگے نکل جائیں اور یہ مصرعہ اکثر اپنے آپ کو سناتا رہتا ہوں۔

تجھے اے جگر مبارک' یہ "شکست فاتحانہ"

فلم سازی میری نظر میں ایک بڑا آرٹ ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایسے ہاتھوں میں ہے جو صرف عورت اور دولت کے دلدادہ ہیں۔ وہ دولت کے حصول کے لئے عورت کا ہر استعمال جائز سمجھتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں عورت ایک ماڈل کے سوا ہو بھی کیا سکتی ہے۔ رسالے ہوں کہ اخبار' ٹی وی ہو کہ فلم...... عورت کا ایک ہی روپ ہے' ایک ہی مصرف!
انور جبیں :- شاید ہمارا یہ اقدام اس "ورلڈ کلچر" کی طرف ہے جو بہت جلد مشرق و مغرب کا فرق مٹا دے گا۔
حمایت علی شاعر :- جی ہاں' اور شاید یہی "نیو ورلڈ آرڈر" بھی ثابت ہو۔
(دونوں ہنستے ہیں)
انور جبیں :- اچھا۔ اب کچھ سوالات ٹی وی کے بارے میں' آپ کا ایک پروگرام "کسوٹی" بہت مقبول رہا اور عرصے تک چلتا رہا۔ آپ کی کمپیئرنگ بھی لاجواب ہوتی تھی۔
حمایت علی شاعر :- شکریہ' مگر اس کی بھی بہت مخالفت ہوئی' اخبارات میں بھی لکھا گیا۔ کچھ نہیں تو یہ سراغ لگایا گیا کہ حمایت صاحب جو اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے رہتے ہیں تو یہ بھی ایک "اشارہ" ہے جو افتخار عارف اور عبیداللہ بیگ کو دیا جاتا ہے۔
انور جبیں :- (ہنستے ہوئے) جی ہاں' میں نے بھی سنا تھا۔ خیر ایسی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے معاشرے سے "یقین" اٹھ گیا ہے' اس لئے "بدگمانی" یقینی ہے۔ افتخار عارف اور عبیداللہ بیگ یقیناً وسیع المطالعہ اور ذہین حضرات ہیں۔ افتخار تو شاعر بھی بہت اچھے ہیں۔ میں نئی نسل میں انہیں صف اول کا شاعر مانتا ہوں۔
حمایت علی شاعر :- میں بھی ان کا دل سے قدرداں اور مداح ہوں۔
انور جبیں :- آپ نے ایک پروگرام "لبِ آزاد" بھی لکھا۔ پاکستان کی احتجاجی شاعری کے حوالے سے۔ اس کی کمپیئرنگ پہلے پروین

چھوٹا بیٹا ڈاکٹر ہے وہ اسپیشلائزیشن کے لئے جانا چاہتا ہے تو اس کے راستے میں بھی اس قسم کے کالموں سے رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی ہیں ۔ حالانکہ وہ پاکستان میں امریکی میڈیکل امتحان (F.C.F.M.G) بھی پاس کر چکا ہے۔

انور جبیں :۔ اچھا ہمارے ادیبوں میں "رقابت" کی ایسی مثالیں بھی ہیں!! یہ بہت گھٹیا اور افسوس ناک بات ہے۔ آپ ایسی باتوں کا اثر نہ لیں۔ جہاں تک حب الوطنی کا مسئلہ ہے ہمارے ملک میں ابھی کئی صاحب علم اور باضمیر اہل ادب موجود ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ آپ کے کیا خیالات ہیں۔ آپ کی نظم "لہو" آج بھی لوگوں کو یاد ہے ویسے آپ کی مخالفت تو چند مخصوص لوگوں کا مشغلہ بن گئی ہے۔ "احوال واقعی" سے پتہ چلا کہ ۱۹۶۱ء سے یہ سلسلہ جاری ہے سچ پوچھیے تو آپ بھی بہت سخت جان ہیں۔ برابر مقابلہ کئے جا رہے ہیں۔ ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن، شاعری، تدریس...... کس شعبے میں آپ کی مخالفت نہیں کی گئی۔ جب کوئی بات نہ بن سکی تو قابل اجمیری کے انتقال کے (۳۰) سال بعد نسیم صاحب سے "چشم دید حالات" پر مبنی ایسی "ناول نما سوانح حیات" لکھوائی گئی جنہوں نے قابل کو دیکھا تک نہیں تھا کبھی حیدر آباد سندھ بھی نہیں رہے۔ قابل صاحب کی زندگی میں جن کی عمر صرف ۱۲ یا ۱۳ سال کی تھی۔ اور انہوں نے آپ اور آپ کے سارے دوستوں کو "قابل دشمن" ٹھہرا دیا اور جس شاعر نے یہ تک کہلائے اسے قابل صاحب کا ایا واحد دوست ثابت کیا گیا کہ پورا "ناول" ان کا "قصیدہ" بن گیا

حمایت علی شاعر :۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ وقت سب کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ آپ کی نظر سے شاید میری کتاب "شخص و عکس" (مطبوعہ ۸۴ء) نہیں گزری۔ اس میں میرے تمام جوابی مضامین یکجا ہیں۔ جب ان مضامین کے بارے میں "میرے کرم فرما" یہ لکھنے لگے کہ یہ من مانی تاویلات ہیں، اصل مضامین کے اقتباسات کو اپنے سیاق و سباق سے الگ کر کے، جوابات تحریر کئے گئے ہیں۔ تو سندھ یونیورسٹی کے ایک لیکچرار مرزا سلیم بیگ (جو اسی یونیورسٹی میں کبھی میرے شاگرد بھی رہے ہیں)، نے "اصل مضامین" اور میرے "جوابی مضامین" کو یکجا کر کے "احوال واقعی" میں تاریخی حوالوں کے ساتھ شائع کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے محترم دوست مشفق خواجہ (خامہ بگوش) نے رسالہ "تکبیر" میں شاگرد کی کتاب کی مثال دیتے ہوئے اسے "میری تصنیف" باور کرانے کی کوشش کی

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئیے

انہوں نے قابل صاحب کی موت کو "وسیلہ شہرت" بنانے دو ایک معمولی باتوں کو بنیاد بنا کر ایک (اختلافی) افسانہ گھڑنے اور دوسروں کی کردار کشی کی مذموم کوشش کی مذمت کرنے کے بجائے اس مجرمانہ ذہنیت کی پشت پناہی کی اور "احوال واقعی" کو متعلقہ حضرات کو بدنام کرنے کی کوشش سے تعبیر کیا۔ کاش مشفق خواجہ صاحب ایک "محقق" کی نگاہ سے اس ناول نما سوانح حیات کا مطالعہ کرتے اور غیر جانبدارانہ رائے قائم کرتے۔

انور جبیں :۔ اب سنا ہے کہ کراچی کی ادبی سیاست کے بارے میں ایک کتاب آ رہی ہے "چراغ تلے"

حمایت علی شاعر :۔ جی ہاں، نئی نسل میں کچھ ایسے لکھنے والے بھی ہیں، جو سیاہ و سفید کو الگ کر کے دیکھنا چاہتے ہیں، تاکہ تاریخ کے ریکارڈ پر رہے۔ ان نوجوانوں نے صرف یہ کیا ہے کہ بکھرا ہوا مواد مطبوعہ تاریخی حوالوں کے ساتھ یکجا کر دیا ہے تاکہ علامہ اقبال کے الفاظ میں ہم بھی اپنے عہد سے کہہ سکیں۔

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

انور جبیں :۔ ریڈیو اور ٹی وی کے لئے آپ نے جو کچھ لکھا...... وہ بہت کم شائع ہو سکا اس کا سبب؟
حمایت علی شاعر :۔ بھائی' کراچی میں پبلشر کہاں ہیں اس سلسلے میں لاہور کے اہل قلم خوش نصیب ہیں۔ یہاں تو ہر ادیب اپنی کتاب خود چھاپتا ہے۔ اور احباب میں تقسیم کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی کتاب' کراچی کے باہر کسی شہر میں نہیں ملے گی' یہ بھی غالباً" کوئی ادبی یا تجارتی راز ہے۔
انور جبیں :۔ آپ نے فلم انڈسٹری چھوڑی اور ایسے وقت میں جب آپ کا نام تجارتی حلقوں میں کامیابی کی ضمانت بن چکا تھا کیوں؟
حمایت علی شاعر :۔ جب آدمی صاحب اولاد ہوتا ہے تو تھوڑا بزدل بھی ہو جاتا ہے۔ میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتا تھا جب میرے بچے کالج جانے لگے تو میرے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ وہ کالج کا راستہ چھوڑ کر اسٹوڈیوز کی راہ پر نہ چلنے لگیں۔ یوں ان کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی' اور میرے خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔ سو میں نے اسٹوڈیو چھوڑ' یونیورسٹی کی راہ لی' خود پڑھانے لگا تاکہ بچوں کے دل میں علم کی وقعت بڑھ جائے۔ میں اپنے بچوں کا شکر گزار اور احسان مند ہوں کہ انہوں نے میری آرزو پوری کردی۔ خدا انہیں سلامت رکھے اب میری آرزو یہ ہے کہ ان سے میں پہچانا جاؤں۔ وہ مجھ سے آگے نکل جائیں اور یہ مصرعہ اکثر اپنے آپ کو سناتا رہتا ہوں۔

تجھے اے جگر مبارک' یہ "شکست فاتحانہ"

فلم سازی میری نظر میں ایک بڑا آرٹ ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایسے ہاتھوں میں ہے جو صرف عورت اور دولت کے دلدادہ ہیں۔ وہ دولت کے حصول کے لئے عورت کا ہر استعمال جائز سمجھتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں عورت ایک ماڈل کے سوا ہو بھی کیا سکتی ہے۔ رسالے ہوں کہ اخبار' ٹی وی ہو کہ فلم...... عورت کا ایک ہی روپ ہے' ایک ہی مصرف!
انور جبیں :۔ شاید ہمارا یہ اقدام اس "ورلڈ کلچر" کی طرف ہے جو بہت جلد مشرق و مغرب کا فرق مٹا دے گا۔
حمایت علی شاعر :۔ جی ہاں' اور شاید یہی "نیو ورلڈ آرڈر" بھی ثابت ہو۔
(دونوں ہنستے ہیں)
انور جبیں :۔ اچھا۔ اب کچھ سوالات ٹی وی کے بارے میں' آپ کا ایک پروگرام "کسوٹی" بہت مقبول رہا اور عرصے تک چلتا رہا۔ آپ کی کمپیئرنگ بھی لاجواب ہوتی تھی۔
حمایت علی شاعر :۔ شکریہ' مگر اس کی بھی بہت مخالفت ہوئی' اخبارات میں بھی لکھا گیا۔ کچھ نہیں تو یہ سراغ لگایا گیا کہ حمایت صاحب جو اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے رہتے ہیں تو یہ بھی ایک "اشارہ" ہے جو افتخار عارف اور عبیداللہ بیگ کو دیا جاتا ہے۔
انور جبیں :۔ (ہنستے ہوئے) جی ہاں' میں نے بھی سنا تھا۔ خیر ایسی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے معاشرے سے "یقین" اٹھ گیا ہے' اس لئے "بدگمانی" یقینی ہے۔ افتخار عارف اور عبیداللہ بیگ یقیناً وسیع المطالعہ اور ذہین حضرات ہیں۔ افتخار تو شاعر بھی بہت اچھے ہیں۔ میں نئی نسل میں انہیں صف اول کا شاعر مانتا ہوں۔
حمایت علی شاعر :۔ میں بھی ان کا دل سے قدر داں اور مداح ہوں۔
انور جبیں :۔ آپ نے ایک پروگرام "لب آزاد" بھی لکھا۔ پاکستان کی احتجاجی شاعری کے حوالے سے۔ اس کی کمپیئرنگ پہلے پروین

شاکرنے کی تھی پھر غازی صلاح الدین نے، یہ کون صاحب ہیں؟

حمایت علی شاعر :- ارے بھائی، یہ مشہور صحافی ہیں۔ کچھ عرصہ "دی نیوز" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ "ڈان" میں بھی لکھتے رہے۔ میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی ان کا قدرداں ہوں۔

انور جبیں :- اچھا، یہ وہی صاحب ہیں، معاف کیجئے، ہمارے ہاں "ہم نام" بھی تو بہت سے لوگ ہیں۔ غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ "لب آزاد" بہت جرات مندانہ پیش کش تھی۔ آپ اور انصر وقار عظیم قابلِ مبارکباد رہیں۔

حمایت علی شاعر :- یہ جمہوریت کی برکات ہیں۔

انور جبیں :- اب کون سا پروگرام زیر غور ہے۔

حمایت علی شاعر :- "نشید آزادی" یعنی۔ تحریک آزادی میں اردو شعراء کا حصہ۔ اس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے سیاسی حالات، برطانوی سامراج کے خلاف ہماری جدوجہد کی تاریخ اور شاعری میں اس کے اثرات -- میں یہ پروگرام لکھ چکا ہوں۔ اقبال حیدر اس کے پروڈیوسر ہیں۔ انشاء اللہ اگلے سال پاکستان کی پچاس سالہ جشن آزادی کے دوران یکم اگست سے ۱۴ر اگست تک روزانہ پیش کیا جائے گا۔

انور جبیں :- سنا ہے آج کل آپ دوبارہ "عقیدت کا سفر" پیش کر رہے ہیں۔

حمایت علی شاعر :- جی ہاں، سات سو سال کی نعتیہ شاعری تو پیش کر چکا۔ اب اسی سے متصل "پاکستان میں نعتیہ شاعری" کا مطالعہ پیش کر رہا ہوں۔ ہر بدھ کو ساڑھے چار بجے پی ٹی وی (۲) سے پیش ہوتا ہے۔ عون محمد رضوی اس کے پروڈیوسر ہیں۔ یہ پروگرام انشاء اللہ چھ ماہ چلتا رہے گا۔ اسی طرح کراچی سے سندھی شعراء کے اردو کلام پر مبنی ایک پروگرام "محبتوں کے سفیر" بھی لکھا ہے جس میں سندھ میں اردو شاعری کی تقریباً پانچ سو سال کی تاریخ پیش کی جارہی ہے۔ اس کے پروڈیوسر سہیل مسرور ہیں۔ ہر پیر کو شام ساڑھے سات بجے پاکستان ٹی وی سے پیش ہوتا ہے۔

انور جبیں :- ہمارے اخبارات کے "ادبی کالم نگاروں" کو ایسے پروگرام بھی دیکھنا چاہئے تھا کہ آپ کی حب الوطنی کا اندازہ ہو

حمایت علی شاعر :- یہ سب کالم نگاروں کی بات نہیں ہے۔ صرف چند مخصوص "حلقہ بند" حضرات کا کارنامہ ہے۔ خدا ان کی تحریروں کو "دلوں کے میل" سے پاک کرے۔

انور جبیں :- آمین، اب اپنے دو تین شعر سنا دیں۔ نشر میں بہت باتیں ہو چکیں۔

حمایت علی شاعر :- ایک تو وہی شعر سن لیجئے جو بہت عام ہو گیا ہے۔

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اڑ کے ترے دل میں اتر جائے

دو ایک دوسرے بھی سن لیں۔ شاید حسب حال ہوں

گنبد کی طرح دوش پہ رکھے ہوئے ہیں سر
جسموں کے مقبروں میں دریچے نہ جالیاں

اور

بیٹھے ہوئے زمیں پہ جنگلی میں ہیں مگن
وہ جانور جو چڑھ نہیں سکتے درخت پر

انور جبیں :- بہت خوب، یہ تم ہم سب کا المیہ ہے۔

حمایت علی شاعر :- ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔

انور جبیں :- اچھا جناب، آپ کا بہت بہت شکریہ

TONS OF SUCCESS

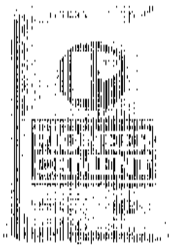

By the Grace of Almighty Allah, Pioneer Cement's performance has exceeded all expectations. During the first year of operation, Pioneer Cement achieved over 90% capacity utilization. Average sales during last half of 1st year came to 2443 tons per day as against rated capacity of 2100 tons per day.

Quality standards have not been compromised despite the increase in production. In fact, customer response has been more than complimentary. A few words to thank our dealers and patrons whose patronage has made us the No. 1 Cement in the Country. "Thank you for your support."

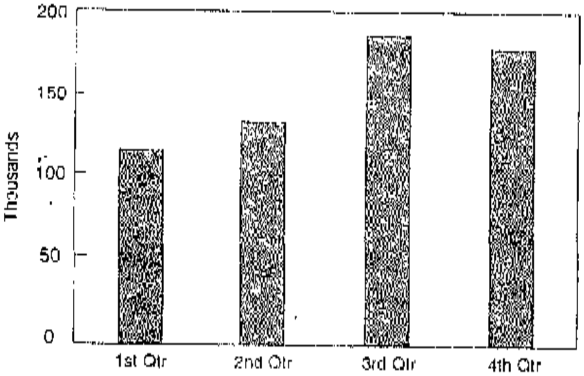

Sales during 1st year of Operation

PIONEER
CEMENT LTD

When Quality Counts

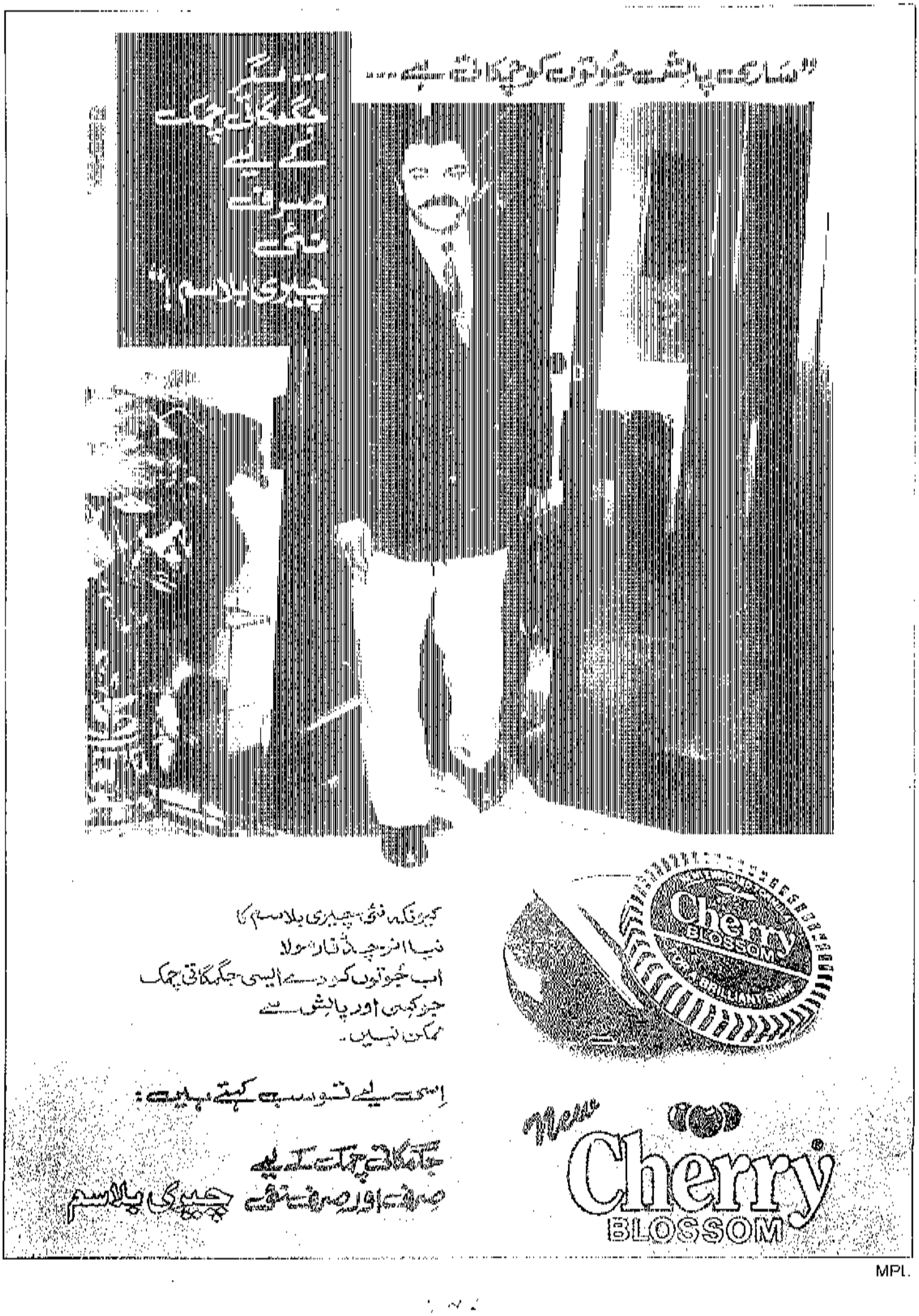
تو پھر
جگمگاتی چمک
کے لیے
صرف
نئی
چیری بلاسم؟
کیونکہ نئی چیری بلاسم کا
اب جوتوں کو دے ایسی جگمگاتی چمک
جو کسی اور پالش سے
ممکن نہیں۔
اسی لیے تو سب کہتے ہیں:
جگمگاتی چمک کے لیے
صرف اور صرف نئی چیری بلاسم
New
Cherry
BLOSSOM

REGD. NO. AGD. 32

AURANGABAD TIMES

کچھ پیش رو۔ کچھ ہم سفر

والد محترم سید تراب علی صاحب

والدہ محترمہ سیدہ حور النساء بیگم

حمایت علی شاعر اور بیگم معراج نسیم (۱۹۶۵ء)

حمایت علی شاعر اور بیگم معراج نسیم

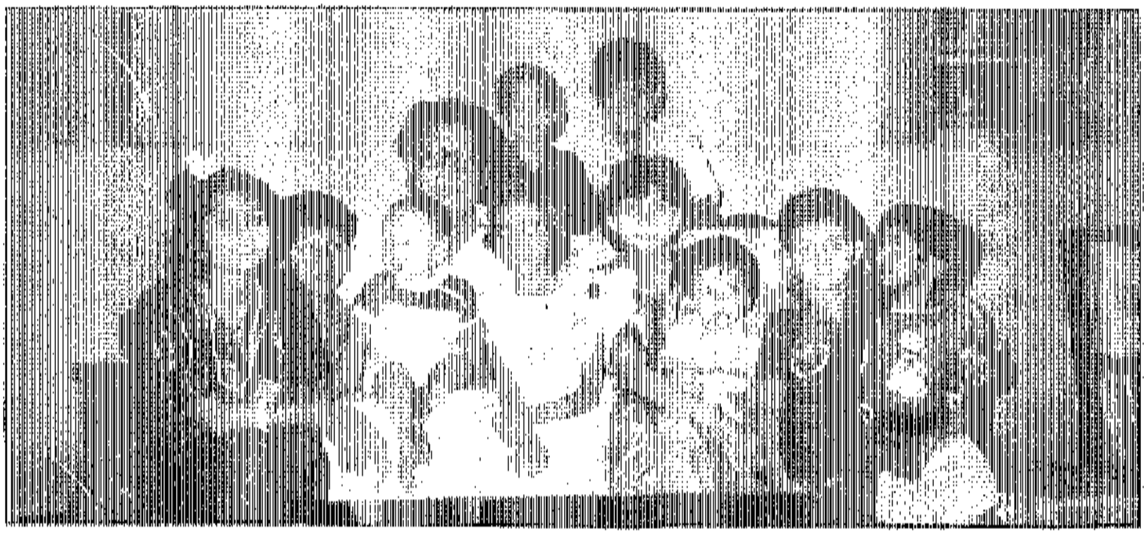

حمایت علی شاعر اپنے نواسے، نواسیوں اور پوتے پوتیوں کے ساتھ

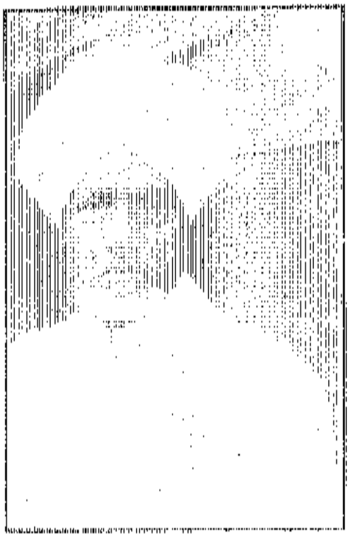

(خسر محترم) مولوی عبدالغفور صاحب

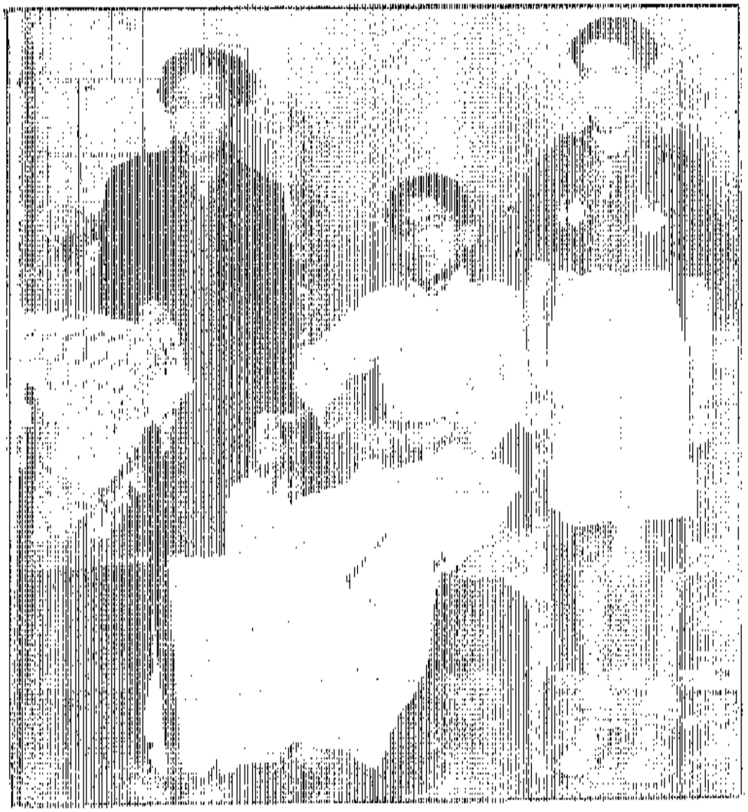

(بچپن کے تین دوست) حفیظ الدین، (شفیق الزماں کے والد) بشیرالدین اور حمایت علی شاعر (۱۹۴۲ء)

مسلم ضیائی اور حمایت علی شاعر (۱۹۴۸ء)

حمایت علی شاعر۔ ضیاء الحق انجم اور عزیز (۱۹۴۳ء)

اے آر ممتاز اور حمایت علی شاعر (۱۹۶۰ء)

حمایت علی شاعر (۱۹۵۴ء)

حمایت علی شاعر (۱۹۴۸ء)

حمایت علی شاعر (۱۹۵۳ء)

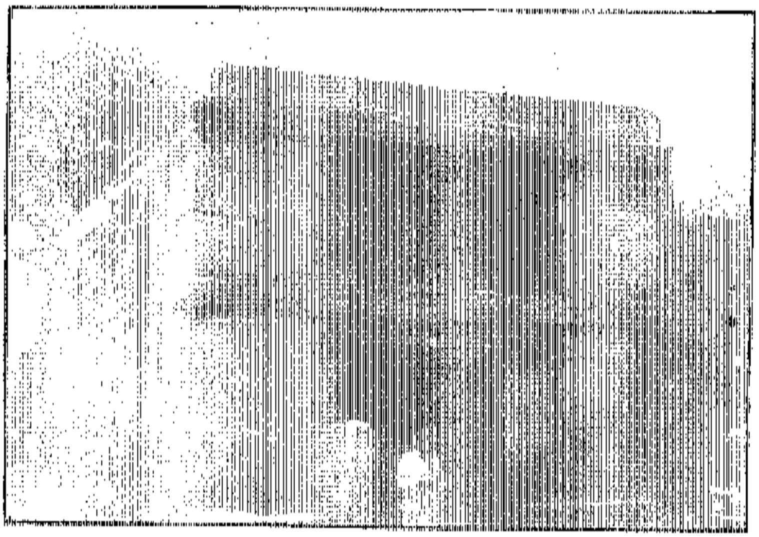

حمایت صاحب اورنگ آباد میں آبائی مکان کے سامنے (۱۹۸۷ء)

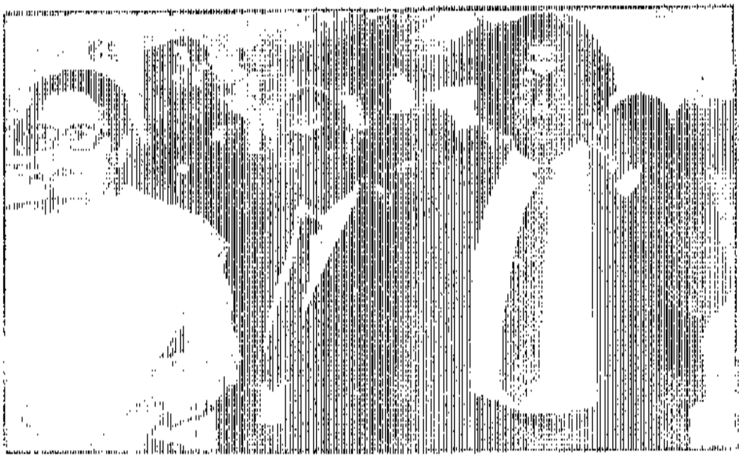

حمایت علی شاعر۔ رام لعل اور ڈاکٹر عالیہ امام
(کلکتہ میں)

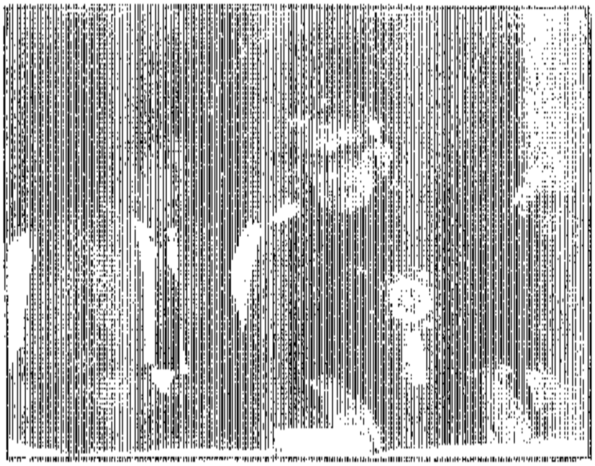

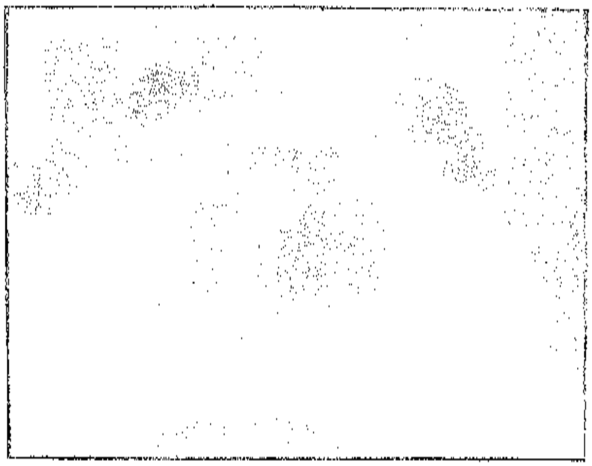

حمایت علی شاعر اور افتخار عارف / افتخار امام (مدیر "شاعر" بمبئی) ڈاکٹر مظفر حسین برنی (ماہر اقبالیات گورنر ہریانہ) اور حمایت علی شاعر (انبالہ میں)

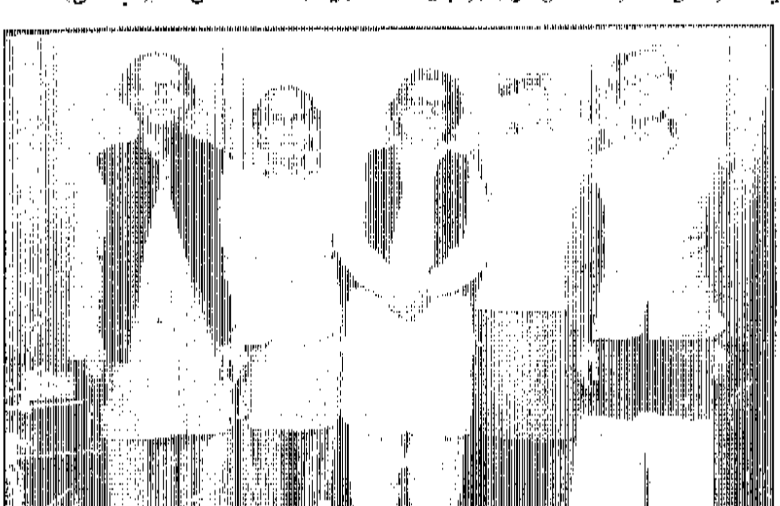

خالد (علیگ) مہر الہی شمسی (مالک و مدیر "کلیم" سکھر) حمایت علی شاعر۔ نکہت بریلوی اور
ن۔م۔نیازی

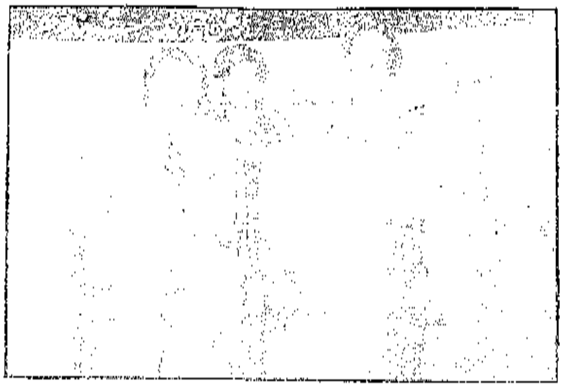

پروفیسر ممتاز حسین ۔ مجنوں گورکھپوری اور حمایت علی شاعر

حمایت علی شاعر ۔ امرتا پریتم اور بلراج کومل (دہلی میں)

مہتاب راشدی، حکیم محمد سعید، شیخ ایاز، کریم بخش خالد اور حمایت علی شاعر

حمایت علی شاعر ۔ آصف جیلانی اور محسنہ جیلانی (افسانہ نگار)

حمایت علی شاعر اور اعجاز نسرین (افسانہ نگار)

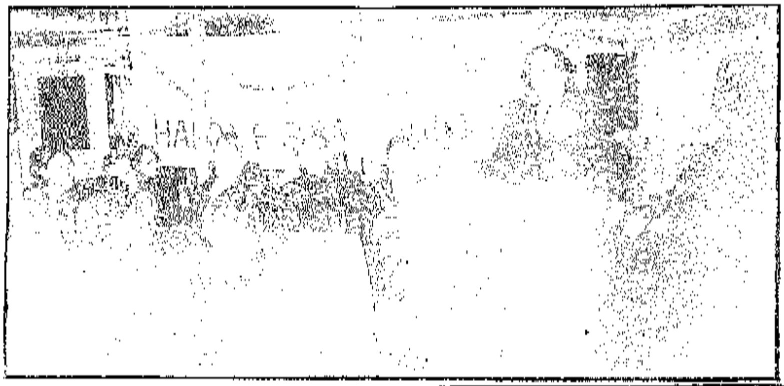

(جشن کیفی نیویارک میں) حمایت علی شاعر مقالہ پڑھ رہے ہیں طالب خوند میری' شبانہ کیفی۔ جاوید اختر' قتیل شفائی' کیفی اعظمی اور شوکت کیفی نمایاں ہیں۔

(ہالی وڈ اسٹوڈیوز میں) سید ضمیر جعفری' قتیل شفائی' اعظمیٰ سحر' حمایت علی شاعر اور پروین فنا سید (۱۹۸۱ء)

عزیز الحسن عزیز۔ حمایت علی شاعر اور سید حنیف اخگر

کمانڈر روشن خیال۔ یاسین مراد آبادی حمایت علی شاعر۔ وکیل انصاری اور اوج کمال (مدیر اعزازی دنیائے ادب)

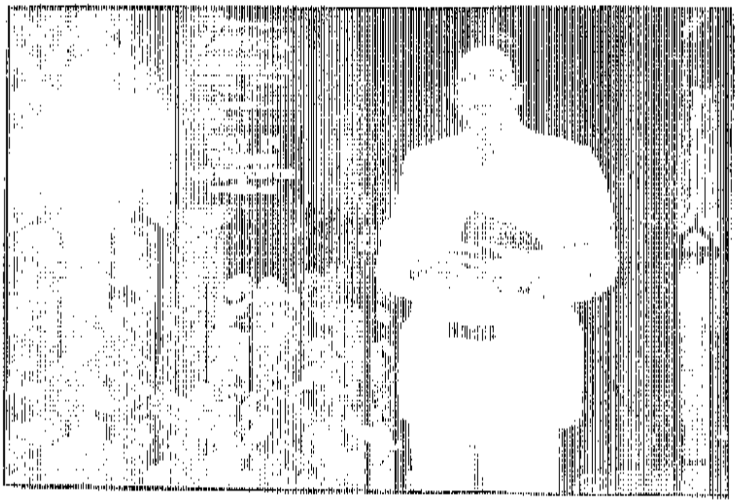

حمایت علی شاعر، شیکسپیئر کے مکان پر
(اسٹیٹ فورڈ برطانیہ ۱۹۸۱ء)

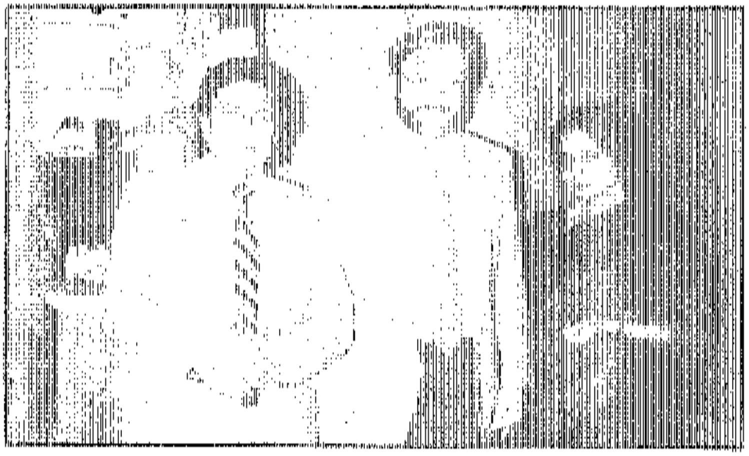

پروین فنا سید، اردو کے پروفیسر برائن سلور اور
حمایت علی شاعر (ہاورڈ یونیورسٹی بوسٹن ۱۹۸۱ء)

ہرچرن چاؤلہ، اردو کے پروفیسر فین تھیسن
حمایت علی شاعر اور جمیل الدین عالی
(انٹرنیشنل لائبریری اوسلو میں ۱۹۸۵ء)

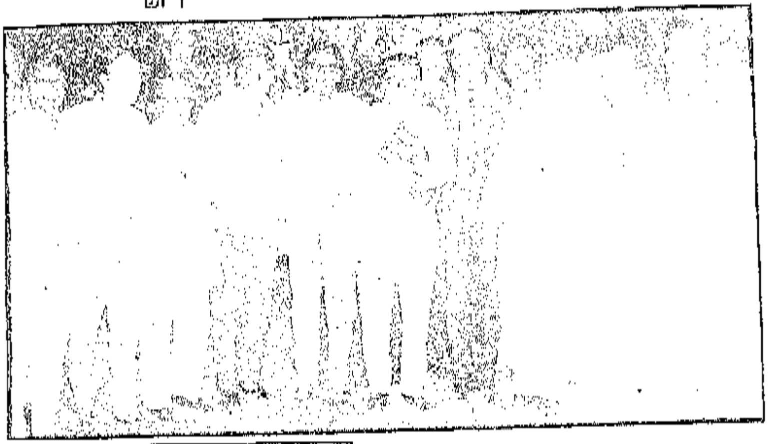

مجیب خیر آبادی، سرہ بارہ بنکوی مسلم نیپالی، ابراہیم جلیس، حمایت علی شاعر سحر انصاری محسن بھوپالی، مرزا ظفر الحسن اور احمد رئیس (اے ڈی اے لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام ۱۹۷۲ء)

حمید قریشی - حمایت علی شاعر- مشتاق احمد یوسفی- پروفیسر حمید الدین شاہد- ڈاکٹر پروفیسر حبیب الحق ندوی (صدر شعبہ اردو، فارسی، عربی ڈربن یونیورسٹی)- نجمہ خان- جیلانی بانو- راغب مراد آبادی اور ڈاکٹر انور معظم

نکہت بریلوی- حسن عابد- حمایت علی شاعر، نسیم سید، نجمہ خان، خلیق ابراہیم اور راحت سعید

(حمایت علی شاعر کا جشن صحت یابی) شکور حسین یاد- صہبا اختر- اظہر عنایتی- ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، حمایت علی شاعر- سید حنیف اخگر (امریکہ میں)

علی سردار جعفری۔ حمایت علی شاعر۔ سلطانہ جعفری اور ان کی نواسی (بمبئی میں)

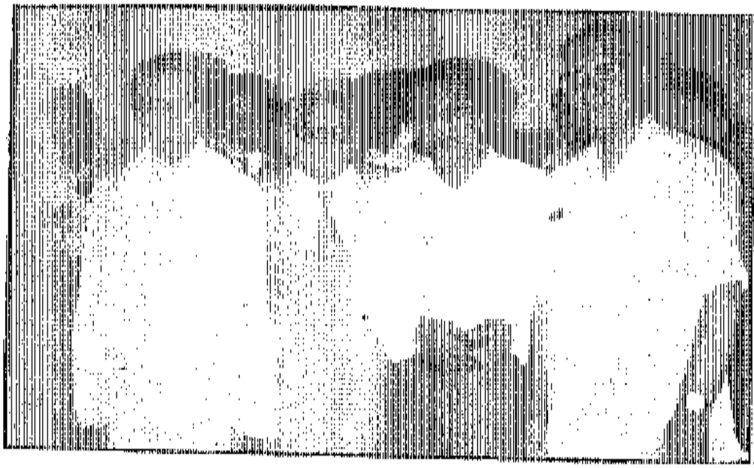

ڈاکٹر مسعود حسین۔ حمایت علی شاعر۔ خواجہ احمد فاروقی اور قاضی سلیم

پروفیسر عبد القوی ضیاء اور حمایت علی شاعر (سڈبری کینیڈا میں)

حمایت علی شاعر اور جگن ناتھ آزاد (میامی میں)

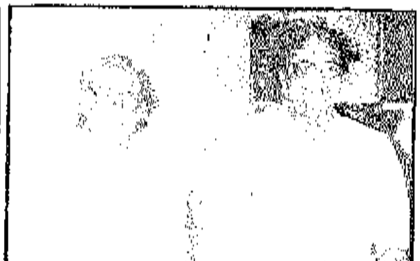

عزیز قیسی۔ بیگم قیسی۔ حمایت علی شاعر اور بیگم معراج نسیم (بمبئی میں)

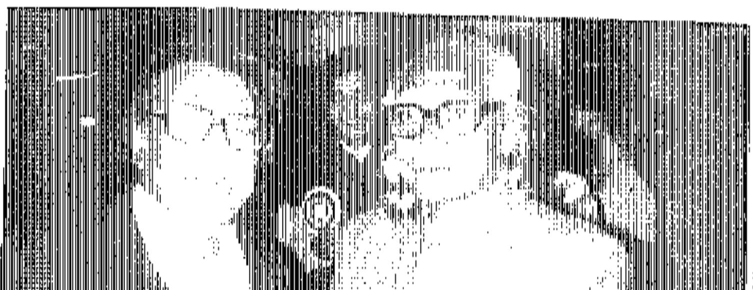

قاضی عبد الستار اور حمایت علی شاعر (دہلی میں)

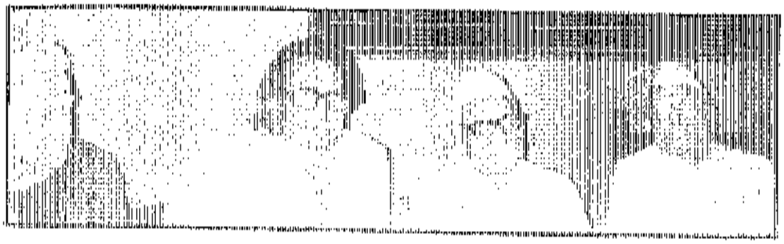

حیات اللہ انصاری۔ مالک رام۔ حمایت علی
شاعر اور مشیر جھنجھانوی (دہلی میں)

حمایت علی شاعر اور علی سردار جعفری (اوسلو۔
ناروے، کے ایک کیفے میں)

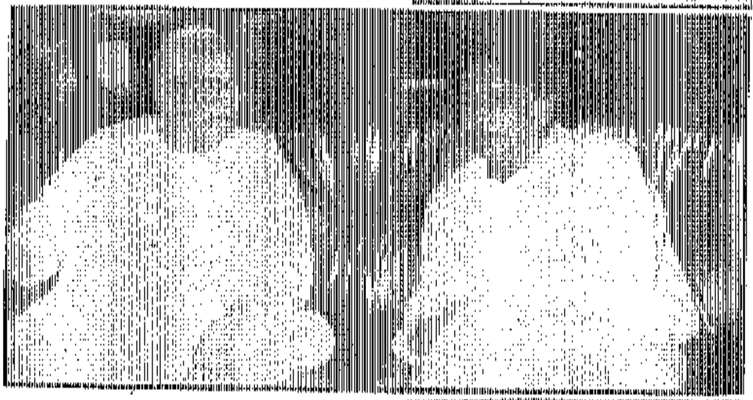

حمایت علی شاعر اور مجروح سلطان پوری (بمبئی میں)

حمایت علی شاعر اور اختر الایمان

حمایت علی شاعر پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی سگریٹ سلگاتے ہوئے

اطہر لکھنوی ۔ فاروق حیدر ۔ افتخار عارف ۔ سحاب قزلباش ۔ امیر زہرہ ۔ پروفیسر آل احمد سرور
حمایت علی شاعر اور صفرا نمایاں ہیں (اردو مرکز لندن ۔ فیض میموریل لیکچر ۱۹۸۵ء)

فکر تونسوی اور حمایت علی شاعر (دہلی میں
۱۹۸۶ء)

سچدانند وتسائین (ہندی کے مہاکوی) اور
حمایت علی شاعر

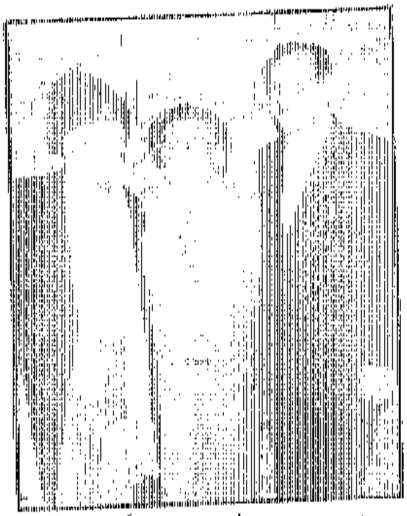

بدر رضواں، حمایت علی شاعر اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

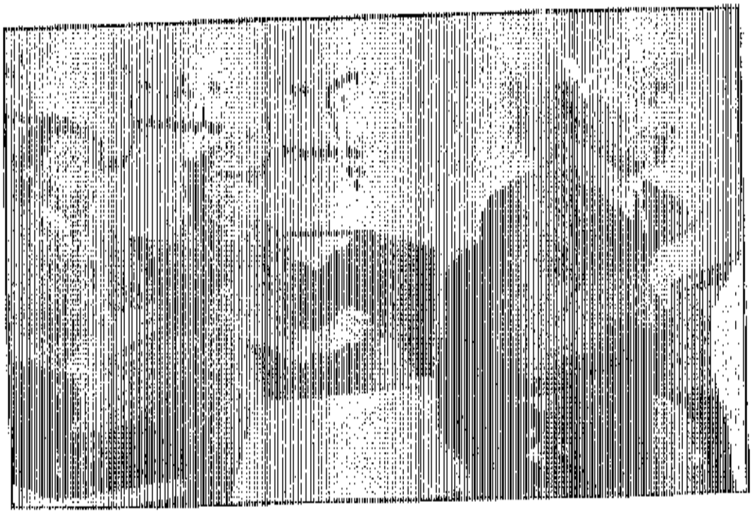

مسلم ضیائی۔ اختر حسین رائے پوری۔ حمایت علی شاعر (مٹی کا قرض تقریب رونمائی ۱۹۷۴ء)

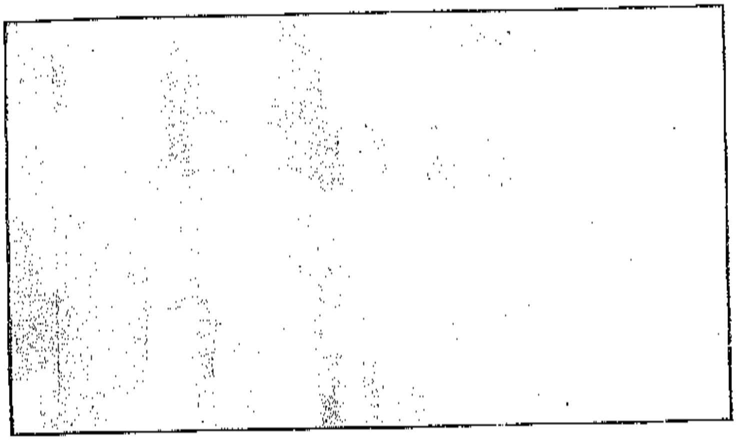

حمایت علی شاعر۔ راغب مراد آبادی۔ رئیس امروہوی اور تاج (دبئی میں)

حمایت علی شاعر اور کامریڈ افتخار

حمایت علی شاعر۔ اور عمران الارشد (لندن)

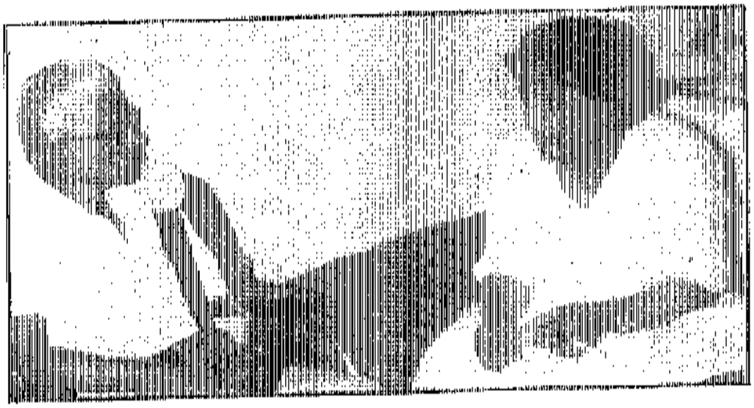

حمایت علی شاعر اور اختر الزماں ناصر

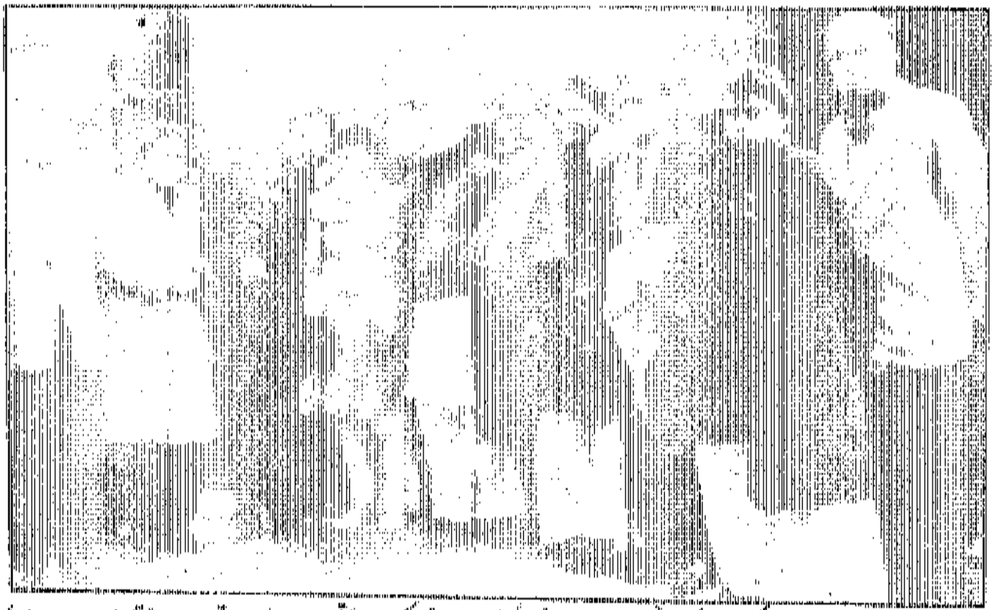

ماہر القادری، اقبال صفی پوری، ادیم لکھنوی، نوری، تبسم الدین، جوش ملیح آبادی، اختر لکھنوی، قمر جلالوی، وحید قیصر ندوی، نظیر جبلپوری، حمایت علی شاعر، سہا اختر اور شاعر لکھنوی (صدر [illegible] مشرقی پاکستان ۱۹۶۳ء)

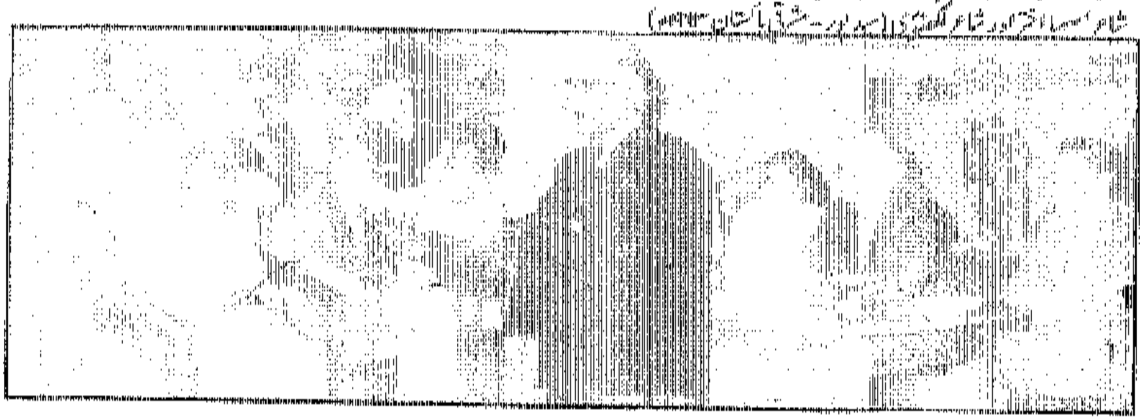

"مٹی کا قرض" کی تقریب رونمائی ۱۹۷۴ء کے موقع پر احمد ندیم قاسمی مضمون پڑھ رہے ہیں۔ حمایت علی شاعر، کشور ناہید اور فیض احمد فیض (صدارت) ڈائس پر بیٹھے ہیں

(حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام) صلاح الدین نیر، مغنی تبسم، حمایت علی شاعر، اور ڈاکٹر انور معظم، وزیر صحت شری ٹی انجیا (آندھرا پردیش) خطاب کر رہے ہیں

حمایت علی شاعر، عظیم عباسی، سید محمد جعفری، تابش دہلوی، حبیب انصاری، ماہر القادری، محشر بدایونی، اقبال صفی پوری، نظر امروہوی، رابعہ نہاں، قمر جلالوی، وحیدہ نسیم (ڈھاکہ)

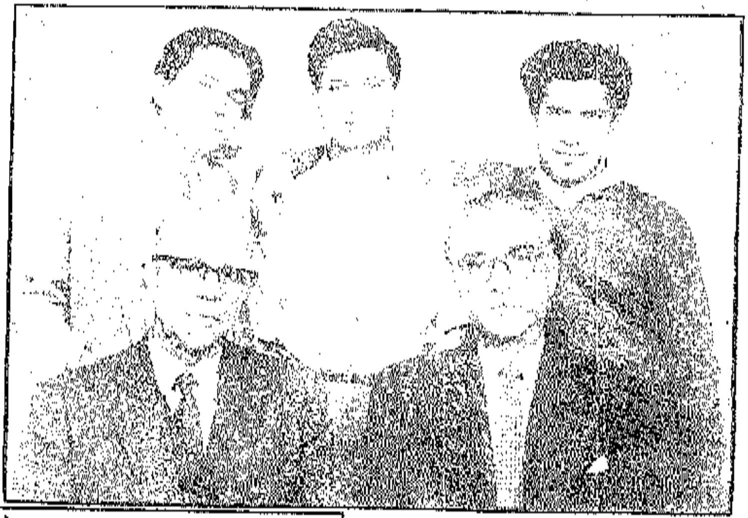

سرور بارہ بنکوی۔ ہارون (فلم اسٹار) حمایت علی شاعر، شوکت تھانوی اور سید محمد جعفری (ڈھاکہ)

اطہر نفیس۔ سناقی فاروقی۔ سلیم احمد۔ قمر جمیل۔ حمایت علی شاعر

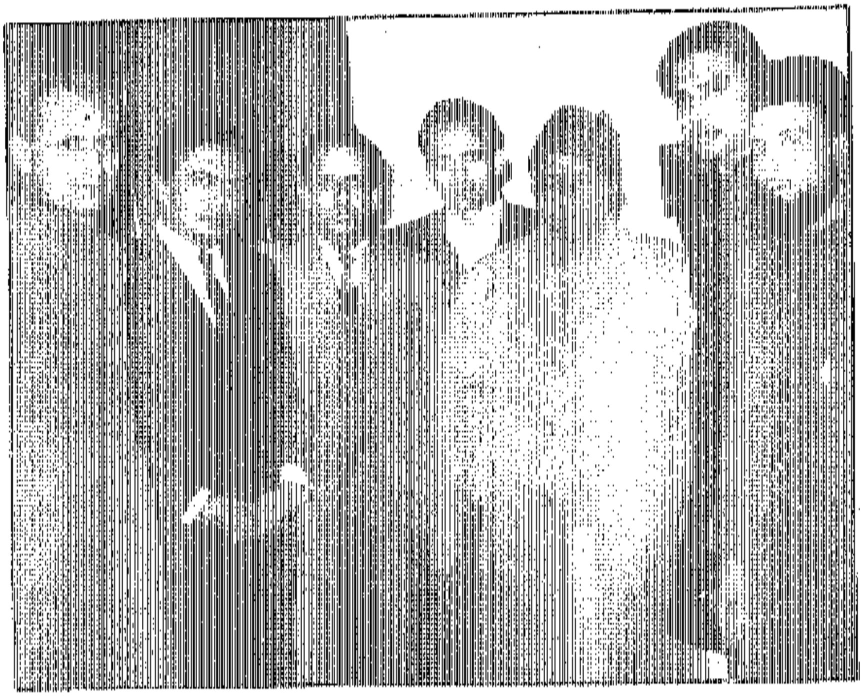

ذکی (مفتی محمد شفیع کے فرزند) کلیم عثمانی، احسان دانش (ریڈیو پروڈیوسر) راغب مراد آبادی، حمایت علی شاعر، نظر امروہوی (لاہور میں)

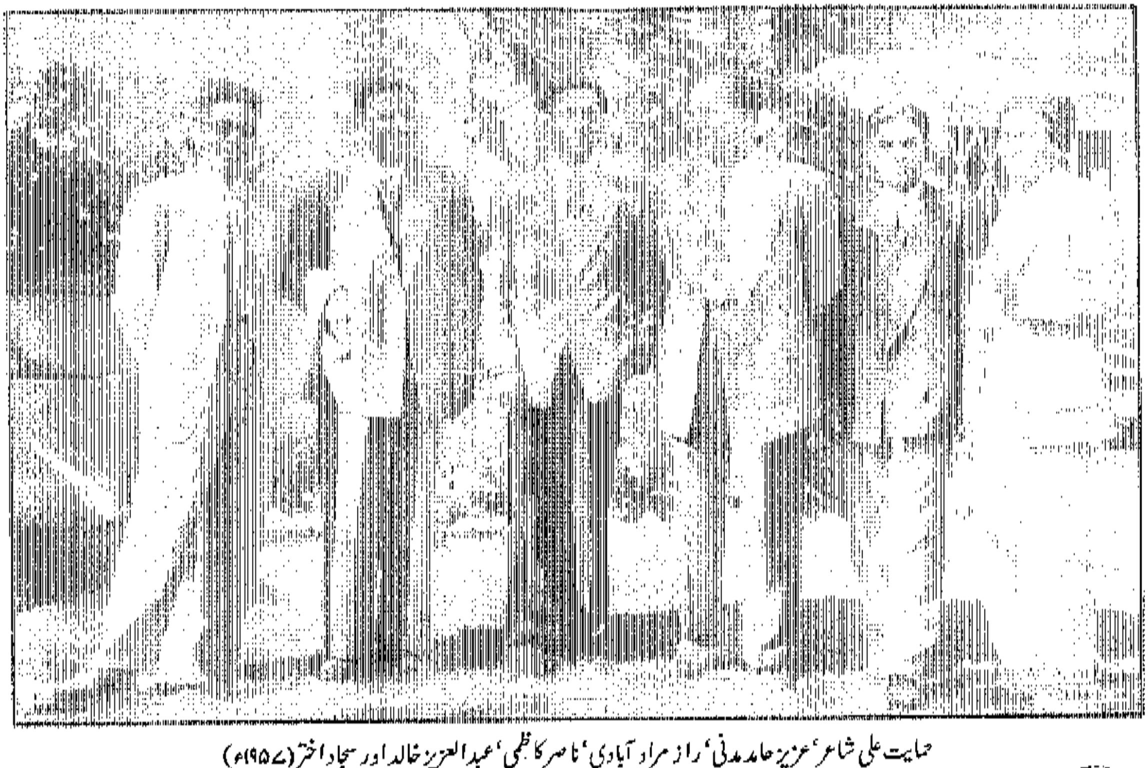

حمایت علی شاعر، عزیز حامد مدنی، راز مراد آبادی، ناصر کاظمی، عبدالعزیز خالد اور سجاد اختر (۱۹۵۷ء)

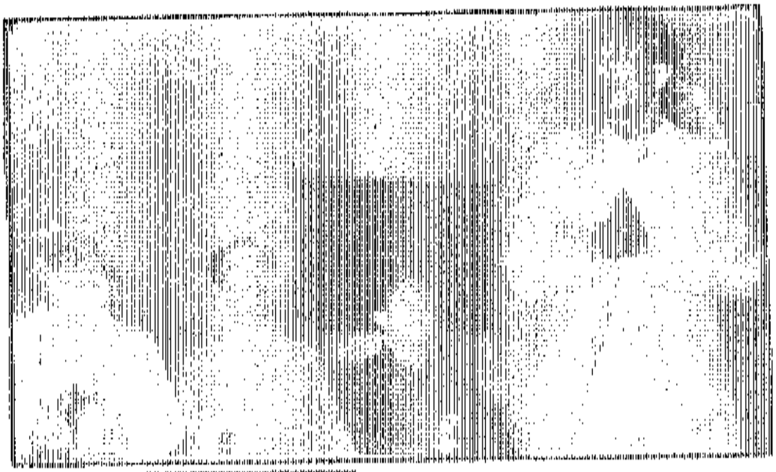

حمایت علی شاعر۔ پروفیسر کاظمی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق۔

(مشاعرہ گورنمنٹ کالج حیدرآباد)

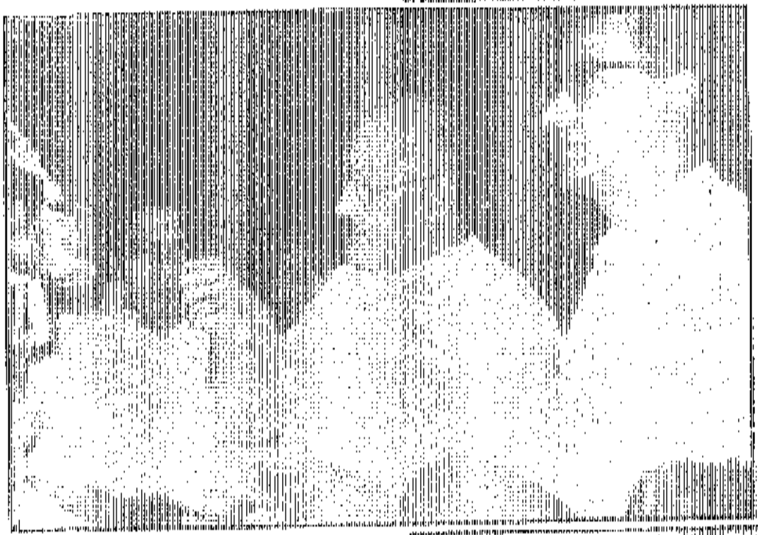

مصطفیٰ زیدی۔ جوش ملیح آبادی۔ حمایت علی شاعر

(مشاعرہ نواب شاہ)

لی ایس ساحر۔ قتیل شفائی۔ ادیب سہارنپوری
حمایت علی شاعر۔ سید محمد جعفری۔ حبیب جالب
اور ظریف جبلپوری۔ مشاعرہ ڈی سی ایم۔ دہلی ۱۹۵۷ء)

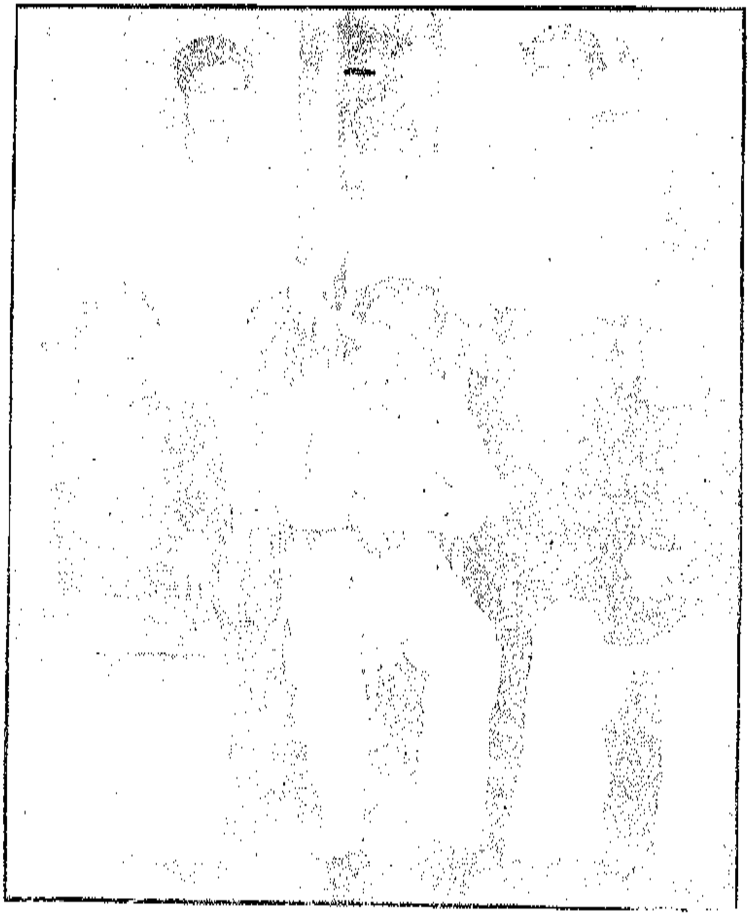

خواجہ نصیر الدین ۔ منظور آحمد (بیٹھے ہوئے) منتجب الدین حمایت علی شاعراور فکر حیدر آبادی
(حمایت علی شاعر کی منگنی کے موقع پر) (۱۹۴۸ء)

غلام دستگیر۔ حمایت علی شاعر۔ قاضی شفیع الدین ۔ جاوداں ۔ خواجہ معین الدین ۔ خواجہ نصیر الدین (جاوداں کی سالگرہ کے موقع پر)

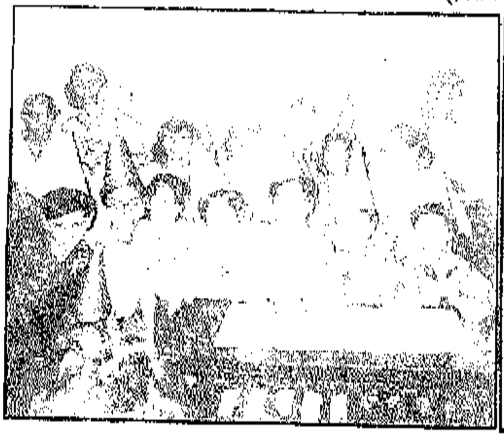

حمایت علی شاعر اپنے نواسے 'نواسیوں اور پوتے' پوتیوں کے ساتھ (اپنی پوتی شاداب کمال کی پہلی سالگرہ کے موقع پر)

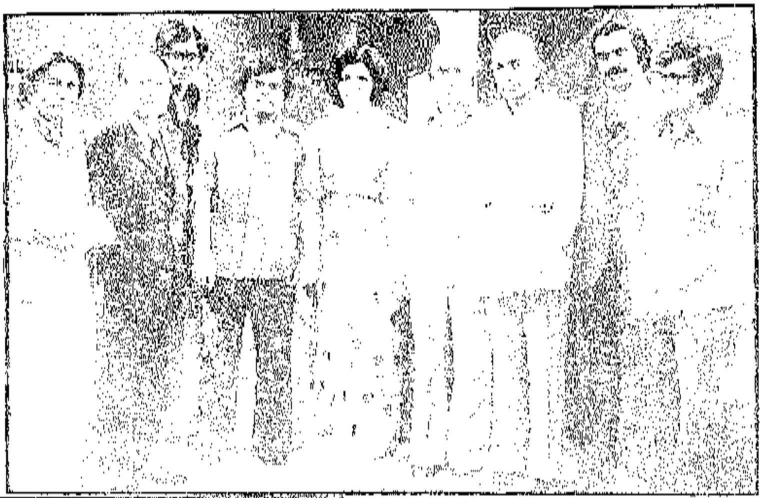

عبید اللہ بیگ۔ الیاس رشیدی۔ سلمہ احمد۔ آفتاب عظیم (پروڈیوسر) افتخار عارف۔ سید ہاشم رضا اور میزبان "کسوٹی پروگرام" حمایت علی شاعر

آذر زوبی اور حمایت علی شاعر (کسوٹی میں)

عبد الکریم راجکوٹ والا۔ شاکر جعفری۔ محمود سردار۔ حمایت علی شاعر۔ سبحانی بایونس۔ محمود علی۔ ذاکر حسین (ماڈرن اسٹوڈیو کراچی)

فلمساز حمایت علی شاعر کی
پہلی فلم "لوری" کا ریوالی
سینما کراچی میں افتتاح
(۱۹۶۶ء)

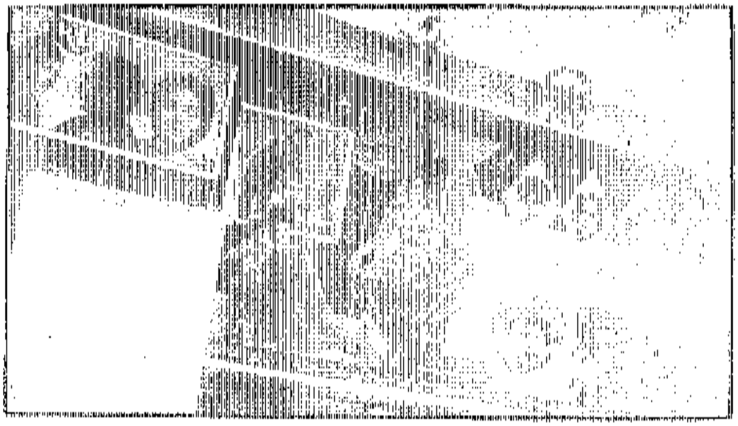

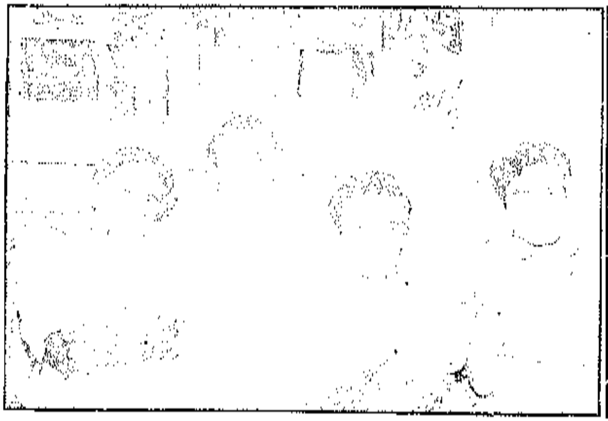

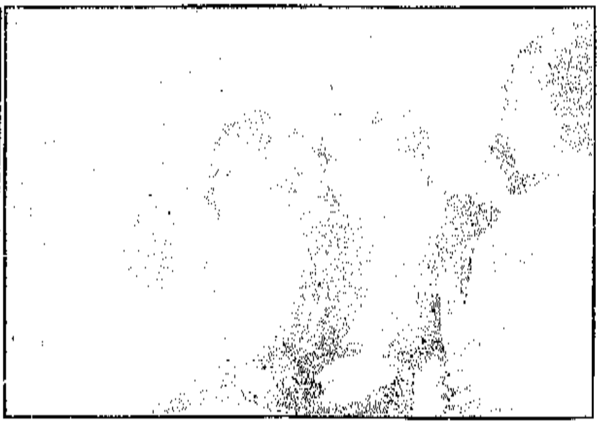

فلم "لوری" کے افتتاح کے مہمان خصوصی محترمہ نصرت بھٹو' سفیر مصر اور ان کی بیگم اور حمایت علی شاعر/ ارشاد علی' ستار شیخانی' اے ایچ صدیقی (ڈائریکٹر) اور حمایت علی شاعر (ایسٹرن اسٹوڈیو کراچی میں)

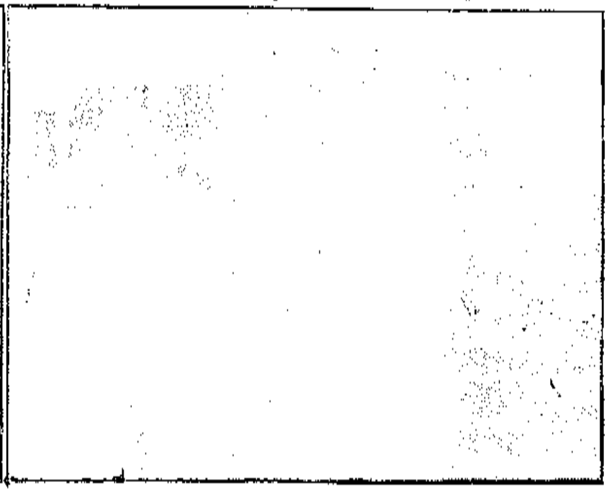

سلیم جعفری' درپن' حمایت علی شاعر' رضوان صدیقی (باری اسٹوڈیوز) / سبحانی بایونس' حمایت علی شاعر' محمد علی' زیبا' سنتوش رسل' ارشاد علی' اور مبارک علی (فلمساز' نغمہ نگار اور ہدایت کار حمایت علی شاعر کی دوسری فلم "گڑیا" کی شوٹنگ کے دوران)

علی سردار جعفری - شریف کنجاہی - ضمیر جعفری - احمد فراز - شاہد نقوی - احمد فقیہہ - محمد علی صدیقی اور حمایت علی شاعر کلام سناتے ہوئے (اوسلو ناروے ۱۹۸۵ء)

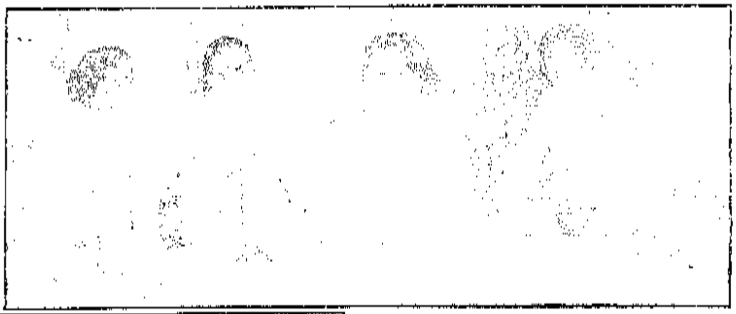

یوسف ناظم - مجتبیٰ حسین - حمایت علی شاعر اور طالب خوندمیری بمبئی کے ایک مشاعرے میں

(حمایت علی شاعر کے ساتھ حیدر آباد دکن کے اردو گھر میں ایک شام)
مسٹر کمار، گوپی چند نارنگ، حمایت علی شاعر اور شمس الرحمان فاروقی خطاب کرتے ہوئے

ڈاکٹر شفیق 'حمایت علی شاعر' طاعت رفیق جان' ڈاکٹر رفیق جان' حنیف اخگر' منہاج برنا (صدر)' راغب مراد آبادی' سردار سوز' (استادہ) صلاح الدین ناصر' تکلیل آزاد' یاسین زبیری' آزاد لکھنوی' شہاب کاظمی' وکیل انصاری' زریں یاسین' جمال قادری' فاطمہ وصیہ جعفری' نسیم فروغ' باقر زیدی' عزیز الحسن عزیز (نیویارک ۱۹۹۴ء)

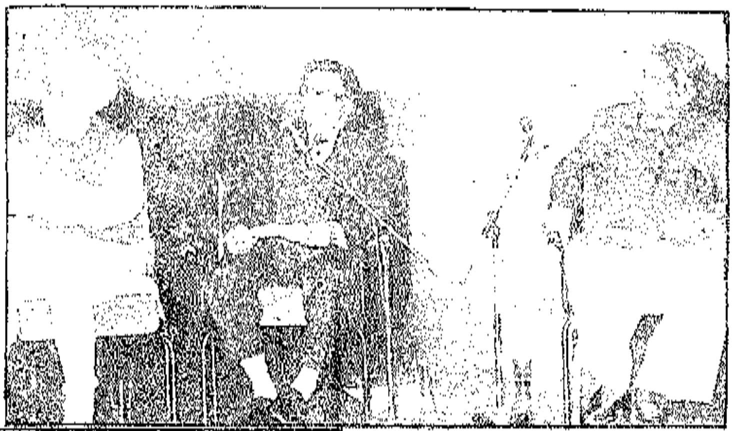

کیفی اعظمی ۔ حمایت علی شاعر۔ کنور مہندر سنگھ بیدی (اوسلو ناروے ۱۹۸۷ء)

پاکستانی سفارت خانہ لندن کے ایک مشاعرے میں حمایت علی شاعر کلام سنا رہے ہیں۔ قتیل شفائی ۔ مشتاق یوسفی (صدر) عقیل دانش اور صدیقہ شبنم نمایاں ہیں

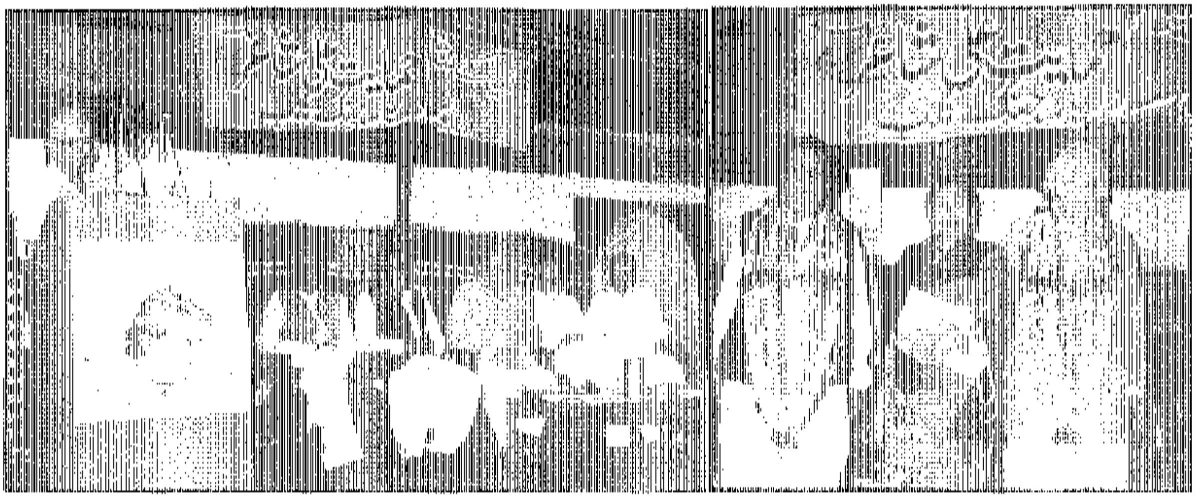

(حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام) پروفیسر کرار حسین (صدر) بیگم معراج نسیم' حمایت علی شاعر/ حمید قریشی' جسٹس مہدی علی صدیقی' پروفیسر کرار حسین' حمایت علی شاعر اور رشید شکیب جبکہ انور عنایت اللہ مضمون پڑھ رہے ہیں

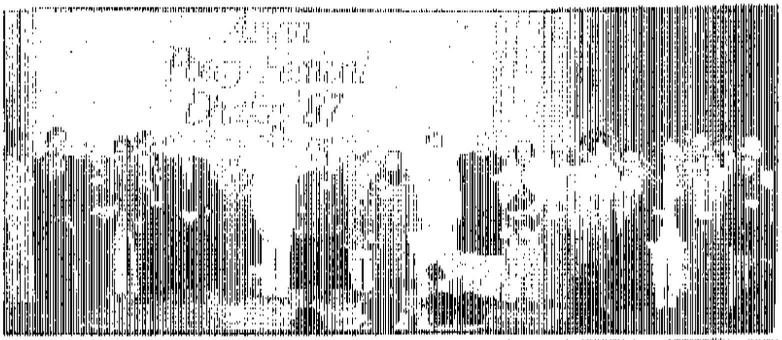

(ایشین پوئٹری فیسٹیول۔ ڈھاکہ ۱۹۸۵ء) ایشیا کے پندرہ ممالک کے شعراء کرام اور بنگلہ دیش کے صدر ارشاد

(عالمی لٹریری فیسٹیول ۔ مجاز سیمینار) حمایت علی شاعر' زبیر فاروق' معین احسن جذبی' قتیل شفائی' علی سردار جعفری' گوپی چند نارنگ اور راہی معصوم رضا نمایاں ہیں (لکھنؤ ۱۹۹۱ء)

حمایت علی شاعر لندن میں کارل مارکس کی قبر پر
(۱۹۸۱ء)

حمایت علی شاعر اور قتیل شفائی امریکہ میں
مجسمہ آزادی کے سامنے

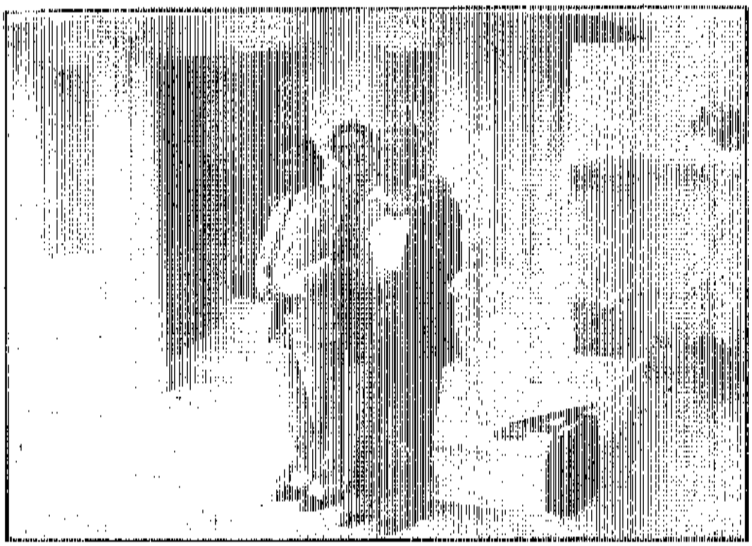

مجتبیٰ حسین۔ کامریڈ کاظم اور حمایت علی شاعر
دہلی میں غالب کے مزار پر

MAURITIUS

The SUN — Mercredi 21 octobre 1987 4

Visite de deux poètes pakistanais

Visite de courtoisie des poètes pakistanais à M. Parsuraman

Deux éminents poètes du Pakistan sont actuellement en visite à Maurice. Il s'agit de M. Himayat Ali Shair et M. Syed Raghib Muradabadi, qui sont les invités du *National Urdu Institute*.

Hier matin, accompagnés de M. Edun, ils ont rendu une visite de courtoisie au ministre de l'Education, des Arts et de la Culture, M. A. Parsuraman.

Lundi soir, ils ont participé à une "mushaira" (récitation de poèmes), organisée par le *National Urdu Institute*, au siège du Gymkhana, Port-Louis.

M. Shair et M. Muradabadi ont écrit plusieurs poèmes.

M. Shair a reçu plusieurs prix pour ses oeuvres. Il a reçu le '*Presidential Award*' en 1959, le '*Nigar Award*' en 1962 et en 1963 et le '*Writer's Guild Adamji-Award*' en 1974.

M. Shair et M. Muradabadi quittent Maurice aujourd'hui.

ماریشس کے وزیر تعلیم ایم۔ پارسورامن
راغب مراد آبادی اور حمایت علی شاعر
(پاکستان اور موریشس کے نظام تعلیم پر تبادلہ
خیالات)

حمایت علی شاعر۔ راغب مراد آبادی اور پروفیسر
ڈاکٹر حبیب الحق ندوی (صدر شعبہ اردو فارسی
اور عربی۔ ڈربن یونیورسٹی ویسٹ وبائل۔ جنوبی
افریقہ)

جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) میں راغب مراد
آبادی اور حمایت علی شاعر ایک مقامی افسر کے
ساتھ سونے کی کان میں (۱۹۸۷ء)

اعزازات

حمایت علی شاعر اپنے ایوارڈز کے ساتھ

صدر پاکستان جناب سردار فاروق احمد خان لغاری حمایت علی شاعر کو مجموعہ کلام "ہارون کی آواز" پر ڈاکٹر علامہ اقبال ایوارڈ دیتے ہوئے، وفاقی وزیر تعلیم سید خورشید احمد شاہ اور فخر زمان چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان بھی موجود ہیں (اسلام آباد ۱۹۹۳ء)

عالمی اردو کانفرنس دہلی کی جانب سے موسیقار اعظم جناب نوشاد، حمایت علی شاعر کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مخدوم محی الدین عالمی ایوارڈ دیتے ہوئے (۱۳ فروری ۱۹۸۹ء۔ دہلی)

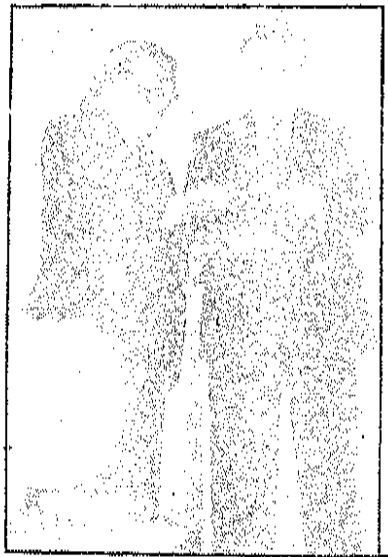

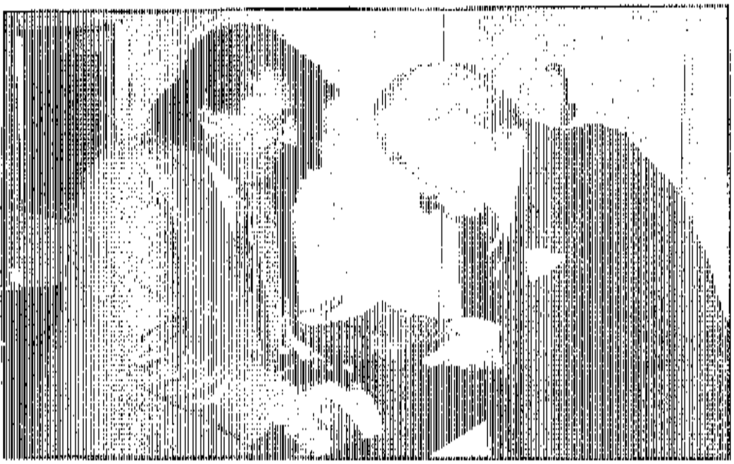

اوسلو (ناروے) کی قومی اسمبلی کے اسپیکر حمایت علی شاعر کو خصوصی تحائف دیتے ہوئے

بولنگ بروک (شکاگو) کے میئر راجر سی کلیئر حمایت علی شاعر کو امریکہ کی اعزازی شہریت اور شہر کی چابی دیتے ہوئے

مہاراشٹر کے مشہور بزرگ رہنما ڈاکٹر گوبنداس شراف حمایت علی شاعر کو سرسوتی ایوارڈ دیتے ہوئے۔

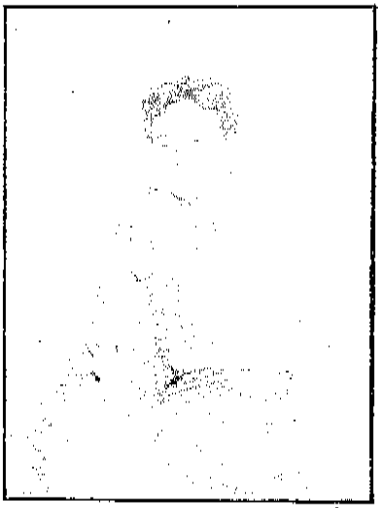

(کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو)
حمایت علی شاعر اور نگار ایوارڈ (۱۹۶۲ء)

(نیچے) پاکستانی امریکن فیڈریشن کے صدر مشیر صدیقی حمایت علی شاعر کو ایوارڈ دیتے ہوئے (لاس اینجلیس)

Habib Bank Limited
یب بینک
و جنگلات لگاؤ
روگرام کی تکمیل میں
م کردار ادا کرنا
ھے۔
حبیب بینک
نے وسیع تر قومی
مفاد میں اپنے آپ
کو پابند کر دیا ہے کہ وہ :
● سڑکوں کی دونوں جانب لاہور، حیدرآباد، نوشہرہ، ٹھٹھہ اور زیارت اضلاع / شہروں میں سڑکوں پر درخت لگائے گا۔
● ۲۵ ہزار ایکڑ کے رقبے پر جنگلات لگائے گا۔
● آلودگی پر قابو پانے اور عوام میں بیداری پیدا کر کے اُن کے تعاون کے حصول کی کوشش کریگا۔
آیئے! پاکستان کونسل برائے تحفظ ماحولیات کے شانہ بشانہ جنگلات لگاؤ پروگرام کو بھرپور کامیابی سے ہمکنار کریں۔
بہتر خدمت کی روایت
حبیب بینک لمیٹڈ

PID(1)